صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۱۲ — ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد سیزدہم

شمارہ نمبر ۱۳۰
جنوری ۱۹۸۵ء

مُدیر:

محمّد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے

فہرست

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خلفاءِ محمدؐ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد میں عدلیہ اور انتظامیہ

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نظامِ عدالت

حضرت عمرؓ کا نظامِ عدالت

حضرت عمرؓ کا نظام عدالت

رسولؐ نمبر کے بارے میں اہل علم کی رائے

اخبارات

مندرجہ بالا اخبارات کے مذاکروں میں حصہ لینے والے :-

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

میں موت سے ڈرتا تھا۔

میں اپنے علمی، تاریخی اور ادبی کاموں سے مطمئن تھا۔ جنہیں میں نے ۴۴ برس تک عبادت سمجھ کر ادا کیا تھا۔ ۴۴ برس
ں کا حساب کر لیجئے۔ ہفتوں کا حساب کر لیجئے۔ دنوں کا حساب کر لیجئے۔ منٹوں کا حساب کر لیجئے۔ وہ سارے منٹ،
ئے دن، وہ سارے ہفتے، وہ سارے مہینے، وہ سارے سال، میرے اسی عشق میں گزرے۔ مگر دل پوری طرح
نہ تھا، جیسے کوئی کمی ہو۔ ایک دھڑکا سا موجود تھا!

مْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ ۝ قٰلَ
قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (سورہ مومنون)

[(گنہگاروں سے) ارشاد ہوگا (کہ اچھا یہ بتلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین پر رہے ہوگے ۝ وہ
دیں گے ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے (اور سچ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے پوچھ
یعنی فرشتوں سے) ۝ ارشاد ہوگا کہ تم (دنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے لیکن کیا خوب ہوتا کہ تم یہ بات دنیا میں
ہوتے ۝]

بے شک اول دن، میرے سامنے قرآن کی یہ آیت نہ تھی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا مگر یہ احساس ضرور تھا کہ یہ جو
ی ہے، جو اللہ کی دی ہوئی ہے، یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس کا کوئی مفہوم ہے!

وہ مفہوم کیا ہے؟ وہ مقصد کیا ہے؟

اُسے پانے کے لیے میں ۴۴ برس سے سفر میں ہوں۔ جب تک حالتِ سفر میں رہوں گا، مجھے موت بھی ڈرا نہ سکے گی۔
میرے نزدیک صرف سجدہ ریزی کو عبادت نہیں گنا جائے گا۔ وہ ایک فرض ہے جو ادا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک عبادت
گردانا جائے گا جس سے خلقِ خدا کو فیض پہنچا ہو، جو فرض کی طرح دُوسرا فرض ہو!

بے شک میری عمرِ مستعار کے منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا حساب کر لیجئے۔ میں حالتِ سجدہ مسلسل
ہوں!

محمد طفیل

○

اس شمارے میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانِ غنیؓ پر چار کتابیں عربی زبان میں چھپیں، جنھیں ابوالنصر نے لکھا اور بے پناہ شہرت پائی۔ انھیں ادارۂ نقوش نے رُبع صدی پہلے کتابی صورت میں بھی پیش کیا تھا۔ یہ حوالے کی کتاب ہے جس کی بے حد ضرورت تھی، اسے اب یہاں بھی ایک عرصے کے بعد دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ علمی تشنگی دُور ہو۔

محمد احمد نے مصنف کے خیالات کو اردو میں منتقل کر دیا۔ نظرِ ثانی ہم نے حبیب اشعر دہلوی سے کرائی جو عربی زبان کے عالم تھے۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ اطمینان ہو کہ نقل مطابقِ اصل ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے اس کتاب پر دوبارہ نظرِ ثانی مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب (ڈائریکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ کالج ٹرسٹ لائبریری) سے بھی کرائی تاکہ مزید اطمینان حاصل ہو۔

جو پیغام ہمارے خدا کا ہے، ہمارے نبیِ آخر الزماںؐ کا ہے۔ اُسے عملی طور پر پیش کرنے کے لیے حضورؐ کے بعد خلفا ہی کا نام آتا ہے۔ ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ چاروں اپنی اپنی حیثیت میں یکتائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ چاروں ملت کی بقا کے لیے ناگزیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں اسلام دُور دُور تک پھیلا۔ چاروں قرآن کے پرکار تھے، چاروں ارشاداتِ نبویؐ پر جان دینے والے تھے۔

میرے نزدیک سیرت پر کام، بارھویں جلد تک مکمل ہو گیا ہے۔ میرا منصوبہ تکمیل پذیر ہوا، ورنہ موضوع کی تو اتھاہ ہی نہیں۔ ساری دنیا لکھے، ساری دُنیا کے چھاپے خانے چھاپیں تو بھی حق ادا نہ ہو۔

اس تیرھویں جلد کو جی چاہے تو سیرت کے باب میں شامل کر لیں چاہے نہ کریں، آپ کی مرضی! مگر اتنا کہوں گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ احکاماتِ الٰہیہ کو نافذ کرنے کے مواقع زیادہ تر خلفا کے حصے میں آئے، کیونکہ قدرتِ کاملہ نے انھیں زیادہ عرصہ مرحمت فرمایا۔ اگر سیرۃ کے باب میں ایسا کرنا مناسب نہ ہوتا تو علامہ شبلی نعمانی یا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کے بعد باقی پانچ جلدیں پیش نہ کرتے کیونکہ باقی جلدیں شعائرِ اسلام کے ابواب سے متعلق ہیں! بہرحال جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں یہ اتباعِ رسولؐ کا حصہ ہے! عطیہ ہے!

ایک مضمون جو خلفا پر ہے، ابوالنصر کا عربی سے ترجمہ ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا انگریزی سے ترجمہ ہے۔ یہ دونوں مضامین آج کے ماحول میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کو تو سپریم کورٹ کے سابق پانچ چیف جسٹسوں نے اتنا سراہا کہ مصنف کو بھی اطمینان نصیب ہُوا ہو گا، اس لیے کہ ہم سب امتحان دیتے ہیں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔

قدرت نے مہلت دی تو ان تمام نمبروں کی ازسرِ نو ترتیب پر غور ہو گا۔ پھر اہل الرائے حضرات کے مشوروں سے ضروری ترامیم و اضافہ بھی کیا جائے گا۔ یہ ابتدائی کام ہے جس پر مسلسل غور و فکر ہوتا رہے گا، نوک پلک درست ہوتی رہے گی اور یہ سلسلہ زندگی بھر رہے گا ان شاء اللہ العزیز!

اہلِ قلم نے میرے ساتھ جتنا تعاون کیا وہ ایک مثال ہے۔ پھر مثال بھی ایسے نامور لکھنے والوں کی طرف سے جو یہ کہہ سکتے ہیں ؎

اپنے ہاتھوں میں لیے شمعِ یقیں آئیں گے
اب ہمیں ہم نہیں آئیں گے ہمیں آئیں گے

دنیا نے ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمانِ غنیؓ، علی المرتضیٰؓ جیسے انسان پیدا نہیں کیے، رسول اللہؐ کی تربیت ہی اور ہے!

محمد نقوش

خلفائے محمد ﷺ

مؤلف

عمر ابو النصر

اللہ نے توفیق دی تو ادارۂ نقوش
اسی اہتمام سے قرآن نمبر بھی پیش کرے گا
—— محمد طفیل

تقریظ[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد عمر ابو النصر کی کتاب "خلفائے محمدؐ" کا اُردو ترجمہ جو جناب محمد احمد کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے (جس پر نظر ثانی حبیب اشعر دہلوی نے کی تھی) میں نے دیکھا ہے، بالخصوص اس کے وُہ حصّے جن کا تعلق مشاجراتِ خلفاءؓ وصحابہؓ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی مؤرّخ کے لیے اسلامی تاریخ کے یہ حصّے پُل صراط کی حیثیت رکھتے ہیں تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک۔ مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں ایک مرتبہ کسی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے سوال کیا تو انھوں نے جو جواب دیا تھا میں سمجھتا ہُوں کہ وُہ جواب پُوری اُمتِ مُسلمہ کے لیے ان معاملات میں دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری تلواروں کو ان کے مقدس خُون سے محفوظ رکھا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی زبانوں کو ان کی بدگوئی میں ملوث کریں وہ تمام حضرات اپنی خُوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہیں اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

غالباً اسی بنا پر اہلسنّت والجماعت کا یہ متفق علیہ عقیدہ ہے کہ،

الصحابۃ کلھم عدول (صحابہؓ تمام کے تمام عادل ہیں)

گو کہ ان کے درمیان اختلافات بھی ہوئے اور بعض اوقات دشمنانِ اسلام اور منافقین کی ریشہ دوانیوں کی بدولت ان کے درمیان خوفناک جنگیں بھی ہوئیں، جن میں ہزاروں کلمہ گو مسلمان شہید ہُوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ اندوہناک ترین باب ہے۔ تاہم یہ ہمارا منصب نہیں کہ ہم کسی کو موردِ الزام قرار دیں یا مطعون و بدنام کریں خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن سے غلطیاں سرزد ہوئیں وہ اجتہادی غلطیاں تھیں جن پر ملامت روا نہیں۔ دُوسری اہم بات یہ ہے کہ جو شخص بھی بنظرِ غائر اس دور کے حالات کا جائزہ لے گا اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے یہ اکابر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ایک نہایت سوچی سمجھی سازش کے شکار ہُوئے اور انھوں نے بالارادہ جنگ نہیں کی بلکہ منافقین نے سازش کر کے ان پر جنگ مسلط کر دی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جُونہی سازشی عناصر بے نقاب ہُوئے حضرات صحابہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور ان کا وہ ملّی جذبہ

---

[1] جہاں ضرورت سمجھی ہاشمی صاحب نے حواشی بھی لکھے ہیں۔ (ادارہ)

پیدا ہوگیا جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیضانِ صحبت سے ان کے قلوب و اذہان میں راسخ فرمایا تھا۔ ذیل میں علامہ ابن کثیر کی ایک روایت نقل کی جارہی ہے جس سے امید ہے کہ کافی حد تک مشاجراتِ صحابہؓ کی حقیقت واضح ہو جائے گی (ان شاء اللہ العزیز)۔ البدایہ والنہایہ میں علامہ فرماتے ہیں:

> "جب روم کے بادشاہ نے یہ دیکھا کہ حضرت امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کے ساتھ لڑائی میں مشغول ہیں تو وہ اس نیت سے کہ اسلامی ممالک کے بعض حصّوں پر قبضہ کرلے ایک لشکرِ جرّار لے کر آگے بڑھا اور ممالکِ محروسہ کے قریب پہنچ گیا اس وقت جناب معاویہؓ نے اسے لکھا:
>
> "ملعون! خدا کی قسم! اگر تُو باز نہیں آئے گا اور اپنے ملک کی طرف نہیں لَوٹے گا تو میں اپنے ابنِ عم (علیؓ) سے صُلح کرلُوں گا اور ہم دونوں مل کر تجھے تیرے ملک سے بھی نکال باہر کریں گے اور تیرے اُوپر زمین تنگ کر دیں گے۔"
>
> شہنشاہِ روم اس خط کو پڑھ کر خوف زدہ ہوگیا اور اپنے مکروہ ارادوں سے باز آگیا اور اس نے حضرت امیر معاویہؓ سے مصالحت کرنے کی درخواست کی۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۱۹)

خدا کا شکر ہے کہ زیرِ نظر کتاب کے مصنف عمر ابو النصر کی نگاہ اس حقیقت تک رسائی رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (سوائے چند مبتذل اور موضوع روایات کو نقل کرنے کے) مصنّف کا قلم نہایت محتاط ہے۔ مترجم اس سلسلے میں قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے جس روایت یا رائے کو صحیح مسلک سے ہٹا ہُوا پایا ہے حاشیہ میں اس کی وضاحت کردی ہے تاکہ قاری کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ عرصہ ہوا ادارہ نقوش نے اس ترجمہ کو کتابی صورت میں شائع کیا تھا لیکن عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اسے "رسولؐ نمبر" کا حصہ بنا کر شائع کیا جارہا ہے۔ اس طرح "خلفائے محمدؐ" کا یہ آبجو "سیرتِ رسولؐ" کے بحرِ ناپیدا کنار کا جزو بن کر کُل میں فنا ہُوا اور ساحلِ مراد کو پہنچ گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

○

سید محمد متین ہاشمی
ڈائریکٹر ریسرچ سیل
دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

فقد نصره الله إذ أخرجه الذين كفروا ثاني اثنين إذ هما في الغار



نصرت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

فصل اوّل ــــــ خلافت کا سوال

(۱)

حادثۂ فاجعہ

ابنِ اثیر نے اسد الغابہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مؤذن حضرت بلالؓ بن رباح کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی فتح سے فراغت پائی تو حضرت بلالؓ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"مجھے شام میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور حضرت بلالؓ مستقل طور پر شام میں اقامت پذیر ہو گئے۔ مدت کے بعد ایک روز بلالؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضورؐ فرما رہے ہیں:

"بلالؓ! یہ کیا ماجرا ہے؟"

بلالؓ کی آنکھ کھل گئی۔ اب انھیں ایک لمحہ قرار نہ تھا۔ اسی بے چینی کے عالم میں وہ مدینہ روانہ ہو گئے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر زار و قطار رونے لگے۔ جب حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ تشریف لائے ہیں تو وہ دونوں آپ کے پاس آئے۔ بلالؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کو دیکھ کر سینے سے لگا لیا اور انھیں پیار کرنے لگے۔ حسینؓ نے آپ سے کہا:

"ہماری خواہش ہے کہ صبح کی اذان آپ دیں۔"

بلالؓ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشوں کا دل کیسے تھوڑا کر سکتے تھے۔ صبح کی نماز کے وقت مسجد کی چھت پر چڑھے اور اذان دینی شروع کی۔ جس وقت انھوں نے اللہ اکبر اللہ اکبر کہا اس سرے سے اس سرے تک سارا مدینہ تھرا اٹھا۔ جب اشھد ان لا الٰہ الا اللہ پر پہنچے تو اہلِ مدینہ کے دل اور بھی بے چین ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب بلالؓ کی زبان سے اشھد ان محمداً رسول اللہ نکلا تو مدینہ کا کوئی متنفس نہ تھا جو زار و قطار روتا ہوا گھر سے باہر نہ آ گیا ہو، اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اپنے محبوب رسولؐ کی جدائی کے غم میں ساون بھادوں کی طرح نہ برس رہی ہو۔ اس دن مدینہ ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا جہاں ہر طرف آہیں تھیں اور سسکیاں!

اس روایت کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کئی سال بعد

جب مدینہ والوں کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت بلالؓ کی اذان سن کر وہ اپنے پیارے آقا کی یاد میں تڑپ اُٹھے، تو اس وقت ان کے حزن وملال کا کیا عالم ہوگا جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم شاہدِ لم یزل سے ہم کنار ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روز اہلِ مدینہ پر بجلی گر پڑی تھی ان کے دل خون ہو رہے تھے اور شدتِ غم سے ان پر بیہوشی کا عالم طاری تھا۔ مدینہ والوں کی یہ حالت اس لیے تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خدا کے رسول تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے باپ، مومنوں کے رفیق، غریبوں اور کمزوروں کے خادم، اُمت کے معلم، فقیروں کے ملجا، ضعیفوں کے ماویٰ اور مصیبت زدوں کے مونس وغم خوار تھے۔ آپ عربوں کے لیے حُریت وآزادی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ان پر موت وارد ہو چکی تھی۔ آپؐ نے انھیں حیاتِ تازہ بخشی۔ وہ قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے تھے، آپؐ نے انھیں بامِ عرش پر پہنچا دیا۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں زندگی کی جو رُوح پھونکی تھی، اس نے ان کے دلوں میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا اور یہ اسی انقلاب کا اثر تھا کہ جب وہ عرب کی سرزمین سے نکلے اور ایسے ملکوں میں پہنچے جو فتنہ وفساد اور افتراق وانشقاق کی آماجگاہ تھے۔ جہاں ہر طرف جہالت کا بازار گرم تھا تو اُنھوں نے اس تعلیم کے اثر سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو ملی تھی، وہاں کے باشندوں کی کایا پلٹ دی اور اسلامی اخلاق وآداب، عدل وانصاف اور اخوتِ انسانی کے ایسے شاندار نمونے پیش کیے جن کی نظیر ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ بالفاظِ دیگر انھوں نے ایک نئی زمین اور ایک نئے آسمان کی بنیاد رکھی۔ وہ جو بھیڑوں کے ریوڑ چرایا کرتے تھے، کاروانِ انسانیت کے سالار بن گئے۔

اسلام کا یہ عروج معجزہ سے کم نہ تھا۔ مستشرقینِ یورپ نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح اس کے حقیقی اسباب معلوم کر لیں۔ لیکن آخر الامر انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ عربوں کی یہ ترقی انسانی قوتوں کی حد سے ماورا ہے اور یہ کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں کہ وہ محض اپنے زورِ بازو سے ایسا انقلاب برپا کر دے۔

(۲)

خلافت

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے بعد کسی شخص کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا اور نہ اس امر کے متعلق کوئی ہدایت دی تھی کہ خلیفہ منتخب کرتے وقت کن کن باتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس لیے آپؐ کی وفات کے بعد جب خلافت کا مسئلہ درپیش ہُوا تو مختلف طبقوں میں کش مکش پیدا ہوگئی۔ ہر گروہ چاہتا تھا کہ خلیفہ اسی میں سے ہو۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے معاً بعد صحابہ کرام کو ایسے خلیفہ کی ضرورت کا احساس ہوگیا تھا جو مسلمانوں کی ہر پہلو سے نگرانی کر سکے، جنگوں کا سلسلہ بحسن وجوہ جاری رکھ سکے، آپس کے تنازعات کو سُلجھا سکے اور اسلامی حکومت کما حقہٗ چلا سکے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے پہلے ہی انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہُوئے اور یہ کوشش کی کہ اپنے میں سے کسی کو امیر بنا لیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو اس کا علم ہوا تو

وہ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے اور انصار کے اس ارادہ کی مخالفت کی۔ اب دو فریق ہو گئے، ایک انصار کا اور دوسرا مہاجرین کا۔ انصار چاہتے تھے کہ خلافت ان کے حصہ میں آئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک اپنی قوم میں رہ کر اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے۔ لیکن اس مدت میں معدودے چند لوگوں نے آپؐ کی دعوت قبول کی۔ اس کے بعد جب آپؐ نے ہجرت فرمائی تو انصار کثیر تعداد میں آپؐ پر ایمان لائے اور اس طرح انھوں نے اسلام کو تقویت پہنچائی۔ وہ ہر جنگ میں آپؐ کے دوش بدوش لڑے اور کسی دشمن کی یہ مجال نہ ہوئی کہ وہ آپؐ کو نقصان پہنچا سکتا۔ یہاں تک کہ بالآخر سارا عرب آپؐ کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک انصار سے انتہائی خوش تھے اس لیے خلافت کا حق انہی کو پہنچتا ہے۔

اس کے برعکس مہاجرین یہ کہتے تھے کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے جس کی وجہ سے ہمیں شدید ترین مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی ظلم نہ تھا جس کا ہمیں تختۂ مشق نہ بننا پڑا ہو۔ گو ہماری تعداد تھوڑی تھی لیکن ہم نے کسی موقعہ پر بھی گھبراہٹ اور بے دلی کا اظہار نہیں کیا۔ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قوم اور آپؐ کے اہلِ خاندان ہیں۔ عرب اگر مطیع ہو سکتے ہیں تو قریش ہی کے مطیع ہو سکتے ہیں اس لیے خلافت کے ہم ہی حقدار ہیں۔

نزاع کو طول پکڑتے دیکھ کر انصار نے تجویز پیش کی کہ ایک امیر ہم میں سے ہونا چاہیے اور ایک مہاجرین میں سے۔ مہاجرین اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد سب لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہو گئے اور اسی وقت اور اسی جگہ آپؓ کی بیعت کر لی گئی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے اس لیے وہ اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے۔ ان کو جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی خبر پہنچی تو اس انتخاب کو انھوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اب ایک تیسرا فریق اور پیدا ہو گیا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ خلافت اہلِ بیت کا حق ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قریبی رشتہ دار آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ تھے۔ لیکن حضرت عباسؓ ان سابقون الاولون میں سے نہیں تھے جنھوں نے شروع میں ہی حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی تھی۔ وہ غزوۂ بدر میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے حضورؐ کی بیعت بھی ہجرت کے کئی سال بعد کی تھی۔ لیکن حضرت علیؓ کی پرورش خود حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ حضورؐ پر جو اشخاص سب سے پہلے ایمان لائے حضرت علیؓ ان میں سے ایک تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی آپ سے کر دی تھی۔ جہاں تک علم و فضل اور اسلام کی راہ میں قربانیوں کا تعلق ہے، آپ کا مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

جو لوگ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہو وہی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خاندان کی نسبت خاندانِ بنوہاشم زیادہ معزز ہے۔ جہاں تک عربوں کی اطاعت کا سوال ہے وہ خاندانِ بنوہاشم کی اطاعت کو زیادہ ترجیح دیں گے۔ اگر مہاجرین سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے سامنے یہ حجت پیش کر سکتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قوم اور ہم قبیلہ

ہونے کی بنا پر خلافت کے زیادہ مستحق ہم ہیں تو اہلِ بیت نبوی یہ دلیل کیوں نہیں لا سکتے کہ ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس لیے خلافت پر سب سے زیادہ حق ہمارا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت علیؓ کے استحقاقِ خلافت کا نظریہ زیادہ زور نہ پکڑ سکا نہ صرف اس لیے کہ شیخینؓ کی شخصیتیں بڑی زبردست تھیں بلکہ اس لیے بھی کہ جس قسم کا عدل و انصاف انھوں نے قائم کیا، جاہلی عصبیت کو دبانے میں جو کوششیں اُنھوں نے کیں اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو مناصب عالیہ سے دُور رکھنے میں جو احتیاط اُنھوں نے برتی اور اخوت و مساوات کا حقیقی نمونہ پیش کرنے میں جس بالغ نظری کا ثبوت انھوں نے دیا اس نے لوگوں کے دلوں میں ان کی انتہائی قدر و منزلت پیدا کر دی۔ مزید بر آں ان کے عہدِ خلافت میں جنگ آزمائیوں اور فتوحات کا سلسلہ کچھ اس طرح جاری رہا کہ کسی کو خلافت کے مسئلہ پر سوچنے اور غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر عصبیت نے پھر زور پکڑ لیا۔ زمانۂ جاہلیت میں عداوت کی جو آگ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان بھڑک رہی تھی اور جسے اسلام کی بارانِ رحمت نے ٹھنڈا کر دیا تھا، وہ پھر لَو دینے لگی اور فتنہ و فساد دوبارہ سر اٹھانے لگا۔ حضرت علیؓ کے حامی کہتے تھے:

"ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علیؓ ہیں۔ وُہ شخص کتنا ظالم ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو جائز نہیں سمجھتا اور اس طرح آپ پر حملہ کرتا ہے۔"

جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے اور زمامِ خلافت حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی تو ان لوگوں کا مقصد پُورا ہو گیا جو خلافت کو صرف اہلِ بیت کا حق سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اُموی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام رکھتے تھے کہ اُنھوں نے حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے میں کوتاہی کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عثمانؓ بیچارگی کے عالم میں شہید کر دیے گئے اُمویوں کی تائید بعض صحابہؓ نے بھی کی۔ چنانچہ شام کے والی حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ نے حضرت علیؓ کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے پاس قوت و طاقت زیادہ تھی اور ان کے لشکر میں اتحاد و اتفاق بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کو یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت معاویہؓ پر فتح نہ پا سکے۔

شیعہ حضرات کے دعویٰ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں کوئی نصِ صریح اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح ارشاد موجود نہیں اسی لیے انصار نے دعویٰ کیا کہ خلافت ان کا حق ہے۔ مہاجرین نے کہا خلافت کے وہی مستحق ہیں، اور حضرت علیؓ کے حامیوں نے کہا کہ سوائے حضرت علیؓ کے اور کوئی بھی خلافت کا حقدار نہیں۔ اگر خلافت کے متعلق کوئی نصِ صریح ہوتی تو کسی گروہ اور کسی شخص کو ضرورت نہ تھی کہ وہ اس پر اپنا حق جتاتا اور اس بارہ میں دلائل دے کر دوسرے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا۔

تاریخ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تھوڑی مدت کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت ابوبکر

صدیقؓ کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کی بھی بیعت کر لی اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب خلافت حضرت عثمانؓ کے حصہ میں آئی تو حضرت علیؓ نے اس وقت ان کی بھی بیعت کر لی۔ اگرچہ یہ بات ضرور ہے کہ حضرت عثمانؓ کی بیعت اُنھوں نے ناراضی کی حالت میں کی[1]

جب حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو ان لوگوں کو بہت تقویت پہنچی جو خلافت کو اہل بیت کے بے منصوص کرتے تھے۔ وہ کہنے لگے:

"امامت ایسی چیز نہیں جسے عام مصلحت کے خیال سے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ جسے وُہ چاہے خلیفہ بنا دے بلکہ خلافت دین کا ایک رکن اور اسلام کا ایک ستون ہے۔ کسی نبی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ خلافت کے بارہ میں کوتاہی سے کام لے اور اس کا حل اُمت کے سپرد کر دے بلکہ اس کے لیے کسی امام کا تعین ضروری اور لازمی ہے۔"

امام کے متعلق ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ امام چھوٹے بڑے سب گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت اور خلافت کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو متعین کیا تھا۔ اس بارہ میں وہ کئی حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جنھیں اہل سنت نہیں مانتے یا اگر مانتے ہیں تو ان کی تاویل کرتے ہیں۔ اس دعویٰ کے ساتھ ہی وصیت کا نظریہ بھی پیدا ہو گیا اور اُنھوں نے حضرت علیؓ کا لقب "وصی" رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کی وصیت کی تھی، اس لیے وہ رسول اللہ کے وصی ہیں۔

آگے چل کر شیعہ حضرات بھی مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے، جن میں سب سے زیادہ معتدل امامیہ ہیں۔ امامیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ اماموں کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی موجودگی میں خلیفہ بنتے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ ان دونوں کی خلافت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے۔ وہ کہتے ہیں:

"چونکہ حضرت علیؓ خود شیخینؓ کی امامت پر راضی ہو گئے تھے۔ آپ نے ان کی بیعت کر لی تھی اور ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اس لیے ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اُن کو بُرا بھلا کہیں۔ اور جو کچھ حضرت علیؓ نے کیا اس سے تجاوز کریں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید جو ایک اعتدال پسند شیعہ ہے، لکھتا ہے:

---

[1] بیعت ایک مذہبی معاہدہ ہے اور مذہب میں جبر یا سختی یا ناراضی کی کوئی گنجایش نہیں۔ یہاں تو یہ ہے کہ من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ اپنی مرضی اور خوشی کی بات ہے۔ لا اکراہ فی الدین کے زرین اصول کے مطابق حضرت علیؓ جیسا فاضل عالم اور بہادر انسان کس طرح کسی ایسے شخص کی بیعت کر سکتا تھا جس سے وہ ناخوش اور ناراض ہو۔ تاریخ میں جس قدر روایتیں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کی باہمی ناراضی کے متعلق ملتی ہیں ساری کی ساری ناقابلِ اعتماد، قطعاً غلط اور فرضی ہیں۔ ان کی نہ کوئی اصل ہے نہ سند۔ (مترجم)

"یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے جب معاویہؓ سے برأت کا اظہار کیا تو ہم نے بھی ان سے برأت کا اظہار کیا ۔ جب حضرت علیؓ نے یہ کہا کہ اہل شام، عمروؓ بن العاص اور دوسرے صحابہ جنھوں نے معاویہؓ کا ساتھ دیا ہے غلطی پر ہیں تو ہم نے بھی ان پر ویسا ہی حکم لگا دیا ۔ حاصل یہ کہ ہم حضرت علیؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں سوائے مرتبۂ نبوت کے اور کسی چیز میں فرق نہیں کرتے ۔ نبوت کے علاوہ ہم ان دونوں میں تمام باتیں مشترک مانتے ہیں، اس کے علاوہ ہم اکابر صحابہؓ کو بھی برا بھلا نہیں کہتے بلکہ حضرت علیؓ نے ان سے جس قسم کا معاملہ کیا ہم بھی ان سے اسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں ۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ شیعہ اصحاب کے نظریات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ صرف حضرت علیؓ خلافت اور امامت کے حقدار تھے اور یہ کہ امام کی اطاعت ایمان کا ایک حصہ ہے ۔ امام عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک مافوق البشر ہستی ہے جو ہر قسم کے گناہوں اور خطا سے پاک ہوتی ہے ۔

خلافت کے بارہ میں شیعوں کے نظریہ کو ہم نے اس فصل میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس لیے بیان کر دیا ہے کہ یہی نظریہ ان حوادث و واقعات کا باعث بنا جو آگے چل کر پیش آئے ۔

(۳)

انصار اور خلافت

خلافت کے بارہ میں فرانسیسی مستشرق لامنس کا جدید نظریہ

بعض مستشرقین، جن میں فرانسیسی مستشرق "لامنس" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے اس نظریہ کے حامی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت ایک خاص گروہ کی کوشش کی مرہون ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد پیدا ہو گیا یہ گروہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہ عامرؓ بن الجراح پر مشتمل تھا ۔ لامنس اپنے نظریہ کی تائید میں بعض واقعات بھی پیش کرتا ہے ۔

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ان تینوں حضرات کے باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے اسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا، اور اگر ابو عبیدہؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انتقال نہ کر جاتے تو حضرت عمرؓ اپنے بعد انہی کو خلیفہ نامزد کرتے، اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب کے موقعہ پر ان تینوں میں اس قسم کا سمجھوتہ ہو چکا تھا۔[۱]

اس نظریہ میں اگر کچھ صداقت ہے تو بس اتنی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب اس طرح اچانک ہوا کہ پہلے سے کسی کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا ۔ اور اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ کہیں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو جائے اور مسلمان مختلف گروہوں

---

[۱] لامنس کا یہ نظریہ محض فرضی ہے ۔ ہرگز اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ان تینوں نفوسِ مقدسہ میں یہ معاہدہ ہوا تھا۔ ہذا بہتانٌ عظیم ۔ (مترجم)

میں نہ بٹ جائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت کی خواہش سے کوسوں دُور تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ یا حضرت ابوعبیدہؓ میں سے کسی کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ وہ ضعیف العمر انسان تھے اور ان کا خیال تھا کہ خلافت کا بار بُوڑھا شخص نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے لیے عمرؓ یا ابوعبیدہؓ جیسے مضبوط انسان کی ضرورت ہے لیکن مسلمانوں میں سے کسی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سوا اور کسی کی خلافت کو پسند نہ کیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں ان کا جو مقام تھا، اور اسلام میں انھیں جو فضیلت حاصل تھی، اس کے ہوتے ہوئے مسلمان خلافتِ رسولؐ کے لیے کسی اور کو ہرگز منتخب نہ کر سکتے تھے۔

حصولِ خلافت کے لیے انصار کی جدوجہد

انصار دو گروہوں میں منقسم تھے، اوس اور خزرج۔ یہ دونوں گروہ جاہلیت کے زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے۔ خزرج تعداد میں زیادہ تھے۔ زمانۂ اسلام میں ان کے رئیس سعدؓ بن عبادہ تھے جو بنی ساعدہ میں سے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ انہی کے گھر کے قریب تھا۔

جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہُوئی تو انصار سقیفہ میں جمع ہو کر اس سانحۂ عظیمہ کے متعلق بات چیت اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگے کہ رسولؐ اللہ کے بعد کون خلیفہ ہو۔ ان کی خواہش تھی کہ خلافت انہی میں سے کسی کو حاصل ہو۔ اس لیے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کی تھی۔ آپؐ کا ہر طرح ساتھ دیا تھا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے حضورؐ کی معیت میں تمام عرب کو اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے۔

سعدؓ بن عبادہ اس وقت بیمار تھے۔ کچھ لوگ انھیں سقیفہ میں لے آئے۔ لیکن وہ اس قدر کمزور تھے کہ ان کی آواز لوگوں کو سُنائی نہ دیتی تھی۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے بیٹے قیس بلند آواز سے لوگوں کو سُنا دیتے تھے۔ سعدؓ بن عبادہ نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے گروہِ انصار! تمھیں دین میں وہ سبقت اور اسلام میں وہ فضیلت حاصل ہے جو عرب کے کسی قبیلہ کو حاصل نہیں۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چند سال اپنی قوم میں رہے اور اسے توحید کی طرف بُلاتے اور شرک اور بُت پرستی سے روکتے رہے۔ لیکن باستثنائے چند کسی نے آپؐ کی دعوت قبول نہ کی۔ اور جو لوگ ایمان لائے، ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ کفار کے دستِ تعدّی سے آپ کو دُور رکھ سکتے یا دین کو کوئی تقویت پہنچا سکتے یا خود ان مصائب و شدائد سے بچ سکتے، جو مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں انھیں پیش آ رہے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تمھیں فضیلت دینے اور اپنی نعمت سے بہرہ ور کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے تمھیں ایمان لانے، رسول اللہ کی دعوت قبول کرنے، آپؐ کا اور آپؐ کے حلقہ بگوشوں کا ساتھ دینے اور دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے کی توفیق عطا کی، اور تم اپنے دشمنوں پر ہمیشہ غالب رہے۔ عرب کو طوعاً و کرہاً اسلام قبول کرنا پڑا، تمھاری تلواروں نے سارے عرب کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع بنا دیا۔ حضورؐ اپنی وفات کے وقت تم سے بے حد خوش تھے اس لیے اب تم خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہو جاؤ، کیونکہ یہ تمھارا حق ہے۔"

تمام حاضرین مجلس نے سعدؓ کی تقریر کا متفقہ طور پر یہ جواب دیا:

"اگر آپ کی بھی رائے ہے تو ہم اس سے اختلاف نہیں کرتے اور خلافت کے لیے آپ ہی کا نام پیش کرتے ہیں کیونکہ آپ ہم میں سب سے زیادہ بزرگ ہیں۔"

بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس نے طول کھینچا اور یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ اگر مہاجرین قریش نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا اور کہا کہ ہم مہاجرین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہؓ میں سے ہیں۔ آپ کے اہلِ خاندان ہیں تو پھر کیا ہوگا اور اس وقت انصار کس برتے پر ان کا مقابلہ کریں گے؟

اس پر چند اشخاص کہنے لگے کہ اگر یہ صورت ہوئی تو پھر ہم ان سے کہیں گے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو جائے اور ایک امیر تم میں سے۔ اس کے بغیر ہم کسی اور بات پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔

جب سعدؓ نے ان کی یہ باتیں سنیں تو کہا:

"تم نے تو شروع ہی میں کمزوری دکھادی۔"

انصار کے دلائل کا تجزیہ

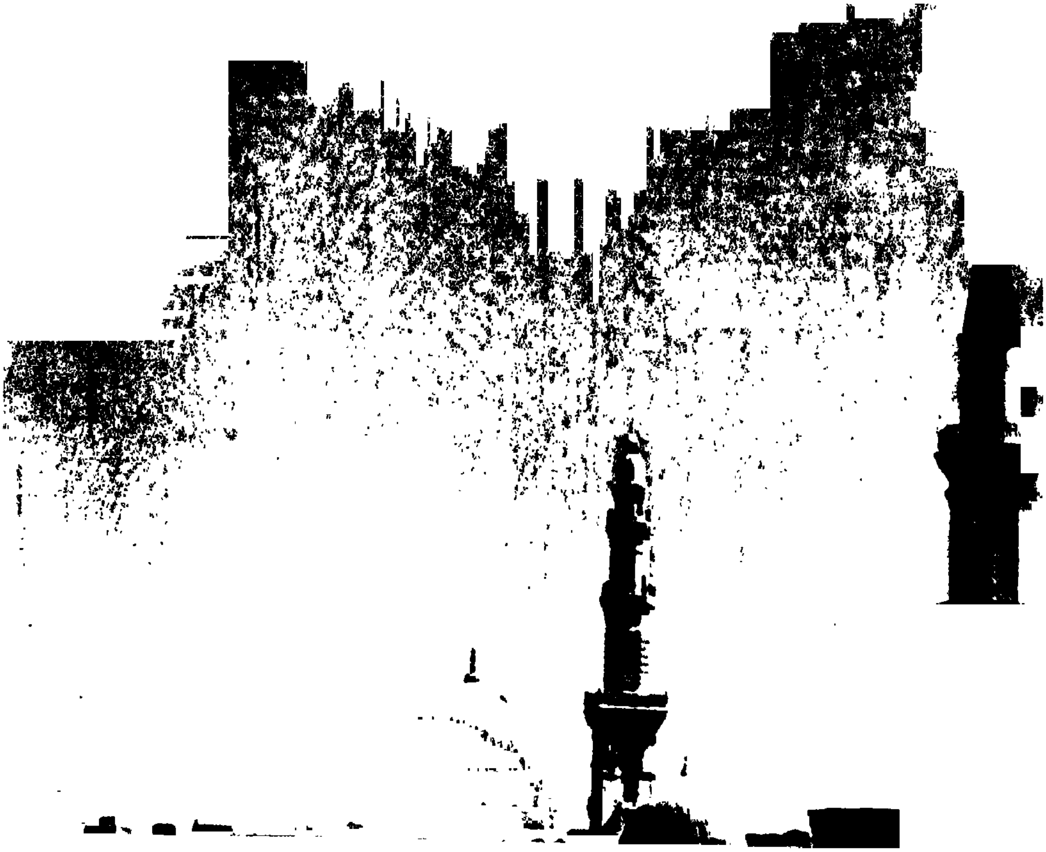
انصار کے مندرجہ بالا دلائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خلافت کے لیے ان کے پاس صرف یہ دلیل تھی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی قوم نے ایذائیں پہنچائیں اور آپؐ کے اہلِ وطن نے آپ کو گھر سے نکال دیا تو انھوں نے آپ کو پناہ دی اور ہر موقعہ پر آپؐ کی مدد کی۔ لیکن محض اسی دلیل کی بنا پر قبائلِ عرب ان کی سیادت اور حکومت پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہی چیز تھی جس کی وجہ سے انصار طبعاً اپنے تئیں کمزور محسوس کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خلافت کے بارہ میں ہرگز تساہل نہ کرتے اور کبھی یہ نہ کہتے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو جائے اور ایک مہاجرین میں سے۔ ان کے رئیس سعدؓ بن عبادہ نے بھی شروع میں ہی اس امر کو محسوس کر لیا تھا اور اسی بنا پر انھوں نے یہ فقرہ کہا تھا:

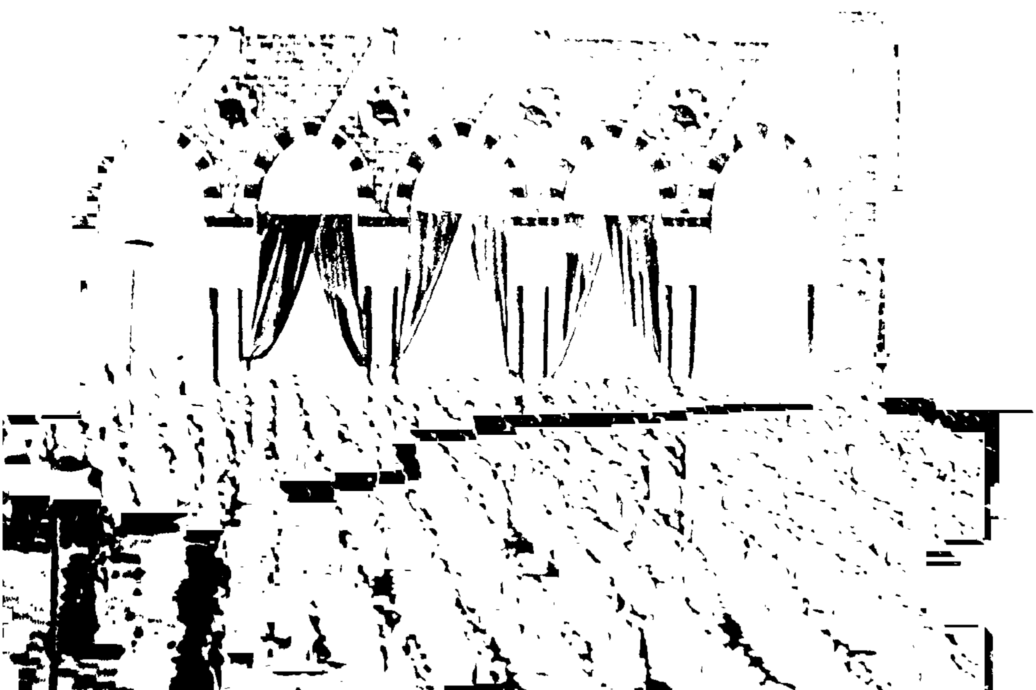
"تم نے تو شروع ہی میں کمزوری دکھادی۔"

یہ ہو بھی کس طرح سکتا تھا کہ ایک جدید مملکت کے دو امیر ہوں اس سے تو ہمیشہ کے لیے فساد کی ایک راہ کھل جاتی اور مملکتِ اسلامیہ کو کسی صورت میں بھی چین نصیب نہ ہوتا۔

انصار کی باہمی گروہ بندی

پھر جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے انصار دو گروہوں میں منقسم تھے: پہلا گروہ خزرج کا تھا اور دوسرا اوس کا۔ خزرج تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کے رئیس سعدؓ بن عبادہ تھے جو چاہتے تھے کہ خزرج کو خلافت مل جائے۔ لیکن اوس، خزرج کے کسی آدمی کو اپنا امیر بنانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائیوں اور جھگڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ اسلام نے آکر یہ لڑائیاں اور جھگڑے ختم کرا دیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باہم شیر و شکر کر دیا۔ لیکن جاہلیت کے دنوں کی یاد دونوں فریقوں کے دلوں میں باقی تھی جس کو خزرج اور اوس دونوں جانتے تھے۔ اسی لیے





مسجد نبوی کا بیرونی منظر

جب سعدؓ بن عبادہ نے ذکر چھیڑا کہ خلافت انصار کا حق ہے تو اسی باہمی اختلاف کی بنا پر ان کو انصار کی کامیابی پر کامل یقین نہ تھا اور وہ متردد تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد انصار، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر رضامند ہو گئے اور انھوں نے آپ کی بیعت کر لی۔

(۴)

اصحابِ ثلاثہ

خلافت کے بارہ میں لامنس اور دیگر مستشرقین کے نظریے کی تردید

مشہور عیسائی مستشرق لامنس اور اس کی تقلید میں بعض دوسرے مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح تینوں نے مل کر اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ جب ایک شخص کو خلافت مل جائے تو وہ اسے اپنے انتقال کے وقت دوسرے کے نام منتقل کر دے اور جب دوسرے شخص کا وقت آجائے تو تیسرے کے حق میں وصیت کر جائے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ بن خطاب کو زخمی کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا:

"اگر آج ابوعبیدہؓ زندہ ہوتے تو خلافت میں ان کے سپرد کر دیتا"

لیکن جب اس نظریہ کو واقعات اور تاریخ کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو اس کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اتنی اچانک ہوئی تھی کہ صحابہؓ کو خلافت کے بارہ میں پہلے سے سوچنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا تھا۔ جب حضورؐ نے وفات پائی اور خلافت کا سوال پیدا ہوا تو حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کیا تاکہ فتنہ نہ پھیلے اور مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ ہو جائے۔

انصارؓ کا سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع

پچھلی فصل میں بتایا جا چکا ہے کہ انصارؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کے بارہ میں فیصلہ کرنا چاہا۔ انصار کے اس اجتماع کی خبر سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو ہوئی۔ وہ فوراً مسجد نبویؐ میں پہنچے اور حضرت ابوبکرؓ کو بلایا۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ جب وہ باہر آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا:

"آپ ذرا میرے ساتھ چلیں"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوں، آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں؟"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"لیکن واقعہ ایسا پیش آ گیا ہے کہ آپ کا میرے ساتھ چلنا بے حد ضروری ہے۔"

جب حضرت ابوبکرؓ مسجد نبوی سے باہر نکلے تو حضرت عمرؓ نے آپ سے کہا:

"آپ کو کچھ پتا بھی ہے انصارؓ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور چاہتے ہیں کہ خلافت سعدؓ بن عبادہ کے سپرد کر دی جائے۔ بعض لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہونا چاہیے اور ایک قریش میں سے۔"

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچنا

حضرت صدیقؓ یہ خبر سن کر بہت مضطرب ہوئے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چلے راستہ میں حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح مل گئے اور وُہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ آگے چل کر ان تینوں کو ابن عدیؓ اور عویم بن ساعدہؓ ملے اور ان سے کہا:

"آپ حضرات لوٹ جائیے۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں وُہ نہیں ہوگا۔"

لیکن انھوں نے ان کی بات پر کان نہ دھرا اور سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ گئے۔ حضرت عمرؓ نے انصار سے مخاطب ہونا چاہا وہ اپنی تقریر شروع کرنی ہی چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا:

"ذرا ٹھہر جاؤ، میں ان سے کچھ کہہ لوں، اس کے بعد جو تمھارا جی چاہے کہہ لینا۔"

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تقریر شروع کی اور جو کچھ حضرت عمرؓ کہنا چاہتے تھے وہ سب کہہ دیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

حضرت ابُوبکرؓ کی تقریر

"اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مخلوق کی طرف رسول اور اپنی اُمت کے لیے گواہ بنا کر بھیجا تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اسی کو اپنا معبود سمجھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مختلف فرضی معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ معبود ہماری شفاعت کریں گے، ہمیں فائدہ پہنچائیں گے۔ لیکن ان کی حقیقت گھڑے ہوئے پتھروں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے:

ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھٰؤلاء شفعآؤنا عند اللہ وقالوا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ [1]

جب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے تو عربوں کو اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑنا بڑا دوبھر معلوم ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے خدا تعالیٰ نے اوّلین مہاجرین کو آپ کی تصدیق

---

[1] اور اللہ کے سوا ان کو پُوجتے ہیں جو اپنے پُوجنے والوں کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع۔ اور کہتے ہیں کہ یہ بت اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں اور یہ کہ ہم تو ان کی پُوجا صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کر دیں۔

کرنے، آپ پر ایمان لانے، آپ کی تکالیف دُور کرنے اور آپ کے ساتھ آپ کی قوم کے شدید مظالم سہنے کی توفیق بخشی۔ ساری قوم ان کی مخالف تھی اور اس نے متفقہ طور پر ان غریبوں پر ظلم و ستم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن یہ لوگ اپنی قلتِ تعداد کے باوجود کبھی ہراساں نہ ہوئے۔ یہی تھے جنھوں نے زمین میں سب سے پہلے خدا تعالیٰ کی عبادت کی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ یہی آپؐ کے مددگار تھے، آپؐ کے اہلِ قبیلہ تھے۔ اور اب یہی لوگ آپؐ کے بعد سب سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ اس بارہ میں ان سے ظالم شخص ہی جھگڑ سکتا ہے۔ اے گروہِ انصارؓ! تم بھی مہاجرینؓ کی دین میں فضیلت اور اسلام قبول کرنے میں ان کی اوّلیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ تمھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسولؐ کا مددگار بنایا۔ اس کے رسولؐ نے تمھاری طرف ہجرت کی۔ آپؐ کی کئی ازواجِ مطہراتؓ اور کئی بڑے بڑے صحابہؓ تمھیں میں سے تھے۔ اس لیے اوّلین مہاجرینؓ کے بعد کوئی شخص تمھارے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ پس ہم امیر ہیں اور تم ہمارے وزیر۔ تمھارے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت عمرؓ اور حضرت حبابؓ بن منذر کا جھگڑا

حضرت ابو بکرؓ یہیں تک پہنچے تھے کہ حبابؓ بن منذر بن جموح کھڑے ہوئے اور انھوں نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے گروہِ انصار! خلافت کو اپنے ہاتھ میں رکھو۔ لوگ تمھارے ہی سائے تلے ہیں۔ کوئی شخص تمھاری مخالفت کی جرأت نہیں کرے گا۔ اور لوگ تمھاری ہی رائے پر چلیں گے۔ تم عزت، و ثروت والے ہو، تعداد اور تجربہ کے لحاظ سے دوسروں پر فوقیت رکھتے ہو، صاحبِ عزم و ہمت اور بہادر ہو۔ سب کی نظریں تمھاری طرف ہیں۔ اس لیے آپس میں اختلاف پیدا نہ ہونے دو۔ اس سے تمھاری رائے کی وقعت جاتی رہے گی۔ باقی رہا مہاجرینؓ کا مسئلہ، تو یہ اس طرح طے ہو سکتا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر ان میں سے۔"

اب حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آپ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے:

"ایک میان میں دو تلواریں کبھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ خدا کی قسم! عرب کبھی تمھیں امیر بنانے پر راضی نہ ہوں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے نہیں تھے۔ عرب اسی کی اطاعت کریں گے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے ہوگا۔ اس لیے ہمیں دوسروں پر ترجیح حاصل ہے۔ ہم ہی خلافت اور امارت کے حقدار ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اور آپؐ کے ہم قوم ہیں۔ ہماری مخالفت وہی شخص کر سکتا ہے جو باطل پر ہو اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنا چاہتا ہو۔"

جب حضرت عمرؓ اپنی تقریر ختم کر چکے تو حبابؓ بن منذر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے :

"اے گروہ انصار! تم اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قایم رہو اور ان لوگوں کی بات سُنو۔ اگر یہ تمہاری نہیں مانتے تو ان کو یہاں سے جلا وطن کر دو۔ اللہ کی قسم تم ان لوگوں کی نسبت خلافت کے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری تلواروں سے اسلام کو وہ کچھ حاصل ہوا جو اوروں کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکا۔ تم نے ہی اس کی حفاظت کی اور تمہاری وجہ سے ہی اسلام کا درخت پھلا پھولا۔"

اس پر حضرت عمرؓ اور حبابؓ میں کچھ تلخ کلامی ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو عبیدہؓ اُٹھے اور کہنے لگے :

"اے گروہِ انصارؓ! تم ہی وہ لوگ ہو جو سب سے پہلے اسلام کی مدد کو آئے۔ اب تم ہی اس میں سب سے پہلے تفرقہ ڈالنے والے نہ بنو۔"

حضرت ابو بکرؓ نے اس موقعہ پر جو تقریر فرمائی وہ اخلاص، سوز و گداز اور تقویٰ سے لبریز تھی۔ آپ نے صرف مہاجرینؓ کی فضیلت ہی کا ذکر نہیں کیا بلکہ انصار کی بزرگی بھی تسلیم کی۔ آپ نے ان کے متعلق تعریفی کلمات کہے اور ان کو بتلایا کہ خلافت کے حقدار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے ایمان لانے والے اور آپؐ کے اہلِ قوم ہی ہو سکتے ہیں۔ انصارؓ نے بھی چونکہ اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں سرانجام دی ہیں اس لیے ان کا حق ہے کہ وہ وزیر بنیں۔ لیکن جب حبابؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اس معاملہ کا تصفیہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے۔ تو حضرت عمرؓ کو بہت غصہ آیا اور آپؓ نے فرمایا کہ :

"عرب انصار کی امارت پر کبھی راضی نہ ہوں گے، اور جو شخص اوّلین مہاجرینؓ کی مخالفت کرتا ہے وہ باطل پر ہے اور اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں گرانے والا ہے۔"

حبابؓ نے اس کا بہت سخت جواب دیا اور اپنی قوم سے کہا کہ وہ مہاجرینؓ کو مدینہ سے نکال باہر کریں۔ اس پر تکرار شروع ہو گئی۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے چاہا کہ اس جوش و خروش کو ٹھنڈا کیا جائے۔ آپ نے انصارؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"تم نے اسلام کی سب سے پہلے مدد کی ہے اب تم ہی اس میں سب سے پہلے تفرقہ ڈالنے والے نہ بنو۔"

بشیرؓ بن سعد مہاجرین کی حمایت پر

اس مرحلہ پر اوس نے معاملہ میں دخل دیا۔ جاہلیت میں ان کے اور خزرج کے درمیان عداوت تھی اور کئی بار خونریز لڑائیاں بھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے اوس نہیں چاہتے تھے کہ خزرج کو خلافت مل جائے۔ چنانچہ ان کے ایک رئیس بشیرؓ بن سعد بولے :

"اے گروہِ انصارؓ! خدا کی قسم ہمیں مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے اور اللہ پر ایمان لانے میں پہل کرنے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہم نے اپنے رب کی رضا اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کے لیے کیا تھا ہمیں یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کے بدلہ دنیوی شان و شوکت اور جاہ و جلال طلب کریں۔

اللہ تعالیٰ ہی ہمیں اس کی جزا دینے والا ہے۔ بیشک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں سے تھے اور آپؐ کی قوم ہی خلافت کی سب سے زیادہ حقدار ہے خدا نہ کرے کہ میں ان سے اس معاملہ میں کبھی جھگڑوں۔ تم بھی ان کی مخالفت اور ان سے لڑائی جھگڑا نہ کرو۔"

حضرت ابو بکرؓ صدیق کی بیعت

بشیرؓ بن سعد کے ان الفاظ سے انصار کے قبیلہ اوس کا موقف واضح ہو گیا۔ جنھوں نے اپنے قبیلہ کے ایک رئیس کے ذریعہ اس بات کا اعلان کر دیا کہ وہ خلافت کے بارہ میں مہاجرین اولین سے کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"تمھارے سامنے عمرؓ اور ابوعبیدہ موجود ہیں، ان دونوں میں سے جس کی چاہو بیعت کر لو۔"

اس پر ان دونوں نے کہا:

"ہرگز نہیں، خلافت کا آپ سے زیادہ حقدار کوئی نہیں۔ آپ مہاجرینؓ میں سب سے افضل ہیں۔ غارِ ثور میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی رہے ہیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ سے زیادہ اور کس کا حق ہو سکتا ہے؟ اپنا ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔"

حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ بشیرؓ بن سعد جلدی سے آگے بڑھے اور سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی۔

جب اوس نے دیکھا کہ بشیرؓ بن سعد نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی اور یہ بھی دیکھا کہ خزرج سعدؓ بن عبادہ کو امیر بنانا چاہتے ہیں تو آپس میں کہنے لگے کہ اگر تم پر خزرج کو ایک بار بھی حاکم بنا دیا گیا تو یہ فضیلت ہمیشہ ان ہی کے پاس رہے گی اور تمھیں کبھی اس سے حصہ نہ ملے گا۔ اُٹھو اور ابو بکرؓ کی بیعت کر لو۔

چنانچہ اوس نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر لی۔ اب تو بیعت کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں جلدی سے آگے بڑھ کر بیعت کروں۔ لوگوں کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ انھیں خزرج کے بیمار رئیس سعدؓ بن عبادہ کا بھی دھیان نہ رہا اور وہ ان کو کچلتے ہوئے بیعت کے لیے آگے بڑھنے لگے۔

چونکہ حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کے افراد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ اس لیے نہ تو وہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جا سکے اور نہ اس وقت حضرت ابو بکرؓ کی بیعت ہی کر سکے۔ سعدؓ بن عبادہ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی وفات اسی حالت میں ہوئی۔

(۵)

اسلام کا پہلا خلیفہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت نرم دل اور نیک خُو تھے۔ محبت اور شفقت گویا آپؓ کی فطرت تھی۔ آپ ایمان و یقین کا مجسمہ تھے۔ عزم و ہمت اور قول و عمل میں پختگی آپ کی ہر حرکت سے ہویدا تھی۔ اولوالعزمی اور مستقل مزاجی، راستبازی اور نیک خصالی میں کوئی آپ کا نظیر نہ تھا۔ آپ بنی تیم بن مرہ سے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب مرہ بن کعب بن لوئی پر پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی والدہ ام الخیر بنت سلمٰی بنت صخر بن عامر بھی بنی تیم میں سے تھیں۔ آپؓ عام الفیل سے دو سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے آپ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے۔ آپؓ خاصے امیر تھے۔ لیکن تجارت کے ذریعہ جو کماتے تھے اسے مسکینوں، محتاجوں، غریبوں، مسافروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ قریش آپ کی بے حد عزت کرتے تھے۔ چونکہ آپ میں سخاوت کا مادہ بیحد تھا۔ اس لیے کثرت سے لوگوں کی دیتیں اور خون بہا ادا کیا کرتے تھے۔ آپ کو عربوں، خصوصاً قریش کا حسب نسب بیان کرنے میں بیحد مہارت حاصل تھی۔ عرب کی تاریخ آپ کو ازبر تھی۔ ہر قوم کے مفاخر و مثالب سے آپ پوری طرح آگاہ تھے۔ جاہلیت اور اسلام میں آپ کا مشغلہ تجارت تھا۔ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کا راس المال چالیس ہزار درہم تک پہنچ گیا آپؓ نے اس میں سے پینتیس ہزار درہم اللہ کی راہ میں دے دیے۔ آپ ان غلاموں کو اکثر خرید لیا کرتے تھے جو قبولِ اسلام کی پاداش میں اپنے آقاؤں کے ہدفِ ستم ہوتے اور جس غلام کو خریدتے اس کو راہِ خدا میں آزاد کر دیتے۔ حضرت بلالؓ بھی انہی غلاموں میں سے ایک تھے جنھیں آپ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کو قبول کیا اور اس کے نتیجہ میں کفار کے مظالم کا نشانہ بنے۔

غور کیا جائے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اخلاص اور وفا کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہی۔ اس وقت آپ باعتبارِ وجاہت قریش میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ ہر فرد بشر آپ کی عزت کرتا تھا۔ آپ مالدار اور آسودہ حال تھے۔ آپ کی شہرت دُور دُور تک پہنچی ہوئی تھی۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ پیغمبروں کی جماعت میں سب سے پہلے وہ لوگ داخل ہوتے ہیں جو اپنی کمزوری اور مفلسی کی بنا پر اپنی قوم میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ جو لوگ مالدار ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو نہایت شریف اور معزز سمجھتے ہیں وہ بالعموم شروع میں نبی کی بات پر کان دھرنا یا اسے قبول کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی قوم میں مال و دولت کے لحاظ سے بلند اور وجاہت و عزت کے اعتبار سے بے مثل انسان تھے، تاہم آپ نے کسی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی قوم کے مذہب اور اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کو یک قلم ترک کر دیا اور وہ دین اختیار کر لیا جس میں آپ جیسے مالدار اور وجیہہ انسان اور ایک بے بس غلام میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جاتا تھا اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاتی تھی۔ دراصل یہی وہ قربانی اور یہی وہ اخلاص کا جذبہ تھا

جس کی مثال صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں بھی ملنی ناممکن ہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"سوائے ابوبکرؓ کے اور کوئی نہیں جس کو میں نے اسلام کی دعوت دی ہو اور اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے قبول کر لیا ہو۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبولِ اسلام کی بنا پر قریش کے ہاتھوں بے پناہ تکالیف اٹھائیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ مکہ تک چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ آپ ہجرت کے ارادہ سے جا رہے تھے کہ راستہ میں آپ کو قریش کا ایک رئیس ابن دغنہ ملا اور پوچھا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

جب اسے حقیقتِ حال کا پتا چلا تو اس نے کہا:

"آپ جیسا شخص کسی صورت میں بھی مکہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور ناداروں کی مدد کرتے ہیں، میں آپ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں، کسی شخص کی مجال نہیں ہے کہ وہ آپ کو آنکھ بھر کے دیکھ سکے۔"

چنانچہ وہ آپ کو مکہ واپس لے آیا اور قریش نے اس شرط پر آپ کو مکہ میں رہنے کی اجازت دے دی کہ ابوبکرؓ لوگوں کے سامنے باآوازِ بلند نماز نہ پڑھا کریں۔ چنانچہ آپ نے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنالی اور وہاں نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگے۔ آپ انتہائی رقیق القلب تھے۔ خدا کے غضب کا خیال آتا تو زار و قطار رونے لگتے۔ جب کبھی آپ نماز یا قرآن پڑھتے، مشرکوں کی عورتیں اور بچے آپ کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر قریش کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں ان کی عورتیں اور بچے اسلام قبول نہ کرلیں۔ اُنھوں نے اس کی شکایت ابنِ دغنہ سے کی، اور اس نے آپ کی حمایت و پناہ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ آپؓ نے بالکل پروا نہ کی اور خدائے عزّوجلّ کی مدد اور حمایت پر بھروسا کرتے رہے۔ آخر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنے اور رفیقِ غار بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

ہم نے اس فصل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعض اخلاق و عادات کو بے حد مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کے فضائل ریت کے ذرّوں کی طرح بے حساب و شمار ہیں۔ اگلی فصلوں میں بھی ہم آپ کے فضائل پر بحث کریں گے لیکن حق یہی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی گرد کو بھی کوئی نہیں پا سکتا۔ آپ میں جو صفات پائی جاتی تھیں وہ ہر حاکم میں پائی جانی چاہئیں، ہر لیڈر اور سردار میں ان کا پرتو ہونا چاہیے۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے وقت جو خطبہ پڑھا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس خطبہ سے پتا چلتا ہے کہ اسلام کس طرح کا جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس خطبہ میں اسلام کے پہلے عظیم الشان خلیفہ نے بتلایا کہ ایک حاکم پر اپنی رعایا اور عوام کے کیا کیا حقوق ہوتے ہیں۔ آج تک جس قوم نے بھی ان اصولوں کو اپنایا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں بیان کیے ہیں، وہ قوم برابر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوتی چلی گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

"اے لوگو! مجھے تم پر حاکم بنا دیا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک رستے پر چلوں تو میری مدد کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں غلط رستے پر جا رہا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت! ہر ضعیف اور کمزور میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلوا دوں اور ہر طاقتور میرے نزدیک اس وقت تک ضعیف اور کمزور ہے جب تک میں اس سے مظلوم کا حق نہ لے لوں۔ تم میں سے کوئی جہاد کو ترک نہ کرے۔ کیونکہ جو قوم جہاد کو ترک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس قوم پر ذلت طاری کر دیتا ہے۔ جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ کے احکام کے خلاف جاؤں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ نماز کے لیے اٹھو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔۔۔۔"

اس خطبہ میں حضرت صدیق اکبرؓ نے لوگوں کے سامنے اپنی سیاست نہایت واضح طور پر بیان کر دی۔ آپ نے ان کو بتلایا کہ مسلمان، مسلمان سب برابر ہیں اور انھیں ایک دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ آپ نے خلیفہ اور مختارِ مطلق ہوتے ہوئے لوگوں سے مدد کی اپیل کی۔ آپ نے ان سے اقرار کیا کہ وہ ہر شخص کو اس کا حق دلائیں گے اور اس کے بدلے میں صرف یہ چاہا کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے خلاف نہ چلیں اس وقت تک ان کی اطاعت کی جائے۔ حریت افکار کی یہ مثال آج کل کی متمدن و مہذب دُنیا میں کہیں نہ ملے گی۔

خلفائے راشدینؓ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے خلیفہ تھے۔ خلافتِ راشدہ کا آغاز ہجرت کے بارھویں سال رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعتِ خلافت سے ہوا، اور ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت پر ختم ہوگیا۔ اس خلافت کا قیام دُوسری دُنیوی بادشاہتوں کی طرح نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد روحانیت اور تقویٰ پر تھی۔ اس میں چھوٹے بڑے، غریب امیر، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خلیفہ بازاروں میں بغیر کسی پہرہ کے اس حالت میں پھرتا تھا کہ اس کے بدن پر پھٹی ہوئی قمیص اور پاؤں میں ٹوٹا ہوا جوتا ہوتا تھا۔ جب وہ مجلس میں بیٹھتا تھا تو اس کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا کھانا عام لوگوں کی طرح نہایت سادہ ہوتا تھا۔ اس طرح خلفائے راشدینؓ نے لوگوں کے سامنے قربانی، اخلاص اور مساوات کی ایک مثال قائم کر دی۔ ایسی مثال جس کا نمونہ پیش کرنے سے زمانہ آج تک قاصر رہا ہے۔

حصّہ دوم ——— فتنہ ارتداد

(۱)

جزیرۂ عرب میں بغاوت

بعض بدوی قبائل میں اسلام سے ارتداد کا فتنہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے جزیرۂ عرب کے اطراف و جوانب کو

ہلا ڈالا اور اسلام کے ابتدائی دور ہی میں اس کے لیے زبردست خطرہ کا موجب بن گیا۔ اگر خدانخواستہ یہ فتنہ کامیاب ہو جاتا تو اسلام کی بنیادیں ہی اُکھڑ جاتیں اور دُنیا کے سامنے جاہلیت کا زمانہ پھر عود کر آتا۔

بعض قبائلِ عرب کا زکوٰۃ دینے سے انکار

صحرائی علاقوں خصوصاً نجد اور یمن میں اسلام کا اثر بعض بدووں پر بہت ہی کم تھا۔ وہ محض نام کے مسلمان تھے۔ دراصل انھیں اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وُہ صرف اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ جب ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے بعض ان فرائض کو ترک کر دینا چاہا جو اسلام نے ان پر عاید کیے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ وہ فرائض شاق گزرتے تھے جن کا تعلق مال سے تھا، مثلاً زکوٰۃ وغیرہ۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ زکوٰۃ دراصل ایک قسم کا جزیہ اور ٹیکس ہے جس کی ادائیگی کے لیے ان پر اسی طرح ظلم کیا جاتا ہے جس طرح ایک جابر بادشاہ ٹیکس لینے کے لیے اپنی رعایا کو نشانہ ستم بناتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ زکوٰۃ کوئی جزیہ یا تاوان نہیں بلکہ صدقہ ہے جو امیروں سے لے کر غریبوں کو دیا جاتا ہے۔ اور صرف انہی لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے فضل نے مال و دولت کی فراوانی سے نوازا رکھا ہو۔ اس کی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی شخص فقیر اور بھوکا ننگا نہ رہے اور غریب لوگ زندگی کی آسائشوں میں اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ یکساں حصہ گیر ہو سکیں۔ لیکن بدوی اس فرق کو نہ سمجھ سکے۔ اُنھوں نے سرکشی اور بغاوت پر کمر باندھ لی اور تہیہ کر لیا کہ وہ کسی صورت میں بھی زکوٰۃ ادا نہ کریں گے۔

جھوٹے نبیوں کا خروج

زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کے فتنہ کے ساتھ ساتھ ایک اور خوفناک فتنہ نے بھی سر اُٹھایا یعنی عرب میں نبوت کے کئی جھوٹے مدعی پیدا ہو گئے جنھوں نے کہنا شروع کیا کہ ہمارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ نبوت کا دعویٰ کرنے والے یہ لوگ تھے:

طلحہ اسدی، اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور سجاح تیمیہ

ان مدعیانِ نبوت کے قبائل ان کی حمایت میں کھڑے ہو گئے اور اس طرح سرزمینِ عرب میں ایک زبردست فتنہ پھوٹ پڑا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا عزم و ثبات

گو یہ وقت نازک ترین وقت تھا لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپ نے ان سب لوگوں سے مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا جنھوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر کے جزوی طور پر اسلام کو ترک کیا تھا، یا مختلف مدعیانِ نبوت کی فرماں برداری اور اطاعت اختیار کر کے کلیۃً اسلام سے رُوگرداں ہو گئے تھے۔

اسامہؓ کے لشکر کی شام کو روانگی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عزم و ہمت کے مالک اور صدق و صفا کے پیکر تھے۔ ایمان آپ کی رگ رگ میں رچا ہوا تھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جب آپ نے انتہائی نامساعد اور نہایت ہولناک حالات میں اسامہؓ بن زید کو

شام بھیجا تھا۔ بات یہ تھی کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضورؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ نے غزوۂ موتہ میں رومیوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا حضورؐ کو ان کی وفات کا بے حد رنج ہوا۔ اس جنگ میں قضاعہ کے قبائل نے جو شام کی سرحد پر آباد تھے رومیوں کی مدد کی تھی اور مسلمانوں کے لشکر کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت سے کچھ پہلے ایک لشکر اُسامہؓ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ان کے باپ کی شہادت کا انتقام لینے کے لیے تیار کیا اور اسے شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ شامل تھے۔ اسی دوران میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کی خبر سُن کر لشکر نے جو مدینہ سے روانہ ہو چکا تھا اپنی روانگی ملتوی کر دی اور مدینہ سے باہر ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت یابی کا انتظار کرنے لگا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور بدوی قبائل نے ارتداد اختیار کیا تو بعض صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ مناسب ہو گا اگر اسامہؓ کے لشکر کی روانگی فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ کیونکہ اس وقت انتہائی نازک صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے۔ دشمن کے حملہ کا خطرہ لحہ بہ لحہ بڑھ رہا ہے۔ اگر اس وقت اسامہؓ کا لشکر شام چلا گیا تو مدینہ بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو ماننے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

"نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ لشکر ضرور شام جائے گا، اس لیے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت کے دوران میں اس کو بھیجنے کی تاکید کی تھی۔ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کس طرح کر سکتا ہوں!"

جب اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کو ملتوی کرنے کا مشورہ سختی سے رد کر دیا گیا تو بعض لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے یہ عرض کیا کہ اسامہؓ کی عمر بہت کم ہے، کسی سن رسیدہ شخص کو اسامہؓ کی جگہ لشکر کا سردار مقرر کر دیا جائے۔ یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ صدیق کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اور آپ نے فرمایا:

"ابو قحافہ کے بیٹے (ابوبکر صدیقؓ) کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار بنایا ہو وہ اسے معزول کر دے!"

حضرت عمرؓ انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے اس بارہ میں زیادہ اصرار کر رہے تھے۔ جب ان کا اصرار بڑھتا چلا گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر اُن کی داڑھی پکڑ لی اور فرمایا:

"تمھاری ماں تمھیں روئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہؓ کو لشکر کی سرداری سونپی تھی اور تم کہتے ہو کہ میں اسے ہٹا دوں۔"

حضرت صدیقؓ نے اس موقعہ پر لشکر کے ان جذبات کو خوب اچھی طرح بھانپ لیا تھا جو اس کے اندر اکابر صحابہؓ اور قریش کے بڑے بڑے جہاندیدہ آدمیوں پر بست سالہ اسامہؓ کو سردار بنانے کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے، اور آپ نے لوگوں کے

دلوں سے جاہلیت کے ان اثرات کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا جن کے تحت وہ سن رسیدہ آدمیوں پر کسی نوجوان سالارِ لشکر کا تقرر برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس درخواست کو سختی سے رد کرکے اپنی بڑائی اور فضیلت کے جو اثرات ان کے دلوں میں جاگزیں تھے، انھیں محو کر دیا۔

حضرت عمرؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ مگر اس وقت اشد ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ مدینہ میں موجود رہیں تاکہ اس نازک وقت میں حضرت ابوبکرؓ کی مدد کر سکیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ہرگز یہ گوارا نہیں کیا کہ بغیر اسامہؓ کی اجازت کے انھیں بطور خود مدینہ میں ٹھہرا لیں۔ انھوں نے باقاعدہ اسامہؓ سے اس امر کی درخواست کی۔ اور جب اسامہؓ نے اجازت دے دی تو حضرت عمرؓ کو مدینہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے اس طرزِ عمل سے مسلمانوں کو دراصل یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ جس شخص کو کوئی عہدہ دیا جائے تو ضروری ہے کہ اس عہدہ کے اعتبار سے اس کا احترام کیا جائے اور اسے اس کے دائرۂ عمل میں آزاد رکھا جائے۔

جب لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت اُسامہؓ اور اس لشکر کو جو مدینے کے باہر کھڑا تھا، رخصت کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت اُسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ پیدل ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس پر اُسامہؓ نے کہا:

"یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں ورنہ میں خود گھوڑے سے اُترتا ہوں۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! نہ تم اُترو گے اور نہ میں سوار ہوں گا۔ کیا ہوا اگر میرے پاؤں اللہ کے رستے میں گرد آلود ہو گئے؟"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے سردار کی جتنی قدر و منزلت کی اس سے خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بلند مرتبے کا پتا چلتا ہے۔ اس طرح آپ نے اُمت کو کئی سبق دیے۔ آپ نے لوگوں کو بتانا چاہا کہ جو شخص امیر ہو اس کی عزت کرنی چاہیے، اس لیے آپ نے اسامہؓ کی مشایعت کے لیے پیدل چلنا گوارا فرمایا۔ آپ کی خواہش تھی کہ قیادت کو انتہائی مضبوط ہونا چاہیے۔ اس لیے آپ نے اُسامہؓ سے اس امر کی درخواست کی کہ حضرت عمرؓ کو مدینہ میں ہی رہنے دیا جائے، جس کی اسامہؓ نے اجازت دے دی۔

حضرت اُسامہؓ کوئی غیر معمولی نوجوان نہیں تھے آپ اس وقت بچپن کی منزلوں سے نکل کر جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تھے۔ اور آپ کا خلیفہ کے خاص مقربین یا بڑے بڑے بہادروں میں بھی شمار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی صدیق اکبرؓ نے چاہا کہ لشکر میں ان کی عزت و تکریم کی جائے اور ان کے ہر حکم پر لبیک کہا جائے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنی اور کرانی چاہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حضرت اسامہؓ کو مہاجرین اور انصار کے اکابر صحابہؓ پر سردار بنایا تھا۔ دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ لوگوں کو یہ بات جتلا دینا چاہتے تھے کہ بڑائی صرف

عمر پر منحصر نہیں ہوتی اور اسلام کسی قسم کی جاہلی عصبیت اور حسب و نسب میں فضیلت کا روادار نہیں۔

لشکر کی روانگی کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے مندرجہ ذیل نصیحتیں فرمائیں:

"میں تمھیں مندرجہ ذیل باتوں کی نصیحت کرتا ہوں ان کو یاد رکھنا اور ان کے خلاف ہرگز نہ کرنا۔ یعنی خیانت نہ کرنا، مال نہ چھپانا، عہد شکنی نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا (یعنی جنگ میں مقتولوں کے اعضاً مثلاً ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا) چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجوروں اور پھلدار درختوں کو نہ کاٹنا نہ جلانا، بھیڑوں بکریوں، گایوں اور اونٹوں کو کھانے کے سوا اور کسی غرض کے لیے ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے جو ترکِ دنیا کر کے گرجاؤں میں بیٹھے ہوں گے۔ ان سے تعرض نہ کرنا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تمھارا گزر ایسے لوگوں میں بھی ہو گا جو تمھارے پاس قسم قسم کے کھانے لائیں گے۔ جب تم ان کھانوں کو کھاؤ تو اللہ کا نام لے کر کھانا۔ پس خدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ، وہ تم کو دشمنوں کے نیزوں اور طاعون سے بچائے۔"

اُسامہؓ کے لشکر کی واپسی یکم ربیع الثانی ۱۱ھ کو اُسامہؓ کا لشکر مدینہ سے روانہ ہوا۔ شام کی حدود پر پہنچ کر اس نے قضاعہ کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا، اور مالِ غنیمت لے کر چالیس دن کے بعد فتح اور ظفر مندی کے ساتھ مدینہ واپس آگیا۔

یہ لشکر بھیجنا مسلمانوں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ جب مرتدین کو مدینہ سے اس لشکر کی روانگی کا حال معلوم ہوا تو وہ حیران و ششدر رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگر مسلمانوں کے پاس قوت و طاقت نہ ہوتی تو ایسے وقت میں وہ اپنے لشکر کو غسانیوں کے مقابلہ کے لیے ہرگز نہ بھیجتے۔

مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اسامہؓ کے لشکر کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ اس میں مہاجرینؓ اور انصارؓ کی تعداد ڈیڑھ اور دو ہزار کے درمیان تھی۔ باقی لشکر قریش کے قبائل پر مشتمل تھا۔ قریش کے ان قبائل نے اس جنگ میں بھی اور بعد کی جنگوں میں بھی بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور پرچمِ اسلام کو ہر موقعہ پر سربلند رکھا۔

(۲)

حضرتِ صدیقؓ کا عزمِ صمیم

اکثر صحابہؓ کا خیال تھا کہ ان مرتدین سے جنھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے نرمی کا سلوک کرنا چاہیے۔ ان قبائل کا کہنا تھا کہ ہم نماز پڑھنے کے لیے تیار ہیں مگر زکوٰۃ دینے کے لیے نہیں۔ صحابہؓ کہتے تھے کہ جس حد تک یہ لوگ ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں اس حد تک ان کا تعاون قبول کر لیا جائے اور کچھ دنوں کے لیے ان سے زکوٰۃ لینی بھی ملتوی کر دی جائے تاکہ اس مدت میں اسامہؓ کا لشکر واپس پہنچ جاتے اور مسلمان اس قابل ہو جائیں کہ ہر حملہ کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ لیکن حضرت صدیقؓ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس طرح دین کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچتا تھا۔ دین در اصل ایک پتھر

کی طرح ہے کہ اگر اس کا کوئی ایک کونہ بھی جھڑ جائے تو آخر کار پورا پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسلام تو ایسا دین ہے کہ خواہ ابوبکرؓ ہوں یا کوئی اور اس کے تشریعی عقاید میں سرِمُو بھی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ کوئی شخص خدائی احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں کمی بیشی کا مجاز نہیں۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بارہ میں جو موقف اختیار کیا وہ آپ کے آہنی عزم پر دلالت کرتا ہے۔ آپ نے مرتدین کے مطالبوں کے سامنے جھکنے سے سختی سے انکار کر دیا اور فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر وہ مجھے اونٹ کی ایک رسّی بھی، جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کیا کرتے تھے دینے سے انکار کریں گے تو میں اس رسّی کے ٹکڑے کے لیے بھی ان سے لڑوں گا۔"

حضرتِ صدیقؓ کے اس ارادہ سے آپ کی انتہائی عقلمندی، قوتِ ارادی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے آپ کے عشقِ صادق کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جب انسان کا ایمان مضبوط ہوتا ہے تو وہ دشمن کی طاقتؔ قوت کو بالکل ہیچ سمجھتا ہے اور خواہ دشمن کا لشکر طاقتؔ قوت بڑھا چڑھا کیوں نہ ہو وہ بے دھڑک اس یقین کے ساتھ اس کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے کہ فتح و نصرت اور کامرانی اسی کی قسمت میں لکھی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والے، اس کی راہ میں ایثار و قربانی سے کام لینے والے دین کی عزت کے لیے کوشاں رہنے والے اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر جِدّ و جُہد کرنے والے کو کبھی ذلیل اور رُسوا نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر اس کو اپنی مدد اور فتح و نصرت سے نوازتا ہے۔

مُرتدین کا مدینہ کی طرف رُخ کرنا

اُسامہؓ کے لشکر کے چلے جانے کے بعد مدینہ کی حفاظت کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی[1]۔ اس لیے حضرت صدیقؓ نے تمام حالات کا نہایت دُور اندیشی اور احتیاط سے جائزہ لیا۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اسامہؓ کے لشکر کی واپسی سے پہلے مرتدین سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ اسی لیے آپ نے مختلف طریقوں سے اس بات کی کوشش کی کہ مدینہ کے اردگرد عبسؔ، ذبیانؔ، اسدؔ اور طیؔ کے قبائل کے ساتھ جو مرتد ہو کر اسلام کے دشمن بن کر مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہونا چاہتے تھے، فی الحال جنگ نہ کی جائے۔ بلکہ لڑائی کو اس وقت تک ٹالا جائے جب تک اسامہؓ کا لشکر واپس نہ پہنچ جائے۔ لیکن یہ قبائل بھی جانتے تھے کہ اگر اسامہؓ کا لشکر پہنچ گیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔ اس لیے انھوں نے مدینہ پر حملہ کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ چنانچہ مرتدین کا ایک لشکر ذی القصہ اور ایک لشکر ابرقؔ[2] میں اُترا اور وہاں سے اُنھوں نے حضرتِ صدیقؓ کے پاس ایک وفد بھیجا جس میں پھر اپنی اس پیشکش کو دُہرایا کہ اگر زکوٰۃ معاف کر دی جائے تو وہ نماز وغیرہ دُوسرے اسلامی ارکان ادا کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی سختی کے ساتھ انکار کر دیا اور ان کو مدینہ سے نکال دیا۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس وفد کے مدینہ آنے کی غرض یہ تھی کہ موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے اور مسلمانوں کے لشکر کی صحیح تعداد معلوم کی جائے۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس وفد کے آنے کی غرض یہی ہو۔

---

[1] بعض مؤرخین نے تو ان کی تعداد چند سو لکھی ہے۔

[2] یہ دونوں مقام مدینہ کے قریب واقع ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کا یہ جواب سُن کر وفد واپس اپنے لشکر میں چلا گیا اور آپ کے جواب کے ساتھ ساتھ مدینہ کی ساری صورتِ حال، مسلمانوں کی قلتِ تعداد اور ان کی کمزور حالت کا سارا نقشہ بیان کر دیا۔

وفد نے مسلمانوں کی قلتِ تعداد کا حال تو اپنے ساتھیوں کو سُنا دیا۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر گیا کہ فتح و نصرت کثرتِ تعداد اور قوت و طاقت کی مرہونِ منت نہیں ہوتی بلکہ فتح کا دارو مدار قوتِ ایمان، قوتِ ارادی اور صدق و یقین پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جو طاقتیں سامنے آئیں وُہ قوت و تعداد کے نشہ میں چُور ہوتی تھیں۔ انھیں میدانِ جنگ میں اپنے وسیع تجربے کا گھمنڈ ہوتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک پیش نہ گئی اور ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تارکینِ زکوٰۃ کے وفد کو ناکام واپس کرنے کے بعد مدینہ والوں کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ اور مدینہ کے مسلمانوں کا ایک لشکر مرتب فرما کر لشکر کے مختلف حصّوں کو علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور ابنِ مسعودؓ کی نگرانی میں دے دیا۔ آپ کو خوف تھا کہ کہیں دشمن مدینہ پر شبخون نہ مارے۔ اس لیے آپ نے شہر کے اردگرد ہر اہم ناکے پر فوج کا ایک دستہ متعین فرما دیا۔ باقی لوگ مسجد میں آکر جمع ہو گئے اور اس بات کا انتظام کر دیا گیا کہ اگر دشمن رات یا دن کے کسی حصّہ میں مدینہ پر حملہ کرے تو ناکوں پر متعین دستوں کو مدد مل سکے۔

اسی طرح تین دن گزر گئے۔ تین روز کے بعد عبس، ذبیان، طی اور ان کے مددگاروں نے رات کو مدینہ پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے اپنے لشکر کے ایک حصّہ کو "ذی حسیٰ" مقام پر ہی چھوڑ دیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لیا جا سکے۔ مدینہ کے ناکوں پر جو دستے متعین تھے انھوں نے کچھ لوگوں کو مدینہ کے اردگرد اور مدینہ سے باہر بھیجا ہوا تھا تاکہ وہ دشمنوں کی حرکات و سکنات کا پتا چلائیں۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ مرتدین رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ کی جانب بڑھے چلے آ رہے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو فوراً خبر کر دی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مرتدین پر حملہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فوراً اس امر کی اطلاع دی گئی آپ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور لشکر کے ساتھ اونٹنیوں پر سوار ہو کر ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکلے اور پہلے ہی حملے میں مرتدین کو شکست دے دی۔ جب مرتدین شکست کھا کر بھاگے تو مسلمانوں نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ حتیٰ کہ وہ ذی حسیٰ مقام تک پہنچ گئے جہاں مرتدین کا بقیہ لشکر موجود تھا وہ مسلمانوں کو دیکھ کر مقابلہ میں نکل آیا۔ اس لشکر نے مسلمانوں کے اونٹوں کے گلوں میں رسّیاں ڈالنی چاہیں تاکہ ان کو پکڑ لیں اور ساتھ ہی مسلمان بھی ان کے قبضہ میں آ جائیں۔ لیکن اونٹوں نے فوراً اپنا رُخ پھیر لیا اور مدینہ کی جانب بھاگنے لگے اونٹ اتنی تیزی سے بھاگے جا رہے تھے کہ مسلمانوں کے روکے نہ رُکتے تھے۔ مرتدین کسی ایک مسلمان کو بھی گرفتار نہ کر سکے اور ان کی چال اکارت گئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے باقی رات تیاری میں گزاری اور رات کے آخری حصّہ میں مرتدین سے مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی لشکر کے ہمراہ مدینہ سے باہر نکل آئے۔

ادھر مرتدین نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کے اونٹ مدینہ کی طرف بھاگے جا رہے ہیں تو وہ دھوکے میں آ گئے اور انھوں نے

"ذی القصہ" والوں کی طرف آدمی بھیجا کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور خود اس امید میں سو گئے کہ کل مدینہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیں گے۔

لیکن ہوا کچھ اور ہی تھا۔ صبح ہوتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر ان کے ڈیروں پر پہنچ گئے۔ وہ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی آواز تک نہ سنی تا آنکہ مسلمانوں کی تلواریں ان کے گلوں میں پیوست ہو گئیں۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہونے پایا تھا کہ مسلمان دشمنوں پر فتح پاکر اپنے ساتھ مال غنیمت لیے واپس آ گئے۔

اس واقعہ سے قبیلہ عبس میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کو سان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور ان کے خواب سب ادھورے رہ گئے۔ اس جھنجلاہٹ میں ان سب مسلمانوں کو انھوں نے قتل کر دیا، جو ان کے پاس تھے۔ اب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اسامہؓ کا لشکر شام سے واپس آ گیا۔ آپ نے اسے مدینہ میں آرام کرنے کا حکم دیا اور اپنے پیچھے اسامہؓ کو مدینہ کا امیر بنا کر خود بنی عبس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بہ منت عرض کیا کہ آپ اپنے تئیں خطرہ میں نہ ڈالیں اور مدینہ میں ہی قیام فرمائیں۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ آپ کی ذات کو کسی طرح کا نقصان پہنچ گیا تو اُمت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ آپ لشکر کی قیادت کے لیے اپنی جگہ کسی اور شخص کو نامزد فرما دیجئے۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے لشکر کے ساتھ سب سے پہلے ابرق پہنچے۔ وہاں عبس اور بنو بکر کو شکست دی۔ کچھ دنوں ابرق میں قیام فرمایا۔ پھر آگے بڑھ کر بنی ذبیان کو مغلوب کیا اور ان کی زمینیں اور چراگاہیں مسلمانوں کے گھوڑوں کے لیے وقف کر دیں۔ اس کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے۔ چونکہ مدینہ کے آس پاس بسنے والے دشمن قبیلوں کی سرکوبی ہو چکی تھی۔ اس لئے اب آپ کو اطمینان ہو گیا کہ مدینہ آئندہ ان لوگوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہے گا۔

مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے متعدد لشکروں کی روانگی

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسامہؓ کے لشکر کو کچھ دن تک آرام کرنے دیا اور جب وہ تازہ دم ہو چکا تو ارادہ فرمایا کہ عرب کے مرتدین پر ایک بھرپور حملہ کر کے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ ایک لشکر لے کر مدینہ سے نکلے اور "ذی القصہ" میں جو نجد کی جانب مدینہ سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے، قیام فرمایا۔ وہاں آپ نے گیارہ جھنڈے بنا کر انھیں گیارہ امیروں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر امیر کو اپنے دستہ کے ساتھ مختلف اطراف و جوانب کو جانے کا حکم دیا۔ پھر ہدایت کی کہ راستے میں جس مسلمان قبیلہ کے پاس سے گزریں اسے اپنے ساتھ مرتدین سے جنگ کرنے کی ترغیب دیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ کچھ لوگ تو مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ میدان میں نکل آئیں گے اور کچھ لوگ اپنے مرتد بھائی بندوں کی حمایت کے لیے گھروں میں ہی بیٹھے رہیں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں اور مرتدین کے حامیوں میں امتیاز کرنا آسان ہو جائے گا۔

آپ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو "بزاخہ" کے مقام پر طلیحہ بن خویلد اسدی کے مقابلہ کے لیے بھیجا اور ہدایت کر دی کہ جب وہ اس مہم سے فارغ ہو جائیں تو بطاح میں مالک بن نویرہ کے مقابلہ کے لیے چل کھڑے ہوں۔
عکرمہؓ بن ابوجہل کو یمامہ میں مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کے لیے بھیجا اور ان کے پیچھے شرحبیلؓ بن حسنہ کو ان کی امداد و تقویت کے لیے روانہ کرکے حکم دیا کہ مسیلمہ سے فارغ ہو کر قضاعہ کی طرف بڑھیں۔
مہاجرؓ بن ابی امیہ کو صنعاء میں اسود عنسی کے مقابلہ پر متعین کیا۔
حذیفہؓ بن محصن کو عمان میں اہلِ دبا کا سر کچلنے کے لیے روانہ کیا۔
عرفجہؓ بن ہرثمہ کو اہلِ مہرہ کی طرف بھیجا۔ ان کو اور حذیفہؓ بن محصن کو حکم دیا کہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں اور فرمایا کہ جو جس کے رقبۂ حکومت میں ہو، اس کے ماتحت رہے (یعنی جب دونوں عمان میں ہوں تو حذیفہؓ امیر ہوں گے اور عرفجہؓ ان کے ماتحت، اور جب مہرہ میں ہوں تو عرفجہؓ امیر ہوں گے اور حذیفہؓ ماتحت)
سویدؓ بن مقرن کو تہامۂ یمن کی طرف بھیجا۔
علاؓ بن حضرمی کو بحرین روانہ کیا۔
طریفہؓ بن حاجز کو بنی سلیم اور ان کے ساتھ جو ہوازن شامل ہو گئے تھے ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔
عمروؓ بن العاصؓ کو سرحد شام کی طرف روانہ فرمایا۔

مرتدین کے نام حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خط لشکر کے دستوں اور امراء کی تعیین کے بعد آپ نے عرب کے مرتدین کے نام ایک ہی مضمون کے خطوط بھیجے جن میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپؐ کی وفات کے ذکر کے بعد لکھا:

"مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے بعض لوگ، جنھوں نے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور اس کے احکام پر عمل کرنے لگے تھے، اب اس دین کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اپنی نادانی اور جہالت سے اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا اور وہ شیطان کے بہکائے میں آ گئے۔ میں نے مہاجرینؓ، انصارؓ اور تابعینؒ کے لشکر کے ساتھ فلاں شخص کو تمھاری طرف بھیجا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ اس وقت تک جدال و قتال سے اپنا دامن بچائے جب تک تمھیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلا نہ لے، جو اس کی بات مان لے گا، اسلام کا اقرار کر لے گا، اپنے ناروا اعمال سے باز آ جائے گا اور نیک کام کرنے لگے گا، اسے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ بلکہ اس کی امداد و اعانت میں ساعی ہو گا۔ لیکن جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں گے ان کے متعلق میں نے حکم دیا ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ انھیں آگ میں جلا دیا جائے، انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ان کے بیوی بچوں کو قید کر لیا جائے اور کسی سے بجز اسلام کے اور کچھ قبول نہ کیا جائے۔ جس شخص نے ان باتوں کو مان لیا اور اسلام قبول کر لیا تو یہ اس کے لیے بہتر ہو گا۔ لیکن جس نے ایسا نہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز عاجز

نہیں کر سکے گا۔ میں نے اپنے قاصد کو حکم دیا ہے کہ وہ میرے اس خط کو تمھارے مجمع عام میں سنا دے اور نشانی یہ مقرر کی ہے کہ جس بستی کے لوگ اذان دیں ان سے ہاتھ روک لیا جائے اور اگر وہ اسلام کا اقرار کر لیں تو ان کا اقرار قبول کر لیا جائے۔"

یہ خط لکھ کر ہر لشکر کے سپرد کر دیا گیا اور انھیں حکم دے دیا گیا کہ اس خط کو عام مجمعوں میں سنا دیا جائے اور مرتدین کو اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

اُمرائے عساکر کے لیے ہدایتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امرائے عساکر کے لیے ایک عہد بھی لکھا جس کا مضمون سب امرا کے لیے ایک ہی تھا۔ ہر امیر نے وہ عہد نقل کر لیا اور اس پر کاربند ہونے کا وعدہ کیا۔ اس عہد کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

"یہ عہد ابوبکرؓ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور فلاں شخص سے لیا جاتا ہے جب کہ وہ ان لوگوں سے لڑنے جا رہا ہے جنھوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ فلاں شخص سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہوگا وہ پوشیدہ اور اعلانیہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے گا، خدا کی راہ میں ہر طرح کوشاں ہوگا۔ ان لوگوں سے جہاد کرے گا جو اسلام کو چھوڑ کر شیطان کے پیروکار بن گئے ہیں۔ البتہ حجت تمام کرنے کے لیے وہ پہلے انھیں اسلام کی طرف بلائے گا۔ اگر وہ دائرۂ اسلام میں آجائیں گے تو ان سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ لیکن اگر انکار کریں گے تو ان سے اس وقت تک سر جنگ رہے گا جب تک وہ اسلام قبول کرنے کا اعلان نہ کر دیں۔ اگر مرتدین اسلام قبول کر لیں تو وہ ان تمام حقوق و فرائض سے انھیں آگاہ کر دے گا جو ان پر واجب ہوتے ہیں اور جو حکومت کی طرف سے ان کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ازاں بعد جو فرائض ان کے ذمہ واجب ہوں گے وہ ان کی بجا آوری کا انتظام کرے گا اور جو حقوق ان کے ہوں گے وہ ادا کرے گا۔ حالتِ ارتداد میں ان سے کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے گا اور نہ ان سے لڑنے میں پیچھے ہٹے گا جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کا اقرار کرے تو اس کا یہ اقرار قبول کرے گا اور ہر نیک کام میں اس کی مدد کرے گا۔ لیکن جو شخص حالتِ ایمان کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے انکار پر کمر باندھے گا تو اس سے لڑے گا۔ البتہ اگر وہ دوبارہ اسلام کی دعوت قبول کرے گا تو اس سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے دل میں کوئی اور بات پوشیدہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس سے خود نپٹ لے گا۔ جو شخص اللہ تعالےٰ کی دعوت پر کان نہیں دھرے گا' اسے' جہاں کہیں وہ ملے گا' قتل کر دے گا اور اس سے اسلام کے سوا اور کچھ قبول نہ کرے گا۔ جو شخص اسلام کی دعوت پر ایمان لے آئے گا اس کا یہ اقرار قبول کرے گا۔ لیکن جو شخص انکار کرے گا' تو اس سے لڑے گا اور اگر خدا تعالیٰ اسے اس مرتد پر فتح دے گا تو اس کو تلواروں اور آگ کے ذریعہ ہلاک کر دے گا۔ جو مالِ غنیمت حاصل ہوگا اسے سوائے خمس کے' فوج میں

تقسیم کر دے گا جس ہمارے پاس آنا چاہیے۔ اس شخص سے اس بات کا بھی عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو عجلت اور فساد سے باز رکھے گا۔ کسی غیر کو اپنے لشکر میں داخل نہ ہونے دے گا جب تک کہ اس کو اچھی طرح جان پہچان نہ لے تاکہ جاسوسوں کے فتنہ سے محفوظ رہے۔ سفر اور حضر میں مسلمانوں سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کرے گا۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھے گا اور مسلمانوں کو بھی اس بات کی تاکید کرے گا کہ وہ نیک صحبت اختیار کریں۔ اپنے ساتھیوں سے نرمی کا سلوک کریں"۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان تباہی اور بربادی کے ہولناک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اگر خدا تعالیٰ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی اور وہ حضرت ابوبکرؓ جیسے صادق الایمان آہنی عزم و ارادہ کے مالک، اور اسلام کے عاشقِ زار کو کھڑا نہ کرتا تو مسلمان صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کے مقابلہ میں جس جرأت، دلیری اور سختی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس وقت جب مدینہ کا ہر متنفس یہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے شاید خدائے تعالیٰ ان کے دلوں کو پھیر دے اور وہ اسلام قبول کر لیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہر ممکن خطرہ کو مول لیتے ہوئے مرتدین سے مقابلہ کرنے اور فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح آپ نے مرتدین کے لیے اس امر کے سوچنے کی گنجائش بھی نہ رکھی کہ اب اسلام کمزور ہو چکا ہے اور انھوں نے سرزمینِ عرب میں جس فتنہ کی بنیاد رکھی ہے اسلام میں اس کے روکنے کی طاقت نہیں ہے۔ اگر حضرت صدیقِ اکبرؓ اس موقعہ پر بے نظیر جرأت اور بہادری کا مظاہرہ نہ کرتے تو یقیناً سارا عرب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا اور مدعیانِ کاذبہ کی طاقت و قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ لیکن خدائے تعالیٰ جو دین کا محافظ ہے، ایسا ہونا کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو چنا اور آپ کے ذریعہ مرتدین کا بالکلیہ استیصال کرا دیا۔

(۳)

اسلام کی شمشیرِ بُرّاں

حضرت خالدؓ بن ولید اور طلیحہ بن خویلد الاسدی کا باہم مقابلہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو ان دشمنانِ اسلام کی طرف بھیجا جو مدینہ سے قریب تر تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ وہ پہلے طلیحہ بن خویلد الاسدی اور اس کے مددگاروں کا مقابلہ کریں۔ اور اس پر فتح پا لیں تو پھر مالک بن نویرہ کے مقابلے کے لیے روانہ ہو جائیں۔

طلیحہ بن خویلد الاسدی اور مالک بن نویرہ دونوں انتہائی طاقت و قوت کے مالک تھے اور حضرت خالدؓ بن ولید کو ان دونوں کے مقابلہ پر بھیجنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت خالدؓ بن ولید کی جرأت اور بہادری پر کتنا اعتماد تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یقین تھا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں اسلام اپنے دشمنوں پر غالب آ جائے گا

اور جزیرہ عرب اور مدینہ کے گرد و نواح میں دوبارہ امن قائم ہو جائے گا۔

طلیحہ بن خویلد اسدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات ہوگئی تو اُس نے بے حد طاقت حاصل کر لی اور کئی قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ در اصل اُس کی خواہش تھی کہ وہ بھی حضورؐ کی سی شان و شوکت حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اپنی قوم بنی اسد کو اپنی نبوت کی طرف بلایا جو فوراً ہی اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ اب اس نے قبیلہ طے کی طرف رُخ کیا۔ چونکہ قبیلہ طے اور بنی اسد کے درمیان دوستی تھی اس لیے طے والے بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ قبیلہ غطفان نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ گو ان قبیلوں کے با رسوخ اور معزز اشخاص طلیحہ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنے دین کو نہیں بدلا۔ لیکن عوام کثیر تعداد میں اس کے پیروکار ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں اس کے گرد ایک زبردست لشکر جمع ہوگیا۔ اس لشکر کا پڑاؤ سرزمینِ نجد میں طے کے ایک چشمہ بزاخہ پر تھا۔ لشکر کی تعداد چار ہزار جنگجوؤں سے بھی زیادہ تھی۔ اُس کے مقابلہ میں حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز نہ تھی۔

حضرت خالدؓ بن ولید حسب الحکم حضرت صدیقؓ طلیحہ کے لشکر کی جانب روانہ ہوگئے۔ عبس اور ذبیان بھی مدینہ سے شکست کھا کر طلیحہ کے پاس بزاخہ پہنچ چکے تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ قبیلہ طے کے دو خاندانوں "جدیلہ" اور "غوث" کے پاس اپنے آدمی بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں۔ بعض لوگ تو فوراً آکر مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ لیکن بعض نے تاخیر سے کام لیا۔

عدیؓ بن حاتم طائی کی کوششوں سے قبیلہ طے کا قبولِ اسلام

ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حاتم طائی کے لڑکے عدیؓ کو اس کے قبیلہ کی طرف بھیجا اور اسے سمجھا دیا کہ تم جا کر اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دینا اور ان سے کہنا کہ وہ خواہ مخواہ فتنہ انگیزی نہ کریں۔ چنانچہ عدیؓ نے ایسا ہی کیا۔ ان کی قوم نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور عدیؓ سے کہا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر کے پاس جا کر اسے آگے بڑھنے سے روک دو۔ ہم اپنے ان آدمیوں کو جو طلیحہ کے لشکر میں ہیں، خط لکھتے ہیں کہ وہ واپس آجائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طلیحہ کو ہمارے دوبارہ اسلام قبول کرنے کا پتا چل جائے اور وہ ان لوگوں کو قتل کرا دے۔ چنانچہ عدیؓ حضرت خالدؓ کے پاس گئے اور ماجرا کہہ سُنایا۔ حضرت خالدؓ نے اس مشورہ کے مطابق دشمن پر کچھ عرصہ کے لیے حملہ ملتوی کر دیا۔ اسی اثنا میں وہ لوگ جو طلیحہ کے پاس تھے، قبیلہ میں واپس آگئے۔ عدیؓ نے ان کو دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے اُنھوں نے قبول کر لیا۔ اس پر عدیؓ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو لے کر حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس گئے۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک ہزار جنگجو سوار اور مل گئے۔ اب حضرت خالدؓ بن ولید طلیحہ کے لشکر کی جانب روانہ ہوگئے۔ قریب پہنچ کر آپ نے دو مسلمانوں عکاشہؓ بن محصن اور ثابتؓ بن اقرم انصاری کو طلیحہ کے لشکر کا حال احوال معلوم کرنے بھیجا۔ راستے میں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبال ملا جسے ان دونوں نے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر طلیحہ کو ملی تو وہ اپنے ایک اور بھائی سلمہ کے ساتھ ان دونوں کے مقابلے کے لیے نکلا۔ مقابلہ کے وقت طلیحہ نے عکاشہؓ کو اور اس کے بھائی سلمہ نے ثابتؓ کو شہید کر دیا۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید کو ان واقعات کا علم ہوا تو آپ نے اپنے لشکر کو لڑائی کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا۔ دونوں فوجیں مدِ مقابل ہوئیں اور تھوڑی ہی دیر میں حضرت خالدؓ نے طلیحہ کے لشکر کو شکست دے دی۔ طلیحہ شام کی طرف بھاگ گیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ ایمان لے آیا اور مرتے دم تک اسلام پر ہی قائم رہا۔

قبیلہ تمیم میں سجاح بنت حارث کا ورود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم کے مختلف قبائل میں کئی امیر مقرر کیے تھے جن میں زبرقان ابن بدر، قیس بن عاصم، وکیع بن مالک اور مالک بن نویرہ بھی تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان میں سے بعض تو اسی عہد پر قائم رہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھا تھا اور انھوں نے زکوٰۃ کی ساری رقوم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔ لیکن بعض لوگوں نے زکوٰۃ روک لی اور ارتداد اختیار کر لیا۔ بعض ابھی تذبذب میں ہی تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔
جن لوگوں نے ارتداد اختیار کر لیا تھا ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ اس اختلاف نے قبیلہ میں انتشار کی حالت پیدا کر دی تھی۔

اسی اثنا میں اس قبیلہ سے سجاح بنت حارث اٹھی۔ اس عورت کا والد ایک تمیمی قبیلہ بنی یربوع کی ایک شاخ بنو تغلب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے تمیم نے اس کی مدد کی۔

بنو تمیم میں خانہ جنگی

اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور بنو تغلب کے عیسائیوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ سجاح نے ان کے ساتھ مل کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لشکر سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔
جب وہ بنی تمیم میں پہنچی تو اس نے بنو یربوع کے سردار مالک بن نویرہ کو بلا بھیجا اور اس سے رائے طلب کی۔ مالک بن نویرہ نے مشورہ دیا کہ اس وقت ابوبکرؓ سے لڑنے کا خیال چھوڑ دو، بلکہ پہلے بنو تمیم میں اپنے مخالفوں سے نپٹ لو۔ ادھر وکیع بن مالک اور اس کی قوم بھی سجاح کے ساتھ ہو گئی تھی۔ سجاح نے مالک بن نویرہ کے مشورے پر عمل کیا اور اپنے مخالف تمیمی خاندانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اس طرح بنو تمیم میں خود لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی توجہ مسلمانوں سے ہٹ گئی۔ اگر بنو تمیم متفقہ طور پر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو دس ہزار کا عظیم الشان لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر نکل آتا اور ان کے لیے بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا۔

سجاح کا مسیلمہ کذاب کی طرف جانا

جب سجاح نے دیکھا کہ یہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تو اس نے اپنے لشکر کو، جو ربیعہ اور ایاد وغیرہم قبائل پر مشتمل تھا، بنی حنیفہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ بنو حنیفہ میں مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ جب مسیلمہ نے سجاح کے لشکر کی آمد کا حال سنا تو بہت گھبرایا اور اس نے خیال کیا کہ اگر وہ اور اس کی قوم سجاح سے برسرِ پیکار ہو گئی تو ابوبکرؓ کی فوجیں اس پر ٹوٹ پڑیں گی اور اس کے اردگرد جو قبائل ہیں وہ بھی اس کی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں گے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر اس نے سجاح کو

کچھ تحفے تحائف بھیجے اور اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

سجاح اور مسیلمہ کذّاب کی شادی

جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو مسیلمہ نے اس سے شادی کی درخواست کی اور بہت کچھ لالچ وغیرہ بھی دیا۔ چنانچہ سجاح کی رضامندی کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ تین دن کے بعد سجاح اپنے لشکر میں واپس ہوئی۔ جب لوگوں نے اس سے حالات پوچھے تو اس نے کہا:

"میں نے مسیلمہ کو حق پر پایا اس لیے میں نے اس کی تابعداری اختیار کر کے اس سے شادی کر لی۔"

لوگوں نے سجاح سے پوچھا:

"تم نے کچھ مہر بھی وصول کیا؟"

اس نے کہا:

"نہیں، اس نے مجھے مہر تو نہیں دیا۔"

اس پر اس کے ساتھیوں نے کہا کہ بغیر مہر وصول کیے شادی کرنا اس کے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔ اس پر وہ مسیلمہ کے پاس واپس آئی اور مہر کا مطالبہ کیا۔ مسیلمہ نے سجاح کے مؤذن شبث بن ربعی الریاحی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں میں اس امر کا اعلان کر دے کہ مسیلمہ نے دو نمازیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے واجب کی تھیں ہٹا دی ہیں۔ اور وہ عشا اور فجر کی نمازیں ہیں۔

مہر کے بارہ میں سجاح اور مسیلمہ کے درمیان یہ تصفیہ ہوا کہ مسیلمہ یمامہ کی زمینوں کے لگان کی نصف آمدنی سجاح کو بھیجا کرے گا۔ سجاح نے مطالبہ کیا کہ وہ سال آئندہ کی آمدنی میں سے اس کا حصہ پہلے ہی اسے دے دے۔ جس پر مسیلمہ نے نصف سال کی آمدنی میں سے اس کا حصہ اسے دے دیا۔ بقیہ حصہ کی وصولی کے لیے سجاح نے اپنے آدمیوں کو مقرر کر دیا اور خود واپس چلی گئی۔

جب سجاح بنو تمیم میں پہنچی تو مالک بن نویرہ کو افسوس ہوا کہ اس نے اسلامی حکومت سے بغاوت کیوں کی؟ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بنو تمیم کے بقیہ مرتدین اور ان کے امراء کا بھی یہی حال تھا۔ انھوں نے حضرت خالدؓ بن ولید سے اپنی ندامت کا اظہار کیا اور ان کی خدمت میں زکوٰۃ ارسال کر دی۔

مالک بن نویرہ سردار قبیلہ بنی یربوع کا قتل

لیکن مالک بن نویرہ نے زکوٰۃ ادا نہ کی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے قبیلہ بنو یربوع میں حضرت خالدؓ بن ولید اور ان کے لشکر کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اس لیے انھیں منتشر ہو نے کا حکم دے دیا۔ جب حضرت خالدؓ بطاح پہنچے تو میدان خالی پڑا تھا اور کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت خالدؓ نے فوج کے دستوں کو مختلف اطراف میں ان لوگوں کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ ایک دستہ بنی یربوع کے کچھ لوگوں کو پکڑ لایا۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ حضرت خالدؓ نے ان سب کو قید کر دیا اور اس کے بعد ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ چنانچہ وہ سب قتل کر دیے گئے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر کے بعض آدمیوں نے یہ گواہی دی تھی کہ جب بنی یربوع نے مسلمانوں کی اذانوں کی آوازیں سنی تھیں تو انھوں نے بھی اذانیں دینی شروع کر دی تھیں۔ اسی بنا پر ان کا خیال تھا کہ ان لوگوں کا خون ناحق

بتایا گیا ہے اور خلیفہ کے احکام کی صریح موجودگی میں ان کا قتل ہرگز جائز نہ تھا۔ جو لوگ اس خیال کے حامی تھے ان میں حضرت ابو قتادہؓ بھی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ اس وجہ سے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہو گیا اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ پھر ایک اور بات نے اس امر کو اور زیادہ اہمیت دے دی اور وہ یہ کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے مالک بن نویرہ کی بیوہ سے شادی کر لی۔
ابو قتادہؓ اس بات کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ لشکر کو چھوڑ کر مدینہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس آئے اور ان سے شکایت کی کہ کس طرح خالدؓ نے آپ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ مگر حضرت ابو بکرؓ نے قتادہؓ کے اس فعل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کہ وہ بغیر خالدؓ سے اجازت لیے ان کے لشکر کو چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، قتادہؓ یا کسی اور کے معاملہ میں اس بات کے روادار نہ تھے کہ فوجی احکام کی خلاف ورزی کی جائے، کیونکہ اس طرح مسلمانوں کے لشکر میں کمزوری پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس وقت لشکرِ اسلام مخالفینِ اسلام سے برسرِ پیکار تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی صفوں میں کامل اتحاد اور اتفاق رہے۔ اسی لیے انھوں نے ابو قتادہؓ کو مجبور کیا کہ وہ دوبارہ خالدؓ کے لشکر میں چلے جائیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ فعل جنگی سیاست کے نقطۂ نگاہ سے انتہائی عقلمندی اور بڑی دور اندیشی پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے تو ابو قتادہؓ کو خالدؓ کے لشکر میں واپس کر دیا۔ لیکن مدینہ کے مسلمانوں میں حضرت خالدؓ بن ولید کے اس فعل پر کثرت سے نکتہ چینی ہونے لگی۔ مالک بن نویرہ کا بھائی متمم بن نویرہ بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے بھائی کے ساتھ حضرت خالدؓ نے جو سلوک کیا تھا اس کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے بھی حضرت ابو بکرؓ سے خالدؓ کے فعل کی مذمت کی۔ حضرت عمرؓ نے کہا:

"چونکہ خالدؓ نے ایسے لوگوں پر تلوار چلائی ہے جنھوں نے اذان کا جواب اذان سے دیا تھا۔ اس لیے اگر یہ الزام صحیح ہے تو انھیں قید کر دینا چاہیے۔"

لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا:

"عمرؓ! خالدؓ نے ایک تاویل[1] کی اور اس میں ان سے غلطی ہو گئی اس لیے تم خالدؓ کے بارہ میں اپنی زبان بند کرو۔"

تب حضرت خالدؓ بن ولید حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے معاملہ میں اپنی معذرت پیش کی۔ ادھر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خود مالک بن نویرہ کا خوں بہا ادا کر دیا۔ بنو یربوع کی طاقت ٹوٹ چکی تھی۔ قبیلہ تمیم بھی سارے کا سارا دوبارہ اسلام لے آیا۔ اور اس بات پر راضی ہو گیا کہ جس طرح وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے اسی طرح وہ حضرت ابو بکرؓ کو بھی زکوٰۃ ادا کیا کریں گے۔

---

[1] حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ تاویل کی تھی کہ ان لوگوں نے قتل کے خوف سے اذانیں دینا شروع کر دی تھیں۔

فوج کے سالاروں کو سزا دینے کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پالیسی

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہ سیاست بڑی دور اندیشی اور حکمت پر مبنی تھی کہ

اگر فوج کے سالاروں اور عمال سے اثنائے جنگ میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو انھیں سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ اگر لڑائی کے دوران میں کسی لشکر کے سردار کو سزا دی جائے تو دوسرے لشکروں کے سرداروں کی پوزیشن بھی نازک ہو جاتی ہے۔ ان کے بارہ میں بھی شکایتیں ہونے لگتی ہیں۔ ان کے حاسدین کی زبانیں ان کے خلاف مصروفِ عمل ہو جاتی ہیں اور اس طرح فوج کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

آج کل کی متمدن حکومتوں کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اگر ان کے افسروں سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ اس کا محاسبہ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیتیں اور جب تک وہ اپنی ذمہ داریوں پر متعین رہتے ہیں ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتیں۔ وہ اس وقت تک انتظار کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتی ہیں جب تک دلوں کے جوش ٹھنڈے اور شکایتوں کے دفتر بند نہ ہو جائیں۔ اگر کوئی ایسا ہی سنگین معاملہ ہوتا ہے جس میں شک کی کوئی گنجایش ہی نہ ہو تو وہ ایسے افسروں کا تبادلہ کر دیتی ہیں۔ لیکن اکثر اوقات تبادلہ کے ساتھ ہی ان کے منصب میں ترقی بھی کر دی جاتی ہے تاکہ شکایت کرنے والوں کو یہ کہنے کا موقعہ نہ مل سکے کہ فلاں افسر کا تبادلہ ان کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے یا ان کی شکایت پر عمل میں آیا ہے۔ اس طریقۂ عمل سے نہ صرف یہ کہ مخالفین کے منہ بند ہو جاتے ہیں بلکہ سرکاری ملازمین کے دلوں میں حکومت پر اعتماد بھی بحال رہتا ہے۔

بنو حنیفہ کے ساتھ جنگ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو حنیفہ کا ایک وفد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لے آیا تھا۔ قبیلہ کا سردار مسیلمہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو کچھ عطایا دیے جن میں سے مسیلمہ کو بھی اپنا حصہ ملا۔ واپس جا کر اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے بعد پھر مدینہ آیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

"مجھے بھی آپ کے ساتھ امرِ نبوت میں شریک کیا گیا ہے، اس لیے نصف ملک ہمارے لیے ہے اور نصف ملک قریش کے لیے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جواب میں لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد رسول اللہ الی مسیلمۃ الکذاب السلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد فان الارض للہ یورثھا من یشاء والعاقبۃ للمتقین۔"

ترجمہ: "اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام، اس پر سلام جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ ساری زمین اللہ ہی کی ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام تو متقیوں ہی کا اچھا ہوگا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عکرمہؓ بن ابوجہل کو مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کرنے کے لیے یمامہ بھیجا اور ان کے پیچھے شرجیلؓ کو ان کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ اور حکم یہ دیا کہ جب دونوں فوجیں جمع ہو جائیں تب جنگ شروع کی جائے لیکن

عکرمہؓ نے اس خیال سے کہ جنگ میں کامیابی کا فخر ان ہی کے حصہ میں آئے۔ اکیلے پہنچ کر بنو حنیفہ پر حملہ کر دیا۔ جب بنو حنیفہ سے لڑائی شروع ہوئی تو عکرمہؓ نے شکست کھائی۔ شرحبیلؓ کو جب اس کا پتا چلا تو وہ جہاں تھے وہیں ٹھہر گئے۔ عکرمہؓ نے ساری سرگزشت حضرت ابو بکرؓ کو لکھ بھیجی۔ حضرت ابو بکرؓ کو عکرمہؓ کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور آپ نے ان کو جواب میں لکھا:

"نہ میں تمھاری صورت دیکھوں گا نہ تم میری۔ اس وقت واپس نہ ہونا، کیونکہ اس طرح لوگوں میں بددلی پھیل جائے گی۔ تم حذیفہؓ اور عرفجہؓ کو ساتھ لے کر آگے بڑھو اور اہل عمان و مہرہ سے جنگ کرو۔ اس کے بعد مہاجرؓ بن ابی امیہ کے ساتھ شامل ہو کر یمن اور حضر موت کے مرتدین کی خبر لو۔"

شرحبیلؓ کو آپ نے اس وقت تک انتظار کرنے کا حکم دیا جب تک ان کے پاس دوسرا حکم نہ پہنچے۔

اس اثنا میں خالدؓ بن ولید بنو یربوع کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے انھیں یمامہ بھیجا اور کئی اور لشکروں کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ کیونکہ یمامہ میں مسیلمہ کا زور بہت بڑھ چکا تھا۔ طبری کی روایت کے مطابق مسیلمہ کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اکثر لوگوں نے اس کی اطاعت محض عصبیت اور اپنی قومیت کے تحفظ کی خاطر قبول کی تھی، حالانکہ وہ اس پر مطلق ایمان نہیں لاتے تھے اور اسے جھوٹا سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کہتے تھے:

"ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا ہے۔ لیکن ربیعہ کا کذاب ہمیں مضر کے صادق سے زیادہ محبوب ہے۔"

حضرت خالدؓ اپنے لشکر کے ہمراہ یمامہ روانہ ہو گئے۔ ادھر شرحبیلؓ نے بھی وہی حرکت کی جو عکرمہؓ سے سرزد ہوئی تھی اور ان کو بھی وہی نقصان اُٹھانا پڑا جو عکرمہؓ کو اٹھانا پڑا تھا۔ اس پر حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کو زبردست سرزنش کی۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید یمامہ پہنچے تو وہاں مسیلمہ کذاب کے پیروؤں سے نہایت شدید جنگ پیش آئی۔ بنو حنیفہ نہایت بے جگری سے لڑے۔ قریب تھا کہ مسلمان شکست کھا جاتے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی مدد بروقت آ پہنچی اور باحمیت مومنین نے عین موقعہ پر مسلمانوں کو ابھارا کہ وہ بنو حنیفہ پر ایک تازہ حملہ کریں۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ سیکڑوں اشخاص اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر بنو حنیفہ کے لشکر میں گھس گئے اور ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ مسلمان بہادر مسیلمہ تک بھی پہنچ گئے اور اسے قتل کر ڈالا۔ مسیلمہ کو قتل کرنے کا فخر وحشی اور ایک انصاری کے حصے میں آیا۔ وحشی وہی شخص ہے جس نے جنگِ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ جب بنو حنیفہ نے دیکھا کہ ان کا سردار مارا گیا اور مسلمانوں کا حملہ شدت سے جاری ہے تو وہ ہمت ہار بیٹھے اور بھاگ کر اپنے قلعہ میں پناہ گزین ہو گئے جس کا حضرت خالدؓ نے محاصرہ کر لیا۔

جب بنو حنیفہ قلعہ میں پڑے پڑے بہت عاجز ہو گئے اور اُنھوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو ان کا ایک آدمی مجاعہ بن مرارہ خالدؓ بن ولید کے پاس آیا اور آپ سے صلح کر لی۔ صلح نامہ میں یہ شرائط تھیں کہ بنو حنیفہ کے ان لوگوں کی جنھوں نے لڑائی میں حصہ لیا، جان بخشی کر دی جائے گی۔ ان کے پاس سونے چاندی اور اسلحہ وغیرہ کے جتنے ذخیرے ہوں گے وہ سب ضبط کر لیے جائیں گے اور ان کے جو لوگ قید کر لیے گئے ان میں سے چوتھائی بدستور مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہیں گے۔

جب صلح نامہ کی شرائط پر اتفاق ہو گیا اور صلح طے پا گئی تو حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس حضرت ابو بکر صدیقؓ کا

خط پہنچا جس میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ بنوحنیفہ کے تمام لوگ جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا، قتل کر دیے جائیں۔ لیکن معاہدہ لکھا جا چکا تھا، اس لیے حضرت خالدؓ نے اپنے وعدہ کو نباہا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سارے حالات لکھ بھیجے۔

جب صلح ہو چکی تو بنوحنیفہ اسلام لے آئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ان لوگوں کا ایک وفد حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجا۔ جب یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ان سے فرمایا:

"تمھیں کیا ہو گیا تھا؟ تم نے اپنے آپ کو اور ہمیں مصیبت میں کیوں ڈالا؟"

انھوں نے جواب دیا:

"اے رسول اللہ کے خلیفہ! جو کچھ ہمارے ساتھ گزری اس کا آپ کو سب پتا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ ایسا کام تھا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اور ہمارے لیے منحوس تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں اور ہماری غلطیوں کو معاف فرمائے۔"

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے مسیلمہ کا کلام سننے کی خواہش کی۔ تعمیل حکم میں انھوں نے اس کے بعض کلمات سنائے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب یہ کلام سُنا تو ان کو بنوحنیفہ کی جہالت پر بے حد تعجب ہوا اور آپ نے اس امر پر سخت حیرت کا اظہار کیا کہ ان لوگوں کو انتہائی فصیح و بلیغ کلام (قرآن مجید) اور ہزلیات (مسیلمہ کا کلام) میں کچھ بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔

بنوحنیفہ کے ساتھ لڑائی میں جہاں مرتدین کا بھاری نقصان ہوا اور ان کے سترہ ہزار آدمی مارے گئے۔ وہاں مسلمانوں کا نقصان بھی ناقابلِ تلافی ہُوا۔ اس جنگ میں ایک ہزار سے زیادہ مہاجرینؓ و انصارؓ اور تابعینؒ شہید ہوئے۔ بنوحنیفہ کو شکست دینے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید یمامہ کی ہی ایک وادی میں جسے وبر کہتے ہیں ٹھہر گئے اور آئندہ کے لیے خلیفہ کے احکامات کا انتظار کرنے لگے۔

(۴)

جزیرۂ عرب کے اطراف و جوانب میں مرتدین کا استیصال

یمن میں اسود عنسی کا خروج

بنوحنیفہ اور مسیلمہ کذاب کے استیصال کی تفصیلات کے بعد اب ہم اسود عنسی اور یمن میں مرتدین کے فتنہ کا ذکر کرتے ہیں۔

جس زمانے میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ تھا وہاں "باذان" نامی ایک شخص ایرانیوں کی طرف سے عامل تھا۔ اس نے آخر کار اسلام قبول کر لیا اور اس کی وجہ سے یمن میں بھی اسلام پھیل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو یمن کا حاکم رہنے دیا، اور یہ اپنے انتقال تک اسی عہدہ پر فائز رہا۔ باذان کے انتقال کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے "شہر" کو صنعا کا والی بنا دیا اور یمن کے باقی حصوں میں دُوسرے عمّال مقرر کر دیے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کو حضورؐ نے اس سارے علاقے کی معلمی کے فرائض سپرد فرمائے۔ آپؓ ہر ولایت میں جاتے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کے احکام کی تعلیم

دیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل، قبائل "قحطان" کی ایک شاخ "عنس" میں ایک کاہن اسود عنسی نامی نے نبوت کا دعویٰ کیا جسے یمنی بدوؤں کی ایک جماعت نے قبول کر لیا۔ ان بدوؤں کے ساتھ مل کر اسود عنسی نے نجران پر حملہ کر دیا۔ اور خفیف سے مقابلہ کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں قبیلہ مذحج کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ جس سے اس کی جمعیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

اب اسے خیال پیدا ہوا کہ اگر انھی فتوحات پر قناعت کر لی گئی تو معاملہ پلٹ ہو جائے گا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر مسلمان طاقت حاصل کر کے اس علاقہ کی طرف بڑھے تو اس کی ساری فتوحات پر پانی پھر جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر مزید علاقہ پر اپنا قبضہ جمانے اور وہاں کے قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ کیا۔ وہ صنعاء کی طرف بڑھا۔ صنعاء یمن کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک تھا اور وہاں کے باشندے اپنی دولت مندی کی وجہ سے مشہور تھے۔ صنعاء کا عامل "شہر" اپنی ایرانی فوج کو جو ابناءؒ کے نام سے مشہور تھی ساتھ لے کر اسود عنسی کے مقابلہ میں نکلا۔ لیکن شکست کھائی اور میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

صنعاء کی طرف خروج کرنے اور اس پر قابض ہونے میں اسود عنسی کو صرف پچیس دن لگے۔ شہر فتح کرنے کے بعد اس کے مرحوم گورنر "شہر بن باذان" کی بیوی سے جبراً شادی کر لی۔

اس فتح کی وجہ سے سارے یمن میں اسود عنسی کا شہرہ ہو گیا۔ وہاں کے باشندے دھڑا دھڑ اس کی اطاعت قبول کرنے اور اس کے دین میں داخل ہونے لگے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دل سے اسود عنسی سے نفرت کرتے تھے لیکن وہ برملا اپنی نفرت کا اظہار نہ کر سکے اور جان کے خوف سے خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

یمن کے عمال نے سارا حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام واقعات کی اطلاع پا کر یمن میں "ابناءؒ" کے سرداروں کے نام ایک خط لکھا جس میں انھیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ اسلام پر قائم رہیں۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو اسلحہ اور قوت سے کام لے کر اسود کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اسے قتل کر ڈالیں۔

اسود کے قتل کی سازش

ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کیا لیکن جب وہ اسود کے مقابلے پر آئے تو معلوم ہوا کہ اسود کی طاقت و قوت اور اس کے لشکر کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس پر آسانی سے قابو پانا ممکن نہیں۔ اسی اثنا میں ان کو پتا چلا کہ اسود عنسی کے لشکر کا سردار قیس بن یغوث المرادی اسود سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور قیس کو اپنے ساتھ ملانا چاہا۔ انھوں نے اس خدمت کے لیے ایک نہایت ہوشیار شخص کو منتخب کیا، جس نے بہت ہی جلد قیس کو رام کر لیا اور وہ "ابناء" کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسود عنسی کی بیوی "آزادؒ" سے رابطہ پیدا کیا اور اس سے کہا:

ؒ ابناء نامی فوج ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ایرانی النسل تھے لیکن یمن میں پیدا ہوئے تھے۔

ؒ "آزاد" پہلے شہر بن باذان عامل صنعاء کی بیوی تھی۔ اسود عنسی نے "شہر" کو قتل کرنے کے بعد اس سے جبراً شادی کر لی تھی۔

"اے ہمارے چچا کی بیٹی! تجھے معلوم ہے کہ تیرے خاوند نے تیری قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے تیرے پہلے خاوند کو قتل کر دیا اور تیری قوم کو بھی قتل و غارت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جو لوگ قتل ہونے سے بچ گئے ان کو ہر قسم کے مظالم کا نشانہ بنایا اور عورتوں کو ذلیل کیا۔ کیا اب بھی تیرے لیے اس کے وجود میں کوئی کشش باقی ہے؟ اسود کے لیے اب صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اس کو نکال دیا جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے۔"

"ازاد" نے اس کا یہ جواب دیا:

"جو تم کہتے ہو بالکل درست ہے۔ جس قدر مجھے اس شخص سے نفرت ہے، رُوئے زمین پر اور کسی سے نہیں۔ جب تم اس سے لڑنے کا ارادہ کرو تو مجھے اطلاع کر دینا۔"

اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام "ابناء" کے سرداروں اور اہل نجران کے نام آیا جس میں انھیں اسود سے جنگ کرنے کی تاکید کی گئی تھی چنانچہ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے اور صنعا میں جو "ابناء" موجود تھے ان کو بھی لکھا کہ وہ اس موقعہ پر ان کی مدد کریں۔

اسود کا قتل

لیکن وہ زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکے۔ چونکہ اسود کی بیوی "ازاد" ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو گئی تھی اس لیے اس کے مشورہ سے ابناء میں سے "فیروز" نامی ایک شخص اسود کے مکان میں چپکے سے داخل ہو گیا اور رات کو موقعہ پا کر اسے قتل کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے اسود کے مکان پر سے اذان دی اور اس کے قتل کا اعلان کر دیا۔ اسود کے ساتھی بھاگ گئے اور وہاں کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے قتل کے حالات لکھ بھیجے۔ لیکن جس وقت قاصد مدینہ پہنچا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی۔

یمن میں دوبارہ فتنہ کا خروج

اسود کا فتنہ کوئی معمولی فتنہ نہیں تھا، صنعاء سے لے کر سواحل یمن تک سارا علاقہ اس کا مطیع ہو گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد صنعاء اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں نے یہ خیال کر لیا تھا کہ اب فتنہ دب گیا ہے اور فضا صاف ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ جب اس علاقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی تو فتنہ پھر بھڑک اُٹھا۔ اور بعض رؤسا کے کہنے پر وہاں کے لوگوں نے ارتداد اختیار کر لیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو اس کا پتا چلا تو آپ نے ان کے مقابلہ کے لیے ایک لشکر روانہ کیا اور ان یمنی سرداروں اور رئیسوں کو، جنھوں نے ارتداد اختیار نہیں کیا تھا بلکہ بدستور اسلام پر قایم تھے، کہلا بھیجا کہ جب تک ان کی امداد کے لیے اسلامی لشکر نہیں پہنچ جاتا وہ مرتدین کے مقابلہ پر جمے رہیں۔

اسود عنسی کے لشکر کے سردار قیس بن عبدیغوث کو جو اسود عنسی کے قتل کی سازش میں بھی شریک تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی تو وہ مرتد ہو گیا اور اسود کے پسپا شدہ لشکر کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ اب صنعاء میں اسی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ "ابناء" کے ایک سردار "فیروز" نے جو اپنے اسلام پر ثابت قدم تھا، قیس سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک لشکر مرتب کر کے آگے بڑھا اور قیس سے لڑ کر اسے شکست دی۔ لیکن یہ لوگ صنعاء میں داخل نہ ہو سکے۔ انھیں خبر تھی کہ

قیس کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کا ایک بڑا لشکر آ رہا ہے۔ اس لیے وہ صنعا کے قریب ہی مختلف راستوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کا لشکر آ پہنچا اور یہ لوگ اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ مسلمانوں کے لشکر کی کمان مہاجرؓ بن ابی امیہ کے ہاتھ میں تھی، جنھیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسود عنسی کے لشکر سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے عکرمہؓ بن ابو جہل بھی عمان اور قضاعہ کی جنگوں سے فارغ ہو کر آ پہنچے۔ ان دونوں لشکروں نے مل کر مرتدین پر حملہ کیا اور انھیں شکست دی۔ مرتدین کے سردار قیس اور عمرو بن معدیکرب الزبیدی[1] گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مدینہ بھیج دیا گیا۔ مدینہ پہنچ کر ان دونوں نے اپنے گزشتہ افعال پر پشیمانی کا اظہار کیا، ارتداد سے توبہ کی اور معافی چاہی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی جاں بخشی فرما دی اور انھیں یمن واپس کر دیا۔ یہ لوگ اپنی توبہ پر قایم رہے اور بعد کو اسلام کی راہ میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

اہلِ کندہ کا ارتداد

اہلِ کندہ نے بھی ارتداد اختیار کر لیا تھا۔ ان کے ارتداد کا سبب یہ تھا کہ کندہ میں زیاد بن عبید انصاری زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر تھے انھوں نے ایک شخص شیطان بن حجر اور اس کے بھائی کی ایک اونٹنی بطور زکوٰۃ وصول کی اور اس پر مُہر لگا دی۔ یہ دونوں اس اونٹنی کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن زیاد نے اونٹنی دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر شیطان اور اس کے بھائی نے اپنی قوم بنی عمرو بن معاویہ سے امداد طلب کی اور وہ بربنائے عصبیت ان کے ساتھ ہو گئی۔ حضرموت اور سکون کے لوگوں نے زیاد کی مدد کی۔ دونوں فریقوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ مرتدین کا سردار اشعث بن قیس تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے مہاجرؓ بن ابی امیہ اور عکرمہؓ بن ابو جہل کو اہلِ کندہ کی سرکوبی کا حکم دیا۔ چونکہ اشعث بن قیس کی جمعیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے مہاجرؓ نے تیز رفتار سواروں کا ایک دستہ اپنے ہمراہ لیا اور بقیہ لشکر کو عکرمہؓ کی سرداری میں چھوڑ کر بسرعت تمام محجر الزرقان پہنچے، جہاں اشعث بن قیس مقیم تھا۔ مہاجرؓ نے فوراً ہی اشعث بن قیس پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ اشعث اس ناگہانی حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس لیے فرار ہو کر نجیر میں قلعہ بند ہو گیا۔ تمام مرتدین بھی وہیں پہنچ گئے۔ مہاجرؓ بن ابی امیہ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں عکرمہؓ بھی بقیہ لشکر کو اپنے ہمراہ لے کر پہنچ گئے۔ جب اشعث نے دیکھا کہ محاصرہ سختی سے جاری ہے اور مسلمانوں کو مزید کمک بھی پہنچ گئی ہے تو مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ درخواست میں اس نے اپنی قوم کے صرف نو آدمیوں اور ان کے اہل و عیال کے لیے جاں بخشی کی خواہش کی۔ مہاجرؓ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اشعث اس فہرست میں اپنا نام لکھنا بھول گیا تھا۔ چنانچہ ان نو آدمیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مرتدین کو مع ان کے اہل و عیال اور اشعث کے گرفتار کر لیا گیا اور انھیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ جب یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے روبرو پیش ہوئے تو اشعث نے توبہ کی اور اپنی جاں بخشی کا طالب ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اشعث، بلکہ باقی تمام قیدیوں کو مع ان کے اہل و عیال کے رہا کر دیا۔ اشعث مدینہ میں اس وقت تک رہا جب تک عراق فتح نہ ہو گیا۔

اہلِ بحرین کی سرکوبی

اہلِ بحرین، جن میں ربیعہ کے قبائل شامل تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے اور حضورؐ نے منذر بن ساوی کو ان کا امیر مقرر فرما دیا۔ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، منذر بیمار تھے اور اسی بیماری میں چند روز کے بعد ان کا

---

[1] عمرو بن معدی کرب عرب کا مشہور دلیر شہسوار تھا۔ اس کی شجاعت کی دھاک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی اس نے ارتداد اختیار کر کے اسود عنسی کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

انتقال بھی ہو گیا۔ ساتھ ہی اہلِ بحرین نے دوسرے عرب قبائل نے ساتھ ارتداد اختیار کر لیا۔ اہلِ بحرین میں سے قبیلہ بکر ارتداد پر قائم رہا۔ قبیلہ عبد القیس نے بھی یہ کہہ کر مرتد ہونا چاہا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہوتے تو کبھی وفات نہ پاتے۔ اس قبیلہ میں ایک شخص جارودؓ بن معلی تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی اور اس کو اسلام کے متعلق کافی معلومات حاصل تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی قوم مرتد ہونے لگی ہے تو اس نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا :

"اے قبیلہ عبد القیس! میں تم سے ایک بات دریافت کرتا ہوں، اگر تمھیں اس کا کچھ پتا ہو تو مجھے جواب دینا، لیکن اگر پتا نہ ہو تو جواب مت دینا۔"

قوم نے کہا :

"پوچھو!"

اس نے کہا :

"کیا تم جانتے ہو کہ گزشتہ زمانوں میں اللہ تعالیٰ انبیاء کو مبعوث فرماتا رہا ہے؟"

اُنھوں نے کہا :

"ہاں!"

جارودؓ نے کہا :

"کیا تمھیں انبیاءؑ کے متعلق صرف علم ہے یا تم نے انھیں دیکھا بھی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا :

"نہیں، ہمیں ان کے متعلق صرف علم ہے۔"

جارودؓ نے کہا :

"ان کے ساتھ کیا ماجرا گزرا؟"

انھوں نے کہا :

"وہ وفات پا گئے۔"

جارودؓ نے کہا :

"اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وفات پا گئے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

قبیلہ عبد القیس کے لوگوں کے دلوں پر اس بات کا بے حد اثر ہوا اور اُنھوں نے کہا :

"ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے جارودؓ! آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم سب سے افضل ہیں۔"

چنانچہ قبیلہ عبدالقیس ارتداد سے بچ گیا۔

جارودؓ اور ان کے قبیلے کے سوا ربیعہ کے باقی تمام قبائل مرتد ہو گئے۔ ان کا ایک وفد کسریٰ شہنشاہِ ایران کے دربار میں حاضر ہوا۔ کسریٰ نے ان لوگوں پر منذر بن نعمان بن منذر کو اپنا نائب مقرر کر دیا اور سات ہزار ایرانی فوج اس کے ساتھ کر دی۔ بنو بکر بن وائل کا سردار حُطم بن ضُبیعہ تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کو گمراہ کرنے کے علاوہ قطیف اور ہجر کے باشندوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے بعد جارودؓ اور قبیلہ عبدالقیس سے لڑنے کے لیے مشرکین و مرتدین کا ایک لشکر جرار اکٹھا کیا اور ان پر حملہ بول دیا۔ قبیلہ عبدالقیس قلعہ بند ہو گیا اور حُطم بن ضُبیعہ نے اس کا محاصرہ کر لیا۔

مسلمان، مرتدین کے ہاتھوں سخت ایذائیں اٹھا رہے تھے کہ علاءؓ بن حضرمی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے فوج لے کر بحرین کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ میں ثمامہ بن اثال حنفی اور قیس بن عاصم منقری بنو حنیفہ اور بنو تمیم کی ایک جماعت لے کر ان سے مل گئے۔ اہلِ یمن بھی کثرت سے ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ رات گزارنے کے لیے لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ ابھی وہ اونٹوں پر سے اُترے ہی تھے کہ سارے کے سارے اونٹ مع ساز و سامان کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں کے پاس اب نہ کوئی سواری تھی نہ زادِ راہ، نہ پانی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ ہلاکت کے سوا اب ان کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان جس پریشانی میں مبتلا تھے اس کا کوئی شخص بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔

جس جگہ مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تھا وہ چٹیل میدان تھا۔ جہاں نہ کسی قسم کی روئیدگی تھی، نہ پانی کا نام و نشان تھا اور نہ کہیں کوئی سایہ دار جگہ نظر آتی تھی۔ ان کی زندگی کا واحد ذریعہ اُونٹ تھے اور وہ بھاگ گئے تھے۔ لیکن علاءؓ بن حضرمی نہایت بہادر اور جری تھے۔ ان کا دل ایمان سے بھرپور تھا۔ انھوں نے رات کو خدا تعالیٰ سے گڑگڑا کر دُعائیں مانگیں۔ جب صبح ہوئی تو لشکرِ اسلام نے دُور سے پانی چمکتا ہُوا دیکھا، وہاں پہنچے، پانی پیا، غسل کیا۔ ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ ان کے اونٹ ہر چہار طرف سے آ آ کر پانی پر جمع ہونے لگے۔ لشکر والوں نے اونٹوں کو پکڑ لیا اور ان کو نکیلیں ڈال دیں۔ اس کے بعد ان کو پانی پلایا۔ شاید اونٹوں کے بھاگ کر واپس آ جانے کی وجہ یہ ہو کہ وہ بے حد بھُوکے پیاسے ہوں، پانی اور چارہ کی تلاش میں نکل گئے ہوں۔ رات کے اندھیرے میں انھیں کچھ دکھائی نہ دیا ہو لیکن صبح ہونے پر وُہ پانی اور سبزہ دیکھ کر پھر وہاں پہنچ گئے ہوں۔

علاءؓ بن حضرمی اپنا لشکر لے کر بحرین پہنچے اور حُطم کے لشکر کے قریب ہی خیمہ زن ہوگئے۔ جارودؓ بھی جو عبدالقیس کے ساتھ قلعہ میں محصور تھے علاءؓ کے پاس آن پہنچے۔ حُطم نے اپنے لشکر کے اردگرد خندق کُھدوا رکھی تھی۔ دونوں لشکروں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑائی کا سلسلہ ایک مہینہ تک جاری رہا۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

ایک رات علاءؓ اپنے خیمہ میں لیٹے تھے کہ مرتدین کے لشکر گاہ کی طرف سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ علاءؓ نے خبر لینے کے لیے اپنے جاسوس بھیجے اور انھوں نے تھوڑی دیر میں آ کر خبر دی کہ سارا لشکر شراب میں دھت ہے اور نشہ میں واہی تباہی بک رہا ہے۔ علاءؓ بن حضرمی نے موقعہ کو غنیمت جانا۔ وُہ اپنی فوج کے ساتھ خندق عبور کر کے مرتدین کے لشکر میں داخل ہو گئے اور اسے گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ مرتدین کا سردار حُطم بن ضبیعہ بھی مارا گیا۔ اسی علاقہ میں کسریٰ کے

نائب منذر بن نعمان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جو لوگ قتل ہونے سے بچ گئے تھے انھوں نے جزیرہ دارین میں پناہ لی۔ لیکن علاءؓ نے ان کا وہاں بھی تعاقب کیا اور انھیں شکست دی۔ اس طرح تمام بحرین سے مرتدین کا خاتمہ ہو گیا۔

عمان میں مرتدین کا استیصال

اہلِ عمان رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ایمان لے آئے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان پر جلندی کے دو لڑکوں جیفر اور عبد اکو والی بنا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عمان میں ایک شخص لقیط بن مالک ازدی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اپنے اردگرد بڑی جمعیت اکٹھی کر لی۔ جیفر اور عبد اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بے بس پا کر پہاڑوں میں چلے گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سارا حال لکھ بھیجا۔ آپ نے حذیفہؓ بن محصن کو لقیط بن مالک کے مقابلے کے لیے بھیجا اور ان کی مدد کے لیے عرفجہؓ بن ہرثمہ کو روانہ کر دیا۔ اسی دوران میں عکرمہؓ بن ابوجہل بھی یمامہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ آپ نے ان کو بھی عمان جانے کا حکم دیا۔

لقیط نے اپنی فوج (بدبی) کو اکٹھا کیا۔ مسلمان بھی پہنچ گئے۔ لڑائی شروع ہوئی جس میں مرتدین کو شکستِ فاش نصیب ہوئی اور انھیں جانی و مالی طور پر بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

اہلِ مہرہ کا ارتداد اور ان کی سرکوبی

جب عکرمہؓ عمان کی مہم سے فارغ ہوئے تو اپنے لشکر اور قبائل ناجیہ، عبد القیس، راسب اور سعد کے ساتھ بلادِ مہرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ اہلِ مہرہ نے بھی ارتداد اختیار کر لیا تھا۔ مہرہ میں کئی بیرونی قبائل کے لوگ بھی آباد تھے۔ اہلِ مہرہ سب کے سب مرتد ہو گئے تھے لیکن وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو کر آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ ایک گروہ کا سردار سخریت تھا جو خاص اہلِ مہرہ میں سے تھا۔ دوسرا گروہ مصبح کے جھنڈے تلے تھا جو قبیلہ بنو محارب کا ایک فرد تھا۔

عکرمہؓ نے مہرہ پہنچ کر سخریت کو خط لکھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس خط کا سخریت پر اثر ہوا اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت ایمان لے آیا۔ لیکن مصبح نے اسلام قبول نہ کیا۔ عکرمہؓ نے اس پر حملہ کر دیا اور فتح پائی۔ مصبح مارا گیا، مسلمانوں کو کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ چند دن تک عکرمہؓ یہیں ٹھہرے رہے اس انتظار میں کہ اس علاقہ میں سکون ہو جائے اور یہ لوگ اسلام لے آئیں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے مہاجرین امیہ کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے یمن روانہ ہو گئے۔

قضاعہ کا ارتداد

حضرت عمروؓ بن العاص کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قضاعہ کے مرتدین سے لڑنے کے لیے مسلمانوں کے لشکر کا امیر بنایا تھا۔ عمروؓ بن العاص پہلے بھی ان لوگوں سے غزوہ ذات السلاسل میں جنگ کر کے انھیں شکست دے چکے تھے۔ اس جنگ میں قضاعہ کے سیکڑوں آدمی مارے گئے تھے۔ جو لوگ قتل ہونے سے بچ گئے تھے انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب قضاعہ نے دیکھا کہ ہر چہار طرف کے قبائل مرتد ہو رہے ہیں تو انھوں نے بھی ارتداد اختیار کر لیا۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے قضاعہ میں پہنچ کر اپنی تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور ان کو بزور زکوٰۃ کی ادائیگی اور اسلام قبول کرنے پر مائل کیا۔

ایک سال کی مسلسل جنگوں کے بعد آخر کار لشکرِ اسلامی نے مرتدین پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا۔ مرتدین دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قبائل عرب جس وحدت اور اخوت سے ہمکنار تھے، وہ انھیں دوبارہ حاصل ہو گئی۔ جزیرۂ عرب فتنہ، فساد اور انتشار سے پاک ہو گیا اور ملک کے طول و عرض میں اسلام کا جھنڈا اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ لہرانے لگا۔

(۵)
ارتداد کا پس منظر

عرب کے قدیم مورخین نے ان لڑائیوں کے اسباب پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جو مرتدین سے پیش آئیں اس لیے کہ ان کی غرض صرف واقعات کو جمع کر دینا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں یورپین مورخین نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ ان اسباب پر بحث کی ہے جو ان کے خیال میں ان جنگوں کا باعث بنے۔ لہٰذا ہم بھی تفصیل کے ساتھ ان اسباب پر گفتگو کرتے ہیں۔

محاذِ جنگ کا جغرافیائی لحاظ سے جائزہ مذکورہ جنگوں کے حقیقی اسباب پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ سارے محاذِ جنگ کا جغرافیائی لحاظ سے جائزہ لیا جائے۔ مرتدین سے جتنی جنگیں ہوئیں وہ سب جزیرۂ عرب میں ہوئیں۔ جس علاقہ میں طرفین کی فوجوں کی نقل و حرکت ہوتی تھی وہ حجاز میں سواحلِ بحرِ احمر سے نجد تک پھیلا ہوا تھا اور سرزمین دھناء میں ختم ہوتا تھا۔ دھناء، حسا اور عارض و سدیر کے درمیان واقع ہے، اور اس میں شمالی حجاز، جبل شمر اور نجد کے علاقے شامل ہیں۔

یہ سارا علاقہ بالعموم صحرا پر مشتمل ہے۔ یہاں پانی کی انتہائی قلت ہے۔ البتہ کہیں کہیں نخلستان واقع ہیں جہاں کھجور اور دیگر پھلوں کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ اس منطقہ میں پہاڑ بہت کم ہیں۔ بعض پہاڑ نجد میں ہیں اور بعض شمر کے علاقہ میں۔ ساری زمین ریتلے میدانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس علاقہ میں آبادی بھی بے حد کم ہے۔ جہاں کہیں آبادی ہے وہ وادیوں کے درمیان یا ان نشیبی علاقوں میں ہے جہاں بارش کا پانی آ کر جمع ہو جاتا ہے۔ ان نخلستانوں میں قابلِ ذکر وادی حمض کے وسط میں مدینہ کا نخلستان، وادی رمہ کے وسط میں بریدہ اور عنیزہ کا نخلستان اور وادی حنیفہ کے گرد پھیلے ہوئے عارض کے نخلستان ہیں۔

ارتداد کے اسباب محاذِ جنگ کے جغرافیائی جائزہ کے بعد اب ہم ان جنگوں کے اسباب کی طرف آتے ہیں۔ ہم نے پچھلی فصل میں بیان کیا تھا کہ عربوں کے مرتد ہونے کے اسباب میں یہ بات خاص طور پر داخل تھی کہ بعض قبائل کو اسلام کے متعلق مطلق واقفیت نہ تھی۔ ان میں وہ جاہلی عصبیت علیٰ حالہٖ قائم تھی جس کو اسلام مٹانا چاہتا تھا۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے یہ قبائل مسلمانوں کی طاقت اور قوت و شان و شوکت کی وجہ سے خاموش رہے۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو بعض قبائل کے لوگوں نے قریش کے غلبہ اور دباؤ کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بالکل مطلق العنان اور آزاد ہو کر اسی طرح زندگی گزاریں جس طرح وہ کچھ عرصہ پہلے گزارتے تھے اور کسی شخص یا

کسی قوم کے غلبہ اور سرداری کو قبول نہ کریں۔ بعض لوگوں نے منہ سے اسلام پر قایم رہنے اور نماز پڑھنے کا اقرار تو کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ دراصل زکوٰۃ تاوان ہے جو ہم پر ڈالا گیا ہے اور ہم آزاد منش عربی باشندے اس تاوان کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں نے تاریخ ارتداد کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ان پر یہ بات بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ اکثر اُن عرب قبیلوں نے اسلام کے خلاف بغاوت کی جو مکہ اور مدینہ سے دُور رہتے تھے۔ ان میں بعض طاقت ور تھے اور بعض کمزور۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ ہم اسلامی مراکز سے بہت دُور ہیں۔ اس لیے اسلامی فوجیں ہم تک پہنچنے کی جرأت نہ کریں گی۔ اور اگر کریں گی بھی تو اس عرصہ میں ہم اپنی طاقت اور قوت کو بہت بڑھا لیں گے اور اسلامی لشکر کے لیے ہمیں شکست دینا آسان کام نہ ہوگا۔

پس ارتداد کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عربوں میں ان کی جاہلی عصبیت عود کر آئی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ جس طرح جاہلیت کے زمانہ میں وہ آزادانہ زندگی گزارتے تھے اور کسی قوم یا شخص کو ان پر حکومت کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہو۔ یہ جاہلی عصبیت کئی طریقوں سے ظاہر ہوئی۔ بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ بعض قبائل میں جھوٹے نبی کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اپنے قبیلوں کو اپنی تائید کے لیے بلایا۔ چنانچہ ان کی بعض ایسے لوگوں نے بھی تائید اور مدد کی جو ان کے دعووں پر مطلق یقین نہ رکھتے تھے اور انھیں جھوٹا سمجھتے تھے لیکن چونکہ انھیں قریش اور انصار مدینہ کی ماتحتی گوارا نہیں تھی اس لیے انھوں نے ان جھوٹے نبیوں کو جھوٹا سمجھتے ہوئے بھی ان کی اطاعت اختیار کر لی۔ کیونکہ وہ ان کے علاقوں کے باشندے تھے اور اپنے علاقہ کے لوگوں کو وہ بہرحال قریش اور انصار سے افضل و برتر سمجھتے تھے۔

یہ بات کسی صورت میں بھی نہیں کہی جا سکتی کہ ارتداد کا سبب عرب کے قبائل کی اسلام سے نفرت تھی۔ بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کی وجہ وہ قومی عصبیت تھی جس کو یہ لوگ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جس کا اسلام مطلق روادار نہ تھا۔ یہ لوگ قریش اور انصار کی سیادت و سرداری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اسی وجہ سے وہ اسلامی افواج کے مقابلے پر آئے۔

قبائلِ عرب کی پانچ اقسام

جرمنی کا مشہور مستشرق "کیتانی" لکھتا ہے کہ وہ عرب جن کا تعلق ارتداد کی جنگوں سے ہے پانچ اقسام پر مشتمل ہیں:

پہلی قسم ان اعراب (بدو) مسلمانوں کی ہے جنھوں نے کامل طور پر مدینہ کی حکومت اور اس کے غلبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مدینہ اور مکہ کے قریب یا ان دونوں شہروں کے درمیان آباد تھے۔ ان میں مشہور قبائل جہینہ، مزینہ، بلی، اشجع، اسلم، ہذیل اور خزاعہ تھے۔

دُوسری قسم میں وہ قبائل شامل ہیں جنھوں نے گو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مجبور ہو کر عہد و پیمان کر لیے تھے اور حضورؐ کی زندگی کی آخری جنگوں میں شرکت بھی کی تھی۔ لیکن اسلام ان میں پورے طور پر قائم نہ ہوا تھا اور وہ مدینہ کے تسلط سے آزاد ہونے کے لیے کسی موقعہ کی تلاش میں تھے ان قبائل میں ہوازن، عامر بن صعصعہ، بنی سلیم اور خثعم شامل تھے۔

تیسری قسم ان قبائل کی ہے جو مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں پر واقع تھے جنھوں نے سیاسی طور پر مدینہ کا تسلط اور غلبہ

اپنے اوپر تسلیم کر لیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زکوٰۃ اور صدقات بھی بھیجے تھے۔ ان میں سے مشہور قبائل بنو اسد، بنو غطفان اور بنو تمیم تھے جو نجد کے علاقہ میں آباد تھے۔

چوتھی قسم میں وہ قبائل تھے جنھوں نے مدینہ کی حکومت اور غلبہ کو تسلیم نہ کیا تھا اور صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجنے اور ظاہری طور پر آپ کی تابعداری اختیار کرنے پر اکتفا کی تھی۔ ان قبائل میں مسلمانوں کی بہت تھوڑی تعداد آباد تھی ان مسلمانوں کی حفاظت کا سارا دارومدار اس امر پر تھا کہ مدینہ میں مسلمانوں کو قوت و طاقت حاصل رہے تاکہ ان قبائل کے لوگ ان کے خوف سے اپنے ہاں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم نہ ڈھا سکیں۔ ان قبائل میں بنو حنیفہ، عبدالقیس، عمان کے ازد اور حضر موت اور یمن کے اکثر قبائل شامل تھے۔ ان قبائل کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل کئی معلّمین کو اس غرض کے لیے بھیجا تھا کہ وہ ان میں جا کر لوگوں کو اسلام کی تعلیم اور اسلامی اخلاق کی بنیاد پر ان کی تربیت کا کام سرانجام دیں۔

پانچویں قسم میں وہ قبائل آتے ہیں جو سرے سے اسلام پر ایمان ہی نہیں لائے تھے بلکہ بدستور عیسائیت اور شرک پر قایم تھے۔ یہ وہ قبائل تھے جو عرب کے شمالی حصہ میں مقیم تھے مثلاً بنی کلب، بنی تغلب، غسان، قضاعہ، تنوخ، بکر اور حضر موت و یمن کے بعض قبائل۔

متذبذب قبائل

عرب کے بعض قبائل نے فتنۂ ارتداد کے وقت غیر جانبداری کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ قبائل جو مکہ کے مشرق، مغرب اور جنوب میں رہتے تھے انھوں نے ارتداد اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ قبائل کنانہ، ازد، بجیلہ، خثعم، عک، اشعر، حکم وغیرہ تھے۔ جب مرتدین سے جنگیں شروع ہوئیں تو یہ قبائل بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کسی فریق سے تعرض نہ کیا اور نہ دونوں میں سے کسی کی مدد کی۔

مکہ کے شمال مشرق میں جو قبائل آباد تھے ان میں سے بعض قبائل مثلاً ہوازن، عامر بن صعصعہ، بنو بلہ اور بنو سلیم نے گو ارتداد اختیار کر لیا تھا لیکن ان میں سے کسی قبیلہ نے مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔

طے کے قبائل بھی اسی فکر میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ بالآخر ان میں سے بعض طلیحہ اسدی کے ساتھ مل گئے۔

مدینہ کے شمال میں قضاعہ کے قبائل نے کھلم کھلا مسلمانوں سے جنگ کی۔

قبائل عرب کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کافی حد تک مذبذب تھے۔ بعض لوگ مرتد تو ہو گئے تھے لیکن چونکہ ان کو کامل یقین نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں پر غالب آ جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنی نظریں ان جنگوں کی طرف مرکوز رکھیں جو عرب کے اطراف و جوانب میں لڑی جا رہی تھیں۔ وہ اس بات کے انتظار میں تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ بعض قبائل نے اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمّال کو اپنے علاقہ سے نکال دیا تھا لیکن مسلمانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔

کھلم کھلا جنگ کرنے والے قبائل

وہ قبائل جنھوں نے کھلم کھلا ارتداد کی جنگوں میں حصہ لیا، مندرجہ ذیل تھے:

بنو فزارہ اور غطفان —— یہ قبائل مدینہ کے مشرق اور نجد کے راستہ میں واقع تھے۔ ان کے رؤسا مدینہ آئے اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے زکوٰۃ معاف کرنے کی درخواست کی۔ لیکن آپ نے ان کو صاف جواب دے دیا۔ اس پر ان لوگوں نے اپنی جمعیت کو مجتمع کیا اور مدینہ پر زبردست حملہ کر دیا۔ ان کا جو حشر ہوا وہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔

بنو اسد —— جو طلیحہ اسدی کے ساتھی تھے۔ یہ لوگ جبل شہر کے جنوب میں حجاز اور نجد کے درمیان سکونت پذیر تھے۔ بنو اسد کے ساتھ بنو فزارہ، غطفان اور طے کے قبائل بھی مل گئے تھے۔

بنو تمیم —— جو مالک بن نویرہ کے ساتھ تھے۔

بنو حنیفہ —— جو مسیلمہ کذاب کے پیرو تھے۔

مرتدین سے مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کی جماعتیں

مرتدین کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کی جو جماعتیں میدان میں آئیں وہ انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج اور مہاجرین اور مکہ کے قریش پر مشتمل تھیں۔ ان لوگوں میں لڑنے والوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

مہاجرین، انصار اور قریش کے ساتھ وہ قبائل بھی تھے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان سکونت پذیر تھے۔ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام پر لبیک کہا تھا۔ جو بعض غزوات میں بھی شریک ہوئے تھے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے مرتدین سے جہاد کرنے کے لیے ان لوگوں کو دعوت دی تو یہ بڑی خوشی سے ان جنگوں میں شامل ہوئے۔ یہ قبائل اسلم، غفار، مزینہ، اشجع، جہینہ اور کعب وغیرہ تھے۔ ان قبائل کے لڑنے والوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

قبیلہ ثقیف جو مکہ اور طائف کے درمیان تھا وہ بھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی فوج میں شامل تھا۔ اس قبیلہ کے افراد بڑے بہادر اور نہایت جنگجو تھے۔ یہ لوگ بدستور اسلام پر قایم رہے اور مرتدین کے ساتھ جنگوں میں انھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس قبیلہ میں دو ہزار لڑنے والے موجود تھے۔

جنگہائے ارتداد میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی بے نظیر جرأت

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اگر کل فوج کو جمع کر لیا جائے تو اس کی تعداد دس ہزار سے متجاوز نہیں تھی۔ اس دس ہزار فوج کو آپ نے بارہ حصوں میں تقسیم کیا اور ان بارہ حصوں کو مرتدین سے لڑنے کے لیے عرب کے گوشہ گوشہ میں روانہ کیا۔ اسلامی فوج نے اپنی قلتِ تعداد کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر محاذ پر مرتدین کو شکست فاش دی۔ عرب میں امن قایم کیا۔ افتراق پیدا کرنے والوں کی بیخ کنی کی اور اس طرح سرزمینِ عرب میں اسلام کو دوبارہ قایم کیا اور عربوں کے ان زبردست حملوں کے لیے زمین تیار کی جو مرتدین سے جنگ کرنے کے بعد وقوع میں آئے اور جنھوں نے ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ان جنگوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس عزم و استقلال اور جرأت و بہادری کا ثبوت دیا، روئے زمین پر اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ آپ نے اس موقعہ پر دکھا دیا کہ آپ کے قدم مصائب کی شدید آندھیوں، خطرات کے مہیب بادلوں

اور آفات کے زبردست بگولوں کے مقابلہ میں بھی ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ آپ کو خدا تعالیٰ پر کامل یقین اور بھروسا تھا کہ وہ اپنے قائم کیے ہوئے دین کی آپ مدد کرے گا اور اس کے دشمنوں کو نیست و نابود کرے گا۔ خدا تعالیٰ پر یہی یقین اور بھروسا تھا جس کی وجہ سے آپ کو ہر میدان میں فتح نصیب ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جب کہ تمام عرب میں ارتداد کی آگ پورے زور شور سے بھڑک رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ سارے جزیرہ کو جلا کر خاک کر دے اور اسلام کا نام ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، دینِ خدا کی وہ خدمت انجام دی جس نے اسلام کو دوبارہ اس جزیرہ میں زندگی بخشی۔ آپ نے بروقت اور نہایت جرأت مندانہ طریقہ سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور جب تک اس فتنہ کی آگ کو کلی طور پر فرو نہ کر دیا نہایت عزم و استقلال کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ بظاہر نظر یہ فتنہ انتہائی خوفناک نظر آتا تھا مگر آپ نے اپنی بے نظیر قابلیت کو کام میں لا کر ایک سال سے بھی کم عرصہ میں اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اسلام کی ساری تاریخ میں اس قسم کی مثال ملنی ناممکن ہے اور آج تک مسلمانوں میں کوئی ایسا فرد پیدا نہیں ہوا جس نے دین اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت کی ہو جیسی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کی۔

مرتدین سے جنگوں کے وقت مسلمانوں کی کمزور حالت مذکورہ بالا جنگوں کے وقت مسلمان جس طرح کمزوری سے دوچار اور مرتدین جس طرح قوت و طاقت کے نشہ میں چور تھے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مزید برآں مسلمانوں کو اپنے گھر میں بیٹھ کر مقابلہ کرنا نہیں پڑا۔ بلکہ پُرہیبت صحراؤں کو عبور کر کے، جہاں نہ پانی کا نام و نشان ملتا تھا نہ کسی قسم کے سبزہ کا۔ مرتدین کے علاقوں میں جا کر لڑنا پڑا۔ وہ اپنے مرکز سے دُور تھے۔ راستے بھی نہایت پُرخطر تھے۔ لیکن ان تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود انھوں نے ہر میدان میں اپنے دشمنوں پر فتح پائی اور ان کی عظیم الشان جمعیتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے مرتدین کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ چھوڑا کہ یا تو وہ اپنے گزشتہ افعال پر ندامت کا اظہار کر کے امن شکن کارروائیوں سے باز آ جائیں یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

جو شخص ان واقعات پر گہری نظر ڈالتا ہے اس کے لیے یہ ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ جو کچھ ہوا وہ سب قوتِ ایمانی کی برکت سے اور جذبۂ قربانی کی بدولت ہُوا۔ اس وقت مسلمانوں کے دل میں اس بات کی شدید تڑپ تھی کہ وہ سرزمینِ عرب سے اس فتنہ کو ملیا میٹ کر دیں جس کی موجودگی میں اس کا شدید خطرہ تھا کہ کہیں جاہلیت کا زمانہ جو ابتری، بدنظمی اور بُت پرستی کا دُوسرا نام تھا، دوبارہ لوٹ کر نہ آ جائے۔ چنانچہ اسی خطرہ کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی پُوری طاقت سے فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کیا اور عرب کو پھر سے نئی زندگی بخشی۔ عربوں کی صفوں میں یکجہتی پیدا کی اور انھیں پھر ایک ہی مسلک میں منسلک کر دیا۔

فصل سوم —— اسلام کی یلغار —— عراق کی فتح اور ایران پر حملہ

(۱)

اسلامی فتوحات کے اسباب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ خدا اپنے دین کو ہر میدان میں فتح بخشے گا اور اسے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غالب کر کے ہی دم لے گا۔ یہی یقین تھا جس کی بدولت آپ نے ایران جیسی عظیم الشان حکومت پر بھی حملہ کرنے میں کسی قسم کا تردد محسوس نہیں کیا۔ آپ کو عربوں کی قوت و طاقت کا اچھی طرح علم تھا۔ آپ جانتے تھے کہ عربوں اور ایرانیوں کا کسی طرح بھی باہم مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تمام عرب فوجوں کو ملا لیا جاتا جب بھی ان کی تعداد ایران کے کسی ایک شہر کی حفاظت کرنے والی فوج کی تعداد کے برابر بھی نہ تھی۔ عرب جس تنگی اور تکلیف سے زندگی بسر کرتے تھے ایرانی اس کا قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لڑائی کی صورت میں عربوں کو کسی جانب سے بھی مدد ملنے کا امکان نہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس ایرانی اپنے وسائل کو کام میں لا کر چند دنوں میں بڑے سے بڑا لشکر تیار کر سکتے تھے۔ زندگی کے کسی شعبے میں عربوں کو ایرانیوں پر کسی قسم کی برتری حاصل نہ تھی اور کسی صورت میں بھی وہ ایرانیوں کے ہم پلہ قرار نہیں دیے جا سکتے تھے۔ فتوحات کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ لشکر کی تعداد وافر ہو۔ اسے دشمن سے لڑنے کے لیے ہر قسم کی آسانیاں مہیا ہوں۔ لیکن عربوں کو ان میں سے کوئی بات بھی میسر نہ تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ کبھی ایران پر چڑھائی کر سکتے اور اس پر اپنا تسلط جما سکتے ہیں۔ ان کے بعض قبائل ایرانیوں کے مطیع تھے۔ عرب کے شمال میں قیاصرۂ روم کی حکومت تھی اور شمال مشرق میں خسروانِ ایران کی۔ روم اور ایران میں باہمی چپقلش رہتی تھی۔ ہوسِ ملک گیری کے باعث دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی سرحد پر حملہ کرتی رہتی تھیں۔ فریقِ مخالف کی طرف سے ان حملوں کو روکنے کے لیے طرفین نے اپنی اپنی سرحدوں پر مضبوط قلعے اور چھاؤنیاں تعمیر کیں۔ لیکن جب ان سے کام نہ چلا تو دونوں نے اپنے قرب و جوار کے سربرآوردہ عرب قبائل کے سرداروں کو لالچ دیا۔ ان کے جنگجو اور بہادر لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا۔ انھیں قواعدِ جنگ سکھائے۔ آلاتِ حرب سے لیس کیا اور تنخواہیں مقرر کر دیں۔ اس طرح بہ عرب ہزارہا اور ان کے اہلِ قبیلہ روپیہ کے لالچ میں اپنے اپنے مالکوں کے لیے جان دینے اور ان کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے لگے۔ بہ الفاظِ دیگر خود وہ عرب جنھیں اپنی آزادی، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ ایران اور روم کی کاسہ لیسی میں مصروف ہو گئے۔

اسلام سے قبل اہلِ عرب ایرانیوں اور رومیوں کو بڑی ہیبت، عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان عظیم الشان سلطنتوں کی سطوت، عظمت اور جبروت سے انتہائی مرعوب تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان سلطنتوں کے باشندوں کو ہر قسم کا آرام، ہر طرح کا چین نصیب ہے۔ ان کے پاس طاقت اور قوت کے خزانے ہیں۔ ان کی فوجیں جدید ترین آلاتِ حرب سے

پوری طرح مسلح ہیں۔ اس کے برعکس وہ خود انتہائی کس مپرسی اور ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں، نہ ان کے پاس طاقت ہے، نہ ہتھیار ہیں، نہ فوج۔ ہتھیاروں میں لے دے کر ان کے پاس تیر کمان، نیزے اور تلواریں تھیں۔ لیکن یہ چیزیں ایرانیوں اور رومیوں کے جدید ترین اسلحہ کے سامنے کیا کام آسکتی تھیں۔ عربوں کی یہی سقیم حالت تھی جس کے پیشِ نظر اسلام سے قبل ان کے واہمہ میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہ اپنے جزیرہ سے اس عزم کے ساتھ نکلیں گے کہ اپنی پڑوسی سلطنتوں پر حملہ کریں اور ان کی طاقت و قوت اور عظمت و جبروت کو آن کی آن میں خاک میں ملا کر رکھ دیں۔

لیکن اسلام نے آکر ان عربوں کے تنِ مُردہ میں زندگی کی ایک نئی رُوح پھونک دی تھی اور ان کی حالتوں میں ایک عظیم تغیر، ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اسلام نے عربوں میں اتحاد کی داغ بیل ڈالی، ان کے عزائم کو بلند اور مضبوط کیا۔ انھیں اس بات کا احساس دلایا کہ روئے زمین پر وہی سب سے زیادہ معزز ہیں، پھر انھیں حقیقی آزادی سے ذوق آشنا کیا، جس کے زیرِ اثر بڑی بڑی طاقتیں اور باجبروت بادشاہتیں ان کی نظروں میں ہیچ ہوگئیں۔

جُونہی خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ مرتدینِ عرب کے استیصال سے فارغ ہوئے آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ایران اور روم کی بادشاہتوں کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں چند ہزار نفوس پر مشتمل مسلمانوں کا حقیر سا لشکر کم مائیگی، بے بضاعتی، اسلحہ اور سامانِ رسد کی کمی اور ہزار ہا مشکلات کے باوجود عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں کو قطع کر کے ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے مقابل صف آرا ہو گیا جو اپنی تہذیب و تمدن، قوّت و شوکت اور رعب و دبدبہ کی وجہ سے تاریخ عالم میں اپنے لیے ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔ خلیفہ کے احکام کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ اسلامی لشکر نے ایرانی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس کے سامنے ایرانی لشکرِ جرار کی وافر سامانِ جنگ کے باوجود کچھ بھی پیش نہ جا سکی۔ اسی طرح رومی سلطنت بھی اپنی ہیبت اور شکوہ و عظمت کے ساتھ مسلمانوں کے قدموں پر آپڑی اور مسلمان اس کے اکثر حصہ پر قابض ہوگئے۔ اس قبضہ کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ایرانی اور رومی سلطنت کے کھنڈروں پر مسلمانوں نے ایک اور عظیم الشان سلطنت کی عمارت تعمیر کر دی جو قوت و طاقت، تہذیب و تمدن، مضبوطی و استحکام اور شان و شوکت کے لحاظ سے گزشتہ سلطنتوں سے کہیں بہتر اور دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک تھی۔

مسلمانوں کا یہ عروج مورخین کے لیے انتہائی حیرت و استعجاب کا باعث ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ تاریخ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی جس میں ایک خانہ بدوش قوم جسے دنیوی آسائشوں سے کچھ بھی حصہ نہ ملا ہو، جس کا گزارہ اونٹنیوں کے دُودھ اور باسی گوشت پر ہو، جسے رائج الوقت فنونِ جنگ سے مطلق واقفیت نہ ہو، دیکھتے دیکھتے بگولہ کی طرح اُٹھے، اور آن کی آن میں آندھی کی طرح اپنے ہمسایہ ملکوں پر چھا جائے اور وہ ملک اپنے اعلیٰ ترین سامانِ جنگ، اپنی انتہائی شان و شوکت کے باوجود اس بدو قوم کے سامنے خس و خاشاک بن کر بہہ جائیں۔

مورخین نے ان حیرت انگیز واقعات کے دو عوامل بیان کیے ہیں:

ایک یہ کہ اسلام نے عربی قبائل میں وہ تاثیر پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ صحرا سے نکل کر بڑی بڑی عظیم الشان

سلطنتوں کے مقابل صف آرا ہو گئے۔

دُوسرا یہ کہ خود ان ممالک میں بھی جنھیں عربوں نے فتح کیا تھا، اندرونی طور پر ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے اسلامی فتوحات کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

اسلام کا ظہور ان قبائل میں ہوا جو پراگندگی میں اپنی حد کو پہنچ گئے تھے۔ بتوں اور غیر اللہ کی پرستش نے ان کی عقلوں پر دبیز پردے ڈال دیے تھے، آپس کی خانہ جنگیوں نے ان میں خطرناک حد تک انتشار پیدا کر دیا تھا لیکن اسلام نے آکر ان تمام قبائل کو باہم شیر و شکر کر کے ایک روحانی، اجتماعی اور اخلاقی نظام میں جکڑ دیا۔ جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے وہ زمانہ اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے انتہائی انحطاط کا زمانہ تھا لوگوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھنے اور آدابِ زندگی پر عمل پیرا کرنے کے لیے کسی قسم کے نظام کا وجود نہیں تھا۔ اس وقت صرف عرب ہی کی یہ حالت نہیں تھی بلکہ ایران، شام اور دوسرے ممالک بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان ممالک میں عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان زبردست جھگڑے پیدا ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی ترقی اور خوشحالی پر شدید اثر پڑ رہا تھا اور ان ممالک میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئی تھیں۔

دُنیا کی یہ حالت تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ اس نے اپنی تعلیم کی بدولت عرب کے تمام قبائل کو مجتمع اور منظم کر دیا۔ اسلامی تعلیم کی روشنی میں جو قوانین مسلمانوں نے مرتب کیے انھوں نے عربوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اسلام نے قبائل کو باہم متحد اور مربُوط کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے ان میں عقیدۂ توحید سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ جب عربوں نے دیکھا کہ ان سب کا معبود ایک ہے تو قبیلہ قبیلہ کا بُت جُدا ہونے کی وجہ سے ان میں باہمی طور پر جو بیگانگی پائی جاتی تھی۔ وہ دور ہونے لگی۔ اسلام نے آکر لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ سب انسان برابر ہیں اور کسی شخص کو کسی شخص پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اگر کسی قبیلہ کا سردار کوئی جُرم کرتا ہے تو قانون کی نظر میں وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہے جس سزا کا مستحق ایک عام آدمی ہے۔ اخوت کا جو سبق اسلام نے آکر پڑھایا اس نے قبائل کو اسلام کی طرف راغب کیا اور خود اسلام لانے کے بعد انھوں نے باقی دنیا میں اسلام کو پھیلانے کا تہیہ کر لیا۔ غرض ایک مضبوط نظام جس نے تمام مسلمانوں کو باہم مربوط کر رکھا تھا اور اخوت و مساوات کی تعلیم کا زبردست اثر یہ دو عوامل تھے جو اوّلین اسلامی فتوحات میں بہت کافی حد تک مدد و معاون ثابت ہوئے۔

اس کے بالمقابل ایران اور روم میں جو کچھ ہو رہا تھا وُہ ان سلطنتوں کو تباہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ایران کے اکاسرہ نے یہود و نصاریٰ پر ظلم و ستم توڑنے اور ہر طرح ان کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ادھر قیاصرۂ روم نے جو عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ تمام سلطنت میں یہودیوں اور آزاد خیال منکرین کو جور و عدوان کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ عین اسی وقت اسلام نے حریتِ فکر، حریتِ ضمیر اور حریتِ عقیدہ کا ببانگِ دہل اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ نے لشکرِ اسلامی کے سرداروں کو اسی تعلیم کے مطابق عمل کرنے کی پُرزور تاکید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی اور رومی ممالک کی رعایا کے ایک بہت بڑے حصہ نے جو ظلم و ستم اور جور و الم کی چکی میں پس رہا تھا نہ صرف یہ کہ حملہ کے وقت عربوں کی کوئی مزاحمت نہیں کی

بلکہ ہر طرح ان کی تائید اور مدد کی۔

ایرانی اور مشرقی روم کی سلطنتوں کے زوال اور عرب فوجوں کے ہاتھوں ان کی شکست کا ایک سبب ان دونوں حکومتوں کے جابرانہ قوانین بھی تھے۔ رومی قوانین نے اس مشرقی سلطنت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور ان کی وجہ سے رعایا کے مختلف طبقوں میں باہمی منافرت و مخاصمت پیدا ہو گئی تھی۔ سلطنت میں رومی اور غیر رومی دونوں باشندے آباد تھے اور ملکی عہدوں پر ہر ایک کا حق تھا۔ لیکن تمام بڑے بڑے عہدے اور ہر قسم کے اعزاز رومیوں کو ہی دیئے جاتے تھے اور غیر رومی رعایا کو سیاسی اور شہری حقوق سے کلیتہً محروم رکھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ طبعی طور پر یہ ہوا کہ غیر رومی رعایا کے دل میں رومیوں کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے اور اس طرح سلطنت میں کمزوری پیدا ہونے لگی۔ اس زمانہ میں رومی عساکر نے بھی اپنی قومی خصوصیات کو ترک کر دیا تھا اور فوجوں کے سپاہی سلطنت کی بے لوث خدمت کرنے کے بجائے تنخواہوں اور اُجرتوں کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ تنخواہ دار سپاہی کسی صورت میں بھی اس طرح خلوص سے میدانِ جنگ میں کام نہیں کر سکتا جس طرح وہ سپاہی جس کے پیشِ نظر صرف اپنے ملک کی خدمت ہوتی ہے، محض جذبۂ قربانی ہی اس کو میدانِ جنگ میں لاتا ہے۔ اور اس کے دل میں تنخواہ اور اُجرت کا خیال بھی نہیں آتا۔ رومی فوجوں کی دیکھا دیکھی ان سرداروں اور ان کی فوجوں نے بھی تنخواہ کا مطالبہ شروع کر دیا جن کو رومی سلطنت نے سرحد پر اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ سلطنت کے خلاف ہر حملہ کو روکیں اور دشمن کو مملکت کی حدود میں قدم نہ رکھنے دیں۔ رومی اور غیر رومی عناصر میں اسی قسم کے جذبات کے اُبھرنے سے سلطنت میں ضعف شروع ہو گیا۔ فوج کی حالت بدل گئی، اور وہ فتوحات جو رومی فوج کے ہاتھوں مسلسل ہوتی رہتی تھیں، رُک گئیں۔

لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں کے لشکران کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ وہ ان منظم رومی اور ایرانی لشکروں کا مقابلہ کر سکتے جو جنگ کے لیے ہر وقت کیل کانٹے سے لیس کھڑے رہتے تھے۔ عربوں کی فتح کا سب سے بڑا سبب وہ دینی جذبہ تھا جس نے موت کو ان کی آنکھوں میں بالکل حقیر کر دیا تھا اور وہ ہر خطرہ سے بے پروا ہو کر، ان سلطنتوں سے لڑنے کے لیے نکل آئے تھے۔ اس جذبہ کے سامنے ایرانیوں کی تنظیم اور رومیوں کی شجاعت بھی کچھ کام نہ آ سکی۔

عربی فوجوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے افسروں اور سرداروں کے احکام کی اطاعت بلا چون وچرا اور آنکھیں بند کر کے کیا کرتی تھیں جس سے ان کی صفوں میں کامل اتحاد اور یک جہتی رہتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک ٹھوس اور سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو گئے تھے جس کو توڑنا ان کے دشمنوں کے بس میں نہ تھا۔ جنگی تیاریوں اور سامانِ رسد میں کمی کی تلافی اس کامل اطاعت اور فرماں برداری سے بھی ہو جاتی تھی' جو عرب سپاہی اپنے افسروں کے لیے روا رکھنا اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔

اولیں عربی فتوحات میں عربی فوجوں کا ایک امتیاز یہ تھا کہ وہ انتہائی پھرتی، تیزی اور چستی سے کام کرتی تھیں جس نے ان کی کامیابی میں بے حد مدد دی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ جنگ جیتنے میں حیرت انگیز پھرتی سے کام لیا، بلکہ فتوحات کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مفتوحہ علاقوں کی نئے سرے سے تعمیر شروع کر دی۔ وہاں انتہائی منظم حکومت قائم کر کے' اسلامی قوانین جاری کر دیئے اور اپنا تسلط اس طرح جما لیا کہ دشمن کی فوج دوبارہ حملہ کی جرأت نہ کرے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سلطنت میں ایسے لوگ بھی کثرت سے آباد تھے جن پر حکومت کی طرف سے بے انتہا مظالم کیے جاتے تھے۔ ملکی مناصب میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے علاقوں پر رومیوں نے مختلف جنگوں میں قبضہ کر لیا تھا اور وہ لوگ محکومی اور غلامی کی ذلیل زندگی بسر کر رہے تھے۔ رومی حکومت نے ان کی دل دہی کے لیے کوئی کوشش نہ کی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے وہاں پہنچتے ہی ان سے انتہائی فیاضانہ سلوک کیا۔ اور اس طرح پیش آئے جیسے اپنے بھائیوں سے پیش آتے ہیں۔ اس سلوک کا ان لوگوں پر جو اب تک ظلم و ستم کی چکی میں پستے چلے آرہے تھے بعد اثر ہوا اور وہ اس سرزمین میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مددگار بن گئے۔

مسلمانوں نے جنگوں میں میانہ روی اور ضبطِ نفس کی بڑی اعلیٰ مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے ان وحشیانہ حرکات سے کلی طور پر اجتناب کیا جو اس زمانہ کی لڑائیوں کا طرۂ امتیاز بن چکی تھیں۔ عربوں کے حملہ سے پہلے جب ایرانی اور رومی لشکر اپنے ہمسایہ ملکوں اور علاقوں پر فوج کشی کرتے تھے تو لوٹ مار اور قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہوتا تھا کہ الامان و الحفیظ۔ شہروں کو جلانا، آبادیوں کو برباد کرنا، مفتوحہ علاقہ کے باشندوں کو بے دریغ قتل کر دینا اور بقیۃ السیف لوگوں کو شدید تکلیفیں پہنچانا ان کے لیے معمولی باتیں تھیں اور وہ اس میں لذت محسوس کرتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کی فوجیں ان ملکوں میں پہنچیں تو انھوں نے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے انتہائی رواداری اور محبت کا سلوک کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اپنے حاکموں کے ہاتھوں ایذائیں جھیل رہے تھے اور ان کا پچھلا برتاؤ ان کی نظروں کے سامنے تھا، خود مسلمانوں کا استقبال کرنے کھڑے ہو گئے اور ان جنگوں میں جس حد تک ہو سکتا تھا انھوں نے مسلمانوں کی اعانت کی۔

ان عوامل کے علاوہ عرب فوجوں کے سپہ سالاروں کی جنگی مہارت نے بھی فتوحاتِ اسلامیہ میں بہت مدد دی۔ علاوہ دیگر سپہ سالاروں کے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا جلیل القدر انسان تھا جس کی گرد کو بھی دوسرے سپہ سالار نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہ تھے "سیف اللہ" خالد بن ولیدؓ۔ آپ نے جس عقلمندی، دلیری اور بہادری سے جنگوں میں کام کیا اور جس طرح فوجوں کو ترتیب دے کر انھیں دشمن کے مقابلہ میں بھیجا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عراق مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ سلطنتِ ایران کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور یرموک کی جنگ کے بعد شام اور فلسطین سے رومی سلطنت کا اقتدار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایران اور روم میں مسلمانوں کی کامیابی کے ہم نے جو اسباب گنوائے ہیں یورپین مستشرقین نے بھی کم و بیش انھی اسباب کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے ہم علٰحدہ علٰحدہ ہر مستشرق کی رائے کو درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ البتہ پروفیسر نجار نے متذکرہ بالا اسباب کے علاوہ چند مزید اسباب بھی بیان کیے ہیں جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نجار لکھتا ہے:

"عربوں کا یہ خاصہ تھا کہ وہ جب بھی باہر نکلتے خواہ سفر کے لیے خواہ جنگ کے لیے، تو اپنے ساتھ کم سے کم سامان لیتے اور بہت ہلکے پھلکے ہو کر نکلتے۔ وہ خانہ بدوش تھے اور ان کا کسی ایک جگہ قیام نہ ہوتا تھا اس لیے لازماً انھیں ایسا کرنا پڑتا تھا، صحرائی علاقہ میں رہنے کی وجہ سے جہاں میلوں تک نہ پانی کا نشان نظر آتا ہے

نہ کسی قسم کی خوراک کا، انھیں بھوک اور پیاس کو برداشت کرنے کی عادت بھی پڑی ہوئی تھی اور وہ بہت کم غذا پر قائم ہو سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آسانی کے ساتھ لمبے سے لمبے سفر کر سکتے اور اپنے دشمن پر اچانک چھاپہ مار سکتے تھے۔ اس کے بالمقابل ایرانی اور رومی فوجیں سامانِ جنگ اور سامانِ رسد وغیرہ کی ایک کثیر مقدار اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ انھیں اپنے عالی شان خیموں کو اکھاڑنے اور بار کروانے میں ہی کافی وقت لگ جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ نہ تیزی کے ساتھ سفر کر سکتی تھیں اور نہ اچانک دشمن کے سر پر پہنچ کر اسے ہراساں یا مغلوب کر سکتی تھیں۔"

مزید برآں عربی فوجیں فنِ مبارزت میں کافی مہارت رکھتی تھیں۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ عام لڑائی شروع ہونے سے پہلے فریقِ مخالف کی طرف سے ایک بہادر جس کو اپنی قوت و طاقت پر ناز ہوتا تھا، باہر نکلتا تھا اور اپنے دشمنوں کو چیلنج کرتا تھا کہ تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو میرے مقابلے پر آئے؟ جواب میں دوسری طرف سے بھی ایک بہادر نکل آتا تھا اور دونوں میں باہم لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔ چونکہ عرب کے گھوڑے ایرانی اور رومی گھوڑوں سے کہیں زیادہ تیز اور چالاک ہوتے تھے اور عرب تلوار کی لڑائی میں خوب مہارت رکھتے تھے اس لیے بالعموم انفرادی جنگ میں عرب شہسوار اپنے مدِ مقابل پر غالب آجاتا تھا اور اس کو قتل کر دیتا تھا جس سے فریقِ مخالف کے حوصلے پست ہو جاتے تھے اور وہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو جاتا تھا۔

عربوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پشت کی جانب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ وہ اس وقت تک کبھی آگے نہ بڑھتے تھے جب تک مفتوحہ علاقہ کا انتظام پوری طرح نہ کر لیتے اور جب تک ان کو اس بات کا پورا یقین و وثوق نہ ہو جاتا کہ دشمن کسی طرح بھی ان پر پیچھے کی جانب سے اچانک حملہ نہیں کر سکتا۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ بات نہایت اہم ہے جس کا جنگ کے دوران میں دشمن پر حملہ کرتے وقت اور پیچھے ہٹتے ہوئے خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ عربوں نے اس اہم نکتہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا اور اس طرح کبھی دشمن کو اپنے اوپر قابو نہ پانے دیا۔

(۲)

عراق میں فتوحات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی دُور اندیشی اور دُور بینی سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ ملک عرب کی مضبوطی نظامِ خلافت کی استواری اور اسلام کی شان و شوکت کے لیے قبائلِ عرب کا ایران اور روم سے برسرِ پیکار ہو جانا ضروری ہے۔ دشمنانِ اسلام

ؔ روم و ایران پر حملہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ خود یہ دونوں طاقتیں اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو تباہ کر دینے کی عملی تدابیر میں مصروف ہو گئیں۔ چنانچہ جنگ یرموک میں قیصر نے ایک لاکھ کی جمعیت مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجی تھی۔ اگر صدیق اکبرؓ کمال ہوشیاری اور مستعدی کے ساتھ اس فتنہ کا سر نہ کچلتے تو ایران و روم کی فوجیں بہت ہی جلد مدینہ اور مکہ کو تباہ کر کے رکھ دیتیں۔ (محمد احمد)

سے مصروفِ جنگ ہو کر وہ اپنے باہمی اختلافات بھول جائیں گے اور ان کی ساری کوششیں اپنے دشمنوں کو شکست دینے میں صرف ہو جائیں گی۔ حضرت ابوبکرؓ کی سیاست آپ کے کمال تدبر و فراست پر دلالت کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عرب قبائل کے دل سے ابھی تک دورِ جاہلیت کا اثر پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑائی جھگڑوں کے دلدادہ تھے اور باہمی خانہ جنگی کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس خطرہ کو بروقت بھانپ کر ان کی ساری توجہ دوسری طرف منعطف کر دی اور ان کو آپس کے لڑائی جھگڑوں کے لیے کوئی موقعہ ہی نہ ملا۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دل میں یہ خیال اس وقت اور بھی راسخ ہو گیا جب مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور سوید بن قطبہ عجلی نے آپ کو لکھا کہ ایران اس وقت دورِ انحطاط سے گزر رہا ہے وہاں کے حالات بہت جلدی جلدی پلٹا کھا رہے ہیں اور ایرانی قوم میں کمزوری راہ پا چکی ہے۔ ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ وہ ان دونوں کی مدد کے لیے لشکر روانہ کریں۔ ان لشکروں کی مدد سے وہ ایران پر چڑھائی کر دیں گے۔ مثنیٰ بن حارثہ اور سوید بن قطبہ دونوں قبیلہ بنی بکر بن وائل سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن سرحد پر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ اکثر عجمی سرزمین پر چھاپے مارا کرتے تھے اور جو کچھ ہاتھ لگتا سمیٹ لایا کرتے تھے۔ لیکن خود کسی کے ہاتھ میں نہ آتے تھے۔ مثنیٰ حیرہ کی جانب سے چھاپہ مارتا تھا اور سوید ابلہ کی جانب سے۔ خیال غالب یہی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے دوران میں بھی ان دونوں کا یہی کام تھا کہ اپنے اردگرد کی زمینوں پر چھاپے مارتے اور جس قدر مال ملتا وہ لے کر چلے آتے۔ دشمن اگر پیچھا کرتا تو اس کی نظروں سے بچ کر عرب کے صحرا میں غائب ہو جاتے اور کسی کے ہاتھ نہ آتے۔

حضرت ابوبکرؓ اسی فکر میں تھے کہ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے عرب آپس کے لڑائی جھگڑوں میں نہ الجھ جائیں۔ کیونکہ مرتدین کے استیصال کے بعد جو سکون وجود پیدا ہو گیا تھا اس نے اس خطرہ کو اور قریب کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں مثنیٰ کا خط پہنچا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کو ایران پر چڑھائی کرنے کا حکم

جس وقت یہ خط حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا تو حضرت خالدؓ بن ولید بنو حنیفہ کی بغاوت کے استیصال سے فارغ ہو چکے تھے۔ آپ نے ان کو ایران پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا اور کہلا بھیجا کہ اپنی مہم کا آغاز ہند کی سرحد (ابلہ) سے کریں۔ عیاض بن غنم کو حکم دیا کہ وہ شمال کی طرف سے ایران پر حملہ آور ہوں اور اپنے حملہ کی ابتدا مضیح سے کریں جو شمالی عراق میں واقع تھا۔ آپ نے ان دونوں کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ایران پر چڑھائی کرنے کے لیے کسی شخص کو مجبور نہ کریں۔

حضرت ابوبکرؓ کے اس حکم سے کہ صرف انہی اشخاص کو اس مہم میں شامل کیا جائے جو بطیبِ خاطر اس کے لیے آمادہ ہوں اور کسی شخص کو مہم میں شمولیت پر مجبور نہ کیا جائے۔ آپ کی دقتِ نظر اور دُور اندیشی کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔ آپ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ ایرانیوں سے مقابلہ کے لیے ایسے لوگوں کو بھی ساتھ لے جایا جائے جو اس مہم میں شامل ہونا پسند نہ کرتے ہوں۔ آپ کی یہ رائے صحیح اور بالکل درست رائے تھی کہ اسلامی لشکر صرف ان لوگوں پر مشتمل ہونا چاہیے جو اپنی خوشی سے اس مہم میں شمولیت کریں نہ کہ خوف اور جبر کی وجہ سے۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید کو یمامہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکتوب ملا تو آپ نے ایرانی سرحد کے سپہ سالار اور سردار ہرمز کو ایک تہدیدی خط بھیجا جس میں لکھا:

حضرت خالدؓ بن ولید کا ہرمز کے نام مکتوب

"یا اسلام لے آؤ یا ذمی بن کر ہماری سلطنت میں شامل ہونا اور جزیہ دینا قبول کرو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر بعد میں پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ پھر تم اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرنا۔ ہم اپنے ساتھ ایک ایسی قوم کو لا رہے ہیں جو موت سے اسی طرح محبت کرتی ہے جس طرح تم زندگی سے۔"

حضرت خالدؓ بن ولید نے ہرمز کو اپنے لشکر کے متعلق جو کچھ لکھا تھا درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی وہی چاہتے تھے آپ کی خواہش تھی کہ لشکر میں صرف ایسے لوگ شامل ہوں جن کی نظروں میں موت کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ ہو اور وہ موت کو انتہائی حقیر شئے سمجھتے ہوں۔ کیونکہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو میدانِ جنگ میں بے جگری سے لڑتے ہیں اور زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے خطرناک سے خطرناک جگہوں میں بے دھڑک گھس جاتے ہیں۔ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ حکم دے دیتے کہ طوعاً و کرہاً ہر شخص کو لشکر میں شامل کیا جائے تو لشکر میں ضعف اور ابتری پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ اب مقابلہ ایسے دشمن سے تھا جو تعداد، قوت، طاقت، سامانِ جنگ، غرضیکہ ہر لحاظ سے عربوں سے برتر تھا اور خود عربوں کو بھی اس کی برتری کا اعتراف تھا۔ مزید برآں مسافت بھی دور کی تھی۔ اس بنا پر مقابلہ کے لیے صرف ایسے ہی اشخاص کی ضرورت تھی جو موت سے ڈرنے والے نہ ہوں اور اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لے کر نکلیں۔ اگر ایسے لوگوں کو بھی ساتھ ملا لیا جاتا جو دل سے اس مہم میں شمولیت پر راضی نہ تھے تو سوائے لشکر میں بددلی پھیلنے، کمزوری پیدا ہونے اور آخر کار دشمنوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی عراق کو روانگی

حضرت خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کو صرف ایک ہی راستے سے لے کر نہیں چلے بلکہ لشکر کے تین حصے کر کے انھیں تین مختلف راستوں سے یکے بعد دیگرے عراق[1] کے ایرانی صوبے کی طرف روانہ کیا۔ آپ نے مثنیٰ بن حارثہ کو جو ابلہ کے مقام پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زیرِ ہدایت حضرت خالدؓ بن ولید سے آملے تھے سب سے پہلے روانہ کیا۔ اس کے ایک روز بعد عدی بن حاتم کی سرداری میں لشکر بھیجا۔ تیسرے روز عاصم بن عمرو کو لشکر کے تیسرے حصے کے ہمراہ روانہ کر دیا اور اس کے بعد خود نکلے۔ لشکر کے تمام حصوں کو مقام حفیر میں مل جانے کی ہدایت تھی تاکہ دشمن پر اجتماعی حملہ کیا جا سکے۔

ادھر جب ہرمز کو حضرت خالدؓ بن ولید کا خط ملا تو اس نے شہنشاہِ ایران کسریٰ ازدشیر کو سارے معاملہ کی اطلاع دی۔

---

[1] عراق دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع ہے۔ پرانے زمانہ میں یہ علاقہ عرب کا ایک حصہ تھا اور عرب قبائل ہی یہاں رہتے تھے۔ لیکن ایران نے نہ صرف یہ کہ عرب کے اس حصہ پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ فرات کے مغرب کی طرف بھی اپنا تسلط جما لیا تھا اور اس علاقہ کی بعض اقوام ایران کی باجگزار ہو گئی تھیں۔ (محمد احمد پانی پتی)

ساتھ ہی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے لشکر بھی جمع کیا اور یمامہ کی جانب واقع ایک شہر "کاظمہ" کا رُخ کیا۔ راستے میں اسے پتا چلا کہ مسلمانوں کا لشکر "حفیر" میں جمع ہو رہا ہے۔ یہ سُن کر اس نے لشکر کی باگیں "حفیر" کی طرف موڑ دیں۔

جب حضرت خالدؓ کو اس کی خبر ملی تو وہ اپنی فوج کو لے کر "کاظمہ" کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجبوراً ہرمز کو بھی کاظمہ کا رُخ کرنا پڑا۔ حضرت خالدؓ نے اغلباً حفیر کو چھوڑ کر کاظمہ جانا اس لیے پسند کیا کہ آپ کے خیال میں وہ جگہ لڑائی کے لیے نسبتہ موزوں تھی۔ ہرمز انتہائی عقلمند اور جہاں دیدہ جرنیل تھا۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید کاظمہ پہنچے تو ہرمز پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ چونکہ پانی کی جگہ پر ہرمز اور اس کے لشکر نے قبضہ کر لیا تھا اس لیے حضرت خالدؓ کو مجبوراً ایسی جگہ اترنا پڑا جہاں پانی کا نشان تک نہ تھا۔

غزوۂ ذات السلاسل

لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے حضرت خالدؓ بن ولید میدان میں نکلے اور ہرمز کو مقابلہ کے لیے طلب کیا۔ ہرمز میدان میں آیا اور دونوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ ہرمز چاہتا تھا کہ دھوکا دے کر حضرت خالدؓ کو شہید کر دے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کام نہ آئی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے اس پر قابو پا کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایرانی لشکر مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس جنگ میں ایرانیوں کو زبردست شکست اٹھانی پڑی۔ یہ لڑائی "ذات السلاسل" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس جنگ میں ایرانی سپاہیوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں باندھ لیا تھا تاکہ کوئی شخص بھاگ نہ سکے اور سپاہ آخری وقت تک لڑتی رہے۔

قارن کا حضرت خالدؓ بن ولید سے مقابلہ اور شکست

کسریٰ نے ہرمز کی مدد کے لیے "قارن بن قریانس" کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا تھا۔ جب یہ لشکر موجودہ شہر بصرہ سے بیس میل دور شمال میں "مذار" کے مقام پر پہنچا تو ہرمز کی شکست خوردہ فوج اس سے آملی۔ قارن نے اس فوج کو اپنے ساتھ ملا کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ مثنیٰ کو جب یہ پتا چلا کہ قارن ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے تو انھوں نے اس کی اطلاع حضرت خالدؓ بن ولید کو دی۔ اس وقت حضرت خالدؓ نے پہلا کام یہ کیا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کی اور ولید بن عقبہ کو مالِ غنیمت کا خمس دے کر فتح کی خوشخبری کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس مدینہ روانہ کر دیا اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ "ثنی" کے مقام پر ایرانی فوجوں کا زبردست اجتماع ہو رہا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر آپ اپنے تھکے ماندے لشکر کو ساتھ لے کر آگے بڑھے اور "قارن" کے لشکر کے بالمقابل پہنچ گئے۔ لڑائی کا آغاز مبارزت سے ہوا اور اس کے بعد عام معرکہ شروع ہو گیا۔ اس جنگ میں بھی مسلمانوں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا، اور ایرانی فوج کی صفیں کی صفیں اُلٹ دیں۔ ہزاروں ایرانی ہلاک ہو گئے اور ان کے بڑے بڑے سردار قارن، انوشجان اور قباذ مارے گئے۔ جب ایرانیوں کو شکست ہو گئی تو وہ مشرقی جانب بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا، لیکن ایرانی کشتیوں میں سوار ہو کر پار نکل گئے اور مسلمانوں کے ہاتھ نہ آ سکے۔ طبری نے اس جنگ میں کام آنے والے ایرانیوں کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے مالِ غنیمت اپنی فوجوں میں تقسیم کیا اور خمس سعید بن نعمان کے ہاتھ فتح کی خوشخبری کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں روانہ کردیا۔

جنگِ ولجہ جب کسریٰ کو مدائن میں ایرانی افواج کی ہزیمتوں کی خبر پہنچی تو دربار میں زبردست اضطراب پیدا ہوگیا۔ کسریٰ نے فوراً ایک اور زبردست لشکر" اندرزغر" کی زیرِ قیادت مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ اندرزغر مدائن سے نکل کر" ولجہ" نامی مقام پر پہنچا جہاں اس نے عرب کے نصاریٰ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اِدھر کسریٰ نے اس کے پیچھے مدد کے لیے ایک دوسری فوج بہمن جاذویہ کی سرکردگی میں روانہ کی۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید کو ان فوجوں کے آنے کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ ایرانی کہیں دھوکہ سے لشکر کی پشت پر حملہ نہ کردیں، سب سے پہلے لشکر کی پشت کے تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا اور خطِ رجعت کو محفوظ و مامون رکھنے کے لیے جابجا دستے متعین کردیے۔ اس کے بعد لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ آپ نے تین اطراف سے حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ دشمن کے دو جانب کمین گاہوں میں اپنی فوج کو چھپا دیا اور لشکر کے ایک حصہ کو ساتھ لے کر خود سامنے سے حملہ کردیا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ شدید جنگ کے بعد جب طرفین کے حوصلے پست ہونے لگے تو اسلامی فوج کے جو دستے کمین گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے انھوں نے یکے بعد دیگرے اپنی جگہوں سے نکل کر ایرانی فوج پر دھاوا بول دیا۔ ایرانی فوج اس ناگہانی حملہ کے لیے تیار نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس میں شکست کے آثار پیدا ہونے لگے مسلمانوں نے ایرانیوں کو اپنی تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ بہت سے ایرانی قتل ہوئے، باقی بھاگ گئے۔ بھاگنے والوں میں لشکر کا سپہ سالار اندرزغر بھی تھا جو صحرا کی طرف نکل گیا اور وہیں پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر مرگیا۔

معرکۂ الّیس اس جنگ میں بکر بن وائل کے بہت سے عیسائی بھی مارے گئے تھے۔ اس سے ان کے ہم قوم عیسائی جوش میں آگئے اور انھوں نے دربارِ کسریٰ میں لکھا کہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے ان کی مدد کی جائے۔ خود وہ انبار کے متصل الّیس نامی مقام پر جمع ہونے لگے اور بہمن جاذویہ کا انتظار کرنے لگے جس کو اندرزغر کی مدد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اندرزغر کے لشکر کو شکست ہوچکی تھی۔ الّیس کے مقام پر ایک ایرانی سردار "جابان" بھی پہلے سے موجود تھا۔

جب حضرت خالدؓ کو الّیس پر دشمن کے مجتمع ہونے کی خبر ملی تو آپ اپنی فوج کو لے کر تیزی سے روانہ ہوگئے۔ آپ کا خیال تھا کہ دشمن کو کمک پہنچنے سے پہلے ہی اس پر حملہ کردیا جائے۔ جب حضرت خالدؓ الّیس پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی بے فکر بیٹھے کھانے پینے میں مشغول ہیں۔ اگرچہ دشمن کو پتا چل گیا تھا کہ خالدؓ آ پہنچے ہیں مگر انھوں نے کوئی پروا نہ کی اور بے فکری سے اپنے کاموں میں لگے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ خالدؓ کی فوج تھکی ہوئی ہے اور سفر کی مشقت کی وجہ سے وہ فوراً حملہ نہ کرے گی بلکہ کچھ سستائے گی۔

حضرت خالدؓ کے لیے دو راستے تھے، یا تو کچھ دیر آرام کرتے اور حملہ کو اگلے روز پر ملتوی کردیتے، یا فوراً ہلہ بول دیتے۔ لیکن جب آپ نے دشمن کی فوج کو اس حالت میں دیکھا تو مصلحت اسی میں سمجھی کہ حملہ فوراً شروع کردیا جائے۔ چنانچہ آپ

اپنی فوج کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ دشمن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خالدؓ آتے ہی حملہ شروع کر دیں گے۔ وہ گھبرا گئے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں اور ان کے حلیفوں پر زبردست حملہ شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ ایرانیوں کو یہ اُمید تھی کہ بہمن جاذویہ ایک زبردست لشکر لے کر ان کی مدد کو آ رہا ہے اس لیے وہ اس آس پر میدان میں جمے رہے لیکن آفتاب تک ایرانی لشکر میں کمزوری کے آثار پیدا ہونے لگے ادھر مسلمانوں نے ایرانیوں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر میں بھاگڑ مچ گئی۔ بہت سے قتل ہوئے اور ان کا سارا سامان مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس طرح الیس کی لڑائی بھی دوسری لڑائیوں کی طرح ایرانیوں کی شکست پر منتج ہوئی۔

یہ تمام لڑائیاں جن کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے صفر سنہ ۱۲ھ میں ہوئیں۔ صرف ابلہ کی لڑائی محرم میں ہوئی تھی۔ حضرت خالدؓ کے لشکر کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی اور ہر موقعہ پر اسی لشکر کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔

امغیشیا کا حصول

الیس کی لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید "امغیشیا" کی جانب روانہ ہوئے۔ جب وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کی آمد کی خبر سُنی تو وہ شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تتر بتر ہو گئے۔ امغیشیا حیرہ کی طرح ایک بہت بڑا شہر تھا۔ مسلمانوں کو وہاں اتنا سامان ملا کہ اب تک کسی جنگ میں نہ ملا تھا۔ ایک ایک سوار کے حصے میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار درہم آئے۔ اس کے علاوہ حضرت خالدؓ نے ان لوگوں کو جنھوں نے لڑائیوں میں غیر معمولی جرأت، دلیری اور بہادری کے مظاہرے کیے تھے مزید بیش قرار انعامات بھی دیے۔ خمس حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا جس کو دیکھ کر آپ بیحد خوش ہوئے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد حضرت خالدؓ نے اس شہر کو ڈھا دینے کا حکم دیا۔

سقوطِ حیرہ

حیرہ[1] کے مرزبان (ایرانی حاکم) نے جب "امغیشیا" کا حال سُنا تو ڈرا کہ چند دنوں میں خالدؓ یہاں پہنچ جائیں گے اور پھر اس کی خیر نہیں۔ چنانچہ اس نے لڑائی کی تیاری کی اور اپنے بیٹے کو آگے آگے روانہ کر دیا۔ اس کے پیچھے خود بھی لشکر لے کر حیرہ سے باہر نکل آیا۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مرزبان کے لڑکے کی فوج سے مُڈھ بھیڑ ہوئی۔ حضرت خالدؓ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے دی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا لشکر بھی ان سے آ کر مل گیا اور اس کو ساتھ لے کر حضرت خالدؓ نے حیرہ کا رُخ کیا اور خورنق اور نجف کے درمیان پڑاؤ ڈالا۔

حاکمِ حیرہ "ازاذبہ" کو اپنے بیٹے کا حشر معلوم ہوا اور عین اسی وقت اس نے کسریٰ اردشیر کی وفات کی خبر بھی سُنی۔ یہ دونوں باتیں سُن کر اُس کی رُوح خشک ہو گئی۔ اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ حضرت خالدؓ کے حیرہ پہنچنے سے پہلے وہ بغیر لڑے دریائے فرات پار کر کے اندرونِ ملک میں بھاگ جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ توقع کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید چند روز بعد حیرہ پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ روز تک تو شہر کے باشندے مسلمانوں کے مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ لیکن جب محاصرہ نے شدت اختیار کی تو اُنھوں نے عاجز آ کر اپنے سرداروں کو صلح پر مجبور کیا۔ تمام سردار اپنے اپنے محلات سے نکل کر حضرت

---

[1] اس زمانہ میں حیرہ عراق کے عربی رئیسوں کا جو سلطنت ایران کے باجگزار تھے صدر مقام تھا۔

خالدؓ کے پاس گئے اور ان سے صلح کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ ہر رئیس سے علٰحدہ علٰحدہ ملے اور ان کو کافی سرزنش کی۔ منجملہ اور باتوں کے آپؓ نے ان سے کہا:

"تم پر افسوس ہے۔ تم آخر کون ہو؟ کیا عرب ہو؟ اگر عرب ہو تو تم عربوں سے کس بات کا انتقام لیتے ہو؟ کیا عجمی ہو؟ اگر عجمی ہو تو تمھیں انصاف اور عدل کی مخالفت کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟"

پھر آپ نے ان سے فرمایا:

"تمھیں تین باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی ہوگی،

پہلی بات یہ کہ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ۔ اس طرح جو سہولتیں ہمیں میسر ہوں گی وہی تمھیں بھی ہوں گی اور جو حقوق ہم پر واجب ہوں گے وہی تم سے لیے جائیں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تم جزیہ دینا قبول کرو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ہمارے مقابلہ میں آ جاؤ۔

خدا کی قسم ہم اپنے ساتھ ایک ایسی قوم لائے ہیں جو موت کی اتنی ہی خواہاں ہے جتنے تم زندگی کے۔"

ان سرداروں نے کہا:

ہم جزیہ دینا قبول کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ جزیہ پر مصالحت ہو گئی۔ حضرت خالدؓ نے فتح کی خوشخبری کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں وہ تحفے بھی ارسال کر دیے جو سردارانِ حیرہ نے قدیم دستور کے مطابق حضرت خالدؓ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان تحفوں کو اس شرط پر قبول کیا کہ یہ جزیہ کی رقم میں شمار ہوں گے تحفوں کی حیثیت میں نہیں۔

اہلِ حیرہ کے ساتھ عہدنامہ

حضرت خالدؓ نے اہلِ حیرہ کے ساتھ جو عہدنامہ کیا اس کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

یہ وہ عہدنامہ ہے جو خالدؓ بن ولید نے حیرہ کے رؤسا عدی اور عمر پسرانِ عدی، عمرو بن عبد المسیح، ایاس بن قبیصہ اور حیری بن کال سے کیا ہے۔ اس معاہدے پر اہلِ حیرہ بھی راضی ہو گئے ہیں اور انھوں نے اس کی منظوری دے دی ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے اہلِ حیرہ ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے۔ اس کے بدلے ہم مسلمانوں کے ذمہ ان کی حفاظت ہے۔ اگر ہم ان کی محافظت نہ کریں تو ان کے اوپر کوئی رقم واجب نہیں۔ اور اگر اہلِ حیرہ قولاً یا فعلاً بدعہدی کریں تو ہم ان سے بری الذمہ ہیں۔ یہ معاہدہ ربیع الاوّل ۱۲ھ میں لکھا گیا۔"

جب حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے صلح کر لی تو صلوبا بن نسطونا جو قس ناطف کا رئیس تھا حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس آیا اور آپ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے دریائے فرات کے کنارے اس کی جتنی زمین تھی اس کے بدلے اس نے بارہ ہزار دینار سالانہ دینے کا اقرار کیا۔

جنوبی عراق پر مسلمانوں کا تسلط

ایرانی مرزبان اور دہقان (زمیندار، جاگیردار، رئیس وغیرہ) تمام صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لے رہے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ حضرت خالدؓ بن ولید حیرہ والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت خالدؓ کو ہر جگہ فتوحات ہی نصیب ہو رہی ہیں اور آپ بہت آسان شرائط پر مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے صلح کر رہے ہیں تو فلالیج سے ہرمزجرد تک کے رؤسا نے آکر بیس لاکھ درہم سالانہ جزیہ پر صلح کر لی۔ ان لوگوں کے لیے بھی باقاعدہ عہد نامے لکھے گئے۔

فتح حیرہ کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے ضرار بن ازور، ضرار بن خطاب، مثنیٰ بن حارثہ، ضرار بن مقرن، قعقاع بن عمرو، بسر بن ابی رہم اور عتیبہ بن نہاس سردارانِ لشکر کو حیرہ کے اطراف و جوانب میں چھوٹے چھوٹے لشکروں کے ہمراہ روانہ کیا اور حکم دیا کہ اگر راستے میں کسی جگہ مزاحمت کی جائے تو مقابلہ کرو اور اس وقت تک بس نہ کرو جب تک یہ تمام علاقے اسلامی فوجوں کے زیرِ نگین نہ آجائیں۔ ان میں امن قائم نہ ہو جائے۔ اور کوئی جماعت ایسی نہ باقی رہ جائے جو اسلام قبول نہ کرے یا جزیہ نہ دے۔

ایرانی رؤسا اور عراقی امرائے نام حضرت خالدؓ بن ولید کے مکتوب

جب جنوبی عراق پر مسلمانوں کا پورا تسلط ہو گیا اور دجلہ تک کا تمام علاقہ حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو آپ نے ایک آدمی حیرہ کا اور ایک انباط کا بلا بھیجا۔ حیری باشندے کے ہاتھ آپ نے ایک خط ایرانی رؤسا کی طرف روانہ کیا اور انباطی کے ہاتھ ایک خط عراق کے ان امرا کے نام بھیجا جو زمیندار اور جاگیردار تھے اور ابھی تک انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔

ایرانی رؤسا کے نام مکتوب

ایرانی رؤسا کے نام حضرت خالدؓ بن ولید نے جو خط بھیجا اس کا مضمون یہ تھا:

" خالدؓ بن ولید کی طرف سے ایرانی رؤسائے کے نام

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے تمھارا سارا انتظام درہم برہم کر دیا۔ تمھاری تدبیروں کو بے اثر بنا دیا اور تمھارے اتحاد کو توڑ دیا۔ اگر ہم تمھارے ملک پر حملہ نہ کرتے تو یہ تمھارے حق میں برائی ہوتی۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم ہماری اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو ہم تمھیں اور تمھارے ملک کو چھوڑ کر کسی اور طرف چلے جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے ہماری اطاعت اور فرمانبرداری اختیار نہ کی تو

تم کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں مغلوب ہونا پڑے گا، جو موت کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا تم زندگی کو۔"

عراقی اُمرا کے نام مکتوب

نبطی کے ہاتھوں عراق کے امرأ و رؤسأ، زمینداروں اور جاگیرداروں کو جو خط روانہ کیا اس کا مضمون یہ تھا:

"خالدؓ بن ولید کی طرف سے فارس کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے نام

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے تمھاری عزت کو خاک میں ملا دیا۔ تمھارے اتفاق و اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تم اسلام قبول کرو۔ کیونکہ اسی طرح تم امن میں رہو گے یا ہماری حفاظت میں آ کر ذمی بن جاؤ اور جزیہ ادا کرو۔ اگر تم نے یہ باتیں قبول نہ کیں تو میں ایسی قوم تمھارے پاس لایا ہوں جو موت کو اتنا ہی پسند کرتی ہے جتنا تم شراب پینے کو۔"

حضرت خالدؓ بن ولید کے خطوط پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کو اپنے لشکر پر بہت ناز تھا اور جس کو بھی خط لکھتے تھے اس کو یہ کہہ کر ضرور ڈراتے تھے کہ اس کو ایسی قوم سے مقابلہ کرنا پڑے گا جو موت کی اتنی ہی عاشق ہے جتنے تم زندگی کے۔ یہ لکھ کر وہ کسی تعلّی کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ بالکل حق بات کہتے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فوج جو حضرت خالدؓ کے ساتھ تھی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور اسے اپنے وطن اور قوم سے دور ایک ایسی سلطنت سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جو جاہ و جلال، قوت و طاقت اور رعب و دبدبہ کے لحاظ سے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں سے ایک تھی۔ لیکن دشمن کی عظیم الشان قوت، محاذِ جنگ کی انتہائی دوری اور سفر کی انتہائی تکلیف دہ ہونے کے باوجود اس نے ایک مرتبہ بھی حوصلہ نہیں ہارا، اور حضرت خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں میدانِ جنگ میں شجاعت کے وہ وہ جوہر دکھائے جن کی مثال ملنی ناممکن ہے۔

کسریٰ اردشیر کی وفات کے بعد ایرانیوں میں اس مسئلہ پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ شاہی خاندان میں سے کس شخص کو بادشاہ بنایا جائے۔ ایک سال تک یہ جھگڑا چلتا رہا۔ اس عرصہ میں نہ اُنھوں نے عربوں سے لڑنے کے لیے کسی سپہ سالار کو بھیجا نہ کوئی لشکر روانہ کیا۔ اور مسلمانوں نے دجلہ تک کے تمام علاقے پر تسلط جما لیا۔

اس دوران میں ایرانیوں نے سوائے "بہرسیر" کے اور کسی جگہ مسلمان فوجوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ "بہرسیر" ایران کا ایک بڑا شہر تھا اور دجلہ کے جنوب مغرب میں اس ایوان کے سامنے تھا جو دریا کی مشرقی سمت واقع تھا۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید کا خط جو رؤسائے ایران کے نام آپ نے لکھا تھا، پہنچا تو ایران میں بڑی تشویش پیدا ہوئی اور اہلِ ایران نے فیصلہ کیا کہ اس موقعہ پر باہمی اختلافات کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک شخص کو جو شاہی خاندان میں سے نہیں تھا اس وقت تک کے لیے چن لیا جب تک کہ آلِ کسریٰ میں سے کوئی ایسا موزوں شخص نہ مل جائے جسے بادشاہت سونپی جا سکے۔ جس آدمی کو اُنھوں نے چُنا وہ "فرخ زاد خسرو" تھا۔ لیکن اس شخص کے ہاتھ میں زیادہ دیر تک بادشاہی نہ رہی اور اہلِ ایران نے یزدجرد بن شہریار کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے حضرت خالدؓ اور آپ کے لشکر سے لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

(۳)

عراق پر اسلام کا تسلط

انبار کی فتح حیرہ کی فتح کے بعد جنوبی عراق کا سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِنگین آگیا۔ اب حضرت خالدؓ بن ولید نے شمالی عراق کا قصد کیا۔ اس علاقہ کی تسخیر کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عیاض بن غنم کو بھیجا تھا۔ لیکن وُہ یہاں کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ حضرت خالدؓ نے حیرہ پر قعقاع بن عمرو کو مقرر کیا اور اپنے لشکر کو لے کر انبار پہنچ گئے۔ انبار دریائے فرات کے کنارے موجودہ بغداد کے مغرب میں دس فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید انبار پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے قلعہ بند ہو گئے ہیں۔ قلعوں کے اندر خندقیں کھودلی ہیں اور خود فصیلوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے لشکر کو تیر برسانے کا حکم دیا۔ اس طرح سیکڑوں آدمی مارے گئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید انتظار میں وقت گنوانے والے نہ تھے اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"میں ایسی قوم کو دیکھ رہا ہوں جسے جنگ کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ تم تاک تاک کر ان کی آنکھوں میں تیر مارو، اور سوائے آنکھوں کے اور کسی چیز کو نشانہ نہ بناؤ۔"

چنانچہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ مورخین کے مطابق ایک دن میں مسلمانوں نے ایک ہزار آدمیوں کو اندھا کر دیا۔

اب حضرت خالدؓ نے اپنی توجہ خندق کی طرف مبذول کی اور اسے پار کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ آخر کار ایک بہت عمدہ تدبیر آپ کو سُوجھ گئی۔ آپ نے لشکر کے تمام کمزور اونٹوں کو ذبح کرنے اور ان کو خندق میں پھینکنے کا حکم دیا۔ اس طرح خندق کا ایک حصہ ذبح شدہ اُونٹوں سے پُر ہو گیا، جس کا ایک پُل سا بن گیا۔ اب آپ نے لشکر کو حکم دیا کہ اُونٹوں کے پُل پر سے گزر کر قلعہ پر حملہ کر دے۔ چنانچہ مسلمانوں نے پہلے دمدمہ پر قبضہ کیا اور اس کے بعد فصیل پر پہنچ کر دشمن سے جنگ شروع کر دی۔ گو ایرانیوں نے بڑی بہادری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ جب ان کے سردار "شیرزاد" نے یہ ماجرا دیکھا تو صلح کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ نے اس شرط پر صلح کی کہ ایرانی قلعہ کو خالی کر دیں اور بغیر کچھ مال و متاع لیے یہاں سے نکل کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انبار کا قلعہ ایرانیوں سے خالی ہو گیا۔

جنگِ عین التمر جب فتح پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور انبار کے اطراف کے رئیسوں نے بھی جزیہ پر صلح کر لی تو حضرت خالدؓ "زبرقان بن بدر" کو انبار میں چھوڑ کر خود عین التمر روانہ ہوئے جو کوفہ کے مغرب میں انبار کے قریب ایک قصبہ تھا اور جہاں "مہران بن بہرام" ایرانیوں اور عربوں کی ایک بہت بڑی جمعیت لیے پڑا تھا۔ نیز عقہ بن ابی عقہ بھی قبائل نمر، تغلب، ایاد کے نصارائے عرب کو ساتھ لیے موجود تھا۔ جب ان لوگوں نے حضرت خالدؓ کے آنے کی خبر سُنی تو عقہ نے مہران سے کہا:

"عرب لوگ عربوں سے لڑنا خوب جانتے ہیں اس لیے تم ہمیں خالد سے لڑنے دو۔"

مہران نے کہا:

"بے شک تم عربوں سے لڑنا خوب جانتے ہو جس طرح ہم عجمیوں سے لڑنا خوب جانتے ہیں۔"

اس زمانہ میں عجمی عربوں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب اس طرح مہران نے عجمیوں کو عربوں سے علٰحدہ کر لیا تو اس کے بعض آدمیوں نے اس کو ملامت کی جس پر اس نے کہا:

"کوئی فکر نہیں، میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تمہارے فائدے کے لیے اور ان کے نقصان کے لیے کیا ہے کیونکہ اب تمہارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جنھوں نے تمہارے بڑے بڑے روٴسا اور سپہ سالاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ تمہاری تلواروں کی دھاروں کو کند کر دیا ہے۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے تمھیں ان کے حملوں سے بچایا ہے۔ اگر ان لوگوں نے خالدؓ پر قابو پا لیا تو اس فتح میں تمھارا ہی نام ہوگا۔ لیکن اگر ان کو شکست ہوگئی تو خالدؓ کی فوجیں اس وقت تم تک پہنچ سکیں گی جب تک وہ تھک کر چور ہو چکی ہوں گی ہم تازہ دم ہو کر ان کا مقابلہ کریں گے اور ان پر فتحیاب ہوں گے۔"

مہران کی ان باتوں سے اس کی قوم کی تسلی ہوگئی اور یہ لوگ علٰحدہ کھڑے ہو کر دیکھتے رہے کہ عقہ کیا کرتا ہے!

عقہ میدانِ جنگ میں حضرت خالدؓ کے مقابلے کے لیے نکلا۔ مہران اپنی فوج کے ساتھ قلعہ میں تھا۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید نے عقہ کو آتے دیکھا تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں ہی اس شخص کے ساتھ نبٹ لوں گا، تم علٰحدہ کھڑے دیکھتے رہو۔

عقہ فوجوں کی صفوں کی ترتیب اور درستگی میں مصروف تھا کہ حضرت خالدؓ اس پر اچانک جھپٹے اور اسے زندہ گرفتار کر لیا۔ اس کی فوج اپنے سپہ سالار کو حضرت خالدؓ کے ہاتھوں میں زندہ گرفتار دیکھ کر بھاگی اور اس طرح بغیر لڑائی کے مسلمانوں نے اپنے دشمن عیسائیوں پر فتح پا لی۔

جب مہران کو یہ خبر پہنچی تو اس کے حواس باختہ ہوگئے اور وہ اپنی فوج کو لے کر چپکے سے قلعہ سے کھسک گیا۔ جب عقہ کا شکست خوردہ لشکر قلعہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ایرانی فوج وہاں سے جا چکی ہے۔ اس نے قلعہ کے دروازے بند کر لیے اور اندر محصور ہو کر بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خالدؓ بھی دوسرے عرب سالاروں کی طرح ہیں جو مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور حضرت خالدؓ نے بدستور ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ خالدؓ انھیں کسی طرح چھوڑنے والے نہیں تو مجبور ہو کر انھوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور قلعہ کے دروازے کھول دیے۔ حضرت خالد بن ولید نے ان کے سرداروں عقہ اور عمرو بن الصعق کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا۔ باقی عیسائی عرب بھی جو قلعہ میں پناہ گزین تھے قتل کر دیے گئے۔ قلعہ میں چالیس بچے بھی ملے۔ ان کو قید کر کے مسلمان فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان بچوں میں فاتح اندلس موسیٰ کے والد نصیر اور محمد بن سیرین کے والد سیرین بھی تھے۔

عیاض بن غنم کی حضرت خالدؓ بن ولید سے استمداد

پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عیاض بن غنم کو شمالی عراق فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا اور انھیں حکم دیا تھا کہ خالدؓ کے ساتھ حیرہ کے مقام پر مل جائیں۔ حضرت خالدؓ بن ولید اس دوران میں فتح پر فتح حاصل کر رہے تھے وہ سرحدی قبائل اور رؤسا کو زیرنگین کر کے ایرانی سرداروں اور ایرانی فوجوں سے برسرپیکار تھے لیکن عیاض بن غنم کو ابھی تک عیسائی خود مختار رؤسا سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ جس علاقہ میں وہ مصروفِ جنگ تھے وہ علاقہ ایران، عراق اور شام کی سرحد پر واقع تھا۔ جب حضرت خالدؓ بن ولید عین التمر کی لڑائی سے فارغ ہوئے تو انھیں عیاض بن غنم کا خط ملا جس میں ان سے مدد طلب کی گئی تھی۔ عیاض بن غنم اس وقت شمالی عراق میں "دومۃ الجندل" کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن مسلمان فوج کے لیے اس وقت حالات سخت خطرناک تھے اور اندیشہ تھا کہ کہیں چاروں طرف سے دشمن ان پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ اس لیے انھوں نے حضرت خالدؓ کو اپنی امداد کے لیے خط لکھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کو جواب دیا:

"من خالد الی عیاض: ایاك ارید

البیس قلیلاً تاتك الحلائب   یحملن آسادا علیها القاشب

کتائب یتبعها کتائب"

[از جانب خالد بنام عیاض۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔
کچھ انتظار کرو، عنقریب تمہارے پاس ایسی اونٹنیاں پہنچیں گی جن پر خونخوار شیر سوار ہوں گے
تمہارے پاس فوجوں کے بعد فوجیں پہنچیں گی]

حضرت خالدؓ بن ولید کی دومۃ الجندل کو روانگی

حضرت خالدؓ بن ولید نے عین التمر کو عویم بن الکاہل کی نگرانی میں چھوڑا اور خود فوجوں کے ساتھ دومۃ الجندل روانہ ہو گئے۔ جب باشندگانِ دومۃ الجندل کو حضرت خالدؓ کے آنے کا پتا چلا تو انھوں نے اپنے حلیف عیسائی قبائل عرب بہراء، کلب، غسان، تنوخ، ضجاعم کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ اس وقت دومۃ الجندل میں جو فوج موجود تھی اس کے دو سردار تھے، ایک اکیدر بن عبدالملک جس کو حضرت خالدؓ نے غزوۂ تبوک میں قید کیا تھا۔ دوسرا جودی بن ربیعہ۔

اکیدر کو حضرت خالدؓ کی جرأت اور بہادری کا پورا حال معلوم تھا اس نے اپنی قوم سے کہا:

"میں خالدؓ کو تم سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں ان سے زیادہ مبارک فال اور لڑائی میں تیز دست سپہ سالار میں نے آج تک کوئی نہیں دیکھا۔ کوئی فوج خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اگر خالدؓ کے مقابلہ پر آئے گی تو اس کے لیے سوائے شکست کھانے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ تم میرا کہنا مانو اور مسلمانوں سے صلح کر لو۔"

لیکن اس کی قوم نے اس کی بات نہ مانی جس پر وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا اور راستے میں ہی مارا گیا۔

جنگِ دُومۃ الجندل

حضرت خالدؓ بن ولید دُومۃ الجندل پہنچ چکے تھے۔ مشرکین کی فوجوں کے سردار اس وقت جودی بن ربیعہ اور ودیعہ کلبی تھے۔ حضرت خالدؓ نے عیاض بن غنم کی فوج کے ساتھ مل کر شہر پر حملہ نہیں کیا، بلکہ شہر کے ایک طرف عیاض کو مقرر کیا اور دُوسری طرف اپنا لشکر رکھا۔ اس طرح "دومۃ الجندل" خالدؓ اور عیاضؓ کے لشکر کے بیچ میں آ گیا۔ جودی بن ربیعہ اور ودیعہ کلبی کے لشکر حضرت خالدؓ کے مقابلے کے لیے نکلے اور باقی عیاض کے مقابلے کے لیے۔ لیکن مسلمانوں کے آگے مشرکین اور بیسائی فوجوں کی کچھ بھی پیش نہ گئی۔ لشکر میں جتنے بھی مشرک تھے سب کو مسلمانوں نے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ جودی کو حضرت خالدؓ اور ودیعہ کو عُیینہ بن حصن نے گرفتار کر لیا۔ دونوں طرف کے مفرور بھاگ کر قلعہ میں داخل ہُوئے اور دروازہ بند کر لیا۔ شکست خوردہ فوجوں میں سے کچھ قلعے میں داخل نہ ہو سکی تھیں باہر ہی رہ گئی تھیں۔ عاصم بن عمرو نے جو قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس قبیلہ کے حلیف بنو کلب کو امان دے دی تھی اس لیے وہ تو بچ گئے اور باقی جو لوگ قلعہ کے باہر تھے وہ قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ نے اہلِ قلعہ کے رُوبرو جودی کو مار ڈالا۔ پھر قلعہ پر دھاوا بول کر اس کا دروازہ اکھاڑ پھینکا اور اہلِ قلعہ کو قتل کرا دیا۔

جب ایرانیوں اور عرب قبیلوں کو پتا چلا کہ حضرت خالدؓ بن ولید حیرہ سے چلے گئے ہیں تو انھوں نے اس پر دوبارہ حملہ کرنے اور مسلمانوں کو وہاں سے نکال دینے کا ارادہ کیا۔ حیرہ کے عربی قبائل نے بھی ایرانیوں کی انگیخت پر اپنے سردار عقہ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے جنگ کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ دربارِ ایران سے دو نامور سرداروں "زرمہر" اور "روزویہ" کو علٰحدہ علٰحدہ لشکر دے کر بھیجا گیا۔ یہ دونوں حصید اور خنافس کی طرف روانہ ہوئے۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید واپس حیرہ پہنچے اور انھیں تمام حالات کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے لشکر کے بعض سرداروں کو اس امر پر مامور کیا کہ وہ کسی تدبیر سے دشمن کو ایک جگہ اکٹھا کر دیں تاکہ ان پر ایک ہی دفعہ بھرپُور حملہ کر کے ان کا قصّہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا جائے۔ لیکن دشمن ایک جگہ جمع نہ ہُوئے۔ شاید انھیں حضرت خالدؓ کی نیت کا پتا چل گیا تھا اور انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ وُہ ان کی اس تدبیر کو کبھی پُورا نہ ہونے دیں گے۔

حضرت خالدؓ کی یہ تدبیر بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس عظیم سپہ سالار میں کتنی جرأت پائی جاتی تھی۔ اسے اپنے نفس پر کتنا اعتماد اور اپنے لشکر کی بہادری پر کتنا یقین تھا۔ لڑائیوں میں عام قاعدہ یہی ہے کہ ہر سپہ سالار اپنی مدِّمقابل جماعتوں سے فرداً فرداً لڑنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اسی طرح دشمن کی جمعیت کو منتشر اور پراگندہ کر کے اسے شکست دینا آسان ہوتا ہے۔ لیکن حضرت خالدؓ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ وہ دشمن کی زبردست جمعیت سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی جرأت اور اعتماد تھا جو ہر میدان میں ان کی کامیابی کا باعث بنا اور فتح و کامرانی ایک کنیز کی حیثیت سے ان کے آگے، پیچھے اور دائیں بائیں چلتی رہی۔

جنگِ حصید و خنافس

جب حضرت خالدؓ دشمن کی فوجوں کو یکجا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو آپ نے دو لشکر حصید اور خنافس بھیجے تاکہ وہاں جو فوجیں پڑی ہوئی تھیں ان کا قلع قمع کیا جائے۔

چنانچہ اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ایرانیوں اور عیسائیوں کو زبردست شکست دی جس میں وہ دو زبردست سردار "زرمہر" اور "روزبہ" مارے گئے جو ایرانی دربار سے بھیجے گئے تھے۔

"مضیح" میں ایرانیوں اور عربی قبائل کی بیخ کنی اس کے بعد حضرت خالدؓ خود لشکر لے کر "مضیح" پہنچے۔ اس جگہ وہ لشکر بھی آکر مل گئے جنھیں آپ نے حصید اور خنافس بھیجا تھا اور یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ فلاں دن فلاں گھڑی فلاں جگہ بقیہ اسلامی لشکر سے آملیں۔ جب تینوں لشکر اکٹھے ہو گئے تو آپ نے از سرِ نو اپنے لشکر کو ترتیب دیا اور رات کے وقت تین اطراف سے اچانک دشمن پر حملہ کر کے اسے تہ تیغ کر دیا۔

اس معرکہ میں دو آدمی ایسے بھی مارے گئے جن کے پاس حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یہ تحریر موجود تھی کہ وہ مسلمان ہیں، انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ لیکن چونکہ وہ لوگ بوجوہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ تھے اور دشمنوں میں اس امر کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی کہ کون دشمن ہے اور کون مسلمان! اس لیے دوسرے دشمنانِ اسلام کے ساتھ وہ بھی مارے گئے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان دونوں کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو آپ نے ان کا خون بہا ادا کر دیا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب پہلے ہی حضرت خالدؓ بن ولید کی بعض کارروائیوں سے ناراض تھے۔ ان کے اس فعل سے انھیں اور غصہ آیا لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی شکایت کے جواب میں فرمایا:

"جو شخص حربیوں[1] کے ساتھ ان کے علاقہ میں رہے اس کا یہی انجام ہوگا۔"

"نجار" اس معاملہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ دونوں آدمی یقیناً ایسی جگہوں پر جا کر آباد ہو سکتے تھے جہاں وہ امن و سکون سے زندگی بسر کرتے۔ انھیں ایسے مقام پر جانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی جہاں موت نے اپنے بازو پھیلا رکھے تھے اور جہاں دشمنانِ اسلام اپنی فوجیں لیے پڑے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ پر اظہارِ ناراضی کا کوئی حق نہیں تھا۔"

ہماری رائے میں نجار کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ ان دونوں کو حضرت خالدؓ نے قتل نہیں کیا۔ بلکہ یہ دونوں خود اپنے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کو چاہیے تھا کہ میدانِ جنگ سے بہت دور ہٹ کر کسی محفوظ جگہ مقیم ہوتے۔ دشمنانِ اسلام میں رہ کر یہ امید رکھنا کہ مسلمانوں کے نیزے انھیں چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو اپنا شکار بنائیں گے، انتہائی بعید از عقل بات ہے۔

مختلف جنگیں مضیح میں ایرانیوں اور عربی قبائل کی بیخ کنی کرنے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنے لشکر کے سرداروں کو کوچ کرنے اور "ثنی" جانے کا حکم دیا جو رصافہ کے قریب ایک موضع ہے اور جہاں

---

[1] کفار میں سے جو شخص مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو اُسے حربی کہا جاتا ہے۔

ایرانیوں کا لشکر مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے جمع تھا۔ وہاں پہنچ کر حضرت خالدؓ نے راتوں رات دشمن کا صفایا کر دیا اور ایک شخص بھی بچ کر نہ جا سکا۔ "ثنی" سے کچھ دُور ایک مقام "زمیل" میں بھی دشمن کی فوجوں کا اجتماع تھا۔ "ثنی" کی جنگ سے فارغ ہو کر حضرت خالدؓ بن ولید ہاں پہنچے اور دشمن کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ "رصافہ" میں ہلال بن عقبہ نے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ایک زبردست جماعت تیار کی ہے۔ یہ سُن کر حضرت خالدؓ بن ولید "رصافہ" روانہ ہو گئے۔ مگر جونہی دشمن کو حضرت خالدؓ کے آنے کی خبر ہوئی وُہ بھاگ کر "رضاب" اور "فراض" چلا گیا۔ یہ دونوں مقامات دومۃ الجندل کے قریب شام، عراق اور عرب کے مقامِ اتصال پر واقع تھے۔

جنگِ فراض

جب مسلمان فراض پہنچے تو رومیوں کو اپنی فکر پیدا ہوئی۔ اُنھوں نے ایک طرف دربارِ ایران سے مدد مانگی اور دُوسری طرف قبائل تغلب، ایاد، نمر کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ اس طرح مسلمانوں سے لڑنے کے لیے رومی سپہ سالار کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان لشکر جمع ہو گیا۔

فراض دریائے فرات کے کنارے واقع تھا۔ دریا کے ایک طرف مسلمانوں کا لشکر تھا اور دُوسری طرف رومیوں کا۔ رومی لشکر نے حضرت خالدؓ کو پیغام بھیجا کہ یا تو تم دریا عبور کر کے ہماری طرف آجاؤ یا ہم تمھاری طرف آجاتے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب بھیجا کہ تم ہی اِدھر آجاؤ۔ چنانچہ رومی لشکر دریا عبور کر کے مسلمانوں کے مقابل صف آرا ہو گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ تمام دن بڑی خُون ریز جنگ ہوتی رہی۔ اگرچہ اسلامی لشکر تھکاوٹ سے چُور چُور، اور رومی لشکر مع اپنے حلیفوں کے بالکل تازہ دم تھا۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کے آگے رومیوں کی کچھ پیش نہ گئی اور انھیں شکست فاش نصیب ہوئی۔ چونکہ پیچھے دریا تھا اس لیے رومی بھاگ بھی نہ سکے۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں ایک لاکھ رومی کام آئے۔ یہ لڑائی عراق میں حضرت خالدؓ کی آخری لڑائی تھی۔ ماہ ذی القعدہ ۱۲ھ کے وسط میں ہوئی تھی۔

حضرت خالد بن ولید کا پوشیدہ طور پر حج کرنا

حضرت خالدؓ بن ولید اس لڑائی کے بعد فراض میں دس روز تک مقیم رہے۔ ۲۵ ذی القعدہ کو انھوں نے فوج کو حیرہ واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ فوج کے اگلے حصّہ پر عاصم بن عمرو اور پچھلے حصّہ پر شجرہ بن الاعز کو مقرر کیا۔ اپنے متعلق یہ ظاہر کیا کہ "ساقہ" (فوج کا آخری حصّہ جو اصل لشکر سے بہت پیچھے رہتا ہے) پر رہیں گے۔ لیکن اپنے خاص آدمیوں کو بتلا دیا کہ میں حج کرنا چاہتا ہُوں۔ چنانچہ آپ چند ہمراہیوں کو ساتھ لے کر انتہائی تیزی سے سفر کرتے ہوئے صرف بارہ روز میں فراض سے مکّہ پہنچ گئے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اتنی تیز رفتاری سے واپس ہُوئے کہ ابھی لشکرِ اسلام حیرہ پہنچا بھی نہ تھا کہ آپ لشکر کے "ساقہ" میں آکر مل گئے اور سب کے ساتھ حیرہ میں داخل ہوئے۔ اس عرصہ میں لشکر کو سوائے ان لوگوں کے جنھیں آپ نے اپنے ارادہ سے مطلع کر دیا تھا، مطلق پتا نہ چلا کہ آپ حج کو تشریف لے گئے ہیں، جب اُنھوں نے آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے سر منڈے دیکھے تب ان کو اس واقعہ کا پتا چلا۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خبر ملی کہ حضرت خالدؓ بن ولید لشکر کو چھوڑ کر حج کرنے مکّہ گئے تھے تو آپ کو بے حد تعجب ہُوا۔ آپ نے انھیں اس قسم کے کام کرنے سے منع فرمایا اور کسی قدر ناراضی بھی ظاہر کی کہ ایسے خطرناک موقع پر

فوج کو تنہا چھوڑ کر چلے جانا مناسب نہ تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے حیرہ واپس آکر بعض ان چھوٹے چھوٹے مقامات کو فتح کیا جو باقی رہ گئے تھے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی شام کو روانگی جب ایرانیوں کی طرف سے یہ خطرہ دُور ہو گیا کہ کسی وقت وہ مسلمانوں پر فوج کشی کر سکیں گے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خیال پیدا ہوا کہ اب رومیوں پر چڑھائی کرنی چاہیے۔ آپ نے پہلے بھی شام کی سرحد پر خالدؓ بن سعید کو فوج دے کر بھیج رکھا تھا۔ اب آپ نے خالدؓ بن ولید کو حکم دیا کہ وہ حیرہ سے شام چلے جائیں، وہاں یرموک میں جو مسلمانوں کی فوج ہے اس کی مدد کریں۔ اور عراق میں اپنے پیچھے مثنیٰ بن حارثہ کو نصف فوج کے ساتھ چھوڑ جائیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں حضرت خالدؓ صفر ۱۳ھ[1] میں عراق سے یرموک (شام) روانہ ہو گئے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کا عراق سے شام تک کا سفر انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس سفر میں آپ نے اپنے لشکر کے ساتھ ایک ایسے صحرا کو قطع کیا جس میں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا آپ کی فوج کو مسلسل پانچ دن، پانچ رات اس صحرا سے گزرنا پڑا۔ پیاس کی شدت سے فوجیوں کے گلوں میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ لیکن انھوں نے بڑے صبر اور بڑے استقلال سے یہ دن گزارے۔

حیرہ سے چل کر آپ "بہراء" پہنچے وہاں کے لوگ اسلامی لشکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کو دیکھتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وُہ بالکل مقابلہ نہ کر سکے۔ بہراء کو زیر کرنے کے بعد آپ "اراک" پہنچے۔ اراکیوں نے آپ سے صلح کر لی۔ اس کے بعد "تدمر" پہنچے۔ پہلے تو وُہ لوگ قلعہ بند ہو گئے لیکن پھر صلح کر لی۔ تدمر کو فتح کرنے کے بعد وہاں سے کچھ فاصلہ پر "قریتین" آئے۔ وہاں کے لوگوں نے اطاعت قبول نہیں کی۔ جس پر آپ نے ان سے لڑائی چھیڑ دی اور فتحیاب ہُوئے۔ اس جنگ میں مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ اس کے بعد "قصم" پہنچے۔ وہاں قضاعہ کے ایک قبیلہ بنو مشجعہ نے آپ سے صلح کر لی۔ بعد ازاں آپ دمشق کے قریب ایک مقام "ثنیۃ العقاب" پہنچے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سیاہ جھنڈا لہرایا۔ پھر مرج الراہط آئے اور غسانیوں کو زیر کیا۔ اس کے بعد بصریٰ پہنچے۔ وہاں کے باشندوں سے مقابلہ ہوا جس میں حضرت خالدؓ فتحیاب ہوئے اور اہلِ بصریٰ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بصریٰ شام کا پہلا شہر ہے جو حضرت خالدؓ بن ولید اور عراقی فوجوں کے ہاتھوں فتح ہُوا۔ یہاں سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کا پانچواں حصہ حسبِ دستور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا اس کے بعد آگے روانہ ہوئے اور ربیع الثانی میں یرموک پہنچ کر وہاں مسلمان فوجوں سے مل گئے۔

مستشرق "دی غوبی" شام کی فتوحات کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے حیرہ سے شام تک مندرجۂ ذیل مقامات فتح کیے؛

عین التمر، قراقر، سوی، اراک، تدمر، قریتین، حوارین[2] اور مرج راہط۔

---

[1] طبری، بلاذری، واقدی [2] حوارین قریتین سے تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔

بلاذری کے کہنے کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید دومۃ الجندل سے بھی گزرے تھے۔ لیکن دی غوبی اس سے انکار کرتا ہے۔

حضرت خالدؓ بن ولید مرج راہط سے بصریٰ گئے جہاں آپ تین مسلمان سرداروں سے ملے جو یزید، شرحبیل اور ابو عبیدہ تھے ان کی مدد سے آپ نے بصریٰ فتح کیا۔ بصریٰ فتح کرنے کے بعد یہ سب سردارانِ فوج وادی عربہ میں حضرت عمروؓ بن العاص کی فوج کی امداد کے لیے پہنچے۔ دی غوبی اور طبری وغیرہ اس کو نہیں مانتے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے بصریٰ اکیلے ہی فتح کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ شہر ان مسلمان سرداروں کے ساتھ مل کر فتح کیا جو آپ کی آمد سے قبل ہی اس شہر کا محاصرہ کیے پڑے تھے۔

عراق کی جنگوں میں حضرت خالدؓ بن ولید کے کارہائے نمایاں

حقیقت یہ ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک سال کی قلیل مدت میں عراق کے اندر جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کے صفحات میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں اس قدر تھوڑی سی فوج کے ساتھ ایک زبردست دشمن کو ہر موقع پر شکستِ فاش دینا صرف آپ ہی کا کام تھا۔ آپ کے لشکر کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی مگر اس کے مقابلہ پر دشمن کی فوج اسلامی فوج سے بیسیوں گنا زیادہ ہوتی تھی اور پھر ہر قسم کے اسلحہ اور سامانِ جنگ سے پوری طرح آراستہ بھی۔ اس حالت میں جبکہ اسلامی لشکر انتہائی کمزور اور ایرانی لشکر انتہائی طاقت ور تھا۔ آپ نے نہایت ہی قلیل عرصہ میں ایرانیوں کی عظیم الشان سلطنت کے ہاتھ سے ابلہ اور فراض تک کا سارا علاقہ چھین لیا۔ ایرانی، عربی اور رومی افواج سے جب بھی مقابلہ ہوا حضرت خالدؓ نے اسلامی جھنڈے کو کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا اور اس وقت تک بس نہیں کیا جب تک دشمن پر مکمل طور پر قابو نہ پا لیا۔ آپ کے رُعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ دشمن پر آپ کا نام سُنتے ہی کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ جس جنگ میں آپ شامل ہوتے تھے اس میں مسلمانوں کی فتح کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی تھی کہ دشمن جب یہ سُنتا تھا کہ اس فوج کی کمان خالدؓ بن ولید کر رہے ہیں تو وہ ڈر اور ہیبت کے مارے ہمت ہار بیٹھتا تھا اور اس طرح مسلمانوں کو فتح حاصل ہو جاتی تھی۔

آپ محض فاتح ہی نہیں تھے کہ کسی شہر کو فتح کیا اور آگے چل کھڑے ہوئے، بلکہ جس شہر کو فتح کرتے تھے اس پر پوری طرح تسلط جما کر آگے بڑھتے تھے۔ جو شہر آپ کی اطاعت قبول کرتا تھا وہاں آپ عامل مقرر کر دیتے تھے جو وہاں کے شہری نظام کی نگہداشت کرتے تھے۔ ایک امیر وہاں انصاف قایم رکھتا اور شہر کا انتظام کرتا تھا، اور دُوسرا امیر اس شہر کے باشندوں سے ان شرائط کے مطابق خراج وصول کرتا تھا، جو اس شہر کے باشندوں نے قبول کی ہوتی تھیں اور جو باقاعدہ حیز تحریر میں آجاتی تھیں۔

حضرت خالدؓ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ کسانوں، کاشتکاروں اور پیشہ وروں سے قطعاً بُرا سلوک نہیں کرتے تھے اور انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتے تھے۔ اس کے برعکس ان کے ساتھ انتہائی نرمی سے پیش آتے تھے۔ ہر معاملہ میں ان سے رعایت برتتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرتا تو اس کو اس کے ارادے سے

باز رکھتے تھے۔ آپ کو یقین تھا کہ یہی لوگ قوم کے اصل ستون ہوتے ہیں۔ اسی نیک سلوک کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ ایرانیوں کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر معاملہ میں مسلمانوں کے احکام پر عمل پیرا ہوتے تھے، کیونکہ ان کو تجربہ تھا کہ رومی افسر اور فوج کے سردار جب بھی ان کے پاس سے گزرتے تھے ان پر انتہائی سختیاں کرتے، ان پر ظلم ڈھاتے اور ہر طرح ان کو ذلیل کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل خلاف تھی۔

جہاں خالدؓ ان غریب لوگوں سے انتہائی نرمی اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہاں دشمنوں سے ان کا سلوک نہایت سخت تھا۔ میدانِ جنگ میں ان سے مطلق صبر نہ ہوتا تھا اور دشمن کو دیکھتے ہی اس پر حملہ کر کے اس کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے۔ اکثر اوقات خود میدانِ مبارزت میں نکل کر دشمن کے لشکر کے سپہ سالار کو اپنے مقابلہ میں بلاتے تھے اور پھر اس طرح جھپٹتے تھے جس طرح باز چڑیا پر جھپٹتا ہے، اور اس کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتے۔ جب دشمن یہ دیکھتا تھا تو ڈر اور رعب اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتا، اس میں بزدلی اور کمزوری پیدا ہو جاتی اور وہ شکست کھا جاتا۔

۱۲ھ حضرت خالدؓ بن ولید کی زندگی کا روشن ترین سال تھا۔ تمام عراق اور ایران کا سرحدی علاقہ گیارہ ماہ سے بھی کم مدت میں حضرت خالدؓ کی تلوار کے اثر سے اسلامی حکومت کے زیرِ نگین آگیا۔ اس عرصہ میں پندرہ مقامات پر آپ کو فتح نصیب ہوئی۔[۱] اور کسی ایک موقعہ پر بھی شکست کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے حضرت خالدؓ بن ولید اپنے دشمنوں کے معاملہ میں بےحد سخت تھے۔ آپ دشمن کو کبھی بھاگنے کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ نیز اگر کوئی شخص وعدہ کر کے اس سے پھر جاتا تھا تو ہرگز معاف نہ کرتے تھے اور اس کو تلوار کے گھاٹ اتار کر ہی دم لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ خالدؓ تلوار چلانے میں انتہائی شدت سے کام لیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ آپ اس شخص پر مطلق رحم نہ کرتے تھے جو جنگ میں شکست کھا کر بھاگ جاتا تھا۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ جو شخص آج بھاگ گیا ہے وہ لازماً کل پھر مقابلے میں آئے گا۔ اس لیے آپ ایسے لوگوں کا اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑتے تھے جب تک انھیں کیفرِ کردار تک نہ پہنچا لیتے تھے۔ حضرت خالدؓ کی یہ پالیسی اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے انتہائی دور اندیشی پر مبنی تھی اس زمانہ میں مسلمان بہت تھوڑی تعداد میں تھے اور یہ بات حکمت اور سیاست سے بہت بعید تھی کہ دشمنوں کو ڈھیل کا کوئی موقعہ بھی دیا جاتا کیونکہ اس طرح وہ دوبارہ فوج کشی کر کے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اگر حضرت خالدؓ بن ولید عراقی فتوحات میں یہ طریقہ اختیار نہ کرتے تو وہاں کبھی مسلمانوں کا تسلط برقرار نہ رہ سکتا تھا اور اس قدر تھوڑے عرصہ میں ایسی سنگلاخ اور وسیع سرزمین میں کبھی اسلام نہ پھیل سکتا تھا۔

---

[۱] حضرت خالدؓ بن ولید نے عراق میں مندرجہ ذیل لڑائیاں لڑیں:

(۱) ذات السلاسل (۲) المذار (۳) ولجہ (۴) الیس اور امغیشیا (۵) مقر وضم فرات بادقلی (۶) حیرہ (۷) انبار یعنی ذات العیون اور کلواذی (۸) عین التمر (۹) دومۃ الجندل (۱۰) حصید (۱۱) خنافس (۱۲) مصیخ (۱۳) ثنی (۱۴) زمیل (۱۵) فراض

حصہ چہارم ——— شام اور فلسطین میں فتوحاتِ اسلامیہ

عربوں اور رومیوں کے درمیان معرکے

(۱)

شام اور فلسطین میں فتوحات

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اطراف و جوانب میں اسلامی لشکر بھیجے تھے اس وقت خالدؓ بن سعید کو بھی ایک لشکر کے ساتھ یہ حکم دے کر روانہ فرمایا تھا کہ وہ تیما، چلے جائیں اور اس علاقہ کے اردگرد کے عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔ لیکن کسی مرتد کو اپنی فوج میں شامل نہ کریں[۱] صرف اسی شخص سے لڑیں جو ان سے لڑے، اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلیں جب تک کوئی دوسرا حکم نہ پہنچے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت خالدؓ بن ولید کو منع کرنا چاہتے تھے کہ وہ رومیوں سے لڑنے میں اتنی سرگرمی نہ دکھائیں کیونکہ آپ کو پتا چلا تھا کہ رومیوں نے فلسطین میں عرب کی حدود پر زبردست فوجیں جمع کر لی ہیں۔ سلطنتِ روما کی سرحد پر یہ لشکر بھیجنے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی غرض غالباً یہ تھی کہ آپ رومیوں کو مسلمانوں کی قوت، طاقت اور شجاعت سے مرعوب اور انھیں خبردار کرنا چاہتے تھے کہ وہ آگے بڑھ کر سرزمینِ عرب میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ بات بھی یقین کی حد تک کہی جا سکتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ دشمن کو اس طرح غافل رکھ کر درمیانی عرصہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ جب عراق، عرب کے زیرِ نگیں آ جائے اس وقت رومی سلطنت کے مقابلے کے لیے زبردست لشکر روانہ کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہرقل (شہنشاہِ قسطنطنیہ) عرب پر حملہ کرنا، مسلمانوں کی طاقت کو توڑنا، اور اسامہؓ بن زید کی مہم کا، جو رومی سلطنت کی سرحد پر بھیجی گئی تھی، انتقام لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے عرب اور روم میں سے اپنے مددگاروں کو تیار بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ عربوں کا رومی سلطنت کے حدود اور اس کے علاقوں پر چھاپے مارنا اور عربی لشکروں کا رومی شہروں کو روندنا ہرقل کے لیے خاص طور پر خطرہ کا الارم تھا اور وہ اس پر کبھی خاموش نہ بیٹھ سکتا تھا۔

خالدؓ بن سعید نے تیما اور اس کے گرد و نواح سے کافی بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ جب رومیوں کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے

---

[۱] حضرت صدیق اکبرؓ نے مرتدین کو اسلامی لشکر میں شامل کرنے یا ان سے مدد لینے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی کیونکہ ایسا کرنا دینی غیرت و حمیت کے خلاف تھا۔

فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ مسلمان اپنے لشکر میں اور اضافہ کریں اور ان عیسائی عرب قبیلوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں جو شام کی سرحد پر آباد ہیں، ان پر ایک زبردست حملہ کر کے ان کی طاقت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

یہ فیصلہ کرنا رومیوں کی دقتِ نظر کی دلیل ہے اور اس امر کا ثبوت بھی کہ انھیں ان عرب عیسائی قبیلوں پر، جو شام کی سرحدوں پر آباد تھے، کلیتہً اعتماد نہ تھا کہ وہ جنگ چھڑنے کی حالت میں رومیوں یعنی اپنے ہم مذہبوں کی مدد اور اعانت کریں گے۔[1]

رومیوں سے لڑنے کے لیے چار قائدین کی مدینہ سے روانگی

جب خالدؓ بن سعید کو رومیوں کے ارادوں کا پتا چلا تو انھوں نے سارے معاملہ کی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اطلاع دی اور ان سے رومیوں کے مقابلہ میں مدد چاہی۔ اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ نے روم اور شام کے معاملات پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا اور سنہ ۱۲ھ کے اواخر میں چار جھنڈے تیار کرائے۔[2] ایک جھنڈا خالدؓ بن سعید کی جگہ یزیدؓ بن ابی سفیان کو دیا اور انھیں دمشق کی طرف روانہ کیا۔ دوسرا شرحبیلؓ بن حسنہ کے سپرد فرمایا اور انھیں وادیِ اردن جانے کا حکم دیا۔ تیسرا عمروؓ بن العاص کو عطا کیا اور اس فرمان کے ساتھ کہ پہلے وہ ساحلِ بحرِ احمر کے متوازی سفر کرتے ہوئے ایلا العقبہ تک پہنچیں، پھر فلسطین میں داخل ہوں۔ چوتھا جھنڈا ابو عبیدہؓ عامر ابن الجراح کو مرحمت فرمایا اور انھیں حمص جانے کا حکم دیا۔

جہاں تک مذکورہ بالا تین سالاروں کے ساتھ ابو عبیدہؓ کو بھیجنے کا تعلق ہے، مورخین کا اس میں باہم اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ساتھ ہی بھیجے گئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان تینوں سرداروں کے چلے جانے کے کچھ ماہ بعد ابو عبیدہؓ کو ان کی مدد کے لیے لشکر دے کر روانہ کیا گیا تھا۔[3]

بلاذری وغیرہ مورخین کے لکھنے کے مطابق شروع میں ہر سردار کے ساتھ تین تین ہزار فوج بھیجی گئی۔ طبری کہتا ہے کہ شرحبیلؓ بن حسنہ اور یزیدؓ بن ابی سفیان، ان دونوں کے ساتھ سات سات ہزار فوج تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ چاروں سردار جب شام کی طرف روانہ ہوتے ہوں گے تو کسی کے لشکر کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ ہوگی اور بعد میں حضرت صدیقؓ ان کی مدد کے لیے لشکر بھجواتے رہے ہوں گے جن سے آخر میں جا کر طبری کی روایت کے مطابق ان کی تعداد سات سات ہزار

---

[1] سر ولیم میور کا بیان ہے کہ بیزنطینی حکومت عربوں کو روکنے کے لیے زیادہ بے چین نہیں تھی اس لیے کہ شام کے شہر ہر چند بہت خوبصورت اور مقدس تھے تاہم وہ عرب سے اتنی دور واقع تھے کہ ان پر آسانی سے حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے اپنے ملک کا مضبوطی سے دفاع نہیں کیا۔

[2] مورخین کا لشکر بھیجنے کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ طبری کہتا ہے کہ یہ لشکر سنہ ۱۳ھ کے اوائل میں روانہ کیے گئے تھے۔ ابنِ اسحٰق کہتے ہیں کہ سنہ ۱۲ھ میں بھیجے گئے تھے۔ بلاذری کہتا ہے کہ یکم صفر سنہ ۱۲ھ کو روانہ کیے گئے تھے۔ بعض مورخین نے بلاذری کی تائید کی ہے۔ یورپین مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ لشکر سنہ ۱۲ھ کے اوائل میں بھیجے گئے۔

[3] اٹلی کا مستشرق کہتا ہے کہ ابو عبیدہؓ جنگِ یرموک سے پہلے شام میں کبھی دکھائی نہیں دیے۔

پہنچ گئی ہوگی۔ اس بات کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس عادت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کسی لشکر کو بھیجنے کے بعد کمک کے طور پر اور فوجیں بھی بھجواتے رہتے تھے۔ یہ کمک جو جزیرۂ عرب کے اطراف سے آتی تھی دفعۃً نہیں آجاتی تھی بلکہ متفرق اوقات میں آتی رہتی تھی۔ جب مختلف اطراف کے مسلمان مدینہ پہنچتے آپ ان کو شام کی سرحد پر اسلامی فوجوں کی امداد کے لیے بھجوا دیتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سفر کے لیے ہر لشکر کا راستہ معین فرمادیا تھا۔ اسی طرح ہر سردار کے لیے وہ ولایت بھی مقرر فرمادی تھی جہاں کا اسے — فتح کے بعد — والی بننا تھا۔ عمروؓ بن العاص کو فلسطین، یزید بن ابی سفیان کو دمشق اور شرحبیلؓ بن حسنہ کو اردن کی ولایت سپرد کی گئی۔ طبری نے اس لشکر کی تعداد جو شام کی طرف بھیجا گیا ستائیس ہزار لکھی ہے۔

بعض مستشرقین خصوصاً دی غوبی نے فتح سے قبل ہی ولایات کی تقسیم پر کافی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ یہ اپنی قسم کی پہلی مثال تھی۔ اس طرح گویا حضرت ابوبکرؓ نے ریچھ کو مارنے سے پہلے ہی اس کی کھال بیچ دی۔ لیکن ہمیں اس تقسیم میں کوئی اعتراض کا پہلو نظر نہیں آتا۔ ایسا کرنے سے خلیفہ کی غرض ان علاقوں کی تعیین کرنی تھی جن پر فرستادہ سالاروں کو حملہ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ جب اس علاقہ کی فتح مکمل ہوجائے تو وہی شخص اس پر حاکم اور اس کی حالت کو سدھارنے، وہاں کے شہری نظام کو درست کرنے کا ذمہ دار ہوگا ایسا کرنا اس زمانہ میں بیحد ضروری تھا۔ کیونکہ خلیفہ کو علم تھا کہ راستے بے حد طویل ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضرورت تھی کہ ڈاک آپ کو وقت پر ملتی رہے تاکہ فتح اور دوسرے امور کی اطلاعات آپ تک باقاعدہ پہنچتی رہیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایسا کرنا آپ کی غایت احتیاط کی دلیل ہے۔ اس طرح سالار کو اس امر کا اطمینان رہتا تھا کہ اس کے سپرد جو فرائض و واجبات ہیں ان کو پہلے ہی بتادیا گیا ہے اور اب خلیفہ کی طرف سے اس بارہ میں احکام خلافت کے انتظار میں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت ابوبکرؓ کی قائدین عساکر کو نصیحتیں

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے سالاروں کو رخصت کرتے وقت بعض نصیحتیں کیں جن میں ان کا دستور العمل واضح فرمایا۔ حضرت عمروؓ ابن العاص کو جو نصیحتیں فرمائیں یہ ہیں:

"میں نے تمہیں اس لشکر کی قیادت سونپی ہے۔ لشکر کے اکثر آدمی مکہ، طائف، ہوازن اور بنی کلاب میں سے ہیں۔ تم فلسطین جاؤ اور ابوعبیدہؓ کے ساتھ خط و کتابت کرو۔ جب انھیں تمہاری ضرورت ہو تو اپنی فوج لے کر ان کے پاس پہنچ جاؤ۔ تم جو کام بھی کرو اس میں ان کا مشورہ ضرور حاصل کرلو۔ پوشیدہ اور علانیہ کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ کیونکہ وہ باطن کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح ظاہر کو۔ میں نے تم کو ایسے لوگوں پر مقدم کیا ہے جو اسلام لانے میں تم سے مقدم ہیں اور بزرگی کے لحاظ سے بھی تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس لیے تم آخرت کے عمال میں سے بنو۔ اپنے اعمال کے ذریعہ خدا تعالیٰ کو راضی کرو اور ایلیا کے راستے فلسطین پہنچ جاؤ۔"

"جن باتوں کی طرف میں نے تمہیں بُلایا ہے ان کے بارہ میں کمزوری مت دکھانا۔ کمزوری سے ہمیشہ خدا کی پناہ مانگتے رہنا۔ یہ بات کبھی نہ کہنا کہ مجھے ابن قحافہ (حضرت ابوبکرؓ) نے دشمن کے مقابل کر دیا ہے لیکن مجھ میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اے عمروؓ! جان لو، تمھارے ساتھ بدر کی جنگ میں شریکؓ ہونے والے مہاجرین اور انصار ہیں۔ ان کی عزت اور ان کے حق کا اعتراف کرو۔ اپنا غلبہ اور اقتدار ان پر جمانے کی کوشش نہ کرنا۔ دیکھو، تمہارے دماغ میں شیطانی نخوت داخل نہ ہونے پائے اور تم یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ مجھے ابوبکرؓ نے اس لیے والی بنایا ہے کہ میں ان میں سب سے بہتر ہوں۔ نفس کے دھوکوں سے بچتے رہنا اور لشکر کے سپاہیوں کے ساتھ اس طرح رہنا گویا تم انہی میں سے ایک ہو۔ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ کرنا، نماز کی تاکید رکھنا، جب نماز کا وقت ہو جاتے تو اذان دینا، اپنے دشمنوں سے بچتے رہنا اور اپنے ساتھیوں کو چوکس رہنے کا حکم دینا، کبھی کبھی اچانک پہنچ کر پہرہ داروں کے کام کی نگرانی بھی کرتے رہنا۔ رات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیر تک بیٹھے رہنا، جب تم دشمن کے سامنے جاؤ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، اپنے مقدمۃ الجیش کو ہمیشہ اپنے آگے رکھنا۔"

"جب کسی کو نصیحت کرو تو اختصار کے ساتھ۔ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس طرح تمہاری رعایا بھی تم سے ٹھیک ہو جائے گی۔ جب اپنے دشمن کو دیکھو تو آگے ہی بڑھو، پیچھے نہ ہٹو۔ یہ تمہارے لیے فخر کا باعث ہوگا۔ اپنے ساتھیوں کو قرآنِ کریم پڑھنے کی تاکید کرتے رہنا اور جاہلیت کے ذکر اذکار سے منع کرنا۔ کیونکہ اگر جاہلیت کا کچھ بھی اثر ان میں باقی رہ گیا تو یہ ان کے درمیان عداوت کا بیج بو دے گا۔ دنیا کی خوب صورتی سے اعراض کرنا، یہاں تک کہ تم ان لوگوں سے مل جاؤ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہونا جن کی خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بایں طور تعریف فرمائی ہے:

وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا و اوصینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ وکانوا لنا عابدین۔

یعنی ہم نے ان کو دنیا کا ایسا پیشوا اور رہبر بنایا ہے جو ہمارے احکام کے بارہ میں لوگوں کو ہدایت دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے ان کو نیکی کا کام کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی ہے، اور وہ ہماری ہی عبادت کرتے ہیں۔"

بقیہ سالاروں میں سے ہر ایک کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ نصیحتیں فرمائیں:

"اپنے لشکر کے ساتھ اچھی طرح رہنا، ان سے اچھا سلوک کرنا۔ جب ان کو نصیحت کرو تو اختصار کا خیال رکھنا۔ کیونکہ زیادہ باتیں کرنے سے بعض حصے بھول جاتے ہیں۔ اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس طرح لوگ تم سے بھلائی سے پیش آئیں گے۔ اپنے دشمنوں کے ایلچیوں کی عزت کرنا اور ان کو اتنی

تھوڑی دیر اپنے پاس بٹھانا کہ جب وہ تمہارے لشکر کے باہر نکلیں تو اس کے متعلق انھیں کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو لشکر کے سب سے شاندار حصہ میں ان کو ٹھہرانا، اپنے بھید کو چھپانا، تاکہ تمھارا نظام درہم برہم نہ ہو۔ ہمیشہ سچی بات کہنا تاکہ صحیح مشورہ ملے۔ راتوں کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا، اس طرح تم کو ہر قسم کی خبریں مل سکیں گی۔ لشکر میں پہرہ کا انتظام کرنا اور پہرہ والے سپاہیوں کو تمام لشکر میں پھیلا دینا، اکثر اچانک ان کا معائنہ بھی کرنا۔ اگر کسی ایسے شخص کو سزا دو جو اس کا مستحق ہو تو اس میں کسی قسم کا خوف دل میں نہ لانا۔ مخلص اور وفادار ساتھیوں کے ساتھ میل جول رکھنا، جن سے ملو اخلاص کے ساتھ ملنا، بزدلی نہ دکھانا۔ کیونکہ اس طرح دوسرے لوگ بھی بزدلی کا اظہار کرنے لگیں گے۔"

یہ ہدایات منجملہ ان بیشتر ہدایات کے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں اپنے قائدینِ لشکر کو دیں اور جو کتب تاریخ و مغازی میں درج ہیں۔ یہ کہنے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے قبل لشکر کے کسی سپہ سالار اور کسی امیر کو ایسی واضح، ایسی قطعی اور ایسی شاندار ہدایات کبھی نہیں دی گئی تھیں۔ پھر ان ہدایات کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ یہ ہر زمانہ میں اور ہر جنگ کارآمد ہو سکتی ہیں۔ ان سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بے نظیر سیاست، حُسنِ انتظام اور انسانی سرشت کی غایت درجہ معرفت کا پتا چلتا ہے۔ از منہ ماضیہ اور عہدِ حاضر کی جنگوں میں فوجوں کے سپہ سالاروں کو جو ہدایات دی جاتی ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہدایات ان میں ایک خاص اور منفرد درجہ رکھتی ہیں۔

یزیدؓ بن ابی سفیان کی بیزنطینی لشکروں سے مڈھ بھیڑ

تمام سالارانِ عساکر اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ یزیدؓ بن ابی سفیان شام جاتے ہوئے تبوک سے گزرے اور اسے فتح کیا۔ جب وہ فلسطین میں داخل ہوئے اور روابی پہنچے جو بحیرہ مردار کے جنوب میں وادی عربہ کے سرے پر واقع ہے، تو ان کی مڈھ بھیڑ ایک بیزنطینی لشکر سے ہو گئی جس کی قیادت قنصریہ کا بطریق "سرجیوس" کر رہا تھا۔ بیزنطینی لشکر شکست کھا کر غزہ پہنچا جہاں ایک اور عربی لشکر سے اس کا اچانک سامنا ہو گیا اور اس عربی لشکر نے داثن کے مقام پر، جو غزہ سے تھوڑی دُور واقع ہے، بیزنطینی لشکر کو شکست فاش دے کر بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ داثن کے مقام پر یزیدؓ نے ہی بطریق کی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا اور وادی عربہ میں بیزنطینی فوج کے ساتھ یزیدؓ کا نہیں بلکہ ایک دوسرے شخص کا مقابلہ ہوا تھا۔ یزیدؓ نے ابوامامہ جاہلی کو اس لشکر کا مقابلہ کرنے بھیجا تھا جو وادی عربہ میں پڑا تھا اور جس کی تعداد تین ہزار تھی۔ چنانچہ ابوامامہ وہاں پہنچا اور اسے شکست دی۔

عرب مورخین نے اس امر کا تذکرہ نہیں کیا کہ داثن کی لڑائی کس تاریخ کو وقوع میں آئی۔ لیکن مستشرقین کہتے ہیں کہ یہ لڑائی ماہ ذی القعدہ ۱۲ھ کے آخر یا ماہِ ذی الحجہ کے شروع میں ہوئی تھی۔

ہرقل کا اسلامی لشکروں پر علیحدہ علیحدہ حملہ کرنے کا منصوبہ

حضرت عمروؓ بن العاص حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی ہدایت کے مطابق ایلیا کے راستے فلسطین پہنچے اور عربات پر اُترے۔ جب ہرقل کو اسلامی افواج کے پہنچنے کا پتا چلا تو اس نے کوشش کی کہ اپنے عظیم الشان لشکر کو چار حصوں میں منقسم کر کے مسلمانوں کے لشکروں سے علیحدہ علیحدہ بھڑا دے تاکہ اس طرح مسلمانوں کی قوت کمزور ہو جائے اور ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ عمروؓ بن العاص کو جب یہ اطلاع ملی کہ ہرقل کی ایک لاکھ فوج ان کا مقابلہ کرنے آ رہی ہے تو انھیں بڑا خطرہ محسوس ہوا کیونکہ ان کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی تاہم انھوں نے تیاری کی۔ جب رومیوں کی فوج اسلامی لشکر کے سامنے پہنچ گئی تو عمروؓ بن العاص نے جھنڈا اور ایک ہزار سوار عبداللہ بن عمرؓ کو دے کر انھیں میدان میں بھیجا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمان فوج نے بڑی دلیری سے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر لڑتے بھڑتے رومیوں کے سپہ سالار کے پاس پہنچ گئے اور اس کو نیزے سے قتل کر ڈالا۔ اس سے رومیوں کے دلوں میں مسلمانوں کا ڈر بیٹھ گیا اور وہ شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کے سامانِ جنگ اور مالِ غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ سیکڑوں قیدی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔[1]

دوسرے روز رومی پہلے سے بھی زیادہ لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آ گئے۔ اس لشکر کی تعداد واقدی نے ایک لاکھ لکھی ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر ضحاک کو مقرر کیا، میسرہ پر سعید بن خالد کو، ساقہ پر ابوالدرداء کو اور خود قلب میں رہے۔ آپ کے ساتھ اہلِ مکہ تھے۔ آپ نے لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کا حکم دیا اور ثوابِ جنت کی ترغیب دے دے کر ان کے دل بڑھانے لگے۔

اس معرکہ میں بھی مسلمان رومیوں پر فتحیاب ہوئے۔ یاد رہے کہ یہ روایت جو ہم نے بیان کی ہے، صرف واقدی کے ہاں ہے۔ طبری میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ابن اثیر نے بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ واقدی کا شمار ان مورخین میں ہے جن پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جن کی بیان کردہ روایات کی کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی۔ دوسرے مورخین نے اس بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اور جو حقیقت سے قریب تر سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت عمروؓ بن العاص کو یہ پتا چلا کہ رومی زبردست لشکروں کے ساتھ مسلمانوں کی فوجوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں تو انھوں نے تمام مسلمان سالاروں کو لکھا کہ اس وقت اسلامی لشکر علیحدہ علیحدہ رومیوں کا مقابلہ نہ کریں۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ایک جگہ مجتمع ہو کر، ایک ہی لشکر کی صورت میں رومیوں سے لڑیں۔

ہمارے خیال میں زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ رومیوں کو جب مسلمان فوجوں کے شام کی طرف کوچ کرنے کا علم ہوا تو انھوں نے ہرقل کو تمام واقعات کی اطلاع دی۔ ہرقل حمص آیا۔ جب اس نے یہ سنا کہ مسلمان فوج علیحدہ علیحدہ چار حصوں میں منقسم ہے تو اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی کثیر التعداد فوجوں کو مسلمانوں کے چاروں لشکروں سے مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دے اور اس طرح انھیں یکجا نہ ہونے دے۔ چنانچہ اس نے ہر فوج کے مقابلے میں دُگنی فوج بھیج دی

---

[1] ان واقعات کا طبری نے مطلق ذکر نہیں کیا۔ صرف واقدی نے انھیں "فتوح الشام" میں درج کیا ہے۔

جب مسلمانوں کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے عقلمندی اور احتیاط سے سارے معاملہ کا جائزہ لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمروؓ بن العاص کو تمام واقعات کی اطلاع دی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے انھیں لکھا کہ اس وقت مناسب یہی ہے کہ تمام اسلامی لشکر آپس میں مل جائیں۔ اس لیے کہ اگر ہم ایک جگہ جمع ہو کر مقابلہ کریں گے تو قلت تعداد کے باوجود، دشمن ہمیں مغلوب نہیں کر سکتا، لیکن اگر ہم متفرق اور منتشر ہو کر دشمن کے مقابلہ میں آئیں گے تو اس وقت ہم میں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوگا جو دشمن کا دلجمعی سے مقابلہ کر سکے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی ان کو وہی مشورہ دیا جو حضرت عمروؓ بن العاص نے دیا تھا۔ آپ نے انھیں لکھا :

"ایک جگہ جمع ہو کر ایک بڑی لشکر کی صورت اختیار کر لو اور پھر دشمنوں سے جم کر مقابلہ کرو۔ تم اللہ کے مددگاروں میں سے ہو۔ اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرتا ہے اور اس کو چھوڑ دیتا ہے جو اس سے انکار کرتا ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی جو اس وقت عراق میں مصروف پیکار تھے لکھا کہ اپنی فوج کو ساتھ لے کر شام پہنچو اور وہاں مسلمان افواج کے ساتھ مل کر ہرقل کی فوجوں کا مقابلہ کرو۔ چنانچہ حضرت خالدؓ دیگر مسلمان سالاروں سے بصریٰ میں آکر مل گئے۔ جب بصریٰ فتح ہو گیا تو خالدؓ بن ولید مع دیگر سالاروں کے عمروؓ بن العاص کی مدد کو چلے جنھیں فلسطین کی وادی عربہ میں ایک زبردست بیزنطینی لشکر کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بیزنطینی خود ہی عمروؓ بن العاص سے مقابلہ کرنے کا ارادہ ترک کر کے اجنادینؔ[1] چلے گئے جہاں دیگر مسلمان سالاروں سے ان کا سامنا ہو گیا۔ ان بیزنطینی افواج کا سالار ہرقل کا سگا بھائی تیوورس (تذارق) تھا۔

بعض عرب مورخین نے اس جنگ کو جنگ اجنادین کی بجائے جنگ یرموک کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن مستشرقین نے اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معرکۂ یرموک اس تاریخ کے دو سال بعد وقوع میں آیا۔

مورخین میں بیزنطینی لشکروں کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ بلاذری کہتا ہے کہ ان لشکروں میں ایک لاکھ سپاہی شامل تھے۔ لیکن مستشرق لامنس کہتا ہے کہ وہ اس سے بہت کم تعداد میں تھے تاہم وہ پچاس ہزار سے زیادہ تھے۔ مسلمانوں نے ان لشکروں پر جو فتح عظیم حاصل کی تھی اس کی تصدیق عرب اور فرانسیسی دونوں کرتے ہیں۔

اس معرکہ میں عربی لشکر کے سپہ سالار کی تعیین کے بارہ میں بھی مورخین متفق نہیں ہیں۔ بعض عرب مورخین کہتے ہیں کہ اس سارے لشکر کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید کو سونپی گئی تھی۔ اور یہ امر بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اغلب گمان یہی ہے کہ عراق میں آپ نے جس جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا اس سے متاثر ہو کر سارے قائدین نے آپ کو ہی متفقہ طور پر اپنا سردار تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہو۔

---

[1] اجنادین کا صحیح محل وقوع معلوم نہیں تاہم اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ مقام فلسطین کے ضلع جبرین کے علاقہ میں یا جبرین اور رملہ کے درمیان کسی جگہ واقع تھا۔ (جغرافیہ فلسطین و شام مصنفہ لی۔ اسٹرینج ص ۴۰۱) محمد احمد

اکثر مورخین اس پر متفق ہیں کہ یہ معرکہ ۲۸ جمادی الاوّل ۱۳ھ مطابق ۳۰ تموز (جولائی) ۶۳۴ء کو پیش آیا تھا۔

حضرت خالدؓ کی قیادت کا مسئلہ

یورپین مورخین کا فتوحاتِ شام اور لشکرِ اسلامی کی قیادت کے متعلق بھی عرب مؤرخین سے اختلاف ہے۔ بعض یورپین تو قطعی طور پر اس سے انکار کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالتے ہی خالدؓ بن ولید کو معزول کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ خالدؓ بن ولید حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں کافی مدت تک شام میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار رہے۔ وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ ۱۴ھ میں دمشق کی فتح کے موقع پر عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ حضرت خالدؓ بن ولید نے ہی کیا تھا۔ نیز ربیع الثانی ۱۵ھ میں اس دن جب مسلمان جنگِ یرموک کے لیے نکلے تھے تو خالدؓ نے ہی اسقف دمشق کے مطالبہ پر اس معاہدہ کی تجدید کی تھی۔ ابوعبیدہؓ اس معاہدہ کے وقت موجود تھے۔ لیکن ان کو معاہدہ کے متعلق کسی قسم کا اختیار نہیں تھا۔ عربی مؤرخین میں سے بلاذری نے اس رائے کی تائید کی ہے۔

۲۔ ایک دُوسری روایت سے جو ابوعبیدہ القاسم بن سلام سے مروی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت خالدؓ بن ولید نے تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ:

> "جب تک جنگی ضروریات متقضی رہیں عمرؓ بن الخطاب نے مجھے شام کا عامل بنائے رکھا۔ لیکن جب حالات تبدیل ہو گئے تو مجھ پر عیب لگانے لگے۔"

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے "سپہ سالارِ اعظم" کے عہدہ پر کسی کو فائز نہیں کیا تھا بلکہ جب رومیوں سے لڑنے کے لیے فوجیں جمع کی تھیں تو ایک کی بجائے چار سپہ سالار مقرر کیے تھے، ان کے لیے چار ہی عَلَم بنوائے تھے اور ہر سپہ سالار کے لیے اس کا علاقہ مقرر کر دیا تھا جہاں اُسے جانا، فتح کرنا اور بعد میں اس کی ولایت کا انتظام سنبھالنا تھا۔ چنانچہ ہر قائد اپنے لشکر کا سپہ سالار تھا۔ لیکن جب شام میں حالات کی تبدیلی سے تمام سپہ سالاروں نے متفقہ طور پر یہ رائے دی کہ بیزنطینی رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تمام لشکروں کو یکجا ہو جانا چاہیے تو اس اتحاد کے وقت یہ مشکل درپیش ہوئی کہ ان تمام سپہ سالاروں کی قیادت کس کو سونپی جائے۔ چونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی ہدایت نہیں تھی۔ اس لیے ہمارے خیال کے بموجب تمام سپہ سالاروں نے متفقہ طور پر اس ذمہ داری کو حضرت خالدؓ بن ولید کے سر ڈال دیا۔ کیونکہ عراق میں جس جرأت و بہادری اور فنونِ جنگ میں حضرت خالدؓ نے نمونہ پیش کیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے اس اہم عہدے کے لیے سب کی نظر حضرت خالدؓ پر پڑی۔

(۲)

فیصلہ کن معرکہ

جنگِ یرموک اور جنگِ اجنادین کے متعلق مؤرخین کا اختلاف

مستشرقینِ یورپ کہتے ہیں کہ معرکۂ یرموک ۱۵ھ میں پیش آیا اور جنگِ اجنادین ۱۳ھ میں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے : مورخینِ عرب نے اس معاملہ میں غلطی کی ہے کہ جنگِ اجنادین کی بجائے جنگِ یرموک کا ذکر کیا ہے اور اس طرح جنگِ یرموک کے وقوع سے دو سال پہلے ہی اس کا بیان کر دیا ہے۔

جرمنی کا مشہور مستشرق میخائل دی غوئی جو لیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ اس بارہ میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے :

"ابن اسحاق کہتا ہے کہ اجنادین فلسطین کے علاقہ میں رملہ اور بیت جبرین کے درمیان واقع تھا۔ لیکن بعض لوگوں کے نزدیک وہ رملہ اور خلیل جبرون کے بیچ میں تھا۔ ان شہروں کے درمیان ایک قدیم بستی بھی تھی جس کو یرموث کہتے تھے۔ مشہور سیاح روبنسن کہتا ہے کہ اس بستی کا نام یرموک تھا۔ ان امور کے تسلیم کر لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اجنادین یرموث کے قریب واقع تھا۔ اس لیے مورخین نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ یہ یہی لڑائی جنگِ یرموک تھی (یرموک اور یرموث میں ک اور ث کا فرق ہے اور اس فرق کو مورخین نے نظر انداز کر دیا) حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یرموث کے قریب جو جنگ ہوئی ہے وہ جنگِ اجنادین[1] تھی اور دوسری لڑائی جو وادیِ یرموک میں ہوئی تھی وہ جنگِ یرموک تھی۔"

اس اختلاف کو جو جنگِ اجنادین اور جنگِ یرموک کے بارہ میں مورخین کے درمیان پیدا ہو گیا ہے نظر انداز کرتے ہوئے ہم مورخینِ عرب کے بیان کردہ واقعات کے مطابق جنگِ یرموک کا حال بیان کرتے ہیں کیونکہ اس جنگ کے وقوع میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس زمانہ کے متعلق ہے جس میں وہ واقع ہوئی، اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔

جنگِ یرموک

حضرت خالدؓ بن ولید مسلمان لشکروں سے اس وقت ملے جب وہ رومیوں اور ان کے حلیف عربوں کے زبردست لشکروں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر چار سالاروں کی قیادت میں چار جگہ بٹا ہوا ہے۔ وہ چار سالار مندرجہ ذیل تھے :

---

[1] اجنادین کے مقام پر بھی ایک جنگ نہیں بلکہ دو جنگیں ہوئی ہیں۔ ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں اور دوسری حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں۔ اس کی مفصل بحث حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح حیات میں آئے گی۔ (محمد احمد پانی پتی)

ابو عبیدہؓ بن الجراح، یزیدؓ بن ابی سفیان، عمروؓ بن العاص اور شرحبیلؓ بن حسنہ۔
مسلمانوں کی تعداد رومیوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ بعض مورخین ان کی تعداد چالیس ہزار بتاتے ہیں اور بعض چھیالیس ہزار۔ طبری کی روایت کے بموجب رومیوں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی۔ اور ابن اثیر کی بیان کردہ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ۔ عیسائی پادری مسلسل ایک ماہ تک شہروں میں گشت لگاتے اور رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف اشتعال دلا دلا کر لڑائی کے لیے ابھارتے رہے۔ چنانچہ رومی اس کثرت اور اس شان و شوکت کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔

جب حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ دیکھا کہ مسلمان کسی ایک امیر کے جھنڈے تلے متحد نہیں ہیں بلکہ مختلف قائدین کی سرکردگی میں علٰحدہ علٰحدہ منقسم ہیں، تو آپ کو ڈر پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح دشمن سے مقابلہ کی نوبت آگئی تو مسلمانوں میں کمزوری پیدا ہو جائے گی اور وہ دشمن پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ اس لیے آپ نے تمام امرا کو جمع کیا اور ان سے فرمایا:

"یہ دن وہ دن ہے جس میں فخر اور سرکشی مناسب نہیں۔ تمہارا دشمن سے جہاد خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے۔ تم اپنے اعمال سے اپنے خدا کو راضی کرو اور اس کے لیے آج کے دن سے بہتر اور کوئی دن نہیں۔ آج کے بعد یہ موقعہ ہاتھ نہ آئے گا۔ تم ایسی قوم سے، جو شان و شوکت، قوت و طاقت اور تنظیم میں تم سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے، اس انتشار کی حالت میں نہ لڑو، کیونکہ ایسا کرنا قطعاً مناسب نہیں۔ اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اس صورتِ حال کا پتا ہوتا تو وہ تمھیں کبھی ایسا نہ کرنے دیتے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ تم ان احکام پر عمل پیرا ہو جو بارگاہِ خلافت کی طرف سے تمھیں دیے گئے ہیں، میری رائے پر عمل کرو۔"

تمام امرا نے کہا:

"آپ کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے؟"

حضرت خالدؓ بن ولید نے کہا:

"اس وقت مسلمانوں پر بہت سخت وقت پڑا ہوا ہے۔ دشمن تنظیم اور ترتیب کے ساتھ میدانِ جنگ میں موجود ہے لیکن تم متفرق و منتشر ہو۔ تمہارا یہ انتشار تمہارے لیے دشمن کے حملہ سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے اور دشمن کے لیے اس کی مدد سے زیادہ مفید ہے۔ ہمیں یہ چاہیے کہ ہم سب ایک امیر کے ماتحت ہو جائیں۔ اس سے کسی کی شان میں فرق نہیں پڑے گا اور نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے خلیفہ کے نزدیک اس کا مرتبہ کم ہو جائے گا۔ رومی ہم پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر آج ہم نے ان کو پیچھے دھکیل دیا تو پھر برابر دھکیلتے ہی چلے جائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے ہمیں شکست دے دی تو پھر ہم کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ہمیں امارت کے متعلق آپس میں تعاون کرنا چاہیے، اس طرح کہ ہم میں سے باری باری ہر ایک شخص امیر ہو۔ ایک شخص آج، دوسرا کل، تیسرا پرسوں، آج کے دن تم مجھے امیر بنا دو۔"

چنانچہ سب سالاروں نے حضرت خالدؓ کی یہ بات مان لی اور اُنھیں متفقہ طور پر اس دن کے لیے اسلامی لشکروں کا متحدہ سپہ سالار چُن لیا گیا۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ رومی مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے اس سج دھج اور اس شان سے نکلے تھے جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے جواب میں حضرت خالدؓ بن ولید بھی اس جرأت اور بہادری کے ساتھ میدان میں آئے کہ ایسا نظارہ عربوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے لشکر کو چھتیس، اور ایک روایت کی رُو سے چالیس دستوں میں منقسم کیا ایک دستہ ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ میمنہ کے دستوں پر عمروؓ بن العاص اور شرجیلؓ بن حسنہ، میسرہ کے دستوں پر یزیدؓ بن ابی سفیانؓ اور قلب کے دستوں پر ابوعبیدہؓ متعین ہوئے۔ اس کے علاوہ ہر دستے پر ایک آزمودہ کار اور بہادر آدمی کو مقرر کیا گیا۔ ابو ہریرہؓ کو قاضی اور ابوسفیان کو نقیب بنایا گیا، جو لشکر میں پھر پھر کر لوگوں کو نصیحتیں کرتے تھے، انھیں جوش دلاتے تھے۔ آپ ہر دستے کے سامنے کھڑے ہوتے اور کہتے :

"اللہ اللہ! تم عرب کے نوجوان اور اسلام کے مددگار ہو۔ لیکن تمھارے دشمن روم کے نوجوان اور شرک کے مددگار ہیں۔ یا اللہ! آج کا دن ایک یادگار دن ہے تو اپنے بندوں پر نصرت نازل فرما۔"

جب جنگ شروع ہوئی تو رومیوں نے مسلمانوں کی صفوں پر شدید حملہ کیا۔ مسلمانوں کی صفیں اس زبردست حملہ کی تاب نہ لاکر ان کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور بعض دستے پیچھے ہٹ گئے۔ ان دستوں پر عکرمہؓ اور ان کے چچا حارث بن ہشام متعین تھے۔ عکرمہؓ نے کہا :

"میں نے ہر موقعہ پر پاکوں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا ہے۔ کیا آج کافروں کے مقابلے میں میرا پاؤں پیچھے ہٹ سکتا ہے ؟"

پھر آواز دی :

"تم میں سے کون ہے جو میرے ہاتھ پر موت کے لیے بیعت کرتا ہے ؟"

اس پر چار سو آدمیوں نے جن میں حارث بن ہشام اور ضرار بن الازور بھی شامل تھے ان کی بیعت کی۔ یہ لوگ حضرت خالدؓ بن ولید کے خیمے کے سامنے جان توڑ کر لڑے اور بہادری کا پُورا پُورا حق ادا کر دیا۔ اس معرکہ میں مسلمانوں نے جس جرأت ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اس کا ذکر تاریخ کے صفحات پر لافانی حیثیت کا حامل بن چکا ہے۔ یزیدؓ بن ابی سفیان رومیوں کے تابڑ توڑ حملوں کے باوجود اپنے دستہ کو لیے اپنی جگہ پر جمے رہے اور رومیوں کو ہر بار پیچھے ہٹا دیا۔ عمروؓ بن العاص کے دستہ پر بھی رومیوں نے شدید حملہ کیا۔ لیکن وُہ بھی اپنی جگہ ثابت قدم رہا اور بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ میدانِ جنگ خُون سے لالہ زار ہو گیا۔ آخر کار یہ دستہ رومیوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا اور فوج سے علٰحدہ ہو کر عورتوں کے خیمہ گاہ تک پہنچ گیا۔ جب خواتینِ اسلام نے دیکھا کہ عمروؓ بن العاص کا دستہ پیچھے ہٹ رہا ہے تو اُنھوں نے اپنے خیموں کی چوبیں اُکھاڑ لیں اور ان کو مسلمانوں کے سروں پر مارنے لگیں، ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتی جاتی تھیں کہ

اگر تم نے ہماری حفاظت نہ کی تو تم ہمارے خاوند کہلانے کے مستحق نہ ہوگے۔ اس پر بھاگنے والوں کو بڑی غیرت آئی۔ وہ دوبارہ رومیوں کے سامنے جاکر ڈٹ گئے اور انھیں مار مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

حضرت خالدؓ خود میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سارے محاذِ جنگ پر بھی آپ کی نظر تھی۔ جب آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک حصہ رومیوں کے حملوں کی تاب نہ لاکر پیچھے ہٹ رہا ہے تو فوراً چند دستوں کو آگے بڑھایا کہ وہ پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں کو روکیں اور ان کے قدم مضبوط کریں۔ اسی وقت آپ نے ابوعبیدہؓ کو رومیوں پر ایک زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پوری طاقت سے رومیوں پر حملہ کر دیا۔ اِدھر عورتیں اپنے خیموں سے نکل نکل کر مسلمانوں کی صفوں کے پیچھے آکھڑی ہوئیں اور چلا چلا کر کہنا شروع کیا کہ اگر میدان سے قدم پیچھے ہٹایا تو پھر ہمارا منہ نہ دیکھنا۔ یہ آوازیں سن کر مسلمانوں میں پہلے سے بھی زیادہ جوش پیدا ہوگیا اور انھوں نے اتنی شدت اور اتنے جوش سے رومیوں پر دھاوا بولا جس کی تصویر کوئی مورخ اپنے قلم سے نہیں کھینچ سکتا۔ اس وقت جو رومی بھی سامنے آتا تھا مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ کر نہ جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اس اچانک اور زبردست حملہ سے رومیوں کے حواس باختہ ہوگئے اور ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔

اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ یکایک حضرت خالدؓ بن ولید قلب کے دستوں کو لے کر دشمن کی صفوں میں جا گھسے اور اس کی سوار اور پیدل فوج کے درمیان حائل ہو کر تلوار کے جوہر دکھانے لگے۔ سب سے پہلے دشمن کے سواروں نے حضرت خالدؓ کے دستہ سے شکست کھائی اور بھاگنے لگے۔ مسلمان فوج نے ان کو راستہ دے دیا اور وہ اندھا دھند بھاگتے ہوئے صحرا کی طرف نکل گئے۔ جدھر جس کو موقع ملا چلا گیا۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ آگے بڑھے اور دشمن کی پیدل فوج پر زبردست حملہ کر دیا۔ دشمنوں کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی دیوار ان پر آپڑی ہے۔ وہ گھبرا کر پسپا ہوئے۔ پیچھے پہاڑ تھا اس لیے راستہ نہ ملنے کی بنا پر بہت سے مارے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے وادیِ واقوصہ کا رخ کیا اور اس میں گر پڑے۔ مصیبت یہ ہوئی کہ رومیوں میں سے اکثر آدمیوں نے اپنے آپ کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ رکھا تھا تاکہ کوئی شخص فوج سے بھاگ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب چند آدمی وادی میں گرے تو بقیہ لوگ بھی زنجیروں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہی گرتے چلے گئے اور تمام فوج وادی میں غرق ہوگئی۔

طبری نے لکھا ہے کہ وادیِ واقوصہ میں ایک لاکھ بیس ہزار رومی غرق ہوئے۔ جو لوگ میدانِ جنگ میں مارے گئے وہ ان کے علاوہ تھے۔ لیکن اس میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ لڑائی تمام دن اور رات کے اکثر حصہ میں جاری رہی۔ صبح ہوئی تو حضرت خالدؓ بن ولید رومی لشکر کے سپہ سالار کے خیمے میں بیٹھے تھے اور آپ کو مکمل فتح حاصل ہو چکی تھی۔

رومیوں کے لیے یہ جنگ قہرِ الٰہی سے کم نہ تھی۔ ان کے لشکر کے بڑے بڑے سردار اور بہادر اس جنگ میں مارے گئے۔ مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں بہت کافی نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے تین ہزار آدمی جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی کافی تعداد میں تھے، شہید ہوگئے۔ اندازہ ہے کہ ایک ہزار صحابہؓ نے اس جنگ میں شہادت پائی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات اور حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی

معرکہ ابھی جاری ہی تھا کہ حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس

حضرت عمرؓ بن الخطاب کا قاصد آیا اور ایک خط دیا جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات اور حضرت عمرؓ کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کی اطلاع تھی۔ اسی خط میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی لکھا تھا کہ اُنھوں نے خالدؓ کو اپنے لشکر کی قیادت سے ہٹادیا ہے اور ان کی جگہ ابوعبیدہؓ کو لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ شاید اس سے حضرت عمرؓ کا منشا یہ تھا کہ خالدؓ کو اس لشکر کی قیادت سے الگ کر دیا جائے جو عراق سے اُن کے ساتھ آیا تھا اور ان کی بجائے ابوعبیدہؓ کو سپہ سالار مقرر کر دیا جائے۔

جب حضرت خالدؓ نے حضرت عمرؓ کا خط پڑھا تو مناسب نہ سمجھا کہ اُس وقت، جب کہ گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، اس خط کے مضمون کو عام لوگوں پر ظاہر کیا جائے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس عکرمہؓ اور ان کے بیٹے عمرؓ لائے گئے جو زخموں سے چُور تھے اور دم توڑ رہے تھے۔ آپ نے عکرمہؓ کا سر اپنی ران پر اور عمرؓ کا سر اپنی پنڈلی پر رکھا اور ان کے حلق میں پانی ٹپکاتے اور ان کے چہروں کو گرد سے صاف کرتے ہوئے کہا:

"خدا کی قسم! عمرؓ بن الخطاب کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے۔"

معرکۂ یرموک میں مسلمان عورتوں کی بے نظیر بہادری

اس معرکہ کے ضمن میں ہم نے جو کچھ واقعات بیان کیے ہیں ان میں اس امر کا اور اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اس جنگ میں مسلمان عورتوں نے بھی زبردست بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنا ایک الگ دستہ بنا کر مردانگی کے جوہر دکھائے۔ وہ لشکرِ اسلامی کو پانی پلاتی پھرتی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ بعض عورتوں نے مسلمانوں کے عزائم کو مضبوط اور ان کے دلوں میں بہادری کا جذبہ پیدا کرنے میں بے حد مدد دی۔ وہ مسلمانوں کی صفوں کے پیچھے سے چلاتی تھیں کہ دشمن پر زبردست حملہ کرو۔ جب کسی مسلمان سپاہی کے کان میں کسی عورت کی آواز آتی تھی تو اس کے جوش و خروش اور ولولہ میں اور اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ دشمنوں کی صفوں پر اس طرح ٹوٹتا تھا کہ اس کے آگے کوئی تلوار، کوئی نیزہ اور کوئی بڑے سے بڑا بہادر بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔

اسلامی لشکر کے بہت سے سپاہی اپنے ساتھ اپنی بیویوں اور بچوں کو لائے تھے۔ عورتیں لشکر کے پیچھے رہتی تھیں ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے تھے، جو بھی بھاگنے کی کوشش کرتا وہ اس کے منہ پر پتھر دے مارتی تھیں اور اسے دوبارہ لشکر میں جانے اور دشمنوں سے آخر دم تک لڑنے پر مجبور کرتی تھیں۔

جب رومی زبردست حملہ کر کے آگے بڑھے تو حضرت خالدؓ بن ولید عورتوں کے پاس پہنچے۔ وہ ایک اونچی [illegible] کھڑی تھیں، ان کے ساتھ ابوسفیانؓ بھی تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ان عورتوں سے کہا:

"اے خواتینِ اسلام! جو شخص بھی شکست کھا کر تمھارے پاس آئے تم اسے قتل کر ڈالو۔"

ان وجوہ کی بنا پر ہر مسلمان مجبور تھا کہ وہ دشمن کے مقابلہ میں آخر دم تک لڑے اور پیچھے کی طرف نگاہ اٹھا کر [illegible] خواہ ایسا کرنے میں اسے موت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ امر کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک لشکر جس کی تعداد چالیس ہزار ہے، اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر پر جسے سامانِ جنگ کی فراوانی، تنظیم اور تہذیب و تمدن کی وجہ سے

اوپر ناز ہے، غالب آجاتا ہے اور لشکر کی زیادتی، سامانِ جنگ کی فراوانی اور عسکری تنظیم دشمن کے کسی کام نہیں آتی۔

اگر کوئی شخص یہ کہے جیسا کہ بعض یورپین مورخین نے اپنی کتابوں میں لکھا بھی ہے کہ عراق اور شام میں اسلامی فتوحات کی وجہ یہ تھی کہ دونوں سلطنتیں اپنے داخلی امور میں پھنسی ہوئی تھیں اس لیے وہ ابھی سے مسلمان افواج کا مقابلہ نہیں کر سکیں تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ان داخلی جھگڑوں کی موجودگی کے باوجود ایرانیوں اور رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے عظیم الشان فوجیں اکٹھی کر لیں جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ایرانی اور رومی فوجیں بحر و بر سے اُبل پڑی تھیں۔ آخر یہ داخلی جھگڑے ایرانیوں اور رومیوں کو اس قدر عظیم الشان افواج کو جمع کرنے سے کیوں نہ روک سکے۔

جس امر نے مسلمانوں کی ان جنگوں میں مدد کی وہ ان کی جرأت، قربانی، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دینِ اسلام پھیلانے کے لیے ان کا جذبہ صادق تھا۔ اس کے علاوہ سالاران (عساکر) کی بے نظیر مہارتِ جنگ اور حُسنِ تدبیر کا بھی ان فتوحات میں بہت بڑا حصہ تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی کا سوال

رہا حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کے لشکر کی قیادت سے علٰحدہ کرنے کا معاملہ، تو اس بارہ میں ہماری یہ رائے ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو کبھی افواجِ شام کا سپہ سالار مقرر نہیں کیا تھا جو حضرت عمرؓ انہیں معزول کر دیتے۔ آپ نے حضرت خالدؓ کو صرف شام کی طرف جانے والی فوجوں کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ آپ صرف اپنے اس لشکر کے سردار تھے جو عراق سے شام آیا تھا۔ آپ کی طرح دیگر چار حضرات بھی حضرت صدیقؓ کے حکم سے اپنی اپنی فوج کے سردار تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو یرموک اور اجنادین کے ان تمام سپہ سالاران عساکر نے اپنی مرضی سے ایک دن کے لیے اپنا امیر مقرر کیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اس معاملے کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کا منشا یہ تھا کہ خالدؓ اور بقیہ قائدین کی فوجوں کو جو شام میں موجود تھیں علٰحدہ علٰحدہ قیادت کے ماتحت نہ رکھا جائے، بلکہ ایک سپہ سالار کے ماتحت کر دیا جائے۔ اس غرض کے لیے آپ نے ابو عبیدہؓ کو چُنا اور انہیں جنگ کے تمام معاملات طے کرنے اور فوجیں اِدھر سے اُدھر بھیجنے کا اختیار سونپ دیا۔ کیونکہ اس وقت جنگی مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا۔

مورخین میں اس کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے کس وقت حضرت خالدؓ کو ابو عبیدہؓ کے ماتحت کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ واقعہ جنگِ یرموک کے دوران میں پیش آیا اور بعض کہتے ہیں کہ دمشق کی فتح کے بعد[1]

تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات جمادی الاخریٰ ۱۳ھ میں ہوئی، البتہ تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض ۲۱ جمادی الاخریٰ بتاتے ہیں اور بعض ۲۲ جمادی الاخریٰ۔ بلاذری جو معرکۂ یرموک کو معرکۂ اجنادین کے بعد قرار دیتا ہے، لکھتا ہے کہ مسلمانوں کو حضرت صدیقؓ کی وفات کی خبر یرموک پر معرکۂ یاقوصہ کے دوران میں ملی[2]

---

[1] مستشرق لامنس کہتا ہے کہ ابو عبیدہؓ کو خالدؓ کی جگہ لشکر کا سپہ سالار یرموک کے بعد مقرر کیا گیا۔ بکر بھی اسی رائے کی تائید کرتا ہے۔

[2] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۱۴ جرمن مستشرق خایل بھی گبن کی کتاب "عروج و زوال سلطنت روما" کے حاشیہ میں اسی کی تائید کرتا ہے۔

فصل پنجم ــــ خلیفۂ اوّل کے عہد میں اسلامی سلطنت کا داخلی نظام

(۱)

سلطنت کا داخلی نظام

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں چونکہ اسلامی سلطنت زیادہ وسیع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے سلطنت کا انتظام و انصرام کرنے کے لیے بھی وسیع پیمانے پر انتظامات نہیں کیے گئے۔ اسلامی سلطنت اس شان و شوکت اور تہذیب و تمدن سے بالکل خالی تھی جس کے لیے اس کی ہمسایہ سلطنتیں چار دانگِ عالم میں شہرت رکھتی تھیں۔

حکومت کا سارا انتظام کلّی طور پر خلیفہ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ ہی حاکم تھے، آپ ہی قاضی تھے۔ جو احکام دئے جاتے تھے وہ سب آپ ہی دیتے تھے۔ جو حدود (سزائیں) قایم کی جاتی تھیں ان کا اجرا آپ ہی کرتے تھے تاہم آپ نے اپنی آسانی کے لیے بعض امور مدینہ کے بعض صحابہؓ کو سپرد کر رکھے تھے۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ آپ نے مدینہ کا قاضی حضرت عمرؓ کو مقرر کیا تھا اور شام بھیجنے سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ عامر بن الجراح کو بیت المال کا انچارج بنا رکھا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے لیے کوئی معین کاتب (پرائیویٹ سیکرٹری) مقرر نہیں کیا تھا۔ عموماً خط و کتابت کا کام حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت علیؓ بن ابی طالب سرانجام دیا کرتے تھے۔ جب کبھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کچھ لکھوانے کی ضرورت ہوتی تھی آپ ان تینوں میں سے کسی کو بلا لیا کرتے تھے۔

چونکہ مملکت کا سارا انتظام خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور آپ اپنی مدد کے لیے کبھی کبھی کسی شخص کو بلا کر اس کے سپرد کچھ کام کر دیتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کی تنخواہوں کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ بیت المال سے تمام مسلمانوں کا جتنا جتنا وظیفہ مقرر تھا اتنا ہی ان لوگوں کو بھی ملتا تھا۔ ان کے کام کے معاوضہ میں کوئی زاید رقم انھیں نہیں دی جاتی تھی۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں سلطنتِ اسلامی کا نظام صرف جزیرۂ عرب میں قائم تھا کیونکہ عراق اور شام کے وہ علاقے جو اسلامی سپہ سالاروں کے ہاتھوں فتح ہو رہے تھے ان میں باقاعدہ طور پر کوئی حکومت قائم نہیں تھی وہاں کے داخلی امور پر ابھی تک پوری طرح قابو نہیں پایا جا سکا تھا اور نہ ان علاقوں میں کسی قسم کی کوئی تنظیم قائم کی گئی تھی۔ ان علاقوں کا انتظام اسلامی لشکر کے ان قائدین کے ہاتھوں میں تھا جنھیں دربارِ خلافت کی طرف سے انھیں فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

جزیرۂ عرب کے صوبوں کے امیر

جزیرۂ عرب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختلف صوبوں (ولایات) میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر صوبہ پر ایک امیر مقرر فرما دیا تھا، جو نماز پڑھاتا تھا، مقدمات کا فیصلہ اور حدود شرعی کا نفاذ کرتا تھا۔ وہ خود ہی امیر اور خود ہی قاضی ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک

جزیرۃ عرب کے صوبے اور ان کے امیر حسب ذیل تھے:

۱۔ **مکہ**: اس کے والی عتابؓ بن اسید تھے۔ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں ہی مکہ کا والی مقرر کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی بدستور یہی حاکم رہے۔

۲۔ **طائف**: اس کے امیر حضرت عثمانؓ بن عفان تھے۔ یہ بھی عہدِ رسالت سے یہیں مقرر تھے۔

۳۔ **صنعاء**: اس کے والی مہاجرؓ بن ابی امیہ تھے۔ مرتدین کی جنگوں میں آپ نے اسے فتح کیا اور اس کے والی بنائے گئے۔

۴۔ **حضرموت**: اس کے امیر زیادؓ بن لبید تھے۔

۵۔ **خولان**: اس کے امیر یعلیٰؓ بن امیہ تھے۔

۶۔ **زبید و رمع (یمن)**: اس کے امیر ابوموسیٰ اشعریؓ تھے۔

۷۔ **جند**: اس کے امیر معاذؓ بن جبل تھے۔

۸۔ **نجران**: اس کے امیر جریرؓ بن عبداللہ تھے۔

۹۔ **جرش**: اس کے امیر عبداللہؓ بن ثور تھے۔

۱۰۔ **بحرین**: اس کے امیر علاءؓ بن حضرمی تھے۔

خلیفہ کا گزارہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک کامیاب تاجر تھے۔ خلافت کے بعد بھی آپ کا گزارہ چھ مہینے تک تجارت سے ہی ہوتا رہا۔ اس عرصہ میں آپ نے اپنے خرچ کے لیے بیت المال سے ایک پائی بھی نہیں لی۔ ایک دن آپ اپنے کندھے پر کمبلوں کی ایک گٹھڑی اٹھائے بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت عمرؓ مل گئے۔ اُنھوں نے آپ سے پوچھا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

"بازار جا رہا ہوں۔"

حضرت عمرؓ بولے:

"آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو تو خلیفہ بنا یا گیا ہے اور مسلمانوں کے تمام معاملات آپ کی نگرانی میں دئے گئے ہیں، آپ ان معاملات کو کس طرح سرانجام دیں گے؟"

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:

"آخر میں اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا:

"آپ میرے ساتھ ابوعبیدہؓ (امین بیت المال) کے پاس چلیے۔ وہ بیت المال میں سے آپ کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیں گے۔"

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس گئے اور انھوں نے آپ کا اتنا ہی وظیفہ مقرر کرایا جتنا باقی مہاجرینؓ کو ملتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کا اور آپ کے اہل وعیال کا لباس بھی بیت المال میں سے دیا جانے لگا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کے لیے چھ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن جب آپ وفات پانے لگے تو آپ نے بیت المال میں سے جتنا روپیہ لیا تھا وہ سب واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے آپ کے ورثا نے آپ کی زمین بیچی اور اس سے جو روپیہ حاصل ہوا وہ بیت المال میں داخل کر دیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ شروع سے ہی اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ بیت المال میں سے کچھ لیا جائے اسی لیے آپ نے اپنی زمین بیچنے کا حکم دیا تاکہ جو کچھ آپ نے اپنے عرصۂ خلافت میں بیت المال میں سے لیا ہے وہ سب اس میں واپس پہنچ جائے اور اس طرح دوسرے مسلمانوں کا حق نہ مارا جائے۔

فوجوں کے اخراجات

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں مسلمان سپاہی بغیر کسی تنخواہ کے کام کرتے تھے۔ خلیفہ اور بیت المال پر ان کا کوئی بار نہ تھا۔ وہ اپنے پاس سے سامانِ جنگ خریدتے تھے۔ راستے میں جو کچھ بھی خرچ ہوتا تھا وہ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ البتہ جب جنگوں کے بعد مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا تو اس میں سارے سپاہی شریک ہوتے تھے۔ غنیمت کا ۴/۵ حصہ لشکر کو ملتا تھا۔ البتہ اگر کوئی شخص میدانِ جنگ میں کسی دشمن کو مار گراتا تھا تو مقتول کے بدن پر جو کچھ ہوتا تھا وہ سب اس کے مارنے والے کے حصے میں آتا تھا۔ عراق اور روم کی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھ اس قدر مالِ غنیمت آیا کہ عربوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جب ان مسلمانوں نے یہ دیکھا جو اپنے گھروں میں بیٹھے تھے، تو وہ بھی جوق در جوق اپنے بھائیوں سے ملنے میدانِ جنگ میں پہنچنے لگے۔

اموال تقسیم کرنے میں مساوات

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب مسلمانوں میں اموال تقسیم کیا کرتے تھے تو سب کا حصہ ایک جیسا مقرر کرتے تھے۔ کسی شخص کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ سے کہا گیا:

"آپ سابقون الاوّلون اور ان لوگوں کو، جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا، کس طرح برابر برابر رکھتے ہیں؟"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا:

"جو لوگ ابتداءً اسلام میں داخل ہوئے اُنھوں نے یہ کام آخرت کے لیے کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دین میں پہلے داخل ہوئے اس لیے ان کا اجر بھی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دے سکتا۔"

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس)، زکوٰۃ، صدقہ، ذمیوں کا جزیہ وغیرہ، غرضیکہ جو رقم یا مال آپ کو موصول ہوتا تھا وہ سب آپ بیت المال میں جمع کرا دیتے اور پھر اس میں سے اپنا ماہانہ وظیفہ لیتے تھے۔ اپنے عمال اور ولاۃ کو ان کی تنخواہیں بھیجتے تھے اور باقی مال ان مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے جو مدینہ یا اس کے باہر رہائش رکھتے تھے۔ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ میں ابتداءً ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور جو جنگِ بدر اور جنگِ اُحد میں شامل ہوئے تھے۔

جمع قرآن کریم قرآن کریم کے جمع کرنے کا اہم بالشان کام بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں سرانجام دیا گیا تھا۔ اس اہم کام کی طرف توجہ اس طرح مبذول ہوئی کہ یمامہ اور مرتدین کی جنگوں میں کئی قاری شہید ہو گئے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ کو خیال پیدا ہوا کہ اگر اسی طرح قاری شہید ہوتے رہے تو کہیں قرآن کریم ہی ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے اس کو ایک مصحف میں جمع کر لینا چاہیے۔ آپ نے اس رائے کا اظہار حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کیا۔ شروع میں تو آپ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا میں اُسے کس طرح کر سکتا ہوں۔ لیکن آخر کار حضرت عمرؓ کے اصرار سے راضی ہو گئے اور زیدؓ بن ثابت کو اس کام پر مامور فرما دیا۔

صحابہ کرامؓ قرآن کریم کو کھالوں، ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اس کو حفظ بھی کرتے تھے۔ جب بارگاہِ خلافت سے حضرت زیدؓ بن ثابت کو قرآن کریم کے جمع کرنے کا کام تفویض ہوا تو آپ نے سب جگہوں سے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کو جمع کر کے ایک جگہ لکھنا شروع کیا۔ سورۃ توبہ کی دو آیات نہیں ملتی تھیں جو بعد تلاش کے بعد آنحضرت خزیمہؓ بن ثابت کے پاس سے دستیاب ہو گئیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے تمام قرآن جمع کر کے اسے ایک مصحف میں ترتیب دیا اور حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کر دیا جو آخری وقت تک آپ ہی کے پاس رہا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد وہ مصحف حضرت عمرؓ کے پاس آگیا اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد میں اسے حضرت حفصہؓ کے پاس سے منگوا کر اس کی مختلف نقلیں کرائیں اور ایک ایک نقل تمام بڑے بڑے اسلامی شہروں میں بھیج دی۔

(۲)

مسئلہ خلافت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہیں فرمایا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ چاہتا تھا کہ خلافت اس کے حصہ میں آئے۔ دوسرا فریق چاہتا تھا کہ خلیفہ اس کے قبیلہ میں سے ہو۔ آخر تھوڑی دیر کی حیص بیص کے بعد تمام مسلمانوں کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر اتفاق ہو گیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو وہ وقت بڑا نازک تھا۔ دشمنانِ اسلام سے جنگیں ہو رہی تھیں۔ آپ کو خوف پیدا ہوا کہ

لہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ۷ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو بخار سے بیمار ہوئے اور ۱۷ روز بیمار رہنے کے بعد ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کی شام کو وفات پا گئے۔ آپ کی مدتِ خلافت دو سال تین مہینے دس دن ہے۔ آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے پہلو میں بجانب مشرق دفن ہوئے۔

اگر میں نے اپنے جیتے جی مسلمانوں کے لیے کوئی خلیفہ مقرر نہ کر دیا تو میرے بعد ان میں فتنہ پیدا ہو جائے گا۔ اس غرض کے لیے آپ نے اپنی نظر تمام صحابہ کرامؓ پر دوڑائی اور ان میں کسی ایک آدمی کو ڈھونڈا جو سختی کے ساتھ سلطنت کا نظام قائم رکھ سکے لیکن اس کی طبیعت میں تندی اور درشتی نہ ہو۔ جو نرم دل ہو لیکن کمزور نہ ہو۔ اس معیار پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہؓ پورے اترتے تھے۔ لیکن جو بات حضرت عمرؓ میں تھی وہ کسی اور میں نہ تھی اور حقیقتاً آپ ہی حضرت ابوبکرؓ کے بعد خلیفہ ہونے کے مستحق تھے۔ یہ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کی رائے نہ تھی بلکہ ان تمام لوگوں نے بھی جن سے حضرت صدیق اکبرؓ نے اس سلسلہ میں مشورہ کیا یہی رائے دی کہ خلافت کے لیے حضرت عمرؓ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔

رفیق بک اعظم مؤلف کتاب "اشہر مشاہیر الاسلام" میں لکھتے ہیں :

"صحابہ کرامؓ میں صرف دو آدمی ایسے تھے جن میں مذکورہ بالا صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں، ایک حضرت عمرؓ بن الخطاب، دوسرے حضرت علیؓ بن ابی طالب۔ لیکن حضرت عمرؓ کی یہ عادت تھی کہ اگر آپ کسی بات کا ارادہ کرتے اور بعد کو اس پر عمل کرنے میں دشواری پیدا ہوتی تو ارادہ ترک فرما دیتے۔ لیکن حضرت علیؓ بن ابی طالب اگر کسی کام کے کرنے کا ارادہ فرما لیتے تو پھر خواہ اس راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتیں آپ اس سے نہ ہٹتے اور اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے۔"

ممکن ہے اس امر میں کچھ سچائی ہو۔ لیکن حضرت علیؓ کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پہلی بیعت کے وقت کا رویہ اور آپ کا یہ دعویٰ کہ آپ ہی خلافت کے صحیح حقدار ہیں[1] منجملہ ان اسباب کے تھا جنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت علیؓ کے ہاتھ میں زمامِ خلافت دے دینے سے روکا۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کی نظروں میں خلافت کسی خاص گروہ کا ورثہ نہیں تھی۔ مسلمانوں میں سے جو کوئی خلافت کے معیار پر پورا اترتا اس کو حاصل کر سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنی اسی خواہش کا ذکر فرمایا تھا کہ کاش انصارؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے کہ خلافت میں ان کا حصہ بھی ہوگا یا نہیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو سقیفہ بنی ساعدہ والے دن کوئی جھگڑا ہی نہ پیدا ہوتا۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آئندہ ہونے والے خلیفہ کا اپنی نظروں میں انتخاب کر لیا تو چاہا کہ صحابہؓ سے بھی اس کی تصدیق کرائی جائے اور ان سے بھی اس امر میں مشورہ حاصل کر لیا جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلا بھیجا اور حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ انھوں نے عرض کیا :

"آپ کی رائے بالکل درست ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ عمرؓ میں سختی ہے۔"

---

[1] جہاں تک معلوم ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہی خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کرتے تو بقول مؤلفِ کتاب اپنی مستقل مزاجی کی عادت کے مطابق بڑی سختی کے ساتھ اپنے دعوے پر قائم رہتے اور ہرگز تین خلیفوں کی پے در پے بیعت نہ کرتے، بلکہ شروع ہی سے لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دیتے۔ (محمد احمد پانی پتی)

حضرت صدیقؓ نے کہا ؛

" عمرؓ کی سختی کا سبب یہ ہے کہ میں نرم طبیعت رکھتا تھا ۔ میں نے اندازہ کیا ہے کہ جس معاملہ میں میں نرمی اختیار کرتا تھا اس میں عمرؓ کی رائے سختی کی جانب مائل ہوتی تھی ۔ لیکن جن معاملات میں میں نے سختی اختیار کی عمرؓ کی رائے ان میں نرمی کی طرف مائل ہوتی تھی ۔ میرا خیال ہے کہ خلافت ان کو نرم دل بنا دے گی ۔"

اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ بن عفان سے پوچھا ، انھوں نے جواب دیا ؛

" عمرؓ جیسا انسان ہم میں کوئی نہیں ۔"

حضرت عثمانؓ سے پوچھنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دوسرے مہاجرینؓ اور انصارؓ سے بھی حضرت عمرؓ کے بارہ میں دریافت فرمایا سب نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کو سراہا اور حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنانے کی حمایت کی ۔

جب حضرت صدیقؓ نے دیکھ لیا کہ ان کی رائے کی کسی نے مخالفت نہیں کی تو آپ نے حضرت عثمانؓ کو بلایا اور ان کو وصیت نامہ لکھوانا شروع کیا ۔ آپ نے لکھوایا ؛

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ وہ عہد ہے جو ابوبکرؓ بن ابی قحافہ نے مسلمانوں سے کیا ہے ۔"

اس کے بعد آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی تو حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے لکھ دیا ؛

" میں نے تم لوگوں پر عمرؓ بن خطاب کو مقرر کیا ہے اور تم لوگوں کی بہتری اور بھلائی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔"

اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیق کو ہوش آیا اور آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے مجھے پڑھ کر سناؤ ۔ حضرت عثمانؓ نے ، جو حضرت ابوبکرؓ نے لکھوایا تھا اور جو انھوں نے خود لکھا تھا ، سب پڑھ کر سنا دیا ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا ؛

" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ڈر تھا کہ اگر اسی بیہوشی کے دوران میں میری موت ہوگئی تو میرے بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا ۔"

حضرت عثمان نے کہا ؛

" جی ہاں یہی بات ہے ۔"

آپ نے فرمایا ؛

" خدا تعالیٰ تمھیں اس کی جزا دے ۔"

اس طرح حضرت عثمانؓ نے جو کچھ لکھا تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی توثیق کر دی ۔

طبری کہتا ہے ؛

" جب یہ تحریر لکھی جا چکی تو آپ اسی شدتِ مرض میں لوگوں کے سامنے آئے ۔ آپ کی بیوی حضرت اسماءؓ بنت عمیس آپ کو پکڑے ہوئے تھیں آپ نے لوگوں سے کہا ؛

"میں نے جس شخص کو تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے ، کیا تم اس پر راضی ہو؟ کیونکہ میں نے صرف اپنی ہی رائے سے عمرؓ کو خلیفہ نہیں بنایا بلکہ صائب الرائے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد بنایا ہے ۔ پھر میں نے اپنے کسی عزیز اور رشتہ دار کو بھی خلیفہ منتخب نہیں کیا۔"

لوگوں نے جواب دیا ، "ہم آپ کے انتخاب کو بصدق دل قبول کرتے ہوئے عمرؓ کو اپنا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔"

پھر آپ نے فرمایا :

"تمھیں چاہیے کہ تم عمرؓ کا کہا مانو اور ان کی اطاعت کرو۔"

سب حاضرین نے اس کا بھی اقرار کیا ۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنے پاس بُلایا اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

"اے عمرؓ ! میں نے تمھیں اپنے بعد خلیفہ بنایا ہے ۔ میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا اور وہ کام کرنا جس میں اسلام اور مسلمانوں کا فائدہ ہو ۔ اے عمرؓ ! اللہ تعالیٰ کے بعض حقوق رات سے متعلق ہیں ان کو وہ دن میں قبول نہیں کرے گا اور بعض حقوق دن سے متعلق ہیں ان کی مقبولیت رات میں نہ ہوگی ۔ جب تک فرائض کی ادائیگی نہ کی جائے اللہ تعالیٰ نوافل قبول نہیں فرماتا ۔ اے عمرؓ ! قیامت میں وہی لوگ فلاح پائیں گے جن کے نیک اعمال وزنی ہوں گے ۔ جن کے نیک اعمال بُرے اعمال کی نسبت کم ہوں گے انھیں مصائب میں مبتلا ہونا پڑے گا ۔ اے عمرؓ ! کامیابی اور نجات قرآن مجید پر عمل اور حق کی پیروی کرنے سے میسّر ہوتی ہے ۔ اے عمرؓ ! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ترغیب و ترہیب اور انذار و بشارات کی آیات قرآن مجید میں ساتھ ساتھ نازل ہوئی ہیں تاکہ مومن خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے اور ہمیشہ اس سے اپنی مغفرت طلب کرتا رہے ۔ اے عمرؓ ! جب قرآن مجید میں دوزخیوں کا ذکر آئے تو دعا کرو کہ اے اللہ ! مجھے ان لوگوں میں شامل نہ کریو ۔ اور جب جنتیوں کا ذکر آئے تو دعا کرنا کہ اے اللہ ! تُو مجھے ان لوگوں میں شامل کر ۔ اے عمرؓ ! جب تم میری ان وصیتوں پر عمل کرو گے تو گویا مجھے اپنے پاس بیٹھا ہوا پاؤ گے۔"

جب حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس سے چلے گئے تو آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا :

"اے اللہ ! میری غرض ایسا کرنے سے صرف مسلمانوں کی خیر خواہی ہے ۔ مجھے ان میں فتنہ کا ڈر تھا ۔ اس لئے میں نے ان کے بارہ میں وہ کام کیا جسے تو بہتر طور پر جانتا ہے ۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد لوگوں میں سب سے بہترین ، سب سے زیادہ طاقتور اور لوگوں کی بھلائی کے لیے سب سے زیادہ کوشاں رہنے والے انسان کو ان پر مقرر کیا ہے ۔ میری موت اب قریب ہے اس لیے تو ہی میرے بعد

مسلمانوں کا نگران بن - وہ تیرے بندے ہیں - ان کی پیشانیاں تیرے ہاتھ میں ہیں - اے اللہ! ان کے والیوں کی اصلاح کر - عمرؓ کو خلفائے راشدین میں سے بنا اور مسلمانوں کو اس کا مددگار اور معاون بنا دے۔"

(۳)

ولاۃِ ثلاثہ

ہم شروع میں مستشرق " لامنس " کا وہ نظریہ بیان کر چکے ہیں جو اس نے اپنی کتاب " الولاۃ الثلاثۃ " میں حضرت ابوبکر صدیق رضی کی خلافت کے بارہ میں قائم کیا ہے - اس جگہ ہم اس نظریہ پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت، آپ کی سیاست اور آپ کے اعمال کے تمام پہلو اُجاگر ہو جائیں۔

لامنس نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں میں سب سے زیادہ عقلمند، سب سے زیادہ مدبر اور سب سے زیادہ وسیع النظر تھے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ ہی سے ان کے دل میں خلافت کے حصول کی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی۔ خلافت کی خواہش عمرؓ بن الخطاب اور ابوعبیدہؓ عامر ابن الجراح کے دلوں میں بھی تھی۔ لیکن چونکہ ابوبکرؓ مسلمانوں میں ایک بلند مرتبہ کے مالک تھے اور سارے مسلمان ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا نہایت درجہ احترام کرتے تھے۔ اس لیے ان تینوں حضرات کے درمیان اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ ابوبکرؓ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد پہلے خلیفہ بنیں اور اپنی خلافت کے دوران میں عمرؓ کی خلافت کے لیے راہ ہموار کریں جن کی سختی کی وجہ سے اکثر مسلمان ان کی حکومت سے ڈرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے اپنے عہد کا پاس کیا اور اپنے زمانۂ خلافت میں عمرؓ کی خلافت کے لیے راہ ہموار کر لی۔ جب آپ کا آخری وقت نزدیک آیا تو آپ نے لوگوں سے عمرؓ کی خلافت قبول کرنے کا عہد لے لیا۔

ان تینوں کے مبینہ باہمی مشورہ کو لامنس نے " سیاسی سازش " قرار دیا ہے اور اپنے اس دعویٰ میں جان پیدا کرنے کے لیے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس " سازش " میں بعض عورتیں بھی شریک تھیں۔ اس خودساختہ " سازش " کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لامنس نے من گھڑت روایات کا سہارا ڈھونڈا ہے جن کا مستند تاریخی کتابوں میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لامنس نے لکھا ہے کہ اس " سازش " میں عائشہؓ شریک تھیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیوی اور ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں، اور ذکاوت، فطانت اور سیاسی سُوجھ بُوجھ میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک اور بیوی (عمرؓ کی بیٹی) حفصہؓ کو بھی ملا لیا۔ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مرض الموت میں مبتلا تھے تو یہ دونوں رسول اللہؐ کے پاس آ گئیں اور آپؐ کو مجبور کیا کہ ابوبکرؓ کو حکم دیں کہ وہ آپؐ کی غیر حاضری میں لوگوں کو نماز پڑھائیں۔[1]

---

[1] جو بے سروپا قصہ لامنس نے لکھا ہے وہ بالکل فرضی اور من گھڑت ہے۔ اس کے مقابل طبقات ابنِ سعد میں لکھا ہے کہ

(باقی بر صفحہ آئندہ)

لامنس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "رسول اللہؐ نے ان دونوں کی باہمی سازش کو محسوس کر لیا تھا اور جب ان دونوں نے آپؐ سے ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کے لیے بڑے زور سے کہا تو آپؐ نے اس غرض کے لیے عثمانؓ کا نام لیا۔"

یہ تعجب انگیز امر ہے کہ لامنس اپنے دعوے کی تائید میں جو کوئی روایت یا حوالہ پیش کرتا ہے وہ ایسی کتابوں سے پیش کرتا ہے جو نایاب ہوتی ہیں یا پھر اس کا ماخذ وہ نادر مخطوطات ہوتے ہیں جو صرف یورپ کے کتب خانوں ہی میں موجود ہیں اور جن تک پہنچنا یا جن کے متعلق یہ تحقیق کرنا کہ جو کچھ لامنس نے ان کتابوں اور مخطوطات کے حوالے سے لکھا ہے، واقعی وہ ان میں پایا بھی جاتا ہے یا نہیں، انتہائی دشوار امر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لیے اس واسطے ہرگز نامزد نہیں فرمایا کہ ان دونوں کے درمیان پہلے ہی سے اس کے متعلق کوئی سمجھوتہ ہو چکا تھا بلکہ محض اس وجہ سے کہ آپ کو پورا یقین تھا کہ صحابہؓ میں عمرؓ سے زیادہ اور کوئی اس عظیم اور اہم ذمہ داری کے منصب کا اہل نہیں جیسا کہ بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جو کچھ خیال تھا وہ بالکل درست تھا اور حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمتیں سرانجام دیں جن کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔

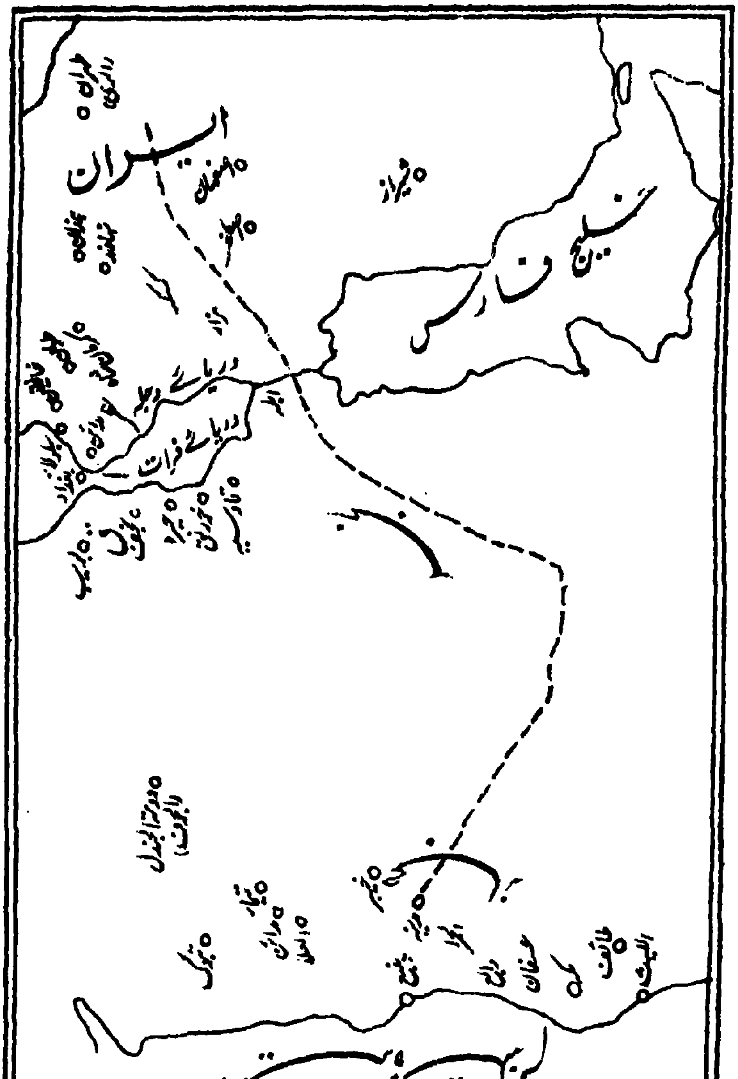
حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد کی ساری تاریخ میں ہمیں اس امر کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان لوگوں میں سے تھے جو اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلافت کی مطلق پروا نہ تھی اور آپ کی شدید خواہش تھی کہ آپ کو دنیوی معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت سنبھالنے کی وجہ سے انصاف کے خلاف کوئی بات آپ سے صادر ہو، جس کے لیے آپ کو خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے۔ آپ نے اپنی جگہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کو بھی محض اس لیے مقرر کیا کہ آپ کو فتنہ کا شدید خوف تھا آپ چاہتے تھے کہ مسلمان ہر قسم کی کج روی سے کوسوں دور رہیں۔ آپ کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ مسلمانوں کو ترقی کی شاہراہ سے بھٹکنے نہ دے۔ مسلمان ہر میدان میں فتح اور کامرانی سے مشرف ہوتے رہیں۔ ان میں اقتدار کی خواہش پیدا نہ ہو اور خلافت کے متعلق مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو خواہشات تھیں وہ سب کی سب نہایت احسن طور پر پوری ہو گئیں۔ جس خلیفہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نامزد کیا تھا مسلمان اس پر راضی ہو گئے، اور صحابہؓ اور غیر صحابہ سب نے حضرت صدیقؓ کے انتخاب کو انتہائی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حضرت عائشہؓ اس بات کو ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہوں۔ آپ نے بیان کیا تھا کہ لوگ کبھی ایسے آدمی کو پسند نہیں کریں گے جو آپؐ کی جگہ پر آپؐ کی بجائے نماز پڑھائے کیونکہ مجھے خیال تھا کہ اگر رسول اللہؐ کی بیماری میں کسی نے آپؐ کی جگہ نماز پڑھائی اور رسول اللہؐ وفات پا گئے تو لوگ اس پر نحوست کا الزام لگائیں گے اسی لیے میں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کی بجائے کسی اور شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دیں۔

فتوحاتِ اسلامیہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور مسلمانوں کے قدم اپنی ہمسایہ سلطنتوں میں برابر آگے ہی بڑھتے گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی زندگی میں ہی خلافت کا فیصلہ نہ کر جاتے بلکہ اس امر کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیتے اور مسلمانوں کے درمیان خلافت کے بارہ میں باہم اختلاف اور انتشار پیدا ہو جاتا تو مسلمانوں کی تباہی یقینی تھی اس وقت مسلمانوں کی فوجیں روم اور ایران میں پھنسی ہوئی تھیں۔ رومی اور ایرانی اس اختلاف اور عصبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمان افواج پر پل پڑتے اور نہ صرف یہ کہ ان کو اپنی حدود سے باہر نکال دیتے بلکہ خود آگے بڑھ کر سرزمینِ عرب پر حملہ کر دیتے اور آن کی آن میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیتے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی فراستِ ایمانی، اپنے تدبر اور اپنی دُور اندیشی سے اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ لیا اور اپنی زندگی میں خلیفہ کا انتخاب کر کے تمام مسلمانوں سے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد لے لیا۔ آپ کے اس عمل نے مسلمانوں کو اس تباہی و بربادی سے بچا لیا جو حضرت صدیقؓ کے بعد انتشار و اختلاف کی وجہ سے ان پر نازل ہوتی۔

عراق میں اسلامی فتوحات



أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ

آپ کے صحابہؓ سخت ہیں کفار کے مقابلے میں

(الفتح ۲۹)



حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۱)

عمرؓ بن الخطاب

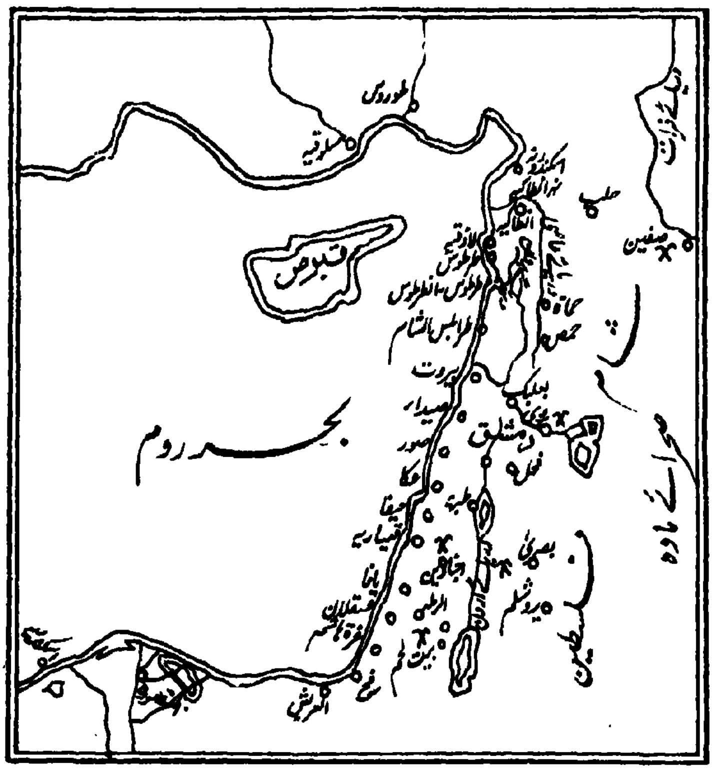
ربیع الاوّل ۱۱ھ کی ۱۲ تاریخ تھی اور پیر کا دن، حضرت عمرؓ بن الخطاب مسجدِ نبویؐ سے نکلے۔ چہرے پر شدید اضطراب اور آنکھوں سے آنسو رواں ——— ابھی تھوڑی دیر پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاکدانِ فانی سے ملاءِ اعلیٰ کی طرف کوچ فرما گئے تھے۔

اس وقت حضرت ابوبکرؓ اور بنو ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ دفن کیا جائے گا جہاں آپؐ نے وفات پائی تھی۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ کو بھی دوسرے صحابہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں شریک ہونا چاہیے تھا لیکن اپنی تمام تر حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی کے باوجود وہ زیادہ دیر تک اس جگہ ٹھہرنے کی تاب نہ لا سکے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تھی اور نہایت بے چینی، اور حد درجہ بیقراری کی حالت میں باہر نکل آئے۔

حضرت عمرؓ کے گرد و پیش ایک زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ لوگ رنج و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ہر زبان پر اسی جانکاہ حادثہ کا ذکر تھا، لیکن حضرت عمرؓ دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنے تصورات میں گم تھے۔ ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ اس وقت قبولِ اسلام کا منظر ان کی نگاہوں میں تھا جب وہ ایک عجیب تصرفِ غیبی کے زیرِ اثر دائرہٗ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور تمام خطرات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے انھوں نے قریش کے سامنے اپنے اسلام کا واشگاف اعلان کر دیا تھا، چھپ کر نماز پڑھنے کی بجائے دوسرے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر عین خانہ کعبہ کے سامنے ——— اپنے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے سامنے ——— نماز ادا کی تھی۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ کی آنکھوں کے سامنے وہ مناظر آ گئے جب ان کے قبولِ اسلام کے بعد کفارِ قریش کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر اسلام کی ترقی کو بزور نہ روکا گیا تو ان کی صفوں میں شدید انتشار پیدا ہو جائے گا اور یہ انتشار ان میں ایک ایسی خانہ جنگی کا آغاز کر دے گا جس کے انجام کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا۔ اس خوف سے انھوں نے مسلمانوں کو شدید تکلیفیں پہنچانے اور اسلام کا کُلّی استیصال کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان زیادہ دیر ان تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکیں گے

شام اور فلسطین میں اسلامی فتوحات



اور آخرکار انھیں پھر اپنے آبائی دین کی طرف لوٹنا پڑے گا۔

وہ تمام مظالم جو مکّہ کی زندگی میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر ڈھائے گئے، ایک ایک کر کے حضرت عمرؓ کی نگاہوں سے گزرتے گئے۔ انھوں نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ان مظالم کو سہا اور اُف تک نہ کی۔ آخر جب قریش کے ظلم و ستم کی کوئی حد ہی نہ رہی تو خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نازل ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے مکّہ سے رخصت ہو گئے:

'اے مکّہ کی سرزمین! تو مجھے دنیا کی سب بستیوں سے زیادہ پیاری ہے، مگر کیا کروں تیرے سپوت مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔'

اب مدینہ کی زندگی حضرت عمرؓ کی نظروں کے سامنے تھی کہ مشرکین مکہ نے یہاں بھی رسول اللہؐ کو چین نہ لینے دیا۔ بار بار اپنی فوجیں لے کر چڑھائی کی اور ہر بار یہ تہیّہ کر کے آئے کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ وہ (عمرؓ) ہر جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے۔ آخر ایک وقت آیا جب کفار کا زور ٹوٹ گیا، مسلمانوں نے مکہ پر قبضہ کر لیا اور سارا عرب اسلام کے زیر نگیں ہو گیا۔

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں نہیں ہیں۔ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو چکے ہیں۔ اب مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ کون سی طاقت انھیں سنبھالے رکھے گی؟

حضرت عمرؓ انھی افکار و تصورات میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک مہاجر آیا اور کہا:

"انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے میں سے ایک امیر منتخب کر لیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہو۔"

ہم اس جگہ سقیفہ بنی ساعدہ کا پورا حال نہیں لکھ سکتے کیونکہ "سیرۃ الصدیق" میں اس کا مفصل حال آ چکا ہے۔ البتہ صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جب واقعہ سقیفہ کے نتیجہ میں خلافت کا بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر آ پڑا[1] تو حضرت عمرؓ

---

[1] بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلافت کا حاصل ہو جانا مہاجرین کے ایک گروہ کی سازش کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ مشہور مصنف امین سعید اپنی کتاب "نشاۃ الدولۃ الاسلامیہ" میں اسی نظریہ کی تائید کرتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کسی سوچی سمجھی سازش کے ماتحت نہیں تھی بلکہ اچانک وقوع میں آئی تھی۔ پہلے سے کسی شخص کو اس کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اس موقع پر مہاجرین کی کوئی جماعت سوائے تین آدمیوں — حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے موجود نہیں تھی اگر حضرت عمرؓ جرأت سے کام لے کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں پہل نہ کرتے اور دوسرے لوگوں کو بھی بیعت کی طرف دعوت نہ دیتے تو اس بات کا سخت خطرہ تھا کہ سقیفہ میں یہ جھگڑا طول پکڑ جاتا اور اس طرح ایسے مناقشات کی بنیاد پڑ جاتی جو کسی کے روکے نہ رُکتے اور ان کا نتیجہ اسلام کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا۔

نے انتہائی وفاداری سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ساتھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی تمام مدتِ خلافت میں نہایت خلوص سے ان کی خدمت کی اور سلطنتِ اسلامی کے استحکام کے سلسلہ میں نہایت گراں قدر مشورے دیے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انھیں پورا اطمینان تھا کہ اپنا جانشین وہ ایک ایسے شخص کو مقرر کر کے جا رہے ہیں جو صحابہؓ میں سب سے زیادہ اس کام کا اہل ہے اور اس کے ہاتھوں اسلام کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب مرض الموت میں مبتلا تھے تو حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ:

"اے خلیفہ رسول! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے اپنے بعد عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا ہے حالانکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے۔ جب آپ کی موجودگی میں ان کا یہ حال ہے تو آپ کے بعد تو خدا جانے وہ لوگوں پر کیا قہر ڈھائیں۔ آپ اب اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو رہے ہیں، کیا وہ آپ سے آپ کی رعایا کے متعلق سوال نہیں کرے گا؟"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

"تم مجھے ڈراتے ہو؟ جب میں اپنے پروردگار سے ملوں گا تو عرض کروں گا کہ اے میرے خدا! میں نے اُمت پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا ہے جو لوگوں میں سب سے بہتر ہے۔"

حضرت طلحہؓ نے عرض کیا:

"اے خلیفۂ رسولؐ اللہ! کیا عمرؓ لوگوں میں سب سے بہتر ہیں؟"

اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا چہرہ تمتما اٹھا اور آپ نے بڑے جلال سے فرمایا:

"خدا کی قسم! وہ لوگوں میں واقعی سب سے بہتر ہے۔"

وہ کیا خصوصیات تھیں جن کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بعد عمرؓ ہی کو یہ عظیم ذمہ داری اٹھانے کے لیے منتخب فرمایا؟ حضرت عمرؓ اپنے نفس پر انتہائی قابو پانے والے، سختی کے وقت سختی کرنے والے، نرمی کے وقت نرمی سے پیش آنے والے اور انتہائی صائب الرائے شخص تھے۔ غیر متعلق باتوں سے قطعاً واسطہ نہ رکھتے تھے۔ مصائب اور پریشانیوں کے وقت کبھی ہمت نہ ہارتے تھے بلکہ نہایت خندہ جبینی کے ساتھ ان کا سامنا کرتے اور انتہائی استقلال سے ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ آپ کسی دوسرے سے کوئی بات سیکھنے میں قطعاً عار محسوس نہ کرتے تھے۔ جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے اسے نہایت چابکدستی اور محنت سے سرانجام دیتے تھے۔ کسی معاملہ میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے اور حق کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروا نہ کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلافت سونپ کر فراست اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے اخلاص کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا۔ اگر آپ خلافت کے مسئلہ کو اپنی زندگی ہی میں طے نہ کر جاتے تو یقیناً مسلمان اس مسئلہ میں اُلجھ کر اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل ہو جاتے اور اس صورت میں دُنیا کی تاریخ آج کچھ اور ہی

ہوتی۔ خلافت کے بارے میں اُمتِ مسلمہ کا انتشار، ارتداد کے فتنہ سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتا۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب واقعۂ فیل کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔[1] آپ کا شمار معززین قریش میں ہوتا تھا۔ جاہلیت میں آپ کے سپرد سفارت کا کام تھا۔ یعنی جب قریش اور کسی دوسرے قبیلے کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا یا آپس میں جنگ چھڑ جاتی تو قریش آپ کو دُوسرے قبیلہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ آپ اوائل اسلام ہی میں ایمان لے آئے تھے۔ آپ سے پہلے چالیس مردوں اور گیارہ عورتوں نے اسلام قبول کیا تھا۔[2]

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر جنگ میں شریک رہے۔ ۱۳ھ میں آپ خلیفہ بنے۔ آپ انتہائی پاک سیرت کے مالک تھے۔ خلافت کے زمانہ میں بیت المال سے اپنے گزارہ کے لیے اتنی ہی رقم لی جتنی دُوسرے لوگوں کو ملتی تھی۔ آپ کے عہد میں خدا تعالیٰ نے شام، عراق اور مصر کو مسلمانوں کے زیرِ نگیں کردیا۔

آپ طویل القامت تھے، جسم بھاری تھا، پیشانی کے بال موجود نہ تھے، رنگ سفید تھا اور دونوں آنکھیں سرخ تھیں۔

آپ انتہائی محنت سے کام کرنے والے تھے۔ آپ کی ہیبت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ آپ میں درشتی اور سختی پائی جاتی تھی لیکن یہ سختی امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لیے بے حد ضروری تھی۔ اگر آپ سختی سے کام نہ لیتے تو مملکت میں کبھی امن و امان قائم نہ رہتا، اور اعراب جو اپنی سرکشی میں مشہور تھے، کبھی آپ کی اطاعت اور اسلامی حکومت کی فرمانبرداری قبول نہ کرتے۔ ایک شخص کے قول کے مطابق اگر حضرت عمرؓ نہ ہوتے تو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت قائم رہنی بھی مشکل تھی۔[3]

---

[1] آپ کا نسب یہ ہے:

عمرؓ بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزّٰی بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب۔

آپ قریش کی شاخ بنی عدی میں سے تھے۔ والدہ کا نام حنتمہ تھا، جو ہاشم ابن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم کی بیٹی تھیں۔

[2] الاستیعاب لابن عبدالبر (مطبوعہ ہندوستان)

امین سعید نے اپنی کتاب "نشاۃ الدولۃ الاسلامیہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے انتالیس مردوں اور ایک عورت نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ امر واقعات کے صریحاً خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کے خاندان کی عورتیں جن میں آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ اور آپ کی صاحبزادیاں تھیں، شروع میں ہی ایمان لاچکی تھیں۔ اس کے علاوہ خود حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بھی حضرت عمرؓ سے پہلے اسلام لاچکی تھیں۔ تعجب ہے کہ گو مؤلف کتاب مذکور نے فاطمہؓ کے اسلام کا ذکر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے پہلے صرف ایک عورت رسول اللہ صلعم پر ایمان لائی تھی۔

[3] شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید

(۲)

ایران میں خلفشار اور عراق پر حملوں کی ابتداء

ہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان عربی لشکروں کا حال بیان کیا تھا جنھوں نے مہیب صحراؤں کو قطع کر کے فارس اور روم کی سرحدوں پر جا کر دم لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسباب بھی بیان کیے تھے جنھوں نے مسلمانوں کی فتوحات میں مدد دی تھی۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ عہدِ صدیقی کی فتوحات ابتدائی فتوحات تھیں۔ فتوحات کا پورا زور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں بعض ان باتوں کو جنھیں ہم نے حضرت ابوبکرؓ کے حالات میں اجمالاً بیان کیا تھا قدرے تفصیل سے بیان کریں۔ ان میں سب سے اہم وہ واقعات ہیں جو اس زمانہ میں سلطنتِ ایران کے دار الحکومت مدائن میں پیش آرہے تھے۔ ان واقعات کو پڑھ کر ایران کے اندرونی حالات کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات سے ہی ایران اپنے اندرونی مناقشات میں گرفتار تھا۔ سب سے پہلے شہنشاہِ ایران کسریٰ پرویز، اس کے بیٹوں اور مملکت کے سربرآوردہ سرداروں کے درمیان اختلافات رونما ہوئے اور ان کی وجہ سے ایران میں ایک خلفشار برپا ہو گیا۔

ان مناقشات کی ابتداً اس طرح ہوئی کہ ولی عہد مملکتِ ایران "شیرویہ" کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا والد اس کی بجائے اپنی دوسری بیوی شیریں کے لڑکے کو ولی عہد مقرر کر رہا ہے، اس پر اس نے اپنے والد کے خلاف سازش شروع کر دی شیریں ایک رومی عیسائی لونڈی تھی جس سے کسریٰ پرویز نے شادی کر لی تھی اور وہ بادشاہ کے دل پر اتنی قابض ہو گئی تھی کہ وہ اس کے کسی مطالبہ کو رد نہیں کر سکتا تھا۔

حقیقی ولی عہد کو معزول کرنا ایران کی شہنشاہیت میں کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں موجود تھیں اور بیشتر شاہانِ کسریٰ جائز وارث سلطنت کی بجائے کسی دوسرے کو ولی عہد مقرر کر چکے تھے۔ لیکن اس موقعہ پر ایران کے سرداروں اور بارسوخ اشخاص کو جو بات سب سے زیادہ کھٹک رہی تھی وہ "شیریں" کی عیسائیت تھی۔ یہ بہت مشکل تھا کہ وہ ان جنگوں کو بھول جاتے جو عرصہ دراز سے ایران اور روم کی عیسائی سلطنت کے درمیان ہوتی چلی آرہی تھیں اور جن میں بے شمار ایرانی کام آچکے تھے۔

بوڑھے بادشاہ کسریٰ پرویز کے گزشتہ کارنامے جو ایرانی قوم کی سربلندی کی خاطر اس نے سرانجام دئے تھے۔ اور وہ فتوحات جو اس نے اپنے دشمنوں پر حاصل کی تھیں ایسی نہ تھیں کہ ان کو آسانی سے بھلایا جا سکتا۔ لیکن ایرانی سرداروں نے کسی بات کا لحاظ نہ کیا اور اس موقعہ پر ولی عہد کو بادشاہ کے خلاف بھڑکایا۔ چنانچہ اس نے درباریوں اور

امرائی مدد سے اپنے بوڑھے باپ کو تخت سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا اور آپ تختِ ایران پر متمکن ہوگیا۔ زمامِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد پہلے اس نے شیریں کے لڑکے اور اپنے دوسرے سوتیلے بھائیوں کو باپ کے سامنے قتل کرا دیا اور اس کے چند روز بعد اپنے باپ کے قتل کا حکم بھی دے دیا۔

قباذ ثانی (شیرویہ) نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے تمام بھائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خوف سے کہ وہ کہیں اس کے خلاف بغاوت برپا نہ کردیں۔ لیکن اس کو اپنے ظلم کا بدلہ جلد ہی مل گیا اور وہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ ۶۲۸ء میں اس نے تخت پر قبضہ کیا تھا۔ آٹھ ماہ بعد اس کا بھی وقت آن پہنچا۔

شیرویہ کے بعد اس کا بیٹا اردشیر تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن چونکہ اس کی عمر صرف ایک سال کی تھی اس لیے امرائے ملک نے ایک اور شخص کو عارضی طور پر تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت ایرانی فوجوں کا سپہ سالار شہر براز تھا جو بیزنطینی حکومت سے جنگ آزما ہو چکا تھا لیکن اب اس نے رومیوں سے گٹھ جوڑ کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسے تختِ ایران پر قبضہ کرنے میں مدد دیں گے۔ چنانچہ رومیوں کی اس یقین دہانی کے بعد وہ اپنے لشکر کے ہمراہ دارالحکومت کی طرف بڑھا اور بغیر کسی مقابلہ کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کمسن بادشاہ اور نائب السلطنت کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن اس کی بادشاہت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ خود اس کے لشکر نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اسے ٹھکانے لگا دیا۔

اس کے بعد ایران کی سیاسی حالت بہت ابتر ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت پر آئے۔ سب سے پہلے کسریٰ پرویز کی بیٹی بوران دخت کے سر پر تاج رکھا گیا۔ اس نے ایک سال چار ماہ حکومت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری زندگی میں یہی ملکہ ایران پر حکمران تھی۔ اس کے بعد کسریٰ پرویز کا چچازاد بھائی جوان شیر تخت پر بیٹھا لیکن اسے صرف ایک ماہ حکومت کرنے کی مہلت ملی۔ اب کسریٰ پرویز کی دوسری بیٹی "آزرمی دخت" تخت نشین کی گئی لیکن کچھ مدت کے بعد اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک شخص کسریٰ بن مہر جو اردشیر بابکان' کے خاندان سے تھا، تخت پر بیٹھا۔ لیکن اسے بھی چند روز سے زیادہ حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی۔ ایرانی اُمرا نے جب یہ حالت دیکھی اور دوسری طرف انھیں اسلامی افواج ایرانی شہروں پر پے در پے کامیاب حملے کرتی نظر آئیں تو ان کے اضطراب کی کوئی حد نہ رہی اور انھوں نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد شاہی خاندان کے ایک فرد یزدجرد ثالث بن شہریار کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ لیکن ایرانی اقتدار کا وقت آ لگا تھا۔ اسی یزدجرد کے عہد میں صحرائے عرب سے وہ زبردست آندھی اٹھی جس نے آن کی آن میں تمام ایوان ہائے کسریٰ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور ایرانی سلطنت ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی۔

سیرتِ صدیقِ اکبرؓ میں بیان ہو چکا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو شام جانے کا حکم دیا تھا تو حضرت خالدؓ آدھی فوج خود لے کر شام روانہ ہو گئے اور آدھی فوج مثنیٰؓ بن حارثہ کے پاس ہی چھوڑ دی تھی جو اس وقت عراق میں ایرانی فوجوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ مثنیٰ بڑے بہادر اور بڑے زیرک سپہ سالار تھے۔

آپ ہی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی توجہ عراق اور ایران پر حملہ کرنے کی طرف دلائی تھی اور بعد کو پیش آنے والی جنگوں میں صدقِ بصیرت، جرأت اور بہادری کی ایسی مثالیں دکھائی تھیں جن کی وجہ سے وہ لشکر میں بیحد مقبول ہو گئے تھے اور انھیں اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ دشمن سے جنگ کی صورت میں وہ کبھی نقصان نہیں اٹھا سکتے۔

ادھر یہ حال تھا کہ حضرت خالدؓ کے چلے جانے سے اسلامی لشکر میں معتد بہ کمی واقع ہو گئی تھی لیکن ایرانی لشکر پورے ساز و سامان اور پوری طاقت و قوت کے ساتھ موجود تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے چلے جانے کے بعد دربار ایران کی طرف سے ایک بہت بڑی فوج حیرہ کی طرف بھیجی گئی جہاں مثنیٰ بن حارثہ مقیم تھے۔ اس فوج کا سردار ہرمز تھا۔ "بابل" کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مثنیٰ نے مدائن تک ایرانیوں کا پیچھا کیا اور پھر حیرہ واپس آگئے۔ اس کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ ایرانی ایک اور لشکرِ جرار مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں انھیں یہ بھی پتا چلا کہ ایرانی اپنے اندرونی جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً مدینہ پہنچے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس وقت بستر علالت پر تھے۔ مثنیٰ نے انھیں سارے حالات سناتے اور مزید فوج بھیجنے کی درخواست کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو بلا بھیجا اور جب وہ آئے تو ان سے فرمایا:

"مجھے یقین نہیں کہ میں آج شام تک زندہ رہ سکوں۔ میرے مرنے کے بعد تم کل کا دن ختم ہونے سے پہلے مثنیٰ کے ساتھ لوگوں کو لڑائی پر روانہ کر دینا۔ تم کو کوئی مصیبت تمھارے دینی کام اور حکمِ الٰہی سے غافل کرنے نہ پائے۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا کیا تھا، حالانکہ مسلمان اس وقت ایک بہت بڑے ابتلا میں تھے۔ جب اہلِ شام پر فتح حاصل ہو جائے تو اہلِ عراق کو عراق واپس بھیج دینا کیونکہ وہ عراق ہی کے کاموں کو خوب سرانجام دے سکتے ہیں اور عراق ہی میں ان کا دل خوب کھلا ہوا ہے۔"

اس وصیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حالتِ نزع میں بھی مسلمانوں کی بہبود کا خیال رہا اور مرتے وقت بھی آپ دینی امور پر ہی غور کرتے رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وصیت کے مطابق حضرت عمرؓ اگلے روز نمازِ فجر سے پہلے ہی منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو عراق جانے اور جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ آپ نے فرمایا:

"اس سرزمین میں پہنچو جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں تم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمھیں اس کا وارث بنا دے گا۔ چنانچہ اس نے فرمایا ہے:

لیظہرہ علی الدین کلہ۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

وہ اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کرنے والا ہے، اسے عزت دینے والا ہے، اور اس کی

مدد کرنے والا ہے۔ رُوئے زمین کی وراثت مسلمانوں ہی کی ہے، کہاں ہیں خدا تعالیٰ کے نیک بندے؟"

حضرت عمرؓ کی تقریر کے بعد عراقی لشکر کے سپہ سالار مثنیٰ کھڑے ہُوئے اور آپ نے اپنی تقریر میں ان تمام خدشات کو رفع کیا جو مسلمانوں کے دلوں میں ایرانی سلطنت اور ایرانی حکومت کے متعلق جمے ہوئے تھے۔

آپ نے کہا:

"لوگو! تم ایرانیوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ ہم نے ان کو آزما لیا ہے اور ان کے اوپر غالب رہے ہیں۔ ہم نے ان کے زرخیز علاقے ان کے ہاتھوں سے چھین لیے ہیں اور وہ ہم سے دب گئے ہیں۔"

اس دعوت کے جواب میں عراق جا کر جہاد کرنے کے لیے سب سے پہلے جس شخص نے اپنے آپ کو پیش کیا وہ ابوعبید بن مسعود الثقفی تھے۔ آپ کے بعد اور بھی بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن چونکہ پہل ابوعبید بن مسعود الثقفی نے کی تھی اس لیے حضرت عمرؓ نے انھیں فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اور مثنیٰ بن حارثہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً عراق پہنچیں اور ابوعبید ثقفی کا انتظار کریں۔ جب ابوعبید کا لشکر مدینہ سے روانہ ہونے لگا تو حضرت عمرؓ نے انھیں نصیحت کی کہ ہر معاملہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے رہیں۔ ابوعبید پانچ ہزار مسلمانوں کا لشکر لے کر مدینہ سے حیرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستہ میں آپ جن جن مقامات سے گزرتے تھے وہاں کے لوگوں کو ایرانیوں سے لڑنے پر آمادہ کرتے تھے۔ اس طرح راستہ میں سے بھی سیکڑوں لوگ آپ کے ساتھ ہو گئے۔

ایرانیوں نے اپنے باہمی جھگڑوں کو ختم کر کے یزدجرد کو بادشاہ تو بنا لیا تھا لیکن انھیں ذہنی سکون کسی دم میسر نہ تھا۔ کیونکہ انھیں روزمرہ یہ خبریں مل رہی تھیں کہ آج مسلمانوں نے فلاں شہر پر قبضہ کر لیا، آج مسلمانوں نے فلاں علاقہ کی طرف کُوچ کر دیا، آج فلاں ایرانی سردار نے مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست کھائی اور آج فلاں ایرانی فوج مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بادشاہ بھی ان واقعات سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی کہ عربوں سے مقابلہ کے لیے کوئی ایسا سپہ سالار منتخب کیا جائے جو ان کے بڑھتے ہوئے قدم روک لے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس کی نظر رستم پر جا کر ٹکی جس کا شمار لشکرِ ایران کے مشہور سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ یزدجرد نے جتنی فوج اکٹھی ہو سکتی تھی کی اور رستم کو اس کا سپہ سالار بنا دیا[1]۔ اس نے رستم کو بطور خاص ہدایت کی کہ جو قدم اٹھائے، احتیاط سے اٹھائے، جلدی ہرگز نہ کرے اور لڑائی یا درمیانی وقفہ میں اپنی فوج کو لطف و مراعات سے نوازتا رہے۔

رستم نے چاہا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مکر و فریب اور دھوکہ سے کام لے۔ چنانچہ اس نے عراق کے

---

[1] "محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ" کے مولف خضری مرحوم اور "اشہر مشاہیر الاسلام" کے مولف امین سعید نے اپنی کتابوں میں غلطی سے یہ لکھا ہے کہ رستم کو ایرانی افواج کا سپہ سالار ملکہ "ازرمی دخت" نے بنایا تھا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ رستم کو ملکہ ازرمی دخت نے نہیں بلکہ خود شاہ یزدجرد نے سپہ سالار مقرر کیا تھا۔

دہاقین[1] اور ان لوگوں کو جن کے شہروں پر مسلمانوں نے حملہ کیا تھا، مسلمانوں کے خلاف فتنہ و فساد اور بغاوت و سرکشی پر اُبھار کر اس طرح نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی پیش قدمی روک دی جائے بلکہ انھیں جزیرۂ عرب کی طرف دھکیل دیا جائے۔ یہ لوگ ایرانیوں سے مرعوب تھے اور انھیں یقین تھا کہ ایرانی دیر یا سویر اپنے علاقے عربوں سے واپس لے کر چھوڑیں گے اور اعراب کو ایک نہ ایک دن لامحالہ جزیرۂ عرب ہی میں پناہ لینی پڑے گی۔

دوسرا کام رستم نے یہ کیا کہ نرسی اور جابان کی سرکردگی میں دو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ نرسی کسریٰ کا خالہ زاد بھائی اور عراق کا ایک جاگیردار تھا، جابان بھی عراق کا ایک رئیس تھا۔ یہ دونوں افسر مختلف راستوں سے عراق کی جانب بڑھے۔ جابان اپنی فوجیں لے کر نمارق[2] پہنچا اور نرسی نے "کسکر" میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ادھر مثنیٰ اور ابو عبید حیرہ تک پہنچ چکے تھے۔ ابوعبید نے ایرانیوں پر حملہ کے لیے اپنی قوتوں کو جمع کیا اور جابان سے مقابلہ کرنے نمارق پہنچے۔ دونوں فوجیں نبرد آزما ہوئیں۔ ایرانیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ابوعبید کی فوجوں کے سامنے کوئی پیش نہ جا سکی اور ان کو میدان چھوڑنا پڑا۔

نمارق کی فتح کے بعد ابوعبید "کسکر" کی طرف روانہ ہوئے جہاں نرسی اپنی فوج لیے پڑا تھا۔ جابان کی فوج کے شکست خوردہ سپاہی بھی بھاگ کر نرسی کی فوج میں شامل ہو گئے۔ مقام سقاطیہ میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور نمارق کی طرح یہاں بھی ایرانیوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ لیکن ایران کی یہ دونوں فوجیں اس لشکر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھتی تھیں جو رستم کی سرکردگی میں عراق کی طرف آرہا تھا۔

جب رستم کو جابان اور نرسی کی شکستوں کا پتا چلا تو اس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے ایک ایرانی سردار بہمن جادویہ کی سرکردگی میں ایک لشکر ابوعبید کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا اور درفش کاویانی[3] اس کے ساتھ کر دیا جو فوج کے سر پر سایہ کیے رہتا تھا۔

دونوں لشکر مشرقی فرات کے کنارے ایک مقام مروحہ پر صف آرا ہوئے۔ دریا کے اس طرف مسلمان تھے اور دوسری طرف بہمن جادویہ کا ایرانی لشکر، دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے بہمن نے پچھوایا کہ تم ہماری طرف آؤ گے یا ہم تمھاری طرف آئیں۔ ابوعبید پہلی فتوحات کے نشہ میں سرشار تھے۔ انھوں نے کہلوا بھیجا کہ ہم خود ہی تمھاری طرف آتے ہیں حالانکہ یہ ان کی سخت غلطی تھی۔ لشکر کے دوسرے سرداروں نے انھیں سمجھایا بھی لیکن ابو عبید

---

[1] دیہاتی زمیندار اور تعلقہ دار وغیرہ۔

[2] نمارق کوفہ کے قریب ایک موضع ہے اور حیرہ سے دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

[3] درفش کاویانی ایران کا قدیم قومی جھنڈا تھا جو کئی ہزار سال سے کیانی خاندان کی یادگار چلا آتا تھا۔ اسے فتح و ظفر کی کلید سمجھا جاتا تھا اور خاص خاص موقعوں پر تبرک کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ (مترجم)

اپنی فوج کو لے کر ایرانیوں کا مقابلہ کرنے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔

دریا کے اس طرف میدان ناہموار تھا جس کی وجہ سے مسلمان فوج کو ترتیب سے کھڑے ہونے میں بڑی دشواری پیش آتی۔ علاوہ ازیں ایرانی فوج کے پاس کئی دیوپیکر ہاتھی تھے جن کے گلوں میں بڑی بڑی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اور زور زور سے بج رہی تھیں۔ ان پر بڑی بڑی جھولیں پڑی تھیں جن سے ان کی شکلیں اور بھی خوفناک ہو گئی تھیں۔ عربی گھوڑے ان دیوپیکر ہاتھیوں کو دیکھ کر بھڑک اُٹھے اور پیچھے ہٹے۔ ابوعبید نے جب یہ دیکھا تو وہ خود بھی گھوڑے سے اُتر آئے اور دوسرے گھڑ سواروں کو بھی یہی حکم دیا اور ہدایت کی کہ ہاتھیوں پر جھولیں پڑی ہیں انھیں کھینچ کر فیل بانوں کو نیچے گرا لیں اور قتل کر ڈالیں۔ اس طرح سیکڑوں فیل سوار قتل کر دیے۔ لیکن دُوسری طرف خود ہاتھی مسلمانوں پر پل پڑے تھے اور ان سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مسلمانوں نے ہاتھیوں پر تلواروں سے حملہ شروع کر دیا۔ خود ابوعبید نے "پیلِ سپید" پر حملہ کیا اور اس کی سُونڈ کاٹ ڈالی۔ "پیلِ سپید" ایک مست ہاتھی تھا اور تمام ہاتھیوں کا سردار۔ وہ درد سے بیتاب ہو کر آگے بڑھا۔ اور ابوعبید کو گرا کر ان کے سینہ پر پاؤں رکھ دیا جس سے ان کی پسلیاں چُور چُور ہو گئیں۔

اِدھر ایرانیوں نے مسلمانوں پر ہلّہ بول دیا اور اسلامی فوج پیچھے ہٹنے لگی۔ بنی ثقیف کے ایک نوجوان عبداللہؓ بن مرثد ثقفی نے ازراہِ غیرت دریا کا پُل توڑ دیا کہ جب مسلمان اپنے لیے کوئی راہِ فرار نہ پائیں گے تو بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کریں گے اور ایرانی فوج کو پیچھے دھکیل دیں گے لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مسلمان جب پسپا ہوتے ہوئے دریا پر پہنچے تو پُل موجود نہیں تھا۔ وہ سالارِ لشکر کے مارے جانے اور ایرانی حملہ کی شدت سے پہلے ہی بدحواس ہو رہے تھے اسی بدحواسی کے عالم میں دریا میں کُودنے لگے اور اس طرح چار ہزار مسلمان پانی میں ڈوب گئے۔

مثنیٰ بن حارثہ نے جب یہ حالت دیکھی تو دوبارہ پُل بندھوانے کا حکم دیا اور خود مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایرانیوں کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے اور پُل تیار ہو جانے پر ساری فوج کو پار اُتارا اور سب سے آخر میں خود پہنچے۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ نو ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار فوج باقی رہ گئی ہے۔

یہ لڑائی تاریخ میں "واقعۂ جسر" کے نام سے مشہور ہے اور رمضان المبارک سنہ ۱۳ھ میں ہفتہ کے دن پیش آئی۔

بعض مورخینِ عرب نے ابوعبید کے اس ناعاقبت اندیشانہ فعل کی مختلف توجیہات کی ہیں، لیکن بعض نے اقرار کیا ہے کہ واقعی اُنھوں نے دریا کو عبور کرنے میں سخت غلطی کی۔ خصوصاً جبکہ مثنیٰ بن حارثہ اور دیگر سردارانِ فوج نے ان کے اس ارادہ کی مخالفت کی تھی اور انھیں ایرانیوں کے حیلہ و مکر اور چھل فریب سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

باقی رہا یہ امر کہ حضرت عمرؓ نے یہ جاننے کے باوجود کہ ابُوعبید ایک اچھے سپہ سالار نہیں ہیں، انھیں کیوں اس اہم عہدے پر مقرر کر دیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابوعبید ہی وہ شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے خلیفہ کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کی جرأت اور اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں یہ عہدہ تفویض کر دیا۔ اگرچہ یہ بات بھی ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو سب سے پہلے لڑائی کے لیے پیش کرے اس کا زیرک سپہ سالار

اور نادر جنگ جُو ہونا ضروری نہیں ہے۔

واقعہ جسر مسلمانوں کی کھلی شکست اور ایرانیوں کی کھلی فتح تھی لیکن یہ ایرانیوں کی آخری فتح تھی۔ اس کے بعد پھر انھیں فتح و کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ مثنیٰ نے دربارِ خلافت سے مدد مانگی اور وہاں سے فوراً فوجیں روانہ کی گئیں۔ اِدھر مثنیٰ نے بھی عراق کے سرحدی مقامات میں اپنے نقیب بھیج کر ایک بڑی فوج جمع کر لی تھی۔ جب مدینہ سے فوجیں پہنچ گئیں تو مثنیٰ اس ایرانی لشکر کو روکنے کے لیے جو مہران کی سرکردگی میں حیرہ پر حملہ کرنے کی غرض سے آ رہا تھا، بویبؔ کی طرف روانہ ہوئے۔

اس موقعہ پر مثنیٰ نے اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا جو ابوعبید نے دریا کو عبور کر کے کی تھی بلکہ اُنھوں نے ایرانیوں کو دریا کے اِس پار آنے دیا۔ ایرانی دریا کو عبور کر کے مسلمانوں کے مقابل صف آرا ہو گئے۔

لڑائی شروع ہُوئی۔ ایرانی اور مسلمان دونوں بڑی بہادری سے لڑے لیکن اس مرتبہ ایرانی مسلمانوں کے مقابل نہ ٹھہر سکے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مثنیٰ نے آگے بڑھ کر دریا کا پُل توڑ دیا۔ ایرانیوں نے پُل ٹوٹا ہوا دیکھا تو مجبوراً پلٹے اور پشت پھیر کر دُوسری طرف بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور دُور تک ان کو قتل کرتے چلے گئے۔ قبیلہ تغلب کے ایک شخص نے ایرانی فوج کے سردار مہران کو قتل کر ڈالا اور اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر پکارا:

"میں ہُوں تغلب کا وہ نوجوان جس نے عجم کے سالار کو قتل کیا ہے۔"

فتح کے بعد مثنیٰ نے فوج کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایرانی فوج کو روکنے کے لیے میں نے جو پُل کاٹ دیا تھا جنگی نقطۂ نگاہ سے یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔ گو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نصرت سے ہمیں فتح عطا فرما دی لیکن دشمن کا راستہ اس وقت تک کبھی نہ روکنا چاہیے جب تک اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وافر تعداد میں فوج موجود نہ ہو۔

(۳)

عراق پر عام لشکر کشی

جب ایرانیوں نے یہ دیکھا کہ عرب مسلسل ان کے شہروں پر حملہ کر کے انھیں فتح کرتے چلے جا رہے ہیں تو انھوں نے اپنی پُوری طاقت کے ساتھ عربوں کا مقابلہ کرنے کا تہیّہ کیا۔ مثنیٰ کو یہ معلوم ہُوا تو اُنھوں نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا جس میں ایرانیوں کے تمام ارادوں کی تفصیل بیان کر کے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اس موقعہ پر سوادِ عراق کے زمیندار

لہ بویب، کوفہ کے قریب ایک نہر ہے جو دریائے فرات سے نکلتی ہے۔

سے نقضِ عہد کا زبردست خطرہ ہے۔ ان میں بغاوت اور سرکشی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ساتھ ہی مدد کی درخواست بھی کی۔

حضرت عمرؓ نے اس خط کے پہنچنے پر مثنیٰ کو لکھا کہ اپنے تمام لشکر کو سمیٹ کر بصرہ سے متصل عراق اور عرب کی سرحد کی طرف چلے آؤ۔ امیر المومنین کی اس سے غرض یہ تھی کہ اسلامی لشکر جزیرۂ عرب سے اس قدر قریب رہے کہ اگر اس پر کوئی حملہ ہو اور اس میں تابِ مقاومت باقی نہ رہے تو وہ جزیرۂ عرب اور اس کے صحراؤں میں داخل ہو کر اپنا بچاؤ کر سکے اور دشمن کو اپنے اوپر قابو نہ پانے دے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے بڑے پیمانہ پر تیاریاں شروع کر دیں اور تمام عمّالِ سلطنت کو لکھا کہ جہاں جہاں کوئی بہادر، رئیس، صاحبِ تدبیر، شاعر، خطیب، اہل الرائے اور ایسا شخص ہو جس کے پاس ہتھیار اور سواری ہو اسے جلد سے جلد میرے پاس بھیج دو۔ یہ ذی الحجہ ۱۳ھ کا واقعہ ہے، حضرت عمرؓ یہ احکام دے کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ ابھی آپ حج سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ہر طرف سے لشکر پہنچنے لگے۔ جو قبائل مدینہ کے قریب تھے وہ مدینہ میں جمع ہونے لگے اور جو عراق کے قریب تھے وہ مثنیٰ کے لشکر میں پہنچنے لگے۔

جب محرم کا مہینہ آیا تو سارے مدینہ طیبہ میں فوجیں ہی فوجیں تھیں۔ در اطراف میں بھی جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے لشکر ترتیب دیا ہراول پر طلحہؓ، میمنہ پر زبیرؓ اور میسرہ پر عبد الرحمٰنؓ بن عوف کو مقرر کیا اور خلافت کے جملہ امور حضرت علیؓ کے سپرد کر کے خود اس فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ پہلا پڑاؤ "صرار" پر ہوا جو مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک چشمہ ہے۔ ابھی تک کسی کو ٹھیک طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ آیا حضرت عمرؓ بنفسِ نفیس فوج کے ساتھ عراق تشریف لے جائیں گے یا اپنی بجائے کسی اور آدمی کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے خود واپس مدینہ چلے جائیں گے۔ صرار پہنچ کر حضرت عمرؓ نے تمام فوج سے اس بارے میں رائے لی۔ خود حضرت عمرؓ کی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقعہ پر دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے تشریف لے جائیں۔ لشکر کے عام لوگ بھی یہی چاہتے تھے لیکن کبار صحابہ کی یہ رائے تھی کہ حضرت عمرؓ کا جانا ٹھیک نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ مدینہ طیبہ ہی میں رہیں اور یہاں سے برابر فوجیں اور سامانِ جنگ محاذ پر بھیجتے رہیں۔ جہاد پر جانے سے یہ چیز آپ کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

حضرت عمرؓ نے بھی غور و خوض کے بعد اسی رائے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ صحابہ کرامؓ نے اس موقعہ پر جو مشورہ دیا وہ اصابتِ رائے کی بہترین مثال تھا۔ اگر حضرت عمرؓ لڑائی کے لیے تشریف لے جاتے اور خدانخواستہ آپ کو کوئی صدمہ پہنچ جاتا تو تمام معاملہ دگرگوں اور اسلام کے اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا۔ اب حضرت عمرؓ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کون شخص اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے مقرر کیا جائے۔ لشکر میں جتنے لوگ موجود تھے ان میں سے کسی کے متعلق حضرت عمرؓ کو یہ اطمینان نہ تھا کہ وہ اس عظیم ذمہ داری سے پورے طور پر عہدہ برآ ہو سکے گا۔ آپ نے اضلاع اور صوبوں کے عمّال پر نظر ڈالنی شروع کی۔ آخر کبار صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جو ایک جلیل القدر صحابی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے، لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا۔ سعدؓ بن ابی وقاص ان دنوں بنی ہوازن میں صدقات کی وصولی پر مامور تھے، حضرت

عمرؓ نے انھیں طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ بہ عجلت ممکنہ عراق پہنچیں اور راستہ میں قبائل کو اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دیں۔ چنانچہ سعدؓ لشکر کو لے کر روانہ ہوئے۔ راستہ میں جس قبیلہ کے پاس سے گزرتے، اسے اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد پر چلنے کی دعوت دیتے، اس طرح آپ کے ساتھ ایک زبردست لشکر ہو گیا۔ ابھی سعدؓ راستہ میں ہی تھے کہ مثنیٰ بن حارثہ کی وفات کی خبر ملی جس میں مثنیٰ کو بعض زخم آئے تھے جو بگڑتے چلے گئے اور آپ جانبر نہ ہو سکے۔ مثنیٰ کی وفات سے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور اسلامی لشکر کو سخت صدمہ پہنچا، کیونکہ ان کی موت سے اسلامی لشکر ایک بہادر سپہ سالار سے محروم ہو گیا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مثنیٰ ہی تھے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایرانیوں سے جنگ شروع کرنے کا باعث بنے تھے۔ تدبر اور تجربہ کے ساتھ وہ فنونِ جنگ کے پوری طرح ماہر تھے فوج سے اپنے احکام منوانے انھیں خاص ملکہ تھا۔ جس کام کا ایک بار ارادہ کر لیتے تھے پھر اس کو پورا کر کے ہی چھوڑتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ہر میدان میں انھیں دشمنوں پر فتح دی۔ جنگوں میں وہ ہمیشہ خالدؓ بن ولید کے طریقوں کی پیروی کرتے تھے اور ان ہی کی طرح میدانِ جنگ میں فوجوں کو ترتیب دیتے تھے۔

جب مثنیٰ نے دیکھا کہ ان کی موت قریب ہے تو سعدؓ کو ایک خط لکھا جس میں عجمیوں کے تمام طور طریقے بیان کیے۔ پچھلے تمام واقعات اور اپنے تمام تجربات سے انھیں آگاہ کیا اور آخر میں لکھا کہ وہ ایرانیوں سے عرب اور عراق کی سرحد پر جنگ کریں۔ اگر خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی تو ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھلا ہوا ہے لیکن اگر خدانخواستہ شکست کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو وہ آسانی کے ساتھ اپنے علاقہ میں واپس آ سکتے ہیں اور وہاں سے مدد لے کر پھر ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے نکل سکتے ہیں۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت عرب فنونِ جنگ کے ماہر نہ تھے۔ ان میں ابھی یہ فن ابتدائی حالت میں تھا۔ اسی لیے ابوعبید الثقفی واقعۂ جسر میں صحیح حالات کا اندازہ نہ لگا سکے اور مسلمانوں کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ انتہائی سوجھ بوجھ کے مالک تھے، آپ ابوعبید کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن ابوعبید نے چونکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو جہاد پر جانے کے لیے پیش کیا تھا، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کی ہمت افزائی اور عام ترغیب و تشویق کی خاطر انھیں فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جب وہ عراق روانہ ہونے لگے تو ان کو نصیحت فرمائی :

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی باتوں کو ہمیشہ غور سے سننا، انھیں اپنے مشوروں میں برابر شریک رکھنا۔ جلد بازی سے کبھی کام نہ لینا اور جو قدم اٹھانا پورے غور و خوض اور معاملہ کا ہر پہلو دیکھ کر اٹھانا۔
> یاد رکھو تم لڑائی پر جا رہے ہو اور لڑائی میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو دانشمندی سے ہر کام کا پہلے خوب اچھی طرح جائزہ لے لیتا ہے اور جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔"

لیکن چونکہ ابوعبید کو فوجی امور کا پہلے کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے انھوں نے حزم و احتیاط اور جنگی چالوں سے کام

نہ لیا۔ اُنھوں نے حضرت عمرؓ کی اس نصیحت کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کر دیا کہ ہر معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے رہنا کیونکہ وہ صاحب تجربہ ہیں اور تمام معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

ابوعبید کی شکست اور اس میں مسلمانوں کے کثیر جانی نقصان سے حضرت عمرؓ کو بیحد رنج ہوا تھا۔ آپ ایک ایک مسلمان کی جان کو قیمتی سمجھتے تھے۔ جنگ میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی آپ کو کسی صورت گوارا نہ تھی۔ چنانچہ اس مرتبہ آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو سپہ سالار بنا کر بھیج تو دیا لیکن لشکر کی تمام مہمات خود اپنے قبضۂ اختیار میں رکھیں۔ آپ مدینہ سے برابر جنگی ہدایات بھیجتے رہتے تھے اور اس طرح آپ نے محاذِ جنگ سے سیکڑوں میل دُور ہوتے ہوئے بھی درحقیقت لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ آپ کی طرف سے سعدؓ کو بطورِ خود آگے بڑھنے اور حملہ کرنے کی اس وقت تک ممانعت کر دی گئی تھی جب تک دربارِ خلافت سے ان کے پاس کوئی حکم نہ پہنچے۔

جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص لشکر کو لے کر عراق روانہ ہونے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُنھیں بلایا اور فرمایا:

"میں نے تمھیں عراق میں لڑنے والی فوجوں کا سالار بنایا ہے اس لیے میری یہ نصیحت یاد رکھو کہ تم ایسے کام کے لیے جا رہے ہو جو بہت سخت اور تکلیف دہ ہے۔ اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو حق و راستی پر ہو۔ اس بنا پر لازم ہے کہ تم خود بھی بھلائی کی عادت ڈالو اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی تلقین کرو تاکہ فتح تمھارے قدم چُومے۔ اگر کوئی تکلیف تمھیں پیش آئے تو اس پر صبر اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔"

اس کے علاوہ آپ نے انھیں فخر و مباہات سے پرہیز کرنے اور اپنے ساتھیوں پر کسی قسم کی بڑائی جتانے سے منع فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ سب سے پہلے "زرود"[1] پہنچیں۔ اور جب وہاں چاروں طرف سے فوجیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر حملہ کے لیے آگے بڑھیں۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص پہلے "زرود" پہنچے اس کے بعد خلیفہ کے احکام کے مطابق کوچ کر کے "شراف" میں پڑاؤ ڈال دیا اور وہاں اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے لگے۔ "شراف" میں حضرت سعدؓ کے پاس تیس ہزار فوج جمع ہو گئی۔ یہاں سعدؓ کے پاس حضرت عمرؓ کا ایک اور فرمان آیا جس میں آپ نے انھیں ہدایت کی کہ تمام فوج کو دس دس سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے۔ ہر دس آدمیوں پر ایک امیر ہو جسے عریف کے نام سے پکارا جائے۔ اس کے بعد اسی ترتیب کی بنیاد پر لشکر کو مختلف دستوں میں تقسیم کر دیا جاتے اور ان دستوں کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ان کے سردار مقرر کر دیے جائیں چنانچہ لشکر کے مندرجہ ذیل حصے کر کے ان پر مندرجہ ذیل افسر مقرر کیے گئے:

---

[1] زرود مدینہ اور کوفہ کے درمیانی راستہ میں کوفہ سے اکتیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۱۔ ہراول : زہرہ بن عبداللہ بن قتادہ
۲۔ میمنہ (دایاں حصہ) : عبداللہ بن المعتصم
۳۔ میسرہ (بایاں حصہ) : شرجیل بن السمط
۴۔ ساقہ (پچھلا حصہ) : عاصم بن عمرو التمیمی
۵۔ طلائع (گشت کی فوج) : سواد بن مالک
۶۔ مجرد (بے قاعدہ فوج) : سلمان بن ربیعۃ الباہلی
۷۔ پیدل : حمال بن مالک الاسدی
۸۔ شتر سوار : عبداللہ بن ذی السہمین
۹۔ رائد (رسد وغیرہ کا بندوبست کرنے والے) : سلمان فارسی

اس کے علاوہ قاضی عبدالرحمٰن بن ربیعۃ الباہلی کو کاتب زیاد ابی سفیان کو اور مترجم ہلال ہجری کو بنایا گیا۔ اس لشکر کے لیے حضرت عمرؓ نے کئی طبیب بھی بھیجے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے خط میں لکھا:

"ہدایات بالا کے مطابق لشکر کی تقسیم کے بعد جب ہر سپاہی اپنے عریف، ہر عریف اپنے قائد اور ہر دستہ اپنے سردار سے اچھی طرح واقف ہو جائے تو باقاعدہ نظام کے تحت اپنے لشکر کو لے کر چلو اور قادسیہ میں جا کر پڑاؤ ڈال دو۔"

آپ نے انھیں یہ بھی لکھا کہ اسلامی لشکر اور صحرائے عرب کے درمیان دریا وغیرہ کی قسم سے کوئی روک نہ ہو۔ آپ نے تحریر فرمایا:

"تم "شراف" سے مسلمانوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ بھروسا رکھو اور اسی سے اپنے ہر کام میں مدد چاہو۔ اچھی طرح جان لو کہ تمھارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو کثرت تعداد، سامان جنگ کی فراوانی اور فنونِ جنگ میں تم سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ جب تمھاری ایرانی فوج سے مٹھ بھیڑ ہو تو ان سے جنگ شروع کر دو۔ خبردار! ان سے مناظرہ نہ کرنے لگنا، ان کے دھوکے میں نہ آجانا۔ وہ لوگ بڑے فریبی اور مکار ہوتے ہیں اور ایسے طور طریقے استعمال کرتے ہیں جو تمھارے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔

جب تم قادسیہ پہنچو تو وہاں قیام کرو اور اس طرح مورچے جماؤ کہ سامنے عجم کی زمین ہو

لے قادسیہ ایران کا دروازہ شمار کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور نہروں اور پلوں کی وجہ سے نہایت محفوظ سمجھا جاتا تھا۔

پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں اور بیچ میں ریتلا میدان ہو۔ ایک بار مورچے جما کر پھر وہاں سے مت ہٹو۔ جب ایرانی یہ دیکھیں گے تو ان پر پوری ہیبت سے تم حملہ آور ہوں گے۔ لیکن اگر تم نے دشمن کے مقابلے میں پامردی کا ثبوت دیا تو مجھے امید ہے کہ تم ان پر فتحیاب ہو گے۔ یہ ضرب انھیں ایسی کاری پڑے گی کہ اس کے بعد وہ اتنی زبردست طاقت لے کر تم پر حملہ آور نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ دوسری صورت پیش آئے تو قادسیہ کی سرزمین سے پیچھے ہٹ کر عرب کے پہاڑوں میں چلے آنا جو تمھارے لیے سپر کا کام دیں گے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ پھر تمھیں دوبارہ حملہ کرنے کی توفیق بخشے اور تم ان پر فتح پا سکو۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ برابر اسلامی لشکر اور ایرانی لشکر کے حالات و کوائف دریافت فرماتے رہے۔ جس روز سعدؓ شراف سے روانہ ہو رہے تھے اسی روز حضرت عمرؓ کا خط ان کے نام پہنچا جس میں لکھا تھا:

"مجھے لکھو کہ ایرانیوں کا لشکر کہاں تک پہنچ چکا ہے؟ تمھارے مقابلہ کے لیے ان کا سپہ سالار کون ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی لکھو کہ اسلامی فوج کی منزلیں کون کون سی ہیں اور اسلامی لشکر اور مدائن میں کتنا فاصلہ ہے؟ مدائن[1] کا حال اس طرح تحریر کرو گویا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے موقعہ جنگ کی حدود اور حالات لکھ بھیجے اور یہ بھی لکھ دیا کہ دربارِ ایران کی طرف سے رستم کو ہمارے مقابلہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ جب تک دشمن پر فتح حاصل نہ کر لی جائے وہ قادسیہ ہی میں ٹھہرے رہیں اور فتح کے بعد ایران کے دارالحکومت مدائن کی طرف بڑھیں۔

ایرانی فوج کے سپہ سالار "رستم" نے حیرہ کو اپنا مستقر بنا رکھا تھا اور حیرہ سے مدائن تک سارے راستے میں بیسیوں چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اس کے قاصد ان چوکیوں پر برابر گشت لگاتے اور لشکر کی خبروں سے شاہ یزدجرد کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ روزانہ جو واقعات پیش آتے تھے ان کی خبر بادشاہ کو مل جاتی تھی۔ سعدؓ نے بھی حضرت عمرؓ کے حکم سے یہی طریقہ اختیار کیا اور راستہ میں جابجا چوکیاں قائم کر دیں۔ اسلامی لشکر کے قاصد برابر قادسیہ اور مدینہ کے درمیان سرگرمِ عمل رہ کر حضرت عمرؓ کو تازہ ترین اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ اس طریقہ سے حضرت عمرؓ فوج کی نقل و حرکت، حملہ کے بندوبست، لشکر کی ترتیب اور فوجوں کی تقسیم کے متعلق برابر احکام بھیجتے رہتے تھے، گویا مدینہ میں بیٹھے عراق میں فوجوں کی کمان کر رہے تھے۔

---

[1] مولفِ کتاب ہذا کو غلطی لگی ہے، حضرت عمرؓ نے مدائن کا نہیں بلکہ قادسیہ کی سرزمین کا پورا نقشہ طلب فرمایا تھا۔ (مترجم)

(۴)

قادسیہ

جنگِ قادسیہ درحقیقت ایرانی سلطنت کے لیے موت کا پیغام تھی۔ سعدؓ بن ابی وقاص کے لشکر میں ستر سے زیادہ بدری صحابہؓ، تین سو سترہ بیعتِ رضوان میں شامل ہونے والے صحابہؓ اور تین سو ایسے صحابہؓ تھے جو فتح مکہ کے موقعہ پر موجود تھے ان کے علاوہ سات سو ایسے تھے جو صحابی تو نہیں تھے مگر صحابہؓ کی اولاد تھے۔

رستم ایک لاکھ بیس ہزار کی سپاہ ساتھ لے کر مدائن[1] سے نکلا اور حیرہ سے باہر "ساباط" کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ سعدؓ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ اس کے لشکر کا سارا حال معلوم ہو گیا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو ان تمام حالات کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ تم ایرانی فوج کی کثرت اور سازوسامان کی فراوانی سے قطعاً مرعوب نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور اسی پر بھروسا کرو۔ نیز شاہِ ایران کے پاس چند آدمی بھیجو جو اسے اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ دعوت قبول کرلے تو فبہا، ورنہ اس کا وبال اسی کی گردن پر رہے۔

مؤرخینِ عرب بیان کرتے ہیں[2] کہ سعدؓ نے دربارِ ایران میں بھیجنے کے لیے جن چودہ اشخاص کو منتخب کیا تھا وہ سردارانِ قبائل میں سے تھے اور خوش گفتاری، وجاہت، سیاست اور بہادری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس سفارت میں مندرجہ ذیل اشخاص شامل تھے:

۱۔ عطارد بن حاجب	۲۔ اشعث بن قیس
۳۔ حارث بن حسان	۴۔ عاصم بن عمرو
۵۔ عمرو معدی کرب	۶۔ مغیرہ بن شعبہ
۷۔ معنیٰ بن حارثہ	۸۔ نعمان بن مقرن
۹۔ بسر بن ابی رہم	۱۰۔ حملہ بن جویہ
۱۱۔ حنظلہ بن الربیع التیمی	۱۲۔ فرات بن حیان العجلی
۱۳۔ عدی بن سہیل	۱۴۔ مغیرہ بن زرارہ

---

[1] "پرشیا" مصنفہ مسٹر بنجمن ص ۲۷۴۔ اسلامی لشکر کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن مستند روایات کی رُو سے اس کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

[2] یورپین مورخین نے اس واقعہ سے قطعی طور پر انکار کیا ہے۔

مدائن میں یزدجرد شاہِ ایران کو عربی سفیروں کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے دربار کو خوب سجایا اور یہ وفد پہنچے تو انھیں دربار میں طلب کیا۔ عربی سردار جُبّے پہنے، کندھوں پر یمنی چادریں ڈالے ہاتھوں میں کوڑے لیے اور موزے چڑھا کے دربار میں داخل ہوئے۔ اُنھیں دیکھ کر درباریوں پر ایک ہیبت طاری ہو گئی، خود بادشاہ پر بھی خوف چھا گیا۔

جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو "یزدجرد" اسلامی وفد کے قائد نعمان بن مقرن سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا:

"تم اس ملک میں کیوں آئے ہو؟"

نعمان آگے بڑھا اور کہا:

"اے بادشاہ! کچھ عرصہ پہلے ہم وحشی اور جاہل تھے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل کیا اور ہماری ہدایت کے لیے ایک رسول مبعوث فرمایا جس نے ہمیں صراطِ مستقیم دکھائی، نیکی کی طرف بلایا اور بدی کے راستوں سے بچنے کی تلقین کی۔ اس نے ہمیں یقین دلایا کہ اگر ہم اس کی دعوت قبول کر لیں گے تو دنیا اور آخرت میں ضرور کامیاب اور کامران ہوں گے۔

ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم دعوت کو اپنی ہمسایہ اقوام تک پہنچائیں اور انھیں بتلائیں کہ اسلام میں تمام خوبیاں جمع ہیں۔ یہ حق کو حق اور باطل کو باطل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

اے بادشاہ! ہم آپ کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ نے اسے قبول کر لیا تو ہم آپ سے مطلق تعرض نہیں کریں گے۔ کتاب اللہ آپ کے حوالے کر دیں گے وہی آپ کی رہنما ہوگی اور اس کے احکام کی پیروی کرنا آپ کا فرض ہوگا۔ لیکن اگر آپ اسلام قبول نہیں کرتے تو پھر دو صورتیں ہیں، یا جزیہ دے کر اپنے ملک پر ہمارا اقتدار تسلیم کیجئے اور یہ وعدہ بھی کہ آپ کی سلطنت میں ظلم و تشدد کا دَور دورہ نہ ہوگا اور بُرے کام نہ کیے جائیں گے، یا پھر میدانِ جنگ میں تلوار سے فیصلہ کر لیجئے۔"

جب نعمان بن مقرن اپنی تقریر ختم کر چکے تو یزدجرد بولا:

"اے قومِ عرب! ساری دنیا میں تم سے زیادہ ذلیل اور بدبخت اور کوئی قوم نہ تھی۔ اگر ہم ایک اُونٹ ذبح کر کے بھی تم کو کھلا دیتے تو تم خوش ہو جاتے تھے اور تمھارا سارا شور و شر اور فتنہ و فساد دب جاتا تھا۔ اگر تم کبھی ہم سے سرکشی کرتے تھے تو ہم سرحد کے زمینداروں اور سرداروں کو لکھ بھیجتے تھے اور وہ تمھارا سارا کس بَل نکال دیتے تھے۔ میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ ملک گیری کی ہوس اپنے دل سے نکال دو اور آرام سے اپنے گھروں کو جاؤ۔ تمھیں خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ تم ہم پر فتح یاب ہو سکتے ہو۔

اگر دو چار مقامات پر تمھیں فتح حاصل ہوگئی ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ اور اگر ضروریاتِ زندگی نے تمھیں لوٹ مار پر مجبور کر دیا ہے تو ہمیں سارے حالات بتاؤ ہم تمھاری ضروریات کا انتظام اور تمھارے اوپر ایسا حکمران مقرر کر دیں گے جو تم سے نرم سلوک کرے گا۔"

بادشاہ کی اس تقریر سے تھوڑی دیر کے لیے سب لوگ خاموش ہو گئے۔ آخر مغیرہ بن زرارہ نے اس سکوت کو توڑا اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"میرے ساتھی رؤسائے عرب میں سے ہیں حلم اور وقار کی وجہ سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہی ان کے لیے مناسب تھا۔ لیکن بعض کہنے کے قابل باتیں رہ گئی ہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اے بادشاہ! واقعی ہم ایسے ہی ذلیل اور بدبخت تھے جیسا کہ آپ نے بیان کیا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھے۔ ہم سانپ بچھو ہر قسم کے حشرات الارض اور ہر قسم کے مردار کھا جاتے تھے۔ اون اور چمڑا ہمارا لباس تھا اور زمین کی پشت ہمارا بستر۔ ہم آپس میں کٹ مرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیتے تھے۔ ہمارا یہ حال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ملک میں ایک برگزیدہ رسولؐ پیدا کیا جو حسب ونسب اور اخلاق وعادات میں ہم سب سے ممتاز تھا۔ پہلے پہلے ہم نے اس کو جھٹلایا اور اس کی مخالفت کی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی باتوں نے ہمارے دلوں میں اثر کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار ہم نے اسے قبول کر لیا۔ اس نے آکر ہماری کایا پلٹ دی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا خدا کے حکم سے کہتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا وہ بھی خدا کے حکم سے کرتا تھا۔ اس نے ہم کو حکم دیا کہ ہم اس دین کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں۔ جو اس کو قبول کر لے اس کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں۔ اور جو قبول نہ کرے لیکن جزیہ دینے پر راضی ہو جائے تو ہمارے اوپر اس کی حفاظت فرض ہے۔ مگر جو اسلام بھی قبول نہ کرے اور جزیہ دینے سے بھی انکاری ہو اس کے لیے تلوار ہے۔ آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ مسلمان ہو جائیں اور اپنی جان اور سلطنت بچا لیں ورنہ جزیہ دے کر اسلام کی حمایت میں آ جائیں۔ اگر یہ دونوں باتیں آپ کو منظور نہیں تو پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔"

یزدجرد یہ الفاظ سن کر غصہ سے بے تاب ہو گیا اور کہنے لگا:

"اگر سفیروں کا قتل روا ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہ جا سکتا۔ جاؤ میرے پاس تمھارے لیے کچھ نہیں ہے، اپنے سردار سے کہہ دینا کہ رستم آ رہا ہے وہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مٹی کا ایک ٹوکرا منگوایا اور ان سفراء سے پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ معزز کون ہے؟ عاصم بن عمر

نے کہا : "میں۔"

یزدجرد نے حکم دیا کہ یہ ٹوکرا عاصم کے سر پر رکھ دیا جائے۔ چنانچہ وہ ٹوکرا عاصم کے سر پر رکھ دیا گیا اور وہ یہ کہتے ہوئے دربار سے باہر نکل گئے :

"شاہِ ایران نے خود اپنے ہاتھ سے اپنی زمین ہمارے حوالے کر دی۔"

یہی بات انھوں نے سعدؓ بن ابی وقاص سے جا کر کہی کہ ایران کی فتح مبارک ہو، دشمن نے خود اپنی زمین ہمیں دے دی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

اس گفتگو کے بعد شاہ یزدجرد نے رستم کو پیغام بھیجا کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی کثیر التعداد فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور مقام کوثا میں پہنچ کر خیمہ زن ہُوا۔ کوثا سے روانہ ہو کر وہ قادسیہ پہنچا اور مسلمانوں کے سامنے مقام "عتیق" میں ڈیرے ڈال دیے۔

رستم لڑنے سے جی چُرا رہا تھا اس لیے کہ وہ مسلمانوں سے بے حد مرعوب ہو چکا تھا لیکن شہنشاہِ ایران کی طرف سے برابر احکام آ رہے تھے کہ لڑائی چھیڑ دو۔ پھر بھی اس نے ٹال مٹول میں کئی مہینے لگا دیے، اور صلح کی کوشش شروع کی۔ سعدؓ بن ابی وقاص کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے کسی آدمی کو میرے پاس بھیج دو، میں اس سے صلح کی بات چیت کرنی چاہتا ہوں۔ سعدؓ نے ربعی بن عامر کو بھیج دیا۔ رستم نے بڑی شان سے دربار منعقد کیا۔ سونے کا تخت بچھوایا، اس کے چاروں طرف دیباج، حریر اور رومی قالینوں کا فرش کرایا۔ ہر طرف زرّیں گاؤ تکیے لگوائے۔ ربعی بن عامر نہایت سادہ لباس میں دربار میں پہنچے۔ اس شان و شوکت کا ان پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا اور نہایت بے پروائی سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے۔ اپنی برچھی کی انی کو اس طرح فرش میں چبھوتے جاتے تھے کہ وہ قیمتی فرش کٹ کٹ کر ناکارہ ہو گیا۔ رستم نے پوچھا کہ تمھارا اس ملک میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ ربعی نے وہی جواب دیا جو اسلامی سفیروں نے شاہِ یزدجرد کو دیا تھا اور جس میں تین باتیں پیش کی گئی تھیں :

قبولِ اسلام یا جزیہ یا تلوار۔

رستم نے یہ بات سُن کر کہا :

اچھا میں اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے پھر تمھیں مطلع کروں گا

دُوسرے روز رستم نے پھر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے اپنا سفیر بھیجنے کی درخواست کی۔ اس مرتبہ انھوں نے حذیفہؓ بن محصن کو روانہ کیا۔ حضرت حذیفہؓ رستم کے دربار میں اس شان سے پہنچے کہ اس کے تخت تک اپنے گھوڑے پر سوار گئے۔ رستم نے ان سے پوچھا :

تم ہمیں کتنے روز کی مہلت دے سکتے ہو؟

حذیفہؓ نے کہا : تین روز کی۔

رستم خاموش ہو گیا اور حذیفہؓ اسلامی لشکر میں واپس آ گئے۔

تیسرے روز رستم نے پھر اسلامی سفیر کو بلوایا اب کے سعدؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ کو روانہ کیا۔ مغیرہ گھوڑے سے اُتر کر رستم کے تخت کی طرف بڑھے اور اس کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ درباریوں کو اس بیباکی پر بڑا تعجب ہوا اور رستم کے چوب داروں نے بازو سے پکڑ کر حضرت مغیرہؓ کو تخت سے اتار دیا۔

حضرت مغیرہؓ نے تمام درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا :

"اے سرداران ایران! ہم تمھیں عقلمند سمجھتے تھے لیکن تم نرے بے وقوف نکلے۔ ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور تمام لوگ بندے بن کر اس کے آگے گردن جھکائیں۔ تمھارے لئے مناسب یہ تھا کہ ہمیں پہلے سے مطلع کر دیتے کہ تمھارے ہاں کمزور طاقتوروں کی پرستش کرتے ہیں اور انھیں خدا بنا کر اونچی جگہ پر بٹھاتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے سے یہ بات معلوم ہوتی تو میں تمہارے دربار کا کبھی رُخ بھی نہ کرتا۔ لیکن اب کہ میں آگیا ہوں تمھیں صاف طور پر بتلائے دیتا ہوں کہ تمھاری سلطنت کے چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں تم ظلم کی چکی تلے پیس رہے ہو وہی تمھاری سلطنت کو تہ و بالا کر دیں گے۔"

جب مترجم نے اس تقریر کا ترجمہ کیا تو اس سے تمام دربار متاثر ہوا۔ نچلے طبقہ کے لوگ کہنے لگے :

"اس عرب نے واقعی سچی بات کہی۔"

سردار کہنے لگے :

"اس نے ہماری رعایا کو ہمارے خلاف بغاوت پر اکسایا ہے۔ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس قوم کو حقیر سمجھتے تھے۔"

رستم بھی شرمندہ ہوا اور کہنے لگا ، یہ چوبداروں کی غلطی تھی۔ میں نے کوئی ایسا حکم نہ دیا تھا۔ پھر اس نے مغیرہؓ کے ترکش سے تیر نکالے اور کہا :

"ان تنکوں سے تمھارا کام کس طرح چلے گا ؟"

مغیرہؓ نے جواب دیا :

"آگ کی لو خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو بہرحال آگ ہے۔"

رستم نے ان کی تلوار کی میان کو دیکھ کر کہا :

"کس قدر بوسیدہ میان ہے ؟"

مغیرہؓ نے جواب دیا :

"میان تو بوسیدہ ہے لیکن تلوار پر دھار ابھی رکھی گئی ہے۔"

اس کے بعد صلح کی بات چیت ہوئی۔ رستم نے چاہا کہ کچھ لالچ دے کر اپنا کام نکالے۔ لیکن مغیرہؓ نے اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اگر تم قبول اسلام یا جزیہ دینا منظور نہیں کرو گے تو پھر اسی سے فیصلہ ہوگا۔ رستم کو بھی جوش آگیا اور کہنے لگا ،

"سورج کی قسم! کل تمام عربوں کو برباد کر دوں گا۔"
مغیرہؓ چلے آئے اور دونوں طرف لڑائی کی بھٹی پورے طور پر دہکنے لگی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح یورپین مؤرخین نے شاہ یزدجرد کے پاس اسلامی سفارت بھیجے جانے سے قطعی انکار کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے متذکرہ بالا واقعات کو بھی نہیں مانا ہے البتہ شاہنامہ فردوسی میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح عرب مؤرخین نے بیان کیا ہے۔

فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں شاہانِ ایران کے کارناموں کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ رستم نے سعدؓ کو ایک خط لکھا جو سیم و زر کے لالچ اور دھمکیوں سے پُر تھا اور جس میں سعدؓ کو ڈرایا گیا تھا کہ اسلامی لشکر کے سپاہی فارس کے بہادروں اور نہاوند اور مدائن کے شہسواروں کا کسی صورت میں بھی مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس کے جواب میں سعدؓ نے لکھ دیا کہ ہم لوگ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی مرعوب ہونا نہیں جانتے۔ یا ہم تمھاری سرزمین پر قابض ہو جائیں گے یا مارے جائیں گے۔ تیسری بات کوئی نہیں ہوگی۔ ہم دیباج و حریر پہننے اور مُشک و عنبر استعمال کرنے کے مطلق عادی نہیں ہیں اور نہ کبھی ہم کھانے پینے کی چیزوں پر فخر کرتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے لکھا کہ تمھارے لیے اب دو ہی راستے ہیں، یا قبولِ اسلام یا جنگ۔

اگرچہ مؤرخینِ عرب نے کسی ایسے خط کا ذکر نہیں کیا، تاہم ممکن ہے کہ رستم نے سعدؓ اور سعدؓ نے رستم کو ایسے خطوط لکھے ہوں بایں ہمہ فردوسی کی روایات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس نے اپنے شاہنامہ میں بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے شامل کر دی ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

حضرت مغیرہؓ کے چلے آنے کے بعد رستم نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان نہر عتیق حائل تھی رستم نے سعدؓ کو کہلا کر بھیجا کہ تم نہر کے اس طرف آؤ گے یا ہم تمھاری طرف آئیں۔ سعدؓ کو ابو عبید کا واقعہ یاد تھا انھوں نے جواب دیا کہ تم ہی ہماری طرف آ جاؤ۔ چنانچہ رستم نے نہر پر پُل بنانے کا حکم دیا اور ساری ایرانی فوج نہر کے اس کنارے پر پہنچ گئی۔

یورپین مورخین کا کہنا ہے کہ رستم نے نہر کو عبور کر کے اور قادسیہ کے میدان میں آ کر نبرد آزما ہونے میں سخت غلطی کی تھی۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے اس کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ اپنی ہی جگہ رہتا تاکہ عربوں کو مجبور ہو کر نہر کے اس پار جانا پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً عربی لشکر کو شکست فاش اٹھانی پڑتی۔ البتہ رستم نے جس طریقہ سے اپنی فوج کو ترتیب دیا تھا، جس طرح ہاتھیوں کو موقعہ بموقعہ کھڑا کیا تھا اور جس بہادری کے ساتھ جنگ کے پہلے روز اس نے مسلمانوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی ہے۔ ان مورخین نے جنگِ قادسیہ میں عربوں کی فتح کے اسباب یہ بتائے ہیں کہ ایک تو انھوں نے ہاتھیوں پر حملہ کر کے انھیں بیکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ دورانِ جنگ میں عربوں کو برابر

کمک پہنچتی رہی جس سے ان کے حوصلے بلند ہوتے رہے اور وہ بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں لڑتے رہے تا آنکہ ان پر فتح پائی گئی۔[1]

جب رستم کا تمام لشکر نہر کے دوسرے کنارے مسلمانوں کے بالمقابل پہنچ گیا تو اس نے باقاعدہ طور پر اس کی میمنہ کی اور میسرہ کے ہر حصہ کے آگے جنگی ہاتھی کھڑے کیے۔ ایک سو ہاتھی قلب میں رستم کے ساتھ تھے۔ پچھتر ہاتھی میمنہ میں، پچھتر میسرہ میں، بیس مقدمۃ الجیش میں اور تیس ساقہ میں تھے۔ ان کے اوپر ہودجوں میں فیلبان بیٹھے تھے۔

عربی لشکر کی ترتیب پانچویں روز کے چاند کے مانند تھی۔ لشکر میں خطیب جا بجا لوگوں کو صبر و استقلال کی تلقین کر رہے تھے۔ قرآنِ کریم کی وہ آیات بلند آواز سے پڑھ کر مجاہدین میں ایک نئی روح پھونک رہے تھے جن میں صبر کرنے والوں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ وہ ان کو بتا رہے تھے کہ وہ عرب ہیں جنھوں نے کبھی دشمن کے سامنے ذلت برداشت نہیں کی۔ کبھی کسی کے ظلم پر خاموش نہیں بیٹھے اور اب اگر انھوں نے دشمن کے مقابلہ میں کمزوری دکھائی تو یہ بات ان کے لیے انتہائی عار کا موجب ہوگی۔

سعدؓ بن ابی وقاص عرق النساء کی تکلیف کے سبب خود میدانِ جنگ میں موجود نہیں رہ سکتے تھے۔ نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے اس لیے وہ ایک قدیم شاہی محل میں جو قصرِ عذیب کے نام سے مشہور تھا چلے گئے۔ یہ محل عین میدانِ جنگ کے کنارے واقع تھا۔ آپ اس عمارت کی چھت پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ اپنی جگہ اسلامی لشکر کا سردار خالد بن عرفطہ کو بنایا۔ بعض لوگوں نے خالد کو نائب سالار بنانے پر اعتراض کیا۔ جب حضرت سعدؓ کو یہ خبر پہنچی تو انھوں نے محل کی چھت پر سے پکار کر معترضین سے کہا:

"خدا تعالیٰ کی قسم! اگر دشمن مقابلہ پر نہ ہوتا تو میں تمھیں سخت سزا دیتا اور دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت بنائے بغیر نہ چھوڑتا۔"

اس کے بعد انھوں نے تمام علمبرداروں کے نام اس مضمون کا خط لکھا:

"میں نے اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو تم پر سالار مقرر کیا ہے۔ میں اپنے درد کی وجہ سے مجبور رہوں ورنہ خود میدانِ جنگ میں حاضر رہتا۔ اس لیے تم پر ان کے ہر حکم کی اطاعت کرنا فرض ہے۔ کیونکہ وہ تمھیں جس امر کی ہدایت دیں گے میرے حکم سے دیں گے اور جو کچھ کریں گے میری رائے سے کریں گے۔"

جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا یہ فرمان لشکر میں پڑھا گیا تو تمام لوگوں نے خالد کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کا اقرار کیا۔ اگرچہ کمان خالد بن عرفطہ کے ہاتھ میں تھی لیکن سعدؓ برابر انھیں ہدایات روانہ کرتے رہتے تھے۔ جو حکم دینا ہوتا تھا پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور خالد انھی ہدایات کے مطابق عمل کرتے جاتے تھے۔

---

[1] "پرشیا" مصنفہ سیمن

حضرت سعدؓ نے لشکر کو مطلع کر دیا تھا کہ نمازِ ظہر کے بعد میں تین تکبیریں کہوں گا۔ تیسری تکبیر لڑائی شروع کرنے اور عام حملہ کرنے کی علامت ہوگی۔

جب مسلمانوں نے ظہر کی نماز پڑھ لی تو سعدؓ نے تین تکبیریں کہیں۔ تمام لوگوں کی نظریں انہی کی طرف تھیں۔ دونوں طرف کے بہادر مبارزت کے لیے اپنے اپنے لشکروں سے باہر نکلے اور رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چوتھی تکبیر پر عام حملہ شروع ہو گیا۔

(۵)

جنگِ قادسیہ کے تین دن

سعدؓ کا چوتھی تکبیر کہنا تھا کہ عربوں نے ایرانیوں پر زبردست ہلّہ بول دیا اور عام جنگ شروع ہو گئی۔ لیکن شروع ہی میں عربوں کے گھوڑوں کو ہاتھیوں کا سامنا کرنا پڑا جو ایرانیوں کے ہر حصّۂ فوج کے سامنے کھڑے تھے۔ ایرانیوں نے عربوں کے قبیلہ بجیلہ کے مقابلہ کے لیے ہاتھی آگے بڑھائے۔ عربوں کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکے اور پیچھے کی طرف بھاگے اور کسی کے روکے نہ رُک سکے۔ جب سواروں نے یہ حالت دیکھی تو وہ اپنے گھوڑوں سے اُتر آئے اور پیدل ہی تلواریں کھینچ کر دشمن کے مقابلہ میں آ گئے۔ پیدل فوج بڑی بے جگری سے لڑی، لیکن ہاتھیوں کے مقابلہ میں وہ بے بس تھی۔

سعدؓ محل کے اوپر سے یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے۔ پہلے اُنھوں نے قبیلہ بنی اسد کو بجیلہ کی مدد کے لیے بھیجا جو برچھیاں لے کر ہاتھیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ایرانیوں نے ہاتھیوں کے حملہ کا سارا زور اب بنی اسد کی طرف کر دیا اور ان کے پانچ سو آدمی ہاتھیوں کے ریلے میں آ کر روندے گئے۔ جب سعدؓ نے یہ دیکھا تو اُنھوں نے بنی تمیم کے سردار عاصم التمیمی کو بلا بھیجا اور ان سے پُوچھا کہ کیا تم سے ان ہاتھیوں کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی؟

اُنھوں نے اپنے قبیلہ بنی تمیم کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ کو حکم دیا کہ وہ ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر تیر چلا کر انھیں مار ڈالیں اور دوسرے حصہ کو حکم دیا کہ وہ قریب جا کر ہاتھیوں کے ہودوں اور عماریوں کو اُلٹ دیں۔

چنانچہ تیر اندازوں نے تیر برسانے شروع کیے اور دوسرے لوگوں نے ہودوں اور عماریوں کو اُلٹ کر ان میں جتنے آدمی تھے ان سب کو قتل کر دیا۔

یہ لڑائی کچھ رات گئے تک جاری رہی۔ جب بالکل ہی اندھیرا چھا گیا تو دونوں فریق میدان سے ہٹے۔ یہ قادسیہ کی لڑائی کا پہلا دن تھا جو "یوم ارماث" کہلاتا ہے۔

تمام رات مسلمان شہیدوں کو دفن کرتے اور زخمیوں کو میدانِ جنگ سے اٹھا اٹھا کر اپنے خیموں میں لاتے رہے۔ زخمیوں کی مرہم پٹی عورتوں نے کی جو کثیر تعداد میں اسی غرض کے لیے آئی تھیں۔ محض تھوڑا سا وقفہ فوج کو آرام کے لیے مل سکا۔

جب صبح ہوئی تو پتا چلا کہ شام کی طرف سے مسلمانوں کے لیے کمک آرہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہؓ کو جو شام میں لڑنے والی فوجوں کے سردار تھے، حکم بھیجا تھا کہ دمشق کی فتح کے بعد عراق کے لشکر کو قادسیہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ لڑائی میں سعدؓ کی مدد کر سکیں۔ چنانچہ ابو عبیدہؓ نے چھ ہزار فوج عراق روانہ کر دی۔ اس لشکر کے سردار ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص تھے۔ ہراول دستہ کے امیر قعقاع بن عمرو تھے۔ انھوں نے اپنی طبعی ذکاوت سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو قادسیہ میں فوری امداد کی ضرورت ہے اس لیے وہ اپنے دستہ کو لے کر تیزی سے سفر کرتے ہوئے عین اس موقع پر پہنچ گئے جب مسلمان رومیوں کے لیے مقابلہ کے لیے تیار تھے۔

قعقاع نے ایرانیوں پر رعب ڈالنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ اپنے لشکر کے دس حصے کر دیے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے یکے بعد دیگرے یہ دستے میدانِ جنگ میں پہنچتے رہے جس سے رومیوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مسلمانوں کو متواتر اور لامتناہی کمک پہنچ رہی ہے، جس سے ان پر خوف طاری ہو گیا۔

سب سے پہلے قعقاع پہنچے۔ انھوں نے آتے ہی ایرانیوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ یکے بعد دیگرے ایرانیوں کے کئی بہادر ان کے مقابلہ کے لیے نکلے مگر سب مارے گئے۔ آخر عام مقابلہ شروع ہوا۔ مسلمانوں کے دل کمک پہنچ جانے سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی بےجگری سے آگے بڑھے اور رومیوں کی صفوں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں۔ البتہ ہاتھیوں سے مفر کی کوئی صورت نہ تھی جو مسلمانوں کے گھوڑوں اور ان کی صفوں پر سیلاب کی طرح بڑھے چلے آرہے تھے۔۔ وہ جس طرف بھی جاتے تھے کائی سی پھٹ جاتی تھی۔ ہاتھیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی سونڈ سے کسی آدمی کو پکڑتے اور زور سے سونڈ ہلا کر اسے کسی دوسرے آدمی پر دے مارتے تھے۔ دونوں آدمی زمین پر گر پڑتے تھے اور ہاتھی آگے بڑھ کر دونوں کو اپنے پاؤں تلے کچل دیتا تھا۔

آخر قعقاع کے ساتھیوں کو ایک نئی تدبیر سوجھی انھوں نے فوج میں جتنے اونٹ تھے ان سب کے اوپر بڑی بڑی کالی جھولیں اور برقعے ڈال دیے جس سے ان کی صورتیں بڑی مہیب ہو گئیں۔ اس کے بعد ان کو آگے بڑھایا۔ ایرانیوں کے گھوڑوں نے انھیں ہاتھی سمجھا اور وہ بدک کر پیچھے کی طرف بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور سیکڑوں ایرانیوں کو مار گرایا۔ اس طرح ایرانیوں کو اس دن اسی قسم کی شکست کا سامنا کرنا پڑا جیسی ایک دن پہلے مسلمان اٹھا چکے تھے۔

دوسرے روز کی لڑائی نصف شب تک جاری رہی۔ اس میں دو ہزار مسلمان اور دس ہزار ایرانی مقتول و مجروح ہوئے اگرچہ ایرانیوں نے منہ کی کھائی تھی تاہم فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور لڑائی اگلے دن کے لیے ملتوی ہو گئی۔ یہ دن "یوم اغواث" کہلاتا ہے۔

تیسرے روز دن چڑھنے سے پہلے ہی قعقاع نے اپنی فوج کے ایک دستہ کو صحرا کی طرف بھیج دیا۔ جب سورج طلوع ہوا تو وہ دستہ تلواریں چمکاتا اور نیزے ہلاتا میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ ایرانیوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کو مزید کمک پہنچ گئی۔

آج کا معرکہ قادسیہ کی جنگ کا سب سے شدید معرکہ تھا۔ ہاتھی حسبِ معمول پھر میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ تکلیف ان ہاتھیوں ہی کی وجہ سے تھی۔ سعدؓ نے چند ایرانیوں کو جو پہلے پارسی تھے مگر بعد میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، بلایا، اور ان سے پوچھا کہ ان ہاتھیوں کا کیا علاج کیا جائے۔ انھوں نے رائے دی کہ ان کی سونڈیں اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام ہاتھیوں میں دو ہاتھی بڑے دیو ہیکل اور خوفناک تھے۔ ایک کا نام ابیض تھا اور دوسرے کا اجرب۔ سعدؓ نے قعقاع اور جند اور آدمیوں کو بلایا اور ان ہاتھیوں کو بیکار کرنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور کچھ پیدل ہاتھیوں کے گرد بھیج دیے جنھوں نے ان کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ پھر وہ ایک اور آدمی کو اپنے ساتھ لے کر فیلِ ابیض کی طرف بڑھے اور برچھیوں سے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالیں ہاتھی درد سے بیتاب ہو کر پیچھے ہٹا۔ یکایک قعقاع نے تلوار کا ایک ہاتھ مارکر اس کی سونڈ مستک سے الگ کر دی۔ دو اور آدمیوں نے فیلِ اجرب کا یہی حال کیا۔ یہ دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے ان کو دیکھ کر باقی کے تمام ہاتھی بھی اپنی ہی فوج کو کچلتے ہوئے ان دونوں ہاتھیوں کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو اس مہیب بلا سے نجات ملی۔

اب لڑائی نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کی صفوں میں گھس گئیں اور زبردست رن پڑنے لگا۔ دونوں فوجوں کے نعروں اور ایرانی فوجوں کے طبلوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ طبل اتنے زور سے بج رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا زمین دہل رہی ہے۔

رات قریب آچکی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے لڑائی بند ہوئی لیکن پھر دوبارہ شروع ہوگئی۔ جب دوبارہ لڑائی شروع ہوئی تو سعدؓ کا حکم تھا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جائے لیکن ایرانیوں نے تیر برسانے شروع کر دیے۔ اس پر قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اپنے جوش میں سعدؓ سے اجازت لیے بغیر ایرانیوں کا مقابلہ کرنے آگے بڑھے۔ فوج کے دوسرے دستوں نے بھی ان کا تتبع کیا اور ساری کی ساری مسلمان فوج میدانِ جنگ میں آگئی۔ زبردست مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس رات سوا نے گھوڑوں کے ہنہناہٹ اور تلواروں کی کھٹاکھٹ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تمام رات سعدؓ کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ لڑائی کا کیا ڈھنگ ہے اور انھوں نے ساری رات انتہائی بےچینی اور بےقراری میں گزاری۔ صبح ہونے پر پتا چلا کہ مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ جنگ کا تیسرا روز "یومِ عماس" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور وہ رات "لیلۃ الہریر" کے نام سے۔

جب سورج چڑھا تو قعقاع نے بلند آواز سے پکار کر کہا:

"مسلمانو! تھوڑی دیر کے لیے اور میدان میں جمے رہو۔ ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرے گا کہ ایرانیوں کی شکست یقینی ہے۔"

ان کی آواز پر قبائل کے رؤسا قعقاع کے گرد جمع ہو گئے اور مسلمانوں نے پھر ایرانی فوج پر شدت سے حملہ کر دیا۔ اس حملہ نے ایرانیوں میں مقابلہ کی تاب نہ چھوڑی۔ فوج کے دونوں بازوؤں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ ایک سخت حملہ نے ان کے قلب میں بھی ابتری پیدا کر دی اور سپاہی بھاگنے لگے۔

ایرانی فوج کا سپہ سالار رستم قلبِ لشکر میں اپنے تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ لشکر میں شکست کے آثار تو پیدا ہو ہی چلے تھے۔ یکایک اس کے تخت کا اگلا حصہ کھل گیا۔ ایک زبردست آندھی کے جھونکے نے تخت کے شامیانہ کو اڑا کر نہر میں پھینک دیا۔ رستم بدحواس ہو چکا تھا۔ تخت سے اٹھ کر بھاگا اور نہر میں کود پڑا۔ لیکن ہلال نامی ایک سپاہی نے نہر میں کود کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور باہر نکال کر تلوار سے کام تمام کر دیا۔

جب ایرانیوں کو اپنے سپہ سالار کے مارے جانے کا علم ہوا تو ان میں کھلبلی مچ گئی اور وہ نہر کی طرف بھاگے۔ لیکن ایرانی فوج کے ایک دستہ نے جو باقی فوج سے پہلے ہی پل عبور کر کے نہر کے دوسری طرف پہنچ گیا تھا یہ خیال کر کے کہ کہیں مسلمان ہمارا تعاقب نہ کریں، پل توڑ دیا تھا۔ ایرانی ہزیمت خوردہ فوج نے جب پل ٹوٹا ہوا دیکھا تو وہ واپس پلٹی۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو اپنی تلواروں کی باڑھوں پر رکھ لیا اور دُور دُور تک ان کا تعاقب کر کے انھیں قتل کرتے چلے گئے۔

قادسیہ کی لڑائی پورے تین دن تک جاری رہی۔ اس دوران میں ساٹھ گھنٹے تک اس طرح لڑائی ہوئی کہ درمیان میں فوجوں کو کچھ آرام کا موقع مل گیا۔ لیکن تیس گھنٹے تک تو یہ عالم رہا کہ ایک منٹ کے لیے بھی لڑائی بند نہ ہوئی۔ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے جو لڑائیاں لڑنی پڑیں، یہ لڑائی ان میں سب سے زیادہ خوفناک تھی، جس کے نتیجہ میں بالآخر آلِ ساسان کی بساط لپیٹ دی گئی اور ایرانی شہنشاہی کا، جس نے صدیوں بڑی شان و شوکت اور دبدبہ کے ساتھ ایران پر حکومت کی تھی، ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

ایران کی مشہور تاریخ " پرشیا " کا مولف سنجمن اپنی کتاب میں اس لڑائی کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:

" لڑائی کے تیسرے روز شام کے وقت ایرانی سپہ سالار رستم نے جب دیکھا کہ اس کی فوج کا برا حال ہے تو اس نے فوج کو ہٹا کر نہر عتیق عبور کر جانے کا ارادہ کیا۔ اس سے اس کی دو غرضیں تھیں، ایک تو یہ کہ شدید جنگ و جدال کے بعد وہ اپنی فوج کو کچھ آرام دے سکے۔ اور دوسری یہ کہ یہ نہر اس کے لشکر اور عربی فوج کے درمیان حائل ہو جائے۔

عربوں کو اس کے ارادے کا پتا چل گیا اور انھوں نے زبردست حملے کر کے ایرانی فوج کو سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ تمام رات لڑائی ہوتی رہی، جب صبح ہوئی تو انفرادی حملے ایک عام حملہ میں تبدیل ہو گئے۔ اس وقت موقعہ پا کر بعض ایرانی دستے نہر کو پار کر گئے۔ جب دن نکلا تو یکایک شدید آندھی اٹھی جس نے ایرانیوں کو اندھا کر دیا اور وہ عربوں کے مقابلہ میں پورے طور پر جم نہ سکے۔ عربوں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور شدت کے ساتھ ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کی صفیں تتر بتر کر دیں اس کے بعد رستم کی طرف بڑھے جو ایک تخت پر بیٹھا اپنے لشکر کو لڑا رہا تھا۔ رستم نے عربوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو بھاگنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ہلال بن علقمہ نے تلوار سے اس کا کام

تمام کر دیا اور اس کا سر لے کر تمام لشکر میں پھرایا۔

جب ایرانیوں نے اپنے سپہ سالار کا یہ حشر دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے لیکن چند لوگوں نے میدان چھوڑنا اپنے لیے عار خیال کیا۔ وہ ڈٹے رہے اور نہایت پامردی کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن کب تک! ایک ایک کر کے وہ سارے بہادر مسلمانوں کی تلواروں سے مارے گئے۔

بے شک معرکۂ قادسیہ میں ایرانیوں نے شکست کھائی۔ لیکن یہ شکست بھی ان کی سربلندی کی دلیل ہے انھوں نے بزدلی کی وجہ سے شکست نہیں کھائی، بلکہ اپنی پوری طاقت اور پوری جوانمردی سے غنیم کا مقابلہ کیا۔ لیکن تقدیر ہی پلٹ چکی تھی اور تقدیر کے آگے کس کی چل سکتی ہے!''

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضؓ کو بڑی بے چینی کے ساتھ اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اسلام کا مستقبل اس جنگ سے وابستہ ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس میں فتح پائی تو ایرانی سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا لیکن اگر خدا نخواستہ انھیں شکست اٹھانی پڑی تو نہ صرف یہ کہ پسپا ہونا پڑے گا بلکہ ایرانی اور رومی دونوں سلطنتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ عرب پر حملہ کر دیں گی اور عربوں میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ وہ بیک وقت ان دونوں طاقتوں کے مقابلہ پر ٹھہر سکیں۔ دوسرے مسلمانوں سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں تھی۔ ہر شخص کی نگاہیں آسمان کی طرف لگی رہتی تھیں اور وہ بڑی بے چینی سے سعدؓ کے پیغام کے منتظر تھے۔

حضرت عمرؓ کو تو اس قدر بے چینی تھی کہ آپ روزانہ صبح کو مدینہ سے نکل کر قاصد کی راہ دیکھتے رہتے تھے۔ جب دوپہر ہو جاتی تھی تب واپس آتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول آپ مدینہ کے باہر سعدؓ کے قاصد کا انتظار فرما رہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار آتا دکھائی دیا۔ آپ آگے بڑھے اور اس سے حال پوچھا۔ اس نے فتح کی خوشخبری دی۔ آپ اس کی اونٹنی کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے اور اس سے فتح کے حالات پوچھتے جاتے تھے جب مدینہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت قاصد کو معلوم ہوا کہ جو شخص اس کے ساتھ ہے وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ خود امیر المومنین ہیں۔ اس نے کہا:

''امیر المومنین! آپ نے مجھے اپنا نام کیوں نہیں بتلایا؟ میرے پاس تو آپ کا ایک خط ہے۔''

چنانچہ اس نے سعدؓ بن ابی وقاص کا خط نکال کر آپ کو دیا۔ آپ نے تمام مجمع میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا:

''خدا تعالیٰ نے ہمیں ایرانیوں پر ایک شدید جنگ کے بعد فتح دی ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو دشمنوں کی اس قدر زبردست فوج کا سامنا کرنا پڑا کہ پہلے کبھی ذکر کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس زبردست فوج سے ایرانیوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ انھیں شدید ہزیمت اٹھانی پڑی اور وہ بری طرح قتل ہوئے۔ مسلمانوں میں سے

بھی بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ شہداء میں سے بعض کے ناموں کا ہمیں پتا ہے اور بعض کا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"
جب حضرت عمرؓ شہداء کے نام پڑھ رہے تھے تو ان پر رقت طاری تھی اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ آپ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا :

"میری خواہش ہے کہ لوگوں کی جس قدر بھی ضروریات ہیں وہ سب پوری کر دوں تاکہ ہم سب برابر ہو جائیں میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمھیں غلام بنانا چاہوں، میں خود خدا کا بندہ ہوں۔ میری خوش نصیبی ہوگی کہ میں اس طرح تمھاری خدمت کروں کہ تم بے فکر ہو کر اپنے گھروں میں سوؤ۔ اور میری بدبختی ہوگی اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم آ کر میرے دروازے پر حاضری دو۔ میں تمھیں تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن خالی باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو خط لکھا جس میں انھیں حکم دیا کہ وہ سرحد کے ان زمینداروں کو ان کی زمینیں واپس کر دیں جنھوں نے اس آخری جنگ میں ایرانیوں کا ساتھ دیا۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ بے شک اس موقعہ پر اُنھوں نے ہم سے عہد شکنی کی لیکن اس عہد شکنی پر انھیں مجبور کیا گیا تھا۔ آپ نے سعدؓ کو حکم دیا کہ جو زمیندار یا کاشت کار اپنی زمین پر واپس آجائے اس پر جزیہ عاید کر کے اس کی زمین اسے واپس کر دی جائے تاکہ وہ اطمینان اور آرام سے اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔ لیکن جو واپس نہ آئے اس کی زمین بطورِ غنیمت لے لی جائے۔

اس حکم کا یہ اثر ہوا کہ اکثر زمیندار اور کاشتکار اپنی اپنی زمینوں پر واپس آگئے اور مسلمانوں کے عدل وانصاف اور احترام حقوق و واجبات سے متمتع ہونے لگے۔

اکثر مورخین کا اندازہ ہے کہ جنگِ قادسیہ میں مسلمان شہداء کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں ایرانیوں کا نقصانِ جان مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھا۔ البتہ مسلمانوں کو جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا، اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ اس غنیمت نے مسلمانوں کو ہکا بکا کر دیا۔ کیونکہ انھوں نے اس سے پہلے اتنا مالِ غنیمت کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ہر سپاہی کو مالِ غنیمت میں سے ہزاروں درہم کے علاوہ قیمتی سامان اور اسلحہ بھی ملا۔

یہ معرکہ شعبان ۱۵ھ میں پیش آیا۔

(۶)

ایرانی شہنشاہی موت کے دروازہ پر

سعدؓ بن ابی وقاص نے فتح قادسیہ کے بعد دو مہینے تک آرام کیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے انھیں حکم دیا کہ

وہ مدائنؔ پر چڑھائی کریں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کی تنظیم اور سامانِ جنگ کی فراہمی کے بعد قادسیہ سے نکلے اور مدائن کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے انھیں "برسؔ" میں ایک ایرانی جمعیت سے مقابلہ پیش آیا جس کی قیادت مشہور ایرانی سردار ہرمزان کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر نے ہرمزان کو شکست دی اور وہ اپنی فوجوں کے ساتھ حلہ کے شمال میں بابل کی طرف بھاگ گیا۔ مسلمانوں نے وہاں بھی اس کا پیچھا کیا اور دوبارہ اس کو شکست دے کر اس کی قوت کو توڑ ڈالا۔

بقیۃ السیف ایرانی سپاہی تین حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک حصہ جنوب میں اہواز بھاگ گیا، دوسرا حصہ کسریٰ کی فوجوں سے جا ملنے کو مدائن چلا گیا اور تیسرے نے مشرقی جانب نہاوند کا رُخ کیا۔

سعدؓ بن ابی وقاص نے کچھ روز بابل میں قیام کیا۔ اس کے بعد ایران کے دار السلطنت مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ مدائن دریائے دجلہ کے دونوں جانب آباد تھا۔ جو حصہ بائیں کنارے پر تھا اسے مشرقی مدائن اور جو دائیں کنارے پر تھا اسے مغربی مدائن کہا جاتا تھا۔ مغربی مدائن کو "بہرہ شیر" بھی کہتے تھے۔ "بہرہ شیر" پر پہنچ کر عربوں نے شہر کے سامنے منجنیقیں لگا دیں اور شہر کا زبردست محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ نے صلح کا ارادہ کیا اور سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں مغربی مدائن تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کرو اور مشرقی مدائن ایرانیوں کے پاس ہی رہنے دو۔ لیکن حضرت سعدؓ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور فوج کو شہر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ جب مسلمان شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ سارا شہر خالی پڑا ہے، اور کسی متنفس کا اس میں نشان تک نہیں ملتا۔ معلوم ہوا کہ شہر والے دریا عبور کر کے مشرقی مدائن پہنچ چکے ہیں اور پل توڑ دیا ہے تاکہ مسلمان دریا عبور نہ کر سکیں۔

جب یزدجرد کو معلوم ہوا کہ مغربی مدائن مسلمانوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو اس نے اپنے اہل وعیال اور خزانہ کو حلوان بھیج دیا اور خود بھی بھاگنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ سعدؓ نے حکم دیا کہ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا پار کیا جائے لیکن کوئی کشتی نہ ملی کیونکہ ایرانی بھاگتے وقت انھیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک ایرانی سعدؓ کے پاس آیا اور انھیں مشورہ دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے آپ دریا پار کر کے دوسرے کنارے پہنچ جائیں۔ ساتھ ہی ایک جگہ بھی بتائی جہاں سے دریا عبور کیا جا سکتا تھا لیکن چونکہ دریا بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا اس لیے سعدؓ کو تامل ہوا۔ وہ ایرانی دوبارہ سعدؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"آخر آپ ہچکچا کیوں رہے ہیں؟ میں آپ کو صاف صاف بتلائے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے مشرقی مدائن پہنچنے میں ذرا سی دیر بھی کی تو یزدجرد ہر وہ چیز جو مدائن میں ہے، لے کر وہاں سے چلا جائے گا۔"

اس پر سعدؓ کو بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور انھوں نے لشکر کو جمع کر کے کہا:

"تمھارے دشمن نے دریا کے دامن میں پناہ لی ہے لیکن تمھیں کسی چیز سے بھی، خواہ وہ کتنی ہی خوفناک کیوں نہ ہو،

۱؎ مدائن ایران کا دار الحکومت تھا اور قادسیہ سے بجانب شمال ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔

۲؎ برس قادسیہ اور حلہ کے درمیان ایک بستی ہے۔ ۳؎ تاریخ طبری

ڈرنا نہ چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ دنیا کمانے سے قبل تم اپنے دشمن سے جہاد کر کے اس کا سارا زور توڑ دو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس دریا کو عبور کر کے مدائن پر حملہ کیا جائے۔"

سارے لشکر نے بڑی خوشی سے اس بات کو قبول کر لیا۔ سعدؓ نے پوچھا: بتاؤ تم میں سے کون کون شخص اپنے آپ کو اس بات کے لیے پیش کرتا ہے کہ وہ اس دریا کو عبور کرے اور دوسرے کنارے پر جا کر قبضہ جما لے تاکہ باقی لوگ بھی بے خوف ہو کر دریا پار کر سکیں۔ اس غرض کے لیے عاصم بن عمرو اور چھ سو آدمیوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ حضرت سعدؓ نے عاصم کو اس فوج کا سردار بنایا اور عاصم نے فوج کو دس حصوں میں منقسم کیا۔ ہر حصہ میں ساٹھ سوار تھے۔ اس کے بعد گھوڑے دریا میں ڈالنے کا حکم دیا، جس کی تعمیل ہر سوار نے کی۔ ایرانیوں نے جو مسلمانوں کو اس طرح دریا پار کرتے دیکھا تو اپنی فوج سے چند سوار منتخب کیے۔ ان سواروں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور مسلمان سواروں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس طرح وہ کنارے سے بہت دُور نکل آئے۔

جب ان کی مڈھ بھیڑ پہلے دستے سے ہوئی تو عاصم نے چلا کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار نکال کر ان سے لڑو۔ چنانچہ مسلمان سواروں نے پانی ہی میں ایرانیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ایرانی کنارے کی طرف پلٹے۔ ان کے پیچھے پیچھے عاصم بھی اپنے سواروں کو لے کر کنارے پر پہنچ گئے اور قبضہ کر لیا۔ جب سعدؓ نے یہ دیکھا کہ عاصم کی فوج دوسرے کنارے پہنچ چکی ہے تو بقیہ فوج کو بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سب لوگوں نے تعمیل ارشاد کی اور اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دئے۔ گھوڑے بطخوں کی طرح تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پہنچ گئے اور ساری فوج سلامتی کے ساتھ دریا پار کر گئی۔

جب ایرانیوں نے دیکھا کہ سعدؓ کا لشکر بڑھتا چلا آ رہا ہے تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ چنانچہ قبل اس کے کہ سعدؓ کا سارا لشکر کنارہ پر پہنچا، مدائن کے سارے لوگ اور یزدجرد کی ساری فوجیں شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور حلوان جا کر پناہ لی، جو ایران کا ایک شہر تھا۔ یزدجرد اور اس کے ساتھی اپنے محلات چھوڑتے وقت ایوان کسریٰ کے سارے خزانے اور مال و متاع اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔ سب سے پہلے شہر میں عاصم بن عمرو کا دستہ داخل ہوا اور اس کے بعد قعقاع کا دستہ پہنچا۔ جب سعدؓ شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے حکم دیا کہ بھاگتے ہوئے ایرانی لشکر کا تعاقب کیا جائے۔ اس کے بعد آپ ایوانِ کسریٰ میں داخل ہوئے۔ اب سعدؓ کی نظروں کے سامنے عظیم الشان محلات اور شاندار باغات تھے۔ لیکن ان کے مکینوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ انھیں یہ دیکھ کر بے حد عبرت ہوئی اور بے اختیار ان کی زبان سے قرآن کریم کی یہ آیت نکلی:

کم ترکوا من جنات وعیون و زروع و مقام کریم و نعمۃ کانوا فیہا فاکھین
کذالک واورثناھا قوماً اخرین۔

"کافر بہت سے باغات، چشمے، کھیت، عمدہ مکانات اور آرام کا سامان چھوڑ گئے جن میں وہ باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہونا تھا اور یہ سب سامان ہم نے دوسری قوموں کو عطا کر دیا۔"

آپ نے ایوانِ کسریٰ میں نمازِ تشکرانہ ادا کی۔ دیواروں پر بے شمار تصاویر بنی ہوئی تھیں لیکن آپ نے انھیں یوں ہی رہنے دیا، چھیڑا تک نہیں۔ اسی ایوان میں بیٹھ کر شہنشاہ یزدجرد نے اسلامی سفارت کے سامنے عربوں کا نہایت تحقیر آمیز لہجہ میں اور شاہانِ کسریٰ کا نہایت فخر و مباہات کے ساتھ تذکرہ کیا تھا۔ وہی ایوانِ کسریٰ اب بھی موجود تھا۔ لیکن یزدجرد اور اس کے مغرور درباریوں کا کہیں پتا نہ تھا اور وہی حقیر و ذلیل عرب اب فاتحین کی حیثیت سے اس میں کھڑے تھے۔

ایوانِ کسریٰ عجائباتِ عالم میں شمار ہونے کے قابل تھا۔ اس میں ایسے ایسے نوادر جمع تھے جن کی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔ ایوان میں سب سے اہم حصہ شہنشاہ کا ایوان تھا اس کی بلندی ایک سو اکیس قدم عرض بیاسی قدم اور طول ایک سو چونسٹھ قدم تھا۔ اس کی چھت پر ایک نیلا گنبد تھا جس میں جواہرات جڑے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اندھیری رات میں آسمان پر لاتعداد ستارے چمک رہے ہوں۔ ایوان کے فرش پر ایک قالین بچھا تھا جو ایرانی کاریگری کا ایک لاثانی نمونہ تھا۔ اس پر ایرانی جس قدر بھی فخر کرتے کم تھا۔ اس میں ہیرے جواہرات سے ایک باغ بنایا گیا تھا۔ اس کی زمین سونے کی، سبزہ زمرد کا، جدولیں پکھراج کی، درخت سونے چاندی کے، پتے حریر کے، پھل جواہرات کے اور نہریں موتیوں کی بنی ہوئی تھیں۔ سعدؓ نے اس قالین کو خمس کے ساتھ مدینہ بھیج دیا جہاں حضرت علیؓ کے مشورے کے مطابق حضرت عمرؓ نے اسے کاٹ کاٹ کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

مدائن سے عربوں کو جو غنیمتیں حاصل ہوئیں ان کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ سونے چاندی کے پیالے، شاہانِ ایران کے مرصع تاج اور ان کے زرکشی کپڑے کسریٰ کے تخت کے آگے پڑے ہوئے تھے اور ان پرشکوہ اور پرہیبت محلات میں نادرۂ روزگار چیزوں کے سامنے عرب فاتحین مبہوت کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ بڑی حیرت کے ساتھ کبھی ان بلند و بالا محلات کی طرف نظر اٹھاتے تھے اور کبھی ان عجیب و غریب اشیاء کی طرف۔

مسلمانوں نے مدائن سے جو غنیمتیں حاصل کی تھیں مورخینِ عرب نے ان میں سے کئی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ انہی چیزوں میں ایک اونٹنی تھی جو خالص سونے کی بنی ہوئی تھی، ایک گھوڑا تھا جو چاندی کا بنا ہوا تھا۔ مشک اور دوسری خوشبوئیں تو اتنی بڑی مقدار میں تھیں جن کا کوئی شمار ہی نہیں۔ چنانچہ کافور کی کثرت کو دیکھ کر عرب یہ سمجھے کہ یہ نمک ہے۔ انھوں نے اسے اپنی ہانڈیوں میں ڈال لیا، جب چکھا تو ساری ہانڈیاں گرانی پڑیں۔ سعدؓ نے تمام مالِ غنیمت ایک جگہ اکٹھا کیا اور خمس نکال کر باقی مال تیس ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کی رو سے ہر سوار کے حصہ میں بارہ ہزار درہم آئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مدائن کی فتح کے موقعہ پر اکثر مسلمانوں کے پاس اپنے اپنے گھوڑے موجود تھے۔ بہت کم ایسے لوگ تھے جن کے پاس اپنے گھوڑے نہیں تھے۔

ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اگرچہ سارا مدائن عجیب عجیب چیزوں اور ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا، لیکن کسی مسلمان سپاہی نے ان بیش قیمت چیزوں کو ناجائز طور پر اپنے پاس نہ رکھا، بلکہ جو چیز انھیں ملی انھوں نے لے جا کر اپنے سپہ سالار سعدؓ بن ابی وقاص کی خدمت میں پیش کر دی۔ سعدؓ تو روزانہ ایسے نظارے دیکھتے ہی رہتے تھے لیکن جب کسریٰ کی تلوار، جو ہیروں اور جواہرات سے مزین تھی اور دوسری بیش قیمت چیزیں، جن کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی تھی،

حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی گئیں، تو جہاں حضرت عمرؓ ان کی خوبصورتی اور جمال پر عش عش کر اُٹھے وہاں آپ کے دل پر اسلامی فوج کی عدیم المثال دیانت کا بھی بیحد اثر ہوا اور آپ نے کھلے مجمع میں اس دیانت و امانت کا اظہار فرمایا۔ اس پر حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا:

"امیر المؤمنین! جب آپ ہر قسم کی بددیانتی سے بچتے ہیں تو رعایا کیوں نہ بچے!"

مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے مدائن کے گھر فوج میں تقسیم کر دیئے اور اپنے اور لشکر کے اہل و عیال کو قادسیہ سے بلا کر ان میں ٹھہرایا۔ ایرانیوں کے ہزیمت خوردہ سپاہی مدائن سے جلولاؔ پہنچے اور اپنی قوتوں کو ایک قریبی پہاڑ کے دامن میں مجتمع کرنے لگے وہ جگہ لڑائی کے لیے نہایت ہی موزوں تھی۔ حلوان سے کسریٰ نے بھی انھیں سامانِ جنگ اور کمک بھیجنی شروع کی۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو جب ان حالات کا علم ہُوا تو اُنھوں نے ساری کیفیت حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ وہ ہاشم بن عتبہ کو بارہ ہزار فوج دے کر جلولاؔ روانہ کر دیں۔ مقدمۃ الجیش پر قعقاع، میمنہ پر مسعر بن مالک، میسرہ پر عمرو بن مالک اور ساقہ پر عمرو بن مرّہ کو مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ہاشم لشکر لے کر روانہ ہو گئے جس میں مہاجرین، انصار اور دیگر عرب قبائل کے سرکردہ اشخاص شامل تھے۔ جلولاؔ پہنچ کر اُس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ایرانی وقتاً فوقتاً شہر سے باہر نکل کر حملہ کرتے تھے، ان حملوں کا سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا اور اس مدت میں اسّی معرکے پیش آئے۔

سعدؓ برابر مسلمانوں کو کمک روانہ کرتے رہتے تھے۔ جب ایرانیوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جمعیت روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے تو اُنھوں نے اپنے قلعوں سے نکلنے اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ ایرانی فوج باہر نکلی اور مسلمانوں کے سامنے صف آرا ہو گئی۔ قعقاع نے اپنے دستہ کو ایرانیوں پر زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دونوں فوجوں میں شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ شروع میں ایرانیوں نے بڑی بہادری، جرأت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا لیکن آخر تا بکے؟ — ان کے قدم اُکھڑنے لگے اور اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو "جبال"ؔ سے بھی پرے دھکیل دیا۔ مؤرخین کے قول کے مطابق اس لڑائی میں ایک لاکھ ایرانی مارے گئے۔

اس لڑائی میں بے شمار و بے حساب مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ ہزاروں ایرانیوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انھیں آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

زیاد بن ابیہ مالِ غنیمت کا خمس اور فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ آئے تھے۔ آپ نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ سارا حال امیر المومنین سے بیان کیا کہ کس طرح مسلمانوں کو اس جنگ میں تکالیف اٹھانی پڑیں اور کس طرح خدا تعالیٰ نے

لہ آج کل اس جگہ کو قزل رباط کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ بغداد سے چھیانوے میل دور بجانبِ مشرق واقع ہے۔ پُرانے زمانہ میں اور موجودہ زمانہ میں بھی اس شہر سے قافلے گزرا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ تم نے جس فصاحت و بلاغت سے فتح کا حال میرے سامنے بیان کیا ہے کیا مجمع عام میں بھی بیان کر سکتے ہو؟

زیاد نے جواب دیا :

" امیرالمومنین ! دنیا میں سب سے زیادہ رُعب جس شخص کا میرے دل میں ہے وُہ آپ ہیں۔ اگر میں آپ کے سامنے یہ حال بیان کر سکتا ہُوں تو دُوسروں کے سامنے کیوں نہیں کر سکتا ! "

چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے حکم سے مسجد نبوی میں منبر پر کھڑے ہُوئے اور فتح کا تمام حال اس فصاحت و بلاغت سے بیان کیا کہ معرکہ کی تصویر لوگوں کے سامنے کھینچ دی۔

حضرت عمرؓ بے اختیار بول اُٹھے : " خطیب اس کو کہتے ہیں۔"

زیاد نے کہا : " امیرالمومنین ! ہمارے بہادروں کے کارناموں نے ہماری زبانوں کو کھول دیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ کاشتکاروں کو ان کے حال پر باقی رہنے دیا جائے ، اپنی جگہ سے انھیں ہٹایا نہ جائے ، سوائے ایسے لوگوں کے جو مسلمانوں سے لڑیں یا دشمن کی طرف بھاگ جائیں۔ اس حکم سے حضرت عمرؓ کی دُوراندیشی کا پتا چلتا ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ زمین پر ہمیشہ موروثی مزارعین کو آباد رکھا جائے تاکہ وہ اس کی نگہداشت کر سکیں اور مسلمان جو جنگوں میں مشغول رہتے ہیں اور جنھیں کاشت کرنے کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا اس کی پیداوار سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

اگرچہ ان پے در پے اسلامی فتوحات سے ایرانیوں پر زبردست خوف و ہراس طاری ہو چکا تھا اور وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب چند دنوں میں تمام ایران پر عربوں کا قبضہ ہونے والا ہے ، تاہم ان میں بہادری ، جُرأت اور وطنیت کی رُوح بہت زیادہ تھی۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے دارالحکومت اور اپنی سلطنت کے ایک بہت بڑے حصّہ پر مسلمانوں کے قبضہ کو نظرانداز کرتے ہُوئے تکریت[1] میں ان کے مقابلہ کی تیاری شروع کی اور وہاں ہتھیار اور لشکر جمع کرنے شروع کیے۔ جب سعدؓ کو پتا چلا تو اُنھوں نے " عبداللہ بن المعتم " کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ ایرانی قلعہ تکریت میں محاصرہ نشین ہو گئے۔ قلعہ میں ایرانیوں کے علاوہ عرب کے عیسائی قبیلوں ایاد ، تغلب اور نمر کی بھی ایک بھاری جمعیت موجود تھی۔ عبداللہ نے پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا ، قلعہ کے نصاریٰ موقع بموقع قلعے سے باہر نکلتے اور اسلامی لشکر پر حملہ کرتے لیکن ہر بار انھیں ہزیمت اٹھانی پڑتی۔ جب ایرانیوں نے یہ حال دیکھا تو اُنھوں نے قلعہ چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ کیا۔ جب اسلامی لشکر کے سالار کو ان کے اس ارادہ کا پتا چلا تو اُنھوں نے عرب عیسائیوں سے خفیہ تعلق قایم کر کے انھیں اپنی طرف مائل کر لیا۔ وہ لوگ اسلام لے آئے اور انھوں نے اسلامی لشکر کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ طے یہ پایا کہ جب مسلمان قلعہ پر حملہ آور ہوں اور ایرانی بھاگنے کا ارادہ کریں

---

[1] عراق کا مشہور شہر ہے اور دجلہ کے دائیں کنارے پر بغداد سے ۱۰۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

تو یہ نومسلم پیچھے سے ان پر حملہ کردیں اور انھیں بچ کر نکلنے میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایرانی دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ گئے۔ مسلمان قلعہ پر قابض ہوگئے اور اس کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط فوج متعین کر دی گئی۔

سعدؓ نے ماسیذان (جسے آجکل کرکوک کہتے ہیں) کے علاقہ کو فتح کرنے کے لیے ضرار بن خطاب کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ انھوں نے اس کو فتح کرلیا ایک اور دستہ جس کے سوار عمر بن مالک تھے۔ قرقیسا اور ہیت کی طرف روانہ ہوگیا اور یہ دونوں مقامات بھی بآسانی فتح ہوگئے۔

ان فتوحات کے بعد عراق میں ایرانی جنگوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ایرانی مغرب کی طرف چلے گئے اور فارس و عراق کے درمیانی پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہوتے۔ اس طرح سارا عراق اسلامی جھنڈے تلے آگیا۔

جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان جدید فتوحات کی خبر امیرالمومنین کو بھیجی تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ ایک دستہ کو ایلہ[1] فتح کرنے کے لیے بھیجیں تاکہ اس راستے سے ایرانیوں کو کوئی مدد نہ پہنچ سکے۔ جنوبی جانب سے مسلمان فوج کا خطار جعت محفوظ رہے اور اسے کسی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔

سعدؓ نے عتبہ بن غزوان کو ایلہ فتح کرنے بھیجا جنھوں نے اسے فتح کرکے اس کے قریب ہی حضرت عمرؓ کے حکم سے بصرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اس میں فوجوں کو ٹھہرایا۔ اس طرح بصرہ اہواز[2] اور خلیج فارس کے علاقہ کے لیے فوجی چھاؤنی بن گیا۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے ہی ۱۷ھ میں عراق میں ایک دوسرے شہر کوفہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس شہر کے بسانے کی وجہ یہ تھی کہ مدائن کی آب و ہوا اسلامی فوجوں کو سازگار نہ آئی وہ وہاں بحد کمزور ہوگئے اور ان کی صورتیں بدل گئیں۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ کوئی جگہ تلاش کرو جسے بحری اور بری دونوں حیثیتیں حاصل ہوں اور وہاں سے مدینہ تک کوئی دریا نہ پڑتا ہو۔ انھوں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں آج کل کوفہ آباد ہے۔ یہاں سے فرات ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی منظوری دے دی اور یہاں کوفہ شہر آباد کرکے اسے فرات اور دجلہ کے علاقہ کی فوجی چھاؤنی بنا دیا گیا۔

کوفہ حیرہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اس دوران میں ایرانیوں کا مشہور سردار "ہرمزان" اہواز میں مقیم تھا اور وقتاً فوقتاً اسلامی علاقے پر حملہ کرتا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح فوجی کارروائیوں میں رکاوٹ پیدا کرتا رہے۔ حضرت عمرؓ نے عتبہ ابن غزوان کو جو بصرہ میں اسلامی فوجوں کے سردار تھے حکم بھیجا کہ ہرمزان سے جنگ کی جائے، اُدھر سعدؓ کو لکھا کہ عتبہ کے پاس کمک بھیجو۔ عتبہ کا مقابلہ ہرمزان سے ہوا، ہرمزان نے شکست کھائی اور اہواز و مہرجان کا علاقہ مسلمانوں کو دے کر صلح کرلی۔ کچھ عرصہ کے بعد سرحد کی تعیین کے سلسلے میں مسلمانوں اور

---

[1] ایلہ خلیج فارس کے علاقہ میں ایک مضبوط سرحدی قلعہ اور بندرگاہ تھی۔

[2] اہواز خوزستان کے صوبہ میں بصرہ کی حدود پر واقع تھا۔

ہرمزان میں اختلاف پیدا ہوا اس نے صلح توڑ دی اور کردوں کو اپنے ساتھ لے کر مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا۔ عتبہ نے امیر المومنین سے دوبارہ ہرمزان سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی اور کچھ کمک بھی روانہ کی۔ چنانچہ عتبہ اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھے اور ہرمزان کو شکست دے کر اہواز کے اکثر علاقہ پر قابض ہو گئے لیکن ہرمزان پھر مسلمانوں کے مقابلہ پر آموجود ہوا۔

جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے ان اسباب کا پتا چلانا چاہا جن کی وجہ سے ہرمزان دوبارہ نقضِ عہد کا مرتکب ہوا۔ امیر المومنین کا ذہن اس طرف گیا کہ جب تک ذمی لوگ ہرمزان کے ساتھ بغاوت میں شریک نہ ہوں اس وقت تک ہرمزان نقضِ عہد کی جرأت نہیں کر سکتا اور ذمیوں کی بغاوت کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان فاتحین ان پر ظلم وستم کرتے ہوں گے۔ اس معاملہ کی تحقیق کے لیے آپ نے کوفہ کے معززین کا ایک وفد طلب فرمایا۔ چنانچہ دس آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے یہی سوال کیا کہ کیا مسلمان ذمیوں پر ظلم وستم تو نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا: "ہرگز نہیں، ہرمزان کی بغاوت بغیر کسی سبب کے ہے اور ذمیوں سے بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔"

جب حضرت عمرؓ کو اچھی طرح اطمینان ہو گیا تو آپ نے عتبہ کو ایک خط لکھا:

"مسلمانوں کو ظلم سے دُور رکھو اور ذمیوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری طرف سے کوئی زیادتی ہونے پر اہلِ ذمہ بغاوت اور سرکشی پر کمر باندھ لیں۔ تمھیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وفاءِ عہد کی وجہ سے دیا ہے لہٰذا وفاءِ عہد کا ہمیشہ خیال رکھو اور اہلِ ذمہ کے ساتھ حُسنِ سلوک میں خدا کے احکام پر چلو اگر تم نے ایسا کیا تو خدا تعالیٰ تمھارا حامی ومددگار رہوگا۔"

واقعہ یہ ہے کہ ہرمزان کی بار بار عہد شکنی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسلمان ذمیوں پر ظلم کرتے تھے بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ کسریٰ کے بادشاہ یزدجرد کا کس بَل ابھی پُوری طرح نہیں نکلا تھا وہ مرو میں مقیم تھا۔ عربوں نے تمام مملکتِ ایران پر ابھی قبضہ کیا نہیں تھا۔ وہ برابر ان علاقوں کے لوگوں کو جن پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا خفیہ خطوط بھیج کر انھیں بغاوت اور عہد شکنی پر ابھارتا تھا اس نے فارس[1] کے سرداروں کو بھی عربوں کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارس اور خوزستان کے سرداروں نے باہم خط وکتابت کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یزدجرد نے بھی ان کی مدد کے لیے فوج بھیجی۔

حضرت عمرؓ کو جب ان واقعات کی اطلاع ملی تو آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو کوفہ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ خط لکھے کہ وہ دو لشکر اہواز روانہ کر دیں۔ کوفہ سے نعمان بن مقرن روانہ ہوئے اور بصرہ سے سہیل بن عدی۔ نعمان بن مقرن رامهرمز پہنچ کر ہرمزان کے مقابل ہوئے اور اسے شکست دی۔ ہرمزان شکست کھا کر تستر بھاگ گیا۔ نعمان بن مقرن اپنی فوج کو لے کر تستر پہنچے وہاں بصرہ کی فوج بھی ان سے آملی۔ دونوں فوجوں نے مل کر شہر کا محاصرہ کر لیا جو ایک مہینہ تک جاری رہا۔ اس

---

[1] وہ علاقہ جو اصفہان، بحرِ فارس، کرمان اور عراق کے درمیان واقع ہے۔

عرصہ میں ہرمزان اور اسلامی فوجوں کے درمیان برابر چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر مسلمان غالب آگئے اور انھوں نے "تستر" پر قبضہ کر لیا۔ ہرمزان نے اس شرط پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنا منظور کیا کہ اسے امیر المومنین کے پاس مدینہ پہنچا دیا جائے۔ مسلمانوں نے یہ شرط منظور کر لی اور اسے ایک فوجی دستہ کی حفاظت میں مدینہ روانہ کر دیا۔

جب ہرمزان کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا:

"تم بار بار معاہدے کر کے انھیں توڑتے کیوں رہے!"

جواب دینے سے قبل اس نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ چنانچہ اسے پانی کا پیالہ دیا گیا۔ اس نے کہا:

"مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں میں پانی پینے کی حالت ہی میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"نہیں، جب تک تم پانی نہ پی لو گے قتل نہیں کیے جاؤ گے۔"

ہرمزان نے پانی کا پیالہ زمین پر رکھ دیا اور کہنے لگا:

"مجھے پانی پینے کی ضرورت نہیں ہے میں تو امان لینا چاہتا تھا۔"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"میں تو تجھے ضرور قتل کروں گا۔"

اس نے جواب دیا:

"آپ تو مجھے امان دے چکے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"تم جھوٹ کہتے ہو۔"

لیکن حاضرینِ مجلس نے کہا:

"امیر المومنین! آپ نے جو الفاظ اس سے فرمائے تھے ان سے اس کو امان مل گئی۔"

چنانچہ اسے امان دے دی گئی، وہ اسلام لے آیا اور حضرت عمرؓ نے اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

بار بار کے تجربوں سے حضرت عمرؓ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مسلمان عراق میں اور حدودِ فارس پر اس وقت تک چین کی نیند نہیں سو سکتے اور انھیں اس وقت تک اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہو سکتا جب تک شاہِ ایران ان کے قرب و جوار میں موجود ہے وہ اپنی قوم کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہے گا اور بغاوتیں پھوٹتی رہیں گی اس لیے آپ نے تہیہ کر لیا کہ یزدجرد کو سرزمینِ ایران سے بھی نکال دیا جائے۔ اسی اثنا میں آپ کو یہ خبر ملی کہ اہلِ نہاوند مسلمانوں سے لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ وہ اپنا لشکر ساتھ لے کر سرزمینِ ایران پر چڑھائی کر دیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کُلّی طور پر ایران سے شہنشاہی کا خاتمہ نہ ہو جائے اور فتنہ بیخ و بن سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے۔

(۷)

سلطنتِ ایران کا خاتمہ

جس زمانہ میں اسلامی فوجیں عراق میں پے در پے فتوحات حاصل کر رہی تھیں، اس زمانہ میں بحرین کے عامل علاؑ بن الحضرمی تھے انھیں ان فتوحات کا حال معلوم ہوا تو خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دل میں بھی پیدا ہوا اور انھوں نے خلیفہ کی اجازت کے بغیر بحرین سے ایک فوج سمندر کے راستے فارس پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دی۔ لیکن اصطخر پہنچنے پر اس کی فوج کو ایرانیوں کے زبردست لشکر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ایرانی فوج کی ایک زبردست جمعیت اسلامی فوج اور مسلمانوں کی کشتیوں کے درمیان حائل ہوگئی۔ خشکی کے راستے بھی سارے مسدود کر دیے اور مسلمان طاؤس کے مقام پر محصور ہو کر رہ گئے۔ جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے امیر بصرہ عتبہ بن غزوان کو حکم بھیجا کہ وہ علاؑ بن حضرمی کی مدد کے لیے لشکر بھیجیں۔ انھوں نے ایک زبردست جمعیت ابو سبرہ کی سرکردگی میں فارس بھیجی۔ اس فوج نے جا کر علاؑ بن حضرمی کی فوج کو ایرانیوں کے محاصرہ سے نکالا اور دونوں فوجیں بحرین اور بصرہ واپس آ گئیں۔ اس جُرم کی سزا میں حضرت عمرؓ نے علاؑ بن حضرمی کو بحرین کی امارت سے ہٹا دیا۔

حضرت عمرؓ کو عراق کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا تھا لیکن جزیرہ کا صوبہ جو فرات اور دجلہ کے درمیان واقع ہے ابھی تک ایرانیوں کے قبضہ میں تھا۔ اس کے جنوب میں ربیعہ کے عربی قبائل آباد تھے اور مغرب میں مضر کے قبائل۔ اگر جزیرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو یہاں سے ایرانی پھر ریشہ دوانی کر کے ان قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُبھار سکتے تھے۔ اس لیے حسنِ سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ان عربی قبائل کو تو پورے طور پر جدید اسلامی مملکت میں شامل کر لیا جاتا اور جزیرہ کو مطیع بنا لیا جاتا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ جزیرہ کو فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت سعدؓ نے عیاض بن غنم کو ایک فوج دے کر جزیرہ کی طرف بھیجا یہ وہی عیاض بن غنم ہیں جنھیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شمالی عراق پر چڑھائی کرنے کے لیے مقرر فرمایا تھا اور ان کے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید کو جنوبی عراق کی فتح پر مامور کیا تھا۔

حضرت عیاضؓ بن غنم فوج لے کر جزیرہ کی جانب روانہ ہوئے اور رہا پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں کے اکثر باشندے عیسائی تھے، اُنھوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ رہا کو فتح کرنے کے بعد عیاضؓ حران کی طرف بڑھے اور اسے بھی فتح کر لیا پھر نصیبین پہنچے اور اس پر بآسانی قابض ہو گئے۔ اس کے بعد دیار بکر کا رُخ کیا اور اس علاقہ کو بھی فتح کر لیا۔ دراصل جزیرہ کے عربوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان کے پاس چونکہ طاقت نہیں ہے اس لیے وہ لڑائی میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی متابعت تو قبول کر لی لیکن جزیہ دینے سے معذوری ظاہر کی، اس لیے کہ یہ بات ان کی برداشت سے باہر اور حمیت کے برخلاف تھی کہ وہ اپنے ہم قوم عربوں کو جزیہ دیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی عربی وحدت کو قائم رکھنے اور قبائل عرب کی عصبیت کو تقویت پہنچانے کے لیے یہ منظور فرما لیا کہ ان سے جزیہ کے نام سے کوئی رقم وصول نہ کی جائے۔ لیکن اس کی بجائے جزیہ سے دگنی رقم صدقہ کے نام سے وصول کی جائے گی۔

ان قبائل نے اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت عمرؓ نے انھیں اپنی زمینوں پر واپس آنے اور کھیتی باڑی کرنے کی اجازت دے دی۔

۲۱ھ تک عربوں اور ایرانیوں میں مقابلہ جبال حمرین[1] کے مغرب میں عراق عرب اور جنوب میں اہواز اور اصطخر کے علاقوں تک محدود رہا۔ حضرت عمرؓ نہ چاہتے تھے کہ اسلامی فوجیں اپنا قدم اور آگے بڑھائیں لیکن یزدجرد شاہِ ایران اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کا زبردست خواہشمند تھا اس لیے وہ قبائل کو عربوں کے خلاف بغاوت کرنے پر برابر اکساتا رہا اور ان کی مدد کے لیے فوجیں بھی بھیجتا رہا۔ آخر حضرت عمرؓ نے اس فتنہ کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ مسلمان عراق اور اطراف فارس میں اس وقت تک اطمینان سے نہ بیٹھ سکیں گے جب تک یزدجرد اور اس کے لشکر کا خاتمہ نہ کر دیا جائے۔ اسی دوران میں آپ کو یہ خبر بھی ملی کہ نہاوند کے قریب ایرانی فوجوں کا ایک لشکرِ جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہو رہا ہے۔ یہ خبر سن کر حضرت عمرؓ نے عاملِ بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ آپ کے پاس جتنی فوج ہے اسے لے کر ایرانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہو جائیے۔ کوفہ کے عامل حذیفہ بن یمان کو بھی اسی مضمون کا خط لکھا۔ ان دونوں لشکروں کا امیر نعمان بن مقرن کو مقرر کیا اور انھیں لکھا:

> "مجھے خبر ملی ہے کہ ایرانیوں کا ایک کثیر لشکر تمھارے مقابلہ کے لیے نہاوند میں جمع ہوا ہے جب تمھیں میرا یہ خط ملے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت پر بھروسا کرتے ہوئے اسلامی لشکر کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ دیکھو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سختی نہ کرنا جس سے انھیں تکلیف پہنچے۔ کسی کا حق نہ مارنا اور انھیں ہمیشہ خطرناک مواقع سے بچانا، کیونکہ میرے نزدیک ایک مسلمان کی جان، ایک لاکھ دینار سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔"

جب حضرت نعمانؓ کو یہ خط ملا تو وہ تیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ کوفہ سے روانہ ہوئے۔ ان کے لشکر میں کئی بڑے بڑے صحابہؓ اور قبائلِ عرب کے سردار شامل تھے۔ لشکر نے نہاوند کے قریب پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔ نہاوند جبالِ حمرین کے دامن میں واقع ہے۔ ایرانیوں نے جنگ کی زبردست تیاریاں کی تھیں اور اپنے اردگرد خندقیں کھود لی تھیں۔ نعمانؓ نے اپنے جاسوسوں کو بھیجا کہ وہ تمام حالات کا پتا چلائیں۔ جاسوس خبر لے کر آئے کہ ایرانیوں نے قلعہ کے چاروں طرف کانٹے بچھا دیے ہیں اور اپنے خیال میں بڑے محفوظ ہو کر بیٹھے ہیں۔

نہاوند میں نعمانؓ کو برابر کمک پہنچ رہی تھی وہ لوگ جو قادسیہ کی جنگ میں حاضر نہیں تھے اور اس میں شرکت کے فخر سے محروم رہ گئے تھے اُنھوں نے اس داغ کو مٹانے کے لیے دھڑا دھڑ نہاوند پہنچنا شروع کیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح جنگِ قادسیہ کے نتیجہ میں عرب عراق کے طول و عرض، فارس کی حدود اور اس کے اطراف و جوانب، حتیٰ کہ دارالحکومتِ ایران

---

[1] جبالِ حمرین موجودہ زمانہ میں عراق اور ایران کی حدِ فاصل ہے۔

مدائن پر قابض ہو گئے تھے اسی طرح جنگِ نہاوند کے نتیجہ میں ان کے لیے تمام ملک ایران کو فتح کرنے کا راستہ صاف ہو گیا۔

نعمان نے اپنے لشکر کی تنظیم کی۔ میمنہ پر حذیفہ بن یمان، میسرہ پر سوید بن مقرن، مقدمہ پر نعیم بن مقرن، مجردہ پر قعقاع اور ساقہ پر مجاشع بن مسعود کو مقرر کیا اور خود قلبِ لشکر کی قیادت سنبھالی۔

ایرانی قلعہ بند تھے کبھی کبھی شہر سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور پھر قلعہ میں گھس جاتے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مسلمان سرداروں نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ کل صبح مسلمانوں کا ایک دستہ ایرانیوں سے لڑنے کے لیے جائے اور جب لڑائی شروع ہو تو اس طرح آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا رہے جس سے ظاہر ہو کہ اس میں ایرانیوں سے لڑنے کی تاب نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر ایرانی ان پر دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آئیں گے۔ جب وہ اصل اسلامی لشکر کے قریب آ جائیں تو چند دستے ان کی پشت پر جا کر ان کا راستہ کاٹ دیں اور پھر ان پر دونوں جانب سے حملہ کر دیا جائے۔ اس طرح ایرانی دونوں طرف سے گھر جائیں گے اور ان کے لیے بھاگنے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔

اس تجویز کے مطابق نعمانؓ نے قعقاعؓ کو ایرانیوں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ اُنھوں نے اسی حکمتِ عملی سے کام لیا اور اپنے دستہ کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے۔ ایرانیوں نے خیال کیا کہ مسلمان ہمارے حملہ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے اپنے قلعہ کی حدود سے باہر نکل آئے۔ قلعہ میں سوائے پہرہ داروں کے اور کوئی باقی نہ رہا۔

قعقاع پیچھے ہٹتے ہوئے اس جگہ تک آ گئے جہاں نعمان کی قیادت میں باقی اسلامی لشکر چھپا ہوا تھا۔ نعمان نے حکم دے دیا تھا کہ جب تک وہ حکم نہ دیں کوئی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ اسلامی لشکر نے اپنے سردار کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ ایرانی برابر تیر برسا رہے تھے اور ان کی تیر باری سے سیکڑوں مسلمان شہید ہو گئے تھے، لیکن جب تک نعمان نے حکم نہ دیا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد نعمان نے دستور کے مطابق تین نعرے لگائے۔ تیسرے نعرے پر فوج نے ایرانیوں پر زبردست حملہ کر دیا۔ ایرانی فوج دونوں طرف سے مسلمانوں کے نرغہ میں آ گئی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ دونوں فوجوں میں شدید مقابلہ ہوا اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ایسی ہولناک لڑائی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی زوال سے لے کر جھٹپٹے تک اتنے ایرانی قتل ہوئے کہ ان کی لاشوں سے میدان پٹ گیا اور اس قدر خون بہا کہ سپاہی تو علٰحدہ رہے گھوڑوں تک کے پیر پھسلنے لگے۔ چنانچہ امیرِ لشکر نعمان کا گھوڑا پھسلا اور وہ بھی اس کے ساتھ زمین پر گرے۔ زخموں سے پہلے ہی چور تھے، جانبر نہ ہو سکے ان کے بھائی سواد نے جب یہ دیکھا تو خود ان کا لباس پہنا۔ جھنڈا حذیفہ بن یمان نے پکڑ لیا۔ اس طرح لوگوں کو نعمان کی شہادت کا پتا نہ چلا اور مسلمان یہ سمجھتے ہوئے کہ ہمارا سردار ہمیں لڑا رہا ہے، بے جگری سے لڑتے رہے رات ہوئی تو جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ ایرانیوں نے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ان کا بھاگنا بالآخر ان کی طاقت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ قعقاع نے ایرانیوں کا ہمدان تک تعاقب کیا۔

اس فتح نے نہاوند کے آس پاس کی آبادیوں کو سخت خوفزدہ کر دیا۔ اُنھوں نے حذیفہ بن الیمان کی خدمت میں آ کر

امان اور صلح کی درخواست کی۔ مسلمانوں کو نہاوند میں کثیر مال و متاع اور سونے چاندی کے مرصع زیورات ملے۔ یہ مالِ غنیمت امیرالمومنین کی خدمت میں خمس ارسال کرنے کے بعد فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ امیرالمومنین کو جب نعمان بن مقرن کی شہادت کی خبر ملی تو آپ بے اختیار رو پڑے اور خاصی دیر تک روتے رہے۔ آپ نے اسلامی لشکر کو ہدایات بھیجیں کہ وہ فتح نہاوند پر ہی بس نہ کریں بلکہ سرزمین ایران میں پھیل کر اسے پوری طرح اپنے قبضہ میں لے لیں تاکہ فتنہ و فساد کی جڑ پورے طور پر کٹ جائے اور ہر وہ قوت جو اسلام اور عرب کے مقابلہ پر ہے پوری طرح نیست و نابود ہو جائے۔[۱]

مورخینِ عرب میں سے مسٹر بخیمن اس معرکہ کا حال بایں طور بیان کرتے ہیں:

"معرکۂ جلولاء کے بعد یزدجرد شاہِ ایران شمالی ایران کے ایک شہر رَے[۲] میں آکر مقیم ہو گیا اور اسے ایرانی شہنشاہی کا دارالحکومت اور اپنے لشکر کی چھاؤنی بنا لیا۔ اس کے بعد اپنے سرداروں کو، جو پہلے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہر بار ہزیمت اٹھا چکے تھے، حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے حملوں کی مدافعت کے لیے اپنی ہر تدبیر بروئے کار لائیں اور حلوان کو آخری دم تک اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ لیکن اس کے سرداروں نے اپنے بادشاہ کے احکام پر مطلق دھیان نہ دیا جس کا خمیازہ انھیں جلدی ہی بھگتنا پڑا اور حلوان جیسا مضبوط شہر مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

اس کے باوجود یزدجرد نے ہمت نہ ہاری اور ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکنے اور ان کے لشکروں کو عرب تک دھکیلنے کی کوشش میں معروف رہا۔ اس کی ہمت و جرأت نے جنوب میں ہرمزان کو بھی حوصلہ دلایا اور وہ کئی ماہ تک عربوں کے مقابلہ میں ڈٹا رہا۔ کئی مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہرمزان اور عربوں کے درمیان جو معرکے ہوئے ان کی تعداد اسّی تک پہنچتی ہے اور ان معرکوں کے بعد ہی عربوں کے لیے اہواز پر چڑھائی کرنا اور اس پر فتح پانا ممکن ہوا۔

ہرمزان کی شکست کے بعد کسریٰ فارس نے ان عربی لشکروں کے مقابلہ کے لیے جو اب خاص سرزمینِ ایران پر حملہ کرنا چاہتی تھیں، بڑی زبردست قوت جمع کرنی شروع کی۔ اس کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار نفوس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس لشکر نے نہاوند پہنچ کر خندقیں کھود لیں اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے جم کر بیٹھ گیا۔

یزدجرد نے ایرانی فوجوں کا سپہ سالار فیروزان کو مقرر کیا جو قادسیہ کی جنگ میں بھی ایرانی لشکر کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔ نہاوند کی طرف سے آنے والے اسلامی لشکر کی قیادت نعمانؓ بن مقرن کے سپرد تھی

---

[۱] تاریخ معرکۂ نہاوند

[۲] رَے کا شہر موجودہ شہر طہران کے بالکل قریب واقع ہے۔

اور اس کی تعداد تیس ہزار تھی۔ نعمانؓ نے نہاوند پہنچ کر اس بات کی کوشش کی کہ فیروزان ان کے لشکر کے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلے۔ لیکن فیروزان نے عافیت اور بھلائی اسی میں دیکھی کہ اس کا لشکر اپنے قلعوں میں، خندقوں کے پرے ہی جما بیٹھا رہے اور عرب اس وقت تک چٹیل میدان میں پڑے رہیں، جب تک ان کا زادِ راہ ختم نہ ہو جائے، اور وہ تھک کر چور نہ ہو جائیں۔

لیکن نعمان بھی فنونِ جنگ کی مہارت میں کسی سے کم نہ تھے۔ ان کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور انھوں نے لشکر میں یہ بات پھیلا دی کہ انھیں خلیفہ کی وفات کی خبر ملی ہے جس سے وہ بے حد مضطرب ہیں اور اب مجبوراً لشکر کو واپس جانا پڑے گا۔

چنانچہ وُہ اپنی فوج کو لے کر عراق کی جانب چل پڑے۔ فیروزان بھی اسلامی لشکر کے پیچھے نکل کھڑا ہوا لیکن اس کی فوج نہایت بے ترتیبی اور پراگندگی کی حالت میں تھی۔ نعمان کو ان تمام حالات کا پتا چل گیا۔ تین دن کے بعد اسلامی لشکر ایک وسیع میدان میں پہنچا وہ پُوری طرح منظم اور لڑائی کے لیے ہمہ تن تیار تھا نعمان نے ایرانی لشکر کا انتظار کیا اور جب وُہ بھی اس جگہ پہنچ گیا تو اسلامی لشکر نے پلٹ کر اس پر بڑی شدّت سے حملہ کر دیا جس سے ایرانی لشکر بدحواس ہو گیا۔ فیروزان مارا گیا اور ایرانیوں پر اس قدر رُعب طاری ہُوا کہ وہ بُری طرح واپس بھاگے لیکن اکثر قتل ہُوئے۔ عربوں میں اپنے قائد (نعمان) کی وفات سے اور بھی زیادہ جوش پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے ہزیمت خوردہ لشکر کا پیچھا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ہمدان پہنچ گئے۔ ہمدان والوں نے بغیر لڑے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، اور ہمدان خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔"

"تاریخ التواریخ (HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD) مطبوعہ انگلستان میں فتوحاتِ عربیہ کے باب کا مورّخ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ یزدجرد نے نہاوند میں لشکر جمع کیا اور فیروزان کو اس کی قیادت سپرد کی۔ اس کا کہنا ہے کہ عراق میں اسلامی فتوحات اور مدائن کے اسلامی قبضہ میں آ جانے کے بعد یزدجرد پہاڑوں میں بھاگ گیا تھا لیکن اس کے لشکر کے سردار اور دوسرے وطن پرست ایرانی بطورِ خود نہاوند میں جمع ہُوئے اور اپنی تہذیب و تمدّن مذہب اور وطن کو بچانے کی خاطر مسلمانوں کے مقابلہ کا ارادہ کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ معرکۂ نہاوند نے ایرانیوں کی کمر توڑ دی۔ اس لڑائی کے بعد عربی لشکر کو ایران میں اور کوئی بڑا معرکہ پیش نہیں آیا۔ اردگرد کے علاقے نہایت آسانی کے ساتھ فتح ہوتے گئے اور سارے ایران پر قبضہ کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ احنف بن قیس تمیمی خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ مجاشع بن مسعود السلمی نے اردشیر اور سابور کا رُخ کیا۔ عثمان بن ابی العاص الثقفی اصطخر پہنچے ساریہ بن زنیم الکنانی فسا اور دارابجرد کو فتح کرنے میں مشغول ہُوئے۔ سہیل بن عدی کرمان آئے۔ عاصم بن عمرو سجستان اور حکم بن عمیر التغلبی مکران پر قابض ہو گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ان میں سے بعض لوگوں کی امداد کے لیے کوفہ سے لشکر بھی بھیجے۔ چنانچہ سہیل بن عدی کی امداد کے لیے عبداللہ بن عتبان کو، احنف بن قیس کی امداد کے لیے عبداللہ بن عمیر الاشجعی کو اور حکم بن عمیر کی امداد کے لیے شہاب المخارق کو روانہ کیا۔ لشکروں کی روانگی کے بارے میں اُوپر جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف یہی لشکر، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، ایران کی فتح کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ان لشکروں کے علاوہ بھی اور کئی فوجیں، جو تعداد اور سامانِ جنگ کے لحاظ سے متذکرۃ الصدر لشکروں سے بڑھ چڑھ کر تھیں، حضرت عمرؓ کے حکم سے ایران پہنچی تھیں۔ بصرہ کا لشکر اہواز اور اصطخر سے عبداللہ بن عتبان کی سرکردگی میں جنوبی سمت سے فوجی سرگرمیاں شروع کرنے کے ارادے سے جنوبی ایران کو فتح کرنے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے یہ اصفہان پہنچا اور اسے سر کر لیا اس کے باشندوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ وسط ایران سے نعیم بن مقرن کوفہ کے لشکر کو لیے آگے بڑھے اور خراسان پہنچے قزوین فتح کیا۔ شمالی علاقہ کو فتح کرنے کے لیے جو لشکر روانہ ہوا اس کے سردار عتبہ بن فرقد موصل سے چلے اور اربیل، روانڈوز کا راستہ اختیار کیا۔ بکیر بن عبداللہ حلوان سے چلے۔ ان دونوں کو آذربائیجان[1] فتح کرنے کا حکم ہوا تھا۔ یہ دونوں لشکر اپنے اپنے مقررکردہ راستوں سے گزر کر آپس میں مل گئے۔ ان کا زبردست مقابلہ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے نعیم بن مقرن کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ چنانچہ وہ بھی ان کے ساتھ آکر شریک ہو گئے اور آذربائیجان فتح کر لیا۔

معرکۂ نہاوند کے بعد یزدجرد شاہِ ایران خراسان کے مشہور شہر مروالشاہجان بھاگ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے احنف بن قیس کو خراسان جانے اور اسے فتح کرنے کا حکم دیا۔ جب احنف وہاں پہنچے تو یزدجرد بھاگ کر "مروالروذ" چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے ترکستان کے بادشاہ سے، جو ماوراء النہر میں مقیم تھا، اپنی مدد کے لیے ایک لشکر بھیجنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ترکستان کے بادشاہ نے اس کی مدد کے لیے ایک لشکر روانہ کر دیا۔ یزدجرد نے چین کے بادشاہ کو بھی اسی قسم کا ایک خط لکھا۔ جب احنف کو معلوم ہوا کہ یزدجرد "مروالروذ" میں موجود ہے تو وہ اپنا لشکر لے کر اس طرف چلے۔ یزدجرد وہاں سے بلخ بھاگ گیا۔ لیکن احنف بھی تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ اب یزدجرد کے لیے مقابلہ کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے کچھ ایرانی لشکر جمع کیا اور احنف کے مقابلہ کے لیے میدانِ جنگ میں آ گیا۔ لڑائی ہوئی جس میں یزدجرد کی فوجوں نے شکست کھائی۔ کسریٰ دریائے جیحون کی طرف بھاگا اور اپنی بقیۃ السیف فوج کے ساتھ دریا کو عبور کر لیا۔

یزدجرد نے ابھی دریا عبور کیا ہی تھا کہ ترکستان اور چین سے فوجیں اس کی مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ ان فوجوں کو لے کر یزدجرد نے دوبارہ دریا عبور کیا اور احنف کی فوجوں کے سامنے پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔ دوبارہ لڑائی شروع ہوئی۔ کئی معرکوں کے بعد تاتاری فوجیں شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور یزدجرد کو بھی دوبارہ بھاگنا پڑا۔

---

[1] آذربائیجان کا صوبہ بحرِ خزر (کیسپین) کے مغرب میں ہے۔

اس کے بعد یزدجرد کی ہمت بالکل پست ہوگئی، آئندہ اسے کبھی نیا لشکر مرتب کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہ اپنے وطن سے دور دیار غیر میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس نے کئی بار ایرانیوں کو عربوں کے خلاف اُبھارنے اور بغاوت کرنے کی ترغیب دی لیکن ناکام رہا۔ اگر کہیں بغاوت نے سر نکالا بھی تو اسلامی فوجوں نے اسے فوراً کچل ڈالا۔ یزدجرد دس برس تک اسی جلاوطنی کی حالت میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر حضرت عثمانؓ کے عہد میں مار ڈالا گیا۔

(۸)

فتوحات پر ایک نظر

سیرتِ صدیق میں ان اسباب کا تذکرہ کیا جا چکا ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں کو عراق پر فوج کشی کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توجہ سب سے پہلے مثنیٰ بن حارثہ نے مبذول کرائی تھی۔ چنانچہ حضرت صدیقؓ نے خالدؓ کو جنوبی عراق اور عیاض بن غنم کو شمالی عراق کی طرف بھیج دیا تھا۔ حضرت خالدؓ نے عراق میں بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور کوئی بھی ایرانی لشکر ان کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ حضرت خالدؓ ابھی عراق ہی میں مصروفِ پیکار تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں شام بھیج دیا اور مثنیٰ بن حارثہ ایرانیوں سے جنگ کرنے کے لیے اکیلے رہ گئے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو عراق میں اسلامی لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسلامی فوجیں ایران کے طول و عرض میں چھا گئیں اور ایران کی شہنشاہی کا بڑے عبرت ناک طور پر خاتمہ ہو گیا۔

حضرت عمرؓ کو وحدتِ عربیہ اور قبائلِ عرب کے اتحاد کا بڑا خیال تھا۔ آپ کے نزدیک عربی النسل مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ آپ قبائلِ عرب میں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، باہمی اتحاد بید ضروری سمجھتے تھے کیونکہ اسی طرح ان بیرونی قوتوں کو روکا جا سکتا تھا جو عربوں کو ہر دم استعمار اور غلامی کی دھمکیاں دے رہی تھیں۔

اگرچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے تمام ایران پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود ہم اس عظیم الشان کام کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو اس سلسلہ میں حضرت خالدؓ بن ولید نے سرانجام دیا تھا۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ خالدؓ بن ولید کی اوّلین فتوحات ہی کا اثر تھا جس نے ان ایرانیوں کے دل میں عربوں کا رعب پیدا کر دیا تھا جو اس سے پہلے انھیں انتہائی ذلیل قوم سمجھتے تھے اور جن کے واہمہ میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ عربوں جیسی بھوکی ننگی قوم اُن کا مقابلہ کرنے کی جرأت بھی کر سکتی ہے۔ کجا یہ کہ وہ ان کی ساری سلطنت کو ہی ملیا میٹ کر دیتے۔ خود عرب بھی یہی خیال کرتے تھے کہ کسریٰ اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنا نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے بلکہ اپنے آپ کو ہلاکت اور تباہی کے غار میں گرانا ہے۔ لیکن جب خالدؓ بن ولید کی بے مثل بہادری، جرأت اور قیادت نے ان کے دلوں سے ایرانیوں کا رعب مٹا دیا تو وہ بڑھ چڑھ کر عراقی جنگوں میں حصہ لینے لگے۔

ان جنگوں میں عربوں نے جس دلیری اور بہادری سے کام لیا اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے دلوں میں یہ بات راسخ تھی کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے کام آ گئے تو شہیدوں کی موت مریں گے اور آخرت میں ان کو جنت ملے گی یعنی جنت اور اسلام کی راہ میں شہادت، یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے عربوں میں بہادری اور شجاعت کے جذبات پیدا کر دیے تھے خواہ کتنا ہی شدید مقابلہ کیوں نہ درپیش ہو وہ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہتے تھے۔ جب حملہ کرنے کا وقت آتا تھا تو اس شدت کے ساتھ حملہ کرتے تھے کہ ساری زمین دہل جاتی تھی۔ بہادری کے جو کارہائے نمایاں انھوں نے دکھائے تاریخ عالم میں ان کی نظیر ملنی دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے۔

اس جگہ غنیمتوں کی تقسیم کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔ جنگی قانون کی رُو سے غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے تھے ایک حصہ جس کو خمس کہتے ہیں بیت المال یعنی سلطنت کے خزانہ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں اسے مصالح عامہ پر خرچ کیا جاتا تھا۔ باقی چار حصے لڑنے والے فوجیوں میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ ایران کی جنگوں میں مسلمانوں نے بے حساب مالِ غنیمت حاصل کیا جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض بعض دفعہ مالِ غنیمت میں سے ایک ایک سپاہی کو بارہ بارہ ہزار درہم ملے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی جو عربوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ کبھی اس قدر کثیر مال و دولت پر قابض ہو سکتے ہیں۔

آج کل کے جنگی نظام کی رُو سے سپاہیوں کے سارے اخراجات حکومت پُورے کرتی ہے، سپاہیوں کے کھانے پینے، لباس وغیرہ کا سارا خرچ حکومت کا خزانہ ادا کرتا ہے۔ لیکن صدر اسلام میں سوائے اسلحہ کے، کہ جس شخص کے پاس اسلحہ نہ ہوتے تھے اسے مہیا کر دیے جاتے تھے، باقی تمام اخراجات کا ذمہ دار سپاہی خود ہی ہوتا تھا۔ اگرچہ بے اسلحہ لوگوں کو اسلحہ مہیا کر دیے جاتے تھے تاہم اکثر سپاہیوں کے پاس ان کے اپنے اسلحہ موجود ہوتے تھے۔ ہر سپاہی پر واجب تھا کہ وہ اپنے گھوڑے کی نگہداشت رکھے۔ اور اس کے لیے خوراک اور زین وغیرہ مہیا کرے۔ سپاہی یہ اخراجات مالِ غنیمت میں سے پُورے کرتے تھے۔ شارع نے بھی یہ قاعدہ بنا دیا تھا کہ غنیمت میں سوار کا حصہ پیدل سے زیادہ ہوگا۔

سیرتِ صدیقؓ میں ہم نے بعض ان اسباب کا ذکر کیا تھا جنھوں نے عربوں کی فتوحات میں مدد دی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ان فتوحات کا سب سے اہم سبب بہادری کا وہ بے پناہ جذبہ تھا جو ہر عرب سپاہی کے دل میں موجزن تھا۔ یہ درست ہے کہ ایرانی سپاہی تنخواہ دار ہوتے تھے اور یہی ان کی کمزوری کا بڑا سبب تھا۔ یہ بات عقل میں آنے والی نہیں کہ وہ سپاہی اس عقیدہ کے راستہ میں جوش و خروش اور خلوص سے لڑ سکے جس پر اسے ایمان نہ ہو، جس کو وہ سرے سے کوئی اہمیت ہی نہ دیتا ہو۔ وہ لوگ مال و دولت کے لالچ میں لڑتے تھے اور لڑائی میں اسی وقت جم سکتے تھے جب دشمن طاقت و قوت میں ان سے کم تر ہو۔ لیکن اگر مقابلہ سخت ہوتا تو یہ تنخواہ دار سپاہی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگنے کو ترجیح دیتے تھے۔

اس کے علاوہ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ جس زمانہ میں اسلامی فوجوں نے ایرانی علاقے پر حملہ کیا اس زمانہ میں ایران خود اپنے داخلی تنازعات میں بُری طرح اُلجھا ہُوا تھا۔ اس کے علاوہ یرانیوں اور رُومیوں میں جو شدید جنگیں ہو چکی تھیں انھیں بھی دونوں طاقتوں کو کمزور کرنے میں بہت بڑا دخل تھا۔ لیکن ان تمام !توں کے باوجود یہ بات کسی طرح خیال میں آنے والی نہیں کہ عرب اتنی طاقت کے مالک تھے کہ وُہ ایرانیوں پر غالب آسکتے تھے۔

برانی لاکھ کمزور سہی، طاقت و قُوت میں ان کا اور عربوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ عرب اپنی تمام کوشش کے باوجود دس ہزار سے زیادہ سپاہی میدان میں نہیں لا سکتے تھے لیکن ایرانی بڑی آسانی سے پچاس پچاس ہزار سپاہی عربوں کے سامنے لا کر کھڑے کر دیتے تھے یکن طاقت و قوت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہونے کے باوجود وہ کمزور اور غریب عربوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور چند سال میں ان کی سلطنت صفحۂ ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابُود ہو گئی۔

مسلمانوں کو ایران فتح کرنے میں سات سال کا عرصہ لگا۔ اس عرصہ میں وُہ دریائے فرات سے لے کر دریائے جیحون تک، جو آج کل کی طرح قدیم زمانے میں بھی ایران اور افغانستان کی حدِ فاصل تھا، ایرانیوں سے برسرِ پیکار رہے اور ایران کا چپہ چپہ فتح کر لیا۔ دریائے جیحون پر آ کر وہ رُک گئے کیونکہ حضرت عمرؓ نے انھیں آگے بڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ عہدِ اُموی میں آ کر مسلمان دریائے جیحون کو عبور کر کے افغانستان کے علاقے میں داخل ہُوئے اور وہاں اسلام کا جھنڈا گاڑا۔

عرب ایرانیوں اور رومیوں سے ایک ہی وقت میں برسرِ پیکار تھے۔ کئی کئی محاذوں پر بیک وقت لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ مملکتِ ایران کو فتح کرنے میں جو دیر لگی اس کی یہی وجہ تھی۔ اگر عربوں کو صرف ایرانیوں سے ہی لڑائی درپیش ہوتی تو کبھی لڑائی اتنا طُول نہ کھینچتی اور ایرانی اتنے سال تک کبھی عربوں کے لیے دردِ سر نہ بنے رہتے۔

ان جنگوں میں عربی سپہ سالاروں نے جس جرأت اور جس جنگی مہارت کا ثبوت دیا وُہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ان سپہ سالاروں میں سب سے ممتاز حضرت خالدؓ بن ولید ہیں۔ یہ آپ کے بے نظیر حُسنِ تدبر ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ جس لشکر میں شامل ہوتے اسے کبھی شکست کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور وُہ ہر میدان میں کامیاب رہا۔ خالدؓ بن ولید کے بعد جس دُوسرے سپہ سالار کا نمبر آتا ہے وہ مثنیٰ بن حارثہ ہیں۔ وُہ بھی جرأت، بہادری اور حُسنِ تدبیر میں اپنا جواب آپ ہی تھے۔ اُنھوں نے اپنی وفات کے قت سعدؓ بن ابی وقاص کو جو مشورے دیے تھے بعد میں وہی مشورے حضرت عمرؓ نے بھی انھیں دئے۔

سعدؓ بن ابی وقاص بھی ایک عظیم سپہ سالار تھے۔ انھوں نے جنگِ قادسیہ کے موقع پر جس طرح لشکر کی تنظیم کی تھی س نے مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا تھا اور اسی جنگ میں فتح یاب ہونے کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے بے حد نند ہو گئے اور انھوں نے چند ہی برس میں سارے ایران پر قبضہ کر لیا۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ وُہ ہر کام میں خلیفہ کی ہدایات کے عتاج تھے۔ جب تک خلیفہ کی طرف سے ان کو احکام موصول نہ ہو جاتے تھے وُہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھے اپنے سپہ سالاروں کو آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے، کسی جگہ ٹھہرنے اور دشمن پر حملہ کرنے کے احکام بھیجا کرتے تھے ورفوج ان احکام کے مطابق عمل کر کے ہمیشہ فتح یاب اور مظفر و منصور ہوا کرتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی فتح کا فخر اگر

کسی کے حصہ میں آسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف حضرت عمرؓ ہی ہیں ۔

(۹)

شام اور فلسطین پر عربوں کی یلغار

سیرتِ صدیقؓ میں ہم نے معرکۂ یرموک کا تفصیل سے ذکر کر دیا تھا۔ اگر بعض عرب مورخین کے قول کے بموجب یہ مان بھی لیا جائے کہ یرموک کی جنگ ۱۳ھ میں پیش آئی تھی تب بھی بوجہ اس کے کہ یہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی تھی اس میں مسلمانوں کی کامیابی کا فخر حضرت عمر فاروقؓ کے حصہ میں آتا ہے۔ کیونکہ جن مورخین نے ۱۳ھ میں جنگِ یرموک کا ہونا بیان کیا ہے، اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ لڑائی ابھی جاری ہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا خط پہنچا جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کی خبر دی گئی تھی۔ یہ لڑائی ایک روز سے زیادہ جاری نہیں رہی[۱]

---

[۱] LAURENCE OLIPHANT اپنی کتاب THE LAND OF GILEAD میں اپنی سیاحتِ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اثنائے سیاحت میں اسے شوق پیدا ہوا کہ وہ یرموک کو بھی جا کر دیکھے جہاں رومیوں اور عربوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں گیا اور اس دریا کے کنارے بیٹھا جو سرزمینِ یرموک کے برابر سے گزرتا ہے اس کے قریب ہی ایک قدیمی شہر کے آثار ہیں جس کا نام یرموث ہے۔

"واقوصہ" اس جگہ کا نام ہے جس میں معرکۂ یرموک پیش آیا۔ اس کو تین اطراف سے دریا محیط ہے اور چوتھی جانب ایک تنگ گھاٹی ہے۔ جنگ کے وقت رومی اسی زمین پر تھے جو دریا سے گھری ہوئی تھی، عربوں نے اس تنگ گھاٹی پر قبضہ کر لیا۔ اب رومی لشکر کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ جب تک عرب فوج کو شکست نہ دے۔ لے اس تنگ گھاٹی سے نکل سکے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو رومیوں نے شکست کھائی اور عرب ان کو دریا کی طرف دھکیلتے چلے گئے جس سے ہزاروں آدمی غرقاب ہو گئے۔[۱]

[عہ جیلمان، "تاریخ العرب (انگریزی) ص ۲۳۱]

معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یرموک شام کی ایک وادی ہے جو غور تک بڑھتی چلی آئی ہے۔ اس کا پانی اردن میں گرتا ہے اور پھر بہہ کر بحیرۂ متعفن (لوط) میں چلا جاتا ہے۔

سید امیر علی اپنی کتاب "تاریخِ اسلام" میں یرموک کے متعلق لکھتے ہیں: "یرموک ایک گمنام سا دریا ہے جو حوران کی بلندیوں سے نکل کر جھیل طبریہ کے جنوب میں چند میل ورے دریائے اردن سے مل جاتا ہے۔ جائے اتصال سے تیس میل اوپر بجانبِ شمال یہ دریا نیم دائرہ کی شکل میں ایک میدان کے گرد گھومتا ہے جس میں ایک بڑی فوج قیام کر سکتی ہے۔ یرموک کے کنارے ناہموار اور ڈھلوان ہیں۔ چکر کے سرے پر ایک گھاٹی ہے جو میدان کے دروازے کا کام دیتی ہے۔ اس جگہ کو "واقوصہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اسے اسلامی تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔

معرکۂ یرموک کس طرح پیش آیا؟ ——— جب عربوں نے رومی علاقے پر حملے شروع کیے تو شروع شروع میں رومیوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ معمولی بدوی حملے ہیں اور جب سرحدی شہروں کے باشندے ان کو منہ توڑ جواب دیں گے تو اعراب خود بخود اپنے صحراؤں میں واپس ہو جائیں گے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عرب ان کے شہر پر شہر فتح کیے جا رہے ہیں اور مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کا باقاعدہ انتظام کر رہے ہیں تب اُنھوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھا۔ قیصر کے حکم سے ایک زبردست لشکر تیار کیا گیا جسے یرموک میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔[1]

جیسا کہ سیرتِ صدیقؓ میں بھی بیان ہو چکا ہے معرکۂ یرموک کی تاریخ میں زبردست اختلاف ہے۔ کوئی اسے ۱۳ھ میں بتاتا ہے اور کوئی ۱۵ھ میں۔ جرمنی کے مستشرق نولڈیکی نے اپنی کتاب میں سریانی زبان کی ایک کتاب کے ورق کی عبارت درج کی ہے اور اس کی مدد سے اس مشکل کو حل کرنا چاہا ہے۔ یہ کتاب جس میں شام میں عربوں کی فتوحات کا حال بیان کیا گیا تھا ضائع ہو چکی ہے صرف وہ ورق باقی رہ گیا تھا لیکن وہ بھی مکمل حالت میں نہیں۔

ہم بھی اس ورق کی عبارت کو درج کر دیتے ہیں۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معرکۂ یرموک ۱۲ رجب ۱۵ھ کو پیش آیا۔

سطریں	عبارت
۱-۸	.... مبہم سطریں
۹ -	.... حمص اور کئی دوسرے شہر برباد ہو گئے اور ان کے رہنے والے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔
۱۰ -	.... محمد.. اور کثرت سے لوگ قتل کیے گئے اور قیدی بنائے گئے۔
۱۱ -	...... جلیل سے بیت .... تک
۱۲ -	عرب (دمشق کے؟) اطراف میں پھیل گئے[2]
۱۳ -	اور ہر جانب ہلہ بول دیا
۱۴ -	اور آئے ..... اور .... ان کی طرف .... اور ...... میں
۱۵-۱۶ -	سنہ ...... ۲۰ میں لشکر کا ہراول دستہ حمص سے روانہ ہوا اور اس نے بھیڑوں کے ریوڑ کے ریوڑ لوٹ لیے۔
۱۷-۱۸ -	...... "شہر آب" کی دسویں تاریخ کو رومی دمشق سے بھاگ گئے۔

---

[1] معرکۂ یرموک کا مفصل حال "سیرتِ صدیقؓ" میں بیان ہو چکا ہے۔

[2] نولڈیکی کا خیال ہے کہ یہاں "اطراف" سے مراد "دمشق کے اطراف" ہیں۔

۱۹ - ان کی تعداد دس ہزار تھی۔

۲۰ - ۲۲ - ایک سال کے بعد ۹۴۷ء میں شہر آب کے مہینہ کی بیس تاریخ کو رومی "جابیہ" میں جمع ہوئے لیکن شکست کھائی اور پچاس ہزار کے قریب رومی مارے گئے۔

۲۴ - ۹۴۷ء میں ۰۰۰۰۰ (۱)

۲۵ - ۰۰۰۰۰ اور منتشر ہو گئے

۲۶ - ... ... خوش ہوئے

۲۷ -

۲۸ -

۲۹ - ...... اور رومی دل شکستہ ہو گئے۔

نولڈیکی لکھتا ہے کہ جس کتاب کا یہ ورق ہے اس کا مصنف "خلیل" یا "دمشق" کا کوئی راہب ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ جنگِ یرموک کے موقعہ پر موجود تھا یا اس نے دوسروں کی نقل کی ہوئی روایات ہی پر اکتفا کیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عبارت واقعۂ یرموک کے بالکل قریب لکھی گئی ہے۔ اس سے معرکۂ یرموک کی تاریخ کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ سریانی مولف نے یہ تاریخ ۲۰ شہر آب ۹۴۷ء سیلوکیدی (مطابق اگست ۶۳۶ء) لکھی ہے جو سنہ ہجری کے لحاظ سے ۱۲ رجب ۱۵ھ بنتی ہے۔

سیلوکیدی سنہ اس زمانہ میں ایشیائے کوچک، عراق، شام اور فلسطین کی کئی قوموں میں رائج تھا۔ یہ سنہ ۳۱۲ ق م میں سکندر کی وفات کے بعد اس وقت رائج کیا گیا تھا، جب سیلوکس شام میں تخت نشین ہوا۔ بلاذری نے بھی اپنی کتاب "فتوح البلدان" میں اس سنہ کے مہینوں کا ذکر کیا ہے گو اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سنہ کس طرح رائج ہوا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بلاذری نے اپنی تمام معلومات کا مرجع واقدی کو ٹھہرایا ہے اور واقدی کو اپنی کتاب تصنیف کرتے وقت اس کا علم نہ تھا۔

اس سریانی صحیفہ میں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے مولف نے اکیسویں سطر میں بجائے یرموک کے "جابیہ" پر فوجوں کا اکٹھا ہونا بیان کیا ہے حالانکہ جابیہ دریائے یرموک کے کنارے سے بہت دور واقع ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ پہاڑوں اور غاروں کے ایک سلسلہ کی وجہ سے جو جابیہ سے لے کر یرموک تک پھیلے ہوئے ہیں، عرب جابیہ کو یرموک کے منطقہ ہی میں شمار کرتے تھے۔ جابیہ کا ذکر غسانیوں کی تاریخ میں بار بار آتا ہے۔

شام کی زمین عراق کی زمین سے بہت کچھ مختلف تھی۔ عراق کی زمین عرب کی طرح ریتلی تھی اس لیے عربوں کو اس پر چلنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہوتی تھی اور وہ بآسانی دشمن کے مقابلہ میں جم سکتے تھے۔ لیکن شام کی زمین پہاڑی اور سخت تھی عربوں کے لیے ایسی زمین پر چلنا اور اس پر دشمن کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ ازیں شام کے اکثر شہروں کے گرد فصیلیں کھنچی ہوئی تھیں جیسے معان، کرک، بصریٰ، دمشق، حمص وغیرہ۔

جس وقت عربوں نے شام میں اپنے حملوں کا آغاز کیا تو عرب کے عیسائیوں کو بعید تشویش ہوئی۔ ہر چند وہ اس رومی سیاست کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے جس کا دائرہ ان کے قبیلوں تک بھی وسیع تھا لیکن اس کے باوجود وہ رومیوں کی اطاعت کا جو اس وقت تک اپنے سروں سے اتارنے کے لیے تیار نہ تھے جب تک وہ نئے حاکموں کی سیاست اور ان کے عادات و خصائل سے کُلی طور پر واقف نہ ہو جائیں، وہ اس بات کا اطمینان چاہتے تھے کہ نئے حاکم آ کر کہیں انھیں اپنے مظالم کا نشانہ تو نہیں بنائیں گے۔ شروع میں بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمان محض لُوٹ مار کی خاطر جنگ کرنے آئے ہیں۔ لیکن جب عربوں نے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا تو ان عرب عیسائیوں کو پتا چلا کہ مسلمان اپنے ساتھ وُہ اخلاق، وُہ عدل اور وہ نظام لے کر آئے ہیں جس سے وُہ آج تک آشنا ہی نہیں تھے اور اس کی مثال بھی رومیوں کے عہد میں ملنی ناممکن تھی۔ جب انھیں مسلمانوں کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان ہو گیا اور انھوں نے حقیقی عدل و انصاف کا مزا چکھ لیا تو وہ دل و جان سے مسلمانوں کے حامی ہو گئے اور ہر ممکن طریقہ سے اسلامی لشکر کی مدد کرنے اور انھیں سامانِ خوراک اور مختلف معلومات بہم پہنچانے لگے۔ اکثر لوگوں نے مسلمانوں کے بے نظیر عدل و انصاف، اخلاق اور عملی نظام کو دیکھ کر اسلام بھی قبول کر لیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایک قوم ہونے کی وجہ سے عرب عیسائیوں کے دل طبعی طور پر عربوں کی طرف مائل تھے۔ لیکن اس تعلق کا اظہار اسی وقت ہوا جب اُنھوں نے مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ان کے عدل و انصاف اور ضبطِ نفس کو بچشم خود دیکھ لیا۔ مختلف طبقوں کے درمیان تعلقات کی استواری محض قومیت کے ایک ہونے پر منحصر نہیں ہوتی۔ قوموں کی زندگی کا دار و مدار عصبیت پر نہیں بلکہ اخلاق، عدل اور حق و انصاف کے اعلیٰ اصولوں کو برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔

تاریخِ صدیقؓ میں معرکۂ یرموک کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں نے باوجود قلّتِ سامان اور قلّتِ تعداد کے رومیوں کے زبردست لشکر کو شکستِ فاش دی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی زندگی میں شام پر چڑھائی کرنے والے لشکر کو چار حصّوں میں تقسیم کر کے ہر حصّہ کا ایک سردار مقرر کر دیا تھا۔ ادھر حضرت خالدؓ بن ولید کو عراق سے شام میں اسلامی لشکروں کی مدد کے لیے جانے کا حکم دیا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی تو یہ مناسب سمجھا کہ لشکرِ اسلامی پانچ سرداروں کی بجائے ایک قیادت کے ماتحت کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو سارے لشکر کا، جس میں حضرت خالدؓ بن ولید کی امدادی فوج بھی شامل تھی سپہ سالار مقرر فرمایا۔

معرکۂ یرموک کے بعد ہرقل نے اور بھی زور شور سے مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان حالات میں مسلمان سپہ سالاروں نے موزوں طریقِ کار یہ سمجھا کہ جن شہروں کو مسلمان فتح کر چکے ہیں انھیں عارضی طور پر خالی کر دیا جائے۔

ہرقل کے لشکر جنگِ یرموک کے بعد دمشق کی جانب چل پڑے۔ اب کے تیودورس کی جگہ باہان کو رومی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ رومی فوجوں نے بیسان کو اپنا مرکز بنایا اور مسلمانوں نے فحل میں پڑاؤ ڈالا۔ فحل ایک محفوظ مقام تھا، جغرافیائی لحاظ سے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ بحیرۂ طبریہ کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔

موکۂ فحل میں رومیوں اور عربوں کی تھوڑی تھوڑی فوجوں نے حصہ لیا تھا۔ اس جنگ میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار ابوعبیدہؓ شامل نہیں تھے۔ واقدی کے کہنے کے مطابق اس جنگ میں سپہ سالار کے فرائض شرحبیل بن حسنہ نے سرانجام دئیے تھے۔ یہ جنگ ۲۸ ذیقعدہ ۱۳ھ کو ہوئی تھی۔ اس میں رومیوں کو زبردست شکست اٹھانی پڑی اور فحل سے بیسان تک سارے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ ہزیمت خوردہ رومی لشکر، مرج الصفر پہنچا لیکن محرم ۱۴ھ میں اسے وہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب رومی دمشق پہنچے اور اس کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے۔ اس کے دو ہفتے بعد مسلمانوں نے دمشق کے سامنے پہنچ کر اس کا محاصرہ کرلیا۔

(۱۰)

دمشق کا محاصرہ

فتوحاتِ اسلامیہ کے وقت دمشق شام کا ایک مشہور شہر تھا لیکن اس قدر وسیع اور اتنا خوب صورت نہ تھا جتنا آج کل ہے اس کی مساحت کا اندازہ ان فصیلوں کے آثار دیکھ کر ہو سکتا ہے جو آج بھی باقی ہیں۔ ان فصیلوں کی اونچائی بیس قدم اور چوڑائی پندرہ قدم تھی۔ یہ فصیلیں مربع پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ پتھر اتنے بھاری بھاری ہیں کہ بیس پچیس آدمیوں کی ایک جماعت بھی ان کو بمشکل اپنی جگہ سے ہٹا سکتی ہے۔ ان پتھروں کی ہیئت اور بناوٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض رومی زمانے سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں[۱]۔

رومی شہنشاہ دیوکلشیان نے دمشق کو فوجی لحاظ سے مضبوط بنانے اور اس کی دفاعی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے کئی ٹھوس تدابیر اختیار کی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ دمشق کو اپنی مشرقی سلطنت کا اہم فوجی مرکز بنادے تاکہ نہ صرف بیرونی حملوں کا دفاع کیا جا سکے بلکہ یہاں سے ایران اور دُوسرے ممالک پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں بھی بھیجی جا سکیں۔ جب مسلمانوں نے دمشق پر چڑھائی کی تو اس کی فصیلیں بہت اونچی تھیں۔ اس میں لاتعداد کنگرے بنے ہُوئے تھے اور ہر وقت تیر انداز متعین رہتے تھے جو دشمنوں کو فصیلوں کے قریب آنے اور شہر تک پہنچنے سے روکتے تھے۔

فصیل کے چاروں طرف خندق کھدی ہُوئی تھی جو ٹھنڈے پانی سے بھری رہتی تھی۔ اس کا عرض دس سے پندرہ قدم تک تھا۔ شہر کے دروازوں اور فصیل کے دُوسرے حصّوں پر بعض چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہُوئے تھے، یہاں وہ لوگ رہتے تھے جن کے ذمہ شہر کی حفاظت کا انتظام تھا۔

دمشق میں داخل ہونے کے کئی راستے تھے جو خندقوں کے اوپر بنے ہُوئے تھے۔ ہر راستہ کے آخری سرے پر ایک

---

[۱] فان کریمر

دروازہ ہوتا تھا جس پر لوہا منڈھا ہوا ہوتا تھا تاکہ دشمن اس کو آگ لگانے یا توڑنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جب عربوں نے دمشق کا محاصرہ کیا ہے تو ان دروازوں میں سے بعض اچھی حالت میں موجود تھے۔ شہر کے شمالی جانب جو دروازہ تھا اسے باب الفرادیس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ دروازہ سارے کا سارا پتھروں کا بنا ہوا تھا اور اس پر پل بھی نہیں تھا[1]۔ مشرقی جانب جو دروازہ تھا اسے بابِ توما[2] کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ توما شاہِ ہرقل کا داماد تھا اور جس وقت مسلمان دمشق کا محاصرہ کرنے پہنچے ہیں وہ ہرقل کی طرف سے اس شہر کا حاکم تھا۔ اغلباً عربوں نے دمشق فتح کرنے کے بعد اس دروازہ کا نام "بابِ توما" رکھ دیا تھا۔ مغربی جانب جو دروازہ تھا اسے باب الجابیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

خان کریمر کے لکھنے کے مطابق شہر کا اندرونی حصہ بیرونی حصہ کی نسبت بہت خوب صورت تھا۔ دمشق کی سب سے اہم سڑک "دربِ مستقیم" تھی جو مغربی دمشق کو مشرقی دمشق سے ملاتی تھی۔ یہ بابِ توما سے لے کر باب الجابیہ تک سیدھی چلی جاتی تھی۔ اس کی چوڑائی پندرہ قدم تھی۔

اسلامی لشکر دمشق کی فصیل کے سامنے ۱۶ محرم الحرام ۱۴ھ کو پہنچا۔ جب اہلِ دمشق نے مقدمۃ الجیش کو آتے دیکھا تو وہ "غوطہ" اور دمشق کے اطراف سے آکر شہر میں جمع ہو گئے اور دروازوں کو بند کر لیا۔ "غوطہ" اور اس کے گرجے مسلمانوں نے بزور اپنے قبضہ میں کر لیے اور اس کے بعد آگے بڑھ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

مغربی دروازہ (باب الجابیہ) کے سامنے لشکر کے سپہ سالار ابو عبیدہؓ عامر بن الجراح ٹھہرے۔ خالدؓ بن ولید نے مشرقی دروازہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ اس دروازہ کے قریب ہی ایک گرجا تھا جس کا نام "دیرِ صلیبا"[3] تھا لیکن فتحِ دمشق کے بعد اس کا نام "دیرِ خالد" مشہور ہو گیا۔ شرحبیل بن حسنہ "باب الفرادیس" کے سامنے اُترے۔ یزید بن معاویہ نے جنوبی جانب اس جگہ پڑاؤ ڈالا جو بابِ صغیر اور بابِ کیسان کے درمیان ہے۔ عمرو بن العاص کے متعلق بعض مورخین کہتے ہیں کہ وہ اس وقت فلسطین میں تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ شہر کے شمال مشرق میں بابِ توما کے قریب تھے۔

بعض مستشرقین اس تقسیم سے انکار کرتے ہیں۔ اٹلی کا مشہور عالمِ اسلامیات "کیتانی" تو یہاں تک کہتا ہے کہ ابو عبیدہؓ اس زمانہ میں شام میں موجود ہی نہیں تھے[4] لیکن چونکہ مستند روایات کی رُو سے اسی تقسیم کا ثبوت ملتا ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان مستشرقین کی روایت کو کوئی اہمیت دی جائے۔

دمشق کے محاصرہ کے متعلق بعض مستشرقین نے عجیب رائے قائم کی ہے "کارل بکر" اس محاصرہ کے متعلق کہتا ہے کہ عربوں کے پاس اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ دمشق جیسے شہر کا کامل محاصرہ کر سکتے۔ نہ وہ محاصرہ کے فن سے واقف تھے اور

---

۱ سر ولیم میور

۲ ہارٹمن

۳ فتوح البلدان بلاذری ص ۱۲۱، خلافت از سر ولیم میور ص ۱۳۶

۴ تاریخ القرون الوسطیٰ ص ۳۴۴، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۹۰۴

نہ ان میں اس کی استعداد تھی[1]

"لامنس" بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عربوں نے جو محاصرہ کیا تھا وہ بہت نامکمل تھا۔ محاصرہ کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ مسلمانوں کے پاس موجود ہی نہیں تھیں۔ حتیٰ کہ فصیلوں پر چڑھنے کے لیے ان کے پاس سیڑھیاں تک نہ تھیں[2]

اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے اس خیال سے کہ اہلِ دمشق کو شمال کی طرف سے کسی قسم کی امداد نہ مل سکے یا مسلمانوں پر کسی قسم کا حملہ نہ ہو سکے۔ ابو الدرداء عامر بن عویمر خزرجی کو ایک دستہ دے کر برزہ بھیج دیا[3] جو بعلبک کے راستہ میں واقع ہے حمص کی طرف سے کسی کارروائی کے پیشِ نظر ذوالکلاع کو کچھ فوج دے کر دمشق سے ایک منزل کے فاصلہ پر متعین کر دیا۔ چنانچہ ہرقل نے حمص سے جو فوجیں بھیجی تھیں وُہ وہیں روک لی گئیں۔ اسی طرح علقمہ بن حکیم اور مسروق عبسی کو بھی دمشق اور فلسطین کے درمیان مقرر کر دیا گیا تاکہ ادھر سے کسی قسم کی کوئی امداد نہ آنے پائے[4]

محاصرہ کے دنوں میں حاکمِ دمشق کے متعلق مورخین میں بیحد اختلاف ہے۔ طبری کہتا ہے کہ اس کا نام باہان تھا۔ سیف بن عمرو اس کا نام نسطاس بتلاتا ہے، اور ابن اثیر انسطاس۔ ابنِ خلدون کہتا ہے کہ اس کا نام منصور بن سرجون[5] تھا۔ "لامنس" ابن سرجون کے متعلق لکھتا ہے کہ وُہ دمشق کا ایک بہت معزز شخص اور بیزنطینی عہد میں شہر کے مالی معاملات کا نگران تھا[6] پروفیسر دی غوبی لکھتا ہے کہ منصور بن سرجون ہرقل کا مخالف ہو گیا تھا کیونکہ ہرقل نے اسے حکم دیا تھا کہ اگر وہ شہر کا حاکم رہنا چاہتا ہے تو رومی خزانہ میں ایک لاکھ درہم داخل کرے۔ جب ہرقل نے بیزنطینی فوجوں کو باہان کی قیادت میں مسلمانوں کے حملہ کو روکنے کے لیے دمشق بھیجا تو اس موقعہ پر منصور نے لشکر کے ساتھ عجیب و غریب رویہ اختیار کیا۔ اس نے نہ شہر کے خزانہ میں سے فوج کو ایک درہم دیا اور نہ خوراک ہی مہیا کی[7]

بہت ممکن ہے کہ یہ حقائق صحیح ہوں، اس زمانہ میں شام کے عیسائی بیزنطینیوں سے حد درجہ بیزار تھے، کیونکہ بیزنطینیوں نے ان کے علاقہ میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی اور وہاں کے باشندوں پر بڑے ظلم و ستم توڑتے تھے۔

جب مسلمانوں نے شامی علاقوں پر حملہ کیا تو وہاں کے باشندے یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک بادل ہے جو تھوڑے عرصہ کے بعد چھٹ جائے گا اور عرب کچھ مُدت کے بعد اپنے وطن واپس ہو جائیں گے[8] ہرقل اور اس کے سرداران لشکر بھی یہی خیال کرتے تھے ان کو یہ خیال اس وجہ سے بھی پیدا ہوا تھا کہ عربی لشکر کے پاس ہتھیاروں کی بیحد کمی تھی کسی کے پاس تیر ہیں تو تلوار نہیں ہے،

---

[1] تاریخ القرون الوسطیٰ مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی ص ۲۴۲

[2] تاریخِ شام از لامنس جلد اوّل ص ۵۵

[3] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۲۷

[4] طبری ص ۲۱۵۱

[5] تاریخ ابن خلدون جزو دوم ص ۲۲۱

[6] تاریخِ شام ص ۵۶

[7] مذکرہ دی غوبی ص ۸۸، ۸۹

[8] خلفائے اولین از سر ولیم میور ص ۱۴۶

کسی کے پاس نیزہ ہے تو ڈھال نہیں ہے ان باتوں کی وجہ سے شہنشاہ کو یقین ہوگیا تھا کہ دمشق پر مسلمانوں کا یہ حملہ وقتی بات ہے اور کچھ عرصہ کے بعد آپ ہی آپ محاصرہ اُٹھ جائے گا[1]۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں بیزنطینی لشکر ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھا۔ رومی فوجوں کی تعداد بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ اگر مسلمانوں میں قوتِ ایمان اور جذبۂ خلوص نہ ہوتا تو ان کے فتح یاب ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

اہلِ دمشق نے قیصر سے مزید فوجیں بھیجنے کی درخواست کی تھی، جس کے جواب میں ہرقل نے سواروں کی ایک فوج بھیجی۔ لیکن ذوالکلاع حمیری نے، جو حمص اور دمشق کے درمیان ایک دستہ کے ساتھ اسی کام پر مامور تھے کہ اگر کوئی رومی فوج اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آئے تو اسے آگے نہ جانے دیں، اس فوج کو راستہ ہی میں روک لیا اور اسے مجبور ہو کر واپس جانا پڑا[2]۔

گرمی آ چکی تھی اور عرب بڑی سختی کے ساتھ دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سردی آئی اور محاصرہ پھر بھی شدت کے ساتھ جاری رہا۔ سردی گزر کر دوبارہ گرمی آ گئی لیکن مسلمانوں کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔ اس بات کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کہ عرب محاصرہ ختم کر دیں گے۔ جب اہلِ دمشق نے یہ دیکھا تو انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے کے متعلق سوچنا شروع کیا حالانکہ مسلمان فصیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور رومیوں کی قوت و طاقت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

بعض یورپین مورّخ لکھتے ہیں کہ اثنائے محاصرہ میں بیزنطینی فوجوں نے کئی بار باہر نکل کر مسلمانوں پر حملے بھی کیے تھے[3] لیکن عربی تاریخوں میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔

مؤرخینِ دمشق میں مسلمانوں کے داخلہ کی کیفیت کے بارے میں بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اکثر مورخینِ عرب کا کہنا ہے کہ اسلامی فوجیں دمشق کے دو دروازوں سے داخل ہوئیں۔ پہلے دروازے سے لڑتی بھڑتی اور دوسرے دروازے سے صلح و اطمینان کے ساتھ۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ مسلمان شہر میں گھس گئے ہیں تو دوسرا دروازہ خود بخود اس شرط پر کھول دیا کہ انھیں امان دی جائے گی۔ اکثر مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ خالدؓ بن ولید جو لڑتے بھڑتے شہر کے اندر داخل ہوئے تھے، مشرقی دروازے سے اندر گھسے تھے اور ابو عبیدہؓ جنھوں نے عیسائیوں کو امان دینا قبول کر لیا تھا، باب الجابیہ سے داخل ہوئے تھے۔ شہر کے وسط میں دونوں سرداروں کی ملاقات ہوئی۔ خالدؓ کی رائے یہ تھی کہ ہم نے شہر کو لڑ کر فتح کیا ہے اس لیے شہر والوں کو امان نہیں دینا چاہیے۔ لیکن چونکہ ابو عبیدہؓ امن دینے کی شرط پر صلح کر چکے تھے اس لیے مفتوحہ علاقہ میں بھی صلح کی شرطیں تسلیم کر لی گئیں۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ جب شہر کا بچاؤ کرنے والی فوجوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ تو وہ شہر چھوڑ کر چلی گئیں۔ جب شہر والے مایوس ہو گئے تو انھوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ سقوطِ دمشق شہر کے

---

[1] تاریخ عرب از سیدیو ص ۱۰۶

[2] طبری ص ۲۱۵۲ ، خلافت از سر ولیم میور ص ۱۴۶

[3] مذکرۃ دی غوئی ص ۸۲ ، پروفیسر ہٹی ص ۲۳۳

اسقف کی غداری کی وجہ سے ہوا، اور بعض کہتے ہیں کہ جب شہر والوں نے مسلمانوں سے مناسب شرائط پر صلح کر لی تو انھوں نے خود بخود شہر کے دروازے کھول دیے۔ شہر والوں کی طرف سے شرائط شہر کے اسقف اور منصور بن سرجون نے طے کی تھیں۔

طبری فتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دمشق کے بطریق کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے خوشی میں جشن منعقد کیا۔ خوب کھانے پینے، شہر والوں نے اتنی شراب پی کہ ان پر مدہوشی طاری ہوگئی اور وہ بے سُدھ ہو کر پڑ رہے مسلمانوں میں سوائے خالدؓ کے کسی کو اس واقعہ کی خبر نہ تھی۔ انھیں ان کے جاسوسوں نے بتلا دیا تھا کہ دمشق والے کس شغل میں مشغول ہیں۔ انھوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور رسیوں کی سیڑھیاں تیار کرائیں۔ جب دن نکلنے کے قریب ہوا تو وہ قعقاع بن عمرو اور چند اور ساتھیوں کو ساتھ لے کر شہر پناہ کی طرف گئے۔ شہر پناہ کے محافظ بکثرت شراب نوشی کے سبب مدہوش پڑے تھے۔ خالدؓ اور ان کے ساتھیوں نے پانی سے بھری ہوئی خندق کو ایک جگہ سے عبور کیا اور رسیوں کی سیڑھیوں کی کمندیں بنا کر انھیں فصیل کے کنگروں سے اٹکا دیا اور ان کے ذریعے اوپر چڑھ گئے۔ صبح کا وقت تھا اور رومی غافل پڑے سو رہے تھے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ تو نگرانی کرنے لگے اور باقیوں نے اندر سے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ لشکر جو باہر منتظر کھڑا تھا نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گیا۔ عیسائی ہڑبڑا کر اٹھے، دیکھا تو مسلمان شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ خالدؓ مشرقی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ رومی فوراً ابو عبیدہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے صلح کی درخواست کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ رومیوں نے شہر کے باقی دروازے بھی کھول دئے ابو عبیدہؓ وسطِ شہر میں خالدؓ سے ملے اور ان کو بتایا کہ میں نے صلح کر لی ہے اس پر ناچار انھوں نے بھی صلح تسلیم کر لی۔

یہ روایت جو طبری نے سیف بن عمرو سے نقل کی ہے اور اسی قبیل کی اور دوسری روایات کچھ غور و فکر چاہتی ہیں۔ عقل انھیں آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر سکتی، کیونکہ خالدؓ کے حملے کے معاً بعد دمشق والوں کا ابو عبیدہؓ کے پاس دوڑ کے جانا اور ان سے صلح کی درخواست کرنا بہت ہی بعید از قیاس ہے۔ آخر اتنی سُرعت اور اتنی تھوڑی سی مدت میں رومیوں کو یہ خیال کس طرح آیا کہ وہ ابو عبیدہؓ کے پاس جا کر صلح کی درخواست کریں؟ کیا وہ خالدؓ سے، جنھوں نے شہر پر حملہ کیا تھا، صلح کی درخواست نہ کر سکتے تھے؟ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالدؓ کے شہر میں داخلہ سے ابو عبیدہؓ بالکل بے خبر کس طرح ہو سکتے تھے اور کیا وہ اتنی جلدی صلح پر رضامند ہو گئے جبکہ انھیں مطلق پتا نہ تھا کہ دوسری طرف ان کی فوج کے ایک افسر کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؛ کیا عقل اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ خالدؓ دمشق پر حملہ کریں اور ابو عبیدہؓ کو اس کی خبر نہ پہنچیں؟

بعض مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں دو صلح نامے لکھے گئے۔ ایک صلح نامہ خالدؓ کے ساتھ لکھا گیا اور دوسرا ابو عبیدہؓ کے ساتھ۔ لیکن خالدؓ اس وقت اسلامی لشکر کے سپہ سالار نہیں تھے۔ وہ کس طرح بطور خود کوئی معاہدہ کر سکتے تھے؟

واقدی[1] اور بلاذری[2] مندرجہ بالا دونوں روایتوں سے بالکل مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح مستشرقین میں بھی دمشق کی فتح کے بارے میں آپس میں اختلاف ہے۔ سر ولیم میور طبری کی روایت کی تائید کرتے ہیں اور جرمنی کے مستشرق مسٹر ہارٹمن اس کے خلاف واقعہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] فتوح الشام از واقدی ص ۶۲ تا ۷۳

[2] فتوح البلدان از بلاذری ص ۱۲۱

جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمان دمشق میں صلح کے بعد داخل ہوئے۔ لڑ بھڑ کر نہیں۔ صلح نامہ بھی ہماری رائے کی تائید کرتا ہے۔

بلاذری کی روایت کے بموجب اہلِ دمشق سے صلح اس بات پر ہوئی تھی کہ دمشق کے آدھے مکانات اور آدھے گرجے مسلمانوں کے ہوں گے۔ سیف بن عمرو جس سے طبری نے روایت کی ہے اور جس کی انگریزی مستشرق سر ولیم میور نے بھی تائید کی ہے یہ کہتا ہے کہ صلح کی بنیاد اموال و جائیداد کی تقسیم پر تھی یعنی عیسائیوں نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ وہ اپنے نصف اموال اور نصف اراضی مسلمانوں کو دے دیں گے۔ میور اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ صلح کی شرائط میں یہ امر بھی شامل تھا کہ عیسائی اپنے مکانات اور گرجے بھی آدھے مسلمانوں کو دے دیں گے۔ البتہ واقدی کہتا ہے کہ صلح نامہ میں نصف مکانات اور گرجے مسلمانوں کے حوالے کرنے کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ دمشق کی فتح کے بعد وہاں کے اکثر باشندے بھاگ کر انطاکیہ میں ہرقل سے جا ملے، اس طرح شہر کے بہت سے مکانات خالی ہو گئے جن میں مسلمانوں نے رہائش اختیار کر لی۔ اکثر مورخین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔

صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ عیسائی مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔ جزیہ کی شرط پر تمام مورخین متفق ہیں لیکن اس کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہے۔ سیف بن عمرو کے قول کے مطابق ہر فرد بشر کے لیے جزیہ کا ایک دینار مقرر ہوا تھا[1]۔ بلاذری بھی ایک روایت میں اسی قول کی تائید کرتا ہے[2]۔ ایک دوسری روایت میں وہ بیان کرتا ہے کہ جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا گیا تھا جو بالغ تھے اور بچوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے جزیہ کی شرح کو بھی تبدیل فرما دیا اور ہر شخص پر اس کی مالی حالت کے مطابق جزیہ لگایا گیا۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ دمشق کی فتح رجب ۱۴ھ (مطابق ستمبر ۶۳۵ء) میں ہوئی تھی اور محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا تھا[3] لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ محاصرہ ستر دن سے زیادہ جاری نہیں رہا۔

(۱۱)

شام اور فلسطین میں پیش قدمی

بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ دمشق کو دوبار فتح کیا گیا۔ پہلی دفعہ قبضہ کے بعد، جب عربوں کو اس بات کا پتا چلا کہ ہرقل ان کے مقابلے کے لیے ایک اور زبردست لشکر جمع کر رہا ہے تو انھوں نے اسے خالی کر دیا۔ اس روایت کی بعض عرب مورخین مثلاً بلاذری[4] نے بھی تائید کی ہے۔

---

[1] طبری صفحہ ۲۱۵۴

[2] بلاذری صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵

[3] یعنی محرم سے رجب ۱۴ھ تک

[4] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۳۳

اس نئے رومی لشکر کی قیادت تھیودوسیوس سکلاریوس کے سپرد تھی۔ یہ لشکر جس میں ایک لاکھ سپاہی شامل تھے، جھیل حولہ (جسے بحرِ میتت بھی کہتے ہیں) کی جنوبی جانب بڑھا۔ رومی سپہ سالار چاہتا تھا کہ دمشق اور عرب کا درمیانی راستہ کاٹ کر عرب فوجوں کا تعلق عرب سے بالکل منقطع کر دے تاکہ انھیں کسی طرح کی امداد نہ پہنچ سکے۔

ہرقل موسمِ سرما کے گزرنے کے انتظار میں رہا۔ جب سردیاں گزر گئیں اور گرمیاں آگئیں تو ربیع الثانی ۱۵ھ میں اس کا لشکر اسلامی فوجوں کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ خالدؓ نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے لشکر کے سرداروں کو مشورہ دیا کہ شام کا شمالی حصہ حتیٰ کہ دمشق بھی خالی کر دیا جائے اور جنوب کی طرف جا کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور مسلمان شمالی شام کو چھوڑ کر جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنے قبضہ کے دوران میں مسلمانوں نے مقامی عیسائی آبادی کے ساتھ جس حسنِ سلوک سے کام لیا تھا اس نے تمام لوگوں کو مسلمانوں کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ اسی حسنِ سلوک کا اثر تھا کہ جب مسلمان اس علاقہ کو چھوڑ کر جانے لگے تو عیسائی روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ خدا تم کو پھر واپس لائے۔[1]

مستشرقین نے بیان کیا ہے کہ اس موقع پر رومیوں اور عربوں میں جو معرکہ ہوا تھا وہ یرموک میں پیش آیا تھا، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ دمشق کی فتح سے پہلے جو لڑائی ہوئی تھی وہ جنگِ اجنادین تھی۔ لیکن معرکۂ یرموک ۱۵ھ میں دمشق کی فتح کے بعد پیش آیا۔ اس بارے میں ہمارا خیال جس کی تائید بعض یورپین مورخین بھی کرتے ہیں، یہ ہے کہ عرب رومیوں سے دو مرتبہ اجنادین میں لڑے۔ پہلا معرکہ بڑا زبردست تھا۔ اس کے بعد یرموک کا معرکہ پیش آیا۔ پھر فتحِ دمشق ہوئی، اس کے بعد دوبارہ اجنادین کا معرکہ پیش آیا۔

دوسری بار ہونے والے معرکۂ اجنادین کی تفصیلات بہت حد تک پردۂ خفا میں ہیں۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ رجب ۱۵ھ میں پیش آیا تھا اور اس میں ہرقل کی فوجوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ معرکۂ اجنادین کے بعد اور بھی کئی معرکے پیش آئے لیکن کسی جگہ رومی لشکر کو فتح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ قیصر پہلے بھاگ کر انطاکیہ پہنچا۔ اس کے بعد دل شکستہ ہو کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ مسلمان جن علاقوں کو چھوڑ کر گئے تھے واپس آ کر ان پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

مورخینِ عرب ذکر کرتے ہیں کہ دمشق کی فتح کے بعد مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے فلسطین کا رخ کیا، جہاں رومیوں کی اسی ہزار فوج موجود تھی۔ طبری اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ ابو عبیدہؓ نے یزید بن ابی سفیان کو توفوج کے ایک دستہ کے ساتھ دمشق میں چھوڑا اور خود فحل کا قصد کیا جو موجودہ شرقِ اُردن کے علاقہ عجلون میں واقع ہے۔

فلسطین میں رومیوں کے چار جنگی مرکز تھے:

فحل، اجنادین، قیساریہ اور بیت المقدس۔

ان چاروں مرکزوں میں بہ تعدادِ کثیر فوجیں موجود تھیں اور انھوں نے ان شہروں کو مضبوط کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی

---

[1] بلاذری بروایت ابوحفص دمشقی و تنوخی، نیز مذکرۃ دی عربی صفحہ ۱۰۵۔ امام ابویوسف نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اس علاقہ کو خالی کرتے وقت مقامی آبادی سے جتنا جزیہ وصول کیا تھا وہ بھی واپس کر دیا تھا۔ (کتاب الخراج ص ...)

مورخین میں معرکہ فحل کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ معرکہ یرموک کے بعد ۱۴ھ میں ہوا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بعد میں پیش آیا تھا۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ اسلامی لشکر نے مجتمع ہو کر فحل پر حملہ کیا تھا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ حملہ کرنے والے چند دستے تھے۔ یہاں ان کا سخت مقابلہ ہوا۔ بالآخر مسلمان شہر پر قابض ہو گئے۔

جب اسلامی لشکر فحل کی فتح سے فارغ ہو چکا تو ابو عبیدہؓ نے حمص کا رُخ کیا۔ ہرقل نے دو لشکر روانہ کیے، ایک حمص کی طرف بڑھنے والی اسلامی فوج کے مقابلہ کے لیے اور دوسرا دمشق پر قبضہ کرنے کے لیے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دمشق اسلامی فوجوں سے خالی ہو گیا ہے اور اس پر قبضہ کرنے کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔

دمشق کے مغربی جانب مرج الروم میں مسلمانوں کی مٹھ بھیڑ رومیوں کی دونوں فوجوں سے ہوئی۔ ابو عبیدہؓ نے بھی اپنے لشکر کے دو حصے کیے،

ایک حصہ جس کی قیادت وہ خود کر رہے تھے، اسلامی لشکر سے مقابلہ کرنے والی رومی فوج کے سامنے ڈٹ گیا۔ اور دوسرا حصہ جس کی قیادت خالدؓ کے سپرد تھی دمشق جانے والی فوج کے مقابلہ پر آ گیا۔ لیکن رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرا رومی لشکر مسلمانوں کی نظر بچا کر دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ ابو عبیدہؓ کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے خالدؓ کو اس لشکر کے پیچھے بھیجا۔

ادھر یزید بن ابی سفیان کو، جنھیں ابو عبیدہؓ نے دمشق میں چھوڑا تھا، جب رومی فوج کے آنے کا پتا چلا تو وہ اپنی مختصر فوج کو لے کر رومیوں کے مقابل آ گئے۔ رومیوں کو یہ پتا نہ تھا کہ خالدؓ بھی ان کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں، دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں کہ پیچھے سے خالدؓ نے حملہ کر دیا، ادھر یزید نے اپنی فوج کو بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومی دونوں جانب سے پس کر رہ گئے۔ بہت کم لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔ باقی سب مارے گئے۔

ابو عبیدہؓ کا پہلے رومی لشکر سے مقابلہ ہوا جس کی قیادت تیودورس کر رہا تھا۔ لڑائی میں رومی سپہ سالار مارا گیا اور فوج زبردست ہزیمت اٹھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسلامی لشکر نے اس کا تعاقب کیا، بہت سے سپاہیوں کو قید کر لیا، بہت سے مارے گئے۔ بالآخر یہ شکست خوردہ رومی فوج حمص پہنچی۔

ابو عبیدہؓ "بعلبک" کے رستے حمص کی طرف روانہ ہوئے۔ خالدؓ نے "بقاع" کا رُخ کیا اور اس کو فتح کر لیا۔ اہلِ بعلبک نے ابو عبیدہؓ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ انھیں امان دی جائے گی۔ ان کے اموال محفوظ رہیں گے اور ان کے گرجاؤں کو چھیڑا نہیں جائے گا۔ ابو عبیدہؓ نے ان کو صلح نامہ لکھ کر دے دیا اور خود حمص کی جانب بڑھے۔ اہلِ حمص کی طرف سے شروع میں زبردست مزاحمت ہوئی۔ شہر میں بعض رومی دستے بھی تھے وہ موقع بموقع شہر سے نکلتے، مسلمانوں سے مقابلہ کرتے اور پھر جھٹ شہر میں جا گھستے اور شہر کے دروازے بند کر لیتے۔

اگرچہ شدید سردی کا موسم تھا اور مسلمانوں نے سردی کی وجہ سے بڑی تکلیف بھی اٹھائی لیکن وہ برابر شہر کا محاصرہ کیے رہے جب حمص والوں نے دیکھا کہ مسلمان کسی طرح بھی محاصرہ اٹھانے کا نام نہیں لیتے تو انھوں نے امان کی شرط پر صلح کی درخواست کی۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے ان سے انہی شرائط پر صلح کر لی جن شرائط پر اہلِ دمشق کے ساتھ کی تھی۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو سارا حال لکھ بھیجا اور ان سے مزید ہدایات طلب کیں۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھا کہ ابھی حمص میں ٹھہر کر ہی اپنی فوج کی تنظیم کرو اور اس علاقہ میں جو عرب آباد ہیں ان کو اپنی فوج میں شامل ہونے کی ترغیب دو۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں بھی تمہاری مدد کے لیے برابر لشکر روانہ کرتا رہوں گا۔

ابو عبیدہؓ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق حمص ہی میں ٹھہرے رہے اور خالدؓ کو قنسرین کا علاقہ فتح کرنے بھیجا۔ اس علاقہ میں بعض عرب قبیلے آباد تھے اور ایک رومی لشکر بھی موجود تھا۔ جب حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو مقابلہ شروع ہو گیا۔ رومی سردار لشکر مارا گیا اور فوج نے شکست کھائی۔ عربوں نے خالدؓ کے پاس آ کر کہا کہ انھیں اس جنگ میں ان کی مرضی کے خلاف زبردستی شامل ہونے پر مجبور کیا گیا تھا، اس لیے ان سے درگزر کیا جائے۔ حضرت خالدؓ نے اپنی عادت کے بالکل برخلاف ان کا عذر قبول کر لیا اور انھیں امان دے دی۔ کیونکہ انھیں حضرت عمرؓ کی اس سیاست کا علم ہو گیا تھا کہ عربوں کے ساتھ انتہائی نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے تاکہ وہ اسلام قبول کر لیں اور مسلمان فوج کی تقویت کا موجب بنیں۔ چنانچہ اس قبیلہ کے بھی اکثر لوگوں نے بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے شہر "قنسرین" کا رُخ کیا۔ وہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت خالدؓ نے انھیں کہلا بھیجا کہ اگر تم بادلوں میں بھی چلے جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ یا تو ہم کو تمہارے پاس پہنچا دے گا یا تمھیں ہمارے سامنے اتار دے گا۔ اس لیے قلعہ بند ہونے سے کوئی فائدہ نہیں، بہتر یہی ہے کہ تم ہتھیار ڈال دو۔

وہاں کے لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے پاس چونکہ زیادہ طاقت نہیں ہے اس لیے ہتھیار ڈالنا ہی مناسب ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت خالدؓ سے صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ حضرت خالدؓ نے ان سے انہی شرائط پر صلح کی جن شرائط پر حمص والوں سے کی گئی تھی۔ قنسرین پر قبضہ کرنے کے بعد حضرت خالدؓ مرعش پہنچے اور اسے فتح کر کے اس کے باشندوں کو شہر سے نکال دیا۔ مرعش کی فتح کے بعد آپ نے "حدث" کے قلعہ کو فتح کیا۔ کچھ دنوں کے بعد حلب بھی فتح کر لیا گیا۔[1] ہرقل اس زمانے میں انطاکیہ میں مقیم تھا جب اسے خبر ملی کہ حلب پر بھی مسلمان قابض ہو گئے تو وہ ملک شام کی طرف سے مایوس ہو گیا اور قسطنطنیہ کا رُخ کیا۔ جاتے ہوئے جب وہ مقام شمشاط پر پہنچا تو ایک بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر شام کی طرف منہ کیا اور نہایت حسرت سے کہا:

"اے سرزمینِ شام! رخصت ہونے والے کا سلام قبول ہو۔ یہ ایسی جدائی ہے جس کے بعد ملاقات ممکن نہیں۔"

جب حضرت عمرؓ کو شمالی شام میں حضرت خالدؓ کے کارناموں کی تفصیل پہنچی تو آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

"خالدؓ نے اپنے کارناموں سے خود اپنے آپ کو سردار بنا لیا ہے۔ خدا ابوبکرؓ پر رحمت نازل فرمائے،

---

[1] تاریخ ابو الفداء جلد اوّل ص ۱۶۰



مقام ابراہیم

وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے۔"[۱]

حمص، حماۃ، قنسرین اور حلب کی فتوحات ۱۵ھ میں ختم ہوگئیں اور ان فتوحات سے اسلامی لشکر اس قابل ہوگیا کہ وہ جنوبی عراق میں متعین اسلامی فوجوں سے براہِ راست رابطہ پیدا کر سکتا تھا۔

دمشق اور حلب کے درمیانی شہروں دوما، قطیفہ، نبک، حمص، حماۃ اور معرۃ النعمان کو مطیع کرنے کے بعد اسلامی فوجوں نے شام کے ساحلی علاقہ کو جو شمال میں خلیج اسکندرونہ سے لے کر جنوب میں "صور" کی بندرگاہ تک پھیلا ہوا تھا، فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس علاقہ میں لاذقیہ، طرابلس، بیروت، صیدا اور صور کے مشہور شہر آباد تھے۔

اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے ابو عبیدہؓ حلب سے روانہ ہوئے۔ پہلے "معرہ مصرین" پہنچے۔ اسے فتح کیا۔ اس کے بعد "سرمین" کو زیر کیا جو حلب کے قریب ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس کے بعد "بوقا" پہنچے جو شہر لاذقیہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اسے فتح کرنے کے بعد جبلہ، بانیاس، خواب اور طرطوس کو فتح کیا۔ طرطوس، لاذقیہ کے جنوب میں لاذقیہ اور طرابلس الشام کے درمیان ایک شہر ہے۔

اس دوران میں جبکہ ابو عبیدہؓ اور خالدؓ شمال میں رومیوں سے برسرِ پیکار تھے یزید بن ابی سفیان جنھیں ابو عبیدہؓ نے دمشق میں چھوڑا تھا ساحلِ لبنان پر مصروفِ عمل تھے۔ آپ نے اپنے لشکر کے ساتھ پہلے "بیروت" پر حملہ کیا۔ اس کو فتح کرنے کے بعد ساحل ساحل کوچ کرتے ہوئے "صیدا" پہنچے اور اس پر قبضہ کر لیا اس کے بعد اور آگے بڑھے اور صور پہنچ کر اسلامی لشکر سے مل گئے۔ وہاں سے پھر بیروت واپس آئے اور شمالی جانب بڑھنا اور بستیوں اور شہروں کو فتح کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ "عرقا" پہنچے جو "طرابلس الشام" کے شمال میں اس سے تیرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس زمانہ میں "عرقا" بہت خوبصورت اور آباد شہر تھا۔ عرقا کو فتح کرنے کے بعد آپ اس اسلامی لشکر سے مل گئے جو شمالی جانب سے ساحلی شہروں کو فتح کرتا چلا آرہا تھا۔ اس طرح شام کا سارا ساحلی علاقہ شمال میں لاذقیہ سے لے کر جنوب میں قیساریہ تک عرب مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

تاہم اس منطقہ میں مسلمانوں کی جنگی سرگرمیاں اس وقت تک ختم نہ ہوئیں جب تک مسلمانوں نے کیلیکیہ کو فتح نہ کر لیا کیلیکیہ حلب سے بیالیس میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں منبج اور جرابلس کے درمیان واقع ہے۔ اسے آج کل عمریہ یا معمورہ کہتے ہیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اس طرف میسرہ بن مسروق عبسی کی قیادت میں ایک فوج بھیجی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس کی رومیوں سے لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی۔ لیکن اسلامی لشکر زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہرا بلکہ واپس آگیا اور اس علاقہ پر دوبارہ رومیوں کا تسلط ہوگیا۔ یہاں تک کہ فلسطین کی فتح کے بعد ۲۱ھ میں ہاشم بن عتبہ نے پھر کیلیکیہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ دراصل پہلے حملہ کی غرض اس علاقہ پر قبضہ کرنا نہیں تھا بلکہ رومیوں کو ڈرانا تھا کہ وہ شام کی

---

[۱] تاریخ طبری، جلد چہارم صفحہ ۱۵۵، ابنِ اثیر جلد سوم صفحہ ۳۴۴

طرف لوٹنے یا نئے لشکر بھیجنے کا قصد نہ کریں۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ ۱۹ھ میں ہرقل پھر شام کے علاقہ میں آیا اور" او، فا" (اور ہا) سے ایک زبردست لشکر صحرا کے راستہ حمص کی طرف مسلمانوں سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔

جب عرب سالاروں کو اس لشکر کے آنے کی خبر ملی تو انھوں نے مقابلہ کی تیاریاں شروع کیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو ان حالات کی اطلاع دے دی۔ انھوں نے سعدؓ بن ابی وقاص کو لکھا کہ ابوعبیدہؓ کے پاس کمک روانہ کر دو۔ اُنھوں نے قعقاع کے ساتھ ایک لشکر ابوعبیدہؓ کی طرف بھیجا۔ خالدؓ قنسرین سے آگئے۔ اسی طرح دمشق اور دوسری جہات سے بھی فوجیں آگئیں۔ ان فوجوں کو لے کر ابوعبیدہؓ حمص سے باہر نکلے اور اپنے لشکر کی تنظیم کرنے کے بعد رومیوں کا انتظار کرنے لگے۔ جب رومی پہنچے تو لڑائی شروع ہوئی۔ بڑے گھمسان کا معرکہ پڑا جس میں بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس طرح شام میں فتوحات کی تکمیل ہوگئی۔ شام، عراق اور عرب تینوں علاقے اسلامی جھنڈے کے نیچے آگئے اور دولتِ اسلامیہ کی حدود مدینہ سے لے کر شمال میں جبال طوروس کے جنوب تک اور مشرق میں آرمینیہ تک پھیل گئیں۔

(۱۲)

فلسطین میں فتوحات

اب ہم فلسطین کی فتوحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب شام کی فتح کے لیے چار سپہ سالار منتخب فرما کر روانہ کیے تھے تو حضرت عمروؓ بن العاص کو فلسطین کی طرف بھیجا تھا اور شام میں چونکہ رومیوں نے زبردست تیاریاں کی تھیں اس لیے حضرت عمروؓ بن العاص کو باقی تین سپہ سالاروں کے ساتھ یرموک آنا پڑا تھا۔ یرموک کی جنگ ختم ہوگئی تو حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین لوٹ آتے اور یہاں آکر رومیوں سے مصروف پیکار ہوگئے۔ آپ کی کوشش یہ تھی کہ فلسطین کی طرف سے شام میں رومی فوجوں کو کسی قسم کی امداد نہ پہنچ سکے۔ جب مسلمان فتح دمشق اور معرکہ فحل سے فارغ ہوگئے اور شام میں رومیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا تو حضرت عمروؓ بن العاص کو منطقۂ فلسطین اور اردن میں عربی لشکروں کی قیادت سپرد کی گئی کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد ہی میں آپ کو اس علاقہ پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ بلقاء یا شرقِ اردن کے علاقہ میں اسلامی فوج کے قائد شرحبیل بن حسنہ بھی آپ کی مدد کر رہے تھے۔ فلسطین اور اردن کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ فوج کا بڑا حصہ شمالی شام میں تھا جہاں انھیں رومیوں کی زبردست افواج سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے بالمقابل رومیوں کے پاس بہت زبردست طاقت تھی اور ان کی فوجیں شام اور فلسطین کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان کی فوجوں کا ایک

بڑا حصہ جنگِ یرموک میں کام آگیا تھا لیکن پھر بھی ان کی طاقت اور ان کے دم خم میں فرق نہ آیا تھا۔

سنہ ۱۴ھ میں فحل کی فتح کے بعد مسلمانوں کی فوجیں اردن اور فلسطین کے صوبوں میں پھیل گئی تھیں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر فلسطین کے ساحلی شہر "عکا" کو فتح کر لیا، جس سے فلسطین میں مقیم رومی فوجوں کا ان کے دار الحکومت انطاکیہ سے تعلق منقطع ہوگیا۔ اب صرف سمندری راستے سے ہی آمد و رفت ہو سکتی تھی۔ رومیوں کے پاس سمندری طاقت اچھی خاصی تھی۔

عکا کی فتح کے بعد مسلمانوں نے اردن اور فلسطین کے دُوسرے شہروں کو فتح کرنا شروع کیا۔ یافا اور لُد پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں نے ساحل کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع کیا۔ پہلے غزہ کو فتح کیا اس کے بعد جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے فلسطین کی آخری حدود تک پہنچ گئے، جہاں صحرا کی طرف سے مصر کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کا اس جانب سے بھی حجاز سے براہِ راست تعلق قائم ہوگیا۔ اب فلسطین میں صرف چار بڑے شہر ایسے رہ گئے جو مطیع نہیں ہوئے۔ اور وہ تھے اجنادین، قیساریہ، بیت المقدس اور عسقلان۔

عمروؓ بن العاص نے خود تو اجنادین کا محاصرہ کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، ایک فوج بیت المقدس کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیج دی اور تیسری فوج کو معاویہؓ بن ابی سفیان کی قیادت میں قیساریہ کے محاصرہ کے لیے روانہ کر دیا۔

مسلمانوں نے اجنادین کا محاصرہ بڑا زبردست کر رکھا تھا۔ رومیوں کا سرداران کا ایک مشہور اور زیرک سالار ارطبون تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح حضرت عمروؓ بن العاص کو دھوکہ دے کر مسلمانوں کے لشکر میں تفرقہ ڈال دے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ آخر دونوں فوجیں میدانِ جنگ میں بالمقابل آکھڑی ہوئیں، بڑے معرکہ کا رَن پڑا، جس میں بڑی کثرت سے رومی مارے گئے اور ان کو شکست ہوئی۔ ارطبون شکست خوردہ فوج کو ساتھ لے کر بیت المقدس کی طرف بھاگا۔ بیت المقدس کا پہلے ہی مسلمانوں کی ایک فوج محاصرہ کیے پڑی تھی۔ لیکن اس نے ارطبون کی فوج سے کوئی تعرض نہ کیا اور اسے شہر میں داخل ہونے دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رومیوں کی تعداد شہر کے اندر اور باہر اتنی زیادہ تھی کہ مسلمانوں نے فی الحال ان سے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فتح اجنادین سنہ ۱۵ھ میں ہوئی تھی۔

جب حضرت عمروؓ بن العاص اجنادین کی فتح سے فارغ ہوئے تو آپ نے بیت المقدس کا رُخ نہیں کیا، بلکہ اپنی توجہ ان چھوٹے چھوٹے شہروں کی طرف مبذول کی جو ابھی تک فتح نہ ہوئے تھے۔ مثلاً غزہ، نابلس، بیت جبرین، یافا، لُد، عمواس وغیرہ جب یہ سارے شہر فتح ہوگئے تب آپ نے بیت المقدس کا قصد کیا ارطبون کی قیادت میں بیت المقدس کے اندر رومی لشکر تھا اور باہر مسلمان فوج شہر کا محاصرہ کیے پڑی تھی۔

یہ محاصرہ بہت طویل ہوگیا۔ چاروں طرف سے اسلامی فوجیں آکر بیت المقدس کا محاصرہ کرنے والی اسلامی فوجوں سے ملتی جاتی تھیں۔ جب شہر والوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو برابر کمک پہنچ رہی ہے اور قیصر کی طرف سے مدد ملنے کا کوئی امکان نہیں تو وہ مایوس ہوگئے۔ ارطبون بھی ایک رات خاموشی سے مصر کی جانب فرار ہوگیا۔ اس پر شہر والوں کی ہمتیں بالکل

پست ہوگئیں اور انھوں نے ہتھیار ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ اُنھوں نے اسلامی سپہ سالار کو کہلا بھیجا کہ وہ شہر مسلمانوں کے حوالے کرنے کو تیار ہیں، بشرطیکہ خلیفۃ المسلمین خود بیت المقدس تشریف لائیں اور اپنے ہاتھ سے معاہدۂ صلح پر دستخط کریں کیونکہ بیت المقدس کی شان اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں اس کی اہمیت اسی امر کی متقاضی ہے کہ اس موقع پر خلیفۃ المسلمین خود تشریف لائیں۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے عیسائیوں کی یہ شرط حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجی۔ حضرت عمرؓ بیت المقدس روانہ ہو گئے اور شام میں تمام اسلامی سالاروں کو لکھا کہ وہ جابیہ میں ان سے آ کر ملیں۔ چنانچہ یزیدؓ بن ابی سفیان، ابو عبیدہؓ ابن جراح اور خالدؓ بن ولید آپ سے ملنے کے لیے جابیہ پہنچے۔ وُہ تینوں گھوڑوں پر سوار تھے اور دیباج و ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کو یہ دیکھ کر بے حد رنج ہُوا کہ یہ لوگ ابھی سے زینت اور شان و شوکت کے پیچھے پڑ گئے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو گزرے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے۔ آپ نے ان کو سرزنش کی جس پر انھوں نے کہا کہ انھوں نے اپنے ان کپڑوں کے نیچے ہتھیار پہن رکھے ہیں اور یہ لباس انھیں اس لیے پہننا پڑ رہا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جو شان و شوکت کا بے حد لحاظ رکھتے ہیں اور اگر معمولی کپڑے پہنے جائیں تو ان پر رعب نہیں پڑ سکتا۔ حضرت عمرؓ نے ان کا یہ عذر قبول فرما لیا۔

آپ جابیہ ہی میں تھے کہ اہلِ بیت المقدس کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے صلح کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ رومی لشکر کے دونوں سپہ سالار مصر بھاگ گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے صلح نامہ کی تحریر ان کو لکھ کر دی:

"اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے اہلِ ایلیا (بیت المقدس) کو یہ امان نامہ دیا جاتا ہے اہلِ ایلیا کی جان، مال، گرجوں، صلیبوں سب کو امان دی جاتی ہے۔ بیماروں، تندرستوں اور سب مذاہب کے لوگوں کو یہ امان شامل ہے۔ یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ نہ ان کے عبادت خانوں پر قبضہ کیا جائے گا اور نہ انھیں گرایا جائے گا۔ ان کے دینی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ اہلِ ایلیا کا فرض ہے کہ جزیہ ادا کرتے رہیں اور متحارب رومیوں کو اپنے شہر سے نکال دیں۔ جو رومی شہر سے نکلے گا اس کی جان و مال کی پوری حفاظت کی جاتی گی، حتیٰ کہ وُہ اپنے وطن سلامتی سے پہنچ جائے۔ اگر اہلِ ایلیا میں سے کوئی رومیوں کے ساتھ جانا چاہے تو وہ بھی جا سکتا ہے، لیکن اگر رومی بھی امن پسندانہ طور پر رہنا چاہیں تو انھیں بھی انہی شرائط کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے۔ اس امان نامہ کی اللہ، اس کا رسولؐ، آپ کے خلفاءؓ اور جملہ مومنین ذمہ داری لیتے ہیں بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اس معاہدہ پر خالدؓ بن ولید، عمروؓ بن العاص، عبد الرحمٰنؓ بن عوف اور معاویہؓ بن ابی سفیان گواہ ہیں ——— اور یہ ۱۵ھ میں لکھا گیا۔"

معاہدۂ صلح کے بعد حضرت عمرؓ گھوڑے پر سوار ہو کر بیت المقدس کی جانب روانہ ہوئے۔ آپ کے دونوں جانب

سرداران فوج تھے۔ بیت المقدس پہنچ کر آپ اسلامی لشکر میں اتر پڑے اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک رومی شہر سے باہر نہ نکل گئے۔ جب بیت المقدس رومیوں سے بالکل خالی ہو گیا تو آپ بغیر کسی سواری کے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کے دروازہ پر بطریق اور شہر کے معززین نے آپ کا استقبال کیا۔ شہر کے اندر پہنچ کر آپ نے شہر کے مشہور گرجا "کنیسۃ القیامہ" کو جا کر دیکھا۔ آپ ابھی اس کو دیکھ ہی رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ بطریق نے عرض کیا کہ گرجا ہی میں نماز پڑھ لیجئے مگر آپ نے منظور نہ کیا اور گرجا سے باہر آ کر نماز پڑھی۔ جس جگہ آپ نے نماز پڑھی اس جگہ ایک مسجد بنا دی گئی، جس کا نام جامع عمرؓ ہے۔ مسجد اقصیٰ بعض مورخین کے قول کے بموجب "ہیکل سلیمانؑ" کی جگہ بنی ہوئی ہے۔

ابھی حضرت عمرؓ جابیہ ہی میں مقیم تھے کہ اہالی "رملہ" کے بھی دو نمائندے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہی شرائط پر آپ سے صلح کی جن شرائط پر بیت المقدس والوں نے کی تھی[۱]۔ اب جنوبی فلسطین میں صرف دو مقام قیساریہ اور عسقلان باقی رہ گئے تھے جہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ معاویہؓ نے قیساریہ کا محاصرہ کر لیا اور ۲۲ھ میں اسے فتح کیا۔ عسقلان ۲۳ھ میں فتح ہوا۔ یہ فلسطین کا آخری شہر تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اس فتح کے بعد فلسطین کا سارا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

گو فتوحاتِ شام و فلسطین کا حال تو ختم ہو گیا ہے لیکن ایک اہم واقعہ کا تذکرہ ابھی باقی ہے۔ اور وہ ہے عمواس کا طاعون جو شام میں ۱۸ھ میں پھیلا اور جس نے امیر المومنین کو دمشق اور شام کے دیگر شہروں کا دورہ کرنے سے روک دیا۔

اس طاعون کا سبب وہ جراثیم تھے جو اس سرزمین پر ہونے والی شدید جنگ نے تمام فضا میں پھیلا دئے تھے۔ غالب گمان یہ ہے کہ عربوں نے اپنے شہیدوں کو تو دفن کر دیا تھا۔ لیکن رومی مقتولوں کو تو یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کی لاشیں زمین پر پڑی سڑتی رہیں جس سے تمام فضا زہر آلود ہو گئی اور بڑے وسیع پیمانے پر طاعون پھوٹ پڑا۔ اس طاعون میں تقریباً بیس ہزار مسلمان شہید ہوئے جن میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابی مثلاً ابو عبیدہؓ قائد لشکر اسلامی، معاذؓ بن جبل اور یزیدؓ بن ابی سفیان شامل تھے۔ یہ وبا اس وقت تک دور نہ ہوئی جب تک کہ حضرت عمرؓ نے عمروؓ بن العاص کو اس علاقہ کا حاکم مقرر نہ کیا اور انھوں نے لوگوں کو شہر چھوڑ کر پہاڑ پر چلے جانے کا حکم نہ دیا۔ چنانچہ لوگ بھاگ بھاگ کر پہاڑوں میں چلے گئے، جب کہیں انھیں اس منحوس وبا سے نجات ملی۔

طاعون دور ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ شام جا کر وہاں کا ملکی نظام درست کریں اور اس وبا کے

---

[۱] حضرت عمرؓ نے بیت المقدس پہنچ کر فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جنوبی فلسطین اور شمالی فلسطین۔ جنوبی فلسطین کا صدر مقام بیت المقدس کو بنایا اور اس علاقہ کا حاکم علقمہ ابن محرز کو مقرر کیا۔ شمالی فلسطین کا صدر مقام رملہ کو بنایا اور اس علاقہ کا حاکم علقمہ بن حکیم کو مقرر فرمایا۔

بعد وہاں کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کریں۔ چنانچہ آپ مدینہ سے شام پہنچے، مصیبت زدہ لوگوں کو پوری پوری امداد بہم پہنچائی، والیوں کا نئے سرے سے تقرر اور مرنے والوں کا سامان ان کے وارثوں میں تقسیم کیا۔

شام میں ایک دن جب نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ حضرت بلال رضؓ کو اذان کا حکم دیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی خواہش دیکھ کر حضرت بلالؓ سے اذان دینے کی درخواست کی جسے انھوں نے قبول کر لیا اور اذان دینی شروع کی۔ اس اذان کو سُن کر تمام لوگ زار و قطار رونے لگے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ آ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے اور مسجدِ نبوی میں حضرت بلالؓ اذان دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اتنا روئے کہ روتے روتے ان کے آنسو خشک اور ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔

صحابہؓ کو روتے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں دیکھا تھا، رونے لگے۔

(۱۳)

مصر کی جانب پیش قدمی

حضرت عمروؓ بن العاص نے زمانۂ جاہلیت میں مصر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ وہاں کی تہذیب و تمدن، دولتمندی اور سرسبزی و شادابی سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح مصر کو فتح کر لیں جب تک مسلمان عراق اور شام کی فتوحات میں مشغول رہے یہ امر ممکن نہ تھا کہ مصر کی طرف بھی توجہ کی جاتی۔ لیکن جب عراق، شام اور فلسطین کی فتوحات قریب قریب مکمل ہو چکیں تو حضرت عمروؓ بن العاص کے دل میں مصر پر چڑھائی کرنے کا خیال چٹکیاں لینے لگا۔ انھوں نے جابیہ کے مقام پر حضرت عمرؓ سے اس کا تذکرہ کیا اور مصر پر چڑھائی کرنے کی اجازت چاہی۔ انھیں تفصیل سے بتایا کہ مصر کو فتح کرنے میں کیا کیا فائدے اور اس علاقہ کو چھوڑ دینے سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ رومی سپہ سالار ارطبون فلسطین سے بھاگ کر مصر پہنچ چکا ہے اور وہاں نئے سرے سے لشکر تیار کر رہا ہے۔ وہ اس بات کے انتظار میں ہے کہ اسے کب موقع ملے، جو وہ فلسطین اور شام پر حملہ کرے۔

حضرت عمرؓ نے عمروؓ بن العاص کی باتیں بڑے غور سے سُنیں اور جواب میں کہا:

"ہمیں اس فیصلہ کے لیے شام، عراق اور فلسطین کی فتوحات کے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔"

حضرت عمرؓ کی دلیل یہ تھی کہ عرب ابھی تک شمالی شام کی سرحدوں پر رومیوں سے برسرِپیکار ہیں، ادھر ایران میں ایرانی ابھی تک عربوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس صورت میں ایک نیا محاذِ جنگ کھول لینا عربی قوت کے ضعف کا موجب ہو سکتا ہے۔

حضرت عمروؓ بن العاص اس وقت تو خاموش ہو رہے لیکن کچھ دنوں کے بعد اُنھوں نے پھر حضرت عمرؓ کے سامنے

اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ مصر کی فتح کے لیے چار ہزار سے زیادہ فوج درکار نہ ہوگی اور اتنی فوج اگر شام سے مصر منتقل کر دی جائے تو شام میں اسلامی فوجوں کی قوت میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کہا کہ مصر کو فتح کرنا جنگی نقطۂ نگاہ سے بے حد ضروری ہے کیونکہ جب تک مصر فتح نہ ہوگا عربوں کو ہر وقت اس بات کا خوف لاحق رہے گا کہ کہیں رومی مصریوں کو بھڑکا کر مصر کی جانب سے شام و فلسطین پر حملہ نہ بول دیں۔

اس مرتبہ حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کے متعلق سوچنے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ وہ مدینہ پہنچ کر اس سلسلہ میں انھیں کوئی خط لکھیں گے۔ جب حضرت عمرؓ مدینہ پہنچے تو آپ نے اس مسئلہ میں صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا۔ بعض نے اس رائے کی تائید کی اور بعض نے مخالفت۔ آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد حضرت عمرؓ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مصر کو فتح کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو خط لکھا جس میں انھیں مصر پر چڑھائی کرنے کی اجازت دے دی، لیکن ساتھ ہی اس بات کی تاکید بھی کر دی کہ وہ اس معاملہ کو بڑی سختی کے ساتھ پوشیدہ رکھیں، کسی کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پڑنے پائے، مصر پر اچانک حملہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص نے ایک نیا لشکر اس مقصد کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ حضرت عمرؓ نے مصر پر چڑھائی کرنے کی اجازت کے متعلق حضرت عمروؓ بن العاص کو جو خط لکھا تھا وہ ۱۸ھ کے نصف میں لکھا تھا۔

شام سے مصر کے لیے تین راستے تھے۔ سمندر کا راستہ، ساحل کا راستہ اور صحرا کا راستہ۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے اغلباً ساحل کا راستہ اختیار کیا جو قیساریہ سے عریش تک تھا۔ ان دونوں شہروں کی باہمی مسافت ایک سو تریپن میل ہے۔ یہ راستہ بہ نسبت دوسرے دو راستوں کے زیادہ آسان اور قریب کا تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس چار ہزار کی مختصر سی فوج تھی جو انھوں نے نہایت احتیاط سے مرتب کی تھی اور صرف انہی سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے چنا تھا جن کی بہادری اور جرأت وہ فلسطین کی جنگوں میں آزما چکے تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین سے فصلِ خریف کے اواخر میں روانہ ہوئے تھے۔ جب آپ عریش پہنچے تو اس کو بغیر لڑے بھڑے فتح کر لیا۔ مصر کا یہ پہلا شہر تھا جس پر اسلامی جھنڈا لہرایا گیا۔ عریش میں ہی اسلامی فوج نے عید الاضحیٰ منائی۔ اس جگہ کوئی رومی فوج موجود نہ تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ رومیوں نے حضرت عمروؓ بن العاص اور ان کے لشکر کی آمد کی خبر پا کر شہر چھوڑ دیا ہو کیونکہ حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنی مہم کو اس قدر پوشیدہ رکھا تھا کہ ان کی سپاہ کو بھی یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور ان کا کیا ارادہ ہے۔ صرف یہی ایک بات ہو سکتی ہے کہ عریش میں سرے سے رومیوں کی کوئی فوج موجود نہ ہو اور اس طرح عربوں کو آسانی سے بغیر لڑے بھڑے یا محاصرہ کیے اسے فتح کرنے کا موقع مل گیا ہو۔

اسلامی لشکر نے کچھ دنوں عریش میں آرام کیا اور اس کی خوشگوار ہوا، شیریں پانی، خوش ذائقہ انگوروں اور لذیذ کھجوروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے بعد "فرما" کی جانب بڑھا۔ اس شہر کا آجکل تو نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ لیکن اس زمانے میں جب حضرت عمروؓ بن العاص نے مصر پر حملہ کیا تھا یہ بڑا مضبوط شہر تھا۔ اس کے اردگرد باقاعدہ

فصیل بنی ہوئی تھی۔ مشرقی جانب سے یہ مصر کا دروازہ تھا۔ مسلمانوں نے پہلے اس کا محاصرہ کر لیا اور پھر لڑائی کے بعد اسے فتح کر لیا۔ "فرما" کو فتح کرنے کے بعد وہ "بابلیون" کی جانب بڑھے۔ بابلیون ایک مستحکم قلعہ تھا اور مضبوطی میں اسکندریہ کے قلعہ کا مقابلہ کرتا تھا۔ ان دونوں زبردست قلعوں کو فتح کر لینے کے بعد تمام وادیِ نیل کو فتح کرنا کوئی مشکل امر نہ تھا جو حملہ آور بھی ان دونوں قلعوں پر قابض ہوا وہ لازماً "اسوان" سے "رشید" تک کے تمام علاقہ پر قابض ہو گیا۔

رومیوں کی عملداری میں اہلِ مصر پر سخت ظلم توڑے جاتے تھے۔ جب رومیوں نے مصر کو فتح کیا تو انھوں نے مقامی رسوم و رواج کو مٹا کر اپنے ظالمانہ طریقے رائج کر دیے اور اصلی باشندوں کے حقوق کو بُری طرح پامال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے قبطیوں[1] اور حاکم رومیوں کے درمیان ایک دائمی عداوت اور مخاصمت پیدا ہو گئی۔ رومی سلطنت پر مسلمانوں کے حملہ سے پہلے جب قیصر ہرقل نے اپنے علاقہ سے ایرانیوں کے حملہ کو پسپا کیا تو اپنی مملکت کے استحکام اور مضبوطی کی خاطر یہ ارادہ کیا کہ مملکت کے ہر حصہ میں مقامی مذاہب کو مٹا کر صرف یونانی کلیسا کے عقاید کو باقی رکھا جائے اور تمام رعایا کو یونانی عقیدہ کی اطاعت پر مجبور کیا جائے تاکہ اس طرح تمام مملکت ایک ہی مذہب کے سانچے میں ڈھل جائے اور اختلاف مذاہب کی وجہ سے جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ باقی نہ رہیں۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہرقل نے "فیرس" کو مصر کا بطریق اور حاکم مقرر کیا اور اسے مصر کے اصلی باشندوں سے من مانا سلوک کرنے کا اختیار دے دیا کہ جس طرح چاہے قبطی مذہب کو فنا کرے۔ قبطیوں نے اپنے بطریق "بنیامین" کی قیادت میں رومی سیاست کا سخت مقابلہ کیا جو انھیں ان کے مذہب سے ہٹانے کے لیے جاری کی گئی تھی۔ جب "فیرس" کے مظالم شدت اختیار کر گئے تو قبطیوں کا بطریق بنیامین صحرا کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن مصر کے باقی باشندے اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر برابر رومیوں کے مقابل ڈٹے رہے۔

رومیوں کا ظلم قبطیوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہودیوں پر بھی اسی طرح مظالم توڑے جاتے تھے۔ فیرس نے ان پر بھی یونانی عیسائیت کے عقاید جبراً ٹھونسنے چاہے اور ان کے انکار پر انھیں طرح طرح کے مظالم کا شکار بنانا شروع کیا۔ انھیں زندہ آگ میں جلا دیا جاتا، قتل کر دیا جاتا، ان کی جائدادیں چھین لی جاتیں۔ غرض یہ کہ رومیوں نے ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر قبطیوں اور یہودیوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور وہ اس بات کے انتظار میں رہے کہ کب ان کو موقع ملے اور وہ رومیوں کے خلاف بغاوت کر دیں۔ چنانچہ جب عربوں نے مصر پر حملہ کیا تو قبطیوں اور یہودیوں نے، جو مسلمانوں کے عدل و انصاف کی داستانیں سن چکے تھے، ان کو خوش آمدید کہا، بڑھ چڑھ کر ان سے تعاون کیا اور ان کے زیرِ سایہ رہنے میں خوشی محسوس کی۔

مصر میں رومیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی شام اور فلسطین میں تھی۔ انھوں نے جان بُوجھ کر مصر کی طرف سے

---

[1] مصر کے اصلی باشندے

لاپروائی نہیں برتی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ عرب اس قدر سرعت کے ساتھ مصر کی جانب اپنی توجہات مبذول کرلیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ عرب سب سے پہلے شام اور فلسطین میں اپنی حکومت مضبوط کرنے پر زور دیں گے اور ایک لمبے عرصے تک کسی اور ملک کو فتح کرنے کا خیال بھی ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوگا۔

رومیوں کے مصر میں کئی اہم قلعے تھے۔ ان میں اہم ترین قلعے وہ تھے جو انھوں نے اسکندریہ کے ارد گرد تعمیر کیے تھے۔ ان قلعوں میں زبردست جنگی آلات موجود تھے جن کے ذریعے قلعے کی حفاظت کا کام لیا جاتا تھا۔ نیز اتنا سامان رسد و خوراک بھی موجود تھا جو شہر کی حفاظت کرنے والی پچاس ہزار فوج کے لیے مہینوں کافی ہو سکتا تھا[1]

اسکندریہ کے قلعوں کے علاوہ بابلیون، نقیوس اور کریون کے قلعے بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے اور بہت مضبوط تھے۔

جس وقت عرب مصر کی سرحدوں پر پہنچے ہیں تو رومیوں کو ان کے حملہ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ جب اچانک رومی قائدین کو لشکرِ اسلام کے سرحدِ مصر پر پہنچنے کی اطلاع ملی تو ان کے اضطراب اور پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ تاہم رومی حاکم قیرس جلدی جلدی تیاری کر کے اپنے صدر مقام اسکندریہ سے بابلیون کے قلعہ کی طرف روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر عربوں کے حملہ کو روکے۔ اسی اثنا میں اس کو معلوم ہوا کہ مسلمان فوجوں نے "فرما" کا رُخ بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک فوج "فرما" کی جانب بھی روانہ کی اس ارادہ سے کہ وہ فرما کی حفاظتی فوج کی مدد کر سکے اور جتنی دیر تک ممکن ہو عربوں کی فوجوں سے اس کو بچائے رکھے۔

"فرما" ایک چھوٹا سا شہر تھا جو عریش سے پچہتر میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ جب عربی لشکر نے عریش کو فتح کر لیا تو اُنھوں نے "فرما" کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ عربوں اور شہر کی محافظ فوج میں کئی جھڑپیں ہوئیں، آخر کار عرب شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

حضرت عمروؓ بن العاص "فرما" میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے بلکہ اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور راستے میں کسی مزاحمت کے بغیر "بلبیس"[2] پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک مہینہ تک جاری رہا۔ آخر رومی لشکر کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ اس سے مسلمانوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ بلبیس میں رومیوں کی تعداد بارہ ہزار تھی لیکن عرب تین ہزار چند سو سے زیادہ نہ تھے اس معرکہ میں عربوں کے ہاتھوں تین ہزار سے زیادہ رومی مارے گئے تھے۔ بلبیس پر، جو مصر کے مشرقی حصہ کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا، عربوں کی فتح نے مصریوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ایران، شام، فلسطین اور عراق میں مسلمانوں کی فتوحات نے مصریوں کے دلوں کو پہلے ہی مرعوب کر رکھا تھا۔ جب انھوں نے اپنی سرزمین میں بھی انھی واقعات کو

---

[1] فتح مصر از بٹلر

[2] یہ شہر آج بھی موجود ہے اور قاہرہ اور عریش کے درمیان مصر کے مشرقی حصہ میں قاہرہ سے ۳۵ میل اور "فرما" سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

رونما ہوتے دیکھا تو عربوں کی تعظیم و تکریم میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ یہ واقعہ ہے کہ مصر میں عربوں کی فتوحات کی بڑی وجہ ان کا اس سرزمین پر اچانک حملہ اور ان کا وہ رعب تھا جو مصریوں کے دلوں میں عربوں کی گزشتہ فتوحات کی وجہ سے پیدا ہوچکا تھا۔

حضرت عمروؓ بن العاص بلبیس میں کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد اپنی فوج کو لے کر مشرقی صحرا کو قطع کرتے ہوئے ام دنینؔ[1] پہنچے۔ اس جگہ ایک رومی فوج موجود تھی۔ مصر میں رومی فوجوں کا سپہ سالار تیدور اس فوج کا سردار تھا۔ اس کے ساتھ ہی مصر کا رومی حاکم قیرس بھی تھا۔ جب ان دونوں نے سنا کہ عرب اس طرف آرہے ہیں تو وہ بڑے پریشان ہوئے۔ مقابلہ کی تیاری کی لیکن بے سود۔ رومی لشکر نے بُری طرح شکست کھائی اور عرب ام دنین پر قابض ہوگئے۔ حضرت عمروؓ نے اس کو اپنے لشکر کے لیے ایک فوجی چھاؤنی بنا لیا۔

ام دنین کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص آگے بڑھے اور قلعۂ بابلیون پر پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس جگہ رومیوں نے بڑی زبردست فوج اکٹھی کر رکھی تھی کیونکہ ان کو پتا تھا کہ اگر یہ قلعہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تو مصر سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ فیصلہ کیا کہ قلعہ پر حملہ نہ کیا جائے بلکہ پہلے وسطی مصر کو فتح کیا جائے کیونکہ اس طرح ایک تو رومیوں پر رُعب پڑے گا، دُوسرے رومیوں کی قوت مجتمع نہیں ہو سکے گی بلکہ بٹ جائے گی۔ جب مدینہ سے کمک پہنچ جائے گی تب اس قلعہ پر بآسانی حملہ کر کے رومیوں کی قوت کو توڑا جا سکے گا۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے پیش قدمی کا پروگرام بہت ہوشیاری سے بنایا تھا۔ وُہ اپنی فوج کو لے کر پہلے "منفیس" پہنچے جو قدیم زمانہ میں فراعنہ کا دارالحکومت تھا۔ اس پر قبضہ کرکے مغربی جانب مُڑے اور شہر "فیوم" کا قصد کیا۔ قریب پہنچ کر پتا چلا کہ "فیوم" میں رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ یہ سُن کر اُنھوں نے "فیوم" پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کرکے "بہنسا" کا رُخ کیا۔ اسے فتح کرنے کے بعد ابھی وہیں مقیم تھے کہ اُنھیں پتا چلا کہ رومی سپہ سالار کچھ فوج لے کر ان کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ وُہ پلٹے اور ان کی فوج کو شکست دی۔

رومیوں نے فیوم میں اس غرض کے لیے بڑی زبردست فوج اکٹھی کر رکھی تھی کہ مسلمان ضرور اس طرف آئیں گے اور وہ بآسانی ان سے نپٹ لیں گے۔ لیکن حضرت عمروؓ بن العاص وسطی مصر (جیزہ، فیوم، بنی سویف) کے علاقوں میں اپنا رُعب ڈال کر تیزی سے شمالی جانب مُڑ گئے اور رومیوں کو دوبارہ نئے سرے سے اپنے لشکر کی تنظیم کرنی پڑی اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے اُنھوں نے جو تیاری کی تھی وہ سب اکارت گئی۔ اس سے ان کو بے حد اضطراب اور ڈر پیدا ہوگیا۔ مسلمان اس تیزی سے مختلف علاقوں میں نقل و حرکت کر رہے تھے کہ رومی حیران تھے کہ آخر کس جگہ مسلمانوں کا جم کر مقابلہ

---

[1] ام دنین دریائے نیل کے مشرقی کنارے بابلیون کے قلعہ کے شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ بعد میں اسی علاقہ میں قاہرہ آباد کیا گیا۔

کیا جائے۔ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ آج اگر جیزہ میں ہیں تو کل فیوم اور پرسوں کسی اور جگہ۔ اسلامی لشکر کی اس تیزی اور پھرتی سے نقل و حرکت بھی منجملہ ان اسباب کے تھی جنھوں نے ان کو مصر میں کامیابی کا منہ دکھایا۔

قاہرہ اور فیوم کے علاقوں میں رومیوں کے لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار نفوس سے کسی طرح کم نہ تھی اور ان کے دفاعی خطوط اور مضبوط قلعوں کا سلسلہ دور تک پھیلا گیا تھا۔ لڑائی میں جس جس سامان اور جس رسد کی ضرورت ہوتی وہ ان کے پاس موجود تھی۔ انھیں دشمن سے لڑنے کے لیے دشمن کے علاقہ میں نہیں جانا پڑتا تھا بلکہ وہ خود اپنے علاقہ میں موجود تھے۔ اس کے بالمقابل عربوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ سامانِ جنگ کی ان کے پاس بے حد قلت تھی، ان کو اپنے وطن سے بے حد دور ایک ایسے علاقہ میں دشمن کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جہاں کی نہ انھیں زبان آتی تھی اور نہ اس علاقہ کا انھیں کچھ علم تھا۔

لیکن بے پناہ دینی جذبہ، موت سے بے خوفی، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی امداد پر بھروسا۔ یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے ان کو ہر میدان میں کامیابی بخشی۔ نہ مضبوط قلعے ان کو آگے بڑھنے سے روک سکے اور نہ پہاڑ ان کے سدِ راہ بن سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسی قوم کے آگے نہ ٹھہر سکتے جس کے پاس ان لوگوں سے سیکڑوں گنا زیادہ قوت، طاقت، لشکر اور سامانِ جنگ تھا۔

اسلامی لشکر کی یہ نقل و حرکت جو مئی سنہ ۶۴۰ء کے آخر میں شروع ہوئی تھی چند ہفتے بڑی تیزی سے جاری رہی۔ جولائی کے مہینے میں حضرت عمروؓ بن العاص کو پتا چلا کہ حضرت زبیر بن العوام کی سرکردگی میں مدینہ سے کمک آ رہی ہے۔ یہ سن کر وہ ان فوجوں کے استقبال کے لیے "ام دنین" پہنچے۔ ان فوجوں کے آنے سے مصر میں عربی فوجوں کی مجموعی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔

(۱۴)

صلح کی بات چیت

معرکۂ عباسیہ

جب حضرت عمروؓ بن العاص کو کمک پہنچ گئی تو آپ نے اس امر پر غور کرنا شروع کیا کہ آیا قلعۂ بابلیون پر از خود حملہ کر کے اسے فتح کیا جائے یا رومیوں کے قلعہ سے باہر نکلنے کا انتظار کیا جائے آخر کار بہت غور و فکر کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ ابھی کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہیے تاکہ اپنی قوت اور لشکر کو مضبوط کرنے کا موقع بھی مل جائے۔ چنانچہ وہ مطریہ میں مقیم ہو گئے۔ کچھ روز تک مسلمانوں اور رومیوں میں چھیڑ چھاڑ نہ ہوئی۔ آخر کار ایک روز حضرت عمروؓ بن العاص کے جاسوسوں نے انھیں خبر دی کہ چالیس ہزار رومی فوج مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے قلعہ سے باہر نکلی ہے۔ اس کے علاوہ دس ہزار فوج اور ہے جو اس خیال سے قلعہ کے اندر چھوڑ دی گئی ہے کہ مسلمان موقع پا کر پیچھے سے قلعہ پر حملہ نہ کر دیں۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے اس عظیم لشکر کے مقابلہ کے لیے جنگی سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہا۔ آپ نے اپنے لشکر کے تین حصے کیے، ایک حصہ کو مغرب میں امّ دنین اور دوسرے حصہ کو مشرق میں ثنیۃ الجبل[1] کی جانب روانہ کیا اور ان دونوں حصوں کے

---

[1] یہ جگہ موجودہ قلعۂ قاہرہ کے قریب واقع تھی۔

سرداروں کو ہدایت کی کہ وہ پچھلی جانب سے رومی لشکر کے دونوں بازوؤں پر حملہ کریں حضرت عمرو بن العاص خود سامنے کی جانب سے رومی لشکر کے مقابلہ کے لیے آئے۔

رومی لشکر بڑھتے بڑھتے اس جگہ پہنچا جہاں آج کل قاہرہ کا محلہ عباسیہ آباد ہے۔ یہاں اسلامی لشکر پہلے سے موجود تھا صفیں مرتب ہوئیں اور لڑائی شروع ہوگئی۔ شروع میں رومیوں کا پلہ بھاری تھا۔ ابھی لڑائی جاری ہی تھی کہ اسلامی فوج کا وہ دستہ جو خارجہ بن حذافہ کی زیرِ سرکردگی پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا اپنی کمین گاہوں سے نکلا اور اچانک رومیوں کے دائیں بازو پر آپڑا۔ رومی اس ناگہانی حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں شدید گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی اور وہ بائیں جانب ام دنین کی طرف مڑے جہاں عربی فوج کے دوسرے حصہ نے نیزوں اور تلواروں سے ان کا استقبال کیا۔ اب تین جانب سے رومیوں پر حملہ ہو رہا تھا۔ رومی سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اس حصار سے نکلیں۔ بڑے معرکہ کا رن پڑا، مسلمانوں نے رومیوں کی صفوں کی صفیں اُلٹ دیں۔ جو لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے وہ قلعۂ بابلیون پہنچے اور قلعہ میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ بے شمار مالِ غنیمت اور سامانِ جنگ عربوں کے ہاتھ آیا اور وہ مطریہ سے لے کر قلعۂ بابلیون تک سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔ جب اس معرکہ کی خبر "فیوم" اور "ابویط" میں مقیم رومی فوجوں کو پہنچی تو ان کے دلوں پر ایسی دہشت سوار ہوئی کہ وہ ان دونوں شہروں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے اپنی فوج کے چند دستے ان کی جانب بھیجے جنھوں نے ان دونوں شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ آپ نے چند اور دستوں کو اردگرد کے علاقہ میں بھیجا، جنھوں نے جیزہ، منف اور اتریب وغیرہ شہروں کو فتح کیا۔

جب حضرت عمرو بن العاص وسطی مصر کی فتح سے فارغ ہوئے تو آپ نے ماہِ ستمبر ۶۴۰ء میں قلعۂ بابلیون کا پوری طرح محاصرہ کر لیا۔ عباسیہ کا معرکہ جولائی میں ہو چکا تھا۔ قلعہ میں رومی فوجوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی کیونکہ معرکۂ عباسیہ میں ان کے لشکر کا اکثر حصہ موت کے گھاٹ اُتر چکا تھا۔

تیدور ——— رومی لشکر کا سپہ سالار ——— قلعہ میں موجود رومی فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ مصر کا حاکم اور شہنشاہِ ہرقل کا نائب قیرس بھی وہیں تھا۔ قلعہ میں جتنے لوگ تھے سب پر انتہائی درجہ کا خوف و ہراس طاری تھا کیونکہ وہ اس بات سے قطعاً ناامید ہو چکے تھے کہ عربوں کو قلعہ پر قبضہ کرنے سے روک سکیں گے اور ان کو پیچھے ہٹا دیں گے۔ ان کو اس بات کا بھی یقین کامل ہو گیا تھا کہ شام اور فلسطین کے معرکوں میں رومی لشکر کے بُری طرح شکست کھانے کے بعد اب ہرقل ان کی مدد کے لیے کوئی فوج نہیں بھیج سکے گا۔

ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قیرس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب ہمارے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم عربوں سے صلح کر لیں۔ اس کے ساتھیوں نے رضامندی ظاہر کر دی اور اس کو اختیار دے دیا کہ وہ عربوں سے مل کر صلح کی بات چیت کرے۔ چنانچہ قیرس نے چند آدمیوں کا ایک وفد حضرت عمرو بن العاص کی خدمت میں بھیجا۔ عربی سپہ سالار نے وفد کی بہت تعظیم و تکریم کی اور بڑے غور سے اس کی باتیں سنیں۔ رومی وفد کا قائد بابلیون کا اسقف تھا۔ اس نے

حضرت عمروؓ بن العاص سے کہا کہ رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے بڑی زبردست طاقت جمع کر رکھی ہے اور ان کے پاس بے شمار سامانِ جنگ بھی موجود ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ رومیوں سے صلح کر لیں۔

عربی سپہ سالار نے جواب میں کہا کہ رومیوں اور مصریوں کے لیے صرف تین راستے ہیں، ان میں سے وہ جس راستہ کو چاہیں اپنے لیے چُن لیں۔

پہلا یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے بھائی بن جائیں گے۔ جن فوائد سے اس وقت مسلمان متمتع ہو رہے ہیں انہی فوائد سے وہ بھی متمتع ہوں گے۔ اور جو مسلمانوں سے لیا جاتا ہے وہی ان سے لیا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ جزیہ ادا کرنا منظور کریں۔ تیسرا یہ کہ لڑائی کے ذریعہ فیصلہ کر لیا جائے۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے رومی وفد کو اپنے لشکر میں دو روز تک ٹھہرائے رکھا۔ اس دوران میں وفد نے اس رُوح کا بغائر مطالعہ کیا جو مسلمانوں میں موجود تھی اور اس جوش و خروش کو بھی دیکھا جو ہر مسلمان سپاہی کے دل میں موجزن تھا۔

جب رومی وفد واپس قلعہ میں پہنچا تو قیرس نے ان سے مسلمانوں کے حالات دریافت کیے۔ انھوں نے جواب دیا:

"ہم نے ایسی قوم کو دیکھا ہے جسے موت زندگی سے زیادہ پیاری ہے اور تواضع تکبر سے زیادہ پسندیدہ ہے، ان میں سے کوئی شخص دنیا اور متاعِ دنیا کا حریص نہیں ہے۔ وہ زمین پر بیٹھنے میں عار محسوس نہیں کرتے، وہ بغیر دستر خوان کے کھانا کھا لیتے ہیں، ان کا سردار بھی ان ہی جیسا ہے، وہ کسی بات میں ان سے ممتاز نہیں، اعلیٰ ادنیٰ اور آقا و غلام کی ان میں کوئی تمیز نہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو سب وضو کر کے ایک قطار میں کھڑے ہو کر انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔"

قیرس کی خواہش پر حضرت عمروؓ بن العاص نے بھی ایک وفد قلعہ میں بھیجا۔ اس وفد نے بھی وہی شرائط رومیوں کے سامنے رکھیں جو حضرت عمروؓ بن العاص نے اسقف کے سامنے رکھی تھیں یعنی اسلام یا جزیہ یا لڑائی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان شرائط سے کسی صورت میں بھی عدول نہیں کیا جائے گا۔ لیکن رومیوں نے ان میں سے کوئی شرط بھی نہیں مانی۔ چنانچہ عربوں اور رومیوں کے درمیان سفارتی بات چیت ختم ہو گئی اور عربی وفد نے واپس آ کر حضرت عمروؓ بن العاص کو وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے قلعہ میں دیکھا یا سُنا تھا۔

یہ سُن کر حضرت عمروؓ بن العاص نے ارادہ کیا کہ اب جبکہ بات چیت ناکام ہو چکی ہے رومیوں سے لڑائی کرنے میں جلدی کی جائے اور بہ قوت تمام قلعہ کو رومیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیا جائے کیونکہ بابلیون اگر رومیوں سے لے لیا گیا تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وسطی اور بالائی مصر سے رومی سلطنت ختم ہو گئی۔

حضرت عمروؓ بن العاص جنگی تیاریوں اور فوجوں کی ترتیب میں مصروف تھے کہ انھیں قیرس کا پیغام ملا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ماہ کے لیے عارضی صلح کر لی جائے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہ درخواست مسترد کر دی اور جواب میں کہلا بھیجا کہ صرف تین دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس عرصہ میں تم لوگوں نے ہماری تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط قبول کر لی تو خیر، ورنہ

پھر جنگ کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہے گی۔

قبل اس کے کہ حضرت عمروؓ بن العاص کو رومیوں کی جانب سے کوئی جواب ملتا یا تین روز کی مدت ختم ہوتی رومی فوجیں اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قلعہ سے باہر نکلیں اس ارادہ سے کہ وہ مسلمانوں پر بے خبری کی حالت میں حملہ کرکے انھیں تباہ و برباد کردیں گی۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ مسلمان پوری طرح چوکنے اور تیار تھے۔ لڑائی ہوئی اور حسبِ معمول رومی فوج کو شکست فاش اٹھانی پڑی وہ قلعہ کی طرف پلٹی اور دروازہ بند کرلیا۔

اب رومیوں کے کس بل نکل چکے تھے۔ اپنی طاقت اور قوت کے متعلق انھیں جو گھمنڈ تھا وہ خاک میں مل چکا تھا۔ ان کو یقین ہوگیا کہ مسلمان ضرور قلعہ پر قابض ہوجائیں گے اور پھر ان کی خیر نہیں۔ چنانچہ انھوں نے دوبارہ صلح کی بات چیت شروع کی۔ اپنے قاصدوں کے ہاتھ اسلامی سپہ سالار کے پاس کہلا کر بھیجا کہ وہ جزیہ دینا اور اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ رہنا قبول کرتے ہیں۔ اس لیے صلح کی بات چیت شروع کی جائے۔ چنانچہ طرفین میں دوبارہ بات چیت شروع ہوئی اور چند شرائط پر دونوں کا اتفاق ہوگیا۔ یہ پہلا معاہدہ تھا جو مصر میں رومیوں اور عربوں کے درمیان ہوا۔

معاہدہ کی شرطیں مندرجہ ذیل تھیں:

۱۔ یہ صلح جزیہ پر کی جاتی ہے۔

۲۔ اس صلح کا نفاذ اس وقت ہوگا جب شہنشاہِ ہرقل اس کی منظوری دے دے گا۔

۳۔ اگر ہرقل منظوری نہ دے گا تو صلح باطل سمجھی جائے گی۔

۴۔ ایک مہینے تک دونوں فوجوں میں لڑائی بند رہے گی۔ ہر لشکر اپنی اپنی جگہ پر رہے گا، آگے نہیں بڑھے گا۔

یہ معاہدہ حیّزِ تحریر میں آنے کے بعد قیرس قلعہ سے نکل کر اسکندریہ گیا اور وہاں سے شہنشاہِ ہرقل کو معاہدہ کی تمام تفصیلات لکھ بھیجیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ عربوں کو شکست دے کر انھیں سرزمینِ مصر سے باہر نکال دینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

سلطنتِ روما کے مورخین نے لکھا ہے کہ قیرس کا خط ملنے پر شہنشاہ نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ وہ سمندر کے راستے قسطنطنیہ پہنچا اور شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہوکر مصر کے تمام حالات سے، جو اس نے بچشمِ خود ملاحظہ کیے تھے، ہرقل کو آگاہ کردیا۔ لیکن شہنشاہ نے قیرس کو خوب سخت سُست کہنے کے بعد اس کے عذر کو تسلیم کیا اور معاہدہ کی توثیق کرنے سے انکار کردیا اور اسے قسطنطنیہ سے بہت دُور نظر بند کرادیا۔

اِدھر مصر میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان پھر جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ رومی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد قلعہ سے اس امید پر نکلتے کہ مسلمانوں پر اچانک حملہ کرکے انھیں نقصان پہنچا سکیں گے، لیکن ہر بار انھیں منہ کی کھانی پڑتی اور وہ پسپا ہوکر پھر قلعہ میں آجاتے۔ جب رومی آئے دن کی شکستوں سے تنگ آگئے، اور قلعہ کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا تو سات ماہ کے طویل عرصہ کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی، جو قبول کرلی گئی۔ حضرت عمروؓ بن

العاص نے انھیں امان نامہ لکھ کر دے دیا جس میں کہا گیا تھا کہ رومی تین دن کے اندر اندر قلعے سے نکل جائیں گے، وہ اپنے ساتھ صرف اتنا سامانِ خوراک لے جا سکیں گے جو چند روز کے لیے انھیں کافی ہو۔ قلعہ میں جو سامان اور ذخائر وغیرہ ہیں، انھیں ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ نیز شہر کے باشندوں کو جو اپنے دین پر قایم رہیں گے، جزیہ دینا ہوگا۔

قلعہ پر اسلامی جھنڈا ۶ را پریل ۶۴۱ء بروز جمعہ لہرایا گیا اور رومیوں کے نکل جانے کے بعد ۹ را پریل کو قلعہ پر اسلامی فوجوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ قلعہ کو فتح کرنے کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے پہلا کام یہ کیا کہ قلعۂ بابلیون اور روضہ و جیزہ کے درمیان دریائے نیل پر دو پل بنوائے۔ اس طرح عرب فوجوں کے لیے دریائے نیل کے دوسرے کنارے پر جانے اور نقل و حرکت کرنے میں بے حد آسانی ہو گئی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے قریبی علاقوں میں فوجیں بھیجنی شروع کیں۔ ہر شہر اور بستی کے باشندوں نے انھی شرائط پر مسلمانوں سے صلح کر لی جن شرائط پر قلعۂ بابلیون کے باشندوں نے کی تھی۔ انھوں نے جزیہ دینا اور اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا منظور کر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ محض قلعۂ بابلیون پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے عرب تمام وادیٔ نیل کو اپنے قبضہ میں لانے میں کامیاب ہو گئے اور سارے علاقہ میں ان کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا۔

حضرت عمروؓ بن العاص چند روز بابلیون میں قیام پذیر رہے اور شہر کا نظم و نسق درست کرتے رہے۔ یہیں سے حضرت عمرؓ کو فتح کی خوشخبری بھیجی اور دیگر مصری شہروں خصوصاً اسکندریہ کو فتح کرنے کے لیے مزید کمک طلب کی۔ مئی کا مہینہ شروع ہونے سے قبل ہی آپ اپنی فوج کو لے کر قلعۂ اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ البتہ فوج کا ایک دستہ عبداللہ بن حذافہ سہمی کی زیرِ قیادت بابلیون کی حفاظت کے لیے یہیں چھوڑ دیا۔

---

(۱۵)

فتح اسکندریہ

حضرت عمروؓ بن العاص مغربی صحرا کے راستے اسکندریہ روانہ ہوئے۔ پہلے فسطاط پہنچے، وہاں سے امبابہ۔ اس کے بعد عزبتہ المناشی، پھر طرانہ۔ اس سفر میں آپ کو چند ہفتے (مئی، جون) لگے جس میں رومیوں سے کئی جنگیں بھی پیش آئیں لیکن سب میں مسلمانوں ہی کو فتح نصیب ہوئی۔ ان جنگوں میں سب سے بڑی جنگ "جنگِ کریون" تھی اس جگہ رومیوں نے کثیر تعداد میں فوج جمع کر رکھی تھی اور وہ لڑے بھی بہادری سے۔ عربوں کو انھیں شکست دینے میں بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ لیکن بالآخر رومی فوج نے شکست کھائی اور وہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئی۔ مسلمانوں نے قلعہ پر قابض کر لیا۔ یہاں سے کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔

"کریون" کی فتح اور یہاں کے نظم و نسق کی ترتیب سے فارغ ہو کر حضرت عمروؓ بن العاص اسکندریہ پہنچے اور شہر کے سامنے ڈیرے ڈال دیے۔

اسکندریہ کا قلعہ مصر کا مضبوط ترین قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر میں رومی فوجوں کی تعداد پچاس ہزار نفوس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جن کے پاس بہترین اسلحہ اور وافر مقدار میں سامانِ خوراک موجود تھا۔ شہر کے پچھلی جانب سے سمندر اس کی حفاظت کرتا تھا اور باقی تین اطراف سے مضبوط فصیل۔ اس وجہ سے اس کی فتح کی مہم بے حد کٹھن تھی۔

مسلمانوں نے اسکندریہ کی پوری طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی جس سے وہاں کے باشندوں کی تجارت اور معاشی و اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ اسکندریہ مصر کا زبردست تجارتی مرکز اور ایک بہت بڑی بندرگاہ تھی اس کی آبادی بھی تین لاکھ سے کم نہ تھی اتنے آدمیوں کا شہر کی فصیل میں کئی مہینے کے لیے محصور ہو جانا ان کے لیے شدید بے چینی کا باعث ہوا۔

حضرت عمروؓ بن العاص قاہرہ اور اسکندریہ کے راستہ میں رومیوں کو شکست دیتے اور ان کے بڑے بڑے مرکزوں اور قلعوں کو فتح کرتے ہوئے اواخر جولائی میں اسکندریہ پہنچے تھے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو اسکندریہ ان پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا جو تمام اطرافِ نیل سے بھاگ بھاگ کر وہاں آئے تھے۔

اسلامی لشکر نے اپنے ڈیرے قلعہ اسکندریہ کے قریب نہیں بلکہ بہت پیچھے ہٹ کر ڈالے تھے تاکہ وہ قلعہ کی حفاظت کرنے والی فوج کے حملہ سے محفوظ رہ سکے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے تھوڑی سی فوج ساتھ لے کر قلعہ پر ایک معمولی سا حملہ اس غرض سے کیا کہ قلعہ کے کمزور مقامات کا پتا چل سکے اور شہر پر قبضہ کرنے کی کوئی راہ معلوم ہو سکے۔ لیکن قلعہ کی فصیل پر سے رومیوں نے اسلامی فوج پر آگ پھینکنی اور منجنیقوں سے پتھر گرانے شروع کیے۔ حضرت عمروؓ بن العاص فوج کو لے کر پیچھے ہٹ آئے اور قلعہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب وقت کی ٹوہ میں رہے۔

اس دوران میں رومی شہنشاہی پر ادبار کی گھٹائیں چھا چکی تھیں۔ ہرقل کو شام میں جن زبردست شکستوں اور پے درپے ناکامیوں سے دوچار رہنا پڑا تھا، ان سے اس کے دل کو سخت صدمات پہنچے تھے۔ آخر انہی صدمات کی تاب نہ لا کر وہ ۱۴۱ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام قسطنطین اور چھوٹے کا کلوناس تھا۔ یہ دونوں سگے بھائی نہیں تھے۔ قسطنطین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ کلوناس کی والدہ "مرتینہ" زندہ تھی اور قیصر کے آخری زمانہ میں مہماتِ سلطنت میں اس کی شریک رہتی تھی۔ قیصر کی وفات کے بعد اس نے چاہا کہ اس کا بیٹا کلوناس تخت پر بیٹھے تاکہ امورِ سلطنت میں اس کا عمل دخل اسی طرح برقرار رہے جس طرح قیصر کی زندگی میں تھا۔ لیکن چونکہ قسطنطین بڑا لڑکا تھا اس لیے قانوناً اسی کو تخت پر بیٹھنے کا حق پہنچتا تھا۔ چونکہ قسطنطین، کلوناس اور اس کی والدہ میں اقتدار کے حصول کی جنگ شروع ہو گئی تھی اس لیے سلطنت کے امراء اور رؤسا بھی مختلف دھڑوں میں بٹ گئے حالانکہ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام ملک میں مکمل اتحاد ہوتا اور ملک کا ایک ہی قاید اور ایک ہی بادشاہ ہوتا۔

بہرحال قسطنطین تخت پر بیٹھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے مصر کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اسکندریہ کے سپہ سالار کو قسطنطنیہ بلایا اور مصر کے جنگی حالات کے متعلق اس سے تبادلۂ خیالات کیا۔ قسطنطین نے سپہ سالار سے وعدہ کیا کہ وہ مصر کی رومی فوجوں کو مزید کمک بھیجے گا۔ لیکن ابھی اس کا ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہوا تھا کہ اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے

کر اس کے چھوٹے سوتیلے بھائی کی والدہ ملکہ مرتینہ نے اسے ہلاک کرنے کی سازش کی تھی تاکہ زمامِ حکومت اس کے بیٹے کے ہاتھ میں آجائے اور وہ حسبِ سابق سلطنت کے کاموں میں دخیل ہو سکے۔

قسطنطین کی وفات کے بعد نئے بادشاہ "کلوناس" نے مصر کے سابق حاکم قیرس کو جسے اس کے والد نے جلا وطن کر دیا تھا اپنے عہدہ پر بحال کر دیا اور اسے مصر بھیجا کہ وہ عربوں سے مصالحت کی بات چیت کرے اور وادیٔ نیل میں جنگی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔

قیرس اسکندریہ میں ستمبر ۶۴۱ء کو وارد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مصر میں، رومی فوجوں کا سپہ سالار "تیہ ودر" بھی واپس آیا۔ قیرس کا باشندگانِ اسکندریہ نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان کو اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ قیرس ان کو تباہی سے بچائے گا۔

اسکندریہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ماہِ اکتوبر کے آخر میں، قیرس خفیہ طور پر دریائے نیل کے راستہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے ملنے فسطاط آیا جو ان دنوں اپنے لشکر کو اسکندریہ کی فصیلوں کے ارد گرد چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے قیرس کا اس کے شایانِ شان استقبال کیا اور اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آئے۔

اب دونوں قائدین کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہوئی جو ماہ نومبر ۶۴۱ء میں ختم ہوئی۔ آخر مندرجہ ذیل شرائط پر دونوں کا اتفاق ہو گیا:

۱۔ فریقین کے درمیان عارضی صلح گیارہ ماہ تک رہے گی۔

۲۔ عارضی صلح کے دوران میں عرب اپنی اپنی جگہ پر رہیں گے اور اسکندریہ کو فتح کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

۳۔ رومی لڑائی سے باز رہیں گے۔

۴۔ اسکندریہ کی محافظ فوج سمندر کے راستے اپنے وطن واپس چلی جائے گی۔ لشکر اپنا سامان واپس لے جا سکے گا' البتہ جو لوگ خشکی کے راستے سفر کریں گے، انھیں جب تک وہ سرزمینِ مصر میں رہیں گے، ہر ماہ اپنے سامان کا کچھ حصہ مسلمانوں کو دینا ہو گا۔

۵۔ رومی لشکر مصر واپس نہیں آئے گا اور نہ یہاں اپنا قدم جمانے کے لیے کسی قسم کی کوئی حرکت کرے گا۔

۶۔ مسلمان مسیحیوں کے گرجاؤں پر قبضہ کرنے اور ان کے دینی امور میں مداخلت کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔

۷۔ جو شخص مصر میں رہنا چاہے اسے جزیہ دینا ہو گا۔

۸۔ یہودیوں کو اسکندریہ میں رہنے کی اجازت ہو گی۔

۹۔ رومی ان شرائط پر قائم رہنے کی ضمانت کے طور پر ۱۵۰ رومی افسر لوگ اور ۵۰ باشندگانِ شہر بطور یرغمال مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔

معاہدہ کی یہ شرطیں " خانقیوسی" کی بیان کردہ ہیں۔ لیکن مورخینِ عرب کا کہنا ہے کہ فریقین میں صرف اس بات پر اتفاق ہُوا تھا کہ مصریوں کو جزیہ دینا پڑے گا جس کی مقدار پچاس ہزار تھی۔ اس کے سوا کسی عربی مورخ نے دوسرے امور کا تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ معاہدہ زبانی ہوا تھا، تحریری نہیں۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد قیرس اسکندریہ واپس آگیا اور اس کی اطلاع قسطنطنیہ میں شہنشاہ کو بھیج دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ اس نے معاہدہ کی شرائط منظور کر لی ہیں۔ ادھر حضرت عمروؓ بن العاص نے بھی معاویہ بن خدیج کندی کو امیرالمومنینؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا کہ بارگاہِ خلافت سے معاہدہ کی شرائط کی منظوری حاصل ہو سکے۔

مدینہ پہنچ کر معاویہ نے اپنی اُونٹنی مسجدِ نبویؐ کے دروازہ پر بٹھائی، ظہر کا وقت تھا، انھیں امیرالمومنینؓ کی ایک خادمہ نے دیکھا اور ان سے نام پوچھا۔

معاویہ نے کہا کہ وہ عمروؓ بن العاص کے قاصد ہیں۔

خادمہ نے حضرت عمرؓ کو خبر کی۔ آپ نے فوراً معاویہ کو بلا لیا اور پُوچھا:

"کیا خبر لائے ہو؟"

معاویہ نے کہا:

"امیرالمومنین! میں ایک خوشخبری لایا ہُوں۔ خدا تعالیٰ نے اسکندریہ کو ہمارے ہاتھوں فتح کرا دیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے پُوچھا:

"تم آتے ہی مجھ سے کیوں نہیں ملے؟"

معاویہ نے جواب دیا:

"میں اس وقت مدینہ پہنچا تھا جب آپ کے آرام کا وقت تھا۔ میں سمجھا کہ آپ سو رہے ہوں گے اس لیے میں نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"تم نے غلط خیال کیا اگر میں دن میں سو جاؤں گا تو رعایا کا نقصان کروں گا اور اگر رات کو سو جاؤں گا تو اپنا نقصان کروں گا۔ میں ان دونوں اوقات میں کیسے سو سکتا ہوں؟"

حضرت عمرؓ فوراً مسجد میں تشریف لاتے اور اذان کا حکم دیا۔ مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے۔ آپ منبر پر چڑھے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد انھیں خوشخبری سنائی کہ اسکندریہ فتح ہو گیا ہے اور تمام مصر نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے۔

قیرس نے اسکندریہ واپس جا کر معاہدہ کی شرائط کے متعلق سب سے پہلے رومی سپہ سالار تیدورد کو مطلع کیا تھا۔ اس نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد قیرس نے چاہا کہ نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ معاہدہ کی شرائط پر عمل درآمد شروع کیا جائے۔

عام لوگوں میں دفعتہً اس خبر کی تشہیر کرنی اس نے مناسب نہ سمجھی، کیونکہ اس طرح تمام اسکندریہ میں ایک ہیجان برپا ہو کر شہر کا امن و امان غارت ہو جاتا، جس کے نتیجہ میں اسے معاہدہ توڑنا پڑتا اور یہ اسکندریہ والوں کے لیے اور بھی تباہ کن ہوتا۔ اس کے لیے قیرس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب وہ اسکندریہ کے حکام اور فوجی سرداروں کو اس معاہدہ کی شرائط کے متعلق اپنا ہم خیال بنا چکا تو اس نے ایک عام اجتماع منعقد کرنے کا حکم دیا۔ جب تمام شہر ایک میدان میں اکٹھا ہو گیا تو اس نے تقریر شروع کی جس میں رومی حکومت کی حالت اور اس کی کمزوری کی تمام تفصیلات بیان کیں۔ اس کے بعد عربوں کے مصر پر حملہ کا تذکرہ کیا اور اشارۃً و کنایۃً اس صلح کا بھی ذکر کیا جو اس نے اسلامی فوج کے سپہ سالار سے کی تھی۔ اس نے مصلحتاً صلح کی شرائط تو نہیں بتائیں لیکن ان تمام وجوہ و بواعث کا ذکر کر دیا جن کی وجہ سے صلح کرنی ناگزیر تھی۔ آخر میں اس نے اہل اسکندریہ سے اپیل کی کہ جن شرائط پر اس نے مسلمانوں سے صلح کی ہے وہ اگرچہ مجمع عام میں نہیں بتائی جا سکتیں، تاہم تمام باشندے ان پر قائم رہنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے وقت کوئی رکاوٹ نہ ڈالنے کا اقرار کریں۔ کیونکہ جن حالات سے وہ آج گزر رہے ہیں ان کے پیش نظر شہر کی سلامتی اور شہر والوں کی جان و مال محفوظ رکھنے کے لیے جو سب سے بہتر طریقہ ہو سکتا تھا وہ اس نے اختیار کیا ہے۔

تمام حاضرین نے متفقہ طور پر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ بہر صورت صلح کی شرائط پر قائم رہیں گے اور ان کو توڑنے کی کوشش نہ کریں گے۔

باشندگانِ شہر کی طرف سے اطمینان ہونے پر قیرس نے معاہدہ کی شرائط سے شہنشاہِ روم کو اطلاع دی، جس نے انھیں منظور کر لیا اور ان پر عمل درآمد شروع کرنے کا حکم دے دیا۔

جب یہ تمام مراحل طے ہو گئے اور شرائط کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو رومی حکام خفیہ طور پر شہر سے باہر مسلمان سرداروں سے ملے اور ان سے یہ طے کیا کہ اسلامی فوج شہر کی فصیلوں کے نزدیک آ جائے۔ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں گے، فوج شہر میں داخل ہو جائے۔ تمام شہر اطاعت قبول کر لے گا اور جزیہ کی پہلی قسط بھی اسی وقت ادا کر دی جائے گی۔ (جزیہ تین قسطوں میں دینا قرار پایا تھا)

چنانچہ وقت معین پر عربی لشکر شہر کی فصیلوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ فوراً ہی یہ خبر تمام شہر میں مشہور ہو گئی عامۃ الناس معاہدہ کی شرائط سے بالکل بے خبر تھے۔ کیونکہ شہر کے حکام نے انھیں شرائط سے مطلع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ جوق در جوق فصیل کے برجوں پر پہنچنے شروع ہوئے کہ دیکھیں رومی فوج اور مسلمانوں کے درمیان کس طرح مقابلہ ہوتا ہے، لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ جونہی مسلمان شہر کے دروازوں پر پہنچے، دروازے کھول دئے گئے اور مسلمان امن و سلامتی کے ساتھ شہر میں داخل ہونے لگے۔

یہ دیکھ کر کہ سب معاملہ ختم ہو چکا ہے، مسلمانوں کے شہر پر قبضہ نہ ہو سکنے کے متعلق ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر چکا ہے اور فریقین میں مصالحت ہو گئی ہے، باشندگانِ شہر میں انتہائی اشتعال پیدا ہوا اور وہ قیرس کے محل پر پہنچے۔ قیرس باہر نکلا اور تفصیل سے تمام واقعات مجمع کے سامنے بیان کیے، اس نے کہا:

"اس صلح سے میرا مدعا صرف یہ تھا کہ میری قوم بچ جائے اور اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ عرب اتنے طاقت ور ہیں کہ اب ان کو کوئی چیز آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ ان سے مقابلہ کرنا بے سود ہے۔"

"خدا تعالیٰ کا یہی منشا ہے کہ وہ مصر کے حاکم بن جائیں اور خدا تعالیٰ کے منشاء کو پورا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ رومیوں کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ عربوں سے مصالحت کر لیتے، وہ اگر ایسا نہ کرتے تو تباہ ہو جاتے، خون کی ندیاں بہہ جاتیں، ان کے مال و اسباب ان سے چھن جاتے، ان تمام حوادث کے بعد جو لوگ زندہ رہ جاتے وہ مُردوں سے بدتر ہوتے، ان کے پاس کسی قسم کی ثروت اور جائداد نہ ہوتی اور وُہ نہایت ذلت سے زندگی بسر کرتے، دنیا میں ان کے لیے کسی جگہ بھی ٹھکانا نہ ہوتا اور وہ خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے۔"

"مسلمانوں سے صلح اس بات پر ہوئی ہے کہ اسکندریہ کے باشندوں کی جان و مال اور دین کی حفاظت کی جائے گی۔ اس صلح کے بعد جو چاہتا ہے کہ عیسائی سلطنت میں چلا جائے، اسے اس بات کا اختیار ہے، لیکن جو شخص مسلمانوں کے ماتحت ہو کر مصر ہی میں اپنی زندگی گزارنا چاہے، تو اسے اس بات سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

تقریر کے دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور حاضرین بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ قیرس نے قسم کھا کر کہا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے محض قوم کی خاطر کیا ہے۔ اس کا مقصد صرف اور صرف قوم کی بھلائی اور بہتری تھا۔ اس کی اس تقریر اور ان آنسوؤں نے لوگوں پر بے حد اثر کیا۔ ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور انھوں نے برضا و رغبت مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جزیہ کی پہلی قسط بھی اُنھوں نے فوراً مہیا کر دی۔ قیرس خود رقم لے کر جنوبی دروازے سے مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور مسلمانوں کے حوالے کی۔

اسکندریہ پر مسلمانوں کا رسمی قبضہ یکم محرم ۲۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۶۴۱ء کو ہوا۔ حضرت عمروؓ بن العاص چند روز بعد اپنے پورے لشکر کے ہمراہ شہر میں داخل ہوئے اور حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے کر شہر کے نئے انتظام میں مشغول ہو گئے۔

(۱۶)

کتب خانہ اسکندریہ

بعض مؤرخین حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ جب اسلامی فوجوں نے اسکندریہ کو فتح کیا تو وہاں ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا، جسے حضرت عمرؓ نے جلا دینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ وہ کتب خانہ بڑی بیدردی سے جلا دیا گیا اور اس طرح دنیا کو

ایک زبردست علمی دولت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ لیکن یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔

اسکندریہ نے مصر میں اس وقت سے علمی شہرہ حاصل کیا جب سے خاندانِ بطالسہ نے اس کو اپنی سلطنت کا دار الحکومت بنایا۔ رفتہ رفتہ یہ شہر دنیا کا علمی مرکز بن گیا۔ علوم و معارف اور فنونِ فلسفیہ کا یہاں دریا بہنے لگا۔ اسی زمانہ میں یہاں ایک کتب خانہ کی بنیاد رکھی گئی۔ سنہ ۴۷ ق م تک اس کتب خانہ میں علوم و فنون کی سات لاکھ کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔

اسی سال اسکندریہ والوں نے مشہور رومی سپہ سالار جولیس سیزر کے خلاف بغاوت کر دی۔ جولیس سیزر کو کیلو پٹرا نے جو شہنشاہ بطلیموس کی بہن اور امورِ مملکت میں اس کے ساتھ شریک تھی، اپنے بھائی کے خلاف اپنی مدد کے لیے بلایا تھا۔ عوام الناس نے قصر الملوک کا جہاں رومی شہنشاہ مقیم تھا، محاصرہ کر لیا۔ جولیس سیزر نے اس خیال سے کہ کوئی شخص اس تک نہ پہنچ سکے، محل کے چاروں طرف آگ روشن کروا دی اور خود بچ کر نکل گیا۔ اس آگ کے شعلے بڑھتے بڑھتے اس عدیم المثال کتب خانے تک بھی پہنچ گئے اور اس کے بڑے حصّہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

جولیس سیزر کے بعد جب "مرقص انطونی" کیلو پٹرا کے عشق میں گرفتار ہوا تو اس نے سنہ ۴۰ ق م کے لگ بھگ اس مصری ملکہ کو ایشیائے کوچک کے شاہانِ برجو کے کتب خانہ کی تمام کتابیں تحفہ کے طور پر پیش کیں۔ ان کتابوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی۔ اس طرح اس کتب خانے نے وہی حیثیت حاصل کر لی جو اسے آگ لگنے سے پہلے حاصل تھی۔ بعد میں روم اور یونان کے عہدِ بُت پرستی کی تالیفات کثرت سے اس میں جمع ہوتی رہیں۔

جب سرزمینِ مصر میں عیسائیت نے اپنا قدم رکھا تو وہاں کی علمی زندگی کو ایک نئے اور خاص رنگ میں ڈھال دیا۔ عیسائیت اور بُت پرستی میں مقابلہ شروع ہو گیا اور دورِ بُت پرستی کے کتب خانوں کے مقابلہ میں مسیحی کتب خانے قایم ہو گئے۔

جب عیسائی قیصروں نے مصر پر اچھی طرح تسلط جما لیا اور عیسائیت کو خوب اچھی طرح فروغ حاصل ہو گیا تو عہدِ بُت پرستی کے اس عظیم الشان کتب خانہ کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا اور اسکندریہ کے دوسرے کتب خانوں میں عیسائی مولفین کی کتابوں، کتبِ مقدسہ اور ان کی شروح کی بھرمار ہونے لگی۔

اس کے بعد شہنشاہ تھیوڈوسس (سنہ ۳۷۹ء تا سنہ ۳۹۵ء) کا عہدِ حکومت آیا۔ یہ بادشاہ نہایت ہی متعصب تھا اس نے مصر کے عہدِ بت پرستی کے تمام عبادت خانوں اور مدرسوں کو گرانے کا حکم دے دیا انہی عبادت خانوں اور مدرسوں میں اسکندریہ کا مشہور معبد "سراپیس" بھی تھا۔ اسکندریہ کا مذکورہ کتب خانہ بطالسہ کے قدیمی محلات کے منہدم ہونے کے بعد اس معبد میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح علم و فن کا وہ بیش بہا خزانہ، جو جولیس سیزر کے عہد کی آتش زدگی کے بعد بچنے والی تصنیفات، مکتبہ برجمیہ کی دو لاکھ کتابوں اور سنہ ۳۹۱ء تک اس کتب خانہ میں شامل ہونے والی نئی مؤلفات پر مشتمل تھا، نہایت بے دردی سے ضائع کر دیا گیا۔

سنہ ۴۱۵ء میں قبیلوں کے آبائی مذہب کے خلاف اسکندریہ میں ایک اور طوفان اُٹھا۔ یہ طوفان اسکندریہ کے پیٹریارک سیرلس اکبر نے اس عہد کے ایک بُت پرست فلسفی "ہیلیانیا" کے خلاف اٹھایا تھا۔ اس شورش میں نہ صرف یہ کہ اس غریب

فلسفی کی جان گئی، بلکہ شہر میں دو وبُت پرستی کی یادگار جو کچھ علمی کتابیں باقی رہ گئی تھیں، وہ بھی تباہ ہو گئیں۔

۵۲۹ء میں شہنشاہ جوسٹینین (جامع قانون جوسٹینین) نے عیسائیت کے علاوہ ہر مذہب کو کچل دینے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلہ میں اس نے بُت پرستوں کے واحد اور آخری مدرسہ" ایتھنا" کو بند کرنے اور سلطنتِ روما کے طول و عرض میں بُت پرستوں کے علما کی لکھی ہوئی ہر کتاب کو ضائع کر دینے کا حکم دے دیا۔

بار بار کی ان آتشزدگیوں اور مختلف شہنشاہوں کے ہاتھوں کتابوں کی تباہی کے بعد اس کتب خانہ میں کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا جسے مسلمان آکر جلاتے۔ اسی کی طرف " انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا " میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

" ابوالفرج ملطی نے کتب خانہ اسکندریہ کو عمروؓ بن العاص کے ہاتھوں آگ لگا دینے کی جو روایت بیان کی ہے وہ بالکل بے بنیاد اور صریحاً مغالطہ دہی ہے۔ کیونکہ ان آتشزدگیوں کے بعد جن میں اس کتب خانہ کا اکثر حصّہ برباد ہوا اور ۳۸۹ء میں شہنشاہ تھیوڈوسس کے حکم سے پیٹریارک تیوفیلس کے ہاتھوں اس کتاب خانہ کی تباہی کے بعد اس میں کوئی قابلِ ذکر کتاب باقی نہیں رہی تھی۔"

مسلمانوں کے ہاتھوں کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی کی روایت بہت بعد کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ متقدمین عرب و روم کی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر قطعاً ناپید ہے۔ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے چھ سو سال بعد تک کوئی مورخ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتا حالانکہ اس عرصہ میں بیسیوں کتابیں تاریخِ مصر اور مسلمانوں کی فتوحات کے بارے میں لکھی گئیں۔

فرانس کا مشہور مصنّف موسیو کرک کہتا ہے:

" فتح اسکندریہ کے وقت کتب خانہ مذکورہ موجود ہی نہیں تھا جسے مسلمان آگ لگاتے۔"

انگریز مورخ بٹلر اس روایت کے متعلق لکھتا ہے:

" میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی بالکل بعید از قیاس ہے، کیونکہ عرب گیارہ ماہ تک شہر اسکندریہ میں داخل نہیں ہوئے۔ صلح نامہ میں صاف طور پر لکھا ہوا تھا کہ رومی اپنا سارا سامان اپنے وطن لے جا سکتے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں سمندر کا راستہ اُن کے لیے کھلا ہوا تھا۔ اگر کتب خانہ میں کوئی علمی کتاب باقی ہوتی تو رومی اسے ضرور اپنے ساتھ لے جاتے۔"

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ پہلے ہی جلایا جا چکا تھا اور اس میں کوئی ایسی کتاب باقی نہ رہی تھی جس کو عرب آکر جلاتے۔[1]

(۱۷)

مصر میں اسلامی فتوحات پر ایک اجمالی نظر

فسطاط کی آبادی حضرت عمروؓ بن العاص نے اسکندریہ فتح کرنے کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وُہ مصر میں

---

[1] اس الزام کی تردید کے لیے دیکھئے "ایران اور مصر میں کتب سوزی" از مرتضیٰ مطہری شہید۔ اردو ترجمہ عارف نوشاہی مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی ۱۹۸۱ء (ادارہ)

اپنی فوجوں کے لیے کوئی چھاؤنی بنائیں، جیسا کہ عراق میں بصرہ اور کوفہ کو بنایا جا چکا تھا۔ پہلے تو ان کا یہ ارادہ ہوا کہ اسکندریہ ہی کو فوجی چھاؤنی بنا لیا جائے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں منع کر دیا۔ کیونکہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اور اسلامی لشکر کے درمیان کوئی دریا حائل ہو۔ تب حضرت عمروؓ بن العاص کی نظر اس میدان پر پڑی جہاں قلعۂ بابلیون کے محاصرہ کے وقت اسلامی لشکر نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہی جگہ ہے جہاں آج کل قاہرہ آباد ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہاں ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام "فسطاط" رکھا۔

فتح کے بعد مسلمانوں نے مصریوں سے انتہائی رحم دلی اور احسان کا برتاؤ کیا۔ مسلمان مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے فتح کی نوعیت کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ جو شہر جنگ کے ذریعہ فتح کیے جاتے تھے مسلمانوں کو پورا اختیار ہوتا تھا کہ اس شہر کے باشندوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک مناسب سمجھیں کریں۔ اس سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ شہریوں پر ان کا رعب طاری ہو جائے تاکہ وہ دوبارہ مقابلہ کے لیے نہ اُٹھ کھڑے ہوں اور فاتحین کے راستہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

لیکن جو شہر صلح کے ذریعے مسلمانوں کے قبضہ میں آتے تھے اور وہاں کے باشندے ان سے جنگ کرنے سے احتراز کرتے تھے، ان کا معاملہ جنگ کے ذریعے فتح کیے ہوئے شہروں کے معاملہ سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ اگر وہاں کے باشندے اسلام قبول کر لیتے تھے تو انھیں بالکل مسلمان شہریوں کے سے حقوق دیے جاتے تھے اور اس میں کسی قسم کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی، کیونکہ اسلام طبقاتی نظام اور گروہ بندی کا قائل نہیں ہے اور اس کے نزدیک تقویٰ اور اعمالِ صالحہ ہی معیارِ فضیلت ہے، اس کے علاوہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر مفتوحہ شہر کے باشندے اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتے تھے تو انھیں اس کی اجازت تھی لیکن شرط یہ تھی کہ وہ جزیہ ادا کریں اور اسلامی احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

جزیہ بھی کسی قسم کا تاوان نہیں تھا بلکہ فی الواقع وہ معاوضہ تھا جو مسلمان غیر مسلم رعایا سے اس کی حفاظت کے عوض وصول کیا کرتے تھے۔ اس کے بدلے غیر مسلموں کو فوجی خدمات سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ شام میں جب اسلامی فوجوں نے بعض شہروں کو خالی کیا تو جتنا جزیہ انھوں نے ان علاقوں کے شہریوں سے وصول کیا تھا وہ سب واپس کر دیا۔ قائدینِ لشکر کی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے یہ جزیہ باشندگانِ شہر کے دفاع اور ان کی حفاظت و سلامتی کے معاوضہ میں وصول کیا تھا لیکن اب کے وہ ان کا دفاع کرنے اور ان کی سلامتی برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ وصول شدہ جزیہ انھیں واپس کیا جانا چاہیے۔ پھر خود جزیہ بھی اس قسم کا ٹیکس نہ تھا جو مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کی کمر توڑ دیتا بلکہ اس کے برعکس ان ٹیکسوں سے بدرجہا کم تھا، جو رومی حکومت کے زمانہ میں مصری باشندوں پر عائد کیے جاتے تھے۔

مزید برآں اکثر شہر، جو جنگ کے بعد فتح کیے گئے، حضرت عمرؓ کے حکم سے وہاں کے باشندوں سے ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا ان شہروں کے باشندوں سے کیا گیا جنھوں نے صلح کے ذریعہ اپنے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیے تھے۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مفتوحہ شہروں کے باشندوں سے پیار محبت اور نرمی کا سلوک کیا جائے تاکہ وہ

اسلامی حکومت کے گرویدہ ہو جائیں نیز شہروں کو تباہی اور بربادی سے بچایا جائے۔ چنانچہ گو قلعۂ بابلیون کو مسلمانوں نے شدید جنگ کے بعد فتح کیا تھا لیکن جب شہر کے باشندے حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس امان طلب کرنے آئے تو آپ نے ان سے مصالحت کرنے، ان کو امان دینے اور ان کے اموال وجائداد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ کرنے میں ذرا بھی پس و پیش سے کام نہ لیا۔

صرف قلعۂ بابلیون پر ہی موقوف نہیں حضرت عمروؓ بن العاص نے مصری فتوحات کے سلسلہ میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیے رکھا کہ آپ باشندگانِ ملک سے نرمی اور ہمدردی کا سلوک کرتے اور سختی سے حتی المقدور اپنا پہلو بچائے رکھتے تھے۔ آپ کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ بات رہتی تھی کہ فتوحاتِ اسلامی ملک کی تباہی اور بربادی کے لیے نہیں کی جا رہیں اور نہ ان کا مقصد اس قسم کی شدت و سختی اور ظلم و جور روا رکھنا ہے جو رومیوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں روا رکھی تھیں۔

حضرت عمروؓ بن العاص کی اس سیاست کا، جو آپ نے مصر میں اختیار کی اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ نرمی اور پیار محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے پاؤں مصر میں خوب اچھی طرح جم گئے۔ فتوحات کے دوران میں وہاں کے باشندے مسلمانوں کی برابر امداد کرتے رہے اور ایک کثیر حصہ نے اسلام بھی قبول کر لیا۔

عربوں کو مصر فتح کرنے میں دو سال دو مہینے[1] لگے۔ یہ فتوحات مشرقی مصر کے سرحدی شہر "عریش" میں اسلامی فوجیں داخل ہونے سے شروع ہوئیں۔ اسکندریہ کی فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر اسلامی فوجوں نے دمیاط، ساحلی علاقہ اور شمالی ڈیلٹا کو بھی فتح کر لیا۔

مصر کو نہایت قلیل فوج کے ساتھ فتح کرنا حضرت عمروؓ بن العاص کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ بات بیحد ضروری ہے کہ حملہ آور فوج قلعوں اور فصیلوں کے اندر رہنے والی مدافعتی فوج سے بہت زیادہ ہونی چاہیے اور اس کے مادی ذرائع بھی بہت وسیع ہونے چاہئیں، کیونکہ حملہ کی مہم مدافعت کی مہم کے مقابلہ میں بہت زیادہ سخت اور مشکل ہوتی ہے۔ دفاع کرنے والی فوج کو زیادہ قوت و طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی خصوصاً جب کہ وہ فوج مضبوط قلعوں، فصیلوں اور بلند و بالا برجوں کی پناہ میں ہو۔ چنانچہ عربوں کے مصر پر حملہ کرنے کے وقت مصر میں متذکرہ بالا حفاظتی اقدامات کی کوئی کمی نہ تھی۔ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سپہ سالار کسی شہر یا علاقہ کو فتح کرنے نکلا ہو، اس کی فوج مدافعت کرنے والی فوج سے کم ہو اور پھر اس کو ہزیمت نہ اٹھانی پڑی ہو۔ اس کلیہ سے صرف وہ اسلامی سپہ سالار مستثنیٰ ہیں جو شام، مصر اور عراق کو فتح کرنے کے لیے نکلے۔ ان سپہ سالاروں کے لشکروں کے مقابلہ میں جو لشکر آتے، ان میں اور اسلامی لشکروں کی تعداد میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایرانی اور رومی فوجوں کے پاس جو بے پناہ وسائل اور مادی ذرائع جنگ جیتنے کے لیے تھے، عربوں کے پاس ان کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان چھوٹے چھوٹے لشکروں

---

[1] ماہِ ذوالحجہ ۱۹ھ سے ۲۲ھ تک

نے ایرانی اور رومیوں شہنشاہیتوں کے تختے اُلٹ دیے اور دندانہ ان کے علاقوں میں گھستے اور شہر پر شہر اور علاقہ پر علاقہ فتح کرتے چلے گئے۔

قبطی، رومی اور عرب مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ اس اسلامی لشکر کی تعداد، جو حضرت عمروؓ بن العاص مصر کی جانب لے کر چلے اور جس نے مصر کی مشرقی سرحد پر فتوحات حاصل کیں، چار ہزار سواروں سے زیادہ نہیں تھی۔ ان مورخین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ عربوں کے مقابلہ میں قبطیوں اور رومیوں کے لشکر کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے کسی صورت میں بھی کم نہیں تھی، جو اسکندریہ سے لے کر مصر کے بالائی حصّہ تک اور نوبا سے لے کر قیوم تک پھیلا ہوا تھا۔ ان فوجوں نے مصری شہروں کے استحکامات میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ جا بجا قلعے بنے ہوئے تھے اور دفاعی خطوط قائم تھے۔

عرب اس سرزمین میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے جہاں کی کوئی چیز بھی ان کے وطن سے نہ ملتی تھی۔ اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب اور تھا، زبان اور تھی، عادات وخصائل اور تھے۔ عرب اس کے راستوں سے ناواقف تھے۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود اس چھوٹے سے لشکر کے سامنے رومی افواجِ قاہرہ کی کوئی پیش نہ جا سکی اور تمام مصر پر دیکھتے دیکھتے اسلامی افواج کا قبضہ ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مصر کی فتح دنیا کی جنگی تاریخ میں لازوال حیثیت کی حامل ہے۔ حضرت عمروؓ بن العاص کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کے مقابلہ میں حضرت خالدؓ بن ولید کی عراق وشام میں فتوحات، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی فتحِ قادسیہ اور فتحِ نہاوند کے سوا اور کسی جنگی جرنیل کے کارناموں کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۸)

امیرالمومنین اور آپ کے عمّال

پچھلے صفحات میں ان فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے جو مسلمانوں نے عراق، ایران، شام اور مصر میں حاصل کی تھیں اب ہم مختصر طور پر حضرت عمرؓ کی سیاست اور آپ کے جاری کردہ نظام کے متعلق کچھ بیان کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں حکومت کا طریقہ تقریباً وہی رہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا۔ عہدِ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی سب کچھ تھی۔ رسول ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ہی بحالتِ جنگ فوج کے سپہ سالار ہوتے تھے، مقدمات سارے آپ کے پاس ہی پیش ہوتے تھے اور اسلامی حکومت کے سربراہ بھی حضور ہی تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے۔ جن عمّال اور امراء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا آپ نے بھی ان ہی کو باقی رکھا۔ البتہ جب خلافت کے امور میں وسعت پیدا ہوئی تو حضرت

ابوبکر صدیقؓ کی آسانی کے لیے حضرت ابوعبیدہؓ نے بیت المال کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور مقدمات فیصل کرنے کا کام حضرت عمرؓ نے۔ قوانین وغیرہ لکھوانے کے لیے کوئی خاص آدمی مقرر نہ تھا بلکہ صحابہؓ میں سے جس سے چاہتے یہ کام لے لیتے۔ آپ کے عہد میں حکومت کا کام بیحد سہل اور سادہ تھا اور کسی نئے انتظام کے وضع کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن جب زمامِ خلافت حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں آئی فتوحات میں وسعت پیدا ہوئی، اسلام مشرق و مغرب میں پھیلنے لگا تو لازماً حکومت چلانے کے لیے ایک نیا نظام مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ان نئے شہروں اور علاقوں میں، جن پر مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا، ایرانی اور رومی سلطنتوں کا مقرر کردہ نظام نافذ تھا، اور وہاں حکومت کا ہر کام منظم قواعد کے تحت ہوتا تھا۔ اس لیے نئی حکومت کے لیے واجب تھا کہ وہ گزشتہ حکومت کے نظام اور قوانین کی جگہ ایسا نظام اور قوانین مرتب کرے جن سے یہاں کے باشندوں میں بے چینی نہ پیدا ہو اور رعایا کے ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس ہو سکے۔

خلیفہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ دور دراز تک پھیلے ہوئے شہروں کے کل حالات سے ذاتی طور پر واقف ہو، لازماً ہر شہر کے معاملات اس شہر کے عامل اور امیر کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ یہی عامل حضرت عمرؓ اور آپ کی رعایا کے درمیان واسطہ ہوتے تھے۔

حضرت عمرؓ کو اس بات کی شدید خواہش تھی کہ آپ کے عمال آپ ہی کی سیرت اختیار کریں، آپ ہی کے طریقوں پر چلیں اور اپنے اخلاق و عادات کو آپ ہی کے اخلاق و عادات کے سانچے میں ڈھالیں۔ اگر کسی عامل سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی ذمہ دار قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس بارہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے وہی جوابدہ ہوں گے۔ اسی لیے آپ اپنے عمال کی حرکات و اعمال پر کڑی نظر رکھتے اور سختی سے محاسبہ کرتے رہتے تھے۔ آپ نے سلطنت کے ہر علاقہ میں جاسوس مقرر کر رکھے تھے، جو آپ کو دم بہ دم عمال کے افعال اور ان کی سیاست سے باخبر رکھتے تھے اور بتلاتے رہتے تھے کہ رعایا سے ان کا برتاؤ کیسا ہے؟ آپ اپنے جاسوسوں کی رپورٹوں کی بھی خوب اچھی طرح چھان بین کرتے تھے اور اگر وہ سچی نکلتی تھیں تو عامل سے فوراً جواب طلب کرتے تھے۔ اگر کوئی سنگین معاملہ ہوتا تھا تو اسے اس کے عہدہ سے برطرف کر دیتے تھے، لیکن اگر معمولی غلطی ہوتی تھی تو محض سرزنش پر اکتفا کرتے تھے۔ اگر مخبر کی رپورٹ غلط ہوتی تھی تو پھر اس کو سخت سزا دیتے تھے۔ اس طریقہ سے سلطنت کے ہر حصہ کی خبریں آپ کو ملتی رہتی تھیں اور عمال یا رعایا کی کوئی حرکت آپ سے چھپی نہ رہتی تھی۔ آپ کی ہدایت تھی کہ عمال نہایت سادہ زندگی بسر کریں کھانے پینے اور لباس میں میانہ روی اختیار کریں، فضول خرچی اور شان و شوکت سے قطعاً پرہیز کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ خود انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ عمال پر آپ کا رعب بے حد تھا اس لیے وہ آپ کے احکام سے سرِمو تجاوز نہ کرتے تھے اور جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا حضرت عمرؓ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا کر سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

جب آپ کسی شخص کو عامل بنا کر کسی جگہ بھیجتے تھے تو اسے رخصت کرنے خود شہر سے باہر تک تشریف لے جاتے تھے اور رخصت کرنے کے وقت اسے بے بہا نصیحتوں سے بھی نوازتے تھے۔ آپ اپنے عمال سے فرمایا کرتے تھے: میں نے تمھیں

اُمتِ محمدیہ پر اس لیے عامل نہیں بنایا کہ تم اسے اپنی دست درازیوں اور ظلم و ستم کا نشانہ بناؤ بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ انھیں نماز پڑھاؤ اور عدل و انصاف سے ان کے مقدمات فیصل کرو۔ آپ عمال کو رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی کرنے کی بحد تاکید کیا کرتے تھے اور انھیں حکم دیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنے کی طرف رغبت دلائیں اور زیادہ احادیث بیان کرنے سے روکیں۔ کیونکہ کثرتِ روایت سے کئی جھوٹی حدیثیں لوگوں میں مشہور ہوگئی تھیں۔

امراءِ لشکر کو آپ کی نصیحت تھی کہ وہ اللہ سے ڈریں، زیادتی نہ کریں، دشمن سے مقابلہ کے وقت بزدلی نہ دکھائیں، دشمن پر فتح پانے کے بعد اس کی لاشوں کا مثلہ نہ کریں، کسی بوڑھے، کسی عورت اور کسی بچے کو قتل نہ کریں، جہاد کو مال و دولت کمانے اور لونڈی غلام حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ یہ امر اپنے پیشِ نظر رکھیں کہ جہاد صرف اسلام کے جھنڈے کو بلند و بالا کرنے اور اس کو عزت اور رفعت دینے کے لیے ہے۔

اگر رعیت میں سے کوئی شخص کسی عامل کی شکایت آپ کے پاس لاتا تھا تو آپ فوراً عامل کو مدینہ حاضر ہونے کا حکم دیتے تھے اور اُس سے اس شخص کی شکایت کے بارہ میں جواب طلب فرماتے تھے۔ اگر عامل کے خلاف شکایت مبنی برحق ہوتی تھی تو مظلوم کی دادرسی فرماتے تھے اور عامل کو سزا دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ بار بار اپنے عمال کو یاد دلایا کرتے تھے کہ وہ رعیت کے خادم ہیں، اپنے آپ کو حاکم کبھی نہ سمجھیں۔ آپ کا اعتقاد تھا کہ جو شخص امت کا مال کھاتا ہے، اس کے لیے امت کی خدمت کرنا فرض ہے۔ اس گروہ کا کوئی شخص اگر اُمت کی خدمت سے پہلوتہی اور اپنے فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کی حیثیت ایک چور کی سی ہے اسی لیے حضرت عمرؓ رات کو بہت کم سوتے تھے بلکہ رات کا اکثر حصہ مدینہ کی گلیوں میں یہ دیکھنے کے لیے گزار دیا کرتے تھے کہ آیا رعایا مطمئن ہے یا نہیں اور اسے کوئی تکلیف تو نہیں، اگر کسی شخص کو مصیبت یا فقر و فاقہ میں مبتلا دیکھتے تو آپ کی نیند اُڑ جاتی، آپ کا آرام جاتا رہتا۔

آپ نے محمد بن مسلمہ کو سلطنت کے عمال کی تفتیش کا کام سپرد کیا تھا۔ جس شہر سے بھی وہاں کے عامل کی کوئی شکایت موصول ہوتی تھی آپ انھیں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کے کام سے آپ بحد مطمئن تھے۔ آپ نے انھیں ہدایت دے رکھی تھی کہ عامل کی شکایات کے بارہ میں جا کر عام مجمعوں میں لوگوں کا اظہار لیں۔ کسی شخص کو یہ ڈر نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر میں نے عامل کے خلاف گواہی دی تو عامل بعد میں مجھ سے بازپرس کرے گا اور مجھے نقصان پہنچائے گا کیونکہ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ بہت سخت تھے اور آپ کے ڈر سے کوئی عامل اپنے خلاف گواہی دینے والے شخص کو کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا۔

حضرت عمرؓ کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جب آپ کسی شخص کو عامل بناتے تو تقرر سے پہلے اس کے اموال و اسباب اور جائداد کا جائزہ لے لیتے۔ اگر بعد میں اس کے مال و اسباب میں غیر معمولی زیادتی ہوتی تو زاید مال کی ضبطی کا حکم دے دیتے یا اس میں سے کچھ حصہ ضبط کر لیتے۔ آپ اس بارہ میں یہ دلیل دیتے تھے کہ عامل امت کے اموال میں سے صرف اتنا حصہ ہی لے سکتا ہے جو اسے کافی ہو۔ اگر اس کے پاس مال و اسباب کی زیادتی ہو جائے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ہو سکتی ہے۔ یا تو اس نے وہ مال ناجائز طور پر حاصل کیا ہے، اس صورت میں اس کے مال کا بیت المال زیادہ حقدار ہے،

جہاں سے یتیموں، مسکینوں، کمزوروں اور حاجت مندوں کی امداد کی جاتی ہے، یا اس کی تنخواہ، اس کے اصل خرچ سے بہت زیادہ ہے۔ اس صورت میں زاید مال کے مسلمان زیادہ حقدار ہیں۔

عتبہ بن ابی سفیان کو حضرت عمرؓ نے کنانہ کا عامل بنایا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب وہ مدینہ آئے تو ان کے پاس کافی مال تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا:

"تم نے یہ مال کہاں سے حاصل کیا؟"

انھوں نے عرض کیا کہ میں اپنے ساتھ کچھ رقم لے گیا تھا، اس سے میں نے تجارت کر کے یہ مال حاصل کیا۔

آپ نے فرمایا:

"عامل ہونے کی وجہ سے تمھیں اس بات کا اختیار نہیں تھا کہ تم تجارت کرتے۔"

اور پھر ان کا مال لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔

حضرت عمرؓ کو پتا چلا کہ حضرت ابو عبیدہؓ جنھیں آپ نے شام کا عامل مقرر کیا تھا، بافراغت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ نے ان کی تنخواہ کم کر دی۔ کچھ مدت کے بعد آپ نے ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا رنگ متغیر ہو گیا ہے، کپڑے پھٹ گئے ہیں اور بُرا حال ہے۔ آپ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ ابو عبیدہؓ پر رحم کرے، انھوں نے صبر کا بہت اچھا نمونہ دکھایا ہے۔"

اس کے بعد جتنی تنخواہ کم کی تھی دوبارہ جاری کر دی۔

ایک دفعہ آپ ابو عبیدہؓ کے پاس تشریف لے گئے، ان کے گھر کی حالت نہایت خستہ ہو رہی تھی آپ نے ان سے کھانے کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے بہت معمولی کھانا لا کر سامنے رکھ دیا، حضرت عمرؓ رو پڑے اور واپس آکر ابو عبیدہؓ کو چار سو دینار بھیجے کہ وہ اپنی حالت درست کر سکیں۔ لیکن انھوں نے وہ تمام رقم شہر کے غربا میں تقسیم کر دی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے معاذ بن جبل کو بھی چار سو دینار بھیجے تھے۔ انھوں نے بھی اس رقم کا اکثر حصہ خیرات کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو ان دونوں واقعات کا پتا چلا تو آپ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُمتِ محمدیہ میں ان جیسے اخلاق، تقویٰ اور فضیلت رکھنے والے اشخاص موجود ہیں۔

صرف حضرت ابو عبیدہؓ اور معاذؓ بن جبل پر ہی موقوف نہیں، حضرت عمرؓ کے مقرر کیے ہوئے اکثر عمال انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اہلِ حمص نے حضرت عمرؓ کے پاس اپنے عامل سعیدؓ بن عامر کی شکایت کی اور انھیں معزول کر دینے کا مطالبہ کیا۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ سعیدؓ جب تک دن اچھی طرح نہیں چڑھ جاتا لوگوں سے ملاقات نہیں کرتے۔ رات کو اگر کوئی ان سے ملنے آئے تو ملنا تو درکنار جواب بھی نہیں دیتے، مہینہ میں ایک دن گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ جب حضرت عمرؓ نے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ عامل مذکور ہر روز صبح خود آٹا گوندھتا ہے اور خود ہی روٹی پکاتا ہے۔ اس لیے دن چڑھے تک لوگوں سے مل نہیں سکتا۔ ساری رات عبادت میں گزار دیتا ہے، مہینہ میں ایک دن اپنے کپڑے دھوتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے انھیں ایک ہزار دینار بھیجے تاکہ وہ کسی نوکر کو مقرر کر لیں۔ لیکن سعیدؓ نے انھیں لشکر میں تقسیم کر دیا۔

جب سعیدؓ بن عامر مدینہ آئے تو ان کے ساتھ صرف ایک لاٹھی اور ایک پیالہ تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تمھارے پاس ان دونوں چیزوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ان کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لاٹھی سے اپنا کھانا باندھ لیتا ہوں اور پیالہ میں کھا لیتا ہوں۔

ایک اور عامل عمیر بن سعد تھے ان کے متعلق حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میری بڑی خواہش ہے کہ میرے پاس عمیر بن سعد جیسے چند آدمی اور ہوں تاکہ میں خلافت کے کاموں کی سرانجام دہی میں ان سے مدد حاصل کر سکوں۔ ایک مرتبہ عمیر نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ اسلام اس وقت تک مضبوط رہے گا جب تک اس کا غلبہ برقرار رکھنے میں شدت سے کام لیا جائے گا۔ لیکن شدت اور سختی لوگوں کو تلوار سے قتل کرنے اور کوڑے مارنے کا نام نہیں بلکہ حق و انصاف سے کام کرنے کا نام ہے۔ ان دنوں جب عمیر حمص کے عامل تھے حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ طلب کیا۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے ان کے کام کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے کہا:

"جب آپ نے مجھے عامل بنا کر بھیجا تو میں نے شہر کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور انھیں مال جمع کرنے پر مامور کیا۔ جو کچھ انھوں نے جمع کیا میں نے اسے مناسب مواقع پر خرچ کر دیا۔ اگر اس میں سے کچھ بچتا تو آپ کے پاس لے کر آتا۔"

حضرت عمرؓ نے پوچھا:

"گویا تم کچھ بھی نہیں لائے؟"

انھوں نے جواب دیا: "نہیں!"

حضرت عمرؓ نے انھیں دوبارہ حمص بھیجنا چاہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا:

"میں اب کبھی یہ کام نہیں کروں گا، میں نے ایک دن ایک عیسائی کو یہ کہہ دیا اللہ تجھے ذلیل و خوار کرے۔ اس فقرے پر میں اب تک پچھتاتا ہوں۔ اگر آپ مجھے امیر مقرر نہ فرماتے تو میری زبان سے ایسا فقرہ نکلتا ہی کیوں؟"

چنانچہ انھوں نے دوبارہ عامل بننا قبول نہ کیا۔

حضرت عمرؓ جب کسی شخص کو کسی شہر کا عامل بناتے تھے تو شہر والوں کے نام اسے ایک پیغام بھی دیتے تھے جو وہ مجمع عام میں سناتا تھا۔ اس پیغام میں لکھا ہوتا تھا کہ میں نے فلاں کو عامل بنایا ہے اور اسے یہ یہ احکام دئے ہیں۔ جب آپ نے حذیفہ بن یمان کو مدائن کا عامل بنایا تو انھیں شہر والوں کے نام جو پیغام دیا اس میں لکھا تھا:

"حذیفہ بن یمان تمھیں جو کچھ کہیں اسے سنو اور ان کی اطاعت کرو اور وہ تم سے جو مانگیں وہ انھیں دو۔"

جب حذیفہ مدائن پہنچے اور شہر کے معززین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ کے فرمان کو پڑھ کر انھوں نے حذیفہ سے کہا:

"جو کچھ آپ کی خواہش ہو ہم حاضر کرنے کو تیار ہیں۔"

حضرت حذیفہ نے کہا کہ "میں تم سے صرف اتنا مطالبہ کرتا ہوں کہ جب تک میں یہاں رہوں تم میرے لیے اتنا کھانا جو میرے پیٹ بھرنے کو کافی ہو اور میرے گدھے کے لیے چارہ دے دیا کرو۔"

چنانچہ شہر والوں نے اس کا انتظام کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ طلب فرمایا اور وہ مدائن سے روانہ ہوگئے۔ جب حضرت عمرؓ کو ان کے آنے کی خبر پہنچی تو آپ مدینہ سے باہر نکل کر ان کے راستہ میں چھپ کر کھڑے ہوگئے۔ جب حذیفہ قریب پہنچے تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کی وہی حالت ہے جو مدینہ سے مدائن روانہ ہونے کے وقت تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ اپنی کمین گاہ سے نکلے اور حذیفہ کے قریب آکر انھیں چمٹا لیا اور فرمایا:

"تم میرے بھائی ہو اور میں تمھارا بھائی ہوں۔"

حضرت عمرؓ کسی کو عہدہ دیتے وقت اس بات کو خوب اچھی طرح جانچ لیا کرتے تھے کہ وہ شخص زہد و اتقاء کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی پیش نظر رکھتے تھے کہ وہ جس کو بھی منتخب کریں اس میں انتظامی صلاحیت موجود ہو۔ یہ نہیں تھا کہ دینی اعتبار سے جو شخص بھی نمایاں حیثیت کا مالک ہو اسے ضرور ہی امور سلطنت تفویض کر دیے جائیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو کوئی کام سپرد کر کے ان کی شان کم کروں۔ اکثر اوقات آپ سلطنت کے کسی کام کی سرانجام دہی کے لیے کسی شخص کو مقرر کرتے وقت لوگوں سے مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ انھیں سلطنت کے ایک کام کی بجاآوری کے لیے کوئی ایسا آدمی بتائیں جو کسی قوم میں ہو لیکن ان کا امیر نہ ہو تو اپنے اعمال کے اعتبار سے ان کا امیر معلوم ہوتا ہو، اور اگر ان کا امیر ہو تو ان ہی کا ایک فرد معلوم ہو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ صفت ربیع بن زیاد الحارثی میں پائی جاتی ہے اسی لیے ہم اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے انھیں بلایا اور وہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ ربیع نے بالکل حضرت عمرؓ کے حسبِ منشاء کام کیا جس پر آپ نے ان لوگوں کا بجد شکریہ ادا کیا جنھوں نے ربیع بن زیاد کی سفارش کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے عمروؓ بن معدی کرب سے سعدؓ بن ابی وقاص والیِ کوفہ کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا:

"وہ سخاوت کرنے میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں، حسب و نسب کے لحاظ سے بے داغ عربی ہیں، بہادری میں شیر کی مانند ہیں، جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو عدل و انصاف سے کرتے ہیں، جب کچھ تقسیم کرتے ہیں تو سب کو پورا پورا دیتے ہیں۔ ہم پر ایسی مہربانی کرتے ہیں جیسی مشفق ماں اپنے بچوں پر مہربانی کرتی ہے، ہمیں ہمارا حق پورا پورا دیتے ہیں۔"

لیکن انھی سعدؓ کی جب اہلِ کوفہ نے شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر دیا اور اس میں کسی قسم کی رورعایت روا نہ رکھی۔ کیونکہ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ہمیشہ وہی کام کیا جائے جس میں لوگوں کا فائدہ ہو خواہ وہ کام ان کے عمال میں سے کسی کے ذریعہ انجام دیا جائے۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے شکوہ و شکایت کی کوئی گنجائش نہ رکھی جائے۔

یہی سعدؓ تھے جنھیں صحابہؓ نے متفقہ طور پر ایرانی فوجوں کے مقابلہ کے لیے عراق بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ جب چلنے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا:

"اے سعدؓ! تمھیں یہ بات دھوکہ نہ دے کہ تم رسول اللہ کے ماموں ہو۔ اللہ تعالیٰ بُرائی کو بُرائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ نیکی کے ذریعہ مٹاتا ہے۔ اللہ کے اور اس کے بندوں میں سے کسی کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ دنیا کے سب شریف و وضیع اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا پروردگار ہے اور وہ اس کے بندے ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے ذریعہ ہی وہ دُوسروں سے فضیلت حاصل کر سکتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے انعامات کے وارث ہو سکتے ہیں۔ صرف وہی کام خدا تعالیٰ کی نظر میں مقبول ہو سکتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے اور دوسروں کو بھی انھیں کرنے کا حکم دیا۔ میری تمھیں یہ نصیحت ہے کہ انھیں کاموں کو اختیار کرنا۔ اگر تم نے انھیں چھوڑ دیا اور ان کی طرف سے بے پرواہ ہو گئے تو تمھارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم سراسر نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے۔"

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے حضرت عمرؓ کی اس نصیحت کو لفظ بہ لفظ پُورا کیا اور انھی کے ہاتھوں عراق فتح ہوا۔

جہاں حضرت عمرؓ اپنے عمال کا محاسبہ کرنے میں بہت سخت گیر تھے وہاں آپ ان لوگوں سے بھی بہت سختی سے پیش آتے تھے جو سرکشی کرتے تھے یا جن کی طرف سے سرکشی کا شبہ ہوتا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ شہر اور ہر علاقہ کے لوگوں کے دلوں پر اپنے عامل کا پورا رعب اور ہیبت طاری ہونی چاہیے تاکہ عوام و خواص کی طرف سے سرکشی کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔ ایک مرتبہ اہلِ عراق نے اپنے امام کو کنکر مارے حالانکہ حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست پر پہلے امام کو معزول کر کے دوسرا امام مقرر کیا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ سُنا تو انھیں بیحد طیش آیا اور اہلِ شام سے فرمایا:

"اہلِ عراق کے لیے ایک لشکر تیار کرو کیونکہ شیطان نے ان پر اپنا تسلط جما لیا ہے اور انھیں اپنی راہ پر چلانا چاہتا ہے۔"

عتبہ ابن غزوان جو سعدؓ بن ابی وقاص کے ماتحت تھے اپنے افسر سے ناراض ہو کر مدینہ چلے آئے اور حضرت عمرؓ سے ان کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ خاموش رہے، عتبہ نے دُوسری بار پھر شکایت کی۔ حضرت عمرؓ پھر بھی خاموش رہے۔ آخر جب بار بار اُنھوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی شکایت کرنی شروع کی تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا:

"عتبہ! تمھیں کیا ہو گیا ہے تم ایسے آدمی کی شکایت کرتے ہو جو قریش میں سے ہے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہے۔"

عتبہ نے جواب دیا:

"کیا میں قریش میں سے نہیں ہوں؟ اور کیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل نہیں ہے؟"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"تمھاری فضیلت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔"

عتبہ نے کہا: "میں تو سعدؓ بن ابی وقاص کے پاس کبھی نہیں جاؤں گا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تمہیں ضرور جانا ہوگا"

چنانچہ آپ نے انھیں دوبارہ سعد بن ابی وقاص کے پاس بھیج دیا لیکن راستہ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

حضرت معاویہؓ امیرِ شام نے کسی بات میں عبادۃ بن صامت کے خلاف مرضی کوئی کام کیا۔ حضرت عبادۃ بن صامت نے اس پر احتجاج کیا۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے کوئی پروا نہیں کی بلکہ حضرت عبادہ کو کچھ سخت الفاظ بھی کہہ دیے۔ عبادہؓ نے کہا:

"میں تمہارے ساتھ ایک جگہ کبھی نہیں رہوں گا"

یہ کہہ کر وہ مدینہ روانہ ہوگئے۔

جب مدینہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے آنے کا سبب پوچھا۔ اُنھوں نے سارا حال بتا دیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں دوبارہ شام جانے کا حکم دیا۔ البتہ معاویہؓ کو یہ لکھ بھیجا کہ آئندہ عبادہ پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہوگا اور نہ ان پر تمہارا کوئی حکم چلے گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ اس لیے کیا کہ آپ نہ تو معاویہؓ کی خدمات کو نظر انداز کر سکتے تھے اور نہ عبادہ کے علم و فضل سے استغنا برت سکتے تھے۔

حضرت عمرؓ اگرچہ خلیفہ تھے لیکن اپنے لباس، اپنی سواری، اپنی حرکات و سکنات، غرضیکہ کسی چیز میں بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں پر آپ کی زبردست ہیبت اور رعب چھایا ہوا تھا۔ اگر اربابِ حکومت سے اور کوئی شخص اس قدر تواضع اور فروتنی سے کام لیتا تو نہ صرف یہ کہ لوگوں پر اس کا رعب و دبدبہ قائم نہ رہتا بلکہ اس کی رعایا خود اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوتی۔ لیکن یہ حضرت عمرؓ کی سیاست کا کمال تھا کہ انتہائی عاجزی اور مسکینی کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود کبھی آپ کے رعب و دبدبہ میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ لوگوں کے خوف کی حالت یہ تھی کہ ایک مرتبہ انھوں نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کہا کہ آپ حضرت عمرؓ سے کہیں کہ وہ کچھ نرمی اختیار کریں۔ ان کی ہیبت تو ہماری کنواری لڑکیوں پر بھی طاری ہے۔

حضرت عمرؓ کا عہد ایک مثالی عہد تھا۔ آپ کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ چند افراد تو خوشحال ہوں لیکن باقی قوم بھوکی مرے۔ چند لوگ تو بلند مرتبے حاصل کر کے ہر طرح کے آرام اور راحت کی زندگی گزاریں اور باقی رعایا تنگ دستی اور غربت کی حالت میں اپنے شب و روز بسر کرے۔ آپ امراء کی مصلحتوں پر عوام کی خواہشات کو قربان نہیں کرتے تھے۔ آپ کی نظر میں ایک والی، عام رعایا جیسا ایک فرد تھا جس پر قانون کا اطلاق اسی طرح ہوتا تھا جس طرح باقی لوگوں پر۔ رعایا کا چھوٹے سے چھوٹا فرد بھی اگر عامل کی شکایت کرتا تھا تو آپ فوراً والی کو جواب دہی کے لیے طلب فرما لیتے تھے اور جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جاتا تھا مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ اگر عامل کو قصوروار پاتے تھے تو شریعت کے مطابق جس سزا کا وہ حقدار ہوتا تھا وہ اسے دیتے تھے۔ اگر قصاص لینا ہوتا تھا تو قصاص لیتے تھے۔ اگر جُرم کی نوعیت کچھ سخت ہوتی تھی تو اسے اپنے عُہدہ سے معزول بھی کر دیتے تھے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی شخص کو والی بناتے تھے تو اس کے مال و اسباب کا جائزہ لے لیتے تھے اور اس کے سارے سامان کی فہرست بنا کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ اگر بعد میں اس کے مال و اسباب میں غیر معمولی زیادتی

ہو جاتی تھی تو زاید مال ضبط کر لیتے تھے۔ ایک بار آپ ایک عمارت کے پاس سے گزرے جو پتھروں اور چونا سے تعمیر کی گئی تھی، آپ نے پوچھا:

"یہ مکان کس کا ہے؟"

لوگوں نے بتایا کہ یہ عاملِ بحرین کا مکان ہے۔ آپ نے اس کے مال و اسباب کا کچھ حصّہ ضبط کر لیا۔

حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ مصر کے عامل عمروؓ بن العاص کے پاس بہت سا مال و اسباب جمع ہو گیا ہے جو اس وقت نہیں تھا جب انھیں مصر کی ولایت سپرد کی گئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے عمروؓ سے جواب طلب کیا۔ انھوں نے کہا کہ مصر کی زمین زراعتی زمین ہے اور یہاں تجارت کو خوب فروغ حاصل ہے۔ میرے پاس جو مال و اسباب ہے وہ میں نے اپنے گھوڑوں اور اِس مالِ غنیمت کو، جو جنگوں میں حاصل ہوا تھا، بیچ کر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کے زاید مال و اسباب کو ضبط کر کے اسے بیت المال میں داخل کرا دیا۔

اسی طرح حضرت ابُوہریرہؓ کے متعلق آپ کو اطلاع ملی کہ ان کے پاس دس ہزار درہم جمع ہو گئے ہیں۔ جب آپ نے باز پُرس کی تو اُنھوں نے کہا کہ میرے گھوڑوں نے بچے دئے تھے۔ مالِ غنیمت بھی کافی جمع ہو گیا تھا۔ نیز میں نے کچھ تجارت بھی کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں حکم دیا کہ اپنے اصل مال و اسباب اور اپنے نان و نفقہ کے علاوہ جو زاید مال ہے وہ بیت المال میں داخل کر دیں۔

ایسا کرنے سے حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ عمال اپنی تمام کوششیں رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیں۔ تجارت اور مال و اسباب کو بڑھانا سلطنت کے عمّال کے لیے مناسب نہیں ہے۔

جن دیگر عمال کے مال و اسباب حضرت عمرؓ نے ضبط کیے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

نعمان بن عدی عاملِ میسان،
نافع بن عمرو الخزاعی عاملِ مکہ،
یعلی بن منیہ عاملِ یمن،
سعدؓ بن ابی وقاص عاملِ کوفہ،
خالدؓ بن ولید عاملِ شام۔

(۱۹)

حضرت عمرؓ کے عہد کا عدالتی نظام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قضا کا سارا کام حضورؐ خود انجام دیتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے

اپنے عہد میں یہ کام اپنے اور حضرت عمرؓ کے درمیان بانٹ رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ کے سپرد بس یہ خدمت تھی کہ جو مقدمات دربارِ خلافت میں پیش ہوں وہ ان پر غور و فکر کر کے اپنی رائے بتا دیں، مقدمات کا فیصلہ کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو فتوحات میں وسعت پیدا ہونے لگی، نئے نئے علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہونے لگے، سلطنت کی وسعت کے ساتھ امورِ خلافت میں بھی زیادتی ہو گئی اور نت نئے مسائل پیش آنے لگے۔ ان حالات میں حضرت عمرؓ کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ خلافت کے دیگر امور، انتظامِ سلطنت اور دُور دراز تک پھیلی ہوئی فوجوں کی نگرانی کے ساتھ ساتھ قضا کا کام بھی خود ہی سنبھال سکیں۔ اس لیے آپ نے یہ کام بعض کبار صحابہؓ کے سپرد کر دیا۔ ابو الدرداؓ کو مدینہ، شریحؒ کو کوفہ، ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرہ اور قیسؓ بن ابی العاص السہمی کو مصر کا قاضی مقرر کیا۔ باقی شہروں اور صوبوں میں قضا کا کام وہاں کے امراء کے سپرد کیا۔

حضرت عمرؓ لوگوں کو عام طور پر تفقہ فی الدین کی طرف رغبت دلاتے رہتے تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ فقہاء کو مختلف شہروں میں بھیجتے رہتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو علمِ دین سے واقف کرائیں۔ منجملہ دیگر اغراض کے ایک غرض حضرت عمرؓ کی یہ بھی تھی کہ ہر انسان کو اپنے واجبات کا پتا لگ جائے تاکہ وہ دُوسرے شخص کے حق پر دست درازی نہ کرے اور اس طرح جھگڑوں اور مقدمات کی نوبت نہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے قضاۃ و عمّال کو اپنے خطوط میں قضا کے متعلق جو قوانین لکھ کر بھیجے تھے آج تک وہ عدالتوں میں بنیادی اصولوں کے طور پر رائج ہیں۔ ان تمام خطوط میں سب سے مشہور خط وہ ہے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھیجا تھا۔ اس خط میں آپ نے اسلامی قضا کے احکام و اصول کو نہایت اعلیٰ پیرایہ میں بیان کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے بعد اگر عدالتوں میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ اس قسم کے معاملہ میں حضرت عمرؓ نے کیا فیصلہ کیا تھا۔

آپ ضروری معاملات میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی رائے لے لیا کرتے تھے اور مشورہ کے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا مقولہ تھا:

"اکیلے شخص کی رائے کچے دھاگے کی طرح ہے، دو آدمیوں کی رائے دو مضبوط دھاگوں کی طرح ہے اور تین آدمیوں کی رائے ایک ایسے حکم کی مانند ہے جس سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا۔"

آپ کے زمانہ میں مدینہ ایک مدرسہ کی مانند تھا جس میں سے سیکڑوں قضاۃ، عمال، سپہ سالار اور امراء نکل نکل کر دوسرے ممالک کو جا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ جس کسی کو بھی کوئی عہدہ دے کر باہر بھیجتے تھے پہلے اس کی آزمائش کر لیتے تھے اور بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ آپ کی فراست غلط ثابت ہوئی ہو۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

کعب بن سور حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے، ایک عورت آئی اور اپنے خاوند کی شکایت کی۔ آپ نے کعب سے فرمایا:

"ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

کعب نے جو فیصلہ کیا اس سے حضرت عمرؓ بہت خوش ہوئے اور انھیں بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا۔ آپ نے ایک شخص سے گھوڑا خریدنے کی بات چیت کی۔ گھوڑے کا تجربہ کرنے کے لیے اس پر سوار ہوئے۔ لیکن گھوڑے نے چوٹ کھائی۔ آپ نے گھوڑے کے مالک کو اس کا گھوڑا واپس کرنا چاہا۔ لیکن اس نے لینے سے انکار کیا۔ اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے شریحؒ کو ثالث مقرر کیا گیا۔ شریح نے کہا :

"امیرالمومنین! دو ہی صورتیں ہیں، یا تو آپ یہ داغدار گھوڑا اپنے پاس رکھیں یا گھوڑے کے مالک کو اس کا گھوڑا اصلی حالت میں واپس دیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"فیصلہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

یہ کہہ کر آپ نے انھیں کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا... وہ وہاں ایک طویل عرصہ تک قاضی کے عہدے پر متمکن رہے۔

حضرت عمرؓ کے قاضیوں میں سے مشہور قاضی ابو موسیٰ اشعریؓ، سلمان بن ربیعہ الباہلی، ابو قرۃ الکندی، ابو الدرداءؓ، ابو سعید خدری اور عبداللہ بن عباس وغیرہم تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص اپنے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ کے لحاظ سے چوٹی کا انسان تھا۔

آپ نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ قاضی صرف دولت مند اور معزز آدمی ہی کو بنایا جائے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو آپ نے ایک خط لکھا تھا جس میں اس قاعدے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ کمزور اور غریب آدمی انصاف ٹھیک طور پر نہیں کر سکے گا بلکہ رشوت کا طالب رہے گا۔ اسی طرح وہ دوسرے بڑے بڑے لوگوں کے رعب میں بھی آ سکے گا اور بڑے آدمی اپنے رعب و داب اور اثر و رسوخ سے کام لے کر اپنے حسبِ مرضی فیصلہ کروا سکیں گے۔ لیکن اس کے برخلاف امیر اور معزز آدمی رشوت کا طالب نہیں ہوگا اور نہ کسی کا رعب اور اثر قبول کر سکے گا۔

حضرت عمرؓ سفارش کو سختی سے ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک غلام نے آپ سے ایک شخص کی سفارش کی اور کہا کہ آپ عاملِ عراق کو لکھ دیجیے کہ جب یہ شخص ان کے پاس پہنچے تو وہ اس کی عزت و تکریم کریں اور اس کا خاص خیال رکھیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے جھڑک دیا اور فرمایا :

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس شخص کے واسطے دوسرے لوگوں پر ظلم کیا جائے، حالانکہ یہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہے اور اس کا حق بھی اتنا ہی ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا۔"

ان قضاۃ میں سے جو حضرت عمرؓ نے مقرر فرمائے تھے سب سے مشہور شخصیت ابو موسیٰ اشعریؓ کی ہے۔ علم و فضل کے علاوہ آپ فنونِ جنگ میں بھی بے حد مہارت رکھتے تھے اور ایران کی فتح میں آپ کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، آپ کو حضرت عمرؓ نے ایک بہت مشہور خط لکھا تھا جس میں عدالتی نظام و اصول کو نہایت سلیقے سے بیان کیا تھا۔ اس خط کے پڑھنے سے ہمیں وہ تمام اہم اصول معلوم ہو جاتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے

اپنی مملکت میں عدالتوں کے لیے جاری فرمائے تھے، خط حسب ذیل ہے:

"اچھی طرح سمجھ لو کہ قضا ایک اہم فریضہ ہے جو سنت[1] کے مطابق بجالانا ضروری ہے۔ تمام لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں اور اپنے انصاف میں برابر[2] رکھو تاکہ کمزور اور غریب آدمی انصاف سے مایوس نہ ہو اور زبردست طاقتور آدمی کو تم سے کسی رو رعایت کی امید نہ ہو۔ جو شخص دعویٰ کرے اس کے ذمہ ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے اور جو اپنے خلاف عائد کردہ الزام کی تردید کرے اس پر قسم واجب ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے لیکن ایسی صلح، جو حلال کو حلال رکھے اور حرام کو حرام۔ ایسی صلح جائز نہیں جس سے حرام حلال اور حلال حرام ہو جاتے۔ اگر تم نے آج کوئی فیصلہ کیا ہے لیکن مزید غور و فکر اور عقل سے کام لینے کے بعد تمہیں وہ فیصلہ غلط معلوم ہو تو تم بیشک اسے بدل دو۔ کیونکہ سچائی کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور باطل پر اصرار کرنے سے حق کی طرف رجوع کرنا بہرحال بہتر ہے[3]۔ جس مسئلہ کے متعلق تمہارے دل میں شبہ پیدا ہو اور کتاب اللہ اور سنتِ نبوی میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر خوب اچھی طرح غور کرو، پھر اس کی مثالوں اور نظیروں کو دیکھو۔ اس کے بعد قیاس لگاؤ اور جو قیاس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی سنت کے زیادہ قریب ہو اس کے مطابق حکم دو۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک مدت مقرر کر دو، اس مدت کے اختتام تک اگر وہ اپنا ثبوت بہم پہنچائے تو اس کا حق اسے دلا دو۔ لیکن اگر مدت کے اختتام تک وہ ثبوت بہم نہ پہنچا سکے تو مقدمہ خارج کر دو۔ ایسا کرنے سے شک دور ہو جائے گا[4]۔ سب مسلمان قابلِ اعتبار ہیں، سوائے ان اشخاص کے

---

[1] یہ لکھنے سے حضرت عمرؓ کا منشا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

[2] یہ حکم اس مساوات کی بنیاد ہے جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اس مساوات کے بغیر عدالت کا احترام کسی صورت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر قاضی طرفین میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا تو یقیناً چند روز میں بدنام ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ اسے آج نہیں تو کل ضرور بھگتنا پڑے گا۔

[3] اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ اگر قاضی نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ بہرحال اس پر اڑا رہے خواہ وہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو بلکہ ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد اگر بعض شواہد و واقعات کی رو سے، جو بعد میں اس کے سامنے آئیں، اسے اپنا فیصلہ غلط معلوم ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنا پہلا فیصلہ منسوخ کر دے اور دوبارہ صحیح فیصلہ کرے۔

[4] اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اگر اپنا ثبوت پیش کرنے کے لیے کوئی شخص مہلت طلب کرے اور اس بارہ میں معقول وجوہات عدالت کے سامنے رکھے تو اسے مہلت دے دی جائے۔ مثلاً وہ ایسے گواہوں کو حاضر کرنا چاہتا ہے جن کے پیش ہونے سے عدالت پر اصل حقیقت ظاہر ہو جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس مہلت کو ایک مقررہ مدت کے اندر محدود کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پابندی نہ رکھی جائے تو مہلت حاصل کرنے والا عدالت کی ہر پیشی پر یہ عذر کر دے گا کہ ابھی ثبوت بہم نہیں پہنچ سکا، اور اس طرح وہ اپنی مہلت کا ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اگر مدت مقررہ تک وہ ثبوت بہم نہ پہنچا سکے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

جن کو حد کی سزا میں کوڑے لگائے گئے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو، یا جن کا نسب مشکوک ہو۔ تنگ دلی کا اظہار نہ کرو۔ فریقینِ مقدمہ کو کسی قسم کی تکلیف مت پہنچاؤ۔ مقدمے پیش ہونے کے وقت بد خلقی مت دکھاؤ۔ اگر مقدمہ کا صحیح فیصلہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا بہت بڑا اجر دے گا۔"

تمام مسلمان قاضیوں نے، جو حضرت عمرؓ کے بعد آئے اس خط کو عدالتی نظام کے لیے بنیاد قرار دیا اور درحقیقت یہ اسی کا مستحق ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قضا نہایت آسان، سہل اور رسمی قواعد و ضوابط سے بالکل آزاد تھی۔ قاضی کے پاس نہ کوئی ایسا شخص ہوتا تھا جو مقدمات کی کارروائی لکھے، نہ اس کے پاس کوئی رجسٹر ہوتا تھا نہ محاکمات اور جرح وغیرہ کے کوئی اصول تھے لیکن ان باتوں کے باوجود فیصلے نہایت جلدی ہوتے تھے اور ان میں عدل و انصاف کو کسی صورت میں ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا۔

فتوحاتِ اسلامیہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے کثیر التعداد نئے مسائل پیدا ہونے لگے جو انتہائی بُعدِ نظر اور دقتِ بصیرت کے محتاج تھے۔ ان نئے مسائل میں سے مالی مسائل، لشکروں اور فتوحات کے مسائل، مفتوحین اور فاتحین کے حقوق کے مسائل، مسلمانوں اور غیر مسلموں سے علیحدہ علیحدہ لیے جانے والے ٹیکسوں کے مسائل ایسے تھے جن کے متعلق عربوں کو پہلے سے کچھ پتا نہ تھا۔ سلطنت کی وسعت کے نتیجہ میں ایسے جرائم بھی منظرِ عام پر آنے لگے جو عربوں کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے۔ مسلمانوں کے سامنے اب بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان نئے نئے مسائل سے پیدا ہونے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے، نئے نئے جرائم کا انسداد کرنے اور جرموں کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کو سزا دینے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ قرآن کریم اور سنتِ نبوی میں جزوی مسائل کے متعلق احکام بیان نہیں کیے گئے تھے۔ آخر غور و فکر کے بعد یہ قرار پایا کہ قرآن و سنت سے اگر کسی جزوی مسئلے کے متعلق کوئی حکم معلوم نہ ہو سکے تو اس صورت میں انفرادی رائے پر، جسے "قیاس" کا نام دیا گیا، عمل کیا جائے۔ لیکن یہ قیاس کسی طرح بھی قرآن و سنت کے احکام کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔

اکثر صحابہؓ نے اسی قاعدے پر عمل کیا۔ چنانچہ جہاں کوئی نص قطعی نہ پائی جاتی ہو وہاں صحابہ اپنی رائے کو استعمال میں لایا کرتے تھے۔ مؤرخین نے ان کئی مسائل کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے جن میں صحابہؓ نے اپنے قیاس سے فیصلے کیے۔ سب سے پہلا مسئلہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھیں پیش آیا وہ یہ تھا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہو۔ ہر شخص نے اپنی اپنی رائے دی اور حضرت ابوبکر صدیق کی رائے پر عمل کیا گیا۔ اس کے بعد ان مرتدین سے جنگوں کا مسئلہ پیش آیا جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہتے تھے کہ آپ ان لوگوں سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں حالانکہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے ہیں؟ — لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے اجتہاد کو کام میں لاتے ہوئے فرمایا:

"میں ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک یہ مجھے اونٹ کی وہ رسّی بھی زکوٰۃ میں دینے سے انکار کریں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتے تھے۔"

بعد ازاں جمعِ قرآن کا مسئلہ سامنے آیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے کے مطابق قرآن کریم

جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب وظیفوں اور غنائم کی تقسیم کا مسئلہ درپیش ہوا تو صحابہؓ میں باہم اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ غنیمتوں کی تقسیم میں برابری کا اصول نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ کی پیروی کرنے کی وجہ سے اپنے وطن اور اپنے اموال کو چھوڑا، ان کو ان لوگوں کے برابر قرار دیا جائے جنھوں نے مجبور ہو کر اسلام اختیار کیا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دلیل یہ تھی کہ مہاجرین نے اسلام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے قبول کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو آخرت میں اس کا اجر دے گا۔ اس دنیا میں انھیں دوسرے لوگوں کے برابر ہی حصہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غنیمتوں کی تقسیم میں مہاجرین اور غیر مہاجرین میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس اصول کو قائم نہ رکھا بلکہ تفاوتِ درجات کے مطابق غنیمتوں اور وظائف کی تقسیم کی۔

ایک شہر کے عامل نے حضرت عمرؓ کے پاس رپورٹ کی کہ ایک عورت نے اپنے عاشق کے ساتھ مل کر اپنے خاوند کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک شخص کے بدلے دو شخصوں کو قتل کرنے کے بارہ میں متردد تھے لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اگر کچھ لوگ مل کر ایک اونٹ چرائیں اور اس اونٹ کو ذبح کر کے آپس میں بانٹ لیں تو کیا آپ چوری کے جرم میں سب کے ہاتھ نہیں کاٹیں گے؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"بے شک سب کے ہاتھ کاٹوں گا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"تب قتل کے اس مقدمہ میں بھی دونوں آدمیوں کو قتل کی سزا ملنی چاہیے۔"

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی رائے پر صاد کیا اور اس عامل کو لکھ دیا کہ ان دونوں قاتلوں کو قتل کر دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر سارے صنعا والے بھی ایک آدمی کے قتل میں شریک ہوں تو میں سب لوگوں کو قتل کرا دوں۔

حضرت عمرؓ اجتہاد میں دوسرے سب صحابہؓ سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ کو اتنی کثرت سے مسائلِ مختلفہ کا سامنا کرنا پڑا کہ نہ آپ سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کرنا پڑا اور نہ آپ کے بعد کسی اور خلیفہ کو۔ آپ کے ہاتھ پر بے شمار فتوحات ہوئیں۔ ایران اور روم کی باجبروت اور متمدن قومیں اسلام کے سامنے سپر انداز ہوئیں۔ بعد کے زمانہ میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کو ہزاروں اقتصادی، سیاسی اور عمرانی مسائل درپیش ہوئے۔ ان مسائل کو سلجھانے کے لیے آپ اپنے اجتہاد کو کام میں لائے۔

جب ہم حضرت عمرؓ کے لیے اجتہاد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف یہ مراد نہیں لیتے کہ آپ صرف اس وقت اجتہاد کو کام میں لاتے تھے جب قرآن کریم اور سنّت میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی نص نہ ملے۔ آپ کا اجتہاد بہت وسیع مطالب پر مشتمل ہے۔ آپ کی سیرت کو پڑھنے سے پتا چلے گا کہ آپ ان معنی میں مجتہد تھے کہ آپ قرآن مجید کی آیات اور احادیث

میں بیان کردہ باتوں کی مصلحتوں کو بھی خوب سمجھتے تھے اوران مصلحتوں کے مطابق اپنے احکام جاری کرتے تھے ۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

قرآن کریم میں آتا ہے:

ان الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم۔

(ترجمہ: یقیناً صدقات فقرا، مساکین، صدقات وصول کرنے والوں اوران لوگوں کے لیے ہیں جن کی تالیفِ قلوب مدِنظر ہو)

اس حکم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان لوگوں کو، جو نئے نئے اسلام لائے تھے، بطور تالیف قلوب زکوٰۃ اور صدقات کے اموال سے نوازا، حالانکہ وہ فقرا اور مساکین میں شامل نہیں تھے۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی اس قسم کے چند لوگوں کو زکوٰۃ کے اموال میں سے حصہ دیا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اب خدا تعالیٰ نے اسلام کو عزت دے دی ہے اب وہ کسی کا محتاج نہیں رہا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ "مولفۃ قلوبھم" کے زمرہ والے لوگوں کو زکوٰۃ اس وقت تک دی جاتی تھی جب تک اسلام ضعف اور کمزوری کی حالت میں تھا۔ لیکن جب اسلام طاقت ور ہوگیا تو یہ مصلحت جاتی رہی اور اب ایسے لوگوں کو دینے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے قحط کے سالوں میں چور کا ہاتھ کاٹنے کی ممانعت کر دی تھی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس زمانہ میں زیادہ چوریاں اس لیے ہوتی تھیں کہ لوگ بھوکے اور محتاج ہوتے تھے۔

باوجود اس بات کے کہ حضرت عمرؓ کو دین اور شریعت کی بڑی زبردست مہارت حاصل تھی۔ لیکن آپ مختلف مسائل میں اکثر صحابہؓ سے مشورہ بھی لیا کرتے تھے۔ شعبی روایت کرتے ہیں:

"بسا اوقات جب کوئی قضیہ حضرت عمرؓ کے حضور پیش کیا جاتا تو آپ اس پر مہینہ مہینہ غور فرماتے اور صحابہؓ سے مشورہ کرتے رہتے۔ آخر ایک روز ایک ہی مجلس میں اکٹھے سو سو قضیوں کا فیصلہ کر دیتے۔"

(۲۰)

حضرت عمرؓ کا مالی اور ملکی نظام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک میں حقیقی ثروت کا وجود نہ تھا کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی مال جمع نہ کیا۔ نہ کوئی بیت المال بنایا۔ جنگوں میں جو غنیمتیں حاصل ہوتی تھیں انھیں یا تو جنگ کے معاً بعد یا مدینہ واپس آتے ہوئے تمام راستہ ہی میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ یہی حال اموالِ زکوٰۃ اور صدقات کا تھا۔ جونہی اموال آتے تھے ضرورت مندوں میں

تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ یہ تقسیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے۔ زکوٰۃ میں اکثر اُونٹ، گھوڑے اور دیگر مواشی آتے تھے۔ ان پر حضور ایک خاص قسم کا نشان ثبت کرا دیتے تھے تاکہ وہ دُوسرے مویشیوں سے علٰحدہ رہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا تو اسلامی حکومت کا خزانہ صرف زکوٰۃ کے ان اونٹوں، گھوڑوں اور دیگر مویشیوں پر مشتمل تھا جو مدینہ کے قریب "حمیٰ" کے نام سے پکاری جانے والی چراگاہوں میں موجود تھے[1] ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے نشانات موجود تھے[2]

ان مویشیوں کی تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی[3] زکوٰۃ اور صدقات کے ان اموال سے ان غریب مسلمانوں کو سواری اور ہتھیار مہیا کیے جاتے تھے جن کے پاس سامانِ جنگ نہ ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ یہ اموال فقراء، یتامٰی اور بیوہ عورتوں پر بھی صرف کیے جاتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اگرچہ مسلمان ایک حکومت کے مالک تھے، لیکن اس وقت تک فوجوں اور دُوسرے لوگوں کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوئی تھیں، نہ حکومت کا کوئی خاص نظام رائج کیا گیا تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ آیا اور مسلمان دُنیا کو فتح کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے تو مدینہ میں اموال کی آمد شروع ہُوئی لیکن یہ آمد اتنی زیادہ نہ تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا تو اتنی کثرت کے ساتھ غنائم آنے لگے کہ تمام مسلمان اور خود حضرت عمرؓ بھی حیرت زدہ ہو گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بحرین سے کچھ مال لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت فرمایا :

"تم اپنے ساتھ کتنا مال لائے ہو ؟"

اُنھوں نے جواب دیا :

"پانچ لاکھ درہم"۔

یہ سُن کر حضرت عمرؓ حیرت میں رہ گئے اور فرمایا :

"تمھیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو ؟"

انھوں نے جواب میں عرض کیا :

"جی ہاں ! میں کہہ رہا ہُوں کہ پانچ لاکھ درہم لایا ہُوں"۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے پانچ دفعہ لاکھ لاکھ کا لفظ بیان کیا۔ حضرت عمرؓ منبر پر چڑھے اور فرمایا :

"لوگو ! ہمارے پاس کثیر مال آیا ہے، اتنا کہ اگر تم چاہو تو تمھیں تول کر دے دیں اور اگر چاہو تو گن کر"[4]

---

[1] الماوردی ص ۱۷۶ — [2] البخاری ج ۱ ص ۱۹۰

[3] شرح الموطا نسخہ خطیہ — [4] المقریزی ج ۱ ص ۹۲

جب اموال کی کثرت اور فتوحات میں وسعت ہوئی تو حضرت عمرؓ نے باقاعدہ ایک دفتر کی بنیاد رکھی اور ہر مسلمان کا وظیفہ اسلام میں سبقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے لحاظ سے مقرر کر دیا۔ اسی طرح عمال اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر کر دیں۔ مال جمع کرنے کی ممانعت فرما دی۔ مسلمانوں کے لیے جاگیریں حاصل کرنا اور زراعت کرنا ممنوع قرار دے دیا کیونکہ تمام مسلمانوں، ان کے اہل و عیال، خدام اور غلاموں کی روزی کا انتظام بیت المال سے کر دیا گیا۔ زراعت اور جاگیریں حاصل کرنے کی ممانعت کے متعلق حضرت عمرؓ کی دلیل یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کو زراعت کی اجازت دے دی گئی تو وہ کھیتی باڑی کے جھمیلوں میں پڑ کر اپنے اصلی جوہر یعنی شجاعت اور بہادری کو بھول جائیں گے، سپاہیانہ زندگی ترک کر دیں گے، ان میں عیش و آرام کا مادہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر کسی جگہ جہاد کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ اس انتظار میں رہیں گے کہ فصل کٹ لے تو ہم جہاد کے لیے جائیں۔

اگر ذمیوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو اس کی زمین اس کے ہاتھ میں نہیں رہنے دی جاتی تھی بلکہ اس کے گاؤں والوں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ اس کے بدلے ان لوگوں کو اس ذمی کا خراج بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ مسلمان ہونے پر اس کا مال و اسباب اور مویشی وغیرہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتے تھے، اسے واپس کر دئے جاتے تھے اور اس کے لیے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔

ایسا کرنے سے حضرت عمرؓ کی غرض یہ تھی کہ اہلِ ذمہ اور ان کی زمین سے مسلمان جنگوں کے دوران میں فائدہ حاصل کرتے رہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں نے جاگیریں خرید لیں تو اس کا سارا نفع وہ خود ہی حاصل کریں گے اور وہ زمین صرف انہی کی ملکیت بن کر رہ جائے گی لیکن آپ چاہتے تھے کہ مفتوحہ علاقے کی زمین آخری زمانے تک مسلمان مجاہدین کی امداد کے لیے استعمال کی جاتی رہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تنخواہ دار سپاہی بھرتی کر کے خاص طور پر فوج تیار نہیں کی جاتی تھی بلکہ سارے مسلمان ہی جنگی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے اور جب خلیفہ انھیں جہاد کے لیے بلاتا تھا تو وہ لبیک کہتے ہوئے اپنے آپ کو پیش کر دیتے تھے اور جہاد کے لیے چل کھڑے ہوتے تھے۔ نہ زراعت ان کے راستے میں حائل ہوتی تھی اور نہ تجارت[1]

جب حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے روزینے مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو حسبِ معمول اس بارے میں مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا۔ سب نے حضرت عمرؓ کے خیال کی تائید کی۔ اس کے بعد آپ نے ان لوگوں سے مشورہ کیا جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ باقی سب لوگوں نے تو وہی رائے دی جو حضرت عمرؓ کی تھی، لیکن مکہ کے ایک معزز شخص حکیم بن حزام نے کہا:

"امیر المومنین! قریش تاجر لوگ ہیں، اگر آپ ان کے وظیفے مقرر کر دیں گے تو وہ تجارت بند کر دیں گے

---

[1] ابنِ اثیر - مقریزی - ابنِ عساکر

اور اگر آپ کے بعد کوئی خلیفہ ایسا ہوا جس نے یہ وظیفے بند کر دیے تو قریش کو دو طرفہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تجارت پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہوگی، وظیفے بھی بند ہو جائیں گے۔"

حکیم بن حزام کی یہ رائے بہت مناسب تھی۔ کیونکہ وظیفے مقرر کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ عرب، جو ہمیشہ زندگی کے میدانِ کارزار میں سرگرمِ عمل رہتے تھے، سست ہو جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کا کہنا یہ تھا کہ ان وظیفوں سے عربوں کو اپنی تجارت میں مزید وسعت دینے کا موقع ملے گا۔ حضرت عمرؓ کے عہد تک تو بے شک حجاز میں تجارت کو عروج حاصل رہا، لیکن آپ کے بعد آہستہ آہستہ عربوں کے ہاتھ سے تجارت نکلتی گئی۔ انھوں نے انھی وظیفوں پر اکتفا کر لی جو انھیں ماہ بماہ ملتے تھے اور اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے دنیوی نعمتوں میں سے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ آپ خود بھی انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے اہل وعیال کو بھی ایسی ہی سادہ زندگی گزارنے پر مجبور کرتے تھے۔ آپ کی حالت اس فقیر کی سی تھی جس کا گزارہ محض قوتِ لایموت پر ہو اور دنیوی نعمتوں اور عیش و آرام کی زندگی سے وہ قطعاً ناآشنا ہو۔ اگرچہ لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ آپ بھی اپنے لیے بیت المال سے اتنا وظیفہ لیا کریں جتنا دوسرے لوگ لے رہے تھے، لیکن آپ نے یہ بات منظور نہ کی۔ بیت المال سے آپ کا جو وظیفہ مقرر تھا، وہ اتنا تھوڑا تھا کہ بسا اوقات اس سے آپ کی اور آپ کے اہل وعیال کی ضروریات بھی پوری نہ ہوتی تھیں۔ لیکن آپ اپنے وظیفہ میں اضافہ کی درخواست کرنے کی بجائے یہ بات بہت بہتر خیال کرتے تھے کہ بیت المال کے افسر سے کچھ رقم قرض لے لیں۔

جب بعض صحابہؓ نے دیکھا کہ امیر المومنین جو رقم اپنے گزارہ کے لیے بیت المال سے لیتے ہیں، وہ آپ کی ضروریات کو بھی کافی نہیں ہوتی اور آپ بہت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے ہیں، تو باہم صلاح و مشورہ کر کے ام المومنین حضرت حفصہؓ (جو آپ کی صاحبزادی تھیں) کے پاس آئے اور ان سے کہا:

"آپ امیر المومنین سے عرض کریں کہ وہ اس تکلیف دہ زندگی کو جو انھوں نے خود اپنے لیے اختیار کر رکھی ہے، ترک کر دیں۔"

چنانچہ حضرت حفصہؓ آپ کے پاس آئیں اور صحابہؓ کی بات آپ کے سامنے دہرا دی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے سختی سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کے نام پوچھے جنھوں نے حضرت حفصہؓ کو یہ صلاح دی تھی۔ حضرت حفصہؓ نے ان لوگوں کے نام بتانے سے انکار کر دیا، اگر وہ بتا دیتیں تو ضرور حضرت عمرؓ انھیں سزا دیتے۔

امیر المومنین نے اپنی بیٹی سے پوچھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ کتنے کپڑے پہنتے تھے؟"

حضرت حفصہؓ نے فرمایا:

"دو کپڑے جو آپ کسی وفد کے آنے یا کسی تقریب کے موقع پر پہنتے تھے۔"

آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے کے متعلق پُوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کی خوراک انتہائی سادہ ہوتی تھی۔ پھر آپ نے رسولؐ اللہ کے بستر کے متعلق پُوچھا تو انھوں نے کہا کہ حضورؐ کا بستر کھُردرا ہوتا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے کہا:

"ان لوگوں کو جو تمھارے پاس آئے تھے، یہ بتلا دینا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت پر چلوں گا۔ میری اور میرے پیش رو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابُوبکرؓ کی مثال ان تین آدمیوں کی ہے جنھوں نے ایک راستہ پر سفر کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے پہلا شخص چلا، کچھ زادِ راہ لی اور اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے دُوسرا شخص چلا اور وہی راہ اختیار کی جو پہلے نے کی تھی، چنانچہ وہ بھی صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ان دونوں کے پیچھے تیسرا شخص چلا۔ اگر وہ ان دونوں کی راہ اختیار کرے گا تو ان تک پہنچ جائے گا اور اپنی منزلِ مقصود کو پائے گا لیکن اگر دونوں کے راستہ کے خلاف کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو کبھی منزلِ مقصود کو نہیں پا سکے گا۔"

حضرت عمرؓ اپنے گھر والوں کو کبھی یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان چیزوں سے نفع کمائیں جن پر ان کا حق نہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبید اللہ بن عمرؓ لشکرِ اسلام کے ساتھ عراق گئے، جب واپس ہُوئے تو ان کا گزر حضرت ابُو موسیٰ اشعریؓ کے پاس سے ہوا جو ان دنوں امیر بصرہ تھے۔ حضرت ابُو مُوسیٰ اشعریؓ نے ان دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کو بیت المال سے کچھ رقم اس غرض کے لیے دی کہ وہ اس سے کچھ مال خرید کر مدینہ لے جائیں اور وہاں اسے بیچ کر نفع خود رکھ لیں اور اصل رقم بیت المال میں واپس کر دیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ایسا ہی کیا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے اصل رقم کے ساتھ منافع بھی بیت المال میں داخل کرانا چاہا۔ لیکن بعض صحابہؓ نے مداخلت کی۔ پھر بھی ان دونوں کو آدھا نفع بیت المال میں داخل کرانا پڑا۔

اگر امیر المومنین اس قدر سخت احتیاط نہ برتتے اور خزانہ کے روپیہ کو اپنے اور اپنے اہل وعیال پر کھُلے دل سے خرچ کرتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اور آپ کے اہل وعیال خوشحال ہو جاتے، لیکن سلطنت کا انتظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا، کیونکہ اگر حاکم، ملک کے خزانہ کی طرف اپنا ہاتھ ناجائز طور پر بڑھائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی دولت میں کمی آ جاتی ہے خزانہ خالی ہو جاتا ہے بلکہ حکومت کے تمام شعبے خلل پذیر ہو جاتے ہیں۔ خیانت کی کثرت سے سارا نظام ابتر ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ جب لوگوں کو کسی کام سے منع فرماتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرتے اور ان سے کہتے:

"میں نے لوگوں کو فلاں فلاں کام سے روکا ہے۔ لوگ تمھاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ میں تم میں سے کسی کو یہ کام کرتا نہ دیکھوں، ورنہ خدا کی قسم دوسروں سے دُگنی سزا دُوں گا۔"

گو آپ اور آپ کے اہل وعیال بڑی سختی سے زندگی بسر کرتے تھے لیکن عام لوگوں کو انتہائی سادہ زندگی اختیار

کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ انھیں خوشحالی اور فارغ البالی نصیب ہو اور وہ دُنیا کی نعمتوں سے متمتع ہو سکیں البتہ اپنے عمال کو وہ بالکل اپنے راستہ پر چلانا چاہتے تھے تاکہ حکومت کا کام ٹھیک طور پر چلتا رہے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ آپ اپنی رعایا پر حد مہربان تھے اور جہاں تک آپ سے بن پڑتا تھا رعایا کی خوشحالی، راحت و آرام اور اطمینان کے لیے سعی کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا ہمیشہ دستور رہا کہ آپ عربوں کو عمل کی تلقین کرتے اور سستی سے نفرت دلاتے رہتے تھے۔ اپنے عمال کو اکثر لکھتے رہتے کہ وُہ اپنے فرائض پُوری توجہ کے ساتھ انجام دیں اور کبھی آج کا کام کل پر نہ چھوڑیں ورنہ بہت سے کام اکٹھے ہو جائیں گے اور ان کا سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

آپ نے عام لوگوں کو اپنی مجالس میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ دوسرے لوگوں کو بھی یہ پتا لگ سکے کہ سلطنت کے کام کس طرح سرانجام دیے جاتے ہیں۔ امورِ سلطنت پر کس طرح بحث و تمحیص اور ان پر کیونکر عمل کیا جاتا ہے۔

آپ نے مختلف کاموں کی سرانجام دہی کے لیے بعض خاص خاص ماہرین کو مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اے لوگو! جس کو قرآن کریم کے متعلق پُوچھنا ہو وُہ اُبیؓ بن کعب کے پاس جائے، جس کو فرائض اور واجبات کے متعلق پُوچھنا ہو وہ زیدؓ بن ثابت کے پاس جائے، جس کو فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جس کو مالی امور کے متعلق کوئی بات سمجھنی ہو وہ میرے پاس آئے کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے اموال کا خازن اور تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔"

وظیفے مقرر کرنے کے لیے حضرت عمرؓ نے مردم شماری کرائی تھی اور بربنائے سبقتِ اسلام وظائف مقرر فرمائے تھے تقسیم میں سب سے پہلے ان لوگوں کو رکھا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس کے بعد اہلِ بدر کے حصے مقرر کیے تھے۔ پھر ان لوگوں کے جو حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں حاضر تھے، پھر ان لوگوں کے جو بعد میں ایمان لائے اور قادسیہ اور یرموک کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے۔ اسی طرح امہات المومنین، بچوں، اماموں، موذنوں، معلموں، قاضیوں اور شاعروں کے علیٰ حسب المراتب حصے مقرر کیے تھے۔ حصے مقرر کرنے کے بعد آپ نے ایک تقریر کی جس میں فرمایا:

"خدا کی قسم! ان اموال میں سے کسی کا حق دوسرے سے زیادہ نہیں ہے۔ خود میرا حق بھی کسی دُوسرے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں میں سے ہر شخص کا، سوائے مملوکہ غلاموں کے، ان اموال میں حصہ ہے لیکن چونکہ کتاب اللہ میں مسلمانوں کے مختلف طبقے مقرر کیے گئے ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طبقوں کو برقرار رکھا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔ چنانچہ جو حصے مقرر کیے گئے ہیں وہ اس بات کو دیکھ کر مقرر کیے گئے ہیں کہ کس شخص نے اسلام قبول کرنے کے بعد زیادہ تکلیفیں اٹھائیں، کون شخص ابتدائی زمانہ میں ایمان لایا، کون شخص مالدار ہے اور کس شخص کی کس قدر ضروریات ہیں۔ خدا کی

قسم، اگر جبل صنعا میں کوئی شخص اپنی بکریاں چراتا ہوگا تو اسے بھی ان اموال میں سے حصہ ملے گا۔"

فتوحات کی وسعت کی وجہ سے چونکہ نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے تھے اور کاروبارِ حکومت بھی وسیع ہوگیا تھا اس لیے حضرت عمرؓ کو بعض نئی چیزیں ایجاد کرنی پڑیں۔ آپ ہی نے سب سے پہلے درّہ استعمال کیا تھا اور آپ ہی نے ایران اور روم کے رجسٹروں کی طرز پر رجسٹر تیار کرائے تھے۔ ان رجسٹروں کو عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم نے، جو قریش کے عقلمند ترین لوگوں میں سے تھے اور جنھیں عربوں کے انساب اور تاریخ کا پورا پورا علم تھا، تیار کیا تھا۔

یہ بھی ثابت ہے کہ اسلام میں آپ ہی نے سب سے پہلے قیدخانہ تیار کرایا تھا۔ چنانچہ مشہور شاعر حطیہ کو آپ نے قید کیا تھا اسی طرح ایک اور شخص ضبیع کو بھی آپ نے قیدخانہ میں قید کیا تھا جہاں اسے جسمانی سزا بھی دی گئی۔ اس کے بعد اسے عراق جلاوطن کر دیا گیا اور وہاں کے عامل کو لکھ دیا گیا کہ اسے کوئی شخص منہ نہ لگائے۔ اگر سو آدمی بھی کسی جگہ بیٹھے ہوں اور یہ وہاں پہنچ جائے تو لوگ منتشر ہو جائیں۔ آخر جب اس نے اپنے قصور سے توبہ کی تو حضرت عمرؓ نے اسے معاف کر دیا۔

حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ کوئی شخص نماز کے اوقات کے علاوہ مسجد میں نہ بیٹھا رہے۔ آپ نے مسجد کے کونے میں ایک چبوترہ بھی بنوایا تھا جس کا نام "بطیحا" تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس کسی کو کوئی بات کرنی یا شعر پڑھنا یا شور مچانا ہو وہ یہ کام اس چبوترہ پر جا کر کیا کرے۔ آپ کے عہدِ حکومت میں مسجد صرف نماز اور قضا کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ تمام خلفائے راشدینؓ مسجد میں بیٹھ کر ہی مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

جب فتوحات کا سلسلہ تیز ہوگیا، غیر ممالک کے لوگ جوق در جوق اسلام لانے لگے اور مسلمان بچوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے مدرسے بنانے کا حکم دیا اور چند لوگوں کو اس کام پر مقرر کر دیا کہ وہ بچوں کو دینی علوم سکھائیں اور ان کی تربیت کریں۔

سب سے پہلا رجسٹر جو حضرت عمرؓ نے تیار کرایا وہ خراج اور اموال کا تھا۔ یہ رجسٹر دمشق، بصرہ اور کوفہ میں اسی طرز پر تیار کرائے گئے جس طرز پر پہلے ایرانی اور رومی رجسٹر تیار ہوتے تھے۔ شام کے رجسٹر رومی زبان میں تیار کیے جاتے تھے، عراق کے رجسٹر فارسی زبان میں اور مصر کے رجسٹر قبطی زبان میں۔ ان رجسٹروں کی تیاری کے لیے عیسائی اور مجوسی نوکر رکھے گئے تھے کیونکہ وہ اس کام کو اچھی طرح کر سکتے تھے۔

رجسٹروں اور دفتروں کی تیاری کا باعث یہ ہوا کہ جب حضرت ابوہریرہؓ، جو بحرین کے عامل تھے، پانچ لاکھ درہم لے کر مدینہ تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے مجلسِ شوریٰ منعقد کر کے لوگوں سے رائے پوچھی کہ اس مال کو کس طرح صرف کیا جائے۔ ولید بن ہشام نے جو ایران اور شام کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے، کہا کہ میں نے شام میں دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج کا دفتر اور رجسٹر مرتب رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ رائے پسند آئی اور آپ نے ایران اور شام کی طرز پر دفتر مرتب کرنے کا حکم دیا۔ ایک صندوق بھی تیار کیا گیا جس میں تمام دستاویزات اور معاہدات محفوظ طریقے پر رکھے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اسلامی سلطنت میں چند بڑے بڑے فوجی مرکز بھی قرار دیے جن کا نام 'جند' رکھا۔ یہ مرکز مدینہ،

کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق، اردن، حمص اور فلسطین تھے۔

فوجیں کوچ کے وقت سارا سامانِ جنگ اپنے ساتھ نہیں لیتی تھیں، بلکہ سامان کا اکثر حصّہ ان مرکزوں اور مختلف چھاؤنیوں میں رکھا رہتا تھا اور ضرورت پڑنے پر فوراً فوجوں کو پہنچا دیا جاتا تھا۔ لشکروں کی تنخواہیں مدینہ سے نہیں جایا کرتی تھیں بلکہ جہاں کوئی فوج مقیم ہوتی تھی وہیں سے اسے تنخواہ ملتی تھی۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف ممالک سے خراج اور جزیہ کی جو رقم جمع ہوتی تھی وہ ساری کی ساری مدینہ بھیج دی جاتی تھی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ مدینہ صرف اتنی ہی رقم بھیجی جاتی تھی جو فوجیوں کو تنخواہیں دینے اور ملکی اخراجات کے بعد باقی بچ جاتی تھی۔

حضرت عمرؓ ہی نے سب سے پہلے امیر المومنین کا لقب استعمال کیا۔ آپ ہی نے اسلام میں سب سے پہلے قاضی مقرر کیے۔ سنہ ہجری بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ اسلام کے بعد سب سے پہلے شہر آباد کرنے کا فخر بھی آپ ہی کے حصّہ میں آیا۔ آپ ہی کے عہد میں آپ کے حکم سے بصرہ اور کوفہ دو نئے شہر آباد کیے گئے۔

آپ کی یہ عادت تھی کہ عام مسائل کے متعلق مسجد میں لوگوں سے استفسار فرماتے تھے۔ اس کے بعد اپنی اور کبار صحابہؓ کی رائے مجلسِ شوریٰ میں پیش کرتے تھے۔ اس مجلسِ شوریٰ میں جو رائے پاس ہو جاتی تھی اسی پر عملدرآمد کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کا نتیجہ تھا کہ آپ کے تمام کام ان صاحب آراء کا نچوڑ ہوا کرتے تھے جو ملک کے اہلِ فہم و دانش طبقہ کی طرف سے آپ کو دی جاتی تھیں اور سلطنت کا نظام اس خوبی سے چل رہا تھا کہ آپ کے علاوہ اور کسی خلیفہ یا بادشاہ کے عہد میں نہیں چلا۔

سلطنت کے مختلف علاقوں میں آپ جو حاکم بھیجا کرتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے:

جن لوگوں کے سپرد ملک کا عام انتظام، جہاد کی تیاری اور نماز پڑھانا ہوتا تھا انھیں امیر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

جن لوگوں کے سپرد قضا اور بیت المال کا کام ہوتا تھا انھیں معلّم اور وزیر کہا جاتا تھا۔ مدینہ سے آپ بعض لوگوں کو مفتوحہ علاقے کی پیمائش، خراج کا اندازہ کرنے اور مردم شماری کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے روانہ ہوتے وقت ان لوگوں کو اپنی قیمتی ہدایات سے نوازتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں سے جنھیں آپ نے عراق کی پیمائش کرنے اور وہاں کے باشندوں پر خراج لگانے بھیجا تھا یہ فرمایا تھا:

> "مجھے ڈر ہے کہیں تم عراق کے لوگوں پر اتنا بوجھ نہ ڈال دو جسے وہ اٹھا نہ سکیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا اور توفیق دی تو میں وہاں کے باشندوں کو اتنا خوشحال بنا دوں گا کہ میرے بعد وہاں کی بیوائیں تک کسی آدمی کی مدد کی محتاج نہ رہیں گی۔"

ایک بار فرمایا:

> "اے اللہ! میں تجھے سلطنت کے امراء پر اپنا گواہ ٹھہراتا ہوں۔ تو جانتا ہے میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ وہ لوگوں کو دینِ اسلام سکھائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے آگاہ کریں۔ عدل و انصاف قائم رکھیں اور اگر انھیں کسی مشکل کا سامنا ہو تو اسے میرے سامنے پیش کریں۔"

عمال کی تنخواہیں ان کی ضرورت اور شہر کے حالات کو مدِ نظر رکھ کر مقرر کی جاتی تھیں۔ حمص کے عامل عیاض بن غنم کو ایک دینار، ایک بکری اور دو رطل غذائی اجناس یومیہ ملا کرتی تھیں۔ آپ نے کوفہ میں حضرت عمار بن یاسر کو سرحدوں کی دیکھ بھال کرنے، عثمان بن حنیف کو خراج وصول کرنے اور عبداللہ بن مسعود کو بیت المال کی نگرانی کرنے، لوگوں کو قرآن سکھانے اور انھیں دین سے آگاہ کرانے کے لیے بھیجا تھا۔ ان تینوں کے لیے ایک بکری یومیہ مقرر تھی۔ عمار بن یاسر کو نصف بکری ملا کرتی تھی اور باقی نصف بکری میں عبداللہ بن مسعود اور عثمان بن حنیف شریک تھے۔ عمار بن یاسر کی ماہانہ تنخواہ چھ سو درہم تھی۔ عثمان بن حنیف کی پانچ سو درہم اور عبداللہ بن مسعود کی سو درہم تھی۔ قاضی شریح کی تنخواہ سو درہم ماہانہ اور دس جریب گیہوں تھی۔

حضرت ابوبکرؓ تنخواہیں، وظائف اور عطیات دینے میں کسی کے علم و فضل اور سابقیتِ اسلام کا لحاظ نہیں رکھتے تھے بلکہ سب کو برابر دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے:

"جن لوگوں نے اسلام کی راہ میں مشقتیں اور تکلیفیں اٹھائی ہیں وہ اپنا بدلہ خدا تعالیٰ سے آخرت میں پائیں گے موجودہ مال تو دنیا کا مال ہے اسے لینے میں نیک اور فاجر سب برابر ہیں۔ یہ ان کے اعمال کے بدلے میں نہیں دیا جا رہا۔"

لیکن حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ میں اس شخص کو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں لڑا، اس شخص کے برابر ہرگز نہیں رکھ سکتا، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر کفار سے جنگ کی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنخواہوں میں جو تفاوت برتا تھا وہ اسی اصول کی بنا پر برتا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں پر عصبیت بری طرح مسلط تھی۔ ہر عرب حسب و نسب میں اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتا تھا۔ لیکن جب اسلام آیا تو اس نے تمام عربوں کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور باوجود قبیلوں اور خاندانوں کے اختلاف کے سارے عربوں نے متحد ہو کر ایک قوم اور ایک گروہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ ایک دوسرے پر برتری کا احساس جاتا رہا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عجمی ممالک فتح ہونے لگے اور عربوں اور غیر عربوں میں میل جول ہوا تو آپ نے خطرہ محسوس کیا کہ کہیں عرب عجمیوں کے ساتھ میل ملاپ میں اپنے قومی خصائل کو نہ بھول جائیں اور اس طرح عربی اتحاد میں فرق نہ آ جائے۔ اس لیے آپ نے سختی کے ساتھ اس بات کی نگہداشت رکھی کہ عرب عجمی خصائل اور اخلاق اختیار کرنے نہ پائیں۔ عربوں کی فضیلت کا آپ کو اس حد تک خیال تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

"عربوں کے لیے یہ بات بے حد شرم کا باعث ہے کہ کوئی عرب کسی عرب کا غلام ہو۔"

جاہلیت اور اسلام کے زمانہ کے جتنے عرب غلام لوگوں کے پاس تھے آپ نے سب آزاد کرا دیے۔

مسعودی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی عجمی کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیا[1] گو یہ بات تو بالبداہت غلط ہے کیونکہ آپ نے مرزبان اور ابو لولو وغیرہ کو جو غیر عرب تھے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن شاید مسعودی کا

---

[1] مسعودی جلد اول ص ۲۹

اس روایت سے یہ مطلب ہو کہ آپ نے عجمیوں کی کسی جماعت کو مدینہ میں آباد ہونے کی اجازت نہ دی، اگرچہ آپ بعض اوقات چند خاص خاص لوگوں کو دارالخلافہ میں رہنے کی اجازت دے دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی یہ خواہش تھی کہ عرب میں غیر عرب نہ رہنے پائیں۔ اسی لیے آپ نے خیبر سے یہودیوں کو نکال کر اس کی زمین مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھی۔ اسی طرح نجران سے بھی یہودیوں کو خارج کر کے کوفہ کی طرف بھیج دیا تھا۔

عربوں کی جانب بڑھی ہوئی توجہ ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب اپنے انساب یاد رکھیں تاکہ ان کی عصبیت برقرار رہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اپنے انساب اچھی طرح یاد رکھو۔ کہیں تمھاری حالت عراق کے عجمیوں کی طرح نہ ہو جائے کہ جب تم سے کوئی تمھارا نسب پوچھے تو تم صرف یہ کہہ دو کہ میں فلاں قبیلے سے ہوں"[1]

آپ حجاز کے عربوں کو عراق اور شام میں آباد ہونے کی بہت ترغیب دلایا کرتے تھے[2]۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

"حجاز ہی کو اپنا مسکن بنا کر نہ بیٹھے رہو بلکہ اس سرزمین میں جاؤ جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمھیں اس کا وارث بنا دے گا۔"

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عراق اور شام میں بھی عرب آباد تھے اور آپ چاہتے تھے کہ حجاز کے عرب اور عراق و شام کے عرب آپس میں متحد ہو جائیں اور موقعہ پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد اور تائید کریں۔ یہ بات بیشک تھی کہ دونوں علاقوں کے عربوں کے لب و لہجہ میں فرق تھا لیکن چونکہ زبان کے معاملہ میں حجاز کے عرب باقی سب علاقوں کے عربوں سے بڑھے ہوئے تھے، اس لیے حضرت عمرؓ کو یقین تھا کہ حجازیوں کی بولی ہی عراق اور شام کے عربوں کی بولیوں پر غالب آ جائے گی اور آپس کے میل ملاپ سے ایک ایسی متحدہ عرب قوم وجود میں آ جائے گی جو حجاز سے لے کر شام اور عراق کے نخلستانوں تک پھیلی ہوئی ہو گی۔

حضرت عمرؓ کا یہ نظریہ بالکل درست تھا کیونکہ آئندہ چل کر واقعات نے ثابت کر دیا کہ عراقی عرب مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑے اور انھوں نے ایرانیوں کی کمزوریوں سے مسلمانوں کو مطلع کیا۔ چنانچہ ابوزبید الطائی، جو عیسائی تھا، معرکۂ جسر میں مسلمانوں کے ساتھ ہو کر لڑا اور قتل ہوا۔ اس کے مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی وجہ محض قومی حمیت تھی۔ اسی طرح عراق میں واقعۂ بویب کے دن انس بن ہلال نمری، نمر قبیلہ کی ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کے لیے آیا تھا۔ یہ سب لوگ عیسائی تھے لیکن اُنھوں نے آ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ ہو کر لڑیں گے[3]۔ اسی طرح تغلب اور دیگر عیسائی قبیلوں کا حال تھا کہ انھوں نے جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کی اور اسلامی پرچم کے زیرِ سایہ مسلمانوں کے دشمنوں سے لڑے، حالانکہ وہ سب

---

[1] ابنِ خلدون جلد اول ص ۱۰۹
[2] ابن اثیر جلد دوم ص ۲۱۵
[3] ابن خلدون جلد اول ص ۲۲۱

عیسائی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ رکھتے تھے لیکن محض عربیت کا اتحاد دوسرے تمام اختلافات پر غالب آ جاتا تھا۔ صرف عراقی عربوں ہی کی یہ حالت نہ تھی، شام کے عیسائی عربوں نے بھی اسی طرح مسلمانوں کی ہر موقعہ پر مدد کی۔ اگرچہ "لامنس" ان پر خیانت اور غداری کا الزام لگاتا ہے، لیکن اُنھوں نے اپنے ہم قوم لوگوں کے سامنے اور کسی کی پروا نہ کی۔

حضرت عمرؓ اس رشتہ کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جب آپ نے شام اور عراق میں فوجیں بھیجیں اور عراق کے عیسائی عربوں نے مسلمانوں کی مدد کی تو آپ نے "تغلب" ایاد اور نمر کے عیسائی قبیلوں کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا۔ ان سے صرف وہی صدقات اور ٹیکس لیے جاتے تھے جو مسلمانوں سے لیے جاتے تھے۔ البتہ ایک شرط رکھی کہ وہ اپنے بعد اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے[1]

(۲۱)

امیرالمومنین کے اخلاق و عادات

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی تو کچھ روز تک آپ بازار جاتے اور تجارت کرتے رہے۔ لیکن جلدی ہی آپ کو احساس ہو گیا کہ خلافت اور تجارت اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے اس کا تذکرہ حضرت عمرؓ سے کیا۔ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ خلیفہ کو اپنے اور اہل و عیال کے اخراجات کے لیے بیت المال سے کتنی رقم ملنی چاہیے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو چھ ہزار درہم سالانہ ملا کریں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوتا رہا۔ جب حضرت ابوبکرؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپ نے فرمایا :

"میرے پاس مسلمانوں کا جو مال ہے وہ سب واپس کر دو کیونکہ میں اس میں سے کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اپنے دورانِ خلافت میں میں نے بیت المال سے جو رقم لی ہے اس کے بدلے میری فلاں جائداد فروخت کر دی جائے اور اس کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔"

آپ کے رشتہ داروں نے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا :

"ابوبکر! تم نے اپنے جانشین پر بہت بوجھ ڈال دیا۔"

جس پاک دامنی، جس پاکیزگی اور جس طرزِ معیشت کا نمونہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی زندگی میں پیش کیا تھا حضرت عمرؓ نے بھی اپنے تمام ایامِ خلافت میں اسی قسم کا پاک نمونہ دکھایا۔ آپ عدل، پرہیزگاری، حق کے بارہ میں شدت، بڑے بڑے

---

[1] المعارف از ابنِ قتیبہ ص ۱۹۳

لوگوں پر سختی کرنے اور غریبوں سے انتہائی مہربانی کے ساتھ پیش آنے میں خدا تعالیٰ کا ایک زبردست نشان تھے۔ سادہ زندگی بسر کرنے میں کوئی شخص آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی اخلاق تھے جن کی وجہ سے آپ کے زمانہ میں سلطنت کو انتہائی عروج حاصل ہوا اور اس کی بنیادیں خوب اچھی طرح مستحکم ہوگئیں۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا:

"مجھ کو تمھارے مال میں اسی طرح کا حق ہے جس طرح یتیم کے مال میں اس کے مربی کا ہوتا ہے۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر صاحبِ حاجت ہوں گا تو اندازہ سے کھانے کے لئے لوں گا۔"

روایات سے پتا چلتا ہے کہ خلیفہ ہونے کے بعد کافی عرصہ تک حضرت عمرؓ نے بیت المال سے ایک حبّہ تک نہیں لیا۔ لیکن جب غربت نے بہت ستایا تو آپ نے بعض صحابہؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ خلیفہ ہونے کی وجہ سے کوئی اور کام نہیں سکتے۔ انھیں بیت المال سے کتنا گزارہ لینا چاہیے؟ حضرت عثمانؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید نے عرض کیا کہ آپ کے لیے کیا روک ٹوک ہو سکتی ہے جتنا مال چاہے لے لیجئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ آپ صرف اتنا ہی گزارہ لے سکتے ہیں، جو آپ کی صبح اور شام کی خوراک اور معمولی لباس کے لیے کافی ہو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور صرف اتنا ہی گزارہ لینا منظور کیا جو قُوتِ لایموت کے لیے کافی ہو۔

طبقات ابنِ سعد میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے بہت کم گزارہ لیتے تھے۔ آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ گرمیوں میں جو کپڑے کا جوڑا پہنتے تھے وہ اس وقت تک پہنے رہتے تھے جب تک وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاتا۔ وہ جوڑا بھی نہایت معمولی ہوتا تھا۔ حضرت حفصہؓ نے اس بارہ میں ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا تو انھیں جواب ملا کہ میں اس سے زیادہ عمدہ لباس نہیں پہن سکتا کیونکہ میں جو کچھ پہنتا ہوں مسلمانوں کے مال میں سے پہنتا ہوں۔

آپ ہر روز اپنے اور اپنے اہل و عیال پر صرف دو درہم خرچ کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے حج کیا تو اس میں آپ کے سولہ دینار خرچ ہو گئے۔ آپ نے اپنے لڑکے عبداللہ سے فرمایا:

"عبداللہ بن عمر! ہم نے بہت اسراف سے کام لیا۔"

اس زمانہ میں دینار بارہ درہم کا ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زُہد و تقویٰ کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے آپ کے گھر والوں کو ایک چٹائی بطور تحفہ دی۔ جب حضرت عمرؓ گھر میں آئے تو آپ نے پوچھا:

"یہ چٹائی کہاں سے آئی؟"

آپ کی بیوی نے جواب دیا:

"یہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے ہمیں بطور تحفہ دی ہے۔"

یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے اس چٹائی کو زمین پر دے مارا اور ابوموسیٰؓ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"تم نے کس تقریب سے یہ چٹائی میری بیوی کو تحفہ میں دی ہے ؟"

یہ کہہ آپ نے وہ ان کے سر پر دے ماری اور فرمایا :

"اسے لے جاؤ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے ۔"

ایک سال ملک میں بڑا زبردست قحط پڑا ، آپ نے اس دوران میں اپنی خوراک انتہائی کم کر دی تھی۔ کئی روایات میں آتا ہے کہ جب تک قحط ختم نہ ہوگیا حضرت عمرؓ نے نہ کوئی لذیذ چیز کھائی ، نہ شہد چکھا اور نہ گوشت اپنے منہ میں ڈالا ۔ حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں کہ قحط کے سال آپ نے اپنے اوپر گھی حرام کر لیا تھا ، صرف زیتون کا تیل استعمال فرماتے تھے۔ لوگوں کی تکالیف نے آپ کو اس حد تک بے چین کر رکھا تھا کہ کھانے پینے کا سامان خود اپنی پیٹھ پر رکھ کر غریبوں کے گھروں تک جاتے تھے اور انھیں تقسیم کرتے تھے۔

عیاض بن خلیفہ کہتے ہیں کہ میں نے قحط کے سال حضرت عمرؓ کو دیکھا آپ کا رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے آپ سُرخ و سپید تھے۔ لوگوں نے عیاض سے اس تبدیلی کا سبب پُوچھا تو اُنھوں نے بتلایا کہ پہلے وہ گھی اور دُودھ استعمال کیا کرتے تھے لیکن جب قحط پڑ گیا تو آپ نے یہ تمام چیزیں ترک کر دیں اور محض زیتون کے تیل پر گزارہ کرنے لگے۔ کئی کئی وقت تک آپ کھانا بھی نہیں کھاتے تھے ، اسی لیے آپ کا رنگ تبدیل ہوگیا اور صحت خراب ہوگئی۔

کئی لوگوں کی روایت ہے کہ اگر خدا تعالیٰ قحط دُور نہ کرتا تو حضرت عمرؓ ضرور اسی فکر اور پریشانی کی وجہ سے اپنی جان دے دیتے ۔

اسی قحط کے زمانے میں ایک دفعہ آپ نے اپنے ایک لڑکے کے ہاتھ میں تربُوز دیکھا ۔ جھٹ وہ تربوز اس کے ہاتھ سے لے لیا اور فرمایا :

"تم پھل کھاتے ہو اور رسولؐ اللہ کی اُمّت بھُوکی مر رہی ہے ۔"

بچہ روتا ہوا باہر چلا گیا۔ آپ نے پتا چلایا کہ لڑکے کو تربوز کہاں سے ملا تو معلوم ہوا اس نے کھجوروں کو بیچ کر ان کے بدلے یہ تربوز لیا تھا ۔

قحط کے زمانہ میں آپ روزانہ اپنے دسترخوان پر کئی ہزار لوگوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے ۔ اپاہج ، مریض اور بچے جو آپ کے پاس نہیں آ سکتے تھے ان کو کھانا ان کے گھر بھیجا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی۔

ایک مرتبہ آپ پیاسے ایک آدمی کے گھر پہنچے اور اس سے پانی مانگا ۔ وُہ شہد لے آیا ۔ آپ نے فرمایا :

"یہ کیا ہے ؟"

اس نے عرض کیا کہ "شہد ہے"۔ آپ نے اس کو پینے سے انکار کر دیا اور فرمایا :

"میں نہیں چاہتا کہ اس کے بدلے قیامت میں میرا محاسبہ کیا جائے ۔"

یسار بن نمیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کبھی چھنا ہوا آٹا استعمال نہیں فرمایا۔

سائب بن یزید کہتے ہیں "میں نے قحط کے سال حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپ کے لباس میں سولہ پیوند لگے ہوئے تھے"۔

اسی طرح حضرت انسؓ بن مالک بھی بیان کرتے ہیں کہ خلافت کے زمانہ میں مَیں نے ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ کی قمیص میں دونوں کندھوں کے درمیان تین پیوند اُوپر تلے لگے ہوئے تھے۔

ابو عثمان نہدی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اپنی قمیص پر چمڑے کا پیوند لگا رکھا تھا جمعہ کی نماز کا وقت تھا، حضرت عمرؓ دیر تک مسجد میں تشریف نہ لائے۔ جب آئے تو منبر پر چڑھ کر فرمایا: میں اپنی قمیص کو پیوند لگانے میں معروف تھا کیونکہ میرے پاس اور کوئی قمیص نہیں تھی۔

عامر بن عبیدہ باہلی کہتے ہیں؛

"میں نے حضرت انسؓ بن مالک سے اونی کپڑوں کے بارہ میں پُوچھا، انھوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہؓ نے اونی کپڑے پہنے ہیں، صرف حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ نے انھیں کبھی استعمال نہیں فرمایا۔"

حضرت عمرؓ اس بات سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ خدا تعالیٰ نے پاک چیزوں کو اپنے بندوں کے لیے حلال کیا ہے اور اور اگر وہ اسراف کو کام میں لائے بغیر ان چیزوں کو استعمال کریں تو یہ شرعاً جائز ہے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے اپنے اوپر جس قسم کی تنگی وارد کر رکھی تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ ہر دم ان کے سامنے یہ تصور رہتا تھا کہ وہ امیرالمومنین ہیں اور یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں کہ رعایا میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو لیکن ان کا حاکم، جو ان کی ضروریات پُوری کرنے کا ذمہ دار ہے وہ سیر ہو کر کھانا کھائے۔ دُوسرے لوگ اپنے کپڑوں پر چمڑے کے پیوند لگائیں اور وہ اونی کپڑے پہنے۔

حضرت عمرؓ کی سادہ زندگی، زہد، تقویٰ، کھانے پینے میں انتہائی سادگی اختیار کرنے کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں ان سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ خلیفہ کی اصلی شان یہ ہے کہ وُہ رعایا کے سامنے اپنے آپ کو حاکم کی حیثیت میں نہیں بلکہ خادم کی حیثیت میں پیش کرے اور اسے اپنے اعمال سے یہ بات ثابت کر دینی چاہیے کہ اسے رعایا پر صرف اس کے تقویٰ و طہارت اور اخلاصِ عمل ہی کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔ خلفائے راشدین، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وُہ جانتے تھے کہ ان کا فرض امت کی خدمت کرنا ہے اور امت کے ہر چھوٹے بڑے کام کے متعلق انہی کو خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے:

"اگر کوئی گم شدہ اُونٹ دریائے فرات کے کنارے مرجائے تو مجھے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ قیامت میں خدا تعالیٰ مجھ سے اس کے متعلق پُوچھے گا۔"

اسی طرح یہ بھی فرمایا کرتے تھے؛

"اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے کسی عامل نے کسی شخص پر ظلم کیا ہے اور میں اس ظلم کی تلافی نہ کروں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اپنے ہاتھ سے اس شخص پر ظلم توڑا۔"

جب حضرت عمرؓ خلافت کے زمانہ میں حج کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے تو راستہ میں جہاں پڑاؤ کرتے، اپنے لیے کوئی خیمہ وغیرہ نہ لگواتے بلکہ چادر بچھا کر کسی درخت کے نیچے پڑ رہتے اور اسی کے سایہ میں آرام کرتے۔

ربیع بن زیاد الحارثی کہتے ہیں:

"میں نے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ آپ لوگوں میں سب سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ لذیذ غذا کھائیں، عمدہ سواری پر سوار ہوں اور نرم کپڑے پہنیں"۔

حضرت عمرؓ نے یہ سُن کر ایک چھڑی اٹھائی اور میرے سر پہ دے ماری۔ پھر فرمایا:

"اگر تمھارا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں سُنا کر تم خدا تعالیٰ کا یا میرا قرب حاصل کر سکو گے تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میری اور میری رعایا کی مثال تو اس جماعت کی ہے جو سفر پر چلی۔ سارے لوگوں نے اپنی چیزیں ایک شخص کے حوالے کر دیں اور راستے کی تمام ضرورتیں پوری کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ تم بتاؤ کیا اس شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے؟"

میں نے عرض کیا: "نہیں"۔

اس پر آپ نے فرمایا:

"پھر میں اپنے آپ کو دوسرے لوگوں پر کس طرح ترجیح دے سکتا ہوں؟"

احنف کہتے ہیں،

"ہم حضرت عمرؓ کے دروازہ پر بیٹھے تھے۔ ایک لونڈی ہمارے پاس سے گزری۔ ہم نے آپس میں کہا "یہ امیرالمومنین کی لونڈی ہے"۔ حضرت عمرؓ کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی۔ آپ نے ہمیں اپنے پاس بلایا اور فرمایا "یہ امیرالمومنین کی لونڈی نہیں ہے اور نہ انھیں اللہ کے مال میں سے اس لونڈی کو لینے کا اختیار ہی ہے"۔ ہم نے پُوچھا "آپ کو اللہ کے مال میں سے کیا کیا لینے کا اختیار ہے؟" آپ نے فرمایا "سُنو، میں تمھیں بتاتا ہُوں۔ مجھے صرف یہ چیزیں لینی جائز ہیں۔ سال میں دو جوڑے، ایک جوڑا گرمیوں کا اور ایک جوڑا سردیوں کا۔ اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کے گزارہ کا خرچ، جو قریش کے ایک معمولی آدمی کے لیے کافی ہو۔ میں مسلمانوں ہی کا ایک فرد ہوں۔ جو انھیں ملتا ہے مجھے بھی وہی ملنا چاہیے۔ ان سے زیادہ لینے کا مجھے کوئی اختیار نہیں"۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضرت حفصہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "آپ اپنے والدِ محترم سے کہیں کہ وُہ اپنی زندگی میں کچھ نرمی پیدا کریں"۔

چنانچہ آپ نے حضرت عمرؓ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

"تو نے اپنے باپ کو دھوکا دیا"۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عمّال کو رعایا کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آنے، عدل وانصاف قائم رکھنے اور سخت سزائیں نہ دینے کی تاکید کر رکھی تھی آپ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ رعایا کے ساتھ بے جا سختی کی جائے۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں :

"میں ایک دفعہ صبح کے وقت اپنے والد کے ساتھ تھا ہم دونوں سوار تھے۔ ہم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ ہماری طرف آرہا ہے۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ رونے لگا۔ والد نے اس سے پوچھا : روتے کیوں ہو؟ اگر تم کسی بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہو، تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔ اگر خوف زدہ ہو تو تمھیں امن دیں گے۔ البتہ اگر تم نے کسی کو قتل کر دیا ہے تو اس کے بدلے تمھیں قتل کیا جائے گا۔ اگر تم کسی جگہ رہنا نہیں چاہتے تو ہم تمھیں دوسری جگہ آباد کر دیں گے۔ اس نے عرض کیا : میں بنی تمیم میں سے ہوں ، میں نے شراب پی تھی ، اس کی سزا میں آپ کے عامل ابوموسیٰ اشعری نے مجھے کوڑے مارے ، میرا منہ کالا کر دیا اور مجھے لوگوں کے درمیان گشت کرایا اور انھیں حکم دیا کہ خبردار کوئی آدمی اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ نہ اپنے ساتھ بٹھائے، نہ کھانے پینے میں اپنے ساتھ شریک کرے۔ اس پر میں نے اپنے دل میں تین باتیں سوچیں ، یا تو تلوار لے کر ابوموسیٰ کا خاتمہ کر دوں ، یا شام چلا جاؤں جہاں کوئی شخص مجھے نہیں جانتا ، یا دشمن کے ساتھ مل جاؤں اور ان کے ساتھ کھاؤں پیوں ، مزے اڑاؤں۔"

حضرت عمرؓ یہ سن کر رو پڑے اور فرمایا :

"شراب پینا ایک نہایت قبیح فعل ہے اور ایک مسلمان کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ شراب پئے۔ لیکن یہ زنا کی طرح نہیں ہے۔"

آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو خط لکھا جس میں تحریر کیا :

"مجھے فلاں شخص کی زبانی اس اس بات کا پتا چلا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم نے دوبارہ ایسا فعل کیا تو تمھارا منہ کالا کراکے تمام شہر میں پھراؤں گا۔ لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اس شخص سے برابر میل جول رکھیں اور اگر یہ شخص توبہ کرلے تو اس کی شہادت بھی قبول کر لیا کرو۔"

خود حضرت عمرؓ نے اس شخص کو دو سو درہم دئے۔

مختصر یہ کہ امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ اپنی رعایا کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اس کے فائدہ کے لیے جو بن پڑتا تھا ، کرتے تھے۔ آپ نے جو سیاست اختیار کی تھی اس سے لوگ آپ کے بےحد گرویدہ ہو گئے تھے۔ آپ ان کے اموال اپنے ذاتی مصرف میں لانا حرام سمجھتے تھے۔ رعیت کا ہر شخص آپ کی نظر میں مساوی حقوق کا حامل تھا۔ عدل و انصاف آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ حکمت آپ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جس چیز کا جہاں موقع ہوتا اسے وہیں رکھتے تھے۔ جہاں مصلحت نرمی کا تقاضا کرتی تھی وہاں نرمی اختیار کرتے تھے اور جہاں سختی کا تقاضا کرتی تھی وہاں سختی کو کام میں لاتے تھے۔

عربوں کی ہر خصلت و عادت سے آپ اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ کون سا کام ان کے لیے مفید ہے اور کون سا مضر۔ اس طرح آپ نے ان کو صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا اور انھیں ایک ایسی زندہ قوم بنا دیا جس کی ہیبت سے

سارا جہان کانپتا تھا۔ جو ذلت پر کبھی راضی نہ ہوتی تھی اور جو اپنے اوپر کسی کے ظلم کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے حیرت انگیز اخلاق کے ذریعہ اپنے جانشینوں کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے عرب کو سنبھالا تھا اور کوئی شخص نہ تھا جو اس طرح اسے سنبھال سکتا۔ آپ کے بعد ایسا کون سا انسان تھا جو رعیت کی خاطر اپنی خواہشوں کو قربان اور زندگی کی تکلیفیں برداشت کر سکتا۔ حضرت عمرؓ ایک مافوق البشر انسان تھے، جن کی مثال ان کے بعد اس دنیا میں ملنی ناممکن ہے۔

(۲۲)

واقعۂ شہادت

ماہِ ذوالحجہ ۲۳ھ کا واقعہ ہے ایک دن حضرت عمرؓ حسبِ معمول فجر کی نماز پڑھانے مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ آپ کے ہاتھ میں درہ تھا جو کبھی آپ سے علٰحدہ نہ ہوتا تھا۔ آپ صفوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔ پہلے صفیں سیدھی کرائیں۔ اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھی۔ یکایک مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابو لؤلؤ، جو نمازیوں میں شامل تھا، ایک دو دھاری خنجر لیے آگے بڑھا اور نہایت پھرتی سے آپ پر چھ وار کیے جن میں سے ایک ناف کے نیچے لگا۔ امیر المومنین اسی وقت زمین پر گر پڑے۔

یہ حملہ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں، لیکن کچھ دیر کے بعد لوگوں کو ہوش آیا اور بعض دلیر آدمی ابو لؤلؤ کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن اس نے دائیں بائیں خنجر چلانا شروع کر دیا جس سے تیرہ آدمی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ آخر ایک شخص نے آگے بڑھ کر پھرتی سے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا اور اسے قابو میں کر لیا۔ جب ابو لؤلؤ کو یقین ہو گیا کہ اب وہ بچ کر نہیں نکل سکتا تو اس نے اسی خنجر سے خودکشی کر لی۔

جب لوگ حضرت عمرؓ کی جانب بڑھے تو دیکھا کہ آپ کے خون سے تمام زمین سرخ ہو رہی ہے انھوں نے آپ کی مرہم پٹی کرنے کا ارادہ کیا لیکن آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا اور فرمایا:

"کیا تم میں عبدالرحمٰن بن عوف موجود ہیں؟"

عبدالرحمٰن لوگوں کو چیرتے آگے بڑھے اور کہا:

"امیر المومنین! میں حاضر ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"آگے جاؤ اور نماز پڑھاؤ۔"

چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مختصر سی نماز پڑھائی۔ لوگوں کی نظریں حضرت عمرؓ کی طرف تھیں انھوں نے دیکھا کہ آپ زمین پر ٹیک لگا کر نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں۔

جب نماز ختم ہوگئی تو لوگ آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر لے آئے۔ اس وقت تمام آنکھیں اشکبار تھیں اور سب کے دل خون ہو رہے تھے۔

مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابُو لؤلؤ فیروز نہاوند کا رہنے والا تھا، وہ ایک روز بازار میں امیرالمومنین سے ملا اور کہنے لگا:

"میرے آقا نے میری طاقت سے زیادہ مجھ پر محصول مقرر کر رکھا ہے آپ کم کرا دیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے پُوچھا،

"تمھارا محصول کیا ہے؟"

اس نے کہا:

"دو درہم روزانہ۔"

آپ نے پوچھا:

"تم کام کیا کرتے ہو؟"

اس نے کہا:

"نجاری، نقاشی، آہن گری۔"

امیرالمومنین نے کہا،

"تین پیشے تمھارے ہاتھ میں ہیں، اس حال میں بھی تم شکایت کرتے ہو۔ میرے خیال میں تو یہ رقم تمھارے پیشوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے۔"

باتوں باتوں میں امیرالمومنین نے ابولؤلؤ سے پُوچھا:

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم چکیاں بنانا جانتے ہو۔"

اس نے جواب دیا،

"جی ہاں!"

آپ نے فرمایا،

"تو مجھے ایک چکی بنا دو۔"

ابولؤلؤ نے جواب دیا:

"اگر میں زندہ رہا تو ایسی چکّی بنا کر دُوں گا جس کی شہرت مشرق و مغرب تک پھیل جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔ حضرت عمرؓ کی نگاہوں نے دُور تک اس کا تعاقب کیا اور آپ نے فرمایا:

"اُس غلام نے مجھے دھمکی دی ہے۔"

عبدالرحمن بن ابی بکرؓ بیان کرتے ہیں کہ حادثہ سے پہلے رات کو انھوں نے ہرمزان، جفینہ، نصرانی اور ابولولو کو آپس میں سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ ان لوگوں کی نظر جب آپ پر پڑی تو گھبرا گئے۔ اسی گھبراہٹ میں ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ایک خنجر چھوٹ کر زمین پر گر پڑا جس کی دو دھاریں تھیں۔ یہ خنجر بعینہٖ وہی خنجر تھا جس سے ابولولو نے امیرالمومنین پر حملہ کیا تھا۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں نے حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش کی تھی ورنہ رات کے اندھیرے میں عجمی ایرانی، عربی عیسائی اور مغیرہ کے غلام کو ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی حالانکہ ہرمزان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ ہرمزان ان ایرانی سپہ سالاروں میں سے تھا جنھیں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے شکست دی تھی۔ شکست سے قبل ہرمزان ایرانیوں اور عراق کے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھا۔ اس نے اسلام اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ اس کا قتل یقینی ہے اور بچاؤ کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اسلام لے آئے۔ اس نے بار بار مسلمانوں سے معاہدے کیے کہ وہ آئندہ ان سے جنگ نہیں کرے گا۔ لیکن ہر بار وہ ان معاہدوں کو پسِ پشت ڈال کر مسلمانوں کے مقابلے پر آتا رہا۔ ایسے لوگ عربوں سے اپنی عداوت کو نہیں چھپا سکتے تھے۔ نہ کبھی یہ بات ان کے ذہن سے محو ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں نے شاہانِ کسریٰ کی عظیم الشان سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا اور ایران کے دیار و امصار پر قابض ہو گئے۔

جفینہ عیسائی نجران کا رہنے والا تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اسے وہاں سے اس لیے لے آئے تھے کہ وہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایسے وقت میں، جبکہ وہ ایرانیوں اور رومیوں سے مصروفِ پیکار تھے، نجران کے عیسائیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال کر اور انھیں نقلِ مکانی کا معاوضہ دے کر شام اور عراق میں آباد کر دیا تھا، اس لیے آپ کو اندیشہ تھا کہ ایسے نازک موقع پر یہ عیسائی نقضِ عہد نہ کر بیٹھیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ہرقل کے لشکروں کو زبردست شکست دی ہرقل عیسائی تھا اس لیے عین ممکن ہے کہ جفینہ عیسائی بھی اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف کینہ لیے ہوئے ہو اور کچھ عجب نہیں کہ وہ ہرمزان کو اپنا حلیف پا کر اس کے ساتھ اس سازش میں شریک ہوا ہو۔

فیروز ایرانی تو قتل کے جرم کا مرتکب ہے ہی۔

ان تین اشخاص کے علاوہ ایک اور شخص بھی ہے جس کے متعلق ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ بھی اس سازش میں شریک تھا۔ اور وہ ہیں کعب الاحبار۔

کعب الاحبار قتل کے واقعہ سے تین روز پہلے امیرالمومنین کے پاس آئے اور آپ سے کہنے لگے:

"امیرالمومنین! آپ تین روز کے اندر اندر وفات پا جائیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے پوچھا:

"تمھیں کس طرح معلوم ہوا؟"

اُنھوں نے کہا:

"مجھے کتاب اللہ (توراۃ) سے پتا چلا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"اللہ! عمرؓ کے یہ نصیب کہاں کہ توراۃ میں اس کا ذکر ہو؟"

کعب نے کہا:

"یہ بات نہیں ہے لیکن آپ کی صفت اور آپ کے حلیہ کا اس میں ضرور ذکر ہے۔"

اگلے روز وہ پھر آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"امیر المومنین! آپ کی وفات میں صرف دو روز باقی ہیں۔"

تیسرے روز پھر آئے اور کہا:

"امیر المومنین! دو روز گزر چکے اب صرف ایک دن اور ایک رات باقی ہے۔ کل صبح آپ کی وفات یقینی ہے۔"

کعب ایک یہودی تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام کو روز بروز ترقی نصیب ہو رہی ہے اور کسی دین، کسی قوت میں اس کے مقابلہ کی تاب نہیں رہی تو انھوں نے اپنی ذکاوت سے اس حقیقت کو پا لیا کہ اب اسلام ہی کا دور دورہ ہونے والا ہے۔ وہ بلند روح، وہ زبردست بہادری اور وہ عظیم الشان قربانیاں، جو اس کے سپوت اس کی راہ میں دکھا رہے ہیں، ان کی بنا پر وہ ضرور تمام دنیا پر غالب آجائیں گے اور مشرق سے مغرب تک سارا عالم ان کے زیر نگین آجائے گا۔ یہ حالات دیکھ کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے اسلام قبول کرنے سے انھیں وہ عزت نصیب ہوگی جو ان کی اپنی قوم میں انھیں حاصل نہیں ہے۔

کعب ایک عالم آدمی تھے اور تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے۔ توراۃ کے اشعار ایسی ایسی پیچیدہ عبارتوں سے بھرے پڑے تھے جن کو کوئی عرب، خواہ وہ عبرانی ہی کیوں نہ پڑھا ہوا ہو، سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے کئی من گھڑت باتیں مسلمانوں کے درمیان پھیلا دیں اور ان کے دین اور عقیدہ کی پاکیزگی کو مکدر کر دیا۔

انھوں نے اوائل اسلام ہی میں ایک بلند اور ممتاز مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اکثر لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو تورات وہ پڑھتے ہیں اس میں سب چیزوں کا علم موجود ہے اور جو کچھ وہ انھیں بتاتے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ لوگوں کا ان کی نسبت یہ اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا جب انھوں نے تین روز پہلے حضرت عمرؓ کی وفات کی خبر دی اور وہ فی الواقعہ وقوع میں آ بھی گئی۔ بہت سے لوگ ان اسرائیلیات پر جو انھوں نے بیان کیں آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئے اور انھوں نے ان کو تاریخ اور احادیث و تفسیر کی کتابوں میں بھی داخل کر دیا۔ وہ خود بھی اس سے زیادہ ان کی حقیقت سے واقف نہ تھے کہ وہ خود ان کی بنائی ہوئی باتیں تھیں۔ وہ اپنے کلام کی سند تورات میں سے دیتے تھے لیکن تورات ان باتوں سے خالی تھی جو وہ لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ آج کل

تورات ہمارے سامنے ہے ہم اسے پڑھتے ہیں لیکن ان باتوں میں سے ایک بات بھی ہمیں اس میں نہیں ملتی جو کعب الاحبار نے زمانہ گزشتہ میں بیان کی تھیں۔

ان امور کی موجودگی میں ہمارے لیے یہ شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی اور کوئی آدمی اسے جھٹلا نہیں سکتا کہ کعب نے حضرت عمرؓ سے تین روز پہلے آپ کی وفات کا جو تذکرہ کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں اس تمام سکیم کا پتا تھا جو ابو لولؤ نے حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کے لیے تیار کی تھی۔ حضرت عمرؓ کو بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی قدر و منزلت مسلمانوں میں زیادہ ہو جائے اور وہ ان کی بیان کردہ روایات اور کہانیوں کو بے دھڑک قبول کر لیں۔

زخم کھانے کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ ان کا قاتل کون ہے؟

جب آپ کو پتا چلا کہ قاتل ابو لولؤ ہے تو آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور فرمایا کہ "الحمد للہ میرا قاتل اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہنے والا مسلمان نہیں ہے"۔

مزید اطمینان کے لیے آپ نے ایک صحابی کو پوچھ گچھ کرنے بھیجا۔ وہ مہاجرین اور انصار سے جا کر پوچھتے تھے کہ کہیں قاتل ان میں سے تو نہیں؟ وہ روتے ہوئے نفی میں جواب دیتے۔ یہ ہو بھی کس طرح سکتا تھا کہ کوئی مسلمان حضرت عمرؓ بن الخطاب پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کر سکتا۔ آپ ہی نے اسلام کو عزت بخشی، آپ ہی کے عہد میں فتوحات پر فتوحات ہوئیں۔ جن کے ذریعہ اسلام کا بول بالا ہوا۔ آپ ہی کے لشکروں نے قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتوں کو روند ڈالا اور ہر جگہ اسلام ہی کا طوطی بولنے لگا۔

جب لوگ آپ کو مسجد سے اٹھا کر گھر لائے تو طبیب آیا۔ پہلے اس نے کھجوروں کا پانی آپ کو پلایا[1]۔ لیکن وہ زخم کے راستے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد دودھ پلایا وہ بھی سارے کا سارا باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کو یقین آ گیا کہ اب ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔

اس یقین کے بعد آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلا بھیجا کہ وہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مزاروں کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت دے دیں۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

---

[1] بعض لوگ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو کھجوروں کی شراب پلائی گئی تھی۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ عربوں میں دستور تھا کہ وہ رات کو پانی میں کھجوریں ڈال دیتے تھے۔ صبح تک وہ پانی میٹھا ہو جاتا تھا اور وہ اسے استعمال کر لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو بھی یہی پانی پلایا گیا تھا۔ (مترجم)

"یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی لیکن میں اسے عمرؓ کے لیے قربان کرتی ہوں۔"

حضرت عمرؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئے لیکن اپنے بیٹے عبداللہؓ کو بلا کر فرمایا:

"میں نے حضرت عائشہؓ سے کہلا بھیجا تھا کہ وہ مجھے اپنے دوستوں کے پاس دفن کرنے کی اجازت دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے اجازت دے دی ہے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں انھوں نے خلافت کے اثر یا تکلف سے اجازت نہ دے دی ہو۔ اس لیے جب میں مر جاؤں تو مجھے غسل اور کفن دے کر میرا جنازہ ان کے دروازہ پر لے جانا اور کہنا:

"عمرؓ اجازت چاہتا ہے کہ اسے آپ کے حجرہ میں اس کے دو محترم رفیقوں کے برابر دفن کیا جائے۔"

اگر وہ اجازت دے دیں تو مجھے وہاں دفن کر دینا ورنہ جنت البقیع لے جانا۔"

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ والد کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بعد ہم ان کا جنازہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے قریب لے گئے اور ان سے اجازت طلب کی۔ انھوں نے خوشی سے اجازت دے دی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو بہ پہلو دفن کیے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں کے برابر دفن کیے گئے تھے اور حضرت عمرؓ آپ کے پہلو کے متوازی۔

حضرت عمرؓ کی وفات ترسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ آپ کو ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ بروز بدھ خنجر مارا گیا اور محرم کی پہلی تاریخ کو بروز اتوار دفن کیا گیا۔ آپ کی کل مدت خلافت دس سال پانچ مہینے اور اکیس دن ہے۔

آپ کو تین بار پانی اور بیری کے پتوں سے نہلایا گیا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ انھیں مشک سے نہ نہلایا جائے، نماز جنازہ مسجد نبویؐ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اور منبر کے درمیان ادا کی گئی۔

نماز جنازہ کے وقت حضرت عبداللہؓ بن سلام حاضر نہیں تھے، وہ اس وقت پہنچے جب نماز ختم ہو چکی تھی، انھوں نے لوگوں سے کہا:

"تم نے میرے آنے سے پہلے نماز پڑھ لی ہے لیکن تم عمرؓ کی تعریف کرنے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا سکو گے۔"

یہ کہہ کر آپ نے کہا:

"اے عمرؓ! تم بہترین اسلامی بھائی تھے۔ حق کے بارہ میں بے حد سخی اور باطل کے بارہ میں بے حد بخیل تھے۔ رضا کے موقع پر راضی ہوتے تھے اور ناراضی کے موقع پر ناراض۔ تمھاری آنکھ عفیف تھی، تمھارا ظرف بہت اعلیٰ تھا۔ نہ تم کسی کے مداح تھے اور نہ عیب گو۔"

حضرت علیؓ آپ کے جنازہ پر آئے اور فرمایا:

"دنیا میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ شخص تھا جو اس کپڑے میں لپٹا ہوا ہے۔[1]"

---

[1] یہ روایت محمد بن سعد نے اپنی طبقات میں مختلف اسناد سے الفاظ کے بہت تھوڑے اختلاف کے ساتھ تیرہ مرتبہ بیان کی ہے۔

اُمّ ایمنؓ نے آپ کی وفات کے موقعہ پر روتے ہوئے کہا :

"اب اسلام کمزور ہوگیا ۔"

زید بن وہب روایت کرتے ہیں کہ ہم عبداللہؓ بن مسعود کے پاس آئے ۔ حضرت عمرؓ کا ذکر چل پڑا جس پر وہ رو پڑے اور اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور آپ نے کہا :

"عمرؓ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے جس میں لوگ داخل تو ہوجاتے تھے لیکن نکلتے نہیں تھے ۔ لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو قلعہ کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی اور لوگ اسلام سے نکلنے لگے ۔"

سعیدؓ بن زید نے حضرت عمرؓ کی وفات کے دن روتے ہوئے فرمایا :

"آج میں اسلام پر روتا ہوں ۔ عمرؓ کی موت نے اسلام کی عمارت میں ایک ایسی دراڑ ڈال دی ہے جو قیامت تک نہیں بھری جاسکتی ۔"

حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے حضرت عمرؓ کے بارہ میں فرمایا :

"عمرؓ کی وفات سے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے ۔"

لوگوں نے پوچھا :

"کس طرح ؟"

انھوں نے کہا :

"اگر تم زندہ رہے تو میری بات کی صداقت کا تمہیں یقین ہوجائے گا ۔ عمرؓ کے بعد اگر کسی شخص کو والی بنایا گیا اور اس نے اسی شدت سے کام لیا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ کا خاصہ تھا تو لوگ اس کی اطاعت نہیں کریں گے لیکن اگر اس نے کمزوری اختیار کی تو اسے قتل کر ڈالیں گے ۔"

حضرت حذیفہ کہتے ہیں :

"اسلام حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک آنے والے آدمی کی طرح تھا جو برابر قریب ہوتا جائے لیکن آپ کو شہید کر دینے کے بعد اس کی مثال اس پیچھے ہٹنے والے آدمی کی سی ہوجائے گی جو برابر دُور ہوتا جائے ۔"

ایک شاعر آپ کا مرثیہ لکھتے ہوئے کہتا ہے :

"خدا تعالیٰ جزائے خیر دے اس شخص کو جو امیر المومنین ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ برکت ڈالے اس جسم میں جو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے ۔ اگر کوئی شخص شتر مرغ کے پروں پر سوار ہو کر بھی یہ کوشش کرے کہ ان اعمال کو پہنچ سکے جو تو نے کیے تھے تو وہ اپنے مقصد میں سراسر ناکام ہوگا ۔"

یہ کہنے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ کوئی امام آج تک ایسا نہیں گزرا جس پر خدا تعالیٰ نے اتنی برکت نازل کی ہو جتنی حضرت

عمرؓ پر نازل کی۔ تمام خلفا اور عادل بادشاہ مل کر بھی وہ کام نہ کر سکے جو حضرت عمرؓ نے اکیلے کیا آپ کا نام آج تک عدل و انصاف، جرأت اور حق پرستی میں ضرب المثل بنا ہوا ہے۔ آپ کے زمانے میں آپ کی ہیبت سے عرب اور عجم کانپتا تھا اور چار دانگ عالم میں آپ کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ آنے والے زمانے میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا نام تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا ہے جو قیامت تک زندہ رہے گا ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(۲۳)

اسلامی جمہوریت

حضرت عمرؓ اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے تھے۔ مہاجرین اور انصار جوق در جوق آپ کے پاس آ رہے تھے۔ ہر شخص غمگین اور مضطرب تھا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو نہ بہا رہی ہو۔ امیر المومنین نے اپنے بیٹے عبداللہؓ بن عمرؓ سے پوچھا:

"مجھ پر کتنا قرضہ واجب ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا:

"چھیاسی ہزار درہم۔"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"عبداللہ! اگر میری جائداد سے یہ قرضہ ادا ہو سکے تو بہت بہتر ورنہ بنی عدی بن کعب سے درخواست کرنا کہ وہ اس قرضہ کو اتار دیں، اگر وہ بھی اس قرض کو ادا نہ کر سکیں تو قریش سے درخواست کرنا لیکن ان کے علاوہ اور کسی سے درخواست نہ کرنا[1]۔"

صحابہؓ کی ایک جماعت نے آپ سے درخواست کی کہ آپ اپنے بعد کسی خلیفہ کو نامزد فرما دیں۔ آپ نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام لیے اور فرمایا کہ "میں ان لوگوں سے زیادہ اور کسی کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک خوش رہے۔ پس جسے ان میں سے خلیفہ چن لیا جائے وہی میرے بعد خلیفہ ہوگا۔"

---

[1] یہ قرضہ حضرت عمرؓ کا ایک مکان بیچ کر ادا کیا گیا، جسے حضرت معاویہؓ نے خریدا تھا۔ (خلاصۃ الوفا فی اخبار دار المصطفٰے مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۲۹، ۱۷۹) (مترجم)

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد میں ہونے والے خلیفہ کے لیے مندرجہ ذیل وصیت کی:

"میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے، مہاجرین اوّلین کے حقوق کی حفاظت کرے۔ مفتوحہ شہروں میں جا کر بسنے والے عربوں سے اچھا سلوک کرے، دشمنوں سے سختی کے ساتھ مقابلہ کرے، انصار کے حقوق کا خاص لحاظ رکھے۔ کیونکہ یہ لوگ وُہ ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھہرایا۔ انصار تمہارے محسن ہیں ان کے ساتھ احسان کرنا چاہیے اور ان کی خطاؤں سے حتی الامکان درگزر اور چشم پوشی کرنی چاہیے۔ خلیفہ کو اعراب کا بھی بہت پاس کرنا چاہیے کیونکہ یہی لوگ عربوں کی اصل اور مادۂ اسلام ہیں۔ ان کے امیروں سے زکوٰۃ کا مال لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اسی طرح ذمیوں کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کو ملحوظ رکھا جائے۔ ان سے جو وعدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دی جائے۔ ان کے دشمنوں کو ان سے دُور کیا جائے۔"

ایک روایت آتی ہے کہ سعید بن زید نے حضرت عمرؓ سے کہا:

"اگر آپ خلافت کے لیے کسی آدمی کو نامزد فرما دیں تو بہت ہی اچھا ہو۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"میں نے اپنے ساتھیوں میں حرص کا مادہ دیکھا ہے، میں اس معاملہ کو ان چھ آدمیوں پر چھوڑے جاتا ہوں جو یہ فیصلہ کر لیں اُمتِ محمدیہ کو وہ منظور رہنا چاہیے۔"

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

"اگر ان دو آدمیوں میں سے کوئی آدمی بھی زندہ ہوتا تو میں خلافت اس کے سپرد کر دیتا، ایک ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم اور دوسرے ابو عبیدہؓ عامر بن الجراح۔"

کیونکہ ایک مرتبہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اہلِ یمن آئے اور انھوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ کسی ایسے شخص کو ان کے ساتھ کر دیں جو انھیں سُنّتِ نبوی اور اسلام سکھائے۔ تو آپ نے ابو عبیدہ بن الجراح کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

"یہ اُمت کا امین ہے میں اسے تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ہر شخص اپنی خواہش بیان کرے۔ ہر شخص نے کوئی نہ کوئی خواہش بیان کی لیکن حضرت عمرؓ نے کہا:

"میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک گھر ہو جو ابو عبیدہؓ جیسے لوگوں سے بھرا ہوا ہو۔"

بعض صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کو، جبکہ آپ زخم خوردگی کی حالت میں گھر میں پڑے ہوئے تھے، یہ کہتے سنا کہ اگر ابو عبیدہؓ

بن الجراح زندہ ہوتے تو میں کسی سے مشورہ نہ کرتا بلکہ انھیں خلیفہ بنا دیتا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا تو میں کہہ دیتا:

"میں نے اللہ تعالیٰ کے امین اور رسول اللہؐ کے امین کو خلیفہ بنایا ہے۔"

حضرت ابو عبیدہؓ کی وفات حضرت عمرؓ کے عہد ہی میں ۱۸ھ کی طاعون عمواس میں ہوئی تھی۔ آپ اس وقت شام اور فلسطین میں اسلامی لشکروں کے سپہ سالار تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابو عبیدہؓ کو خبر ملی کہ فلاں شخص نے ان کے خاندان کے ساتھ کچھ احسان کیا ہے، تو آپ نے فرمایا:

"کاش! میں ایک بھیڑ ہوتا۔ میرے اہل و عیال مجھے ذبح کرتے، میرا گوشت کھاتے اور میرا شوربا پیتے۔"

جب آپ شام میں سپہ سالار تھے تو ایک دن کھڑے ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے لوگو! میں قریش کا ایک فرد ہوں لیکن اگر تم میں سے کوئی شخص خواہ وہ سرخ ہو یا سیاہ تقویٰ میں مجھ سے بڑھ جائے تو میری یہ خواہش ہے کہ میں اس کی جلد میں سما جاؤں۔"

سالمؓ جو ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے، معروف النسب نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کے درمیان مواخاۃ کا رشتہ قائم کرا دیا تھا۔

یہ تمام بحث درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی پیدا نہیں ہوئی جس میں جمہوریت اس حد تک پہنچ گئی ہو جس حد تک اسلام میں پہنچی ہے اور اس کی روشن مثال یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کے متعلق خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لوکان نبی بعدی لکان عمر۔"

مسلمانوں کی خلافت کو ایک ایسے عجمی غلام کے سپرد کرنے کو تیار تھے جس کا اصلی نسب غیر معروف ہو۔ یعنی سالمؓ۔ ادھر امین الامۃ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح فرماتے ہیں کہ وہ قریشی ہیں۔ لیکن وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ اگر کوئی حبشی تقویٰ اور طہارت میں ان سے بڑھا ہوا ہو تو وہ اس کی جلد میں سما جائیں۔

اسلام میں اصل چیز تقویٰ اور عمل صالح ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم بھی فرماتا ہے،

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔

تقویٰ و طہارت اور اعمال صالحہ کے سامنے حسب و نسب، دولت مندی اور عزت و وجاہت کوئی چیز نہیں۔ اس بارہ میں حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ قیامت تک مومنوں کی ہدایت کے لیے کام دیتا رہے گا۔ آپ فرماتے ہیں:

"اگر قیامت کے دن عجمی اعمال صالحہ سے مالامال ہو کر آئے اور عرب بغیر اعمال کے آئے تو خدا کی قسم وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ہم سے زیادہ مستحق ہوں گے۔ اس لیے کوئی آدمی اپنے حسب و نسب کی طرف نہ دیکھے بلکہ اعمال صالحہ پر زور دے، جس کے اعمال میں کمی ہوگی اس کا حسب و نسب اس کے کسی کام نہ آئے گا۔"

حضرت عمرؓ نے ان چھ آدمیوں کو بلایا جن کے متعلق آپ نے وصیت کر دی تھی کہ انھی میں سے خلیفہ بنایا جائے لیکن بات صرف حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کی۔ حضرت علیؓ سے فرمایا:

"اے علیؓ! شاید قوم تمھیں تمہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت، دامادی کے رشتہ اور تمھارے علم و فضل کی وجہ سے جانتی ہے۔ اگر تمھیں خلافت مل جائے تو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر ہر کام کرنا اور بنی ہاشم کو لوگوں کے سروں پر مسلط نہ کر دینا۔"

حضرت عثمانؓ سے یہ فرمایا:

"اگر تمہیں خلافت مل جائے تو بنی ابی معیط کو لوگوں کے سروں پر مسلط نہ کر دینا۔"

اس کے بعد فرمایا:

"اب اُٹھ کھڑے ہو اور آپس میں مشورہ کر کے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لو۔"

پھر حضرت ابو طلحہؓ انصاری کو بلایا اور فرمایا:

"اے ابو طلحہؓ! اپنے ساتھ انصار کے ۵۰ آدمی لے کر ان آدمیوں کے ساتھ رہو۔ جس گھر میں یہ خلافت کے بارے میں مشورہ کریں اس گھر کے دروازہ پر اپنے آدمیوں کو لے کر کھڑے رہو اور جب تک یہ مشورے سے فارغ نہ ہو جائیں کسی کو ان کے پاس نہ جانے دو۔ تین روز تک جب تک کہ یہ خلیفہ منتخب نہ کر لیں ان کے پاس سے نہ ہٹنا۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ صہیب لوگوں کو تین روز تک نماز پڑھائیں۔ اگر کسی شخص پر اکثریت متفق ہو جائے اور کوئی اور اس کی مخالفت کرے تو اس کی گردن مار دی جائے۔[1]

---

[1] شوریٰ کا مفصل واقعہ ہم نے اپنی کتاب "عثمانؓ بن عفان" میں بیان کیا ہے۔

عربی ماخذ

نام کتاب	مؤلف	نام کتاب	مؤلف
فتوح الشام	واقدی	الاستیعاب	ابنِ عبدالبر
السیرۃ النبویہ	ابنِ ہشام	تاریخ دمشق	ابنِ عساکر
الطبقات الکبریٰ	ابنِ سعید	معجم البلدان	یاقوت حموی
الامامۃ والسیاسۃ	ابنِ قتیبہ	الکامل	ابن الاثیر
المعارف	"	اسد الغابہ	"
فتوح البلدان	بلاذری	الکامل	مبرد
انساب الاشراف	"	المختصر فی اخبار البشر	ابو الفدأ
تاریخ الیعقوبی	احمد بن یعقوب	الاصابہ فی تمیز الصحابہ	ابنِ حجر عسقلانی
تاریخ الامم والملوک	طبری	صحیح البخاری	حضرت امام بخاریؒ
العقد الفرید للملک السعید	قرطبی	تاریخ الخمیس	دیار بکری
الاغانی	اصفہانی	شرح نہج البلاغہ	ابن ابی الحدید
تاریخ ابنِ خلدون	ابنِ خلدون	عمرو بن العاص	حسن ابراہیم حسن
انساب القرشیین	مقدسی	فتوح مصر واعمالہا	ابنِ اسحاق
وفیات الاعیان	ابنِ خلکان	الاموال	ابنِ سلام
الفخری	ابن طباطبا	کتاب الخراج	حضرت امام ابو یوسف
فتوح مصر	ابن عبدالحکم	کتاب الخراج	یحییٰ بن آدم
العقد الفرید	ابنِ عبدربہ	فتح العرب للشام	حداد
مختصر تاریخ الدول	ابن العبری	الاخبار الطوال	دینوری

المواعظ والاعتبار	مقریزی	تاریخ التشریع الاسلامی	خضری
مروج الذہب	مسعودی	فجر الاسلام	احمد امین
الخلفاء الراشدون	عبدالوہاب نجار	حاضر العالم الاسلامی	حواشی امیر شکیب
تاریخ الامم الاسلامیہ	محمد خضری	خطط الشام	محمد کرد علی
التمدن الاسلامی	"	الادارۃ الاسلامیہ فی عز العرب	"

انگریزی ماخذ

مختصر تاریخ العرب	سید امیر علی	عروج وزوالِ سلطنتِ روما	گبن
فتح مصر	الفرڈ بٹلر	تاریخ عام	ولز
تاریخ ایران	نجبین	مختلف مقالات	گب
تاریخ شہنشاہیت بزنطینیہ	اومان	"	مارگولیوس
تاریخ عرب	جیلمان	انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا	
خلافت	سر ولیم میور	تاریخ التواریخ	مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی
مذکرۃ دی غوبی	دی غوبی	"	"

فرانسیسی ماخذ

الثلاثہ	لامنس	رسائل اور مختلف مقالات	ہارٹمن
تاریخ شام	"	" "	فان کریمر
تاریخ عرب	ہوار	" "	سبرنگر
الاسلام	ماسیہ	" "	سترک ہرونیہ
تمدنِ عرب	گستاف لیبان	" "	غروسیہ
حیاتِ محمدؐ	درمنغہام	" "	ڈوزی
اسلامی عقیدہ اور اس کی شریعت	گولڈسیر	" "	وینہ
الاسلام	مونتہ	انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	
اولیاتِ اسلام	پرنس کیتانی	دائرۃ المعارف الافرنسیہ	
رسائل اور مختلف مقالات	نولڈیکی	"	"

رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ



حضرت عُثمان غنی رضی اللہ عنہ

سیرتِ عثمانؓ بن عفّان

پیش لفظ

حضرت عثمانؓ کا عہد تاریخِ اسلام میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کے زمانہ میں بعض فتنہ پردازوں کی وجہ سے فتنہ و فساد کا جو دروازہ کھلا وہ ساڑھے تیرہ سو برس گزرنے کے بعد بھی بند نہیں ہو سکا اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلاف کی جو خلیج حائل ہوئی وہ نہ صرف یہ کہ اب تک پاٹی نہیں جا سکی بلکہ اس کی وسعت اور اس کی گہرائی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

اس فتنہ کے اسباب کیا تھے؟ اس کے بھڑکانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ اس کے پیدا ہونے میں حضرت عثمانؓ کس حد تک ذمہ دار تھے؟ اکابر صحابہؓ اور عامۃ المسلمین کا اس موقع پر کیا رویّہ تھا؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو ساڑھے تیرہ سو سال سے لوگوں کے دلوں میں مسلسل پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اکثر مورخین نے اپنے قلم سے اس عقدہ کو کھولنے کی کوشش کی ہے مگر بہت کم اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جس کا ترجمہ قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے مولفِ کتاب ہٰذا "عمر ابو النصر" نے اس کتاب میں ان تمام آراء کو ترجیح کر دیا ہے جو اس فتنہ کے متعلق مورخین نے وقتاً فوقتاً قائم کی ہیں اور اس میں ان کو انتہائی کاوش اٹھانی پڑی ہے۔ لیکن اپنی طرف سے ان پر کوئی محاکمہ نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہے تو وہ ایسا پیچیدہ ہے کہ قارئین کرام اس سے کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ اور اس طرح ان کو ایک ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہونا پڑتا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ مؤرخین قدیم و جدید کے بیان کردہ واقعات اور ان کی آراء کو درج کرنے کے بعد اس عہد کے مذہبی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر اس دور پر اپنی طرف سے ایک تبصرہ کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ مورخین نے واقعات بیان کرنے اور رائیں قائم کرنے میں کہاں تک صحیح راستہ اختیار کیا ہے اور کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

اسی امر کو مدِ نظر رکھ کر میں چاہتا ہوں کہ بعض ضروری اور اہم امور کو پہلے ہی بیان کر دوں تاکہ جب ناظرین ان مقامات پر پہنچیں تو ان کو کسی قسم کی اُلجھن نہ ہو وہ امور یہ ہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف جو الزامات لگائے جاتے ہیں وہ قطعاً بے بنیاد ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

۲۔ کبار صحابہؓ پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے مخالف تھے اور انھوں نے فتنہ کے فرو کرنے میں حضرت

عثمانؓ کی کوئی مدد نہیں کی۔ یہ واقعات کے صریح خلاف ہے اور صحابہؓ کے مقدس اور پاکباز گروہ پر ایک بہتانِ عظیم ہے۔

دراصل یہی دو امور ہیں جن پر غور نہ کرنے کی وجہ سے مورخین نے فتنہ کے اسباب و علل تلاش کرنے میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں اور وہ معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے ورنہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہ تھا جس کو محض اپنے خیالات کی غلطی کی وجہ سے پیچیدہ سمجھ لیا گیا۔

ان امور کو زیرِ بحث لانے سے پہلے اس اصل کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ خلافتِ راشدہ کوئی دنیاوی حکومت نہ تھی۔ بلکہ ایک دینی نظام تھا اور قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق قائم کیا گیا تھا اور اس کے خلفاء کسی دنیاوی حکومت کے بادشاہ نہیں تھے بلکہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے معلم اور خادم تھے وہ جو کچھ کرتے تھے اپنی خواہش سے نہیں کرتے تھے بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول کی ہدایات کے مطابق کرتے تھے اور ان پر بدگمانی کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔

اسی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں خلفا کے متعلق اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور تمام دوسرے انسانوں کی طرح وہ ان کو بھی گناہ گار اور غلط کار سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ واقعۃً ایسا نہیں ہے۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف ان کے مخالفین ایک بہت بڑی فہرست الزامات کی بیان کرتے ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء، محققین و مورخین ان کو صحیح سمجھے بیٹھے ہیں مگر بادنیٰ تفکر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ ان الزامات سے قطعاً بری ہیں۔

آپ پر جس قدر اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سے مشہور مشہور الزامات یہ ہیں؛

۱۔ سب سے پہلا الزام آپ پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے کبار صحابہؓ کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس الزام کو درست مان لیا جائے تو پھر کون ہے جو اس سے بچا ہوا ہے؟ کیا حضرت عمرؓ پر، جن کی فراست، دور اندیشی اور عدل و انصاف دنیا بھر میں ضرب المثل ہے، یہ الزام عائد نہیں ہوتا؟ آپ نے حضرت خالدؓ بن ولید (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سیف اللہ" کا خطاب دیا تھا) حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کو معزول کر دیا تھا۔ پھر کیا یہ الزام حضرت علیؓ پر عائد نہیں ہوتا جنھوں نے خلافت سنبھالتے ہی حضرت عثمانؓ کے تمام عمّال کو معزول کر دیا؟ ان معزول شدہ عمال میں طرابلس، آرمینیہ اور قبرص کے عامل بھی شامل تھے۔

حضرت عثمانؓ نے جن لوگوں کو معزول کیا وہ مندرجہ ذیل تھے؛

۱۔ حضرت عمروؓ بن العاص فاتح مصر
۲۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص گورنر کوفہ
۳۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ والیِ بصرہ
۴۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ

۵۔ حضرت عبداللہ بن ارقم مہتمم بیت المال

۱۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو اس بنا پر معزول کیا گیا کہ آپ نے اسکندریہ کی بغاوت فرو کرنے میں ذمیوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا تھا۔ ان کو لونڈی غلام بنا لیا تھا نیز نئی نہروں کے جاری ہونے کے باوجود وہ مصر کے مالیات میں اضافہ نہ کر سکے۔ لیکن عبداللہ بن ابی سرح کے تقرر کے بعد مالیہ بہت زیادہ آنا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ سعدؓ بن ابی وقاص گورنر کوفہ نے بیت المال سے ایک بہت بڑی رقم قرض لی۔ لیکن اس کو وقت پر ادا نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے عبداللہ بن مسعود مہتمم بیت المال سے جھگڑا بھی ہوا۔

۳۔ ابوموسیٰ اشعریؓ والی بصرہ کی معزولی کی وجہ یہ تھی کہ آپ رعایا کو خوش نہ رکھ سکے اور وہاں کے لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ابوموسیٰ کی معزولی کا مطالبہ کیا۔

۴۔ مغیرہؓ بن شعبہ پر رشوت ستانی کا الزام لگایا گیا۔ اگرچہ یہ سراسر بہتان تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی جگہ سعدؓ بن ابی وقاص کے تقرر کی وصیت کی تھی اس لیے ان کو معزول کر دیا گیا۔

۵۔ عبداللہ بن ارقم مہتمم بیت المال کی معزولی کی وجہ ان کا بڑھاپا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان کی معزولی کے وقت جلسۂ عام میں ایک بیان دیا تھا جو یہ ہے:

الا ان عبد اللہ بن ارقم لم یزل علیٰ جرائکم زمن ابی بکر و عمر الی الیوم و انہ کبر وضعف وقد ولینا عملہ زید بن ثابت۔

یعنی عبداللہ بن ارقم ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ سے اس وقت تک آپ کے تقسیم وظائف کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن اب وہ بوڑھے اور ضعیف ہو گئے ہیں اس لیے اس خدمت کو زیدؓ بن ثابت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ عمال اور دوسرے عہدیداروں کی معزولی کے جو وجوہ اوپر لکھے گئے ہیں ان پر کسی شخص کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ان امور کی موجودگی میں یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے محض ذاتی عناد کی وجہ سے ان بزرگوں کو معزول کر دیا۔

۲۔ دوسرا الزام آپ پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے نااہل اور ناتجربہ کار لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا اور آپ کے مقرر کردہ عمال بے راہ رو ہوتے تو جب تفتیش احوال کے لیے حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے لوگوں کو اپنی قلمرو کے ہر حصہ میں بھیجا تھا تو وہ لوگ ہرگز یہ رپورٹیں نہ لاتے کہ تمام عمال بہت اچھی طرح کام کر رہے ہیں۔ ان سے رعایا کے کسی فرد کو شکایت نہیں ہے اور انھوں نے عدل و انصاف کو ملک میں پورے طور پر کر رکھا ہے۔ اگر وہ نااہل اور ناتجربہ کار ہوتے تو رعایا کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے خلاف ہو جاتا اور شورش برپا کر دیتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے چند فتنہ پردازوں کے جنھوں نے محض اپنی ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لیے عمال کے خلاف شور و غوغا بلند کیا تھا، باقی رعایا اس فتنہ سے بالکل علیحدہ رہی۔

بے شک ولید بن عقبہ، سعید بن العاص، عبداللہ بن ابی سرح اور عبداللہ بن عامر اس بلند پایہ حیثیت کے مالک

نہیں تھے جو صحابہ کرامؓ کو حاصل تھی۔ لیکن ان کے انتظامی کارنامے اور بڑی بڑی فتوحات جو عہدِ عثمانی میں انھوں نے کیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ انہی لوگوں کی ہمت، دلیری اور جرأت سے طبرستان، آرمینیہ، طرابلس، قبرص، ہرات، سجستان اور نیشا پور اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے اور اسلامی سلطنت وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ کیا یہ ساری فتوحات نا اہل اور ناتجربہ کار اہلکاروں کے ہاتھوں سے انجام پاتی رہیں؟

۳۔ تیسرا الزام حضرت عثمانؓ پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیے۔

اس الزام کا جواب خود حضرت عثمانؓ نے ایک مجمع میں دیا تھا جس میں بعض صحابہ کرام بھی موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ میں اپنے خاندان کے لوگوں کو کلیدی عہدے دینے میں دُوسرے لوگوں پر ترجیح دیتا ہوں مگر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو باقی اہلِ عرب پر ترجیح نہیں دیتے تھے؟ اور کیا قریش میں سے بنو ہاشم کا سب سے زیادہ خیال نہیں رکھتے تھے؟ کیا حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بعض جلد باز نوجوان انصاریوں نے ایک جنگ کے موقع پر یہی اعتراض نہیں کیا تھا کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے لیکن اموالِ غنیمت مہاجرین (یعنی قریش) سمیٹ کر لے گئے ہیں۔"

درحقیقت ایسے اعتراضات سے خود معترضین کے دلوں پر زنگ لگ جاتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو حضرت عثمانؓ نے اہم عہدوں پر مقرر کیا وہ درحقیقت ان ذمہ داریوں کو پُورا کرنے کے اہل بھی تھے یا نہیں؟ اگر وہ لوگ اہل تھے اور اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھاتے تھے تب یہ اعتراض سراسر باطل ہو جاتا ہے کہ آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دیے۔ واقعہ یہی ہے کہ آپ نے جن لوگوں کو کلیدی آسامیوں پر مقرر کیا وہ بالعموم امورِ مملکت کو سرانجام دینے کے پُورے اہل تھے جبھی یہ بات تھی کہ گیارہ برس کی طویل مدت میں سلطنت کے کاموں میں کسی طرح کا ضعف نہیں آیا اور ہر کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتا رہا، فتوحات بھی ہوتی رہیں اور ملکی انتظام میں بھی کسی قسم کی خرابی واقع نہیں ہوئی۔ اور یہ صورت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک عمال، حاکم اور کارکن لائق، قابل اور فرض شناس نہ ہوں۔

۴۔ چوتھا الزام حضرت عثمانؓ پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے بیت المال میں بے جا تصرف کیا اور اس میں سے اپنے عزیز و اقارب کو کثرت سے دولت عطا کی۔

اس اعتراض کے ثبوت میں جن واقعات کو پیش کیا جاتا ہے وہ یا تو ازسرتاپا غلط ہیں یا رنگ آمیزی کر کے ان کی صورت بدل دی گئی ہے۔

حضرت عثمانؓ ذاتی طور پر نہایت مالدار شخص تھے۔ تجارت سے آپ کو لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی تھی آپ نے ایک کثیر رقم خرچ کر کے مسجد نبوی کی توسیع کی۔ لاکھوں روپے سے جیش عسرت کو آراستہ کیا۔ ہزار ہا روپیہ دے کر بئرِ رومہ کو ایک یہودی سے خریدا اور اس کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ ایسا شخص جو خدا کی راہ میں لاکھوں روپے صرف کرنے سے بھی

دریغ نہ کرے، اپنے مال میں سے اپنے عزیز و اقارب کو کچھ نہیں دے سکتا تھا؟

حضرت عثمانؓ کے سامنے بھی معترضین نے یہی اعتراض پیش کیا تھا جس کا جواب حضرت عثمانؓ نے ایک تقریر میں دیا تھا۔ آپ کی یہ تقریر طبری میں درج ہے ہم اس کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس کے پڑھنے سے واضح ہو جائے گا کہ اس اعتراض کی کیا حقیقت ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے محبت رکھتا ہوں اور ان کے ساتھ فیاضی کرتا ہوں لیکن میری محبت نے مجھے ظلم کی طرف مائل نہیں کیا بلکہ میں صرف ان کے واجبی حقوق ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح میری فیاضی بھی اپنے ہی مال تک محدود ہے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی دوسرے کے لیے۔ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں بھی اپنے مال سے عزیزوں کو گراں قدر عطیے دیا کرتا تھا اور اب جبکہ میں اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا ہوں اور میں نے اپنا تمام سرمایہ اپنے اہل و عیال کے سپرد کر دیا ہے تو مفسد ایسی باتیں مشہور کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی ایسا بار نہیں ڈالا کہ اس قسم کا الزام دینا جائز ہو جو کچھ وصول ہوا وہ انہی لوگوں کی بہتری اور ترقی پہ صرف ہوا۔ میرے پاس خمس آتا ہے اور اس میں سے بھی میرے لیے کچھ لینا جائز نہیں۔ خدا کے مال میں ایک پیسہ کا بھی تصرف نہیں کیا جاتا۔ میں اس میں سے کچھ نہیں لیتا، یہاں تک کہ کھانا بھی ہوں تو اپنے ہی مال سے۔"

اس کے بعد ہم ان واقعات کو لیتے ہیں جن کی بنا پر "طبری" نے حضرت عثمانؓ پر بیت المال کے بے جا اسراف اور اس کے روپے میں سے اپنے عزیزوں کو گراں قدر عطیے دینے کا الزام لگایا ہے۔

۱۔ حکم بن العاص کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف جلا وطن کر دیا تھا، مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور بیت المال میں سے اس کو ایک لاکھ درہم عطا کیے اور اس کے لڑکے حارث کو حکم دے دیا کہ بازار میں جو فروخت ہو اس کی قیمت سے اپنے لیے عشر وصول کر لے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حکم بن العاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف جلا وطن کر دیا تھا۔ لیکن اخیر عہد میں حضرت عثمانؓ کی سفارش سے واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ صاحب اصابہ اور اسد الغابہ دونوں نے حکم کے حالات میں اس اجازت کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجازت کا علم نہیں تھا اس لیے ان دونوں نے اس کو واپس آنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کو اس کا علم تھا اس لیے آپ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں حکم کو واپس بلا لیا اور ان کے لڑکے مروان سے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح کر دیا اور صلۂ رحم کے طور پر اپنے پاس سے ایک لاکھ درہم عطا فرمائے نیز لڑکی کو جہیز میں ایک لاکھ درہم کا عطیہ مرحمت فرمایا۔

حارث بن حکم کو مدینہ کے بازار سے عشر وصول کرنے کا اختیار دینا بالکل بے بنیاد ہے۔

۲۔ مروان کو طرابلس الغرب کے مالِ غنیمت کا خمس دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ پر یہ بھی ایک بہتان ہے ۔ تاریخ ابنِ خلدون میں لکھا ہے :

"ابن زبیر نے فتح کی خوشخبری اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ دار الخلافہ روانہ کیا جس کو پانچ لاکھ دینار پر مروان نے خرید لیا ۔"[1]

ظاہر ہے کہ کسی شخص کو عطیہ دینے اور اس کے ہاتھ فروخت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

۳۔ بیت المال سے زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم دئے ۔

یہ روایت بھی بے بنیاد ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ بیت المال میں لوگوں کو وظیفے دینے کے بعد ایک کافی رقم بچ گئی ۔ حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت کو جو مہتمم بیت المال تھے حکم دیا کہ اس کو رفاہِ عامہ کے کام پر صرف کر دیا جائے ۔ چنانچہ انھوں نے اس کو مسجد کی توسیع اور تعمیر میں صرف کر دیا ۔

۴۔ ایک اور الزام حضرت عثمان پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے مدینہ کے اطراف میں نقیع کو سرکاری چراگاہ قرار دیا اور عوام کو اس میں اپنے جانور چرانے سے روک دیا ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فوجی اور قومی ضروریات کے لیے چراگاہیں بنانا ہر حاکم کا فرض ہے ۔ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ نے ایسی چراگاہیں بنوائیں تو اگر حضرت عثمانؓ نے نقیع کو سرکاری چراگاہ قرار دے دیا تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے ۔ باقی رہا عوام الناس کو اس سے مستفید نہ ہونے دینا، تو چونکہ یہ چراگاہیں سرکاری خرچ پر تیار ہوئی تھیں اور فوجی گھوڑے اور زکوٰۃ کے اونٹ اس میں چرتے تھے اس لیے اگر عوام بھی اسے استعمال کرتے تو نقصان کا بھی اندیشہ تھا اور گڑبڑ پیدا ہونے کا بھی قوی احتمال تھا اس لیے رفعِ شر کی خاطر حضرت عثمانؓ نے عوام کو اپنے جانور اس میں چرانے سے روک دیا ۔

۵۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے حاشیہ نشینوں اور قرابت داروں کو اطرافِ ملک میں بعض نہایت وسیع قطعات دیے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عراق میں بہت سی زمین غیر آباد اور بنجر پڑی ہوئی تھی ۔ جن لوگوں نے اسے قابلِ زراعت بنایا، آپ نے وہی زمین ان کو مرحمت فرما دی ۔ فقہ کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ جو شخص ناقابلِ کاشت زمین کو قابلِ کاشت بنائے وہ زمین اسی کی ملکیت تصور ہو گی ۔ اسی طرح مملکت میں زیادہ رقبہ کو قابلِ کاشت بنایا جا سکتا ہے اور لوگ شوق سے زراعت کرتے ہیں ۔

۶۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کر دیا ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو خود جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے خود اپنی مرضی سے ربذہ جا کر رہنا پسند کیا تھا ۔ حضرت ابوذرؓ صوفی منش آدمی تھے اور لوگوں کو مال و دولت جمع کرنے سے روکتے تھے ۔ ان کی

---

[1] ابنِ خلدون ج ۲ ص ۱۲۹

باتوں سے متاثر ہو کر بعض عربوں نے امیروں کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے حضرت معاویہؓ کو کہلا بھیجا کہ ابو ذرؓ کو عزت و احترام کے ساتھ میرے پاس بھجوا دو (حضرت ابو ذرؓ ان دنوں شام میں مقیم تھے) چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی بہت عزت و تکریم کی۔ لیکن ان کے پیش کردہ نظریہ سے متفق نہ ہونے۔ اس پر حضرت ابو ذرؓ نے عرض کیا کہ پھر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کہیں اور چلا جاؤں۔ کیونکہ مدینہ میرے مناسب حال نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ کیا آپ اس گھر کو چھوڑ کر اس گھر سے بدتر گھر اختیار کریں گے؟ انھوں نے کہا مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب مدینہ کی آبادی سلع تک پھیل جائے تو تم مدینہ میں نہ رہنا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے بادل ناخواستہ ان کو ربذہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دی اور کچھ اونٹ اور دو غلام ساتھ کر دئے۔

۷۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ والی کوفہ ولید بن عقبہ پر شراب خوری کی حد جاری کرنے میں آپ نے غیر معمولی تاخیر کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو الزام ولید پر لگایا گیا تھا اس کا جواب دینے کے لیے حضرت عثمانؓ نے فوراً اس کو مدینہ میں طلب فرمایا اور جب گواہوں کے بیانات سے اس کا شراب پینا ثابت ہو گیا تو آپ نے اس پر حد جاری کی۔ اس سے سزا دینے میں "غیر معمولی" تاخیر کا نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ شریعت کے لحاظ سے گواہی کی رعایت رکھتے ہوئے حضرت عثمانؓ نے ولید کو سزا دی ورنہ اس پر شراب پینے کا الزام شاید پورے طور پر ثابت نہ تھا۔ واقعہ کی تفصیل تاریخوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ فتنہ کے سرغنوں نے ولید بن عقبہ والی کوفہ کو معزول کرانے کی سازش کی اور چند جاسوس مقرر کیے تاکہ کوئی عیب ولید کا پکڑ کر ان کو اطلاع دیں۔ جاسوسوں نے ایک دفعہ ان کو اطلاع دی کہ ولید اپنے ایک دوست ابو زبیر کے ساتھ مل کر، جو عیسائی سے مسلمان ہوا تھا، شراب پیتا ہے۔ اس پر ان مفسدوں نے شہر کے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ، "تمہارا گورنر شراب پیتا ہے۔" عوام الناس جوش سے بے قابو ہو کر ولید کے گھر میں گھس گئے۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ اس پر وہ لوگ ان مفسدوں کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

ولید نے یہ غلطی کی کہ اس واقعہ کی حضرت عثمانؓ کو کوئی اطلاع نہ دی لیکن ان مفسدوں نے پہلے سے بھی زیادہ جوش سے ولید کو گرانے کی تدبیریں کرنی شروع کیں۔ حضرت عثمانؓ نے ایک وفد بھیجا کہ ولید کو معزول کر دیا جائے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ جب تک اس پر کسی جرم یا نااہلی کا الزام ثابت نہ ہو اس وقت تک میں تمہارے مطالبات ماننے سے قاصر ہوں۔ اس پر ان لوگوں نے سازش کی کہ کسی طرح اس پہ شراب پینے کا جرم ثابت کیا جائے۔ ابو زینب اور ابو مورع دو شخصوں نے اس بات کا ذمہ لیا اور اس دن سے ولید کی مجلس میں جانا شروع کر دیا ایک دن موقع پا کر جبکہ کوئی نہ تھا اور ولید سو رہا تھا ان دونوں نے اس کی انگوٹھی آہستہ سے اتار لی اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ ہم نے ولید کو شراب میں مخمور دیکھا ہے اور اس کا ثبوت یہ انگوٹھی ہے جو ان کے ہاتھ سے نشہ کی حالت میں ہم نے اتاری ہے اور ان کو خبر تک نہ ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں کے سامنے ولید نے شراب پی تھی؟ انھوں نے کہا، نہیں، ہم نے ان کو شراب کی قے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ انگوٹھی اس کا ثبوت موجود تھی اور دو گواہ حاضر تھے۔ کچھ مفسد بھی ان کے ساتھ اس شہادت کو پکا کرنے کے لیے

گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا جنھوں نے اس پر حد جاری کرنے کی صلاح دی۔ چنانچہ ولید کو کوفہ سے بلایا گیا اور شراب پینے کی سزا میں اس کو کوڑے لگائے گئے۔ ولید نے کو تمام واقعہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ شریعت کی رُو سے گواہوں کے بیان کے مطابق سزا تو ملے گی۔ ہاں جھوٹی گواہی دینے والا خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا پائے گا۔

(۸) ایک بڑا الزام حضرت عثمانؓ پر یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بصرہ، کوفہ اور مصر کے فتنہ پردازوں نے یہ طے کیا کہ اپنے اپنے شہروں سے حاجیوں کی صورت میں مدینہ چلنا چاہیے اور حضرت عثمانؓ سے بزور اپنے مطالبات منوانے چاہئیں۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر قیام کیا اور چند آدمی باری باری حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص اور حضرت علیؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ حضرت عثمانؓ بدانتظامی کے باعث اب خلافت کے قابل نہیں۔ ہم ان کو معزول کرنے آئے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ ان کے بعد اس عہدہ کو قبول کر لیں گے۔ ان سب نے ان کو دھتکار دیا اور یہ ناکام ہو کر اپنے ڈیروں میں واپس چلے گئے۔

حضرت عثمانؓ کو فتنہ و فساد کا دبانا اور لوگوں کی صحیح شکایات کو رفع کرنا بہرحال منظور تھا۔ جب آپ نے ان مفسدین کے آنے کی خبر سنی تو حضرت علیؓ سے فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے پوچھیے۔ میں ان کے جائز مطالبات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جس پر ان فسادیوں نے چند گورنروں کو بدل دینے کی درخواست کی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی خواہش کے بموجب مصر کے والی عبداللہ بن ابی سرح کو بدل دیا اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو والیِ مصر مقرر کر دیا۔

اس پر یہ لوگ بظاہر خوش ہو کر واپس چلے گئے۔ لیکن چند روز بعد ہی اچانک پھر مدینہ پر چڑھ آئے اور تمام شہر پر قبضہ کر لیا۔ حضرت علیؓ نے ان سے واپس آنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ "ہم واپس جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ صدقہ کے ایک اونٹ پر سوار ہے۔ کبھی ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور کبھی پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہمارے بعض آدمیوں کو اس پر شک گزرا اور انھوں نے اس کو پکڑ لیا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ تو کس کام کو جاتا ہے تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس پر اس کی جامہ تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے حضرت عثمانؓ کا لکھا ہوا ایک خط برآمد ہوا جس میں والیِ مصر کو ہدایت کی گئی تھی کہ "جس وقت مصر کا وفد واپس مصر پہنچے تو ان میں سے فلاں فلاں کو قتل کر دینا، فلاں فلاں کو کوڑے مارنا، ان کے سر اور داڑھیاں منڈوا دینا اور جو خط ان کی معرفت تمہارے معزول کیے جانے کے متعلق لکھا ہے اس کو باطل سمجھنا۔" اس بدعہدی کو دیکھ کر اب ہم لوٹ آئے ہیں۔"

اس پر حضرت علیؓ اور محمد بن مسلمہؓ نے فوراً کہا کہ یہ بالکل جھوٹ اور بناوٹی ہوئی بات ہے۔ جب تم لوگ الگ الگ راستوں پر جا رہے تھے تو تم سب کو یک دم اس خط کی اطلاع کیسے مل گئی؟ جب حضرت عثمانؓ نے یہ واقعہ سنا تو ان مفسدین اور اکابر صحابہؓ کو اپنے پاس بلا کر قسم کھائی اور فرمایا کہ نہ میں نے لکھوایا ہی ہے نہ مجھے علم ہے کہ یہ خط کس نے لکھا۔ پھر فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ کبھی جھوٹے خط بھی بنا لیے جاتے ہیں۔ خط سے خط بھی مل جاتا ہے اور مُہر کی نقل بھی بنوائی جا سکتی ہے۔ جب صحابہؓ نے یہ جواب سنا تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس الزام سے بالکل بری قرار دیا۔ لیکن ان مفسدین پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر یہی الزام دہراتے رہے۔

بعض لوگ حضرت عثمانؓ کو تو اس الزام سے بری سمجھتے ہیں مگر یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ خط آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری مروان نے بطور خود لکھ کر بھیج دیا ہوگا۔ مگر یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ واقعات پر نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بنانے والے انہی مفسدین میں سے بعض تھے نہ کہ مروان یا کوئی اور شخص، جس کے ثبوت مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ لوگ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جھوٹ سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ بارہا ان لوگوں نے اپنے والیوں کے متعلق جھوٹی شکایتیں کیں اور جب ان کی باقاعدہ تحقیقات کی گئی تو سب کی سب جھوٹی ثابت ہوئیں۔

۲۔ ان لوگوں کا اتنی جلدی واپس آجانا اور ایک ہی وقت میں ایک ساتھ مدینہ میں داخل ہونا اس بات کا یقین ثبوت ہے کہ یہ کام ایک باقاعدہ سوچی سمجھی سازش کے مطابق کیا گیا تھا۔ کیونکہ اہلِ مصر کے بیان کے مطابق اُنھوں نے قاصد کو جو والیِ مصر کے نام خط لے جا رہا تھا بویب کے مقام پر پکڑا تھا۔ بویب مدینہ سے چھ منزل کے فاصلہ پر ہے اور اس جگہ واقع ہے جہاں سے مصر کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ مدینہ سے اہلِ مصر، اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ ایک ساتھ واپس روانہ ہوتے تھے گویا اس وقت تک اہلِ بصرہ اور اہلِ کوفہ بھی چھ چھ منزلیں طے کر چکے ہوں گے۔ اہلِ مصر کے واقعہ کی اطلاع باقی دونوں قافلوں کو کم سے کم بارہ تیرہ دن میں مل سکتی تھی۔ اگر ان کے واپس آنے کے دنوں کو شامل کیا جائے تو کم از کم چوبیس دنوں میں یہ لوگ مدینہ واپس پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ لوگ چند دنوں کے بعد مدینہ پہنچ گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ پہلے سے ایک منصوبہ بنا کر مدینہ سے روانہ ہوئے تھے کہ اس تاریخ کو واپس لوٹ کر مدینہ پر قبضہ کر لینا ہے۔ اعتراض سے بچنے کے لیے اُنھوں نے جعلی خط بنایا۔ صدقہ کا اونٹ چرا لیا اور کسی غلام کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

۳۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ ایک اکیلے آدمی کی رفتار قافلہ کی رفتار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قاصد اہلِ مصر کو بویب کے مقام پر جو مدینہ سے چھ منزل کے فاصلہ پر ہے ملا، حالانکہ اس وقت تک اس کو مصر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

غرض یہ واقعات بتاتے ہیں کہ خط اور خط لے جانے والے کا واقعہ شروع سے آخر تک من گھڑت تھا۔ انہی مفسدوں میں سے کسی (زیادہ تر گمان یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا رئیس المفسدین) نے ایک خط بنا کر ایک شخص کو دیا اور اس کو ہدایت کی کہ وہ قافلہ کے ساتھ اس طرح چلے کہ لوگوں کے دل میں شک پیدا ہو اور وہ شک کی بنا پر اس کی تلاشی لیں تو خط دیکھ کر ان کو یقین ہو جائے کہ حضرت عثمانؓ نے ان سے (نعوذ باللہ) فریب کیا ہے۔

۴۔ اس خط کے مضمون سے بھی اس کے جعلی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اس خط میں تھا کہ فلاں فلاں کی داڑھی منڈوائی جائے حالانکہ داڑھی منڈوانا اسلام کی رُو سے منع ہے اور اسلامی حکومتوں میں صرف اسلامی احکام کے مطابق ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ حضرت عثمانؓ یا آپ کے عمّال نے اس سے پہلے کبھی کسی کو ایسی سزا نہیں دی۔ پس ایسی سزا کا اس خط میں تحریر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خط کسی ایسے شخص نے بنایا تھا جو اسلام کے احکام سے بالکل نابلد تھا۔

۵۔ اگر حضرت عثمان ایسے ہی سخت ہوتے تو دونوں دفعہ جب یہ مفسد آپ کے پاس آئے تھے آپ ان کو گرفتار اور قتل کرا سکتے تھے۔ سب صحابہؓ آپ کے ساتھ تھے اور اُنھوں نے آپ کو صلاح دی تھی کہ ان کے ساتھ جنگ کر کے ان کو ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا اور ان کو سزائیں نہ دیں جن کے یہ پورے پورے مستحق تھے۔

لیکن اس وقت ان سے نرمی کر کے مصر کے گورنر کو لکھنا کہ ان کو سزا دے، ایک بعید از عقل خیال ہے۔

(۶) مروان پر بھی خط لکھنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ حضرت عثمانؓ حدود کے قیام میں بہت سخت ہیں وہ ایسا خط لکھ کر آپ کی سزا سے محفوظ رہنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ پھر اگر وہ ایسا خط لکھتا بھی تو کیوں صرف مصر کے والی کے نام لکھتا؟ کیوں نہ بصرہ اور کوفہ والوں کے نام بھی وہ ایسے خطوط لکھ دیتا جس سے سب مفسدین کا ایک ہی دفعہ خاتمہ ہو جاتا؟ صرف مصر کے والی کے نام ہی خط کا لکھا جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ کوفہ اور بصرہ کے قافلوں میں عبداللہ بن سبا جیسا چالاک کوئی نہ تھا۔

(۷) باوجود اس کے کہ حضرت عثمانؓ نے مطالبہ کیا تھا کہ میرے سامنے گواہوں کو پیش کیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس شخص کو سامنے نہیں لایا گیا جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ وہ یہ خط لے کر جا رہا تھا۔ اس سے بھی اس امر کا پتا چلتا ہے کہ یہ سب مفسدین کی اپنی کارروائی تھی۔

(۸) ایک اور امر جس سے اس خط کا صاف جعلی ہونا ثابت ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ جعلی خطوط بنانے میں ماہر تھے اور اس واقعہ سے پہلے بھی یہ لوگ فساد کی آگ بھڑکانے کے لیے جعلی خطوط بناتے رہتے تھے۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو خطوط لکھتے تھے کہ ہم یہاں سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہمارے عمال ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر حضرت علیؓ کی طرف سے مفسدین کے سرغنے خطوط بنا کر لوگوں کو بھیجتے رہتے تھے۔ جن میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ تم لوگ حضرت عثمانؓ کے خلاف جوش دلاؤ اور ان خطوط کے ذریعہ عوام الناس میں جوش پھیلایا جاتا تھا۔

جب ان لوگوں نے واپس آنے پر حضرت علیؓ سے مدد کی درخواست کی تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ان لوگوں نے آپ سے کہا کہ پھر آپ ہم سے خط و کتابت کیوں کرتے تھے؟ حضرت علیؓ نے اس امر سے صاف انکار کیا اور خطوط لکھنے سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس پر ان لوگوں کو بھی سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ درحقیقت خود ان لوگوں کو بھی دھوکہ دیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ خط جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، اس کے لکھنے والے حضرت عثمانؓ نہ تھے نہ ہی مروان یا کوئی اور شخص تھا، بلکہ مصری قافلہ کا ہی ایک فرد تھا، جو بڑی حد تک عبداللہ ابن سبا ہو سکتا ہے۔

حضرت عثمانؓ پر مندرجہ بالا اعتراضات کے علاوہ اور بھی بعض لایعنی اعتراض کیے جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان میں سے مشہور مشہور اعتراضات ہی کو لیا ہے اور ان کے جوابات دئے ہیں۔ ان اعتراضات کی روشنی میں دوسرے اعتراضات کی قلعی بھی کھل جاتی ہے اور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قسم کے اعتراضات ہوں گے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم امر جس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کیا صحابہ کرامؓ حضرت عثمانؓ سے ناراض تھے اور انھوں نے فتنہ کے موقعہ پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ اکثر مورخین نے صحابہ کرامؓ پر یہ الزام لگایا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اس موقعہ پر اپنے اختلافات کو بھول جاتے اور متحد ہو کر اس فتنہ کا مقابلہ کرتے اُنھوں نے اُلٹی حضرت عثمانؓ پر ہی طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی اور جب باغیوں نے مدینہ پر قبضہ کر لیا تو کوئی صحابیؓ حضرت عثمانؓ کی مدد کو نہ آیا۔ مولف کتاب ہذا نے بھی صحابہ کرامؓ پر لگائے ہوئے اس الزام کو درست تسلیم کیا ہے اور اپنی اس کتاب میں کئی واقعات ایسے بیان کیے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ حضرت عثمانؓ سے سخت ناراض تھے۔ وہ ہر موقعہ پر کھڑے ہو کر آپ پر اعتراضات کرنے لگتے تھے۔ جب آپ سے ملتے تھے تو

آپ کے مرتبہ کا لحاظ کیے بغیر آپ سے سخت کلامی کرنے لگتے تھے اور گستاخی کے مرتکب ہوتے تھے اور ان کی ناراضی کا ثبوت یہ لاتے ہیں کہ اس فتنہ کے موقعہ پر صحابہؓ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور کوئی ایک صحابیؓ بھی آپ کی مدد کو نہ آیا۔

یاد رہے کہ صحابہؓ کے متعلق ایسے قصے گھڑنے والے وہی وقائع نویس اور مورخین ہیں جنھوں نے حضرت عثمانؓ پر بھی نہایت لغو اعتراضات کیے ہیں اور ایسی بے سروپا باتیں آپ کے متعلق بیان کی ہیں کہ کوئی ہوشمند اور ذی عقل انسان کسی صورت میں بھی ان کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ جب یہ مورخین حضرت عثمانؓ کے متعلق: جو خلیفۃ المسلمین اور نہایت ہی پاکباز اور مطہر انسان تھے ایسی ایسی خرافات بیان کر سکتے ہیں تو صحابہ کرامؓ کے متعلق نہیں بیان کر سکتے؛

ہمیں نہایت ہی افسوس سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض قدیم مورخین نے محدثین کی طرح روایات لینے میں جرح و تعدیل کا کوئی معیار برقرار نہیں رکھا۔ انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ جس قدر روایات ان کو مل سکیں وہ جمع کر لیں۔ خواہ ظاہری اعتبار سے وہ کتنی ہی ساقط الاعتبار کیوں نہ ہوں اور ان پر بے شمار اعتراضات ہی کیوں نہ ہو سکتے ہوں۔ روایات لینے میں وہ تحقیق و تدقیق کو کام میں نہیں لائے بلکہ جس قسم کی بھی کوئی روایت ملی بلا تامل اور بغیر تحقیق اس کو اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

جیسا کہ کتاب پڑھنے سے پتا چل جائے گا مفسدین کی پوری کوشش اس بات کی ہوتی تھی کہ وہ جھوٹی روایات کے ذریعہ سے عام لوگوں کو حضرت عثمانؓ اور آپ کے عمال سے برگشتہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت علیؓ کے نام سے جھوٹے خط بنا کر مختلف لوگوں کو بھیجتے رہتے تھے جن میں لکھا ہوتا تھا کہ؛

”حضرت عثمانؓ اور آپ کے عمال نے ظلم و تعدی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ حضرت عثمانؓ اور عمال سے چھٹکارا پانے کے لیے عملی جدوجہد کریں اور ہم ان کی اس جدوجہد میں ان کے ساتھ ہوں۔“

اسی طرح دوسرے اکابر صحابہؓ کے متعلق بھی وہ لوگوں میں اس قسم کی باتیں پھیلاتے رہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ ان پر بہت ظلم توڑ رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ سب آپ کے سخت خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح وہ آپ کی خلافت اور آپ کے قائم کردہ عمال سے چھٹکارا پائیں۔

ان حالات کی موجودگی میں ہم کیوں نہ اس بات کا یقین کر لیں کہ مورخین نے انھی مفسدین کی پھیلائی ہوئی باتوں اور روایات کو بغیر تحقیق و تدقیق کے قبول کر لیا اور ان کی تحقیق اور تصدیق کیے بغیر ان روایات کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

قطع نظر ان روایات کے جو صحابہ کرامؓ کے متعلق کتب تواریخ و سیر میں موجود ہیں، ہمیں صحابہؓ کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس امر کو معلوم کرنا چاہیے کہ کیا وہ ایسی باتوں کے مرتکب ہو سکتے تھے یا نہیں؛

اس امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آفرینشِ عالم سے لے کر اب تک کوئی گروہ بھی ایسا نہیں گزرا جو تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی کے اس مقام پر پہنچا ہو جس مقام پر صحابہ کرامؓ پہنچے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک زبردست معجزہ ہے کہ آپ نے ایک ایسی قوم کو جو وحشیوں سے بھی بدتر تھی اور جس کے عادات و خصائل درندوں سے مشابہ تھے، ایک ایسی قوم بنا دیا جو اپنے اخلاص، صدق و صفا اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے تمام دنیا کے رہبر بن گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلوں سے

دنیا کی محبت کو بالکل سرد کر دیا تھا اور ان کا ہر عمل خدا تعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے اور اس کی رضا و خوشنودی کو حاصل کرنے کے لیے ہوتا تھا۔

خدا تعالیٰ نے بھی ان کے اس صدق و صفا کی قدر کی اور رضی اللہ عنہم کا ابدی خطاب ان کو دیا۔ جس خوش قسمت گروہ کو خود خدا تعالیٰ رضی اللہ عنہم کا خطاب دے۔ کیا اس سے کسی طرح بھی کوئی ایسی حرکت سرزد ہو سکتی ہے کہ وہ خلیفۂ وقت کی نافرمانی اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے پر تل جاتے اور اس سے ایسی گستاخی سے پیش آتے کہ ایک معمولی انسان سے بھی اس کی توقع نہ ہو سکے۔ وہ قدسی گروہ جو محض خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لیے ہر قسم کی دنیاوی خواہشات سے دستبردار ہو گیا تھا اور اس کام کا بیڑا اٹھانے کی خاطر کسی قسم کا کوئی ظلم نہ تھا جو اس نے اپنے اوپر نہ سہا ہو اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی جو اس نے برداشت نہ کی ہو۔ اس سے یہ کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے افراد محض عمال میں ردّ و بدل اور بعض صحابہؓ کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کرنے کی وجہ سے خلیفہ کے بالمقابل آ گئے ہوں۔ ان کے دلوں میں اس کی طرف سے کینہ اور بغض بھرا ہو اور فتنہ کے اٹھنے کے وقت وہ اس کی مدد سے کنارہ کش ہو گئے ہوں۔

اگر ان باتوں کو جو صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت نے ان کے دلوں میں کسی قسم کا بھی تغیر پیدا نہیں کیا بلکہ وہ بھی دوسرے گروہوں اور دوسری قوموں کی طرح محض اپنا اقتدار قایم کرنے کے لیے کوشاں رہے اور خلیفہ کے بالمقابل اس وجہ سے کھڑے ہو گئے کہ اس نے اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو امورِ سلطنت میں کیوں شریک کر رکھا ہے اور کیوں ان کو بڑے بڑے عہدے دے رکھے ہیں۔ لیکن اس گروہ پر جس کے متعلق خدا تعالیٰ خود کہے:

رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ اور رضی اللّٰہ عن المؤمنین اذ یبا یعونک تحت الشجرۃ۔

اگر لاکھوں مورخین بھی متفقہ طور پر یہ الزام عاید کریں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستہ سے ہٹ گئے تو ان لاکھوں کی باتوں کو خدا تعالیٰ کی ایک بات کے مقابلہ میں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی جا سکتی۔

حضرت علیؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت ابوذرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے مخالف تھے حالانکہ وہ نہایت پاکباز بزرگ تھے۔ انھوں نے ہر موقعہ پر اسلام کی عظیم الشان خدمات سرانجام دی ہیں، ان کے متعلق یہ کس طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ خلیفہ کی مخالفت اور اس سے بغض و عناد رکھنے کے گناہِ عظیم کے مرتکب ہوئے ہوں گے اور محض اس ناراضی میں کہ ان میں سے بعض کو معزول کیوں کر دیا گیا اور بعض کو عہدے کیوں نہیں دیے گئے۔ انھوں نے عین اس موقع پر خلیفہ کا ساتھ چھوڑ دیا جبکہ خلیفہ کا شہید ہونا صرف ایک فرد کا مارا جانا نہ تھا بلکہ تمام عالمِ اسلام کے لیے ہمیشہ کے واسطے فتنہ کا باعث تھا۔

کتبِ تواریخ و سیر میں حضرت عثمانؓ کے متعلق ان بزرگوں کی طرف جو اعتراضات منسوب کیے جاتے ہیں ان کا باطل ہونا ذرا سے غور و فکر اور تدبر سے معلوم ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ تیرہ سو برس بعد پیدا ہونے والے انسان تو عقل سے کام لے کر

ان اعتراضات کے باطل ہونے پر یقین کر لیتے ہیں۔ لیکن صحابہ کرامؓ جن کے سامنے تمام واقعات رُونما ہو رہے تھے بے دھڑک ان الزامات پر ایمان لے آتے ہیں اور نہ صرف ایمان لے آتے ہیں بلکہ حضرت عثمانؓ کے سامنے ان کو پیش بھی کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ خود حضرت عثمانؓ پر الزامات لگاتے ہیں اور ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ مسجد میں کھڑے ہو کر اپنے اُوپر عائد کردہ الزامات کی تردید کرتے ہیں اور صحابہؓ سے اپنی بات کی تصدیق چاہتے ہیں تو سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کی تصدیق کرنے والے اور ان کو الزامات سے بری قرار دینے والے وہی لوگ تھے جو پہلے ان کو ان الزامات سے ملوث قرار دے چکے تھے۔

پھر کیا ہی عجیب بات ہے کہ جب بلوائیوں نے تمام مدینہ پر قبضہ کر کے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے اپنے لڑکوں کو بھیجنے میں سب سے پیش پیش حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تھے جن کے متعلق الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے اشد ترین دشمنوں میں سے تھے۔ کیا کوئی شخص اپنے دشمن کی جان بچانے کے لیے اپنے بیٹوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟ پھر کیا یہی طلحہؓ، زبیرؓ، عائشہ صدیقہؓ اور عمروؓ بن العاص نہیں تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کا قصاص لینے کی آواز بلند کی؟ کیا کسی دشمن کا بھی قصاص طلب کیا جاتا ہے؟ پھر کیا یہ حضرت علیؓ ہی نہیں تھے جنھوں نے بلوائیوں کو سمجھانے اور حضرت عثمانؓ کے گھر پانی پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو اپنا عمامہ اپنے سر سے اُتار کر حضرت عثمانؓ کے گھر میں پھینک گئے تاکہ آپ کو پتا چل جائے کہ اُنھوں نے حتی المقدور کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر کیا صحابہؓ نے ہر موقع پر حضرت عثمانؓ کی تصدیق نہیں کی؟ کیا بار بار حضرت عثمانؓ کو نہیں سمجھایا کہ آپ ان مفسدین سے نرمی کا برتاؤ نہ کریں بلکہ ان کو عبرت ناک سزائیں دیں؟ کیا اپنے دشمن کو بھی کوئی شخص ایسا مشورہ دے سکتا ہے؟

رہا یہ امر کہ صحابہ نے بلوائیوں کے حملہ کے وقت حضرت عثمانؓ کی مدد کیوں نہ کی اور کیوں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ باغیوں نے جس طریقہ سے مدینہ پر قبضہ کیا تھا اس نے صحابہؓ کے لیے کوئی موقع ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ باغیوں کے مقابلہ میں آتے۔ مفسدین نے یک دم بغیر کسی اطلاع کے مدینہ پر قبضہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ کوئی شخص بھی ہتھیار لے کر باہر نہ نکلے، جو باہر نکلے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ایسے موقعہ پر منظم مقابلہ آخر کس طرح ہو سکتا تھا؛ لیکن باوجود اس کے صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ سے باغیوں کے خلاف لڑنے کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کسی طرح بھی لڑائی پر راضی نہ ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ میری جان بچانے کی خاطر اسلام میں تلوار کشی اور خُونریزی نہ کرو۔ لیکن اس کے باوجود صحابہ حضرت عثمانؓ کی مدد سے غافل نہ رہے۔ اکابر صحابہؓ نے اپنے لڑکوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا اور خود مفسدین کو سمجھانے بجھانے میں لگ گئے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا، مگر خدائی تقدیر کو کون روک سکتا ہے۔ باوجود صحابہؓ کی کوششوں اور ان کے بیٹوں کے مقابلہ کے حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔

کیا ان امور کی موجودگی میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرنے اور ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے؛ صحابہ کرامؓ پُورے طور پر

حضرت عثمانؓ کے وفادار تھے اور آپ کو چھوڑ دینے کا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے دلوں میں نہیں آسکتا تھا۔ صحابہؓ کو حضرت عثمانؓ کی خلافت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ آخر دم تک وفاداری سے کام لیتے رہے اور جبکہ کسی قسم کی مدد کرنی بھی ان کے لیے ناممکن تھی تب بھی اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر آپ کی حفاظت کرتے رہے۔ ان فسادات میں حضرت عثمانؓ کے انتخاب ولاۃ کا بھی کچھ دخل نہ تھا اور نہ گورنروں کے مظالم اس کے باعث تھے کیونکہ ان کا کوئی ظلم ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ پر خفیہ ریشہ دوانیوں کا الزام بھی بالکل غلط ہے۔ ان تینوں اصحاب نے اس وفاداری اور اس ہمدردی سے اس فتنہ کے دُور کرنے میں سعی کی کہ سگے بھائی بھی اس سے زیادہ تو کیا اس کے برابر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انصار پر جو الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ سے ناراض تھے، وہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انصار کے سب سردار اس فتنہ کو دُور کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

فساد کا اصل باعث یہ تھا کہ دشمنانِ اسلام نے ظاہری تدابیر سے اسلام کو تباہ نہ ہوتے دیکھ کر خفیہ ریشہ دوانیوں کی طرف توجہ کی اور بعض اکابر صحابہؓ کی آڑ لے کر چپکے چپکے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا چاہا۔ سزا یافتہ مجرموں کو اپنے ساتھ ملایا۔ لٹیروں کو تحریص دلائی۔ جھوٹی مساوات کے خیالات پیدا کر کے انتظامِ حکومت کو کھوکھلا کیا۔ مذہب کے پردہ میں لوگوں کے ایمان کو کمزور کیا اور ہزاروں حیلوں اور تدبیروں سے ایک جماعت تیار کی۔ پھر جھوٹ، جعل اور فریب سے کام لے کر ایسے حالات پیدا کر دیے جن کا مقابلہ کرنا حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہؓ کے لیے مشکل ہو گیا۔

ABN1PT اس زمانہ کی تاریخ کے متعلق بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اس زمانہ کے بعد کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جو ایک یا دُوسرے فریق سے ہمدردی رکھنے والوں سے خالی ہو اور یہ بات تاریخ کے لیے نہایت مضر ہوتی ہے کیونکہ جب سخت عداوت یا ناواجب محبت کا دخل ہو تو روایت کبھی بعینہٖ نہیں پہنچ سکتی۔ اگر راوی جھوٹ سے کام نہ بھی لیں تب بھی ان کے خیالات کا رنگ روایت پر ضرور چڑھ جاتا ہے اور پھر تاریخ کے راویوں کے حالات ایسے ثابت شدہ بھی نہیں ہیں جیسے کے احادیث کے ہیں۔ پس اس معاملہ میں بہت احتیاط اور جرح و تعدیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلۂ واقعات کو مدِنظر رکھنے کے بغیر کسی زمانہ کی تاریخ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ تاریخ کی تصحیح کا یہ زرّیں اصول ہے کہ واقعاتِ عالم ایک زنجیر کی طرح ہیں کسی منفرد واقعہ کی صحت معلوم کرنے کے لیے اسے زنجیر میں پرو کر دیکھنا چاہیے کہ وہ کڑی ٹھیک اپنی جگہ پر پروئی بھی جاتی ہے یا نہیں۔ غلط اور صحیح واقعات میں تمیز کرنے کے لیے یہ ایک نہایت ہی کارآمد بات ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں مولف نے کافی محنت اٹھائی ہے اور بیسیوں کتابوں کی چھان بین کر کے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ کتاب کے آخر پر ان سب کتابوں کے نام درج کر دیے گئے ہیں جن سے مولف نے مدد لی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق جو جو رائیں مولف کو مل سکیں، وہ اس نے اس میں درج کر دیں تاکہ لوگوں کو پتا چل سکے کہ آپ کے متعلق لوگوں کے خیالات کیا کیا ہیں اور مورخین نے کس کس نہج پر واقعات کو بیان کیا ہے اور ان سے کیا کیا نتیجے نکالے ہیں، لیکن سب سے بڑی کمی جو اس کتاب میں رہ گئی ہے وہ یہی ہے کہ مولف نے اس میں اپنی رائے کو بہت کم دخل دیا ہے اور اس بات کی بہت کم کوشش

کی ہے کہ مختلف آراء کو ملا کر ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہو وہ کھول کر لکھ دیں۔ حضرت عثمانؓ اور صحابہؓ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے بڑے بڑے اعتراضات کے جوابات میں نے اس تمہید میں دے دیے ہیں اور کتاب کے دوران میں بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آئے ہیں حاشیے میں ان کی وضاحت کرنے یا جواب دینے کی کوشش کی ہے تاکہ ناظرین کے سامنے تصویر کا صرف ایک ہی رُخ نہ آئے بلکہ وہ دوسرے پہلوؤں کو بھی مدِ نظر رکھ کر غور و فکر کر سکیں۔

میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ جو اُلجھنیں پڑھنے والوں کو اس کتاب میں پیش آئیں ان کو دُور کر دوں۔ خدا کرے میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہُوں۔

محمد احمد پانی پتی

مقدمہ مؤلف

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتنہ اُٹھا وُہ ایسا تھا کہ اُس کے افسوسناک نتائج آج تک اُمتِ محمدیہ کو بھگتنے پڑ رہے ہیں ۔ وحدتِ اسلامی پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اُمتِ محمدیہ سیکڑوں فرقوں میں بٹ چکی ہے اور اسی اختلاف کی وجہ سے ممالکِ اسلامیہ کی اپنی ذاتی آزادی بھی بہت حد تک سلب ہو چکی ہے۔ اس فتنہ کے اسباب و نتائج کے متعلق متقدمین میں باہم شدید اختلاف ہے لیکن ان سب سے ہٹ کر ہم نے اس کے بارے میں بالکل جدید طرز سے بحث کی ہے اور ایک نئے طریقہ سے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

اس عہد کی تاریخ لکھنا اور اُس پر بحث کرنا کوئی آسان کام نہیں، وہ شخص جس کو تاریخ لکھنے کا اہم کام سپرد کیا جائے اُس کا فرض ہے کہ وہ یہ نہ دیکھے کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور ان کی اس معاملہ میں کیا رائے ہے یا اس کا مختلف افراد اور جماعتوں پر کیا اثر پڑے گا ، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ وُہ اپنے قارئین کے سامنے وہی واقعات پیش کرے جن کے متعلق اس کو یقین واثق ہو کہ وہ ٹھیک اور درست ہیں خواہ ان واقعات کے بیان کرنے سے لوگ خوش ہوں یا ناراض، خواہ اس کی رائے قارئین کی رائے کے مطابق ہو یا اس کے خلاف ۔ ایسا کرنے میں اُس کو بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اسے اپنے لیے ایک ایسی راہ متعین کرنی پڑتی ہے جو حدِ اعتدال کے اندر اور حقیقی واقعات کے بالکل مطابق ہو۔

اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنی کتاب میں اپنے لیے دوسرے تمام مورخین سے الگ ایک راستہ مقرر کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس فتنہ کی حقیقی تصویر قارئین کرام کے سامنے کھینچ دیں تاکہ ان کو اس عہد کے سیاسی اور اجتماعی واقعات سے پوری پوری آگاہی ہو جائے اور وہ تاریخِ اسلام کے اس پُر آشوب زمانہ کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے متعلق اس طرح مفصل معلومات حاصل کر سکیں کہ ان واقعات پر یکجائی نظر ڈالتے ہی فتنہ کے اصل اسباب کی تہ تک پہنچ جائیں۔

ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ ہم نے جہاں تک ہمارے امکان میں تھا حضرت عثمانؓ کو ان الزامات سے بری کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف گروہوں اور لوگوں کی طرف سے ان پر لگائے جاتے ہیں ۔ بشری کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں اور ان سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں۔ حضرت عثمانؓ میں بھی کمزوریاں ہوں گی لیکن اس امر میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عثمانؓ نے اسلام کی شاندار خدمات سرانجام دی ہیں۔ آپ نے اسلام کی خدمت کرنی اس وقت بھی ترک نہ کی جب آپ پر بُرے دن آ چکے تھے اور ہر طرف سے مصیبتوں کے پہاڑ آپ پر ٹوٹ رہے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے آپ کی یہ قدیم الفت و محبت ہی تھی جس کی وجہ سے آپ کی دردناک موت کے وقت اُس زمانہ کے لوگوں میں انتہائی درجہ کا حزن و ملال اور رنج و الم پیدا ہوا اور آج بھی جب ہم ان واقعات کو پڑھتے ہیں تو

انتہائی درجہ کا رنج و الم ہماری رُوحوں پر مسلّط ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کو بہت بُری طرح شہید کیا گیا۔ مفسدین نے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے ہر طرح کی کمینگی کا مظاہرہ کیا۔ تین روز تک کوئی شخص بھی آپ کو دفن کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور کسی کو بھی آپ کے فضائل اور آپ کے اعمال صالحہ کا پاس نہ ہوا۔ رنج اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ مورخین اور غیر مورخین آپ کی اس دردناک شہادت پر بالکل خاموش ہیں اور اسّی سال تک انتہائی پاکیزہ زندگی بسر کرنے اور تمام عمر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور اسلام کی بے لوث خدمات کو دیکھتے ہوئے ان سے یہ نہ ہو سکا کہ اگر بالفرض محال حضرت عثمانؓ سے بعض لغزشیں صادر ہو بھی گئی تھیں تو ان کی توجیہات کر لیتے اور ان پر عفو و درگزر کا پردہ ڈال دیتے۔

ہم لوگ جو چاہتے ہیں کہ اپنی قومی میراث کی، چاہے قدیم ہو یا جدید، عزّت و توقیر کریں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے بزرگوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اگر واقعات ہمیں اس بات کی اجازت دیں تو ان کو ان کی غلطیوں پر متہم کرنے کی بجائے ان کی توجیہات کر لیں تاکہ یہ قدیم واقعات کہیں ملّتِ اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سبب نہ بن جائیں اس اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اس مسئلہ کا بنظرِ انصاف جائزہ لیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ خلفاؓ میں سے ایک خلیفہ پر اس کی رعیت کے بعض لوگ ناراض ہو گئے، بعض اپنے دل میں اس کے متعلق بُرے ارادے لئے ہوئے تھے اور بعض کے دلوں میں بُرے ارادے تو نہیں تھے، لیکن وہ ان لوگوں کے پیچھے لگ گئے تھے جو مفسدہ پرداز تھے۔ اس کے بعد وہ خلیفہ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔ اس پر ہم یہی حکم لگا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے انتہائی قابلِ شرم حرکت کی۔ اب وہ سب خدا تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہیں وہ جو چاہے ان سے معاملہ کرے۔ ان حالات میں جب کہ واقعات میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم محض یقینی باتوں کو بیان کر دیں اور مشتبہ واقعات و اشخاص کے متعلق بحث نہ کریں، جن کو گزرے ہوئے عرصہ گزر چکا ہے اور جن کے متعلق کوئی یقینی بات ہمیں معلوم نہیں۔

قارئین کرام دیکھیں گے کہ ہم نے اس کتاب میں فتنہ کے سرغنوں اور سرکردہ باغیوں کی تائید نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم مورخین نے حضرت عثمانؓ کے والیوں کی غلطیوں کے بارے میں بہت ہی زیادہ اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے جو ان کے متعلق مورخین میں پیدا ہوا ہے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم کو ان کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہے تو جہاں تک ہو سکے ہم ان والیوں کی غلطیوں کی توجیہہ کریں۔ کیونکہ اگر شک کی بنا پر ایک مجرم اور قاتل کو بھی بری کیا جا سکتا ہے تو ان عمال اور گورنروں کو کیوں نہیں کیا جا سکتا جن کے بارے میں قدیم مورخین کی بڑی بڑی ضخیم کتب میں اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن ان کو بالکل بری الذمہ اور ہر قسم کے الزامات سے پاک وصاف بھی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگر وہ ایسے ہی عقلمند ہوتے اور ان کی سیاست نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوتی تو ان کے علاقوں میں بالکل سکون رہتا اور یہ مفسد اور فتنہ پرداز کبھی لوگوں کو بغاوت پر اکسانے اور مدینہ چل کر خلیفۃ المسلمین سے ان کی شکایتیں کرنے پر آمادہ نہ کر سکتے۔

عبداللہ بن سبا معصر، کوفہ اور بصرہ میں تو اپنا زہر پھیلا دیتا ہے۔ لیکن دمشق اور شام میں اس کو ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر حضرت عثمانؓ کے تمام والی حضرت معاویہؓ کی طرح عقلمند اور بہترین سیاستدان ہوتے تو کبھی اس مخلوق کو یہ موقع نہ دیتے کہ وہ اُمتِ محمدیہ میں اس طرح فساد کا بیج بو دیتی۔ اگر وہ ایسے ہی عقلمند ہوتے تو بیماری کو جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ملیامیٹ کر دیتے اور فساد پیدا ہوتے ہی اس کی جڑ کو اکھاڑ پھینکتے۔ لیکن انھوں نے سستی برتی اور اس طرف پوری توجہ نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ پورے زور شور سے اٹھا۔ مدینہ کا محاصرہ ہوا اور آخر میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ جب مفسدین نے آپ پر زور ڈالا کہ آپ اپنے عمال کو برطرف کردیں تو آپ نے یہ دیکھ کر کہ وہ کوئی قابلِ مواخذہ بات نہیں کرتے اور نہ انھوں نے امنِ عامہ میں خلل ڈالا ہے (سوائے ولید کے معاملہ کے کہ جو کچھ اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ سچ تھا) یہ مناسب نہ جانا کہ انھیں ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا جائے۔ اگرچہ ہمیں اس امر سے انکار نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ کو جیسا کہ مشہور ہے اپنے اعزہ و اقربا سے بہت محبت تھی، آپ ان سے احسان کا سلوک کرتے اور ان کو ملک کی خدمت کے مواقع بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ لیکن ہماری نظر میں یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے بلادِ اسلامیہ میں بغاوت پھیلانا، مدینہ پر حملہ کرنا اور خلیفہ کو شہید کرنا جائز سمجھا جائے۔ اسی امر نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اپنی اس کتاب میں فتنہ کے سرغنوں کے متعلق سخت رویہ اختیار کریں۔ ہمیں کوئی ایسی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم ان کے فتنہ و فساد کو، خلیفہ کے خلاف بغاوت کو اور اس طرح ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر کرنے کو کسی صورت میں بھی جائز قرار دے سکیں۔ یہ فتنہ اتنا دُور رس ثابت ہوا کہ تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی آج تک اس میں ویسی ہی تازگی پائی جاتی ہے جیسی اس کے رونما ہونے کے وقت تھی۔ مورخین نے اندازہ کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد سے لے کر آج تک لڑائیوں اور فتنہ و فساد میں لاکھوں مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور فتنہ و فساد کا یہ دروازہ ابھی تک بند نہیں ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مسلمانوں کی خوش قسمتی سے اس فتنہ کے رونما ہونے کے وقت رومی خود کمزوری کی حالت میں نہ ہوتے تو ضرور وہ شام کے اسلامی علاقے پر حملہ کر دیتے اور آن کی آن میں اسے فتح کر لیتے۔

ہم نے یہ دکھانے کی خاطر کہ حضرت عثمانؓ کی سیاست اور اس فتنہ کے اسباب کے متعلق مختلف مورخین کے کیا کیا خیالات ہیں، اختصار کے ساتھ ان کی آرا اور ان کے اقوال بھی درج کر دیے ہیں لیکن جہاں جہاں ہم نے اس فتنہ کے اسباب پر بحث کی ہے وہاں درمیانی راستہ اختیار کیا ہے اور بحث میں حدِ اعتدال کے اندر رہنے کی کوشش کی ہے کیونکہ نفرت زدہ دلوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا یہی ایک ذریعہ ہے اور اگر ہم حقیقی آزادی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونا اور اپنے لیے ایک شاندار مستقبل وضع کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے طریقوں سے کلیتہً اجتناب کرنا پڑے گا جن سے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت بڑھے اور امت کا شیرازہ بکھر جائے۔

ان سطور کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم پرانی تقلیدوں اور گمراہ کن راستوں کو بالکل ترک کر دیں۔ اس بھڑکتی ہوئی دوزخ اور اس اختلافِ عظیم سے کنارہ کشی اختیار کریں اور اپنی زندگیوں کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جو گزشتہ صدیوں کی زندگیوں سے بالکل مختلف ہو۔ ہم اپنے قابلِ رشک آبا و اجداد کی زندگیوں کو اپنے آئندہ اور شاندار مستقبل کی بنیاد رکھنے کے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔ ہمیں اپنے نوجوانوں سے یہ کہتے ہوئے کوئی باک نہیں ہے کہ یہ بات ان کے لیے انتہائی شرم کا موجب ہوگی۔ اگر وہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوں کہ کسی قسم کی خیر، بھلائی اور نیک ذکر اپنے پیچھے چھوڑ کر نہ جائیں، بلکہ ہمیں یہ اصول ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ: ؎

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
گاہ کوئی نہ کوئی یاد کرے

ہمیں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ ہم اس وقت تک کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے جب تک ہمارا بچہ بچہ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنی چاہیے۔ ایک ٹھوس اور سیسے کی پگھلائی ہوئی دیوار کی طرح بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وہ وطن کا سپاہی ہے اور ایک سپاہی کے لیے یہ بات انتہائی ننگ کا باعث ہے کہ وہ شکست کھا جائے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ آج ہمارے لیے جو معرکہ درپیش ہے وہ اقوامِ عالم کے درمیان اپنی صحیح حیثیت اور پوزیشن قائم کرنا ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو اتحاد اور تنظیم کے ساتھ مسلسل کام کرنا پڑے گا تاکہ ہم ایک بار پھر روئے زمین پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ سکیں۔

۴ شعبان ۱۳۵۴ھ

عمر ابو النصر

۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء

(۱)

مجلسِ مشاورت

۲۳ھ (۶۴۴ء) کی ایک صبح عالمِ اسلام کے دارالخلافہ مدینہ میں زبردست ہیجان بپا تھا۔ سارے شہر پر رنج و غم کے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر شخص اضطراب کے عالم میں مسجدِ نبوی کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت کے سب سے بڑے انسان اور حضور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو ——— جس کی ہیبت و جلال سے قیصر و کسریٰ کے تخت لرزہ براندام تھے ——— ایک مجوسی غلام نے، فجر کی نماز پڑھاتے ہوئے، خنجر مار کر زخمی کر دیا تھا۔

مدینہ کی زندگی ان دنوں بہار در آغوش تھی۔ وہاں دم بدم شام، مصر اور ایران کی فتح کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ مدینہ والے جب اپنے سپوتوں، اپنے نوجوانوں اور بوڑھوں کے محیّر العقول کارنامے سُنتے کہ کس طرح انھوں نے رُوئے زمین کو اپنے گھوڑوں کے سُموں سے روند ڈالا اور کس طرح پُر ہیبت اور پر شکوہ بادشاہتوں کو پلک جھپکتے میں زیر و زبر کر دیا، تو اُنھیں ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس وقت عالمِ حقیقت میں نہیں بلکہ خوابوں کی دُنیا میں ہیں مجاہدینِ اسلام تائیدِ ایزدی سے ہر لمحہ بہرہ یاب ہو رہے تھے اور فتح و ظفر، لونڈی غلاموں کی طرح ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔

ان دنوں مدینہ والوں کا معمول ہو گیا تھا کہ ان کی اکثریت قاصدوں کی زبانی، لڑائیوں کے حالات اور فتح کی خوش خبری سُننے کے لیے شہر کے باہر مضافات میں چلی جاتی اور جب کوئی قاصد نظر آجاتا تو شوق اور بے تابی کے ساتھ اس کی طرف لپکتی۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی کہ سب سے پہلے وہی خبر سُنے۔ اُنھیں کامل یقین ہوتا کہ قاصد فتح و ظفر کی نوید کے سوا اور کوئی خبر لا ہی نہیں سکتے۔ اس پر بھی ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ بار بار فتح کی خبریں سُنتے لیکن سیر نہ ہوتے تھے۔

غرض مدینہ کے باشندوں کا اس زمانہ میں عجیب عالم تھا۔ وہاں کی زندگی بڑی رُوح پرور اور راحت افزا تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کو اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ عدل و انصاف کے بارے میں وُہ زمانہ ہمیشہ کے لیے ضرب المثل بن چکا ہے۔ حق و صداقت کے جو مظاہرے اس وقت دُنیا نے دیکھے ان کی نظیر لانے سے زمانہ اب تک قاصر رہا اور شاید ہمیشہ قاصر رہے۔

جس زمانہ کا یہ ذکر ہے وہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کلیۃً وقف تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں آپ کو اپنی جان کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو آنے والی رات اہلِ مدینہ کے لیے ایک مہیب ترین خونیں رات تھی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو اُن کی آنکھوں سے اُمڈا چلا آتا تھا۔ ایک ناقابلِ بیان اضطراب تھا جو ان کے دلوں پر محیط ہو چکا تھا۔ ان کو کسی بات کی سُدھ نہ تھی اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا!

خلافت کا جو رعب اور دبدبہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے قائم کیا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس زمانہ میں رعایا کے حکومت سے اور حکومت کے رعایا سے جو حیرت انگیز خوشگوار تعلقات تھے وہ تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ آپ اپنے فرائضِ خلافت کی انجام دہی میں جتنے سرگرم عمل تھے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ ان ذمہ داریوں کے شدید احساس سے، جن کا بارِ خلافت کے منصبِ عظیم نے آپ کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ آپ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے کہ مبادا آپ کے قدم غلط راستے پر پڑ جائیں اور اس طرح خدانخواستہ ملک و قوم کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ عدل و انصاف کے قیام، مظالم کی روک تھام اور حدود و شریعت کی نگہداشت کے لیے آپ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

جب آپ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور صحابہؓ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک ایسے آدمی کو مقرر فرما دیں جو آپ کے بعد خلافت کا بار اپنے دوش پر اٹھائے تو آپ نے اس معاملہ پر غور کیا۔ لیکن آپ کی نظر میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اس بارِ عظیم سے عہدہ بر آ ہونے کی پوری پوری قابلیت رکھتا ہو، جو ہر قسم کے پیش آمدہ خطرات کا استقلال کے ساتھ مقابلہ اور ملک پر پوری طاقت سے کنٹرول کر سکتا ہو۔ رہ رہ کر اُن کی نظر حضرت علیؓ پر پڑتی تھی اور وُہ سمجھتے تھے کہ اگر صحابہؓ میں سے کسی شخص کو یہ عہدہ تفویض کیا جا سکتا ہے تو وہ علیؓ ہیں۔ مگر حضرت علیؓ کے دل میں اہلِ بیت کی جو غیر معمولی وقعت تھی اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں میرے بعد علیؓ بنی ہاشم کو عامۃ المسلمین کے سروں پر مسلط نہ کر دیں اور حکومت جو جمہور کا حق ہے وُہ بنی ہاشم ہی میں محدود ہو کر نہ رہ جائے اور اس طرح ایک ایسی فضا قائم ہو جائے جس کا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وجود تک نہ تھا۔

انتہائی غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلافت کسی ایک شخص کو تفویض نہیں کرنی چاہیے۔ یہ حق ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے جنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بابرکت زمانہ پایا اور جن میں سے اکثر نہایت زیرک اور معاملہ فہم تھے۔ وہ فیصلہ کریں کہ اس عہدہ کا مستحق صحیح معنیٰ میں کون ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی دلیل یہ تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کوئی جانشین مقرر کیے بغیر وفات پا گئے۔ صحابہ کرامؓ نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو اپنا خلیفہ چُن لیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ وفات پانے لگے تو اُنھوں نے صحابہؓ کے مشورہ سے عمرؓ کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا، تو عمرؓ کو یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ وُہ خلافت کو کسی ایک شخص تک محدود نہ رکھے بلکہ اس کو مشورہ کے لیے ایک مجلس کے سپرد کر دے اور وہ مجلس یہ فیصلہ کرے کہ کون شخص خلافت کا حقدار ہے۔ اس طرح اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرنے کا موقعہ بھی مل جائے گا کہ آپ نے اپنے بعد کسی خاص شخص کو خلافت کے لیے مقرر نہیں فرمایا بلکہ اس معاملہ کو جمہور پر چھوڑ دیا۔

بیشک حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ کو اس کام کا پوری طرح اہل سمجھا اور ان کو نامزد کر دیا، لیکن

حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی نظروں میں اس اہم ترین عُہدہ کے لیے موزوں ہو۔ بے شک حضرت علیؓ کو باقی صحابہؓ پر فوقیت حاصل تھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اہلِ بیت کے متعلق، اپنے قبیلہ بنو ہاشم کے متعلق اور والیِ سلطنت کے حقوق و اختیارات کے متعلق ان کے خیالات ایسے تھے جن سے حضرت عمرؓ متفق نہ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اس وقت بہترین طریقہ آپ کو یہی نظر آیا کہ مسلمانوں کو اس امر میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کو چاہیں خلافت کے لیے چُن لیں۔

جب حضرت عمر فاروقؓ اپنی رائے کے تمام پہلوؤں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو آپ نے صحابہؓ اور قریش کے معزز اشخاص کو بُلا کر کہا "ان اصحابؓ کے متعلق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وُہ جنتی ہیں:

۱ - علیؓ بن ابی طالب
۲ - عثمانؓ بن عفان
۳ - عبدالرحمٰنؓ بن عوف
۴ - سعدؓ بن ابی وقاص
۵ - زبیرؓ بن العوام
۶ - طلحہؓ بن عبیداللہ

تم آپس میں مشورہ کر کے ان میں سے جس شخص کو چاہو خلافت کے لیے چُن لو اور جو شخص خلیفہ منتخب ہو جائے خلوص و نیک نیتی کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹاؤ اور اس کی مدد کرو۔ خلیفہ بننے والے شخص کو میری نصیحت یہ ہے کہ جس کے سپرد یہ امانت کی جائے وہ اس امانت کا حق بطریقِ احسن ادا کرے۔"

اسی وقت حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب حضرت علیؓ سے ملے اور ان سے کہا "میری رائے یہ ہے کہ تم مجوزہ چھ آدمیوں کی کمیٹی میں شامل نہ ہو۔"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "میری یہ مجال نہیں ہے کہ میں خلیفۂ وقت کے احکام کو ٹھکراؤں اور وُہ مجھ سے جو توقع رکھتے ہیں اس کے خلاف کروں۔"

اس پر حضرت عباسؓ نے ان سے کہا "تمھاری مرضی۔ لیکن اس کا نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہ نکلے گا اور آخر الامر تمھیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

حضرت عباسؓ کی حضرت علیؓ کو یہ نصیحت ذرا تفصیل اور تشریح کی محتاج ہے۔ حضرت عباسؓ نہایت زیرک، دانا اور معاملہ فہم انسان تھے۔ جو بات کہتے تھے پُورے سوچ بچار کے ساتھ اور حالات پر نگاہ رکھتے ہوئے کہتے۔ اگر انھیں یہ محسوس نہ ہوتا کہ قوم حضرت علیؓ کو نظر انداز کر کے کسی دُوسرے شخص کو اپنا امیر اور حاکم بنا لے گی، تو وہ کبھی حضرت علیؓ سے یہ بات نہ کہتے۔ وُہ جانتے تھے کہ اگر مجلسِ شوریٰ نے باہم فیصلہ کر کے کسی دُوسرے شخص کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا اور حضرت علیؓ بھی اس مجلسِ شوریٰ کے ممبر ہوئے تو یہ براہِ راست ان پر ایک حملہ ہوگا اور اس بات کا ثبوت کہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان حضرت علیؓ کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ وُہ بارِ خلافت

کو اپنے کندھوں پر اٹھائیں۔ اس وقت یہ بات حضرت علیؓ کے لیے انتہائی رنج والم کا باعث ہوگی۔ لیکن اگر وہ اس مجلس سے علٰحدگی اختیار کر لیں اور صحابہؓ حضرت علیؓ کے علاوہ کسی اور شخص کو منتخب کر لیں۔ تب معاملہ کی صورت اور ہو جائے گی۔ اس صورت میں نہ حضرت علیؓ کی طرف سے کھلم کھلا ایثار کا اظہار ہوگا نہ صحابہؓ پر صاف طور سے جانب داری کا الزام لگایا جا سکے گا اور نہ اس وقت حضرت علیؓ ہی کو شدید رنج والم سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسی لیے حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کے لیے احتیاطاً اسی میں سمجھی کہ وہ مندرجہ بالا طریق اختیار کریں اور مجلس شوریٰ میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کر لیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔[1]

جب صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام کو بلایا اور ان سے کہا کہ میں نے بہت کچھ غور و فکر کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم لوگ عوام الناس میں امتیازی حیثیت کے مالک ہو۔ اس معاملہ کا فیصلہ اب مل جل کر تمہیں کو کرنا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت تم سب سے خوش تھے۔ اگر تم درست فیصلہ کرو اور لوگ اس کی مخالفت کریں تو مجھے اس کا ڈر نہیں۔ لیکن اگر اندیشہ ہے تو اس بات کا کہ کہیں تم ہی آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنے لگو اور تمہاری دیکھا دیکھی عوام الناس بھی مختلف دھڑوں میں بٹ جائیں اور علٰحدہ علٰحدہ گروہوں میں تقسیم ہو جائیں۔ تم حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں چلے جاؤ، وہاں آپس میں مشورہ کرو اور اپنے میں سے کسی آدمی کو خلیفہ منتخب کر لو۔

کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مشورہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں نہیں بلکہ کسی قریبی جگہ کیا جائے تاکہ انھیں جلد جلد حالات کا علم ہوتا رہے اور ضرورت پڑے تو مشاورتی مجلس ان سے بھی مشورہ کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ان کا اس دوران میں انتقال ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ تین روز تک مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ اس عرصہ میں صہیبؓ (رومی غلام) امامت کے فرائض سرانجام دیں گے[2] لیکن بغیر خلیفہ کے چوتھا روز نہ ہونے پائے۔ عبداللہ بن عمرؓ کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔ لیکن وہ خلیفہ نہیں بنائے جا سکتے[3] طلحہؓ بن عبید اللہ اس وقت مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے

---

[1] حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی رائے سے اس لیے اتفاق نہیں کیا کہ نہ ان کو ایک لمحہ کے لیے خلافت کی آرزو پیدا ہوئی تھی اور نہ ان کی نیک اور صالح طبیعت ایک منٹ کے لیے یہ گوارا کر سکتی تھی کہ خلیفۂ وقت کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے خواہ اس کے نتیجہ میں ان کی اپنی ذات کو نقصان پہنچے۔ علیؓ وہ مقدس انسان تھا جس نے آنحضرتؐ کی گود میں پرورش پائی تھی پس کس طرح ممکن ہے کہ ایسا شخص خلافت کا متمنی ہو۔ یا اس کے دل کے کسی گوشے میں خلیفہ کے حکم سے انحراف کا خیال پیدا ہو۔

[2] اسلام نے غلاموں کو جو اسلام سے پہلے بدترین مخلوق سمجھے جاتے تھے جس بلند اور اعلیٰ درجہ پر پہنچایا یہ واقعہ اس کی ایک روشن مثال ہے کہ ایک رومی غلام کو خلیفۂ اسلام نے تمام معززینِ قریش کے مقابلہ میں امام الصلوٰۃ مقرر فرمایا مگر کسی ایک نے بھی چوں نہیں کی اور برابر تین روز تک اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ یہ تھا مساوات کا شاندار نمونہ۔

[3] یہ واقعہ سوچنے کے والے کے لیے اپنے اندر بڑا سامانِ بصیرت رکھتا ہے۔ فاروقِ اعظمؓ کو اگر ذرا سی بھی خلافت کی خواہش ہوتی۔ یا وہ اسے کچھ بھی اپنے لیے عزت اور آمدنی کا ذریعہ سمجھتے یا دنیوی شہرت کی ان کو چاہ ہوتی یا عام بادشاہوں کی طرح وہ ایک بادشاہ ہوتے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

متعلق یہ حکم دیا کہ اگر وہ تین روز کے اندر اندر آجائیں تو ان کو بھی شریکِ مشورہ کر لیا جائے۔ لیکن اگر اس عرصہ میں وہ نہ آئیں تو ان کے بغیر ہی فیصلہ کر لیا جائے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق آپ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ان دو میں سے کسی ایک کے متعلق فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر عثمانؓ منتخب ہو گئے تو وہ نرم آدمی ہیں اور اگر علیؓ چُن لیے گئے تو وہ خوش خلق آدمی ہیں اور لوگوں کو صحیح راہ پر چلانے کے ہر طرح قابل۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ، ابوطلحہؓ انصاری کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا: "اے ابوطلحہؓ! کسی وقت اللہ تعالیٰ اسلام کو تمہارے ذریعہ سے عزت دے گا۔ اگر یہ لوگ کوئی فیصلہ نہ کر سکیں تو انصار میں سے پچاس اشخاص لینا اور ان کو مجبور کرنا کہ اپنے میں سے کسی شخص کو منتخب کر لیں۔"

حضرت مقدادؓ بن اسود سے یوں مخاطب ہوئے کہ "جب تم مجھے دفنا چکو تو ان لوگوں کو ایک گھر میں جمع کرنا تاکہ وہ کسی کو خلافت کے لیے چُن لیں۔ عبداللہؓ بن عمرؓ بھی مجلسِ مشاورت میں شامل ہوں۔ ان کے پاس کھڑے رہنا۔ اگر پانچ آدمی کسی شخص پر اتفاق کر لیں۔ لیکن ایک شخص اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دے تو اس کا سر اُڑا دینا۔ اگر چار ممبران کسی ایک کو منتخب کر لیں اور دو اس فیصلے کو نہ مانیں تو تلوار سے ان دونوں کی گردنیں کاٹ دینا۔ اگر تین آدمی ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف تو عبداللہ بن عمرؓ کو حَکم بنانا اور جس فریق کے حق میں وہ فیصلہ دیں وہ فریق اپنے میں سے کسی ایک فرد کو منتخب کر لے۔ لیکن اگر وہ عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ تسلیم نہ کریں تو جس فریق میں عبدالرحمن بن عوف ہوں اس کے ساتھ ہو جانا اور دُوسرے لوگ اگر فیصلہ قبول نہ کریں تو انھیں قتل کر ڈالنا۔"

(۲)

انتخاب

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور سعدؓ بن ابی وقاص کی مجلس ہوئی۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ مدینہ سے باہر تھے۔ وہ آخر وقت تک شرکت نہ کر سکے۔ البتہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کو حضرت فاروق کے اس حکم کے بموجب کہ "ان کو مشورہ میں شریک کر لیا جائے لیکن خلیفہ نہ بنایا جائے" مشورہ میں شریک کر لیا گیا۔

پہلا دن خصوصیت سے بڑا سخت تھا۔ ارکانِ مجلس کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ ہر شخص کی رائے دُوسرے سے مختلف تھی۔ ہر ایک یہ جانتا تھا کہ خلافت کے حق دار صرف دو اشخاص ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ اور

۲۔ حضرت عثمانؓ

(بقیہ حاشیہ ص گزشتہ) تو فوراً اپنے بیٹے کے حق میں وصیت کر جاتے جبکہ بیٹا ہر طرح نہایت لائق و فائق بھی تھا۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے بیٹے کے حق میں وصیت نہ کی بلکہ مجلسِ شوریٰ کے ممبران کو حکم دے دیا کہ "ابن عمرؓ کو خلیفہ منتخب نہ کیا جائے۔" (مترجم)

ان دونوں کی موجودگی میں کوئی اور خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حضرت علیؓ کے طرفدار حضرت علیؓ کی تائید میں لگ گئے اور حضرت عثمانؓ کے طرفدار آپ کے پروپیگنڈے میں مصروف ہو گئے۔ پروپیگنڈے اور اختلاف کا طوفان اتنے زور شور سے جاری تھا کہ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا، اس افتراق و اختلاف کے ہوتے کسی بات کا فیصلہ ہو سکے گا[1]۔

اس وقت حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو یہ بات سوجھی کہ اپنے تئیں درمیان سے نکال لیں اور خلافت کی امیدواری سے دست بردار ہو جائیں۔ اس فیصلہ میں ان کے اس یقین کو بھی دخل تھا کہ خلافت ان کے حصہ میں ہرگز نہیں آسکتی۔ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد وہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان سے ملے اور ان سے اس طرح گفتگو شروع کی :

"تم میں سے کون خلافت سے دست بردار ہونے اور اپنے حق کو اپنے سے بہتر و افضل انسان کے لیے چھوڑ دینے پر تیار ہے ؟"

اس پر سب خاموش رہے اور کسی نے جواب نہ دیا۔ تب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا :

"میں دست بردار ہوتا ہوں۔"

حضرت عثمانؓ نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور کہا :

"اس بات پر سب سے پہلے میں راضی ہوں۔"

باقی لوگوں نے بھی یہی کہا "ہم راضی ہیں۔"

صرف حضرت علیؓ خاموش رہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا :

"ابوالحسن ! تم کیا کہتے ہو ؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا :

"میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ہمیں حق کی پیروی کرنی چاہیے۔ خواہشاتِ نفسانی کو بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ رشتہ داری کا مطلقاً لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا :

"اگر تم لوگ مجھ سے اس بات کا پکا عہد کرو کہ تم میرے فیصلہ کو بخوشی مان لو گے اور جو میں کہوں گا اس پر بلا چون و چرا عمل کرو گے، تو میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی رشتہ داری کا لحاظ اور کسی دوستی کا پاس نہیں کروں گا۔ محض قوم کی بھلائی کو پیشِ نظر رکھ کر اس معاملہ میں صحیح فیصلہ دوں گا۔"

---

[1] بیشک اس موقعہ پر دونوں بزرگوں کے طرفدار اپنے اپنے ممدوح کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایک منٹ کے لیے بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی ایک نے ان لوگوں سے اپنے پروپیگنڈے کے لیے کہا ہو۔ کیونکہ ان کی مقدس روحیں ان آلائشوں سے بالکل پاک تھیں۔ بطور خود جس کا جس نے چاہا پروپیگنڈہ کیا۔ (مترجم)

اس پر تمام رضامند ہو گئے کہ عبدالرحمٰنؓ جو چاہے فیصلہ کر دیں انھیں یہ فیصلہ بلا چون وچرا منظور ہو گا اور جس کو وہ نامزد کر دیں گے اسے اپنا خلیفہ مان لیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بھی ان کے سامنے اس بات کا عہد کیا کہ وہ خلیفہ نامزد کرتے وقت رشتہ داری اور دوستی کا ذرّہ بھر لحاظ کیے بغیر جس کا حق ہو گا، اسی کو تفویض کریں گے۔

جو کام پہلے پوری مجلس شوریٰ کے سپرد تھا اب اس کا سارا بوجھ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف پر آ پڑا۔ ان کے ذمّہ خلافت کے لیے ایک ایسے شخص کو نامزد کرنا تھا، جو اربابِ شوریٰ میں سب سے بہتر اور افضل ہو۔

سب سے پہلے وہ تنہائی میں حضرت علیؓ سے ملے اور ان سے اس طرح گفتگو چھیڑی:

"اپنے دینی مرتبہ اور ہر نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے آپ خلافت کے حقدار ہیں۔ لیکن بالفرض اگر کسی وجہ سے آپ کا انتخاب نہ ہو سکے تو پھر آپ کے نزدیک ان لوگوں میں ترجیح کے لائق کون ہے؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"اس صورت میں میرے نزدیک عثمانؓ کا حق سب سے زیادہ ہے۔"

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف حضرت عثمانؓ سے ملے اور کہنے لگے:

"آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں۔ حضورؐ نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی یکے بعد دیگرے آپ سے کی۔ اور یہ وہ فضیلت ہے جو اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس لیے خلافت کے معاملہ میں آپ کو ترجیح حاصل ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ آپ خلافت کے لیے منتخب نہ ہو سکیں تو پھر آپ کے نزدیک ان لوگوں میں خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: "علیؓ!"

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ، زبیرؓ بن العوام اور سعدؓ بن ابی وقاص سے ملے اور ان سے بھی اسی قسم کی باتیں کیں۔ ان دونوں نے حضرت عثمانؓ کے حق میں رائے دی۔

حضرت علیؓ نے بھی محسوس کر لیا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ سعدؓ سے ملے اور ان سے اپنے حق میں رائے دینے کی اپیل کی۔[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اب راتوں کو مہاجرینؓ، انصارؓ، صحابہ کرامؓ، فوج کے اعلیٰ افسروں اور معززینِ شہر سے

---

[1] مصنف کا یہ بیان صحیح نہیں اور نہ کسی مستند ذریعہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نہ مصنف نے اپنے بیان کی توثیق میں کوئی حوالہ دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ہرگز سعدؓ سے یا اور کسی سے اپنے حق میں رائے دینے یا کوشش کرنے کے لیے نہیں کہا۔ بھلا جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ پرورش پائی ہو۔ جس کی تربیت شروع سے آنحضرتؐ نے خود کی ہو۔ اور جس نے اپنے آقا کا یہ فرمان بارہا سنا ہو کہ "جو شخص کسی عہدہ کا طلبگار ہو وہ عہدہ اسے نہ دیا جائے"۔ وہ بھلا کس طرح اس قسم کی ناواجب خفیہ کارروائیاں کر سکتا تھا؟ (مترجم)

مشورہ کرنا شروع کیا۔ جس سے ملتے وہی حضرت عثمانؓ کی حمایت کرتا۔ جب وہ رات آئی جس کی صبح کو آخری فیصلہ ہونا تھا تو عبدالرحمٰن، مسورؓ بن مخرمہ کے گھر پہنچے۔ ان کو سوتے سے جگایا اور کہا:

"زبیرؓ اور سعدؓ کو بلاؤ۔"

وہ ان دونوں کو بلا لائے۔ اس وقت جب عبدالرحمٰنؓ نے زبیرؓ سے اس معاملہ کے متعلق گفتگو کی تو انھوں نے کہا:

"اب میری رائے یہ ہے کہ خلافت حضرت علیؓ کو تفویض کرنی چاہیے۔"

سعدؓ نے بھی یہی کہا۔

اگر مورخین کے بیان کردہ واقعات صحیح مان لیے جائیں تو اس وقت زبیرؓ اور سعدؓ دونوں نے اپنی رائے بدل لی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد انھیں حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ زیادہ صلاحیتوں کے مالک نظر آئے ہوں۔ کیونکہ حضرت علیؓ اپنی سیرت میں حضرت عمرؓ سے بہت مشابہ تھے۔ ان میں بھی حق و صداقت کے بارے میں وہی سختی اور وہی شدت تھی جو حضرت عمرؓ میں تھی۔ یہ بھی دنیا سے اسی طرح دُور بھاگتے تھے جس طرح حضرت عمرؓ۔ دُوسری طرف حضرت عثمانؓ کے مزاج میں نیکی اور نرمی کا پہلو غالب تھا جس کی وجہ ان کا بڑھاپا تھا[1]۔ بڑھاپے کی وجہ سے حضرت عثمانؓ تنہا کام بھی نہ کر سکتے تھے۔ انھیں دُوسرے کی مدد اور مشورہ کی ضرورت پڑتی تھی[2]۔

شاید ان دونوں کو یہ بھی خیال تھا کہ مددگار صحیح طور پر کام نہیں کر سکتے۔ اور مشیر ضروری نہیں کہ صحیح مشورہ ہی دیں۔ اس لیے ان کے مشورہ پر کلیۃً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ بعید نہیں کہ جن اسباب نے ان دونوں کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا، ان میں یہ خوف بھی شامل ہو کہ کہیں حضرت عثمانؓ کی کمزوری اور نرم خوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی امیہ کو یہ موقع نہ مل جائے کہ وُہ ملک پر اپنا تسلط جمالیں اور امورِ حکومت میں انہی کا غلبہ ہو جائے۔

شروع میں اُنھوں نے حضرت عثمانؓ کے حق میں جو رائے دی تھی اس وقت ان کا خیال یہ ہوگا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت کی سختی کے بعد اب کسی نرم اور رقیق القلب خلیفہ کی ضرورت ہے لیکن غور و فکر کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہو کہ امورِ سلطنت کو انجام دینے، اسلام کو صحیح طور پر قایم رکھنے اور اس کو چار دانگِ عالم میں پھیلانے کے لیے حضرت عمرؓ جیسی سخت گیری ہی کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت سعدؓ سے جو اپیل کی تھی اس کا ان پر اثر ہوا ہو اور انھوں نے اس

---

[1] نیکی اور نرم مزاجی حضرت عثمانؓ کے مزاج میں بڑھاپے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وُہ شروع ہی سے نہایت درجہ نیک فطرت اور نرم دل واقع ہوئے تھے۔

[2] ضرورت پڑنے پر دُوسرے شخص سے مدد لینا یا اس سے مشورہ کرنا اگر کمزوری کی علامت ہے تو اس سے کوئی بھی خلیفہ بچا ہوا نہیں۔ صدیقِ اکبرؓ، فاروقِ اعظمؓ سے مشورہ لیتے تھے اور فاروقِ اعظمؓ ہر بات حضرت علیؓ سے پُوچھ کر کرتے تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں: لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ۔ (اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گیا ہوتا)۔ مترجم

اثر کے ماتحت اپنی رائے تبدیل کر لی ہو۔

رات کے آخری حصہ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کو بلا بھیجا اور ان سے بڑی لمبی گفت گو کی۔ باتیں کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ صبح کی نماز کے بعد اراکینِ مجلسِ مشاورت جمع ہوئے۔ ادھر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مہاجرین اور انصار کے اہلِ علم اور صاحبِ فضل حضرات کے ساتھ ساتھ افسرانِ فوج کو بھی بلا بھیجا۔ چنانچہ سب جمع ہوئے اور مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس مسئلہ خلافت پر لوگوں کی آرا طلب کیں۔ حضرت عمارؓ بن یاسر نے کہا:

"اگر یہ بات مدِنظر رکھی جائے کہ مسلمانوں میں تفرقہ اور اختلاف پیدا نہ ہونے پائے تو سب سے بہتر بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی بیعت کر لی جائے۔" مقدادؓ بن الاسود نے اس کی تائید کی۔

اس کے بعد عبداللہؓ بن ابی سرح کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

"اگر یہ بات مدِنظر ہو کہ قریش میں اختلاف و انشقاق پیدا نہ ہو تو حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنی چاہیے۔"

عبداللہ بن ابی ربیعہ نے اس کی تائید کی۔ اس پر عمارؓ نے ابن سرح سے کہا: تم مسلمانوں کو نصیحت کرنے والے کہاں سے آئے!

اس مرحلہ پر بنی ہاشم اور بنی امیہ کے کچھ لوگ آپس میں تکرار کرنے لگے۔ بنی ہاشم کی خواہش تھی کہ حضرت علیؓ کی بیعت کی جائے۔ اور بنی امیہ چاہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کو خلافت سپرد کی جائے۔ اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب سعدؓ بن ابی وقاص بولے:

"عبدالرحمٰن! اس سے پہلے کہ لوگ فتنہ میں پڑیں، تم اس کام سے فراغت حاصل کر لو۔ بہتر ہے کہ تم اپنا فیصلہ سنا دو۔"

چنانچہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف اُٹھے اور کہنے لگے:

"میں نے بہت غور و فکر سے کام لیا ہے اب میں جو فیصلہ دُوں گا لوگوں کو چاہیے کہ وہ بغیر کسی انقباض کے کھلے دل سے قبول کر لیں اور اس بارے میں میری طرف سے کسی قسم کی بدگمانی کو اپنے دل میں راہ نہ پانے دیں۔"

اس کے بعد انھوں نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ اگر آپ کو خلیفہ بنا دیا جائے تو کیا آپ کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"ان شاء اللہ میں حتیٰ المقدور اس پر پُوری طرح عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر اُنھوں نے حضرت عثمانؓ کو بلایا اور جو بات حضرت علیؓ سے کہی تھی وہی ان سے کہی۔ حضرت عثمانؓ نے بھی وہی جواب دیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ان کی بیعت کر لی اور اپنا ہاتھ جو عثمانؓ کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا چھت کی طرف اٹھایا اور کہنے لگے:

"اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ اس وقت تک جو کچھ میرے اختیارات تھے میں نے وہ عثمانؓ کی طرف منتقل کر دیے ہیں۔"

اس پر حضرت علیؓ کہنے لگے کہ یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہمیں گرانے کی کوشش کی ہے اچھا ہم صبر کرتے ہیں اور سارا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔"[1]

[1] ہرگز یقین نہیں آتا کہ علیؓ جیسے متقی، پرہیزگار، کامل الایمان اور دنیا سے دل برداشتہ انسان کے منہ سے ایسے کلمات نکلے ہوں۔ (مترجم)

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا:

"علیؓ! اپنے دل میں اس کے متعلق کوئی خیال نہ لاؤ۔ میں نے اس معاملہ میں بہت سوچا، لوگوں سے تفصیلی مشورہ کیا اور خوب غور وفکر اور صلاح ومشورہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خلافت کا بار عثمانؓ ہی کو سونپا جائے۔ عامۃ المسلمین بھی زیادہ تر عثمانؓ ہی کے حق میں تھے۔"

حضرت علیؓ مسجد سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے:

سیبلغ الکتاب اجلہ [1]

مقدادؓ نے کہا:

"عبدالرحمٰن! تم نے علیؓ کو چھوڑ دیا حالانکہ علیؓ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ حق کے مطابق فیصلہ کرتے اور عدل وانصاف کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا:

"مقداد! میں نے جس شخص کو مسلمانوں کے لیے بہتر پایا اسی کو نامزد کیا۔ تم اس وقت چپ رہو، خدا سے ڈرو، کیونکہ ایسی باتوں سے فتنہ وفساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علیؓ تھوڑی دیر بعد ہی مسجد میں تشریف لے آئے تھے اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی تھی۔

طبری میں روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت میں توقف کیا تھا جس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی تھی:

ومن نکث فانما ینکث علیٰ نفسہ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً۔ (فتح)

یعنی جو شخص اپنے اقرار کو توڑے گا، اس کا وبال اس پر پڑے گا، اور جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اللہ اسے عنقریب بڑا اجر دے گا۔

اس پر حضرت علیؓ بھیڑ کو چیرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور ان کی بیعت کر لی [2]

---

[1] یہ محض من گھڑت قصہ ہے اور حضرت علیؓ کے کسی دشمن کی اختراع ہے۔ جب شروع ہی میں مجلس شوریٰ کے تمام ممبروں نے کہہ دیا تھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف جو فیصلہ کر دیں ہمیں منظور ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کا یہ طعنہ زنی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

[2] اس موقعہ پر سوال صرف یہ ہے کہ کیا یہ آیت علیؓ جیسے ہوشمند، واقف علم القرآن اور وارث علوم نبوی کے ذہن میں پہلے سے نہ تھی وعدہ کا ایفا تو معمولی شخص بھی ضروری سمجھتا ہے علیؓ کی شان تو بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ (مترجم)

(۴)

انتخاب کا پس منظر

گزشتہ صفحات میں قارئین کرام کسی قدر تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بن عفان کو خلیفۃ المسلمین منتخب کرنے کے سلسلہ میں مجلس مشاورت کے ارکان نے کیا کچھ کیا۔ ان واقعات کے بعد اب ہم وہ اسباب بیان کرتے ہیں جن کے زیر اثر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی۔

اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے حضرت عثمانؓ کی بیعت اس وجہ سے کر لی ہو کہ حضرت عبدالرحمٰن رشتہ میں ان کے بہنوئی تھے[۱]۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کثرتِ رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں ہو (اور جیسا کہ واقعات بتاتے ہیں وجہ یہی تھی) اس کا بھی امکان ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کو حضرت عثمانؓ کے عہد و پیمان سے اس بات کا اطمینان ہو گیا ہو کہ وہ بنی امیہ کو عامۃ المسلمین کے سروں پر مسلط نہیں کریں گے۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ اپنے بعد انھیں خلیفہ نامزد کر دیں گے[۲]۔ خلافت ملنے کے وقت حضرت عثمانؓ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے بیعتِ عثمانؓ کے بعد مسجد میں اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔

اگرچہ یقینی طور پر اس روایت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے قریش کے معاملے میں اتنی سختی سے کام لیا تھا کہ ان میں سے کوئی شخص بھی دنیوی جاہ و حشمت اور مال و منال میں خاطر خواہ حصہ یاب نہ ہو سکا۔ حضرت علیؓ بھی عزم و استقلال، عدل و انصاف، دنیوی اغراض سے بے تعلقی اور دینی احکام پر بہ شدت عمل پیرا ہونے میں حضرت عمرؓ کی مثال تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ میں رواداری پائی جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان صفات کی وجہ سے حضرت عثمانؓ لوگوں میں ہر دلعزیز ہو گئے ہوں اور یہی امر ان کی خلافت کا باعث بنا ہو۔ لوگوں کو یہ خیال ہو گا کہ اب ان کو حضرت عمر فاروقؓ کی سی سخت گیر پالیسی سے سابقہ نہیں پڑے گا۔ وہ آسانی سے دنیا کما سکیں گے۔ اس کے لذائذ سے بہرہ ور ہو سکیں گے اور انھیں اسلامی فتوحات سے خاطر خواہ متمتع ہو جانے کا موقع مل سکے گا۔ کوئی تعجب نہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی لوگوں کی اس رائے میں ان کے شریک ہوں اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ وہ شروع ہی سے یہ سوچ کر حضرت عثمانؓ کی طرفداری کر رہے ہوں کہ یہ تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے مزاج میں اگر در خور حاصل کر لیا جائے تو آئندہ خلافت کے سلسلہ میں اپنے لیے راہ ہموار کی جا سکتی ہے[۳]۔

یہ بات صاف ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو یقین ہو گیا کہ خواہ کوئی صورت ہو جب تک حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ

---

[۱] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امّ کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط سے شادی کی تھی۔ ام کلثوم حضرت عثمانؓ کی بہن ہیں ان کی والدہ کی طرف سے

[۲] مصنف کا یہ قول غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ بیان کردہ اس وجہ کا کوئی تاریخی یا کتابی ثبوت موجود نہیں۔

[۳] ایک جلیل القدر صحابی کے متعلق، جس نے از خود اپنے آپ کو خلافت سے الگ کر دیا ہو۔ ایسا خیال کسی صورت میں بھی درست نہیں۔ (مترجم)

موجود ہیں وُہ خلافت حاصل نہیں کر سکتے تو انھوں نے اپنے آپ کو خود ہی امیدوارانِ خلافت سے علٰحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ساتھ ہی یہ پیشکش بھی کر دی کہ وُہ حق و انصاف کی رُو سے مسلمانوں کے لیے خلیفہ منتخب کرنے کو تیار ہیں جس کو قبول کر لیا گیا۔ اگرچہ حضرت عثمان رضی ان کے رشتہ دار تھے لیکن پھر بھی ان کے انتخاب کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس لیے کہ وُہ نہایت جلیل القدر صحابی تھے اور مسلمانوں میں نہایت اعلیٰ پوزیشن کے مالک۔ مزید برآں وُہ نہایت نرم دل انسان تھے اور حضرت فاروق رضی کی طرح سختی کا جذبہ ان میں نہ تھا حضرت عمر رضی کے بعد مسلمان چاہتے تھے کہ انھیں اس سخت گیری سے چھٹکارا ملے، جو خلیفہ ثانی کے عہدِ خلافت میں ان کو برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اور ان دنیوی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے جن سے وہ آج تک محروم تھے۔ وُہ اپنے آپ میں بھی اس تہذیب کے جلوہ گر دیکھنے کے خواہشمند تھے جس کی جھلک عظیم الشان تہذیب و تمدن رکھنے والی حکومتوں کو فتح کرنے کے بعد وُہ دیکھ رہے تھے لیکن اس سے حقیقی فائدہ حاصل کرنے کا ان کو موقع نہ مل سکا تھا۔

مورخین کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پہلی دو راتوں کو لوگوں کے پاس جا جا کر اس مسئلہ میں ان سے مبادلۂ خیال کرتے رہے۔ وہ بھیس بدل کر مدینہ کی گلیوں میں گشت لگاتے اور لوگوں سے اس کے متعلق دریافت کرتے۔ کوئی مہاجر، کوئی انصاری یہاں تک کہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی ایسا باقی نہ رہا جس سے انھوں نے اس بارہ میں پُوچھا نہ ہو یا مشورہ نہ لیا ہو۔ اہل الرائے حضرات کے پاس وہ مشورہ طلب کرنے والے کی حیثیت سے جاتے رہے اور دُوسروں سے وہ ایک عام آدمی کی طرح پُوچھتے رہے کہ ہمارے خیال میں حضرت عمر رضی کے بعد کون خلیفہ ہونا چاہیے؟ جس شخص سے بھی انہوں نے مشورہ طلب کیا یا اس بارہ میں کچھ پُوچھا اس نے حضرت عثمان رضی ہی کے حق میں جواب دیا۔ جب انھوں نے حضرت عثمان رضی کے متعلق عامۃ الناس کا اتفاق دیکھا تو لوگوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی ہی کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کر لیا[1]

حضرت عثمان رضی کے بارہ میں جمہور کے اتفاق کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہو کہ اگر قریش کے دوسرے خاندانوں میں خلافت رہے گی تو وہ کسی ایک خاندان سے مخصوص ہو کر نہیں رہے گی لیکن اگر وہ بنی ہاشم میں چلی گئی تو پھر نا ممکن ہے کہ بنی ہاشم اسے اپنے ہاتھوں سے نکلنے دیں۔

غرضیکہ ہماری نظر میں یہی عوامل ہیں جو حضرت عثمان رضی کی خلافت میں معین ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں قریش اور عامۃ المسلمین میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ لوگ طبعی طور پر دنیوی نعمتوں سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے کی تنگی ترشی اٹھانے پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت حسن بصری حضرت عثمان رضی کے اوائلِ خلافت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"میں نے حضرت عثمان رضی کو خطبہ دیتے ہُوئے سُنا۔ میں اس وقت بلوغت کے قریب تھا۔ میں نے آپ سے زیادہ

---

[1] اس صورت کے موجود ہوتے ہوئے پھر کیوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی نیت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آیندہ فائدہ اٹھانے کے لیے حضرت عثمان رضی کو نامزد کیا۔ (مترجم)

پاک وصاف اور آپ کے چہرے سے زیادہ حسین چہرہ نہیں دیکھا۔ آپ فرماتے :

"اے لوگو! تم غریبوں کے واسطے عطیے اور صدقے لاؤ۔"

اور لوگ آپ کے سامنے عطیوں اور صدقوں کا ڈھیر لگا دیتے۔ آپ فرماتے کہ :

"لوگو! غربا کے لیے کپڑے لاؤ۔"

لوگ کثرت سے آپ کے پاس کپڑے لاتے اور آپ ان کو غربا میں بانٹ دیتے۔ آپ فرماتے کہ :

"لوگو! غربا کے لیے خوشبوئیں لاؤ۔"

تو لوگ ہر قسم کی خوشبوئیں عطر، مشک اور عنبر وغیرہ آپ کی خدمت میں لاتے اور آپ ان کو غربا میں تقسیم فرما دیتے۔" جنگوں کی تکلیف اور لڑائیوں کی شدت کے بعد اسی قسم کی چیزیں لوگ چاہتے تھے اور اسی قسم کی چیزیں حضرت عثمانؓ ان کو دیتے بھی تھے۔[۱]

(۴)

عہدِ فاروقی

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں عام مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت سے بالکل مختلف تھی حضرت عمرؓ کے دور میں اسلام ضعف و ناتوانی کی حالت سے نکل کر طاقت، قوت اور شوکت کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ تمام جزیرۂ عرب میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا کلمہ پڑھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو عرب میں کلی اقتدار حاصل ہو چکا تھا اور ان کی حکومت اچھی طرح مضبوط ہو چکی تھی۔ جاہلیت میں افتراق و انشقاق، قتل و غارت اور لڑائی جھگڑوں کی جو کیفیت عربوں پر طاری تھی وہ ایک قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ جہالت کے جو تاریک پردے ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے ملکی نظم و نسق میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ دور ہو چکے تھے۔ رسومِ جاہلیت مٹ چکی تھیں۔ وہ قوم جو اپنی جہالت اور درندگی کی وجہ سے بالکل وحشیوں کی مانند تھی اب اعلیٰ درجہ کی مدبر اور مہذب قوم بن چکی تھی۔ بلند پایہ سیاست دانوں، اہلِ بصیرت، ماہرینِ قانون اور مذہبی لحاظ سے ممتاز لوگوں کی ان میں کمی نہ تھی۔ یہ بھوکی اور ننگی قوم جس کا گزارہ محض اونٹنیوں کے دودھ اور صحرا کی کھجوروں پر تھا چند ہی دنوں میں ترقی کے اس مرتبہ پر پہنچ گئی تھی کہ نہ گزشتہ قومیں اس کی مثال پیش کر سکیں اور نہ معاصر طاقتیں ترقی کی دوڑ میں اس کی گرد کو پا سکیں۔

عربوں کے تنِ مُردہ میں از سرِ نو جان پڑ چکی تھی۔ ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ قوم کا ہر فرد بشر قومی اتحاد کے

---

[۱] آہ! یہ کیسے انسان تھے جنھوں نے ایسے نیک دل، اتنے غریب نواز اور اس قدر فرشتہ صفت بزرگ کے خلاف فساد برپا کر کے خدا کی ناراضی حاصل کی۔ (مترجم)

نشہ سے سرشار تھا۔ ان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ چکی تھی کہ آج دنیا کی کوئی قوم سربلندی اور رفعت و شان میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آئندہ چل کر ہماری قوم ہی سب قوموں کی رہبر بنے گی۔ ہمیں کو اصلی طاقت، شوکت اور قوت حاصل ہوگی اور ہم ہی دنیا کے سردار تسلیم کیے جائیں گے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں سب سے زیادہ مدد دی۔ عرب کے قریبی ملکوں یعنی فارس و روم کی طرف ان کی افواج قاہرہ کا ایک سیلاب عظیم اُمڈ پڑا تھا۔ ان کے گھوڑوں نے ایسے ایسے شہروں کو اپنی ٹاپوں تلے روند ڈالا تھا جن کے نام بھی ان کے ذہنوں میں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رُوئے زمین کا بہت بڑا حصہ ان کے زیرِ نگیں آ گیا۔ بڑی با جبروت بادشاہتوں سے (جن کی طرف پہلے کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مجال نہ تھی) عرب ٹکرائے اور ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ تاریخ عالم کا یہ عجیب و غریب ورق اور کتابِ زندگی کی یہ ایک حیرت ناک داستان ہے جس نے آج تک مورخین کو حیران و ششدر کر رکھا ہے۔ یہ ایک سربستہ راز ہے جس کی تہ کو اب تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔

ایران پر عرب کے لوگ آندھی کی طرح چھا گئے۔ آلِ ساسان کو اُنھوں نے اس بُری طرح تباہ کیا کہ پھر ان میں اٹھنے کی سکت بالکل نہ رہی۔ سلطنتِ روما کی طرف رُخ کیا تو اس کو پامال کرتے ہُوئے گزر گئے۔ الجزیرہ، شام، آرمینیہ، مصر اور برقہ میں رومی اقتدار کو ملیا میٹ کر کے وہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ان کے قدم ہر لحظہ آگے ہی کی طرف اُٹھتے تھے اور فتح و نصرت قدم قدم پر انہیں کے پاؤں چومتی تھی۔ بڑے بڑے لشکر جو اس وقت کے جدید ترین آلاتِ حرب سے لیس تھے، اپنی طاقت اور تعداد کے نشہ میں چُور، مسلمانوں کی بے سروسامان فوج کے مقابلے میں آئے۔ لیکن ان کی طاقت و تعداد، اور ان کا غرور و تکبر ان کے کسی کام نہ آیا۔ ہر بار ان کو منہ کی کھانی پڑی اور کبھی انھیں فتح مندی اور کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

عرب کے ہمسایہ ممالک میں مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھوں جور و استبداد کی بنیادیں بہت گہری ہو گئی تھیں۔ غلامی وہاں کے باشندوں کی قسمت بن گئی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایرانیوں اور رومیوں میں خود اپنے اوپر سے اعتماد اُٹھ چکا تھا اور شخصی آزادی کی محبت کے وہ شعلے ان کے دلوں میں سرد پڑ چکے تھے، جو زندگی کی راہوں میں انھیں سرگرم سفر رکھ سکتے تھے۔ اس کے برخلاف عرب طبعاً شخصی آزادی کے بیحد دلدادہ تھے۔ آزادیٔ رائے اور حریتِ افکار کا عشق ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ انھیں یہ تک گوارا نہ تھا کہ ان کا حاکم اور امیر بھی ان سے کسی چیز میں فوقیت اور برتری رکھے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے امرأ پر بہت سخت احتساب قایم کر رکھا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

"اگر کسی شخص پر اس کے حاکم نے ظلم کیا تو وہ حاکم ہرگز حکومت کرنے کا اہل نہیں ہے۔"

عرب نہ صرف خود آزادی کے نشہ میں سرشار تھے بلکہ اُنھوں نے مفتوحہ ممالک کے لوگوں میں بھی ایک نئی رُوح پھونک دی تھی اور ان کو بھی شخصی آزادی کی حلاوت و شیرینی سے ذوق آشنا کر دیا تھا۔ اُنھوں نے مفتوحین کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ شہری حقوق میں ان کا مرتبہ کسی طرح بھی امرأ کے مرتبہ سے کم نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ایک مصری کو حضرت عمرو بن العاص گورنرِ مصر سے کچھ تکلیف پہنچی۔ وہ شخص مدینہ آیا اور حضرت عمرو بن العاص کے لڑکے سے ملا۔ انھوں نے اپنے والد اور ان کے مرتبہ و بزرگی کا لحاظ کیے بغیر اس شخص کو حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا دیا۔ جہاں انھوں نے اس کی معروضات سنیں

اور داد رسی فرمائی۔

رعایا کا ہر فرد حقیقی مساوات کی لذت سے بہرہ اندوز تھا۔ اس وسیع اسلامی سلطنت میں رہنے سہنے والے انسان کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ سوا اس شخص کے جو اعمالِ صالحہ اور تقویٰ و طہارت میں اس سے ممتاز ہے۔ اور کوئی شخص کسی حیثیت سے اس پر فضیلت نہیں رکھتا۔

جب عرب ان اقوام سے ملے جو ان کے لیے بالکل اجنبی تھیں تو انھوں نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان مملکت ان کے سامنے ہے۔ ان کی آنکھیں ایک جدید تہذیب کی روشنی سے آشنا ہوئیں جس نے عربوں کو، ان کے فاتح ہونے کے باوجود مرعوب کر دیا اور ان کے دلوں میں اس تہذیب کو اپنا لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اخلاق و عادات میں اپنے ہمسایہ ممالک کی تقلید شروع کر دی اور اس طرح زندگی کے میدانِ کارزار میں ان کا دوسری اقوام سے مقابلہ شروع ہوا۔

عربوں کو سب سے پہلے جن چیزوں کی تقلید کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ لڑائیوں کے نت نئے ڈھنگ اور وہ جدید آلاتِ حرب تھے جن سے رومی اور ایرانی جنگوں میں کام لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ امورِ سیاست اور ملکی انتظام کی طرف متوجہ ہوئے اور جو طریقے انھوں نے اپنی مفتوحہ قوموں سے سیکھے تھے وہی اپنی مملکت میں رائج کرنے شروع کر دیے۔ روم اور ایران کی حکومتوں میں جو دفتری نظام رائج تھا اسے سامنے رکھ کر حضرت عمرؓ نے بھی ہر محکمہ کا علٰحدہ علٰحدہ دفتر قائم کیا۔ اس کے بعد آپ نے ولایات کی ترتیب، تقسیم کار، عمّال کے انتخاب اور وظیفوں کے تعین کی طرف توجہ مبذول کی۔ مفتوحہ ممالک سے جو خراج آتا تھا اس کو خرچ کرنے کے بہتر سے بہتر طریقے اختیار کیے۔ امن اور عدل و انصاف کے قیام کی طرف توجہ دی۔ ٹیکس کے اصول اس طرح وضع کیے کہ نہ رعایا پر کوئی بار پڑے اور نہ حکومت کے خزانہ کو کوئی نقصان پہنچے۔ مملکت کے طول و عرض میں فارغ البالی اور خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ فاتحینِ اسلام پر مال و دولت کے دروازے کھل گئے اور ہر قسم کا آرام ان کو میسر آ گیا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن اس پر بھی حضرت عمرؓ کے خوف اور ان کے شدید احتساب کی وجہ سے لوگوں کو کھانے پہننے کے معاملہ میں اپنے اوپر بعض سختیاں عائد کرنی پڑتی تھیں اور زندگی گزارنے کے لیے حدِ اعتدال میں رہنا پڑتا تھا۔ حضرت عمرؓ اسراف اور فضول خرچی کو کسی صورت سے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اس بارے میں وہ بہت سختی سے کام لیتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں عربوں کو اس بات کا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ عیش و عشرت، آرام و راحت، شان و شوکت اور سکون و طمانیت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ جتنی تیزی سے وہ مدنی زندگی اور شہری معیشت اختیار کرتے جا رہے تھے اتنی ہی تیزی سے لڑائیوں کے محاذ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت بھی اس امر کی تھی کہ لڑائیوں کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر کے دشمن پر فتح پائی جائے۔ اگر اس طرف سے وہ ذرا بھی غفلت برتتے تو دشمنوں کی فوجیں موقع سے فائدہ اٹھا کر سارے عرب کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتیں۔ لہٰذا مسلمان اپنے عیش و آرام سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن اسی طرف متوجہ ہو گئے اور عیش و آرام کو کسی اور مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ حضرت عمرؓ کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی سیاست کا یہ اثر تھا کہ آپ کے جیتے جی ملت میں افتراق و انشقاق، بغض و عداوت اور نفرت و حقارت کو کوئی راہ نہ

مل سکی ۔ ملتِ اسلامیہ کے تمام افراد موتیوں کی طرح ایک لڑی میں منسلک تھے جو کوئی اس لڑی کو کھولنے اور اس کے دانوں کو بکھیرنے کی کوشش کرتا تھا اس کی سزا موت تھی۔

لڑائیوں کی طرف ہمہ تن متوجہ رہنے اور مسلمانوں کے ملکوں ملکوں پھیل جانے سے ایک بڑا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ یہ امر لازمی تھا کہ پہلے مسلمانوں کے دلوں میں دین خوب اچھی طرح راسخ ہو جاتا اور عوام کو اسلام اور اس کے اصولوں سے اچھی طرح روشناس کرا دیا جاتا تاکہ بعد کو ان کے ایمان میں کمزوری راہ نہ پا سکتی، ان میں کسی قسم کی بے راہ روی نہ پھیل سکتی۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جبکہ مسلمان ہر قسم کے تفکرات اور مہمات سے آزاد ہو کر اپنی اپنی جگہ ٹکے رہتے اور دینی تعلیمات سے فیض یاب ہوتے رہتے۔ پر ایسا نہ ہو، بلکہ اس سے پہلے کہ دین ان کے دلوں میں اچھی طرح جاگزین ہوتا وہ فتوحات کی غرض سے دُور دراز ممالک میں پھیل گئے اور صحیح طور پر دینی تربیت حاصل نہ کر سکے۔

اسلام کا بڑا مقصد دنیا سے بُت پرستی کو مٹانا اور خدا کی وحدانیت کو صحیح طور پر دنیا میں قائم کرنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ مفتوحہ ممالک کے باشندے بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں ——— اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی ——— بہت سی مشرکانہ رسوم موجود تھیں اور شرک کا کلّی طور پر استیصال نہ ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں ——— خصوصاً عجمی مسلمانوں ——— میں عقاید کے لحاظ سے اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ بدعتیں پھیلنے لگیں اور اس سے فائدہ اٹھا کر کئی منافق اور بدطینت لوگوں نے بظاہر اسلام قبول کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا۔

بہت ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کا پہلے یہ خیال ہو کہ اوّل اوّل ان فتوحات سے فراغت حاصل کر لی جائے جو انتہائی ضروری ہیں تاکہ اس فتنہ و فساد کا بالکل خاتمہ ہو جائے جس کا فرو کرنا ان متحارب اقوام پر قابو پائے بغیر ناممکن تھا۔ دُوسرے میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی جو تڑپ اور امنگ عربوں کے دلوں میں مدتوں سے تھی، وہ پُوری ہو جائے۔ تیسرے ان تمام معاند جماعتوں کا سدّباب کر دیا جائے جو جزیرۂ عرب کے اطراف میں آباد تھیں اور جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ اگر ان پر فتح حاصل نہ کی گئی تو ان کے جھگڑے سرکشی اور بغاوت کا رنگ اختیار کر لیں گے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ دشمن قوت حاصل کر سکے اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے عربوں پر غلبہ پا سکے، سب سے پہلا کام یہی کیا گیا کہ اس کا سر کچل دیا گیا۔ جب یہ مدعا پُورا ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے چاہا کہ اب فتوحات میں میانہ روی اختیار کی جائے اور ان عربوں کو جو سالہا سال سے جنگوں میں مصروف تھے کچھ آرام کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ لیکن ابھی ان کا یہ ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہونے پایا تھا کہ انھیں بروقت اس امر کا احساس ہُوا کہ متحارب اقوام جن سے عربوں نے معاہدات کیے تھے اپنے معاہدات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے صریح عہد شکنیوں پر اتر آئی ہیں اور انھیں اپنے وعدہ اور قول و قرار کا پاس نہیں رہا۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ایران پر مکمل طور سے قبضہ کر لیں اور رومیوں کو شام کی حدود سے پرے دھکیل دیں۔

ان سب باتوں کے باوجود حضرت عمرؓ کی یہ دلی خواہش تھی کہ عرب ان ہی فتوحات پر اکتفا کریں جو شروع میں انھوں نے ایران و روم میں حاصل کی تھیں، مزید فتوحات کا خیال چھوڑ دیں۔ اطمینان سے اپنی اپنی جگہ ٹک کر زراعت و تجارت وغیرہ کا

شغل اختیار کریں اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو جائیں تاکہ ان کے اندر اسلام کی صحیح رُوح پیدا ہو جائے۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو پُورے طور پر جذب کر سکیں اور اس طرح بدعت و ضلالت اور فتنہ و فساد کے خیالات کی ان کے ذہنوں تک رسائی نہ ہو سکے۔

یہ تھے وہ عوامل جو حضرت عثمانؓ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے وقت ملک میں کارفرما تھے۔ ہم نے ان کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ یہ آئندہ ابواب کے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو سامنے رکھے بغیر حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں صحیح طور سے تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۵)

حضرت عثمانؓ بن عفّان

حضرت عثمانؓ اموی تھے اور بنی عبدالشمس بن عبد مناف سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام عفان اور والدہ کا نام اروی تھا۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے:

عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن اُمیہ بن عبدالشمس بن عبد مناف بن قصی القرشی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب آپ سے عبد مناف پر جا کر ملتا ہے۔ آپ کی کنیتیں تین تھیں:

۱۔ ابو عبداللہ

۲۔ ابو عمرو

۳۔ ابو لیلیٰ

آپ اصحاب الفیل کے واقعہ کے چھ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

اروی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبدالشمس بن عبد مناف۔

اروی کی والدہ البیضا اُم حکیم بن عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور آنحضرتؐ کے چچا حضرت ابو طالب کی سگی بہن تھیں۔

حضرت عثمانؓ تاجر تھے۔ آپ تجارت کے سلسلہ میں اکثر شام آیا جایا کرتے تھے۔ خدا نے آپ کی تجارت میں بڑی برکت دی تھی اور آپ کا شمار قریش کے نہایت مالدار اشخاص میں ہوتا تھا۔ لوگ آپ کو ملک التجار کہتے تھے۔

باوجود مالدار ہونے کے آپ میں کبر و نخوت اور غرور و تکبر نام کو نہ تھا بلکہ آپ بڑے خوش اخلاق، پاکیزہ سیرت، انتہائی عفیف اور پرہیزگار انسان تھے۔

آپ کو ان چند خوش قسمت صحابہؓ میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے جو اوائلِ اسلام میں ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

پر ایمان لاکر آپ کی غلامی کا طوق اپنے گلوں میں ڈال چکے تھے۔ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ گہرے تجارتی تعلقات تھے جس کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان مضبوط رشتۂ مودت و اخوت بھی قائم ہوگیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ان پہ کامل اعتماد اور بھروسا ہونے کی بنا پر انھوں نے اس دعوت کو فوراً قبول کر لیا اور حلقہ بگوشانِ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چوتھا تھا۔

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اخلاق و عادات اس قدر پسند آئے کہ آپ نے ان کے اسلام لانے کے بعد اپنی صاحبزادی رُقیہؓ کا نکاح ان سے کر دیا۔ جب قریش نے مسلمانوں کو تکالیف پہنچانی شروع کیں تو آپ حضرت رُقیہ کو لے کر حبشہ ہجرت کر گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر واپس مکہ تشریف لے آئے۔ جب مدینہ کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ بھی حضرت رقیہؓ کے ہمراہ مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت رقیہ نے عین اسی دن وفات پائی جس دن اللہ تعالیٰ نے معرکۂ بدر میں مسلمانوں کو کفار پر فتحِ عظیم دی تھی (۲ھ) حضرت عثمانؓ اس جنگ میں حاضر نہیں تھے لیکن حضرتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مالِ غنیمت میں سے اتنا ہی حصہ دیا جتنا جنگِ بدر میں شریک ہونے والوں کو ملا تھا۔

حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحب زادی حضرت اُمِ کلثومؓ کا نکاح بھی انہی سے کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سفر و حضر، جنگ و صلح غرضیکہ کسی حالت میں بھی علٰحدہ نہ ہوتے تھے۔ صُلحِ حدیبیہ کے موقع پہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تھا کیونکہ حضورؐ کو معلوم تھا کہ قریش ان کے حُسنِ اخلاق کی بنا پر ان کا بہت ادب و احترام کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ آپ انتہائی پاکیزہ اخلاق کے مالک اور بڑے سخی تھے۔ خدا کی راہ میں اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے آپ ہر موقع پر اپنا مال و اسباب بے دریغ لٹاتے رہتے تھے۔ جیش العسرۃ کے موقع پر لشکر کی تیاری کے لیے آپ نے اتنا خرچ کیا کہ اور کوئی اس کی مثال پیش نہ کر سکا۔ آپ نے اس موقعہ پر ایک ہزار اونٹ اور پچاس گھوڑے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے۔ روایت ہے کہ جب حضرت عثمانؓ مع ایک ہزار دینار کے یہ سارا سامان لیے ہوئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرطِ مسرت سے دیناروں کو الٹنا پلٹنا شروع کیا اور فرمایا کہ آج کے بعد عثمانؓ جو کریں گے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اس کی راہ میں کس طرح کھلے دل سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔

مدینہ میں میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا جو بئرِ رومہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا اور وہ اس کا پانی اہلِ مدینہ کے ہاتھوں بڑی گراں قیمت پہ فروخت کرتا تھا جس کے باعث مسلمان بڑی تکلیف میں تھے۔ ایک روز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بئرِ رومہ خرید لے اور اس کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دے تو میں اس کے لیے جنّت کا

وعدہ کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ فوراً اس یہودی کے پاس گئے اور اس سے بئرِ رومہ کے متعلق بات چیت کی۔ اس نے سارا کنواں بیچنے سے تو انکار کر دیا لیکن نصف بیچنے پر رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے بارہ ہزار دینار میں آدھا کنواں خرید کر اس کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ معاملہ اس شرط پر ہوا تھا کہ ایک روز یہودی کو پانی بھرنے کا حق ہوگا اور دوسرے روز عثمانؓ کو۔ جب حضرت عثمانؓ کی باری ہوتی تو مسلمان دو روز کا پانی اکٹھا بھر لیا کرتے اور دوسرے روز یہودی کے پاس کوئی پانی خریدنے نہ آتا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر یہودی بہت گھبرایا اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ بقیہ نصف کنواں بھی آپ ہی خرید لیں۔ چنانچہ آٹھ ہزار درہم میں اس کا بھی معاملہ ہو گیا اور حضرت عثمانؓ نے وہ کنواں مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عثمان کاتبِ وحی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں آپ ان کے امین اور کاتب یعنی پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ جب حضرت عمرؓ کو شہید کیا گیا تو مجلسِ شوریٰ نے آپ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ یہ یکم محرم ۲۴ھ مطابق ۷ نومبر ۶۴۴ء اتوار کے دن کا واقعہ ہے۔

حضرت عثمانؓ کے سریر آرائے خلافت ہوتے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے سارے مدینہ میں ہیجان برپا ہو گیا حضرت عبید اللہ بن عمرؓ نے ہرمزان سابق حاکمِ ایران اور ایک عیسائی غلام جفینہ کو اپنے والد کو شہید کرنے کے شبہ میں قتل کر دیا۔ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ کو پتہ چلا تھا کہ ہرمزان سابق حاکمِ فارس (جس نے اسلام لانے کے بعد مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی) اور جفینہ نصرانی حضرت عمرؓ کے شہید کیے جانے سے پہلے ایک دن آپ کے قاتل ابو لؤلؤ کے ساتھ خاص سرگوشی میں مصروف تھے اس پر انھوں نے یہ خیال کر کے کہ یہ دونوں ان کے والد کی شہادت میں شریک تھے ان دونوں کو طیش کی حالت میں قتل کر دیا۔

عبد الرحمٰن بن ابی بکر بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان تینوں کو ایک جگہ آپس میں سرگوشی کرتے دیکھا، یہ ان کے پاس گئے۔ ان کو دیکھ کر وہ تینوں کھڑے ہو گئے اور گھبراہٹ میں ایک دو دھاری خنجر ان کے کپڑوں میں سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ جب اس خنجر کو دیکھا گیا جس سے حضرت عمرؓ پر حملہ کیا گیا تھا تو وہی خنجر تھا جو عبد الرحمٰن بن ابی بکر نے دیکھا تھا جب حضرت عبید اللہؓ بن عمرؓ نے یہ واقعہ سنا تو ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے والد کی شہادت ان تینوں کی سازش اور اشتراکِ عمل سے ہوئی ہے۔ جب تک حضرت عمرؓ زندہ رہے ابنِ عمر ضبط کیے رہے۔ لیکن جب آپ کی وفات ہو گئی تو شمشیر بدست پہلے ہرمزان کے پاس گئے اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد جفینہ کے پاس گئے اور اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت سعد بن ابی وقاص نے مداخلت کر کے زبردستی ان کو روکا اور ان کے ہاتھ سے تلوار چھین کر انھیں ان کے گھر میں بند کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ کی بیعت ہو چکی تو آپ نے عبید اللہ بن عمر کو بلایا اور ایک مجلس میں جہاں مہاجرین و انصار بیٹھے تھے، پوچھا:

"بتلاؤ اب ابن عمر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"میری رائے یہ ہے کہ آپ ان کو قتل کر دیں"

اس پر بعض مہاجرین کہنے لگے کہ حضرت عمرؓ کل شہید کر دیے گئے اور ان کے بیٹے کو آج قتل کر دیا جائے، یہ کس طرح

ہوسکتا ہے؟

حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا:

"امیرالمومنین! اگر یہ واقعہ آپ کے عہدِ حکومت میں ہوتا تو آپ کو بیشک انھیں قصاص میں قتل کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اب ایسی صورت نہیں ہے۔ یہ واقعہ آپ کے عہدِ حکومت میں نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے ہی ہوچکا تھا اس لیے اب آپ بری الذمہ ہیں۔"

یہ بات حضرت عثمانؓ کے دل کو بھی لگ گئی آپ نے فرمایا کہ:

"میں ان مقتولوں کا ولی ہوں اس لیے ان کی دیت اپنے ذمہ لیتا ہوں اور اپنے مال میں سے ادا کردوں گا۔"

بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ حضرت عبید اللہ بن عمرؓ شرعی نقطۂ نگاہ سے قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے یہ فعل قصاص کے طور پر کیا تھا کیونکہ یہ بات تب کہی جا سکتی تھی جب وہ اصل قاتل کو قتل کرتے لیکن انھوں نے ان لوگوں کو قتل کیا جو حضرت عمرؓ کے قاتل نہیں تھے۔ کوئی ایسا شرعی ثبوت بھی موجود نہیں ہے جس سے ان کا اس قتل میں اشتراک ثابت ہو۔ قصاص تب واجب ہوتا ہے جب قتل کے تمام و کمال ثبوت موجود ہوں۔ قاتل اپنی زبان سے اقرار کرے اور حاکمِ وقت قصاص کا حکم دے۔ لیکن ان قرائن سے جو اس وقت پائے گئے ہرگز قصاص واجب نہیں ہوتا اور نہ شریعت ان قرائن کی موجودگی میں حد جاری کرتی اور سزا دیتی ہے۔ اس لیے ان حالات و واقعات کی موجودگی میں عبید اللہ بن عمرؓ سے قصاص لینا واجب تھا۔

حضرت عمروؓ بن العاص کا اس امر کی طرف اشارہ کرنا کہ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کی حکومت سے پہلے ظہور پذیر ہوا تھا۔ عبید اللہ بن عمرؓ کی بریت کے لیے کافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر حضرت عمرؓ زندہ ہوتے اور ان کے سامنے ان کے بیٹے یہی حرکت کرتے تو وہ ان پر لازماً شرعی حد جاری کرتے اور اس میں کسی رُو رعایت کو دخل نہ دیتے۔ لیکن حضرت عثمانؓ بعض مہاجرین کی طرح یہ نہ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ کے شہید کیے جانے کے معاً بعد ان کا لڑکا بھی قتل کر دیا جائے اور ان کی خلافت کا آغاز گزشتہ خلیفہ کے لڑکے کے قتل سے ہو۔ اس واسطے اُنھوں نے اس اُلجھن سے نکلنے کے لیے حضرت عمرو بن العاص کی رائے پر عمل کیا۔ حضرت عمرو بن العاص ایسے معاملات میں بڑے مدبّر اور اس قسم کی الجھنوں کے حل کرنے میں بڑے ماہر تھے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہرمزان کو مشتبہ حالت میں دیکھا گیا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کی سرشت میں بدعہدی سرایت کر چکی تھی اور اس قسم کے کئی واقعات اس سے پہلے اس سے سرزد ہوچکے تھے، پھر اس کے متعلق جو کچھ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے بیان کیا تھا، ان سب کی روشنی میں اس بات کے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہرمزان، ابو لؤ لؤ اور جفینہ اس قتل میں برابر کے شریک تھے اور اگرچہ خاص واقعۂ قتل میں تینوں کا حصہ نہ بھی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس ناپاک ارادہ سے بے خبر نہیں تھے اور ان کو تمام سازش کا پوری طرح علم تھا۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ کی بیعت ہوچکی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ اُنھوں نے خطبہ دینا چاہا مگر ان کی زبان نے یاوری نہ کی اور وہ خطبہ نہ دے سکے۔

خلیفہ بننے کے بعد حضرت عثمانؓ نے مملکتِ اسلامیہ کے سب امرا اور عمال کے نام ایک خط لکھا جس کی عبارت

یہ تھی:

اما بعد فان اللہ امر الائمہ ان یکونوا رعاۃ ولم یتقدم الیھم ان یکونوا جباۃ ۔ و ان صدر ھذہ الامۃ خلقوا رعاۃ ولم یخلقوا جباۃ ۔ ولیوشکن ائمتکم ان یصیروا جباۃ ولا یکونوا رعاۃ ۔ فاذا عادوا کذالک انقطع الحیاء والامانۃ والوفاء ۔ الا وان اعدل السیرۃ ان تنظروا فی امور المسلمین وفیما علیھم فتعطوھم مالھم وتاخذوھم بما علیھم ثم تعتنوا بالذمۃ فتعطوھم الذی لھم وتاخذوھم بالذی علیھم ثم العدو الذی تنتابون فاستفتحوا علیھم بالوفاء۔

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ نے حاکموں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ امت کے نگہبان بنیں۔ محض خراج جمع کرنے والے نہ بنیں۔ اوائل اسلام کے لوگ نگہبان تھے، محض خراج جمع کرنے والے نہیں تھے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم لوگ نگہبانیٔ امت کے فرائض کو چھوڑ کر کہیں صرف خراج جمع کرنے میں نہ لگ جاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو حیا، امانت اور وفا سب تم سے رخصت ہو جائے گی۔ بہترین عدل یہ ہے کہ تم مسلمانوں کے امور میں غور کرو۔ جو ان کا حق تم پر ہے وہ انھیں دو اور جو تمہارا حق ان پر ہے وہ ان سے لو۔ پھر ذمیوں کا جو حق تم پر ہے وہ انہیں دو اور تمہارا جو حق ان پر ہے ان سے لو۔ اس کے بعد دشمن کی طرف متوجہ ہو اور اس پر فتح پاؤ لیکن جو اس سے وعدہ کرو وہ ضرور پورا کرو۔"

سرحدوں پر فوجیں پڑی تھیں ان کے افسروں کو یہ خط لکھا:

اما بعد فانکم حماۃ الاسلام وذادتھم وقد وضع لکم عمر مالم یغب عنا بل کان عن ملأ منا ۔ ولا یبلغنی عن احد منکم تغییر ولا تبدیل فیغیر اللہ بکم ویستبدل بکم غیرکم ۔ فانظروا کیف تکونون فانی انظر فیما الزمنی اللہ النظر فیہ والقیام علیہ۔

(ترجمہ) "تم اسلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے بچانے والے اور اس کے محافظ ہو۔ حضرت عمرؓ نے تمہارے لیے جو ضابطہ مقرر کیا تھا وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خبردار! مجھے تم میں سے کسی کے متعلق یہ خبر نہ پہنچے کہ اس کی سرشت میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ تمہاری بجائے دوسرے بہترین آدمیوں کو لے آئے گا۔ تم اپنی حالتوں پر نظر کرتے رہا کرو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمہ کیا ہے میں اس کی نگہداشت کروں گا اور اس پر مضبوطی سے قائم رہوں گا۔"

عمالِ خراج کو اس مضمون کا خط لکھا:

اما بعد فان اللہ خلق الخلق بالحق فلا یقبل الا الحق خذوا الحق واعطوا الحق بہ والامانۃ بالامانۃ ۔ قوموا علیھا ولا تکونوا اول من یسلبھا فتکونوا شرکاء من بعدکم

الیٰ ما اکتسبتم والوفاء بالوفاء۔ لاتظلموا الیتیم و لا المعاهد فان اللہ خصمہ لمن یظلمهم۔

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ حق ہی کو قبول کرتا ہے۔ حق لو اور اس کے بدلے میں حق ہی دو۔ امانت، امانت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس پر مضبوطی سے قایم رہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جو امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ اس طرح تم اپنے بعد آنے والے خائنوں کے ساتھ شریک ہو گے۔ وفا، وفا کے ساتھ ہوتی ہے تم یتیم پر اور جس کے ساتھ معاہدہ کیا ہو اس پر ظلم نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دشمن ہے جو ان لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔"

عامۃ المسلمین کو یہ پیغام دیا :

امّا بعد فانما بلغتم ما بلغتم بالاقتداء والاتباع فلا تلفتنکم الدنیا عن امرکم فان امر هٰذہ الامۃ صائر الی الابتداع بعد اجتماع ثلاث فیکم۔ تکامل النعم۔ و بلوغ اولادکم من السبایا۔ وقراءۃ الاعراب والاعاجم القرآن و قد قال رسول اللہ "الکفر فی العجمۃ فاذا استعجم علیهم امر تکلفوا و ابتدعوا۔"

(ترجمہ) "تمہیں اقتدا اور اتباع کا حکم ہے مجھے ڈر ہے کہ تمہیں دنیا کی محبت تمہارے فرائض سے ہٹا نہ دے۔ کیونکہ تین چیزوں کے جمع ہو جانے کے بعد یہ امت بدعتوں کی طرف راغب ہونا شروع کر دے گی۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں :

۱۔ نعمت کا کامل ہونا۔

۲۔ تمہاری اولادوں کا کنیزوں کے بطن سے ہونا۔

۳۔ اعرابیوں اور عجمیوں کی علٰحدہ قرأت۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، عجمیت میں کفر کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جب عجمیت مسلمانوں پر غالب آ جائے گی تو وہ تکلف اور بدعتیں کرنے لگیں گے۔"

حضرت عمرؓ کے اواخر عہد اور حضرت عثمانؓ کے اوائل عہد میں سلطنت اسلامیہ کے مختلف شہروں کے مندرجہ ذیل امیر تھے :

جزیرۂ عرب:

مکہ : نافع بن عبد الحارث الخزاعی

طائف : سفیان بن عبد اللہ الثقفی

صنعاء : یعلیٰ بن منیہ

جند : عبد اللہ بن ابی ربیعہ

بحرین اور اس کا متعلقہ علاقہ : عثمان بن ابی العاص الثقفی

کوفہ : مغیرہ بن شعبہ } عراق
بصرہ : ابو موسیٰ اشعری

دمشق : معاویہ بن ابی سفیان } شام
حمص : عمیر بن سعد

مصر : عمرو بن العاص

(۶)

آرمینیا میں فتوحاتِ اسلامیہ

حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت میں اسلامی فوجیں ایران میں داخل ہو رہی تھیں۔ سلطنتِ روما پر حملہ کر رہی تھیں۔ مصر پر دھاوا بول رہی تھیں۔ لیکن ان فتوحات میں سے کوئی بھی تکمیل کو نہ پہنچی تھی۔ ایک نہ ایک لشکر اسلامی فوج کو دیارِ فارس میں داخل ہونے سے باز رکھنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتا تھا۔ شام اور اطرافِ اناطولیہ کا بھی یہی حال تھا اور افریقہ کی فتوحات تو ابھی تھیں ہی ابتدائی حالت میں۔

عہدِ فاروقی میں مسلمانوں نے تمام شام کو فتح کر لیا تھا یہاں تک کہ وہ اناطولیہ (ٹرکی) اور آرمینیا[1] کی حدود تک پہنچ گئے تھے مورخینِ عرب کہتے ہیں کہ عربی لشکر نے آرمینیا پر دو بار فوج کشی کی۔ پہلی بار حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور دوسری بار حضرت عثمانؓ کے عہد میں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں، آرمینیا کی فتح سنہ ۲۰ھ میں ہوئی تھی اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں سنہ ۲۶ھ میں۔

ایک ضروری امر قابلِ ذکر یہ ہے کہ بکیر بن عبداللہ اور عتبہ بن فرقد نے خلافتِ عمرؓ کے زمانہ میں آذربائیجان کو فتح کر لیا تھا جو آرمینیا کے مشرق میں واقع ہے۔ بکیر نے حضرت عمرؓ کو فتح کی خوشخبری بھیجی۔ حضرت عمرؓ نے سراقہ بن عمرو کو باب اور دربند پر چڑھائی کرنے اور حبیب بن سلمۃ الفہری کو سراقہ کی (جو اس وقت جزیرہ میں تھے) مدد کے لیے حکم دیا۔ جب سراقہ باب کی فتح سے فارغ ہوئے تو آپ نے امراء اور سالارانِ افواج کو آرمینیا کے اردگرد کے علاقے کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ بکیر بن عبداللہ کو موقان کی طرف۔ حبیب بن سلمہ کو تفلیس کی طرف۔ حذیفہ بن یمان کو بلادِ قوقاز اور کوہستانِ قوقاز کی طرف ان علاقوں کے لوگوں[2]

---

[1] آرمینیا کا محلِ وقوع حسب ذیل ہے۔ شمال میں بحرِ متوسط اور گرجستان، مشرق میں گرجستان اور ایران کا کچھ حصہ۔ جنوب میں کردستان اور مغرب میں ایشیائے کوچک۔ یہ محلِ وقوع آج کل کے جغرافیہ کے لحاظ سے ہے۔ لیکن ابتدائی ایام میں بعض اور علاقے بھی آرمینیا میں شامل تھے۔ چنانچہ عربوں نے بلادِ قوقاز اور کردستان کے ایک حصّہ کو بھی آرمینیا میں شامل کر رکھا تھا۔ اسی وجہ سے مورخینِ عرب نے قائم کی فتح کی طرح قوقاز کی فتح کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کو آرمینیا ہی میں شامل سمجھا۔

اسلامی افواج کا مقابلہ کیا لیکن بے سُود۔ اس کے بعد سالارانِ عساکر مغربی آرمینیا اور آئیبریا کی طرف (جو موجودہ گرجستان کا ایک حصّہ ہے) متوجہ ہوئے۔ حبیب بن مسلمہ نے تفلیس اور اس کے تمام بڑے بڑے شہر فتح کر لیے۔ اسی اثنا میں سراقہ کی وفات ہوگئی اور ان کی جگہ عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو مقرر کیا گیا۔ ان کو حضرت عمرؓ نے باب کی سرحد پر ٹھہر جانے اور ترکوں سے لڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وُہ شہر باب سے گزرتے ہُوئے شمال کی طرف بڑھتے چلے گئے اور بحیرۂ خزر کے ساحل پر اکثر کوہستانی شہروں نے ان کی اطاعت قبول کرلی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں انہوں نے شہادت پائی۔ ان کی فتوحات کا دائرہ مشرقی آرمینیا میں قوقاز کے شمالی علاقوں تک وسیع ہوگیا تھا۔

یہ سب فتوحات حضرت عمرؓ کے عہد میں ۱۸ھ سے لے کر ۲۱ھ تک مکمل ہوگئیں مگر یہ فتوحات پائیدار اور مضبوط بنیادوں پر نہ تھیں۔ بلکہ ان علاقوں کے رہنے والوں نے جزیہ دینے کی شرط قبول کر لی تھی اور سلطنتِ اسلام کے مطیع ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ ان پر مکمل قبضہ کر کے وہاں امن بحال کر سکتے اور صرف اپنی ہی عملداری قائم کر سکتے۔

باقی رہا ان علاقوں کو مطیع کرنے کا سوال تو اس کی غرض صرف یہ تھی کہ ان اقوام کو مرعوب کیا جائے جو عرب کے اردگرد آباد تھیں تاکہ وہ اسلامی شہروں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔ ایسا پہلے ہو بھی چکا تھا کہ دریائے ترک پر خزری جماعتوں نے سر اٹھایا اور چونکہ عربوں کی تعداد یہاں بہت کم تھی اس لیے انہوں نے ان کو آرمینیا سے نکال دیا۔ لیکن مسلمان ۲۶ھ مطابق ۶۴۶ء میں ایک زبردست جمعیت کے ساتھ پھر حملہ آور ہوئے اور اس علاقہ پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ اسی سال حضرت عثمانؓ نے ان شہروں کو جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے، اسلامی مقبوضات میں شامل کرنے اور آرمینیا اور قوقاز کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے حبیب اور سلمان کو بھیجا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے تمام چھنا ہوا علاقہ دوبارہ اسلامی سلطنت میں شامل کر دیا۔ گو درمیان میں تھوڑے عرصہ کے لیے وہاں بغاوت کی آگ بھڑکی لیکن پھر مسلمانوں کی سلطنت اس علاقہ میں خوب مستحکم ہوگئی۔

جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں آرمینیا میں بغاوت ہوئی تو ۲۶ھ (۶۴۶ء) میں آپ نے حضرت معاویہ بن سُفیان کو جنہیں آپ شام اور جزیرہ کا گورنر بنا چکے تھے حکم دیا کہ وہ دوبارہ آرمینیا پر چڑھائی کریں۔ حضرت معاویہ نے حبیب بن مَسلَمَة الفھری کو جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی آرمینیا پر چڑھائی کر چکے تھے، چھ ہزار فوج دے کر وہاں بھیجا۔ حبیب بن مَسلمہ نے قالیقلا کا محاصرہ کر لیا۔ جب شہر والوں کو ہر طرف سے مدد پہنچنی بند ہوگئی تو وُہ مجبوراً اس شرط پر صلح کے طالب ہوئے کہ اگر ان کو امان دے دی گئی تو وہ جزیہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ یہ شرط قبول کر لی گئی۔ قالیقلا کو سر کر لینے کے بعد وہاں کے کئی باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا کیونکہ وہ سخت فتنہ پرداز اور فسادی تھے۔

حبیب نے قالیقلا کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے نظم ونسق کی درستی اور اپنی پوزیشن کے استحکام کی طرف توجہ دی۔ اسی اثنا میں انھیں یہ خبر پہنچی کہ آرمینیا کے بطریق "موریان" نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے زبردست فوج اکٹھی کی ہے۔ حبیب نے حضرت عثمانؓ کو کمک بھیجنے کے لیے لکھا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کو حکم دیا کہ شام اور جزیرہ کے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے کر حبیب کی مدد کے لیے بھیجو۔ چنانچہ اُنھوں نے دو ہزار آدمی بھیجے جن کو حبیب نے قالیقلا میں ٹھہرایا اور ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں۔ حضرت عثمانؓ نے سعید بن عاص امیرِ کوفہ کو بھی لکھا کہ وہ سلمان بن ربیعہ کی سرکردگی میں ایک لشکر حبیب کی

مدد کے لیے بھیجیں۔ سلمان بڑے بہادر، صاحبِ عزم و ہمت اور جنگی چالوں کے زبردست ماہر تھے۔ وہ کوفہ سے چھ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر چلے اور دریائے فرات پر پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔

ادھر جب حبیب کے پاس کمک پہنچنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے سوچا کہ دشمنوں پر شبخون مارنا چاہیئے تاکہ ان کے حملہ سے قبل انہیں مرعوب کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شبخون مار کر دشمن کو تہس نہس کر دیا اور رومیوں کے سردار کو قتل کر ڈالا۔

اس معرکہ میں عورتوں نے بھی بہادری اور جوش و ہمت کے زبردست کارنامے سر انجام دیئے۔ چنانچہ جس رات لشکرِ اسلام نے رومی لشکر پر شبخون مارا تو حبیب کی بیوی اُمّ عبداللہ کلبیہ نے اپنے خاوند سے پُوچھا:

"اب کہاں کا قصد ہے؟"

حبیب نے جواب دیا:

"موریان بطریق روم کے خیمہ کا یا جنت کا۔"

حبیب کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب وہ بطریق کے خیمہ پر پہنچا تو اپنی بیوی کو وہاں موجود پایا۔

عورتوں کی شجاعت کی یہ ایک مثال نہیں ہے بلکہ عربوں کی ابتدائی فتوحات کے زمانہ میں عورتیں ہر جنگ میں مردوں سے پیش پیش رہتی تھیں اور مردوں کو بہادری، جرأت، اخلاص اور قربانی کے سبق سکھاتی تھیں۔

اس معرکہ کے بعد کوفہ کی فوجیں بھی حبیب کی مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ اب حبیب نے سوچا کہ وہ اپنے لشکر کو مغربی آرمینیا کی فتح کے لیے آگے بڑھائیں۔ ادھر سلمان نے مشرقی آرمینیا کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ ان دونوں کی ہمت و کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ حبیب شمالی آرمینیا میں قوقاز کے علاقہ تک پہنچ گئے اور مسلمانوں نے مشرقی آرمینیا میں بحرِ خزر (جس کو بحرِ طبرستان بھی کہا جاتا ہے) تک پہنچ کر دم لیا۔

(۷)

ایران میں فتوحات

ایران کی حدود خلفائے راشدین کے عہد میں موجودہ ایران کی حدود سے بہت وسیع تھیں۔ اس زمانہ میں بلوچستان، افغانستان، آذربائیجان، کردستان اور مشرقی آرمینیا کا وہ حصہ جو بحرِ قزوین سے ملتا ہے سب مملکتِ ایران میں شامل تھے۔ مسلمانوں نے اس کے اکثر حصہ کو فتح کر لیا تھا اور ان علاقوں میں جو عرب کی سرحد سے ملتے تھے مسلمانوں کی پائدار سلطنت قائم ہو گئی تھی لیکن وہ علاقے جو عرب کی سرحد سے دُور تھے وہاں مسلمانوں کا قبضہ اور تسلط مستحکم نہ تھا۔ بعض حصے ایسے بھی تھے جہاں عہدِ فاروقی میں مسلمان پہنچے بھی نہ تھے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے تیسرے سال کُردوں نے بغاوت کی تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس بغاوت کو فرو کرنے

اور باغیوں کو مغلوب کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی لیکن ساتھ ہی یہ کام بھی کیا کہ اپنا سارا مال و متاع چالیس خچروں پر بار کر لیا۔

اہلِ بصرہ یہ دیکھ کر کہ ہمارے حاکم کے پاس اس قدر ساز و سامان ہے، بہت سیخ پا ہوئے اور ان کے ایک وفد نے حضرت عثمانؓ سے جا کر سارا قصہ بیان کیا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ابوموسیٰؓ کو ان کے عہدہ سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر قرشی کو مقرر کیا جو اس وقت پچیس سال کے تھے نیز ابوموسیٰ اور عثمان بن ابی العاص والیِ عمان و بحرین کا سارا لشکر عبداللہ بن عامر کی زیرِ سرکردگی کر دیا۔ عبداللہ نے عبیداللہ بن معمر کو خراسان سے ہٹا کر فارس بھیج دیا اور خراسان کا والی عمر بن عثمان بن سعد کو بنا دیا۔ یہ تبدیلیاں کرنے کے بعد انھوں نے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرغانہ تک پہنچ گئے۔ دوسرے امراء کو بھی انہوں نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اس طرح مسلمانوں کا لشکر چین کی حدود تک جا پہنچا۔

کچھ عرصہ بعد اہلِ فارس نے عبیداللہ بن معمر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اصطخر کے مقام پر دونوں فریقوں کا مقابلہ ہوا، جس میں عبیداللہ مارے گئے۔ جب یہ خبر ابن عامر کو پہنچی تو وہ ایک لشکر لے کر فارس کی طرف روانہ ہوگئے۔ اصطخر کے مقام پر ایرانیوں کی فوجوں سے ان کا مقابلہ ہوا جس میں ایرانیوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اصطخر کو فتح کرنے کے بعد ابن عامر نے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا اور جور کے شہروں کو فتح کیا۔ اس اثنا میں اصطخر والوں نے پھر بغاوت کر دی۔ ابن عامر لوٹے اور اصطخر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ طویل عرصہ تک جاری رہا۔ آخر منجنیقوں کے ذریعہ شہر پر سنگ باری کر کے اس کو فتح کر لیا۔ اس جنگ میں ہزاروں ایرانی مارے گئے۔

ان فتوحات سے فارغ ہو کر ابن عامر بصرہ واپس ہوئے۔ ابھی وہ بصرہ پہنچے بھی نہ تھے کہ انھیں خراسان میں بغاوت کی خبریں ملیں۔ وہ زیاد کو بصرہ میں اپنا قایم مقام بنا کر خراسان کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ سجستان کو فتح کرنے کے لیے ربیع بن زیاد حارثی کو اور کرمان کو مغلوب کرنے کے لیے مجاشع بن مسعود سلمی کو مقرر کیا۔ اس کے بعد نیشاپور روانہ ہوئے۔ ہراول دستہ پر احنف بن قیس کو متعین کیا۔ سب سے پہلا مقابلہ "طبسین" پر ہوا۔ یہ دو قلعے تھے اور خراسان کے لیے دروازوں کا کام دیتے تھے۔ ان کو فتح کرنے کے بعد فوج کے سرداروں کو نیشاپور کے علاقوں کی طرف روانہ کیا اور انھوں نے اس کے اردگرد کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔

احنف بن قیس طخارستان کی طرف چلے۔ پہلے سواد بخرد پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے تین ہزار درہم پر صلح کر لی۔ پھر مروالروز کی طرف رُخ کیا۔ پہلے تو وہاں کے باشندے مقابلہ میں آئے۔ لیکن پھر صلح کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے بلخ نامی قصبہ پر قبضہ کر لیا۔

جب اہلِ طخارستان نے دیکھا کہ احنف بڑھتے ہی چلے آتے ہیں تو انہوں نے ایرانیوں اور ترکوں پر مشتمل ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا۔ احنف نے ان کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست فاش دی۔ اس کے بعد وہ بلخ کی طرف روانہ ہوئے جو طخارستان کا دار الحکومت تھا اور اس کو بھی فتح کر لیا۔

باقی سردارانِ فوج میں سے مجاشع بن مسعود سلمی کرمان گئے۔ پہلے انہوں نے دار الحکومت سیرجان کو فتح کیا۔ اس کے

بعد ارد گرد کے شہروں اور علاقوں پر حملے کرنے شروع کیے۔ ربیع بن زیاد حارثی سجستان پہنچے اور تمام علاقہ فتح کرلیا۔ عبداللہ بن حازم نے قارن کا رُخ کیا اور اسے فتح کرلیا۔

اہلِ جرجان اور اہلِ طبرستان خلفاء راشدین کے تمام عہدِ حکومت میں یہاں تک کہ دولت امویہ کے اوائل عہد تک بغاوتوں اور سرکشیوں میں مصروف رہے۔ ان کو سلیمان بن عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں یزید بن مُہلّب نے پُوری طرح مطیع کیا۔

ابن عامر اتنی بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد خدا تعالیٰ کے اس احسان کے شکریہ کے طور پر حج کے لیے روانہ ہوئے اور سارا راستہ پیدل طے کیا۔

عہدِ عثمانؓ کا ایک قابلِ ذکر واقعہ ایران کے یزدجرد کسریٰ کا قتل ہے۔ وُہ مسلمانوں کے لشکروں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اور دوبارہ اپنی فوجوں کو اسلامی لشکر پر حملہ کرنے اور اپنے آبا و اجداد کا ملک واپس لینے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ لیکن وُہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل کی وجوہ میں مورخین کا زبردست اختلاف ہے۔ سیدیو کہتا ہے کہ شہنشاہِ چین نے پہلے تو یزدجرد کی مدد کی۔ لیکن پھر اس کو مرغاب کے کنارے قتل کرا دیا۔

یزدجرد کے قتل سے اس ساسانی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس نے ایران پر تین سو انتیس سال تک بڑی شان و شوکت اور رُعب و دبدبہ کے ساتھ حکومت کی تھی۔

(۸)

رومی سلطنت میں فتوحات

مشرقی روم میں اسلامی فتوحات کچھ عرصہ تک رُکی رہیں۔ رومی لوگ اس درمیانی وقفہ میں اور حضرت عمرؓ کی شہادت سے پہلے زبردست تیاریوں، سرحدوں کو مضبوط اور اپنے اندرونی خلفشار کو دور کرنے میں لگے رہے، اس خوف سے کہ کہیں فتوحاتِ اسلامیہ اناطولیہ کا رُخ نہ کرلیں۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دشمن کے خوف و خطر اور تیاریوں کو بھانپ لیا لیکن خاموش رہے۔ انھیں تیاری کا پورا موقع دیا اور اس دوران میں ایران و آرمینیا کی طرف اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔

۲۵ھ میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے جو اس وقت شام کے گورنر تھے روم کے دو صُوبوں قبادوقیا (جو ایشیائے کوچک کے مشرقی حصہ میں آرمینیا کے متصل واقع ہیں) اور فریجیا پر (جو ایشیائے کوچک کے درمیانی حصہ میں واقع ہے) چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے عموریہ کو جو ایک بڑا شہر تھا اور اناطولیہ کے راستہ میں واقع تھا فتح کرلیا۔ لیکن اس خیال سے کہ رومیوں نے اپنے شہروں کے دفاع کے لیے اس علاقہ میں بڑی زبردست قوت جمع کر رکھی ہے نیز یہ علاقے ان کے دارالحکومت سے بہت قریب واقع ہیں اور رومی بڑی آسانی سے ان کے علاقے پر چڑھائی کر سکتے ہیں، اپنے حملہ میں زیادہ شدت اختیار نہ کی اور اس کو زیادہ طول نہ دیا۔

حضرت معاویہؓ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بہت زیادہ خواہشمند تھے۔ لیکن راستوں کی ناہمواری، پہاڑوں کی کثرت اور ذرائع آمدورفت کے مسدود ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہ خیال کیا کہ اس علاقہ پر سمندر کی طرف سے حملہ کرنا زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔

ان کا یہ خیال حضرت عمرؓ کے زمانہ سے تھا۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے قبرص فتح کرنے کی اجازت بھی مانگی تھی اور آپ کو لکھا تھا: چونکہ یہ ساحل پر واقع ہے اس لیے بڑی آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس خیال کی سخت مخالفت کی تھی اور انہیں جواب میں لکھا تھا کہ آج کے بعد اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لانا۔

حضرت معاویہؓ اس وقت تو چپ ہو گئے مگر اس علاقہ کی فتح کا خیال ان کے دل میں برابر چٹکیاں لیتا رہا۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے آپ سے اجازت طلب کی اور حضرت عثمانؓ نے ان کو سمندر کے راستے رومیوں پر چڑھائی کرنے کی اجازت دے دی۔

حضرت معاویہؓ نے ساحلِ شام پر ایک جنگی بیڑا تیار کرایا اور اس وقت کے عاملِ مصر حضرت عبداللہ بن ابی سرح کو ایک اور بیڑا تیار کرنے کے لیے لکھا۔ جب یہ دونوں بیڑے تیار ہو گئے تو ان کی مدد سے قبرص پر حملہ کر دیا۔ اہلِ قبرص نے مسلمانوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ لیکن جب دیکھا کہ اس نئے عربی بیڑے کا مقابلہ کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے تو انھوں نے سات ہزار دینار سالانہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ صلح کے ساتھ ہی مسلمانوں نے یہ شرط بھی پیش کی کہ دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے انھیں قبرص سے گزرنے اور اس کو استعمال کرنے کی بھی اجازت ہوگی۔

اب قبرص نے بحرِ ابیض میں مسلمانوں کی ایک جنگی چھاؤنی اور اہلِ شام اور ان کے جنگی بیڑوں کے درمیان جنھوں نے اب اس سمندر میں گشت شروع کر دیا تھا خطِ اتصال کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کے جنگی بیڑے اب بوقتِ ضرورت قبرص میں پہنچ کر بڑی آسانی سے لنگر انداز ہو سکتے تھے۔

بری لحاظ سے تو مسلمان اس وقت دنیا میں سب سے زبردست قوم تھے ہی مگر ۲۸ھ میں قبرص فتح کر لینے کے بعد بحری لحاظ سے بھی ان کی دھاک تمام یورپ اور افریقہ میں بیٹھ گئی۔ ایسی مملکت کے لیے جو اس قدر وسیع ہو، اپنے ساحلی علاقوں کی حفاظت اور ان کو رومیوں کے حملوں سے بچانے کے لیے ایک ایسی قوم کی حمایت کی ضرورت تھی جو بیچ سمندر میں آباد ہو اور بوقتِ ضرورت وہاں مسلمانوں کا جنگی بیڑہ آکر ٹھہر سکے۔ قبرص کی فتح سے مسلمانوں کا یہ بڑا مقصد پورے طور پر حاصل ہو گیا۔

عبداللہ بن قیس حارثی وہ پہلے امیر البحر تھے جنھوں نے حضرت معاویہؓ کے تیار کیے ہوئے جنگی بیڑے کی قیادت کی۔ یہ بہادری اور جرأت میں عدیم المثال تھے۔ انھوں نے تقریباً پچاس بحری جنگیں لڑیں لیکن اس دوران میں نہ ان کے لشکر کا کوئی سپاہی غرق ہوا اور نہ کسی جہاز کو نقصان پہنچا۔ ان کی شہرت ان کی زندگی میں سواحلِ روم اور بحرِ ابیض کے تمام کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس باب میں ان کثیر علاقوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کے زیرِ تسلط علاقے میں بڑھا دئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں معاویہؓ صرف دمشق اور اردن کے حاکم تھے۔ لیکن حضرت عثمان نے حمص، قنسرین اور اس کے بعد فلسطین اور جزیرہ کا کچھ حصہ بھی ان کی نگرانی میں دے دیا اور ان علاقوں کے زیرِ تسلط آجانے کی وجہ سے ان کی حکومت تمام شام

اور فلسطین کو محیط ہو گئی۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں امیر معاویہؓ اپنی مہمات، سیاست اور ہر قسم کے امور کی انجام دہی میں تقریباً مختارِ کل تھے۔ ان کا شمار ان والیوں میں نہ ہوتا تھا جن کو ہر کام کی انجام دہی میں بارگاہِ خلافت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہؓ کو اپنی سلطنت کا نصف حصہ سپرد کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس خوش اسلوبی سے حکومت چلائی اور اپنے حُسنِ انتظام، عقلمندی اور ذکاوت کی وجہ سے اہلِ شام کے دل میں اتنا گھر کر لیا کہ وہ ان کی بجائے کسی اور والی کا وجود اور کسی دوسرے حاکم کے احکام کی تعمیل برداشت نہ کر سکتے تھے۔

(۹)

اسلام افریقہ میں

حضرت عمروؓ بن العاص، جیسا کہ مؤرخینِ عرب بیان کرتے ہیں، نہایت نڈر اور بے خوف شخص تھے۔ جب وہ مصر پر قابض ہو گئے اور رومیوں کو وہاں سے ہٹتے ہی بن پڑی تو انہوں نے اپنی توجہ صحرا اور بلادِ مغرب کی طرف مبذول کی، اور تھوڑی سی فوج لے کر ریگستان قطع کرتے ہوئے برقہ تک پہنچ گئے جو مغربی جانب، مصر کی آخری حد ہے، اور اس پر حملہ کر کے تین ہزار دینار سالانہ جزیہ پر وہاں کے باشندوں سے صلح کر لی۔

برقہ کی فتح کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص نے عقبہ بن نافع کو برقہ کے اردگرد کے علاقہ میں بھیجا اور وہ زویلہ تک جا پہنچے۔ اس کے بعد عمروؓ بن العاص خود ۲۲ھ میں طرابلس[1] پہنچے۔ اس کی فصیلیں برقہ کی فصیلوں سے کہیں زیادہ مضبوط تھیں اور یہاں فوج بھی بھاری تعداد میں موجود تھی جس نے برابر ایک مہینہ[2] تک عربوں کو روکے رکھا تاہم اہلِ طرابلس زیادہ محاصرہ کی تاب نہ لا سکے اور بھوک سے نڈھال ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے سمندر کی جانب سے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص اردگرد کے قبائل کو مطیع کر کے برقہ واپس آ گئے۔

بعد ازاں انہوں نے تونس پر چڑھائی کرنے کی ٹھانی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے ڈر سے پہلے اجازت کے لیے لکھا جو منظور نہ ہوئی اور حکم ملا کہ جہاں ہو وہیں ٹھہرے رہو۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ اسلامی فوج مصائب و مشقت سے محفوظ رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنی حالت کو بہتر بنائیں۔ نئی فتوحات سے پہلے اپنے مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق درست کریں۔ ان کے خیال میں حضرت

---

[1] بلاذری اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: طرابلس کے معنی ہیں "تین شہر"۔ "طر" کے معنی "تین" اور "بلس" کے معنی "شہر"۔ یہ سمندر کے کنارے واقع ہے اور اس کی فصیل پتھر کی ہے۔

[2] یاقوت حموی "معجم البلدان" میں تین ماہ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ابنِ خلدون ایک ماہ بیان کرتا ہے۔

عمروؓ بن العاص کا اس وسیع علاقہ پر تھوڑی سی فوج کے ساتھ حملہ آور ہونا محض اپنی قوت کو ختم اور اپنی فوج کو کمزور کرنا تھا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اوّلاً مصر کو رومیوں کے حملوں سے محفوظ کیا جاتا۔ کیونکہ رومی یہ سننے کے بعد کہ حضرت عمروؓ بن العاص مصر چھوڑ کر صحرا میں داخل ہو گئے ہیں مصر کو دوبارہ ہتھیانے کے لیے اپنی قوتیں جمع کر رہے تھے۔

حضرت عمرؓ نے جب عمروؓ بن العاص کو صحرا میں داخل ہونے، تیونس پر حملہ کرنے اور اس طرح مصر کو خالی چھوڑ دینے سے منع کیا تھا تو ان کے پیشِ نظر یہی باتیں تھیں۔ وُہ جانتے تھے کہ رومی مصر کو آسانی سے چھوڑنے والے نہیں۔ اِدھر مصر میں بھی ایک ایسا گروہ تھا جس نے اپنی امید کا دامن رومیوں کے دامن سے باندھ رکھا تھا اور وُہ کسی مناسب موقعہ کے انتظار میں تھا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو ان رومیوں نے، جو اسکندریہ میں مقیم تھے، اس موقع کو غنیمت سمجھا اور شہنشاہِ قسطنطنیہ کو لکھا، یہ موقع اچھا ہے اسکندریہ آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے ایک ہزار لڑنے والوں سے زیادہ یہاں موجود نہیں ہیں اور وہ آسانی سے ختم کیے جا سکتے ہیں۔ پھر جب یہاں کے مسلمان باشندے رومیوں کے جہاز دیکھیں گے تو ان کے ہوش اُڑ جائیں گے اور وُہ کچھ نہ کر سکیں گے۔

شہنشاہِ روم اس امر کی دلی خواہش رکھتا تھا کہ وہ اس وسیع، سرسبز و شاداب علاقے کو دوبارہ اپنی حکومت میں شامل کرے۔ اس نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ حلق الکتمان میں اسکندریہ سے جنگ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑا بھی موجود تھا۔ رومی اپنے بیڑوں کی وجہ سے بحرِ متوسط کے بحری سردار شمار ہوتے تھے۔ عربوں کو سمندر کی طرف سے کسی حملے کا سان گمان بھی نہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اس علاقہ میں نہ اپنا کوئی بیڑا تیار کر رکھا تھا اور نہ کوئی فوجی انتظام کیا تھا۔

رومی بیڑا تین سو کشتیوں پر مشتمل تھا۔ ان کی قیادت ایک بطریق مانویل کے سپرد تھی۔ یہ بیڑا ۲۵ھ میں حلق الکتمان سے چلا اور اسکندریہ کی بندرگاہ میں رات کو داخل ہو کر لنگر انداز ہو گیا۔ رومی اسکندریہ کے عیسائی باشندوں کی مدد سے شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے عربی فوج اور ان کے مددگاروں پر حملہ کیا اور عربوں کے بہت کم آدمی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔

مانویل سکندریہ پر تسلط قایم کرنے اور اس کو اپنا فوجی اڈّہ بنانے کے بعد اس کے قریبی علاقوں کی طرف متوجہ ہوا اور رومیوں اور اپنے مددگاروں کی اعانت سے ان پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن قبطی باشندے مسلمانوں کے عدل و انصاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ رہے۔

حضرت عمروؓ بن العاص کے متعلق بعض مورخین کہتے ہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد مصر چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس حملہ کے وقت وہ مصر میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے ہی اس فتنہ کا سر کچلا تھا اور اس کے شعلوں کو بجھایا تھا۔

حکومت روما کی تاریخ بیان کرنے والے بعض مورخین رومی لشکر کے قائد، بطریق مانویل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے ایک قیمتی موقعہ محض اپنی سستی اور ناتجربہ کاری کی بدولت اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ وُہ لکھتے ہیں اس کو چاہیے تھا کہ وہ بابلیون

کے قلعہ پر حملہ کر کے اس عظیم جنگی مرکز پر قبضہ کر لیتا۔ جس کی وجہ سے وہ تمام زیریں مصر پر اپنا تسلط بہت آسانی کے ساتھ رکھ سکتا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ سکندریہ کے قریبی علاقوں کو فتح کرنے میں لگا رہا جن کی کوئی جنگی اہمیت نہ تھی اور عربوں کو اس بات کا کافی موقعہ دے دیا کہ وہ اپنی طاقت کو مجتمع کر لیں اور دوبارہ منظم ہو جائیں۔

قلعہ بابلیون کی فوجوں کے سردار خارجہ بن حذافہ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو مشورہ دیا کہ دشمن کو بابلیون تک پہنچنے کا موقعہ نہ دیا جائے بلکہ خود آگے بڑھ کر اور سکندریہ پہنچ کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن حضرت عمروؓ بن العاص نے ان کی رائے نہ مانی۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ رومی آگے بڑھیں اور قبطیوں سے ان کا تصادم ہو۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رومی قبطیوں کو عربوں کی حمایت کے جرم میں ضرور نشانۂ ستم بنائیں گے۔ چنانچہ ان کا خیال ٹھیک نکلا۔ رومیوں نے قبطیوں کے اموال اور قیمتی چیزیں لوٹ لیں جس سے وہ اور بھی ان کے خلاف بھڑک اٹھے اور رومیوں سے ان کی نفرت میں دگنا چوگنا اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے وہ کھلم کھلا عربوں کی مدد کرنے اور رومیوں کے راستے میں روڑے اٹکانے لگے۔

جب فسطاط میں یہ خبر پہنچی کہ رومی قلعہ بابلیون کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں اور نقیوس کے قلعہ کے بالکل قریب ہیں تب حضرت عمروؓ بن العاص ان سے مقابلہ کے لیے تیار ہوئے اور پندرہ ہزار فوج لے کر ان سے لڑنے کے لیے نکلے۔ نقیوس کے قلعہ کے قریب بڑا سخت معرکہ پیش آیا۔ حضرت عمرو بن العاص اپنے گھوڑے کی گردن کاٹ کر بڑی بے جگری سے دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ بطریق مارا گیا۔ رومی فوج اسکندریہ کی طرف بھاگی اور وہاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عمرو بن العاص نے ان کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ قریبی دیہات کے قبطی بھی اپنی استطاعت کے مطابق ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے آخر کار وہ اسکندریہ پہنچے اور اس کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے اس کی فصیلوں کو منہدم کرنا چاہا۔ لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

محاصرہ نے کچھ زیادہ طول نہ کھینچا۔ مسلمان سخت مقابلہ کرنے کے بعد شہر پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور رومیوں کو انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ بھاگ جانے پر مجبور ہونا پڑا۔

جب حضرت عمروؓ بن العاص اسکندریہ پر قبضہ کر چکے اور وہاں کی فصیلوں کو منہدم کرا چکے تو یکایک حضرت عثمانؓ کا پروانہ آیا جس میں ان کو بطور افسرِ خراج معزول کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس حکم کی مخالفت کی کیونکہ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا شخص مصر کے معاملات اور اس کے نظم و نسق میں ان کا شریک ہو۔ اس وقت انہوں نے یہ مشہور فقرہ کہا:

انا اذاً کماسك البقرة بقرنیها وآخر یحلبها۔

"ایسی صورت میں تو گائے کے دونوں سینگ پکڑ کر اس کا بچا کھچا دودھ دوہنے والا ہوں گا۔"

اس امر میں مورخین کا اختلاف ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص ولایتِ مصر سے کس طرح معزول ہوئے؛ انہوں نے بطورِ خود علٰحدگی اختیار کر لی تھی یا حضرت عثمانؓ نے انھیں اس لیے معزول کر دیا تھا کہ عبداللہ بن ابی سرح کے حاکمِ خراج مقرر کیے جانے سے

وہ اتفاق نہ کرتے تھے اور اس لیے انہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا؛ لیکن عام خیال یہی ہے کہ انہوں نے بطورِ خود دست کشی اختیار کر لی تھی اور مصر سے واپس آکر مکہ میں مقیم ہو گئے تھے۔

جب عبداللہ بن ابی سرح کا مصر پر پورا اقتدار قایم ہو گیا تو انہوں نے حضرت عثمانؓ سے افریقہ پر چڑھائی کرنے کی اجازت مانگی جو انھیں مل گئی۔ اس پر انہوں نے بڑے زور شور سے تیاری شروع کر دی۔ تیاری مکمل ہونے پر وہ مصر سے نکلے اور تیونس کی حدود پر جا کر دم لیا۔ مصر اور تیونس کا درمیانی فاصلہ ساحل کے راستے سوا تین سو میل کا ہے۔ لیکن صحرائی راستہ کی مسافت بہت کم ہے۔ اس واسطے عبداللہ نے اسی راستے کو اختیار کیا اور صحرا سے گزر کر اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

عبداللہ بن ابی سرح نے بغیر سوچے سمجھے ہی چڑھائی نہیں کر دی بلکہ پُورے غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے پہلے چھوٹے لشکر بھیجے تاکہ رومیوں کی طاقت کا اندازہ ہو سکے۔ جب لڑائی ٹھن گئی تو رومیوں کے سردار غریغوار نے اپنی فوج میں یہ اعلان کیا کہ جو شخص ابن ابی سرح کو قتل کرے گا میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کروں گا اور اس کو ایک ہزار دینار انعام دُوں گا۔

جب ابنِ ابی سرح کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اپنے لشکر میں یہ منادی کرا دی کہ جو شخص غریغوار کو قتل کرے گا میں اس کو ایک ہزار دینار انعام دُوں گا اور اس کی بیٹی کی شادی اس سے کر دوں گا۔

صبح کے وقت سبیطلہ کے قریب رومیوں اور عربوں کے درمیان زبردست معرکہ شروع ہوا۔ سبیطلہ جنوبی تیونس کے مشرقی علاقہ کا مشہور شہر ہے جو آج تک اپنی قدیم جگہ پر واقع ہے۔ رومیوں کی تعداد عربوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور بڑے حوصلہ اور جواں مردی سے میدان میں ڈٹے رہے۔ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ لڑائی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور ہماری فتح کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تو ابنِ زبیرؓ نے ابنِ ابی سرح کو یہ صلاح دی کہ فوج کا ایک حصہ میدانِ جنگ سے ہٹا لیا جائے اور باقی فوج دشمن سے لڑتی رہے۔ جب دشمن کی فوج تھک جائے تب بقیہ تازہ دم فوج کو میدان میں لایا جائے اور اس طرح دشمن کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

ادھر ابنِ زبیرؓ نے رومی سپہ سالار پر تاک لگائی اور چند سواروں کو اپنے ساتھ لے کر اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس اچانک حملہ سے سنبھل نہ سکا اور ابنِ زبیرؓ کے نیزے نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے قتل سے رومیوں کی ہمت چھُوٹ گئی اور مسلمانوں کے حوصلے پہلے سے بھی بلند ہو گئے۔ انہوں نے رومیوں پر فوراً ایک زبردست حملہ کر دیا اور ان کی صفوں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں۔ رومی اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے ان کا میلوں تعاقب کیا، سیکڑوں رومیوں کو قتل اور ہزاروں کو قیدی بنا لیا۔ اس طرح عربی لشکر سبیطلہ اور اس کے قلعہ پر قابض ہو گیا۔

فتح حاصل ہونے کے بعد بھی عبداللہ بن ابی سرح سبیطلہ ہی میں ٹھہرے رہے اور اسے اپنی فوجی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر شمالی جنوبی اور مشرقی علاقوں میں فوجیں بھیجنی شروع کر دیں۔ ان کے لشکر قفصہ، سبت اور غمنت کے قلعوں تک پہنچ گئے۔ ابنِ زبیرؓ نے ساحل کا رُخ کیا وہاں پہنچ کر سوسہ پر حملہ کیا اور اس کو فتح کیا۔

رومی کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ انہوں نے اپنے انجام پر نظر کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ابنِ ابی سرح کو یہ پیشکش کی جائے کہ وہ ان سے تین سو قنطار سونا لے کر ان کے علاقہ سے دست بردار ہو جائیں۔ چنانچہ ابتدائی بات چیت کے بعد دونوں فریقوں کی صلح کانفرنس ہوئی جس میں مندرجہ ذیل شرائط طے پائیں:

۱۔ رومی تاوانِ جنگ ادا کریں گے جس کی مقدار تین سو قنطار[1] سونا ہوگی۔

۲۔ مسلمان ان کے شہروں سے اپنا قبضہ ہٹا لیں گے اور اس علاقہ سے نکل جائیں گے۔

۳۔ مسلمانوں نے صلح سے قبل جو مالِ غنیمت حاصل کیا ہوگا وہ انہی کے پاس رہے گا۔ لیکن صلح کے بعد اگر انہوں نے کچھ حاصل کیا ہوگا تو وہ لوٹانا ہوگا۔

مندرجہ بالا شرائط پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صلح کے بعد شمالی افریقہ سے نکل گئے تھے۔ لیکن ابن جریر اور طبری اس کی تائید نہیں کرتے۔

ابنِ خلدون کا بیان ہے کہ ابنِ ابی سرح نے انہی لوگوں میں سے ایک شخص کو ان کا والی مقرر کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابنِ ابی سرح نے ان کو دولتِ عربیہ کی زیرِ نگرانی اندرونی خود مختاری عطا کی تھی۔

اس معرکہ میں عربی لشکر نے بہت زبردست مالِ غنیمت حاصل کیا تھا۔ جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فوج کے ہر سوار کو مالِ غنیمت میں سے تین ہزار اور پیدل کو ایک ہزار دینار حصہ ملا تھا۔ ابنِ ابی سرح نے اپنے لیے خمس (⅕ حصہ) رکھ لیا تھا اور بقیہ ⅘ حضرت عثمانؓ کو فتح و ظفر کی خوشخبری کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

مسلسل چودہ مہینے جنگ آزمائیوں میں مصروف رہنے کے بعد عبداللہ بن ابی سرح شمالی افریقہ سے مصر کے دارالحکومت اور اپنی جنگی کارروائیوں کے مرکز فسطاط واپس ہوئے۔ اس کے بعد خلفاء راشدین کے عہد میں اسلامی لشکر اور سلطنتِ روما کے مابین لڑائیاں ختم ہو گئیں۔ ان لڑائیوں میں سلطنتِ روما کے مشرقی علاقہ میں سے جبال طوروس سے طنجہ تک کے سب علاقے رومیوں کے ہاتھ سے چھن گئے۔ اس وسیع علاقہ میں مندرجہ ذیل صوبے شامل تھے۔ کیلیکیہ، شام، لبنان، شرق اردن، فلسطین، مصر، برقہ، مغربی طرابلس، تیونس، الجزائر اور مغربِ اقصیٰ، مسلمانوں نے چند ہی سال کے اندر اندر ان تمام علاقوں کے تہذیب و تمدن کو عربی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھال دیا۔ عربی زبان کو رائج کیا اور اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا۔

---

[1] واقدی کے بیان کے مطابق پچیس لاکھ بیس ہزار دینار۔

(۱۰)

مقابلہ

مسلمانوں اور عرب کی ہمسایہ حکومتوں کے درمیان سب سے پہلا مقابلہ ۵ھ میں ہوا جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مسلمانوں کی ایک جمعیت لے کر دومۃ الجندل تشریف لے گئے جو رومی سلطان کے ماتحت تھا۔ اس کے تقریباً بیس برس بعد تک اسلامی لشکر فتوحات پر فتوحات حاصل کرتا رہا اور کبھی اسے شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ اس عرصہ میں کبھی کسی مسلمان کو یہ خوف دامنگیر نہ ہوا کہ اس کا کوئی مومن بھائی تلوار لے کر خود اس کے مقابلہ پر آئے گا۔ لیکن جب یہ حالت ختم ہوئی اور مسلمان تلواریں لے لے کر خود اپنے ہی بھائیوں کے مقابلہ میں آنے لگے تو اس وقت سے فتنہ و فساد اور باہمی تفرقہ انگیزی کا دروازہ کھل گیا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں رومی شہنشاہیت پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ ۵ھ میں ہوا تھا جس کی قیادت خود حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ اس کے بعد جنگِ موتہ ہوئی جس میں تین ہزار عربی سپاہیوں نے شرکت کی تھی۔ بعد ازاں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ یہ آخری غزوہ تھا جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رومیوں کے مقابلہ کے لیے تیار ہوئے۔ اس میں تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ لیکن وہ بغیر جنگ کیے واپس آ گئے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے چند ہی روز پہلے جنگِ موتہ کے شہدا کا بدلہ لینے کے لیے ایک لشکر رومیوں سے مقابلہ کے واسطے اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں تیار کیا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں حضورِ پرنور کی وفات ہوگئی۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلا کام یہ کیا کہ اس لشکر کو روانہ کیا۔ چنانچہ وہ شام کی سرحد پر پہنچا۔ لیکن وہاں کوئی زبردست مقابلہ پیش نہ آیا اور لشکر واپس مدینہ آ گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک مسلمان مرتدین کے مقابلہ میں مصروف رہے۔ جب اس فتنہ سے نجات ملی تو پھر لشکروں کی روانگی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مسلمانوں نے عراق اور شام پر بیک وقت حملہ کیا اور اس کے بعد ایران اور رومی شہنشاہیت پر ان کے حملے شروع ہو گئے۔ لیکن ان میں کوئی بھی حملہ ایسا نہیں تھا جس میں مسلمانوں کی تعداد اپنے حریفوں کے برابر یا ان سے زیادہ ہو۔ ان کی تعداد ہمیشہ اپنے دشمنوں سے بہت کم ہوا کرتی تھی، خصوصاً رومی سلطنت کے لیے۔ جو ایک وسیع علاقے پر قائم تھی اور اس کے باشندوں کی تعداد پانچ کروڑ تک پہنچتی تھی، عربوں سے کئی سو گنا فوج لانا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن مسلمان اس تعداد کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ انہوں نے بے دھڑک اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ فتح یاب ہوئے۔

انسان جب ان محیّر العقول کارناموں کو پڑھتا اور سنتا ہے تو ششدر رہ جاتا ہے اور کسی طرح اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان اس قدر بے سروسامانی اور اس درجہ قلیل التعداد ہونے کے باوجود کس طرح باجبروت بادشاہتوں اور کثیر التعداد لشکروں کے مقابلہ میں ایک ہیبت ناک سیلاب کی طرح آئے اور آن کی آن میں ان بادشاہتوں کی عظمت و جبروت کو ایک تنکے کی

طرح برباد کر رکھ دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان جنگوں میں رومیوں اور عربوں کے درمیان کسی لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں تھی۔ رومی پوری طرح ان جدید آلاتِ حرب سے آراستہ تھے جو اس زمانہ میں رائج تھے۔ لیکن عربوں کے پاس صرف وہی دقیانوسی ہتھیار تھے جو ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملے تھے۔ مثلاً تلوار، نیزے، تیر کمانیں وغیرہ۔ رومیوں کو عربوں پر نہ صرف لشکروں، ہتھیاروں، تعداد اور تیاری کے لحاظ سے برتری حاصل تھی بلکہ ان شہر پناہوں، قلعوں اور حصاروں کے لحاظ سے بھی رومی ہر طرح عربوں سے بڑھ چڑھ کر تھے جن کی شام، فلسطین، مصر، افریقہ میں کثرت تھی۔ ان فصیلوں اور قلعوں نے عربوں کے راستے میں ہر طرح کی مشکلات حائل کیں، ہر قسم کے روڑے اٹکائے، حملوں میں رکاوٹیں پیدا کیں، ان کی قوتوں کو کمزور کیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عربوں نے ہمیشہ ان پر فتح حاصل کی۔ کوئی دیوار اور شہر پناہ ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی اور کوئی قلعہ ان کو اپنے اندر داخل ہونے سے نہ روک سکا۔

رومیوں کے ساتھ جتنی جنگیں ہوئیں وہ ہمیشہ رومیوں کی سرزمین میں ہی لڑی گئیں جس کے چپے چپے سے وہ واقف ہوتے تھے اور وہاں کی ہر بات کا ان کو پتا ہوتا تھا۔ وہ اپنے مددگاروں اور حلیفوں کے ساتھ ہو کر لڑتے تھے۔ لیکن ان کے برعکس عرب ایسی سرزمین میں جا کر لڑتے تھے جس کے متعلق وہ بالکل لاعلم ہوتے تھے۔ ان کا سامنا ایسے لشکروں سے ہوتا تھا جن کی مدد کے لیے اسی سرزمین کے اشخاص موجود ہوتے تھے اور جن کو ہر جگہ سے ہر قسم کی مدد بآسانی مہیا ہو سکتی تھی اور ہو جاتی تھی۔

رومیوں کے پاس مال و دولت کی بھی کمی نہ تھی لیکن عرب اپنی اوّلین فتوحات کے زمانہ میں مال و دولت جمع کرنے سے بالکل مستغنی تھے۔ عربی لشکر کو اپنی ضروریات کا خود ہی کفیل ہونا پڑتا تھا۔ عرب سے ان کو کسی قسم کی امداد نہ پہنچ سکتی تھی کیونکہ جو علاقہ خود اپنا کفیل اور خود اپنا مکتفی نہ ہو وہ دوسروں کی مدد کس طرح کر سکتا تھا۔

ان امور پر غور کرنے سے صاف طور پر پتا چل جاتا ہے کہ وہ کون سی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے رومیوں کو عربوں پر امتیاز حاصل تھا؛ اگر ان واقعات کی صحت پر واضح دلائل اور قرائن موجود نہ ہوتے تو مورخین کے لیے انھیں تسلیم کرنا ناممکن ہوتا کیونکہ یہ بات عقل میں آنے والی نہیں ہے کہ عربی لشکر جیسا حقیر لشکر جس کی تعداد کسی صورت میں بھی کبھی پچاس ہزار سے آگے نہ بڑھی ہو وہ رومی لشکر جیسے عظیم الشان لشکر پر غالب آ جائے اور اس کو بُری طرح برباد کر کے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی وسیع سلطنت چھین لے۔ چنانچہ اس زمانہ کے بعد سلطنت روما کا کوئی جھنڈا شام، مصر اور افریقہ میں بلند نہ ہو سکا اور رومیوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ عربوں سے اپنا چھینا ہوا علاقہ واپس لے سکیں، حالانکہ عربوں کے علاوہ اگر اور کوئی طاقت ان سے لڑتی تھی اور ان کے ہاتھوں سے کوئی علاقہ چھین لیتی تھی تو زیادہ عرصہ نہ گزرنے پاتا تھا کہ رومی اس سے وہ علاقہ واپس لے لیتے تھے بلکہ اس کے بھی کثیر علاقہ پر قبضہ جما لیتے تھے۔

وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے موت کو عربوں کی نظر میں نہایت حقیر شے بنا دیا تھا۔ جن سے متاثر ہو کر وہ اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے تھے اور اقوامِ عالم سے لڑتے لڑتے انہوں نے ایک جہان چھان مارا تھا؛ صرف اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں لڑنے کا جذبہ ہی تھا جس نے ان کو ہر میدان میں کامیابی بخشی اور ہر قوم پر فتح و نصرت عطا کی۔ اس کے

ساتھ ہی عربی سپہ سالاروں کی حیرت انگیز لیاقت وجرأت، افرادِ سیاست کی سیاسی سُوجھ بُوجھ، اسلامی جمہوریت کے حیرت انگیز واقعات، فاتحین کا عدل وانصاف، حملہ آوروں کا مفتوح باشندوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا سلوک، یہ سب باتیں ایسی تھیں جنہوں نے اسلامی فتوحات کو دوسری فتوحات سے بالکل نمایاں کر دیا اور عام فتوحات کے رنگ کو بالکل بدل ڈالا۔ ظلم وجور کی جگہ ایک پائدار نظام اور حقیقی امن نے لے لی۔ اس عدل وانصاف اور محبت وشفقت کی پھواریں مفتوحہ علاقوں کے باشندوں پر پڑیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ پُرانے جور واستبداد اور بے اطمینانی کے زمانہ کی جگہ ایک عدل وانصاف اور طمانیت قلب سے بھرپور دور نے لے لی ہے جس کی نظیر گزشتہ زمانوں میں سے کسی زمانہ میں نہیں پائی جاتی۔

سب سے زیادہ عجیب بات جو عربی فتوحات میں ہمیں نظر آتی ہے وہ مقبوضہ ومفتوحہ علاقوں اور شہروں کی زبردست حفاظت تھی۔ ان عربی شہروں پر جن کو عربوں نے رومیوں سے چھینا کئی فاتحین نے غلبہ حاصل کیا لیکن وُہ اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ ان حملہ آوروں میں آخری حملہ آور ایرانی تھے لیکن اُن کے غالب آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد رومی ان پر آ پڑے۔ انہیں مار مار کر ان کے مفتوحہ علاقوں سے باہر نکال دیا اور مدائن پہنچا کر ہی دم لیا جہاں انہوں نے نہایت ہی کڑی شرائط کے ساتھ ان سے معاہدۂ صلح لکھوایا۔

رومیوں نے اسی نسخہ کو عربوں پر بھی آزمانا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف شام پر حملہ کیا اور دُوسری طرف اسکندریہ پر قابض ہو کر اردگرد کے علاقوں میں بڑھتے بڑھتے نقیوس تک پہنچ گئے۔ لیکن جب حضرت عمروؓ بن العاص ان کے مقابلہ کے لیے اٹھے تو اُن کو بُری طرح بھاگتے ہی بن پڑی اور وہ مصر واسکندریہ سے باہر نکال دیے گئے۔ اسی طرح حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کو شام اور اطرافِ اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ اور وُہ علاقے جن کو عربوں نے فتح کیا تھا اب تک عربی علاقے ہی شمار ہوتے ہیں۔

عربی فتوحات کا ایک اثر یہ ہُوا کہ عرب سے بے شمار قبائل نکل کر مفتوحہ علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ کچھ نے شام میں رہائش اختیار کر لی، کچھ مصر میں آباد ہو گئے اور کچھ شمالی افریقہ میں جا بسے اور جیسا کہ مورخین نے بیان کیا ہے قبائلِ عرب ساحلِ فرات سے لے کر اطلس کے کناروں تک پھیل گئے۔ ان کا وہاں کے اصلی باشندوں سے میل ملاپ ہو گیا اور انہوں نے ان علاقوں اور ملکوں میں اسلام پھیلا کر، عربی زبان کی ترویج اور آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ قائم کر کے نیز اقتصادی اور زراعتی امور میں اشتراکِ عمل کے ذریعہ ان کی طبائع کو بھی عربی طبائع میں رنگ دیا۔

یہ چیز رومیوں اور دیگر فاتحین میں نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں میں سیاسی، عسکری، اقتصادی غرضیکہ ہر لحاظ سے عربیت غالب آگئی اور اس طرح عربوں کی حکومت کو ان علاقوں میں استحکام حاصل ہو گیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ شام، مصر اور افریقہ میں عربی فتوحات اپنی نظیر آپ ہیں۔ تاریخ ابتدائے آفرینش سے اب تک کسی ایسی قوم کی مثال پیش نہیں کر سکی جو حد درجہ قلیل التعداد، مفلس وقلاش اور پرانے دقیانوسی ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود ایک بڑے علاقہ اور ان وسیع وعریض شہروں پر حملہ کرے جو شہر پناہوں کے ذریعہ خوب مضبوط بنائے گئے ہوں۔ جنگی اسلحہ کی وہاں کمی نہ ہو اور ان میں اتنے زبردست لشکر موجود ہوں کہ فاتح قوم کا لشکر ان کے عشرِ عشیر بھی نہ ہو۔ لیکن ان سب باتوں کے

باوجود وہ قوم اپنی حریف قوموں پر غلبہ حاصل کر کے ان کو شکست فاش دے اور ایک قلعہ کے بعد دُوسرے اور دُوسرے کے بعد تیسرے قلعہ پر قبضہ کرتی چلی جائے جو علاقوں کے علاقے فتح کرکے پہلے ان میں اپنا اثر و رسوخ قایم کرے اور پھر مفتوح قوم کو اپنی قومیت میں مدغم کرلے۔ اپنے دین اور اپنی زبان کو اس میں پُوری طرح رواج دے کر مغایرت کے کسی رشتہ کو بھی اپنے اور اس کے درمیان باقی نہ رہنے دے۔

اگر لوگوں کا ان روحانی اور غیبی قوتوں پر اعتقاد نہ ہوتا جو عربوں کو ان کی فتوحات میں مدد دیتی اور جنگوں میں ان کو تقویت پہنچاتی رہیں تو یقیناً ایسے امور دنیا سے خواب و خیال کی باتیں سمجھے جاتے۔

(۱۱)

جمعِ قرآنِ کریم

اکثر مستشرقین حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہی قرآنِ کریم کی جمع و تدوین کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ موجودہ قرآن مجید کے نسخے مصحفِ عثمانی کے مطابق نہیں ہیں وہ مصحف ضائع ہو چکا ہے اور موجودہ مصحف اس پرانے مصحف کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے۔ خلفائے راشدین نے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اس میں زیادتی اور کمی کرلی (نعوذ باللہ)۔ لیکن یہ سب محض ظنی اور خیالی باتیں ہیں حقیقت کا ان سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید بیشتر صحابہؓ کے سینوں میں محفوظ تھا اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا امکان نہ تھا۔ جب یمامہ میں مرتدین سے جنگ ہُوئی اور اس میں کئی صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا تو حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ اس جنگ میں کئی قاری شہید ہوگئے ہیں، اگر اسی طرح جنگوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحابہؓ ان میں شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ آپ کو چاہیے کہ قرآن کریم کو ایک جگہ جمع کرادیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ جس بات کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا میں اسے کس طرح کر سکتا ہوں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ایک انتہائی ضروری چیز ہے حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ برابر مجھ سے اس بارہ میں اصرار کرتے رہے تا آنکہ خدا تعالیٰ نے میرے سینے کو کھول دیا اور میں نے بھی عمرؓ کی رائے سے اتفاق کرلیا۔

ایک دُوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو بلایا۔ حضرت عمرؓ بھی ان کے ساتھ تھے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کرکے زیدؓ سے کہا: "انھوں نے مجھ سے ایک کام کرنے کو کہا ہے لیکن میں نے انکار کردیا۔ تم کاتبِ وحی ہو اگر تم بھی ان کی رائے سے اتفاق کرو تو میں اس کام کو شروع کردوں گا۔ لیکن اگر تم نے اتفاق نہ کیا تو پھر میں بھی یہ کام نہیں کروں گا۔" اس کے بعد اُنھوں نے حضرت عمرؓ کی رائے انہیں بتائی۔ شروع میں تو زیدؓ اس سے متفق نہ ہُوئے اور کہنے لگے کہ آپ وُہ کام کس طرح کر سکتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ لیکن جب حضرت

ابوبکرؓ نے کہا کہ میرے خیال میں یہ کام اُمت کے لیے بھلائی کا موجب ہے، تو وہ مان گئے اور قرآنِ کریم کے جمع کرنے کا کام شروع ہُوا۔ پتّوں، ٹھیکروں، کھالوں، ہڈیوں اور لکڑی کے ٹکڑوں پر سے قرآنی آیات نقل کی گئیں اور لوگوں کو جو اکثر سورتیں یاد تھیں ان سب کو جمع کیا گیا۔ جو کچھ جمع ہوا اس پر تمام صحابہؓ کا اتفاق تھا۔ صرف سورۂ توبہ کی دو آیات ایسی تھیں جو اکیلے حضرت خزیمہؓ بن ثابت کو یاد تھیں اور کسی صحابی کو یاد نہ تھیں۔

جب قرآنِ کریم جمع ہوگیا تو وہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو منتقل ہوگیا۔ آپؓ کی شہادت کے بعد آپ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کی تحویل میں چلا گیا۔

جب آیاتِ قرآنی نازل ہوتی تھیں بعض صحابہؓ بطورِ خود یا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھ لیا کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں کاغذ دستیاب ہونا بڑا مشکل تھا اس لیے صحابہؓ قرآنِ کریم کو کھجور کے پتّوں، پتھر کے ٹکڑوں، کپڑے کی دھجیوں، کھالوں، ہڈیوں اور ہر اس چیز پر جو ان کو اس مقصد کے لیے میسر آجاتی تھی لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح تمام قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی جمع کر دیا گیا تھا، بلکہ ایک جماعت اسی کام کے لیے مقرر تھی جس میں حضرت علیؓ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت اُبیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت شامل تھے۔ وہ نسخے جن کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا، تین تھے:

۱۔ مصحفِ ابنِ مسعود

۲۔ مصحفِ ابی اور

۳۔ مصحفِ زید۔

یہ تینوں قاری تھے اور اپنی اپنی قرأت کے نمونے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر چکے تھے۔ زیدؓ نے اپنی قرأت کا نمونہ سب سے آخر میں اس سال پیش کیا تھا جس سال حضورِ انورؐ کی وفات ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار کر لیا اور آپ سے سُن کر باقی مسلمانوں نے بھی۔

ابو العالیہ کہتا ہے ۳۰ھ میں حضرت عثمانؓ کے سامنے قرآنِ کریم کے بارے میں اہلِ عراق کا ایک جھگڑا پیش ہوا، وہ کہتے تھے ہماری قرأت اہلِ شام کی قرأت سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ ہم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے سیکھی ہے۔ اہلِ شام کہتے تھے ہماری قرأت زیادہ صحیح ہے کیونکہ ہمیں حضرت مقداد بن الاسود نے پڑھایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس بارے میں صحابہؓ سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ صرف اسی مصحف کو رائج کیا جاتے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں لکھا گیا تھا اور جو حضرت حفصہؓ کے پاس امانتاً رکھا ہوا ہے۔ اس کے سوا دُوسرے تمام نسخے جلا دیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس مصحف سے اور مصحف نقل کیے گئے اور ہر شہر میں ایک نسخہ بھیج دیا گیا۔ جن لوگوں نے یہ مصحف اور اس کی نقلیں حضرت عثمانؓ کے حکم سے تیار کیں ان میں زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن زبیر، سعیدؓ بن العاص اور عبدالرحمٰنؓ بن حارث بن ہشام مخزومی شامل ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا تھا:

ان اختلفتم فی کلمۃ فاکتبوھا بلسان قریش فانما نزل القرآن بلسانھم۔

یعنی اگر تمہیں کسی کلمہ میں اختلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں اُترا تھا۔

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مصحفِ عثمانی کے لکھنے والے زیدؓ بن ثابت اور لکھوانے والے سعیدؓ بن عاص ہیں اس لیے کہ سعیدؓ بن عاص اپنے زمانے کے سب سے بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ یہ باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ حضرت زیدؓ بن ثابت کو سارا قرآن مجید حفظ یاد تھا۔ کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ لکھ چکنے کے بعد وہ سعیدؓ بن عاص کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے مصحف میں ایک آیت کم پائی جس پر انہوں نے مہاجرین و انصار سے اس کے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔ حضرت خزیمہؓ بن ثابت کے پاس وُہ آیت مل گئی۔ دُوسری بار سنانے پر یہ آیت نہ پائی:

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم۔

انہوں نے پھر اس کی تلاش کی اور ایک آدمی کے پاس ان کو وہ آیت مل گئی۔ جب تیسری بار سنایا تو اس بار کوئی آیت کم نہ پائی۔ جب اس نسخہ کو حضرت حفصہؓ والے نسخہ سے ملایا گیا تو اس کو بالکل مکمل پایا۔ تب ان کا دل مطمئن ہوگیا اور لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس نسخہ سے دوسرے نسخے نقل کریں۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ان نسخوں کو باہر بھیج دیا جن کی تعداد سات بیان کی جاتی ہے۔ یہ نسخے مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ بھیجے گئے تھے اور ایک مدینہ میں رکھ لیا گیا تھا۔ اس مصحف کو "امام" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ مصاحف جو حضرت عثمانؓ کے مصحف سے قبل لکھے گئے تھے ان کی سورتوں کی ترتیب وہ نہیں تھی جو آج کل پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی دی ہوئی ترتیب[1] ہے۔ حجاج کے زمانہ میں قرآن کریم کو تیس جزو میں تقسیم کیا گیا تھا۔ باقی رہا اس سے

---

[1] مصنف کا یہ بیان ہرگز صحیح نہیں۔ حضرت عثمانؓ کے لکھوائے ہوئے قرآن کریم میں سُورتوں اور آیتوں کی ترتیب بالکل وہی تھی جو حاملِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقرر فرمائی تھی۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کاتب کو بلا کر فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں لکھ لو۔ پھر حضور ختم المرسلینؐ حضرت جبریلؑ کے ساتھ قرآنِ کریم کا دَور کیا کرتے تھے اور جس سال حضور علیہ السلام کا وصال ہوا ہے اس وقت دو مرتبہ دَور کیا۔ اگر سُورتوں کی ترتیب نہیں تھی تو دَور کس طرح ہوتا تھا اور اگر ترتیب تھی تو بعد کے لوگوں کو اس ترتیب کے بدلنے کا کیا اختیار تھا اور کس کی مجال تھی کہ رسولؐ اللہ کی ترتیب کو بدل کر اپنی ترتیب قائم کرتا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سُورۃ میں لکھ لو۔ اس واضح حکم کے بعد کوئی گنجائش کسی انسان کے لیے باقی نہیں رہتی کہ وُہ حضورؐ کے حکم سے سرتابی کرکے بطورِ خود نئی ترتیب قایم کرے۔ نہ حضرت عثمانؓ خود ایسا کر سکتے تھے اور نہ کوئی صحابیؓ انہیں ایسا کرنے دیتا۔

(مترجم)

پہلے کا معاملہ تو روایت ہے کہ جب کوئی سُورۃ اُترتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتب وحی کو بلا کر کہتے: اس سُورۃ کو فلاں فلاں جگہ رکھ دو۔ اس طرح قرآن مجید کی آیات تو پہلے ہی سے مرتب شدہ تھیں لیکن وہ کتابی صورت میں جمع نہیں تھا۔ مصحفِ عثمانؓ کی ترتیب حضرت زیدؓ بن ثابت نے دی تھی اور یقین ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں بھی وہی ترتیب تھی جو انہوں نے دی اور اسی کی حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ متعدد صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کیا اور لوگوں کے سامنے لاکھوں بار وہی پڑھا گیا تو یہ بات قطعی محال ہے کہ انہوں نے اس میں تحریف و تبدل یا زیادتی و کمی کر دی ہو۔ چنانچہ اس بات میں قطعاً شک کی گنجائش نہیں کہ موجودہ قرآن بعینہٖ وہی قرآن ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ باقی رہا قرآت میں اختلاف تو یہ ایک دُوسرا معاملہ ہے جو نفسِ کلامِ الٰہی کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کی قرآت سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ امر کسی سے مخفی نہیں ہے کہ عربوں کے لہجے آپس میں بہت مختلف تھے اور ان لہجوں کے اختلاف سے قرأتوں میں اختلاف پیدا ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔

(۱۲)

فتنہ

حضرت عثمانؓ کے عہد میں باغیوں کا جو فتنہ اُٹھا وہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے اسلامی اتحاد کو ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا اور اگر اللہ کا خاص فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو اسلام اس سخت دھچکے سے ہرگز جانبر نہ ہو سکتا۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر تھا کہ رومی شاہنشہی اور ایرانی بادشاہت حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور جو کچھ ان دونوں میں دم درود باقی تھا وہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ختم ہو گیا تھا۔ اگر خدا نخواستہ ان دونوں طاقتوں کے خاتمہ سے پہلے اسلام میں یہ فتنہ نمودار ہو جاتا تو یقین تھا کہ ان دونوں عظیم سلطنتوں کی فوجیں بلادِ عربیہ پر دھاوا بول دیتیں اور اسلامی سلطنت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مہاجرین قریش کے ممتاز لوگوں پر بغیر اجازت مفتوحہ علاقوں کے دیار و امصار میں جانے پر پابندی لگا دی تھی جس پر انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور آپ سے اس پابندی کی شکایت کی۔ لیکن حضرت عمرؓ پر اس ناراضی اور اس شکایت کا کوئی اثر نہ ہُوا اور آپ نے ان کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں نئے نئے شہروں میں جا کر ان پر عصبیت غالب نہ آ جائے اور یہ پھر اپنی قدیم جاہلی عصبیت پر نہ اُتر آئیں۔

جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے وہ احتیاط نہ برتی جو حضرت عمرؓ نے برتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مدینہ جوق در جوق دُوسرے ملکوں اور شہروں میں جانے لگے۔ انہوں نے اپنے سامنے ایک جدید دنیا اور سرتاپا نئی چیزیں دیکھیں۔

ان کو ایسی زندگی اور ایسی معاشرت سے واسطہ پڑا جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے۔ ان نئی چیزوں، نئی معاشرت اور نئے تہذیب و تمدن نے انھیں ایسا اُبھایا کہ وہ وہیں کے ہو رہے۔ مفتوحہ ملک کے باشندے جنہیں اسلام میں کوئی سبقت کوئی فضیلت حاصل نہ تھی ان کے پاس آنے لگے۔ ان سے راہ و رسم بڑھانے لگے۔ ان کے فاتح ہونے کی وجہ سے ان کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس چیز نے ان کے دماغوں میں بڑائی اور بزرگی کا احساس پیدا کر دیا۔ یہ پہلی کمزوری تھی جو اسلام میں ظاہر ہوئی اور عصبیت کا پہلا مظاہرہ تھا جس نے اس اسلامی مساوات کے اصول کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا جس کی رُو سے تمام مسلمان ایک ہی لڑی میں منسلک تھے اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔

شعبی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں قریش بہت اُکتا گئے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ نے ان کو مدینہ سے باہر جانے سے منع کر رکھا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بات سے بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم لوگ شہروں میں جا کر منتشر نہ ہو جاؤ۔ اگر ان مہاجرین میں سے جن کو آپ نے مدینہ میں روکا ہوا تھا کوئی شخص آپ سے جنگ میں جانے کی اجازت چاہتا تو آپ اس سے کہتے کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگوں میں جو حصہ لیا تھا وہی تمہارے لیے کافی ہے اور اب تمہارے لیے جنگ سے زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ نہ تم دُنیا کو دیکھو اور نہ دنیا تمہیں دیکھے۔

جب حضرت عثمانؓ نے ان کو ڈھیل دی اور وہ دوسرے ملکوں میں پھیل گئے تو وہاں کے باشندے ان کے پاس آنے جانے لگے۔ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنے ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ قریش کے ان لوگوں نے ان شہروں میں اپنی جائدادیں بنالیں۔ چونکہ لوگ ان کے پاس کثرت سے آتے تھے اور فاتح ہونے کی وجہ سے ان کی عزت کرتے تھے اس لیے ان میں جاہلیت کی پرانی باتیں پھر عود کر آئیں اور پرانی عصبیت پھر اُبھر آئی، حالانکہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سخت منع فرمایا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کی قریش کو روکنے کی پالیسی نہایت دُور اندیشی پر مبنی تھی کیونکہ سنّتِ بشری کے مطابق ایک فاتح قوم کے افراد کی طرح ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ بھی کسی دن خلافت کی کرسی پر متمکن ہو جائیں۔ لیکن اس وقت کا رائج الوقت جمہوری نظام ان کی اس خواہش میں سب سے بڑی روک تھا۔ مدینہ کا ماحول ایسا تھا کہ ان کے لیے خلافت کے خلاف کوئی سازش یا ہنگامہ برپا کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ مدینہ میں کسی ایسے شخص کے داخل ہونے ہی کی گنجائش تھی جو وہاں کے باشندوں میں تفرقہ اور فساد ڈلوا سکے۔ لیکن دُوسرے شہروں میں یہ بات بڑی آسانی سے میسر آسکتی تھی اور وہاں فساد کے بیج بونے، لوگوں کو بغاوت پر اُکسانے اور مختلف علاقوں کے عمّال پر نکتہ چینی کرنے کا موقع ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا۔

قریش اس زمانہ میں اپنے آپ کو سارے جہان سے افضل سمجھتے تھے۔ اپنے علاوہ کسی اور کی امارت ان کو سخت ناگوار تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ حکومت میں ان کا حق اپنے امیر سے کسی صورت میں بھی کم نہیں بلکہ وہ اس سے زیادہ امارت کے مستحق ہیں۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت اور آپ کی زندگی میں ناممکن تھا۔ اس زمانہ میں کسی قریشی یا غیر قریشی کو سر اٹھانے یا بغاوت برپا کرنے کا خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم دل تھے اور اسی نرم دلی اور کمزوری سے بدطینت لوگوں نے فائدہ اٹھا کر ملتِ اسلامیہ میں تفرقہ انگیزی اور افتراق و انشقاق کے بیج بو دئے۔

حضرت عثمانؓ نے قریش کو نہ صرف مختلف ممالک میں جانے کی اجازت ہی دی جس پر حضرت عمرؓ نے پابندی لگا رکھی تھی بلکہ اس کام میں ان کی مدد بھی کی۔ حضرت عثمانؓ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر کہیں کوئی فتنہ نمودار ہوا اور تفرقہ کی آگ بھڑکی تو ان کے ذریعہ سے اس فتنہ کا سر کچلنے، اس آگ کو بجھانے اور حکومت کو مضبوط کرنے کا کام لیا جا سکے گا۔ لیکن ان کا یہ پہلا خیال ہی غلط نکلا۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۳۳ھ میں آپ کو سعیدؓ بن العاص نے یہ رپورٹ بھیجی کہ کوفہ میں بے چینی پھیل رہی ہے اور وہاں کے باشندے فتنہ و فساد کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے ان لوگوں کو تیار کرنا شروع کیا جنہوں نے عراق کی فتوحات میں حصہ لیا تھا اور عراق کے اموال میں ان کا حصہ ہونے کے علاوہ وہاں ان کی جاگیریں بھی تھیں۔ لوگ بہت خوش ہوئے خدا نے ان کے باہر جانے کے لیے ایسا سامان کر دیا تھا جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

اس موقعہ سے بعض قریش نے بھی فائدہ اٹھایا اور اس کو غنیمت جانتے ہوئے ان لوگوں سے جن کی عراق میں جائدادیں تھیں اپنی حجاز والی جائدادوں کا تبادلہ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ طلحہؓ بن عبیداللہ نے اپنی خیبر اور حجاز کی جائداد کا تبادلہ ایک ایسے شخص سے کیا جس کی قادسیہ اور مدائن میں جائداد تھی لیکن اس نے عراق میں رہنے کی نسبت مکہ میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی تھی۔ مروان کو جو جاگیر حضرت عثمانؓ سے ملی تھی اس کا بھی اس طرح تبادلہ ہو گیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا اور سیکڑوں لوگوں نے اپنی جائداد کے تبادلے دُوسرے ممالک کے لوگوں کی جائدادوں سے کر لیے۔ اس طرح قریشیوں کو اپنے گھروں سے نکلنے اور دُوسرے شہروں میں جا کر آباد ہونے کا موقع مل گیا۔

جب اس طرح بڑے بڑے قریشی دُوسرے شہروں میں جا کر آباد ہوئے تو جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے وہاں کے باشندے ان کے پاس آنے جانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس علاقے کے باشندے اپنے والیوں اور عمال سے متنفر ہونے لگے اور اپنا تعلق ان نوواردین سے بڑھانے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ اپنے علاقوں کے عمال کی شکایات کر کے ان کی جگہ دوسرے عمال مقرر کرا لیں۔ چنانچہ اہلِ بصرہ حضرت طلحہؓ کو، اہلِ کوفہ حضرت زبیرؓ کو اور اہلِ مصر حضرت علیؓ کو اپنا والی بنانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے مصر میں نہ کوئی گھر بنایا تھا اور نہ کبھی وہاں گئے تھے لیکن ان کا ایک نہایت ہی قریبی رشتہ دار محمد بن ابوبکرؓ وہاں پہنچ گیا۔ محمد بن ابوبکرؓ حضرت علیؓ کا ربیب تھا کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد محمد کی والدہ سے حضرت علیؓ نے شادی کر لی تھی۔ محمد اس وقت دُودھ پیتا بچہ تھا۔ حضرت علیؓ نے اس کی پرورش کی۔ اس لیے محمد بن ابوبکر کو حضرت علیؓ سے خاص تعلق تھا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وُہ فتنے جو مختلف شہروں میں پھوٹے اور حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ والیوں کے خلاف جو شورشیں برپا ہوئیں یہ سب اس بات کا نتیجہ تھا کہ حضرت عثمانؓ نے قریش کے بڑے بڑے لوگوں اور ان کے اعوان و انصار کو مختلف ملکوں میں چلے جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہاں کے لوگوں نے جو حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ والیوں کو پسند نہ کرتے تھے ان لوگوں کے پاس آمد و رفت شروع کی اور اپنے والیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ چاہا کہ خلافت انہی کی طرف منتقل

ہو جاتے اور ان کی ولایت بھی انہی میں سے کسی کو مل جائے۔ لیکن چونکہ ہر علاقے کے باشندے علٰحدہ علٰحدہ اشخاص کے حق میں تھے اور ایک آدمی پر ان کا متفق ہونا ناممکن تھا اس لیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت علیؓ برسرِ اقتدار آئے اور عنانِ خلافت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو اگرچہ مصریوں نے ان کی زبردست حمایت کی تھی لیکن دوسرے علاقوں کے لوگ حضرت علیؓ کی خلافت کو برداشت نہ کر سکے اور آپ کی زبردست مخالفت کی۔ آپ کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں اور اسی وجہ سے کئی جنگیں بھی ظہور پذیر ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان انشقاق وافتراق کے معنوں سے بھی واقف نہ تھے اور تفرقہ کے اسباب موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ آپس میں بھی کسی بات کی مخالفت نہ کرتے تھے۔ عربوں کے باہمی لڑائی جھگڑوں کا سب سے بڑا سبب ان کے روٴسا و امرا کی باہمی چپقلش اور اختلاف تھا۔ اور اس وقت کوئی ایسا زبردست ہاتھ نہ تھا جو ان معاملات کو بزور اپنی حد کے اندر رکھتا اور آگے نہ بڑھنے دیتا۔ حضرت عمرؓ کی ذات ایسی تھی جن کو نہ مصائب و آلام متاثر کر سکتے تھے نہ پریشانیاں ڈرا سکتی تھیں۔ آپ کبھی کسی عظیم شخصیت کے سامنے اس کی عظمت کی بنا پر نہ جھکے اور نہ کسی غریب اور کم حیثیت شخص کو اس کی کم مائیگی کی وجہ سے حقیر جانا۔ کوئی فتنہ ہوتا تو آپ اس کے نشوونما پانے سے پہلے ہی اس کے اصل بانی پر ہاتھ ڈال کر اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔ اگرچہ عام لوگوں کے لیے آپ رحیم و کریم اور شفیق و مہربان تھے لیکن روٴسا و امرا اور وہ لوگ جو عہدوں اور اقتدار کے خواہشمند تھے آپ سے حد درجہ خائف رہتے تھے اور آپ کے ڈر سے جھگڑے یا فساد کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لا سکتے تھے۔

حضرت عثمانؓ میں شرم و حیا اور نرمی بہت زیادہ تھی۔ آپ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں اپنی حیا کی وجہ سے بے حد مشہور تھے اور یہ فطری بات ہے کہ جو شخص بہت زیادہ شرمیلا ہو وہ اگر اپنی خلافِ مرضی بھی کوئی بات دیکھے تو شرم کی بنا پر اس سے اغماض اور پہلوتہی برتتا ہے اور اگر اس کو خود بھی کسی سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنی خلقی کمزوری کے سبب وہ اس کا کچھ خیال نہیں کرتا اور کوشاں رہتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث بنے اور اس سے کسی کو رنج پہنچے۔ یہ بات اگرچہ عام اخلاقی لحاظ سے کسی قدر اچھی کیوں نہ ہو لیکن ملکی سیاست میں کسی عنوان فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی[1] خلافت کی ہیبت اور اس کا ڈر لوگوں کے دلوں پر اس طرح مسلط ہونا چاہیے کہ وہ انہیں ایک خاص حد سے باہر نکلنے دے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمانوں میں جو باہمی الفت و محبت اور اتحاد تھا اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جہاد میں مشغول رہتے تھے اور ایک علاقہ کے بعد دوسرے علاقہ کو فتح کرنے کے لیے نکل جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ جو قوم ہر وقت جنگوں میں ہی مشغول رہے گی اس کی ساری توجہ ان نتائج و عواقب پر ہی مرکوز رہے گی جو جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اور اس صورت میں آپس میں افتراق و انشقاق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اگر حضرت عثمانؓ کے وقت میں بھی فوجیں جنگ میں مشغول

---

[1] اگرچہ یہ بات ٹھیک ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے معاملہ میں بہت نرم دل انسان تھے اور جہاں تک آپ کا بس چلتا تھا نرمی اور عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ لیکن شرعی حدود کے قائم کرنے میں بہت سخت تھے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے۔ (مترجم)

رہتیں اور قوم کی ساری توجہ انہی جنگوں کی طرف مبذول رہتی تو فتنہ و فساد پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

ابن خلدون کی رائے اس معاملہ کے متعلق یہ ہے کہ جب فتوحات ختم ہو گئیں اور ملت اسلامیہ کو اکثر ممالک میں اقتدار حاصل ہو گیا تو عرب اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں جا کر آباد ہو گئے۔ ان لوگوں میں صحابہ کرامؓ بھی تھے اور مہاجرین و انصار بھی۔ قریش بھی تھے اور اہلِ حجاز بھی۔ اور یہ سب وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں یہ ممالک مفتوح ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے علاوہ عرب کے قبائل بنی بکر بن وائل، عبدالقیس، ربیعہ، ازد، کندہ، تمیم، قضاعہ وغیرہ اس صحبت سے بہرہ ور نہیں تھے جس صحبت سے صحابہ کرام بہرہ ور تھے۔ لیکن ان لوگوں کا فتوحات میں بہت بڑا حصہ تھا۔ ان لوگوں نے چاہا کہ ہمیں ہماری خدمات کا پورا پورا معاوضہ ملے اور ان ممالک پر ہمارا ہی دبدبہ اور ہماری ہی حکمرانی ہو۔ ادھر ان لوگوں میں حقیقی طور پر اسلام بھی نہ پھیلا تھا اور یہ لوگ نبوت، نزولِ وحی اور نزولِ ملائکہ کے مسئلہ میں بڑے تردد اور کشمکش و پیچ میں تھے۔

جب دشمن ہر طرح مطیع و منقاد ہو گیا اور تمدد و ممالک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئے تو جاہلیت کی رگ پھر ان میں پھڑکنے لگی اور جا بجا عصبیت کے مظاہرے ہونے لگے۔ خصوصاً جب انہوں نے دیکھا کہ مہاجرین، انصار اور قریش ہی ان پر حکمران ہیں تو ان حکمرانوں سے ان کی بیزاری کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھا کہ وہ کھلم کھلا عمال اور والیوں کے خلاف جھوٹی باتیں منسوب کر کے انھیں بدنام کرنے، ان کے احکام ماننے سے انکار کرنے اور حضرت عثمانؓ سے بار بار ان کو بدلنے اور معزول کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہوں نے عمال اور ولاۃ کے فرضی مظالم کے افسانے کثرت سے گھڑ گھڑ کر پھیلانے شروع کیے۔ جب مدینہ میں یہ خبریں پہنچیں تو حقیقتِ حال سے بے خبر ہونے کی وجہ سے صحابہؓ نے حضرت عثمانؓ پر زور دینا شروع کیا کہ وہ ان امراء کو جن کی برطرفی پر زور دیا جا رہا ہے معزول کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ شکایت کرنے والے اپنی شکایتوں اور الزامات میں سچے ہیں۔ لیکن صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی کیونکہ جب حضرت عثمانؓ نے تحقیقات کرنے والوں کو ان علاقوں میں تفتیش کے لیے بھیجا تو انہوں نے وہاں کے باشندوں پر مبینہ مظالم اور سختیوں کا نام و نشان تک نہ پایا بلکہ خود وہاں کے لوگ انہیں فساد پر کمربستہ اور بغاوت پر آمادہ نظر آئے۔ وہ کھلم کھلا افتراق و انشقاق پھیلا رہے تھے، بغاوت کی تیاریوں میں مشغول تھے اور اپنا اقتدار قایم کرنے اور اس وقت کے حاکموں کا اقتدار خاک میں ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

(۱۳)

مستشرقین اور فتنہ

مستشرقین کا اسلام میں پیدا شدہ فتنوں کے بارہ میں یہ خیال ہے کہ ان کے محرک در اصل پرانے جھگڑے اور اختلافات تھے جو زمانہ جاہلیت میں عرب کے مختلف قبائل میں موجود تھے۔ اسلام کے بعد جو عربی حکومتیں قائم ہوئیں ان کے زوال کا واحد سبب بھی یہی باہمی جھگڑے اور اختلافات تھے۔

ڈوزی کہتا ہے: "قبائلِ عرب کے یہ باہمی جھگڑے ہی، جو زمانۂ جاہلیت سے چلے آرہے تھے حکومتِ اندلس (جس کو بجا طور پر ہم عربی حکومتوں میں طاقت و قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے سب سے بڑی حکومت کہہ سکتے ہیں) کے زوال کا باعث ہوئے۔ یہی موروثی اختلافات تھے جو قبیلوں اور خاندانوں میں وراثتاً جاری تھے اور ان ہی کی بدولت بڑی بڑی بادشاہیاں اور حکومتیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ بنو ہاشم کی حکومت کو بنو امیہ نے ختم کر دیا اور بنو امیہ کی حکومت کو خاندانِ عباسیہ نے مٹا دیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ حتیٰ کہ جب یورپین اقوام نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی پھیلی ہوئی ہے تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونک کر ان کو ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رکھا۔ رفتہ رفتہ اسی خانہ جنگی اور طوائف الملوکی میں خلافت عربوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اندلس یورپین اقوام کے زیرِ تسلط آگیا۔"

ڈوزی اپنے بیان کی تائید میں مثالیں دیتا ہوا پہلے یمنیوں اور معدیوں کے اختلافات کا ذکر کرتا ہے پھر خوارج اور شیعوں کے درمیان جنگ و جدل کے واقعات بیان کرتا ہے۔ پھر کلبیوں اور قیسیوں کے باہمی جھگڑوں کو مثال میں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ بتلاتا ہے کہ اسی خانہ جنگی کی بدولت عبدالرحمٰن اوّل کو اندلس پر قابض ہونے کا موقع ملتا ہے اور اس طرح اندلس میں دولتِ امویہ قائم ہو جاتی ہے۔

ڈوزی دولتِ امویہ کے قیام کے بعد بھی اندلس میں عربی قبائل کے باہمی اختلافات کا جائزہ لیتا ہوا یورپین اقوام کے ہاتھوں اس عظیم عربی شہنشاہی کی بربادی تک پہنچتا ہے۔ کاش! اگر ان میں یہ موروثی اختلافات نہ ہوتے تو ان کو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

جب یہ اختلافات صحراؤں اور سمندروں کو قطع کر کے تہذیب و تمدن کی آماجگاہ سرزمینِ اندلس تک پہنچ سکے ہیں تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان کیوں نہیں ہو سکتے[1] حالانکہ عربی عصبیت کا زور اس وقت بہت شدید تھا اور جاہلیت کی آگ بجھی نہ تھی۔

ڈوزی ایک اور کتاب میں اسلام کی نشاۃِ اولیٰ، مدینہ میں خلافت کے قیام اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے واقعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگرچہ اسلام کو اپنی متواتر فتوحات اور کامیابیوں کے دوران میں کوئی سخت مقابلہ پیش نہیں آیا۔ پھر بھی مکہ کے سرداروں اور عرب میں شخصی حکومت کے حامیوں نے اس نئے دین کے مددگاروں کی ان کامیابیوں کو کبھی معاف نہیں کیا جو مسلمانوں نے ان پر حاصل کی تھیں اور انہوں نے کبھی صدقِ دل سے اس غلبہ کو قبول نہیں کیا جو توحید پرستوں نے ان پر قائم کیا تھا۔

---

[1] اس امر میں کوئی صداقت نہیں کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی اختلاف تھا۔ حضرت علیؓ نے ہر موقعہ پر حضرت عثمانؓ کی مدد کی ہے اور باغیوں کے مقابل ہر دفعہ حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا ہے۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس فتنہ کے بھڑکانے میں حضرت علیؓ کا ہاتھ تھا اور وہ در پردہ حضرت عثمانؓ کے خلاف باغیوں کی امداد کیا کرتے تھے؟ (مترجم)

مختلف قبائل اور خاندانوں میں کسی بات پر جھگڑے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ظاہر تو یہ کیا جاتا تھا کہ یہ جھگڑے محض شخصی جھگڑے ہیں اور ان سے قوم کے اتفاق اور اتحاد میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا یہ جھگڑے کسی خاص غرض کو سامنے رکھ کر کیے جاتے تھے اور اسی غرض اور مدعا کے گرد تمام تنازعات چکر لگاتے تھے۔

اس امر کا علانیہ ظہور اس وقت ہوا جب حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ۲۴ھ میں زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی عمر ستر سال کی تھی۔ وہ بہت حلیم، نرم مزاج اور ضعیف الارادہ تھے۔ مکہ کی ممتاز شخصیتوں، ان کے خاندانوں اور بنو امیہ پر ان کا بہت زبردست اثر تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جنہوں نے بیس سال تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی تھی اور آخر کار مجبور ہو کر اسلام لائے تھے۔ ان کے ایمان کا کوئی بھروسا نہ تھا۔ لیکن ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے اور جس دن آپ شہید کیے گئے وہ دن ان کے لیے سخت ماتم کا دن تھا۔"

انگریزی مورخ سر ولیم میور لکھتا[1] ہے:

"حضرت عثمانؓ نے بارہ سال تک حکومت کی۔ عربی مصنفین بالاتفاق یہ بات لکھتے ہیں کہ آپ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال نہایت اطمینان اور آرام کے تھے لیکن آخری چھ سال بڑے اضطراب اور پریشانیوں میں کٹے۔ کسی حد تک یہ بات ٹھیک بھی ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کراہت اور بغاوت کے اسباب حضرت عثمانؓ کی ابتدائے خلافت ہی سے کارفرما تھے اور اس کے محرکات حسب ذیل تھے:

۱۔ وہ دشمنی جو تمام عربی قبائل اور قریش کے درمیان قائم تھی۔

۲۔ بغض و عداوت کی وہ آگ جو ہمیشہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں بھڑکتی رہتی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عثمانؓ اموی اور بنو امیہ کے ایک ممتاز فرد تھے۔

عربی فوجیں جو اپنی عظمت کے نشہ میں چور تھیں اور فتح و نصرت کے ثمرات سے بہرہ ور ہو چکی تھیں اب تمام سلطنت میں پھیلی پڑی تھیں۔ شام میں ان کی باگ ڈور کلی طور پر حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی اور ان کی مرضی کے خلاف فوج کچھ نہ کر سکتی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے اثر و اقتدار اور قوت کا اصل باعث ان کے وہ زبردست اہل وطن تھے جو مکہ اور مدینہ کو چھوڑ کر دمشق اور اس کے مضافات میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن بقیہ علاقوں اور شہروں کی حالت اس کے برعکس تھی۔ وہاں کوئی ایسا زبردست ہاتھ نہ تھا جو عربی قبائل کو تھامے رکھتا۔ وہ طاقت اور حکومت کے گھمنڈ اور نشہ میں تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی شخص بھی ان پر حکمرانی اور برتری کا دعویٰ نہ کرے۔ کوفہ اور بصرہ میں تو خصوصاً عصبیت اور فتنہ انگیزی کی روح ترقی پذیر تھی۔ یہی دو شہر تھے جہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سب سے پہلے عصبیت اور افتراق و انشقاق کی یہ روح پیدا ہوئی اور حضرت عمرؓ بھی اس سرکشی اور کج روی کی روک تھام نہ کر سکے۔ وہ لوگ اس منظم حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اسلام کی کامیابی ان کی تلواروں سے

---

[1] "خلافت" از سر ولیم میور صفحہ ۱۹۹، ۲۰۰

ہوئی تھی اور وہ اپنی فتوحات کا ثمر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ اسلام نے اخوت اور مساوات کی آواز اٹھا کر ہر مومن خصوصاً ان لوگوں کو جن کی رگوں میں عربی خون دوڑ رہا تھا ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں دی تھی۔ اسلام نے ان لوگوں کو جو حقوق عطا کیے تھے ان کی رُو سے کسی مسلمان کو کسی پر برتری جتانے کی اجازت نہیں تھی۔

خلفائے نبی علیہ السلام کے جانشین ہونے کی وجہ سے اپنے کام میں آزاد تھے۔ وہ کسی دستوری حکومت کے ماتحت نہیں ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ رائے عامہ کی قدر کرتے تھے اور اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے اردگرد کے سرکردہ اشخاص سے ہر موقع پر مشورہ لیتے تھے بلکہ اپنے عمال کو بھی اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ سرکردہ اشخاص سے مشورہ طلب کرتے رہا کریں اور ان کی رائے پر چلا کریں۔ لیکن عرب قبائل ان امتیازات کو برداشت نہ کر سکے اور یہی چیز کوفہ اور بصرہ میں فساد و فتنہ بھڑکانے کا باعث بنی۔ اس طرح ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جو حکومت اور قریشی اقتدار سے عناد و عداوت سے بھرپور تھی۔

دُوسری وجہ اگرچہ اسلام کو زیادہ نقصان پہنچانے والی نہیں تھی لیکن خلافت اور خصوصاً حضرت عثمانؓ کی شخصیت کے لیے بہت زیادہ خطرہ کا باعث تھی۔ اگر قریش تختِ خلافت کے گرد وفاداری سے مجتمع رہتے تو ضرور وہ عربی عصبیت کی روح کو پیدا ہوتے ہی فنا کر ڈالتے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی کمزوری اور اپنے رشتہ داروں کی طرفداری نے بنی ہاشم میں حسد کی رُوح پھونک دی اور انھوں نے حضرت علیؓ اور خاندانِ رسولؐ کے حقوق کے تحفظ کی آواز بلند کرنی شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ بنو امیہ کی اس شاخ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے جس سے حضرت عثمانؓ تعلق رکھتے تھے۔ یہ شاخ بدقسمتی سے بنو امیہ کی وہ شاخ تھی جس نے سب سے آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعتراف کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ انھی لوگوں کو داد و دہش سے نوازا کرتے اور ان پر انعامات کی بارش کیا کرتے تھے جو اوائل اسلام میں اسلام کے بدترین دشمن تھے اور اس کے مقابلے میں آ چکے تھے۔ ان لوگوں کی دشمنی کے زمانہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کے متعلق جو باتیں فرمائی تھیں وہی باتیں لوگ پھر ان کے متعلق کرنے لگے۔ اس طرح جہاں ان لوگوں کی خفت اور رسوائی ہونے لگی وہاں حکومت بھی ندامت و بدنامی سے نہ بچ سکی جس نے ان لوگوں کو طاقت اور عزت بخشی تھی۔ اس طرح قریش ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ رقابت نے ان کے اثر و نفوذ کو کمزور کر دیا اور حضرت عثمانؓ ان لوگوں کی مدد سے محروم ہو گئے جو شوریدہ سری اور بغاوت کی اس رُوح کو کچل سکتے تھے جس نے دور کے شہروں میں اپنا اثر قایم کر لیا تھا۔"

"ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ" میں (جو دنیا بھر کی تاریخی معلومات کا ایک نہایت ضخیم مجموعہ ہے) لکھا ہے:

"شروع سے لے کر اب تک بلادِ اسلامیہ شخصی اور جابر حکومتوں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کی حکومت بالکل جمہوری طریقوں سے کام کرتی تھی اور تمام مسلمان رعایا حقوق و واجبات میں برابر تھی۔ کسی کو کسی کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کو حکومت میں عمل دخل تھا وہ اس طرح کہ خلفائے بغیر اہل الرائے سے مشورہ لیے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ نظامِ حکومت کے ٹھوس بنیادوں پر قایم رہنے کے امکانات نہیں تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی بہترین سیاست اور حضرت عمرؓ کی سخت گیری نے اس نظام کو مضبوطی سے قایم رکھا لیکن حضرت عثمانؓ ان صفات

سے کامل طور پر متصف نہیں تھے جن صفات سے ان کے دونوں پیشرو بہرہ ور تھے۔ ان صفات کی غیر موجودگی میں ناممکن تھا کہ اس زمانہ میں عرب میں کامل طور پر امن بحال رہ سکتا اور مضبوط حکومت قائم ہو سکتی۔

حضرت عثمانؓ کی اس کمزوری کی وجہ سے جو خلافت کے زمانہ میں آپ سے ظاہر ہوئی، ملک میں گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ ہر گروہ نے ایک نئے والی اور نئے خلیفہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ان گروہوں میں کئی صحابہؓ اور کئی بااثر و بارسوخ آدمی بھی شامل تھے۔ؔ

اس کے بعد یہ مؤلف اس بغاوت کا ذکر کرتا ہے جو بلادِ اسلامیہ میں رونما ہوئی۔ اور بتلاتا ہے کہ کس طرح مختلف علاقوں کے باشندے مدینہ پر چڑھ آئے اور خلیفہ کو اپنے مطالبات منظور کر لینے پر مجبور کرنے لگے۔ پھر ان لوگوں نے دارالخلافہ پر چڑھ آنے کے بعد حکومت کی کمزوری کو محسوس کیا اور اپنی قوت اور حکومت کی کمزوری کے احساس کے سبب انھوں نے کس طرح سرکشی اور فساد پر کمر باندھ لی۔ مؤلف لکھتا ہے کہ اگر مدینہ کی حکومت بزور ان کو مدینہ سے نکال دیتی، ان کے سرغنوں کو جلا وطن کر دیتی اور ان فسادیوں اور باغیوں کو منتشر کرنے میں تلوار کا استعمال کرتی تو یہ مفسدہ پرداز، صحابہ اور باشندگانِ مدینہ کی نظروں کے سامنے کبھی حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرنے کی جرأت نہ کرتے اور معاملہ خلیفہ کی شہادت اور حکومتِ اسلامیہ کی تباہی تک نہ پہنچتا۔

(۱۴)

قریش میں اختلافات

ہم نے پچھلے ابواب میں اختلاف کے مختلف اسباب پر جو بحث کی ہے اس سے ناظرین کافی حد تک اس بدنظمی سے روشناس ہو گئے ہوں گے جو اس زمانہ میں رونما ہوئی تھی اور ان حالات کا علم انہیں اچھی طرح ہو چکا ہوگا جو قریش کے باہمی اختلافات سے پیدا ہوئے تھے۔

یہ قریش کا باہمی اختلاف ہی تھا جو اس اضطراب کے پیدا ہونے اور بغاوت کے پھیلنے کا بنیادی سبب بنا۔ اگر قریش متحد ہوتے، ان کی صفوں میں انتشار پیدا نہ ہوتا۔ ان کے کینے دبے رہتے تو یہ ناممکن تھا کہ باغی مدینہ میں حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیتے اور اپنے اغراض و مطالبات کو قوت اور طاقت کے بل پر خلیفہ، اہلِ شوریٰ اور کبار صحابہؓ کے سامنے پیش کرتے۔

سب سے پہلے اختلاف کا اظہار جس نے قریش کو ٹکڑے ٹکڑے اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اس وقت ہوا جب ان کی ممتاز شخصیتوں کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کے لیے کشمکش اور عداوت پیدا ہوئی۔ حضرت عثمان رضؓ نے

ؔ یہ غلط ہے۔ نہ کسی صحابی نے نئے خلیفہ کا مطالبہ کیا، نہ باغیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور نہ فتنہ و فساد کو ہوا دی۔ (مترجم)

اپنے زمانہ میں بعض عمال کو بدل دیا تھا اور بعض کو معزول کر دیا تھا۔ مثلاً حضرت سعدؓ بن وقاص کو کوفہ سے، حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر سے، حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرہ سے واپس بلا لیا تھا اس سے ان کے دلوں میں جذبہ انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے حضرت عثمانؓ اور ان کے مقرر کیے ہوئے عمال کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں کو بھی ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور وہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

اگر امت کے ممتاز اشخاص باہمی عداوت سے باز رہتے اور مصالح عامہ کے پیش نظر آپس میں تعاون سے کام لیتے تو ان کا اتحاد کبھی یہ فسادات اور بغاوتیں برپا نہ ہونے دیتا لیکن جب دلوں میں کینے گھر کر جائیں، محبت کی جگہ عداوت اور نفرت لے لے، ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بجائے حسد پیدا ہو جائے تو فتنوں، فسادات، اضطراب اور بے چینی کے لیے آپ سے آپ راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہی حال مدینہ کا بھی ہوا۔ اگر ان حالات کی چھان بین کی جائے اور حضرت عثمانؓ کے حق میں جو باتیں وہاں کے سربرآوردہ لوگ آپ کے سامنے اور آپ کے پیچھے کرتے تھے ان پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ سے نفرت میں حد سے بڑھے ہوئے تھے اور بعض نے تو آپ کا لقب ہی "نعثل" رکھ دیا تھا (نعثل ایک مصری تھا جس کی داڑھی بہت لمبی تھی۔ اس سے حضرت عثمانؓ کو مشابہت محض آپ سے نفرت اور ناگواری کی وجہ سے دی جاتی تھی) اور تو اور بڑے بڑے صحابہؓ بھی ایسی باتیں علانیہ عام لوگوں کے سامنے کہتے تھے[2] ظاہر ہے کہ یہ باتیں اضطراب، بے چینی اور بغاوت کو بڑھانے والی ہی ہوتی تھیں۔ انہوں نے حکومتِ اسلامیہ کو جسے اس وقت حضرت عثمانؓ اور آپ کے والی اور عمال چلا رہے تھے، سخت نقصان پہنچایا۔

حضرت عمروؓ بن العاص اپنی معزولی کی وجہ سے حضرت عثمانؓ سے بہت ناراض تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ کے خلاف اپنے دل میں کینہ و بغض لیے مصر سے آئے اور جب مدینہ پہنچے تو آپ سے ملنے گئے۔ اس وقت وہ ایک یمنی جُبّہ پہنے ہوئے تھے جس کے اندر روئی بھری تھی۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے پوچھا کہ:

"تمہارے جُبّے میں کیا ہے؟"

---

[1] ایسے جلیل القدر صحابہؓ کے متعلق یہ الزام محض ایک اتہام ہے اور تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ فتنہ بھڑکانے میں ان حضرات کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ فتنہ بھڑکانے میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ ہر موقعہ پر فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش کی اور باغیوں کو سخت ترین سزائیں دینے کے متعلق حضرت عثمانؓ پر زور دیا۔

[2] صحابہؓ پر حضرت عثمانؓ کی مخالفت کا اتہام کسی صورت میں بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر موقعہ پر انہوں نے نہایت جاں نثاری سے حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا۔ ان کی تصدیق کی اور انہیں باغیوں کا سر کچلنے کا مشورہ دیا۔ حتیٰ کہ مدینہ پر باغیوں کے قبضہ کے بعد اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر ان کا مقابلہ کیا۔ کیا ایسے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کا مخالف قرار دیا جا سکتا ہے؟ سبحانك هٰذا بهتان عظيم۔ (مترجم)

انہوں نے جواب دیا:

"عمروؓ بن العاص ۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اندر کھجور کے پتے بھرے ہوئے ہیں یا کچھ اور؟"

اس کے بعد حضرت عثمان نے ان سے پوچھا کہ تم عبداللہ بن ابی سرح کو جسے میں نے مصر میں تمہارا نائب بنا کر بھیجا تھا کس حالت میں چھوڑ آئے ہو!

انہوں نے جواب دیا:

"جس طرح آپ نے چاہا۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"کیا مطلب؟"

حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب دیا:

"اپنے بارے میں خوب مضبوط، اللہ کے بارے میں کمزور اور ضعیف۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"میں نے تو اسے حکم دیا تھا کہ وہ تمہاری اطاعت کرے۔"

انہوں نے جواب دیا:

"آپ نے اسے ناحق اتنی ناقابلِ برداشت تکلیف دی۔"

اس گفتگو سے حضرت عمروؓ بن العاص کی حضرت عثمانؓ اور مصر کے جدید والی سے شدید ناراضی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بہتر اور زیادہ تجربہ کار خیال کرتے تھے۔

حضرت عمروؓ بن العاص ایک ذکی اور انتہائی ہوشیار انسان تھے۔ انہوں نے اپنی ذکاوت سے اس اضطراب اور بے چینی کو معلوم کر لیا جو حضرت عثمانؓ کے خلاف پیدا ہو رہی تھی۔ وہ مدینہ سے چلے گئے۔ فلسطین میں جا کر رہائش اختیار کر لی اور وہاں انتظار کرنے لگے کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ وہ مدینہ کے بار بار چکر لگاتے رہتے تھے تاکہ حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کر سکیں۔ حضرت عثمانؓ ان کی ذکاوت اور پیش بینی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ مدینہ آتے آپ ان سے معاملاتِ حکومت میں مشورہ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے ملکی حالات کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا:

"میں دیکھتا ہوں کہ آپ ان باغیوں سے بہت نرمی کا سلوک کر رہے ہیں اور انہیں ڈھیل دے رکھی ہے حالانکہ آپ کو چاہیے کہ اپنے پیشرو کا طریقہ اختیار کریں اور سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی

برتیں۔[1] ان لوگوں کے ساتھ سختی ضرور کرنی چاہیے جو لوگوں کے ساتھ برائی کرنے سے باز نہ آئیں۔ اور ان لوگوں سے نرمی برتنی چاہیے جو سارے کام صلح و صفائی سے طے کرنا چاہیں۔ لیکن آپ ہر ایک سے نرمی برت کے سب کے ساتھ یکساں سلوک کر رہے ہیں۔"

ایک دن حضرت عثمانؓ نے پھر حضرت عمروؓ بن العاص سے اس فتنہ کے متعلق ان کی رائے معلوم کی جو بلادِ اسلامیہ میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔

انہوں نے جواب دیا:

"آپ نے بنی امیہ کو لوگوں کے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔ میں بھی کہتا ہوں اور لوگ بھی کہ آپ بھی اصل راستے سے ہٹ گئے ہیں اور آپ کے عمال و شرکا بھی۔ آپ میانہ روی اختیار کیجئے اور ان کو معزول کر دیجئے۔ لیکن اگر آپ یہ نہیں مانتے تو اپنے ارادہ پر قائم رہئے اور جس طرح کام چلتا ہے اسے چلتا رہنے دیجئے۔"

طبری کی روایت ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص اپنی معزولی کے بعد سے حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنے لگے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ نے سنا تو انہیں بلا بھیجا اور اس طرح گفتگو کی:

"میں نے سنا ہے تم مجھ پر اعتراض کرتے رہتے ہو۔ میرے سامنے تمہارا طرزِ عمل اور ہوتا ہے اور میرے پیچھے اور!"

حضرت عمروؓ بن العاص نے جواب دیا:

"لوگ تو اسی طرح باتیں بنایا اور اپنے والیوں کی ذات سے ایسی ہی جھوٹی باتیں منسوب کیا کرتے ہیں۔ امیر المومنین! آپ کو اللہ سے ڈرنا چاہیے۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

---

[1] قابلِ غور امر اس جگہ یہ ہے کہ جو شخص باغیوں کے متعلق یہ رائے رکھتا ہو اس کی نسبت یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کا مخالف تھا۔ اگر حضرت عمروؓ بن العاص حضرت عثمانؓ کے مخالف ہوتے اور ان کو اپنے معزول کیے جانے کے متعلق حضرت عثمانؓ سے کینہ ہوتا تو کیا وہ باغیوں کا سر کچلنے کا مشورہ دے سکتے تھے۔ ایسا شخص تو خدا سے چاہتا ہے کہ فتنہ و فساد کا کوئی موقعہ پیدا ہو، اس شخص کے خلاف بغاوت کھڑی ہو اور میں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ اگر حضرت عمروؓ بن العاص کو حضرت عثمانؓ سے کینہ اور مخالفت ہوتی تو وہ اس موقعہ پر باغیوں کا ساتھ دیتے اور ان کو اپنے ساتھ ملا کر فتنہ کی آگ کو اور زیادہ بھڑکاتے۔ نہ یہ کہ وہ حضرت عثمانؓ کو ان کا سر کچلنے کا مشورہ دیتے۔ اس روایت کی موجودگی میں دوسری روایتوں کی حقیقت خوب واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل روایات میں اتنا تناقض ہو گیا ہے کہ ایک انسان کو اصل حقیقت معلوم کرنی سخت دشوار ہو گئی ہے اس موقعہ پر ہمیں صحابہؓ کے متعلق نیک ظنی ہی سے کام لینا چاہیے اور ان بے سر و پا روایتوں پر قطعاً یقین نہیں کرنا چاہیے۔ جن لوگوں کے متعلق خود خدا تعالیٰ نے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ فرمایا ہے کیا وہ ایسی باتیں کر سکتے ہیں جن سے نہ صرف ان پر بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حرف آتا ہے کہ نعوذ باللہ آپؐ صحابہ کی تربیت ٹھیک طور پر نہ کر سکے اور وہ محض اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے بن گئے۔ (مترجم)

"میں نے باوجود تمہاری تنگ نظری کے تمہیں عامل بنائے رکھا حالانکہ تمہارے خلاف اکثر شکایتیں مجھے موصول ہوتی رہتی تھیں"

عمروؓ بن العاص نے جواب دیا:

"میں تو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد سے عامل تھا اور جس وقت ان کی وفات ہوئی وہ مجھ سے خوش تھے"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"اگر میں بھی اسی قسم کا سلوک کرتا جو حضرت عمرؓ نے تم سے کیا تھا تو تم ٹھیک رہتے۔ لیکن میں نے تم سے نرمی کی تو اب تم الٹا مجھے الزام دیتے ہو۔ کیا جاہلیت میں اور کیا خلیفہ ہونے سے پہلے، میں تو جتھے کے اعتبار سے تم پر فوقیت رکھتا تھا"

عمروؓ بن العاص نے جواب دیا:

"ان باتوں کو چھوڑیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیں ایمان لانے اور آپ کے ذریعہ ہدایت پانے کی توفیق دی۔ البتہ آپ نے عاص بن وائل اور اپنے والد عفان کو ضرور دیکھا ہے اور عاص آپ کے والد سے زیادہ معزز تھے"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"ہمیں جاہلیت کی باتوں کو یاد ہی نہیں کرنا چاہیے"

غرضیکہ اسی قسم کی باتیں ان دونوں کے درمیان ہوئیں اور حضرت عمروؓ بن العاص حضرت عثمانؓ کے پاس سے ناراض ہو کر آپ پر اور آپ کی سیاست پر اعتراض کرتے ہوئے چلے آئے۔[1]

اسی طرح کا اختلاف حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف میں بھی پیدا ہو گیا اور ان دونوں کے درمیان سخت خط و کتابت ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عثمانؓ کے عہد ہی میں وفات پا گئے۔

حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کے شروع میں ان صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مشیر تھے اور ولایات کے سلسلہ میں ان والیوں کی رائے پر اعتماد کرتے تھے جو حضرت عمرؓ کے عمال تھے۔ لیکن پھر انہوں نے اپنے اہل و عیال اور خاندان والوں کے مشوروں پر ہی انحصار کرنا شروع کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب انہوں نے بعض علاقوں میں اٹھتے ہوئے فتنہ کی خبریں سنیں تو یہ خیال کیا کہ ان کے اہل و عیال اور اہلِ خاندان ہی ان کے مددگار اور دوسروں سے زیادہ مخلص ثابت ہوں گے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی اس سیاست نے ان قریشیوں کو جو بنی اُمیّہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے سخت ناراض کر دیا۔ حضرت عثمانؓ

---

[1] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے صحابہؓ سے یہ بات بعید ہے۔ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجا ہو وہ ایسی معمولی باتوں پر کسی صورت میں جھگڑ نہیں سکتے۔ اس قسم کی ساری روایتیں بالعموم ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے حالات کا غلط مطالعہ کیا، یا پھر ان سے غلط نتائج اخذ کیے یا جنہوں نے اپنے دل میں خواہ مخواہ اس بات پر یقین کر لیا کہ حضرت عثمانؓ کمزور خلیفہ تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ واقعی ایسے کمزور تھے تو سارے جھگڑے اور ساری بغاوتیں ان کی خلافت کے اوائل ہی میں کیوں نہ رونما ہو گئیں اور کیوں نو دس برس تک انہوں نے نہایت اطمینان سے خلافت کی! (مترجم)

تختِ خلافت پر متمکن ہونے تو حضرت علیؓ اور آپ کے ساتھی آپ سے انتہائی ناراض تھے[1]۔ اور جیسا کہ کتاب "فجر الاسلام" میں لکھا ہے ان کی ناراضی اور بھی بڑھی جب حضرت عثمانؓ نے امویوں کی پُشت پناہی کرنی شروع کر دی اور اکثر عمّال انہی میں سے بنا ئے۔ آپ کا کاتب اور پرائیویٹ سیکرٹری مروان بن الحکم بھی اموی تھا۔ اسلام نے جاہلی عصبیت کے خلاف جو میدان تیار کیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے جس کی غور و پرداخت میں اپنا سارا وقت صرف کیا تھا اس کو اسی مروان اور اس کے ساتھیوں نے ملیا میٹ کر ڈالا[2]۔ اور انہوں نے اس طرح حکومت کرنی شروع کی گویا حکومت امویوں کی ہے عربوں کی نہیں۔ اس طرزِ عمل نے اس پرانی دشمنی کو دوبارہ زندہ کر دیا جو جاہلیت کے زمانہ میں بنی ہاشم اور بنی امیہ میں تھی۔ حضرت عثمانؓ کے آخری عہد میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں جو بار بار لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے معزول کرنے اور آپ کی جگہ کسی اور کو خلیفہ مقرر کرنے پر اکساتی رہتی تھیں۔ بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو حضرت علیؓ کی خلافت کا پروپیگنڈہ کرتی رہتی تھیں۔ ان کا سب سے مشہور سردار عبداللہ بن سبا تھا۔ یہ یمنی یہودی تھا جو بعد میں محض دنیا کے دکھاوے کو اسلام لے آیا تھا۔ یہ شخص بصرہ، کوفہ، شام اور یمن میں پھرتا رہتا تھا، اور کہتا تھا:

"ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت علیؓ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو پورا نہ کرے اور آپؐ کے وصی کا حق غصب کر لے۔"

یہ شخص ان لوگوں کا سب سے بڑا سرغنہ تھا جنہوں نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف ابھارا حتیٰ کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔

یعقوبی کہتا ہے کہ:

"حضرت عثمانؓ نے اپنے قرابت داروں کو ترجیح دی، اپنے خاندان والوں کی ہر معاملہ میں پشت پناہی کی اور اللہ اور مسلمانوں کے اموال سے گھر اور جائداد بنائی اور دولت و ثروت جمع کی۔ حضرت ابوذر غفاری صحابی اور عبدالرحمٰن بن حنبل کو جلا وطن کر دیا۔ حکم بن ابی العاص اور عبداللہ بن ابی سرح کو جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھٹکارے ہوئے تھے پناہ دی۔ ہرمزان کے قتل کو جائز قرار دے کر عبیداللہ بن عمر کو اس کے قصاص کے طور پر قتل نہ کرایا۔ ولید بن عقبہ کو کوفہ کا والی بنا دیا جس نے نماز میں بدعتیں

---

[1] حضرت علیؓ جیسے مقدس انسان پر یہ الزام کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند تھے اور اسی بنا پر خدا کے خلیفہ سے بھی وہ ناراض تھے، محض ایک اتہام ہے۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے بعد سب سے پہلے حضرت علیؓ نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کی بیعت کرنا تھا کہ تمام حاضرین بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ (ابنِ سعد جزو ۳ صفحہ ۴۳)

[2] یہ امر کہ حضرت عثمانؓ نے سارا کام مروان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا، ایک ایسا الزام ہے جس کی کسی طرح بھی تصدیق نہیں ہوتی۔ بیشک مروان حضرت عثمانؓ کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا لیکن امورِ سلطنت کا سارا کام حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں تھا اور آپ سختی کے ساتھ ہر بات کی نگرانی کرتے تھے۔ اگر مروان وغیرہم میں سے کوئی بے راہ روی کا مرتکب ہوتا تو آپ اس کو بھی ضرور سزا دیتے۔ اگر مروان کے ہاتھ ہی میں سب کچھ تھا تو جو عمال حضرت عثمانؓ نے برطرف کیے وہ کس طرح برطرف ہو سکتے تھے! (مترجم)

شروع کردیں لیکن ان بدعتوں سے بھی اس کو منع نہ کیا۔"[1]

یعقوبی ایک اور جگہ حضرت عائشہؓ کی حضرت عثمانؓ سے کشیدگی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو جو وظیفہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ملتا تھا حضرت عثمانؓ نے اس میں کمی کر دی تھی۔ حضرت عائشہؓ موقعہ کی تلاش میں رہیں۔ چنانچہ ایک روز جبکہ حضرت عثمانؓ خطبہ دے رہے تھے انہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک چادر لوگوں کو دکھائی اور فرمایا ؛

"اے لوگو! یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر ہے جو اب تک میلی نہیں ہوئی۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے آپ کی سنت کو بدل ڈالا۔"

جب فتنہ کھڑا ہوا اور معاملہ انتہائی نازک مرحلہ پر پہنچ گیا تب بھی حضرت عائشہؓ نے آپ کے اور باغیوں کے درمیان صلح کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس موقعہ پر مروان آپ کے پاس گیا اور آپ سے دونوں فریقوں میں صلح کرانے کی درخواست کی۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے معذوری ظاہر کی اور کہا میں تو حج کو جا رہی ہوں۔ مروان نے کہا اگر آپ نے صلح کرا دی تو حضرت عثمانؓ آپ کو ایک درہم کے بدلہ میں جو آپ اس سلسلہ میں خرچ کریں گی، دو درہم دیں گے۔

اس پر حضرت عائشہؓ نے جواب دیا ؛

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں عثمانؓ کے معاملہ میں کسی شک میں ہوں۔ خدا کی قسم میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اگر مجھ میں ان کے اٹھانے کی طاقت ہو تو انہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔"[2]

---

[1] یہ ایک انتہائی متعصب آدمی کی رائے ہے۔ اس نے جو الزامات اور اتہامات حضرت عثمانؓ پر لگائے ہیں وہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی قسم کی تحقیقات کے لگائے ہیں اور ان کا رد ہم اپنے پیش لفظ میں کر چکے ہیں۔

[2] تعجب ہے کہ مورخین کس بے تکلفی کے ساتھ اور بغیر تحقیق کے اس قدر سخت الزام جلیل القدر صحابہؓ پر کس طرح لگا دیتے ہیں جن کے ثابت کرنے کے لیے نہ ان کے پاس کوئی عقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ نقلی۔ وہ حضرت عائشہؓ جو یہ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر خدا تعالیٰ تم کو خلافت کا جامہ پہنائے تو تم اس کو اپنی خوشی سے نہ اتارنا (مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۶۳) وہ کس طرح یہ کہہ سکتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا۔ یاد رہے کہ حضرت عائشہؓ کی حضرت عثمانؓ سے کشیدگی کی روایت یعقوبی کی بیان کردہ ہے جو حضرت عثمانؓ کا سخت دشمن تھا۔ اس امر کی موجودگی میں اس کی روایت کا کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو حضرت عثمانؓ سے کسی قسم کی کدورت نہ تھی اور کوئی اختلاف آپ کو ان سے نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ کا حج کے سفر میں باغیوں کے ایک سرغنہ محمد بن ابی بکر کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنا صاف ثابت کر رہا ہے کہ حضرت عائشہؓ دل سے چاہتی تھیں کہ کسی طرح اس فتنہ کی شدت کم ہو۔ انہوں نے محمد بن ابی بکر کو سمجھایا بھی کہ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانا۔ خود حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ حضرت عثمانؓ کے تذکرہ میں فرمایا ؛

"خدا کی قسم میں نے کبھی پسند نہ کیا کہ عثمانؓ کی کسی قسم کی بے عزتی ہو، اگر کیا ہو تو ویسی ہی حالت میری بھی ہو۔ خدا کی قسم میں نے کبھی پسند نہ کیا کہ وہ قتل ہوں، اور اگر کیا ہو تو میں بھی قتل کی جاؤں۔ اے عبید اللہ بن عدی (ان کے باپ حضرت

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ اور بیت المال کے خزانچی کے درمیان بھی چپقلش اور منافرت تھی۔ نقاد اس جھگڑے کو بھی آپ کی مالی سیاست پر اعتراض کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جھگڑا آپ کے اور بیت المال کے خزانچی کے درمیان اس مال کے بارہ میں تھا جو بیت المال کی حفاظت کے لیے اس کو ملا کرتا تھا۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے کہا:

"تو ہمارا خزانچی ہے۔ جب ہم تجھے دیں تو تُو لے لیا کر۔ لیکن جب ہم نہ دیں تو خاموش رہا کر۔"

خزانچی نے جواب دیا:

"ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کا خزانچی نہیں ہُوں اور نہ آپ کے خاندان کا۔ میں تو مسلمانوں کا خزانچی ہُوں۔"

جمعہ کے روز جب حضرت عثمانؓ خطبہ دے رہے تھے تو وہ بیت المال کی کنجیاں لے کر آیا۔ اور کہنے لگا کہ عثمانؓ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کا اور ان کے خاندان کا خزانچی ہوں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میں مسلمانوں کا خزانچی ہوں یہ لو اپنے بیت المال کی کنجیاں۔

یہ کہہ کر اس نے وہ کنجیاں سامنے پھینک دیں۔ حضرت عثمانؓ نے اٹھا کر زیدؓ بن ثابت کے حوالے کر دیں[1]۔

ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلوں میں کس قسم کے کینے اور بغض بھرے ہُوئے تھے۔ یہی باتیں اس بغاوت کا باعث ہوئیں جس کا تفصیلی ذکر ہم آیندہ فصول میں کریں گے۔

(۱۵)

کُوفہ میں فتنہ

کوفہ فساد کا گڑھ تھا۔ فساد کی چنگاریاں سب سے پہلے یہیں سے اُٹھی تھیں۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

علیؓ کے ساتھ تھے) تم کو اس علم کے بعد کوئی دھوکا نہ دے اصحاب رسول کے کاموں کی تحقیر اس وقت تک نہ کی گئی جب تک وہ فرقہ پیدا نہ ہُوا جس نے حضرت عثمانؓ پر طعن کیا۔ اس نے وہ کہا جو نہیں کہنا چاہیے تھا، وہ پڑھا جو نہیں پڑھنا چاہیے تھا، اس طرح نماز ادا کی جس طرح ادا نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے ان کے کارناموں کو غور سے دیکھا تو پایا کہ وہ صحابہؓ کے کمال کے قریب تک نہ تھے۔" (یہ پوری تقریر حضرت امام بخاریؒ نے جزء خلق افعال العباد میں نقل کی ہے صفحہ ۷، مطبع انصاری دہلی)

یہ روایت حضرت امام بخاریؒ نے نقل کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کی نقل کردہ روایت اور دوسرے لوگوں کی نقل کردہ روایتوں میں سے لازماً حضرت امام بخاریؒ کی روایت کو ہی ترجیح حاصل ہو گی۔

[1] اس الزام پر بحث ہم پیش لفظ میں کر آئے ہیں۔ (مترجم)

عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا والی مقرر کیا تھا۔ انہوں نے امیر بیت المال عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ بیت المال سے کچھ رقم قرض لی جب ادائے قرض کا وقت آیا تو ابنِ مسعود ان کے پاس آئے اور اس رقم کا مطالبہ کیا۔ لیکن سعد کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ رقم ادا کر سکتے۔ انہوں نے معذوری ظاہر کی۔ ان کے درمیان بات بڑھ گئی۔ ابن مسعودؓ اور سعد بن ابی وقاص دونوں نے لوگوں کو اپنے اپنے ساتھ ملا لیا۔ بعض لوگوں نے سعد کو قرض کی ادائیگی میں دیر کرنے پر ملامت شروع کی اور بعض نے ابنِ مسعود کو قرض وصول کرنے میں سختی اور شدت کرنے پر بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ جب حضرت عثمانؓ کو یہ خبر پہنچی تو آپ کو بہت غصہ آیا اور آپ نے ان دونوں کو سزا دینی چاہی۔ لیکن اس کے بعد صحیح حالات کی تحقیق کرنے پر سعد بن ابی وقاص کو ولایت کوفہ سے معزول کر دیا اور ابن مسعود کو خراج وصول کرنے پر بدستور مقرر کیے رکھا۔ سعد کی جگہ آپ نے ولید بن عقبہ کو والی مقرر کیا جو حضرت عمرؓ کے عہد میں الجزیرہ کا عامل تھا۔ ولید نے آتے ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ پانچ سال اس نے گزارے لیکن اس کے گھر کی ڈیوڑھی تک نہ تھی۔

ولید کی ولایت کے اثنا میں یہ واقعہ ہُوا کہ کوفہ کے کچھ نوجوانوں نے ایک گھر میں نقب لگائی اور گھر کے مالک کو قتل کر دیا۔ اس کا پڑوسی یہ سب واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پولیس کے محافظوں کو مدد کے لیے پکارا۔ پولیس آئی اور ان ڈاکوؤں کو جن میں زہیر بن جندب ازدی، مورع بن ابی مورع اسدی اور شبیل بن ابی ازدی شامل تھے گرفتار کر لیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور قتل کا جرم ثابت ہونے پر وہ قتل کر دیے گئے۔ ان کے والدین کے دلوں میں ولید کے خلاف کینہ پیدا ہو گیا اور وہ اس سے انتقام لینے کے لیے کسی موقعہ کی تاک میں لگے رہے۔ ولید کے پاس بعض داستان گو تھے جو رات کو اسے قصّے اور داستانیں سنایا کرتے تھے ان میں ایک شخص ابو زبید الطائی بھی تھا۔ یہ شخص پہلے عیسائی تھا پھر مسلمان ہو گیا۔ شراب پینے میں مشہور تھا۔ جب ولید کوفہ کا والی مقرر ہوا تو ابو زبید اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے پاس آیا۔ یہ شاعر بھی تھا۔ ولید نے اس کو اپنے داستان گویوں میں شامل کر لیا۔ چنانچہ یہ اس کے پاس آنے جانے لگا۔ ایک روز اسی ٹولی کا ایک شخص جس کے بیٹوں کو ولید نے قتل کرا دیا تھا، اپنی ٹولی میں آیا اور کہنے لگا:

"تمہیں کچھ اور بھی خبر ہے؟ ولید ابو زبید کے ساتھ بیٹھا ہوا شراب پی رہا ہے۔"

ان لوگوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے یہ بات تمام شہر میں پھیلا دی اور ہر طرف اسی کا چرچا ہونے لگا۔ بعض بیوقوف اس ٹولی کے ساتھ ہو لیے اور یہ سب مل کر اسی وقت ولید کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ولید اس وقت ابو زبید کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا لیکن شراب کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اب ان بیوقوفوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ان فسادیوں کو لعنت ملامت کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

ولید نے اس بات کو چھپائے رکھا اور خلیفہ تک کو اس کی خبر نہ کی۔ لیکن اس کے دشمن اپنی کارروائیوں سے باز نہ آئے وہ ابنِ مسعود کے پاس پہنچے اور انہیں اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ ابنِ مسعود نے کہا:

"اگر کوئی شخص اپنی باتیں ہم سے چھپانا چاہتا ہے تو ہمارا یہ کام نہیں کہ ان کی ٹوہ میں رہیں۔ وہ جانے اور اس کا کام۔"

جب ولید کو اس کی اطلاع پہنچی تو اسے بہت رنج ہوا اور اس نے ابن مسعود سے شکوہ کیا کہ آپ نے ان فسادیوں کو ایسا جواب دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو بھی مجھ پر شک ہے۔ بتلائیے میں نے کیا چیز چھپائی ہے۔

اس پر بات بڑھ گئی اور دونوں میں شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ ان مفسدوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مدینہ جا کر ولید کی شکایت کرنے اور اس پر شراب نوشی کا الزام لگانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ان میں سے دو شخص ولید کے خلاف شہادت دینے کے لیے مدینہ روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عثمانؓ کو معلوم تھا کہ ان کو ولید نے انتظام ملکی سے بالکل علٰحدہ کر رکھا ہے۔ یہ سب مل کر مدینہ پہنچے اور حضرت عثمانؓ سے جا کر شکایت کی کہ ولید شراب پیتا ہے۔ اور ان دو آدمیوں نے شہادتیں دیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ولید کو بلا بھیجا اور اسے معزول کر کے اس پر حد جاری کی۔

ولید کے بعد حضرت عثمانؓ نے سعید بن عاص کو کوفہ کا والی مقرر کیا۔ وہ جب کوفہ روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ یہی لوگ تھے جنہوں نے ولید پر ناحق تہمت لگائی تھی، ان کے نام یہ تھے:

مالک المعروف بہ اشتر نخعی،

ابو خشہ غفاری،

جندب بن عبداللہ،

ابو مصعب بن جثامہ۔

سعید بن عاص منبر پر چڑھے اور حمد و ثنا کے بعد کہا:

"مجھے اپنے اس تقرر سے کوئی خوشی نہیں ہے۔ لیکن تمہیں بہرحال میرا حکم ماننا پڑے گا۔ فتنہ سر اٹھا رہا ہے، میں اس کو سختی سے کچلوں گا اور اس میں تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔"

سعید نے کوفہ میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ وہاں کے معتبر اشخاص سے وہاں کے حالات اور باشندوں کے متعلق مکمل واقفیت حاصل کی اور بایں الفاظ حضرت عثمانؓ کو رپورٹ بھیجی:

"کوفہ میں حالات بہت زیادہ بگڑتے جا رہے ہیں۔ یہاں اوباش اور دین سے ناواقف لوگ غالب ہیں اور شرفاء مغلوب۔ اوباشوں کے ہاتھوں شرفاء کی عزت، مال اور جان تک محفوظ نہیں ہے۔"

حضرت عثمانؓ نے ان کو جواب میں لکھا:

"جو لوگ بڑی بڑی قربانیاں کر کے پہلے پہل دشمنوں کے مقابلہ کے لیے آئے تھے اور جن کے ذریعہ اللہ تعالٰے نے اس علاقہ کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیا تھا ان کو ہر کام میں مقدم رکھو اور ان کی عزت و احترام میں فرق نہ آنے دو۔ دوسرے لوگ ان کے تابع ہوں۔ لیکن اگر وہ دین سے بے توجہی برتیں اور اس کو صحیح طور پر قائم رکھنے میں سُستی سے کام لیں تو بے شک ان لوگوں کو آگے جگہ دینی چاہیے جو ان سے زیادہ دینی کاموں میں چُستی دکھاتے ہوں۔ ہر ایک کے مرتبہ کا خیال رکھو اور برنائے انصاف ہر ایک کو اس کا حصّہ دو۔ کیونکہ لوگوں کے صحیح مرتبہ کا خیال رکھنے سے ہی عدل قائم کیا جا سکتا ہے۔"

سعید نے شہر کے معززین و شرفا اور جنگِ قادسیہ میں شریک ہونے والے مجاہدین کو بلا بھیجا اور ان سے کہا :

"تم شہر کے معزز لوگ ہو ۔ چہرہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ تمام جسم کا حال بتلائے ۔ اس لیے تم ہر حاجت مند کی حاجت اور ضرورت مند کی ضرورت میرے پاس پہنچایا کرو۔"

ان لوگوں کے ساتھ ایسے لوگ بھی اس مجلس میں تھے جن کا شمار معززین اور شرفا میں نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن حضرت سعید بن العاص کا روئے سخن صرف معززین و شرفا کی جانب تھا ۔ اس پر ان اوباشوں اور مفسدوں کی آتشِ غضب اور بھڑک اُٹھی ۔ ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو سعید بن العاص کی توجہ اور لطف و عنایت کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے تھے ۔ ان فسادیوں کو جنہوں نے ولید کو معزول کرایا تھا، یہ امید تھی کہ سعید ان کو انتظامِ ملکی میں وافر حصہ دیں گے ، ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور اپنے ہر مشورہ میں ان کی شرکت ضروری سمجھیں گے ۔ لیکن جب ان کی یہ امیدیں خاک میں مل گئیں تو انہوں نے اپنا قدیم مشغلہ اختیار کر لیا اور سعید کے خلاف شور و غوغا اور ان کی سیاست اور ان کے کاموں پر نکتہ چینی شروع کر دی۔

سعید کی مجلس میں صرف چند مخصوص لوگوں ہی کو آنے کی اجازت تھی اور یہ وہی لوگ تھے جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وہ شہر کے شرفاء ، معززین اور قادسیہ کے مجاہدین تھے ۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایسی مجلسیں بھی منعقد کیا کرتے تھے جن میں عام آدمیوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی ۔ ایک دن سعید اسی قسم کی ایک مجلس میں بیٹھے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ دورانِ گفت گو میں حبیش اسدی نے طلحہ بن عبید اللہ کی سخاوت کا ذکر کر دیا ۔ سعید نے کہا :

"جس شخص کے پاس اتنی دولت و ثروت ہو ، اسے اتنا ہی سخی ہونا چاہیے ۔ خدا کی قسم اگر میرے پاس اتنا مال ہوتا تو تم سب کو نہال کر دیتا ۔"

اس پر ایک نوجوان بول اٹھا :

"آپ اپنے لیے ملطاط کیوں نہیں لے لیتے ؟"

(ملطاط آلِ کسریٰ کی ایک بڑی وسیع جاگیر تھی جو دریائے فرات پر کوفہ سے بالکل ملی ہوئی تھی)

اس پر مفسدین نے جن میں اشتر نخعی ، عمر بن ضابی اور اسی قماش کے دوسرے لوگ شامل تھے اس نوجوان سے کہا :

"خدا تیرے منہ کو توڑے ، ہماری زمین کو تو اس کے حوالے کرنا چاہتا ہے ۔"

اور ساتھ ہی جوش میں آکر اس نوجوان کو مارنا شروع کر دیا اور جب اس کے باپ نے اسے بچانا چاہا ، تو اس غریب کو بھی گھیرے میں لے لیا ۔ یہ سب کچھ سعید کی مجلس میں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا ۔ قریب تھا کہ بلوہ ہو جائے مگر سعید نے ان فسادیوں کو دھکے دے کر اپنی مجلس سے نکلوا دیا اور آیندہ کے لیے ان لوگوں کا اپنی مجلس میں آنا بالکل بند کر دیا ۔

ان لوگوں کی اصل غرض یہ تھی کہ امیر اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کے خلاف فتنہ پھیلائیں ۔ اب انھوں نے علی الاعلان اہلِ حکومت پر نکتہ چینیاں شروع کر دیں ۔ سعید اور شرفاء کوفہ نے حضرت عثمانؓ کو تمام حالات سے اطلاع دی اور ان

فتنہ پردازوں کے متعلق ان کی رائے طلب کی۔ حضرت عثمانؓ نے لکھا :

"اگر رؤسائے کوفہ متفق ہوں تو ان فسادیوں کو شام میں معاویہ کے پاس بھیج دو۔"

چنانچہ سعید نے ایسا ہی کیا اور ان کو کوفہ سے نکال کر حضرت معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ ابتداءً حضرت معاویہ ان سے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی عزت و تکریم کی اور انہیں اپنی گفتگو کے دوران میں فتنہ و فساد سے دامن بچانے کی تلقین کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا اور یہ لوگ اب تک اپنے آپ کو کوفہ میں سمجھ رہے ہیں تو انہوں نے انہیں سخت ڈانٹ پلائی اور کہا :

"یاد رکھو! یہ کوفہ نہیں شام ہے۔ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو شام والے تم سے اس بری طرح پیش آئیں گے کہ میں ان کا والی اور امام ہوتے ہوئے بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا اور وہ تمہاری تکا بوٹی کر کے رکھ دیں گے۔"

اس کے بعد امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ وہ ان لوگوں کی اصلاح کرنے سے بالکل عاجز آ گئے ہیں اور شام میں ان کا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو حمص عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی طرف چلتا کر دیں۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ جب یہ لوگ دمشق سے نکلے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوفہ کا رخ تو کرنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ہم سے ہنسی ٹھٹھا کریں گے اور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے عراق اور شام کو چھوڑ کر جزیرہ چلو۔ چنانچہ وہ جزیرہ چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو جو حمص میں تھے ان کے آنے کا حال معلوم ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے ان لوگوں کو بلایا اور کہا :

"یاد رکھو اگر تم نے یہاں فتنہ و فساد کی ذرا بھی کوشش کی تو میں تمہیں اتنی سخت سزا دوں گا کہ سب قدر و عافیت معلوم ہو جائے گی۔ مجھے پتا نہیں تم عرب ہو یا عجمی۔ خدا مجھے ذلیل کرے اگر میں تمہیں ٹھیک نہ کر دوں۔ خبردار! مجھے معاویہ نہ سمجھنا، میں خالد بن ولید کا بیٹا ہوں۔ اس شخص کا بیٹا جس نے فتنۂ ارتداد کو دور کیا تھا۔ اس شخص کا بیٹا جو بڑے بڑے امتحانوں میں کامیاب نکلا تھا۔ اے صعصعہ بن ذل (ان مفسدین میں سب سے بڑا فتنہ پرداز شخص) اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ اگر تیرے ساتھیوں میں سے کسی نے کسی شخص کے سامنے فتنہ و فساد پھیلانے کی کوشش کی تو تجھے اتنی شدید سزا دوں گا کہ تیرے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گی۔"

اس کے بعد سے عبدالرحمٰن نے یہ دستور بنا لیا کہ جب کبھی دورہ پر جاتے ان کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ جب کبھی ان کے پاس سے گزرتے ان سے کہتے :

"اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔"

اس پر وہ توبہ تلا کرنے اور اپنے کرتوتوں کی معافی چاہتے۔ کچھ عرصہ کے بعد اشتر حضرت عثمانؓ کے پاس گیا اور نادم و تائب ہونے کے بعد، آپ سے اپنے ساتھیوں کے لیے معافی کا خواستگار ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان لوگوں کو کوفہ واپس بھیج دینا چاہا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوئے اور جزیرہ ہی میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔

اسی اثنا میں سعید نے اپنے عمال اور امراء کو فارس کے قریبی علاقے میں پھیلا دیا۔ اس طرح کوفہ رؤسا و اشراف اور مخلص لوگوں سے خالی ہو گیا۔ ادھر سعید کو حضرت عثمانؓ نے مدینہ بلا بھیجا۔ اب لوگ انہی مفسدین کے زیر اثر رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کو جو موقع ملا تو پھر اسی سرکشی، بغاوت اور فساد پر اُتر آئے۔ جب سعید نے کوفہ واپس آنے کا ارادہ کیا تو جرعہ کے مقام پر مفسدین ان سے ملے اور انھیں اپنا امیر ماننے سے انکار کر کے واپس کر دیا۔ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس چلے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے بجائے اس کے کہ سختی اور شدت سے کام لیتے، اہلِ کوفہ کے مطالبہ کو مانتے ہوئے ابو موسیٰ اشعریؓ کو وہاں کا والی مقرر کر دیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے کوفہ کا مکمل حال معلوم ہو جاتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ کس طرح وہاں مفسد غالب آ گئے۔ حکومت کے کام میں ضعف پیدا ہو گیا، اطاعت کا نام و نشان تک نہ رہا اور قوم حاکموں کے اثر سے بالکل آزاد ہو گئی۔

(۱۶)

بصرہ میں فساد

بصرہ عراق کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ ایک وقت میں تو یہاں کے لوگ سرکشی اور حکام کی خلاف ورزی میں کوفہ کے لوگوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پہلے عامل ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کا بیان گزر چکا ہے۔ بصرہ والوں نے جب حضرت عثمانؓ سے ابو موسیٰ اشعریؓ کی جگہ کسی نئے عامل کے تقرر کا مطالبہ کیا تو حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کر دیا۔ ابن عامر کی فتوحات اور ایران میں ان فتوحات کے اثرات بیان ہو چکے ہیں۔ ابن عامر کی امارت بصرہ اور بحرین کے اعمال پر مشتمل تھی۔ اپنی امارت کے تیسرے سال ان کو پتا چلا کہ قبیلہ عبدالقیس میں حکیم بن جبلہ کے ہاں ایک شخص آ کر اترا ہے۔ حکیم بن جبلہ دراصل ایک ڈاکو تھا جس کا کام لوٹ مار کرنا، ذمیوں کو ستانا اور فساد پھیلانا تھا۔ تنگ آ کر ذمیوں اور اس کے علاقے کے باشندوں نے حضرت عثمانؓ سے شکایت کی۔ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن عامر کو حکم دیا کہ وہ حکیم اور اس کے ساتھیوں کو بصرہ میں نظر بند کر دیں اور اس وقت تک نہ چھوڑیں جب تک ان کو اس بات کا پختہ یقین نہ ہو جائے کہ اب اس نے اپنی عادتوں سے توبہ کر لی ہے۔ چنانچہ ابن عامر نے ایسا ہی کیا اور حکیم کو نظر بند کر دیا۔

اسی اثنا میں بصرہ میں ایک شخص آیا جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا اور کنیت ابن السوداء۔ عبداللہ بن سبا اسی حکیم کے ہاں آ کر اترا۔ یہ دراصل یہودی تھا لیکن لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ وہ ان سے کہتا پھرتا تھا کہ عجیب بات ہے لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے تو قائل ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوبارہ آئیں گے۔ لوگ اس کی باتوں کو بہت توجہ سے سُنتے تھے کیونکہ ناواقف لوگ دین کی باتوں کو سمجھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کے عادی نہ تھے۔ پھر وہ ان سے کہتا تھا:

"مسلمانو! تعجب ہے کہ تم میں اہلبیت موجود ہیں پھر بھی مناسبِ حکومت میں ان کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا اور ان کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔"

وہ اس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا جن کو سُن کر سادہ لوح اشخاص اس کے معتقد ہو جاتے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت سے انتہائی محبت و عقیدت ہے۔ لیکن در پردہ وہ لوگوں کو خلافت سے نفرت دلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا جو اس کا خاص مقصد تھا۔

جب ابنِ عامر کو یہ خبریں پہنچیں تو انہوں نے اسس کو بلایا اور پوچھا :

"تم کون ہو ؟"

اسس نے کہا :

"میں پہلے یہودی تھا ، اب اسلام لے آیا ہوں اور آپ کے سایۂ عاطفت میں رہتا ہوں۔"

ابنِ عامر نے اسس کو بصرہ سے نکال دیا ، وہاں سے وُہ کوفہ آیا اور وہاں سے بھی نکالا گیا۔ پھر وُہ شام اور شام سے مصر چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے لیے میدان سازگار پایا اور فساد کے بیج بونے لگا جو آگے چل کر خُوب برگ و بار لائے۔

(۱۷)

مصر میں بے چینی

مصر میں عراق سے بھی بدتر حال تھا۔ کیونکہ عبداللہ بن سبا نے یہاں آتے ہی فتنہ کی آگ بھڑکانے اور اپنی گمراہ کن تعلیمات لوگوں میں رائج کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ بصرہ اور کوفہ کے اکثر باشندوں کو وُہ پہلے ہی گمراہ کر چکا تھا۔ وہ کہتا تھا ، مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ لیکن سا تھ ہی یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس نہیں آئیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ، "ان الذی فرض علیك القرأن لرآدك الیٰ معاد۔ (وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن مجید نازل کیا ہے وُہ ضرور تجھے تیرے لوٹانے کی جگہ پر واپس لائے گی) اس لیے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت عیسٰی علیہ السلام سے زیادہ دنیا میں واپس آنے کے مستحق ہیں۔"

اور اس طرح وہ تناسخ کا گمراہ کن عقیدہ ان میں رائج کرنے لگا۔ وہ ان سے یہ بھی کہتا کہ "ہزاروں نبی ہوئے ہیں ، ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت علیؓ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علیؓ خاتم الاوصیاء اور اسس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو پُورا نہ کرے اور رسولِ کریمؐ کے وصی کا حق چھین لے۔"

حضرت عثمانؓ کے متعلق وُہ کہتا تھا :

"عثمانؓ نے خلافت بغیر کسی حق کے ہتھیا لی ہے اور وصی رسول اللہ کا حق چھین لیا ہے۔ تم لوگ اس معاملہ کو آگے لاؤ۔ سب سے پہلے امراء پر اعتراضات شروع کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دو۔ اسس طرح لوگوں کو اپنی طرف مائل کرو اور

اس معاملہ کی طرف ان کو بلاؤ۔"

جب اس نے دیکھا کہ مصری اس کی دعوت قبول کرنے پر تیار ہیں اور اس کی باتوں کی تائید کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں تو اس نے اپنے والیوں کو تمام ملک میں پھیلا دیا اور ان لوگوں سے جو شہروں میں فساد برپا کرنا چاہتے تھے خط و کتابت شروع کر دی۔ اس کے حواری مختلف شہروں کے باشندوں کو، ان شہروں کے والیوں کی برائیاں خوب بڑھا چڑھا کر لکھتے اور اس طرح فتنہ کی آگ بھڑکاتے۔ جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں تو صحابہؓ میں بہت اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی۔

مدینہ مہاجرین، انصار اور خلافت کا مرکز تھا۔ ہر چہار طرف سے مختلف علاقوں کے لوگ اپنی شکایات لے کر مدینہ میں ہی آتے تھے اور یہاں کے لوگوں سے ہی ظلم و ستم کے ازالہ کے لیے مدد مانگتے تھے۔ اہلِ مدینہ بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس فتنہ کی خبریں اور سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت عمال کی شکایات کثرت سے اہلِ مدینہ کو پہنچنے لگیں تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے پوچھا،

"امیر المومنین! کیا آپ کو بھی وہ اضطراب انگیز خبریں پہنچ رہی ہیں جو ہمیں پہنچتی ہیں؟"

انہوں نے حیران ہو کر کہا:

"نہیں، مجھے تو خیر و عافیت کی خبریں ہی مل رہی ہیں۔"

اس پر اہلِ مدینہ نے سارے معاملہ کی آپ کو اطلاع کی اور مشورہ دیا کہ آپ ہر علاقہ میں لوگوں کو بھیجیں جو وہاں جا کر حالات کی اچھی طرح تفتیش کریں اور پتا چلائیں کہ ان شکایتوں میں کہاں تک صداقت ہے جو عمال کے متعلق کثرت سے پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ایسا ہی کیا اور مختلف اشخاص کو سلطنت کے تمام صوبوں میں حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ محمدؓ بن مسلمہ کو کوفہ، اسامہؓ بن زید کو بصرہ، عبداللہ بن عمرؓ کو شام اور عمارؓ بن یاسر کو مصر بھیجا۔ اسی طرح اور دوسرے علاقوں میں بھی لوگ بھیجے۔ کچھ عرصہ کے بعد عمارؓ کے سوا باقی سب واپس آ گئے اور انہوں نے آ کر بیان کیا کہ ہم نے ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں پائی جو مدینہ میں پہنچ رہی تھیں۔ ان علاقوں کا نظم و نسق بالکل ٹھیک ہے اور ان کہانیوں میں ذرہ برابر صداقت نہیں ہے کہ امرا لوگوں پر ظلم کرتے اور ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔

صرف حضرت عمارؓ بن یاسر ہی ایسے تھے جن کو اہلِ مصر نے بہلا پھسلا کر اپنے حق میں کر لیا تھا۔ انہوں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ ان لوگوں میں پیش پیش عبداللہ بن سوداء، خالد بن ملجم، سودان بن حمران وغیرہم تھے۔ مصر میں حضرت عثمانؓ کے سب سے زیادہ دشمن دو شخص تھے:

ایک تو محمد بن ابی حذیفہ، جس کی ناراضی کا سبب یہ تھا کہ اس نے حضرت عثمانؓ سے کسی علاقہ کی ولایت طلب کی تھی لیکن آپ نے انکار کر دیا تھا۔

دوسرا محمد بن ابی بکر، یہ اپنے آپ کو حضرت ابوبکرؓ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت بڑی شخصیت سمجھتا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ایک موقعہ پر اس کے ساتھ سختی کی تھی جس پر یہ آپ کا سخت دشمن ہو گیا اور اس کے دل میں آپ کی طرف سے کینہ بیٹھ گیا۔

اس وقت سے یہ آپ کو معزول کرنے کی فکر کرنے لگا۔ عمارؓ بن یاسرؓ کا زیادہ وقت انہی دو آدمیوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ان کو بھی حضرت عثمانؓ سے کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ان پر عباس بن عتبہ بن ابی لہب پر حملہ کرنے کی وجہ سے حد جاری کی تھی۔

(۱۸)

شام میں اشتراکیت

دوسرے شہروں کے برخلاف شام کی حالت بالکل پُرسکون اور اطمینان بخش تھی کیونکہ حضرت معاویہ کا زبردست اقتدار وہاں بغاوت کے جراثیم کو پھلنے پھولنے کی مہلت قطعاً نہیں دے سکتا تھا۔ حضرت معاویہ میں عقلمندی، حزم و احتیاط، ضبط اور سختی انتہا درجہ کی تھی اور ان کی ان صفات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔

مفسدین نے سلطنت کے ہر علاقہ میں فساد کے بیج بونے اور عام رعایا کو اپنے والیوں اور خلیفہ کے خلاف ابھارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن شام اس فتنہ سے بالکل محفوظ تھا۔ حضرت معاویہ کی بے نظیر سیاست کی وجہ سے اس وسیع علاقے کے باشندوں کی اطاعت اور وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ معاویہ ان کو جس رستے پر چلانا چاہتے تھے وہ اسی رستے پر چل پڑتے تھے۔ وہ اپنی سیاست میں مختارِ مطلق تھے۔ ان پر کوئی شخص حرف گیری نہیں کر سکتا تھا اور اِلّا ماشاء اللہ ہر شخص ان کی مرضی کے موافق کام کرتا تھا۔

ابنِ سبا شام میں بھی آیا۔ وہ خباثت اور عقلمندی کا پتلا تھا۔ ہر علاقے میں وہاں کے حالات کے مطابق اس کا طرزِ عمل بالکل جداگانہ ہوتا تھا۔ اس کی دور بین نظر ایسے آدمیوں کو فوراً تاڑ لیتی تھی جو اس کی مرضی کے موافق کام کر سکتے تھے یا کسی نہ کسی رنگ میں اس کے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ شام میں بھی اس نے ایک ایسے ہی آدمی کو تاڑا۔ وہ تھے حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ۔ آپ نہایت پرہیزگار اور متقی انسان تھے۔ آپ نے نہایت فقیرانہ اور غریبانہ طرزِ زندگی اختیار کر رکھی تھی اور مال جمع کرنے کو نہایت ناپسند کرتے تھے۔ ابنِ سبا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"حضرت! دیکھیے کیا غضب ہے، معاویہ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہتے ہیں۔ کیا ہر چیز اللہ کی ہی نہیں ہوتی؟ دراصل اس سے معاویہ کا مقصد یہ ہے کہ بیت المال کے اموال کو مسلمانوں پر خرچ نہ کیا جائے اور اس پر سے مسلمانوں کا نام اڑا کر خود ہی خرچ کر لیا جاتے۔"

حضرت ابوذرؓ بیچارے سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کو کیا خبر کہ اس سے ابن السوداء کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس کے کہنے میں آکر حضرت معاویہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"آپ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کیوں کہتے ہیں؟"

معاویہ کہنے لگے :

" ابوذر! خدا آپ پر رحم کرے، کیا ہم اللہ کے بندے نہیں ہیں اور تمام مال اسی کا نہیں ہے؟ کیا تمام مخلوقات اسی کی مخلوق نہیں ہے اور کیا تمام جہان میں اسی کا حکم نہیں چلتا؟"

ابوذرؓ کہنے لگے :

" خیر، پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ آپ آیندہ اس کو اللہ کا مال نہ کہیں۔"

معاویہ نے جواب دیا :

" میں یہ تو ہرگز نہیں مانوں گا کہ بیت المال کے اموال اللہ کے اموال نہیں ہیں۔ لیکن محض آپ کی خاطر آیندہ ان کو اموال المسلمین کہا کروں گا۔"

حضرت ابوذرؓ سے اپنا کام نکلوانے کے بعد ابن السوداء ابوالدرداءؓ کے پاس پہنچا اور ان سے بھی اسی طرح کی باغیانہ باتیں کیں۔ مگر وہ اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آئے اور اس کی دال وہاں بالکل نہ گل سکی۔ لیکن اس کی باتوں نے حضرت ابوذرؓ میں ایک خاص جوش پیدا کر دیا جس کی بنا پر آپ نے شام میں اس قسم کی تقریریں کرنی شروع کر دیں۔

" اے امیروں کے گروہ! اور غریبوں پر ظلم کرنے والو! ان لوگوں کو " بشارت " ہو جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔ قیامت کے روز اسی چاندی اور اسی سونے کو گرم کر کے ان کے سروں، پہلوؤں اور پیٹھوں پر داغ لگائے جائیں گے۔"

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ غریبوں اور مسکینوں میں ان باتوں سے جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے امیروں پر دست درازیاں شروع کر دیں۔ امراء نے حضرت معاویہ سے اس نئے مذہب کی شکایت کی جو ابوذرؓ لوگوں کے درمیان، خصوصاً طبقۂ فقراء و مساکین میں پھیلا رہے تھے۔

اس پر حضرت معاویہؓ کو خطرہ کا احساس ہوا۔ چونکہ حضرت ابوذرؓ، حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور سابقون الاوّلون میں سے تھے اس لیے وہ براہِ راست ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس معاملہ کی رپورٹ حضرت عثمانؓ کو بھیجی۔ آپ نے جواب دیا :

" معلوم ہوتا ہے فتنہ اب پھوٹ پڑنے کو ہے۔ تم ابوذرؓ کو نہایت احترام کے ساتھ میرے پاس مدینہ روانہ کر دو۔"

چنانچہ حضرت معاویہ نے حضرت ابوذرؓ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے آپ سے پوچھا :

" ابوذر! یہ کیا بات ہے اہلِ شام آپ کی شکایت کیوں کرتے ہیں؟"

ابوذرؓ نے سارا واقعہ بتلایا اور کہا کہ بیت المال کے اموال کو اموال اللہ نہیں کہنا چاہیے اور امیروں کو یہ مناسب نہیں کہ وہ مال جمع کریں۔

حضرت عثمانؓ نے کہا :

"ابوذرؓ: رعایا کے جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنا اور رعایا پر جو حقوق واجب ہوتے ہیں ان کو طلب کرنا میرا کام ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں لوگوں کو ترکِ دنیا پر مجبور کروں۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ انھیں میانہ روی اور خدمتِ دین کی تعلیم دوں۔"

اس پر حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا:
"آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں مدینہ چھوڑ دوں اور مدینہ سے کچھ فاصلہ پر ربذہ کی بستی میں جا کر بود و باش اختیار کر لوں۔"
چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ان کو ربذہ جانے کی اجازت دے دی اور ان کے لیے گزارہ بھی مقرر کر دیا۔ حضرت ابوذرؓ کی وفات ۳۲ھ میں ربذہ ہی میں ہوئی۔

اس تمام احترام کو برقرار رکھتے ہوئے جو حضرت ابوذرؓ کا ہمارے دل میں ہے پھر بھی ہمیں اس بات کے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے اشتراکیت کا جو راستہ اختیار کیا تھا اس کا اسلام نے قطعاً کوئی حکم نہیں دیا اور نہ ان کے لیے یہ مناسب ہی تھا کہ وہ اس کی تائید میں وہ طریقے استعمال کرتے جو انہوں نے کیے۔ اسلام نے تفریط اور ایسے امور اختیار کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جو انسانی طاقت سے باہر ہوں بلکہ اس نے میانہ روی کو ہی ہر جگہ مقدم رکھا ہے۔ اگر مسلمان اسلام پر پوری طرح عامل ہوں اور اس کی صحیح تعلیمات کے مطابق احکامِ اسلامی کا نفاذ کریں تو وہ کسی صورت میں بھی اس راستہ کو اختیار نہیں کر سکتے جس کو حضرت ابوذرؓ نے اختیار کر لیا تھا۔ اس اشتراکیت کے خد و خال بظاہر تو بہت اچھے نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ بالکل ناممکن العمل ہے۔ اسلام اشتراکیت کے راستہ کو چھوڑ کر ایک درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے جسے صحیح طور پر اپنا لینے سے نہ غریب آدمی غربت میں بڑھتا چلا جا سکتا ہے اور نہ امیر آدمی امارت میں۔

واقعہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ اس اشتراکیت سے بالکل مختلف ہے اور اس کے اصول ان اشتراکی اصولوں سے بالکل علٰحدہ ہیں جن کے داعی آج کل روس اور اس کے ساتھی ممالک ہیں۔ اسلام کے اصول اشتراکیت کے اصولوں سے بہت زیادہ مضبوط، سُود مند اور پائدار ہیں اور مسلمانوں کے لیے صرف وہی اصول کار آمد ہو سکتے ہیں جو اسلام نے پیش کیے ہیں۔ کیونکہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں تو انسان آپس میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں لیکن اسلام کے احکام تو الٰہی احکام ہیں اور مسلمان رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہی احکام کا نفاذ ہو اور انہی پر عمل بھی کیا جائے۔ زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اکثر جگہ اس کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے۔ اگر مسلمان شرعی مقدار کے مطابق زکوٰۃ ادا کریں تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی ایسا باقی نہ رہے جس کو فقیر کہا جا سکے۔ بجائے اس کے کہ اشتراکیت کے داعی مسلمانوں میں اس کی تبلیغ کریں، اس کے جراثیم حکومت سے بغض و عداوت پیدا کرنے اور طبقاتی جنگ کو بھڑکانے کے لیے لوگوں میں پھیلائیں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے اس ضروری رکن زکوٰۃ کو قائم کرنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ایک نظام کے ماتحت اس کو جمع اور خرچ کیا جائے اور اسلامی سلطنتیں اس بارہ میں ضروری اقدامات روا رکھیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو مسلمانوں میں فقر و غربت کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔ طبقاتی امتیازات فنا ہو جائیں گے۔ غریب اور امیر کے درمیان

کوئی تفریق نہ باقی رہے گی۔ اونچے طبقہ کی طرف سے نچلے طبقہ پر کیے جانے والے ظلم اور زیادتیاں بالکل ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ جس طرح نماز مسلمانوں کو یہ سکھلاتی ہے کہ خدا کے دربار میں غریب و امیر سب برابر ہیں اور نماز میں ایک بادشاہ کے ہم پہلو ایک غریب مفلس اور قلاش کو کھڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی ایک امیر کے دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ کوئی خیرات نہیں جو میں اپنے غریب بھائی کو دے رہا ہوں بلکہ یہ غریبوں کا حق ہے کہ وہ حکومت کی وساطت سے میرے مال میں شریک رہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کے مال میں شریک ہو اس سے حقارت کا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔

لیکن ہم افسوس کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سوائے شاذ و نادر افراد کے باقی سب نے زکوٰۃ کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور وہ دین کے اہم ترین فرض سے بے توجہی اور لاپرواہی برت رہے ہیں۔ اس لیے ہر دم اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ اشتراکیت کی گود میں نہ جا گریں۔ ان کو اس عظیم خطرہ سے بچانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ صحیح اسلامی شریعت کو قائم کیا جائے اور زکوٰۃ کا نظام ایک پروگرام کے تحت شرعی حدود کے ساتھ قایم کیا جائے۔ اگر مسلمانوں نے اسلام کے اس ضروری اور مقدس فرض کو پوری طرح قایم کر لیا تو یقیناً وہ اشتراکیت کے تباہ کن سیلاب سے بچ جائیں گے۔

(۱۹)

والیوں کا اجتماع

سعید بن العاص والیِ کوفہ کو حضرت عثمانؓ نے مدینہ بلایا تھا اس سے پہلے سعید رؤسائے کوفہ کو مختلف شہروں میں عمال بنا کر بھیج چکے تھے۔ جب سعید بن العاص بھی مدینہ چلے گئے تو فتنہ کے سرغنوں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور ان پر بالکل بے بنیاد اور شرمناک الزامات لگا کر لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے لگے اور انہیں اس بات پر اکسایا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ان کی معزولی کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ سینکڑوں آدمیوں کا ایک جتھا اسی غرض کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ ان کو سعید بن العاص ملے جو کوفہ واپس جا رہے تھے۔ ان لوگوں نے ان سے کہا:

"مہربانی کر کے آپ بطور والی کوفہ میں داخل نہ ہوں۔"

سعید نے جواب دیا:

"یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ ایک آدمی کو روکنے کے لیے ہزار آدمی نکلیں۔ یہ کافی تھا کہ ایک آدمی میری طرف بھیج دیتے اور ایک آدمی خلیفہ کی طرف۔"

اس کے بعد وہ واپس آ گئے۔ ان لوگوں نے ان کے غلام کو قتل کر دیا۔ مدینہ واپس آ کر انہوں نے حضرت عثمانؓ کو تمام معاملہ کی خبر دی۔ آپ نے پوچھا: "وہ کس کو چاہتے ہیں؟"

سعید نے کہا، "ابوموسیٰ اشعریؓ کو۔"
حضرت عثمانؓ نے کہا :

"ہم نے ابوموسیٰ کو ان کا والی مقرر کر دیا۔ خدا کی قسم ہم ان کو کسی عذر کا موقع نہ دیں گے۔ کوئی حجت، کوئی دلیل ان کے ہاتھ نہ آنے دیں گے۔ میں ان کی باتوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق عمل کروں گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کا یہ ارادہ کرتے ہیں۔"

جب حضرت عثمانؓ نے یہ محسوس کیا کہ اب فتنہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے تو انہوں نے تمام والیوں کو مدینہ بلا بھیجا۔ جو والی مدینہ پہنچے وہ حسب ذیل تھے :

۱۔ معاویہؓ بن ابی سفیان والیِ دمشق،
۲۔ عبداللہ بن ابی سرح والیِ مصر،
۳۔ سعید بن العاص والیِ کوفہ۔ (ان کو کوفہ والوں نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی نکال دیا تھا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں)
۴۔ عبداللہ بن عامر والیِ بصرہ و بحرین،
۵۔ عمرو بن العاص (جو مدینہ میں ہی موجود تھے)

جب یہ تمام لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"ہر آدمی کے وزیر اور مشیر ہوتے ہیں۔ تم لوگ میرے وزیر اور مشیر ہو۔ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، سب تمہیں معلوم ہے۔ وہ مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میں اپنے عمّال کو معزول کر دوں۔ ان تمام لوگوں کو جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں واپس بلا لوں اور جن لوگوں کو وہ پسند کرتے ہیں ان کو ان معزول شدہ گورنروں کی جگہ بھیج دوں۔ اب آپ سب مجھے اس بارہ میں اپنی رائے بتائیں۔"

عبداللہ بن عامر نے کہا :

"امیرالمومنین! میری رائے یہ ہے کہ آپ ان کو جہاد کا حکم دیں۔ اس طرح ان کی توجہ بٹ جائے گی۔ جب وہ جنگوں میں مشغول رہیں گے تو خود بخود آپ کے مطیع ہو جائیں گے، ان کو صرف اپنی ہی فکر ہو گی۔ فتنہ و فساد کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔"

سعید بن العاص نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا :

"اگر آپ ہماری رائے لینا چاہتے ہیں تو اصل بیماری کو اپنے سے دُور کیجئے اور جو کانٹے آپ کی راہ میں حائل ہیں ان کو ہٹا دیجئے اور میری رائے پر عمل کیجئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یقیناً فتنہ و فساد کا نام و نشان تک نہ رہے گا۔"

حضرت عثمانؓ نے پوچھا :

"وہ کیا رائے ہے!"

انہوں نے جواب دیا: "ہر گروہ کا ایک سردار اور رہبر ہوتا ہے، اگر وہ ہلاک ہو جائے تو تمام گروہ منتشر ہو جاتا ہے اور

اس میں کسی قسم کی طاقت اور جرأت باقی نہیں رہتی۔ پس آپ کو چاہیے کہ اس فتنہ کے بانیوں اور سرغنوں کا سر کچل دیں، یہ فتنہ اپنی موت آپ مرجائے گا۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"رائے تو بہت صحیح ہے لیکن میں ناحق مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں کرنا چاہتا۔"

حضرت معاویہ نے ان الفاظ میں رائے دی:

"امیرالمومنین! میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے عمّال کو ان کے اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ کر دیجئے اور ہر عامل کو اپنی ولایت میں امن وامان قایم رکھنے کا ذمہ دار بنائیے۔ میں خود شام میں امن وامان قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوں گا۔"

عبداللہ بن ابی سرح بولے:

"امیرالمومنین! یہ لوگ لالچی ہیں ان کو بیت المال سے کچھ دے دیجئے۔ پھر کیسا فتنہ اور کہاں کا فساد۔ سب دھواں بن کر اڑ جائے گا اور ان کے دل آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے۔"

اگر حضرت عثمانؓ میں ذرا بھی سختی ہوتی تو وُہ عبداللہ بن عامر یا سعید بن عاص کی رائے پر ضرور عمل کرتے۔ لیکن ان کی کمزوری اور نرمی نے ان کو کسی رائے پر عمل نہ کرنے دیا حالانکہ ان دونوں کی رائیں بہترین رائیں تھیں اور ان میں سے کسی رائے پر عمل کرنے سے فتنہ کا قلع قمع ہو سکتا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ بجائے ان مشوروں پر عمل اور اکابر مفسدین کا قلع قمع کرنے کے خود مفسدین کے آگے جھک گئے اور انہوں نے کوفہ میں اس شخص کو مقرر کر دیا جس کا وہ مطالبہ کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی اس پالیسی کو سیاست کی اچھی مثال نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس سے حکومت کا وقار ہی قائم ہو سکتا تھا۔ اہلِ کوفہ کے نام حضرت عثمانؓ نے جو خط لکھا تھا اس سے بھی حضرت عثمانؓ کی کمزوری کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوجاتا ہے کہ اثر واقتدار حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور آپ مفسدین اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ گئے تھے[1]۔

اہلِ کوفہ نے جب اپنے والی کو لوٹا دیا۔ اس کے غلام کو قتل کر دیا اور اس کی بجائے ابوموسیٰ اشعریؓ کو اپنا والی بنانے کی درخواست کی تو حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھا:

"جس کو تم نے چاہا میں نے تمہارا والی مقرر کر دیا ہے اور سعید کو جسے تم ناپسند کرتے تھے واپس بلا لیا ہے۔ خدا کی قسم جب تک

---

[1] دراصل حضرت عثمانؓ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ باغی راہِ راست پر آجائیں۔ آپ کو ڈر تھا کہ اگر ان پر سختی کی گئی تو فتنہ کا ایک دروازہ کھل جائے گا۔ اسی ڈر سے آپ نے ان سے نرمی کا سلوک کیا اور ان کے ایسے مطالبوں کو جن کو پورا کرنے سے شریعت کے احکام کو ٹھیس نہیں لگتی تھی پورا کر دیا، اس امید میں کہ شاید اس سے متاثر ہو کر اپنی کرتوتوں سے باز آجائیں اور جو شورش انہوں نے برپا کر رکھی ہے اس کو چھوڑ کر پُرامن شہریوں کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ یہ امر حضرت عثمانؓ کی رحم دلی اور آپ کے قلب کی صفائی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ حضرت عثمانؓ مفسدین اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں اس وقت ہر قسم کی طاقت تھی اور اس کو کام میں لا کر آپ دم بھر میں ان کی طاقت کو نیست و نابود کر سکتے تھے۔ (مترجم)

مجھ میں طاقت ہے میں محض تمہاری بھلائی کی خاطر اپنی ذلت گوارا کروں گا، صبر کرتا رہوں گا اور اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ حسن طریقے سے بھی ہو تمہاری اصلاح کروں اور اس غرض سے ہر وہ چیز تمہیں دے دوں گا جو تم مجھ سے مانگو گے بشرطیکہ اس سے احکام خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو میں ہر طرح تمہیں مطمئن کرنے کی سعی کروں گا تاکہ بعد کو مجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔"

اسی طرح کے خطوط انہوں نے دوسرے شہروں میں بھی لکھے یہ کمزوری اور ضعف کی ایک جدید مثال تھی۔ جس کا لوگ حضرت عمرؓ کے وقت میں گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک شریف آدمی پر تو یہ باتیں اثر کر سکتی ہیں لیکن کمینہ آدمی ایسی باتوں کو کمزوری اور خوف پر محمول کرتا ہے اور فتنہ و فساد برپا کرنے میں اور بھی تن دہی سے کوشش کرنے لگتا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شہر میں مفسدین اور فتنہ پردازوں کی ایک جماعت موجود تھی جو ہر ممکن طریقہ سے جھوٹی خبروں کی اشاعت کرنے، خلافت سے نفرت دلانے، ظنون و شبہات میں لوگوں کو مبتلا کرنے اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے میں ہر وقت مشغول رہتی تھی۔

یہ بات مستبعد نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی اسی قماش کا ایک گروہ موجود ہو جو اس آگ کو بھڑکاتا اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی کوششوں میں مشغول رہتا ہو۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو ضروری ہے کہ ایسی باتوں کی اشاعت سے جو کثرت سے مدینہ کے لوگوں کو پہنچتی رہتی تھیں، علاوہ اور لوگوں کے خود صحابہ کرامؓ بھی حضرت عثمانؓ سے بدظن ہو گئے ہوں۔ آپ پر جرح و قدح اور اعتراضات کرنے لگے ہوں اور آپ کی مدد اور مدافعت سے دست کش ہو گئے ہوں۔ چنانچہ اسی قبیل کا ایک واقعہ تاریخوں میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور آپ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت عثمانؓ نے غصہ سے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں اور فرمایا:

"کاش تم میری جگہ ہوتے، میں نہ کبھی تم پر غصہ کا اظہار کرتا ہوں، نہ تم پر کوئی عیب لگاتا ہوں۔ ہمیشہ صلہ رحمی کرتا ہوں اور قرابت کو کبھی نہیں توڑتا۔ لوگوں کی حاجت براری کرتا ہوں۔ میں بھی والی مقرر کرنے میں انہی خصوصیات کو ملحوظ رکھتا ہوں جن خصوصیات کو عمرؓ ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ کیا عمرؓ نے مغیرہ بن شعبہ کو والی نہیں بنایا تھا حالانکہ وہ ان کے رشتہ دار تھے۔ پھر اگر میں نے اپنے رشتہ دار اور قرابتی عبداللہ بن عامر کو والی بنا دیا تو مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"عمرؓ جب کسی شخص کو والی بناتے تھے اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ان کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے تو وہ اس سے بہت سختی کا معاملہ کرتے تھے۔ لیکن آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اپنے اقربا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"تم جانتے ہو کہ معاویہ عمرؓ کے تمام زمانۂ خلافت میں والی رہے، اگر میں نے بھی ان کو والی بنائے رکھا تو کون سا جرم کیا؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو پتا نہ تھا عمرؓ کا خوف معاویہ کے دل پر کس قدر مسلط رہتا تھا؟"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا :

"ہاں مجھے خوب پتا ہے۔"

حضرت علیؓ نے کہا :

"لیکن اب معاویہ آپ سے پوچھے بغیر سلطنت کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ آپ کو بھی اس امر کا پتا ہے۔ لیکن لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ عثمانؓ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ آپ کو یہ باتیں پہنچتی ہیں لیکن آپ معاویہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے۔"[1]

اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو حضرت عثمانؓ کی باتوں میں کوئی وزن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ کسی کو والی مقرر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے ذریعہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اس طرح سے رشتہ داروں اور اہلِ خاندان کا بھلا ہو۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں بنی ہاشم میں سے کبھی کسی کو والی یا عامل نہیں بنایا حالانکہ وہ آپؐ کے قرابتی اور رشتہ دار تھے۔ یہی طرزِ عمل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا بھی رہا۔ خصوصاً حضرت عمرؓ کے تو خاندان میں ایسے شخص موجود تھے جو والی بنائے جانے کے مستحق تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنے رشتہ داروں کو کسی اعتبار سے بھی دوسروں پر ترجیح نہیں دی۔ اسی طرح وہ کبھی کسی عامل کی غلطی، برائی اور قصور پر خاموش نہیں بیٹھے، بلکہ ہر غلطی پر اس کو سخت تنبیہہ کی۔ یہی امور تھے جن کی وجہ سے آپ نے اپنے عہد میں حکومت کو اوجِ ترقی پر پہنچا دیا تھا اور اس زمانہ میں چمنستانِ اسلام پر بہار آئی ہوئی تھی۔

لیکن یہ بھی واقعہ ہے جس سے مورخ کبھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمانؓ کا دل بالکل صاف اور آپ کا ضمیر بالکل پاک تھا۔ آپ نفاق، بدظنی اور فساد کی راہوں سے کوسوں دُور تھے۔ اس لیے اگر آپ اپنے عزیز و اقارب کی نسبت حسنِ ظن رکھتے تھے۔ آپ کو یقین تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں آپ سے اخلاص کا برتاؤ کریں گے، امورِ سلطنت کو اچھی طرح سرانجام دیں گے اور قرابت کی وجہ سے آپ کے بہترین مددگار ثابت ہوں گے تو ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے رشتہ داروں پر دوسروں کی نسبت زیادہ اعتماد کرنا ایک فطری بات ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

طبری میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ نے شام جاتے ہوئے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ،

"اے امیر المومنین! قبل اس کے کہ فتنہ پھوٹ پڑے آپ میرے ساتھ شام چلیے، شام ان فتنوں سے بالکل محفوظ ہے۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ،

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قرب کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا خواہ اس میں میری گردن ہی کیوں نہ ماری جائے۔"

حضرت معاویہؓ نے پھر کہا کہ "اگر یہ صورت آپ کو قبول نہیں تو پھر میں شام سے ایک لشکر آپ کی حفاظت اور فتنہ کا مقابلہ

---

[1] واقدی، ابن اثیر، طبری

کرنے کے لیے مدینہ بھیج دوں۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ :

"میں ایک لشکر کی وجہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب میں رہنے والے مہاجرین اور انصار کی زندگی اجیرن نہیں کر سکتا اور ان کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا :

"پھر تو آپ کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے۔"

حضرت عثمانؓ کا جواب صرف یہ تھا :

"حسبی اللہ ونعم الوکیل۔"

جب حضرت معاویہؓ سفر کے لیے نکلے تو انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو راستہ میں کھڑا پایا آپ وہاں ٹھہر گئے اور ان سے فرمایا :

"حکومت ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم زمانہ سے لوگ لڑتے مرتے چلے آئے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ دین اسلام کا روشن آفتاب چمکا اور اپنی شعاعوں سے ظلمت کدۂ کفرستان کو روشن کر دیا تو لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت قدامت اور سابقیت اسلام کا لحاظ کیا گیا۔ علم و اجتہاد کا پاس رکھا گیا اور اب تک یہی طریقہ جاری ہے۔ اگر لوگ اسلامی طریقہ پر قائم رہیں اور اس پر عمل کریں تو یہ خلافت انہی بزرگوں میں رہے گی اور باقی لوگ ان کے تابع ہوں گے لیکن اگر دُنیا کی طرف جھک گئے اور بزورِ خلافت پر قبضہ کرنا چاہا تو یہ نعمت ان سے سلب کر لی جائے گی اور حکومت و ریاست خداوند تعالیٰ دوسروں کو دے دے گا۔ اللہ تعالیٰ حاکم حقیقی ہے۔ وہ تغیر و تبدل پر ہر طرح قادر و توانا ہے۔ کوئی امر اس کو مشکل نہیں۔ میں آپ لوگوں میں ایک بوڑھے اور بزرگ شخص کو چھوڑے جاتا ہوں۔ آپ ان کے ساتھ خیر خواہی کریں اور ہر طرح ان کے شریکِ حال رہیں۔ آپ کو اس کام کے عوض سعادت نصیب ہو گی۔ خدا تعالیٰ آپ سے خوش ہو گا۔ آپ خدا کے خلیفہ کی نصرت کریں گے خدا آپ کی نصرت کرے گا۔"

یہ نصیحت کر کے حضرت معاویہؓ شام روانہ ہو گئے۔

(۲۰)

شورش کا آغاز

جب تمام علاقوں کے امیر مدینہ میں مشورہ کے لیے آئے ہوئے تھے فتنہ کے سرغنوں نے تمام علاقوں میں یکدم بغاوت کر دینے کا فیصلہ کیا لیکن سوائے کوفہ کے وہ کہیں اپنے ان ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اہلِ کوفہ یہ بہانہ بنا کر کہ وہ مدینہ اپنے عامل

سعید بن عاص کو تبدیل کرانے کی نیت سے جا رہے ہیں، مدینہ روانہ ہو گئے۔ جرعہ کے مقام پر جو مدینہ اور کوفہ کے درمیان واقع ہے ان کی مڈھ بھیڑ سعید سے ہوتی اور سعید کو مدینہ واپس ہونا پڑا۔ اہلِ کوفہ نے سعید کی جگہ ابو موسٰی اشعریؓ کو عامل بنانے کا مطالبہ کیا جس کو حضرت عثمانؓ نے منظور کر لیا۔

جب تمام امرا اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہنچ گئے تو فتنہ پردازوں کے لیے بغاوت برپا کرنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ انہوں نے مختلف شہروں میں اپنے ہم خیال لوگوں سے اس سلسلہ میں خط و کتابت شروع کی اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام علاقوں سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں مدینہ پہنچیں اور وہاں اپنے آئندہ طریقِ کار کے متعلق صلاح و مشورہ کریں۔ لوگوں پر یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کی بہبودی کی خاطر مدینہ جا رہے ہیں۔ مدینہ پہنچ کر وہ حضرت عثمانؓ سے چند سوال کریں۔ عمال اور امرا کی بے راہ روی اور ظلم و ستم کی ان سے شکایت کی جائے پھر ان باتوں کو تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیلا دیا جائے تاکہ عامۃ المسلمین کو خلافت اور امرا کے خلاف بھڑکایا جا سکے اور لوگوں کو یقین ہو جائے کہ حضرت عثمانؓ اور عمال کے خلاف جو الزام لگائے جاتے ہیں وہ سب درست ہیں۔ چنانچہ تینوں شہروں کوفہ، بصرہ اور مصر سے تین وفد اس غرض کے لیے مدینہ کی طرف چلے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو ان کی آمد کا علم ہونے پر حضرت عثمانؓ نے دو آدمیوں کو بھیجا کہ ان کے آنے کی غرض و غایت کا پتا لگایا جائے۔ فتنہ کے سرغنوں نے ان کو دیکھ کر خیال کیا کہ یہ بھی انہی میں سے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ ان کے دل میں تھا بلا کم و کاست ان پر ظاہر کر دیا کہ خلیفہ سے ان امور کے سلسلہ میں بات چیت کرنے مدینہ جا رہے ہیں جن کو وہ پہلے ہی مختلف شہروں اور علاقوں میں پھیلا چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے علاقوں میں واپس جا کر لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ ہم نے خلیفہ سے ان امور کے متعلق بات چیت کی۔ خلیفہ نے انکار تو نہیں کیا لیکن ان سے توبہ بھی نہیں کی۔ اس کے بعد ہم اگلے سال حج کے مہینہ میں بہ تعداد کثیر مکہ میں جمع ہوں گے اور ظاہر یہ کریں گے کہ ہم حج کی غرض سے آئے ہیں۔ مکہ پہنچ کر ہم حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کر لیں گے، ان پر ترکِ خلافت کے لیے زور دیں گے اور اگر انہوں نے انکار کیا تو ان کو قتل کر دیں گے۔

ان دونوں آدمیوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ساری باتیں دہرا دیں۔ آپ نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہنے لگے:

"یا اللہ! ان لوگوں کو گمراہی سے بچا لے۔ اگر تو نہ بچائے گا تو یہ لوگ برباد ہو جائیں گے۔"

پھر آپ نے کوفیوں اور اہلِ بصرہ کو بلا بھیجا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو بھی جمع کر لیا۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ کھڑے ہوئے اور تمام واقعات سنائے۔ اس کے بعد وہ دو اشخاص جو ان مفسدین کے پاس بغرضِ تحقیق بھیجے گئے تھے کھڑے ہوئے اور ان کی باتیں حرف بحرف بیان کر دیں۔ اس پر تمام صحابہؓ نے متفقہ طور پر حضرت عثمانؓ کو یہ صلاح دی کہ ان سب کو قتل کر دیجیے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"ایسے وقت میں کہ لوگوں میں ایک امام موجود ہو، اگر کوئی شخص اپنی اطاعت یا کسی اور کی اطاعت کے لیے لوگوں کو دعوت دے تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ تم اس کو قتل کر دو۔"

لیکن حضرت عثمانؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

"نہیں ہم عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ ان کے عذر قبول اور ان کو راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کریں گے اور جب تک ان میں سے کوئی کسی حدِ شرعی کو نہ توڑے یا کفر کا اظہار نہ کرے اس کی مخالفت نہ کریں گے۔"

اس کے بعد آپ نے وہ تمام باتیں بیان کیں جن کی بنا پر وہ آپ سے ناراض تھے اور جو انہوں نے عامۃ الناس میں پھیلا رکھی تھیں۔ ساتھ ہی آپ نے ان کے جواب بھی دئے۔ یہ باتیں ایسی تھیں جنہیں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی مثلاً آپ کا سفر میں نماز پوری پڑھنا، سرکاری چراگاہ سے عوام کو روک دینا، حَکم کو مدینہ واپس بلا لینا۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طائف بھیج دیا تھا۔

یہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کہ ان پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ ان کے علاوہ کچھ اہم باتیں بھی حضرت عثمانؓ نے ان سے کہیں۔ ان کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

حضرت عثمانؓ نے مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے نوجوانوں کو عامل بنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے صرف ایسے لوگوں کو عامل بنایا جو اس کام کے پورے طور پر اہل تھے۔ نیک صفات اور نیک اطوار سے بہرہ ور تھے۔ مجھ سے پہلے بھی میرے پیشروؤں نے میرے مقرر کردہ والیوں سے زیادہ نوعمر لوگوں کو والی بنایا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُسامہ بن زید کو فوج کا سردار بنانے کی وجہ سے مجھ سے زیادہ اعتراضات کیے گئے تھے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

صحابہؓ نے جواب دیا:

"بالکل یہی بات ہے۔"

پھر حضرت عثمانؓ نے کہا:

"یہ اعتراض کرتے ہیں کہ میں نے غنیمت کے مال میں سے ابنِ ابی سرح کو کچھ مال دیا۔ حالانکہ میں نے اس کو خمس میں سے ایک ہزار درہم دئے تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی بعض لوگوں کو اسی طرح دے دیا کرتے تھے لیکن پھر بھی جب میں نے محسوس کیا کہ لشکر نے اس پر بُرا منایا ہے تو یہ مال انہی کو واپس کر دیا۔ حالانکہ یہ ان کا حق نہیں تھا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

صحابہؓ نے جواب دیا:

"بالکل یہی بات ہے!"

پھر آپ نے فرمایا:

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے رشتہ داروں سے محبت کرتا ہوں اور ان کو عطیات دیتا ہوں۔ محبت کے متعلق تو یہ بات ہے کہ یہ ایک طبعی امر ہے۔ اس کو کون روک سکتا ہے۔ لیکن میں ظلم کے معاملہ میں کبھی ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور جو حقوق ان پر واجب ہوتے ہیں وہ پورے پورے وصول کر لیتا ہوں۔ باقی رہا میرا ان کو عطیات دینا تو میں جو کچھ ان کو دیتا ہوں اپنے مال میں سے دیتا ہوں۔ مسلمانوں کے اموال کو نہ میں اپنے اوپر خرچ کرنا جائز سمجھتا ہوں نہ کسی اور پر، میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم،

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانہ میں بھی جبکہ مجھ میں مال و دولت کی خواہش اور حرص تھی، اپنے مال میں سے بڑے بڑے عطیے لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ اور اب کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ یہ ملحد میرے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت میں سے جو کچھ میرے پاس آتا ہے وہ سب سوائے خمس کے میں ان کو واپس کر دیتا ہوں اور خمس میں سے بھی میں کچھ نہیں لیتا۔ وہ بھی مسلمانوں کا ہی حق ہوتا ہے۔ میں نے اللہ کے مال میں سے ایک پیسہ تک نہیں لیا ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ اپنے ہی مال میں سے کرتا ہوں۔

یہ کہتے ہیں کہ میں نے مفتوحہ زمینیں لوگوں کو دے دیں حالانکہ جب یہ زمینیں فتح ہوئیں تو ان میں مہاجرین اور انصار (جن کی جاں بازیوں سے یہ فتح ہوئیں) شریک تھے۔ پس جو اپنی مفتوحہ زمینوں میں ٹھہرا رہا، وہ تو ان کا مالک تھا ہی لیکن جو واپس آگیا وہ بھی اس حصہ سے محروم نہیں ہوا جو خدا تعالیٰ نے اس کو دیا تھا۔ میں نے ان ہی لوگوں کی سہولت کے لیے اور انہی کے کہنے سے ان کی جائدادوں کا تبادلہ کرایا۔ ان کو مدینہ کے علاقہ میں جاگیریں دے دیں اور اس کے بدلہ میں مفتوحہ علاقوں میں ان کو جو جاگیریں ملی تھیں وہ ان سے واپس لے لیں۔ اس طرح ان کی جاگیریں درحقیقت انہی کے ہاتھوں میں رہیں۔ صرف علاقوں کا ادل بدل ہوگیا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنا مال اور اپنی زمینیں بنی امیہ میں تقسیم کر دی تھیں اور اپنے بچوں کو بھی اتنا ہی حصہ دیا تھا جتنا دوسرے لوگوں کو۔ آلِ حکم نے دس ہزار دینار حاصل کیے اور تمام بنو ابو العاص نے ایک لاکھ۔ حضرت عثمانؓ کے بیٹوں کو بھی اتنا ہی دیا گیا۔ یہ مال و جائداد بنی العاص، بنی العیص اور بنی حرب میں تقسیم کی گئی تھی۔

حضرت عثمانؓ نے اس گروہ کے ساتھ جو دھوکے سے آپ کو نقصان پہنچانے آیا تھا، نرمی کا سلوک کیا۔ صحابہؓ کا اصرار تھا کہ ان کو قتل کر دیا جائے لیکن آپ نے عفو و درگذر ہی کو ترجیح دی اور ان کو چھوڑ دیا۔ فسادیوں کا مطلب حل ہوگیا اور وہ اپنے طے شدہ پروگرام کی تکمیل کے لیے اپنے اپنے علاقوں کو روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ نے یہ خیال کیا تھا کہ ان دلیلوں سے ان کے دلوں پر کچھ اثر ہوگا اور اس عفو و درگزر سے وہ آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی جو ان کے دلوں میں بھڑک رہی تھی اس لیے آپ نے محض کہنے سننے پر ہی اکتفا کیا اور ان کے خلاف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن فسادیوں نے شوال ۳۵ھ/۶۵۶ء میں اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مدینہ پر حملہ کرنے، حضرت عثمانؓ کو گھیر لینے، آپ کو معزول کرنے اور اگر آپ نے اپنی معزولی کو تسلیم نہ کیا تو قتل کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اہلِ مصر چار ٹولیوں میں بٹ کر مدینہ چلے۔ ہر ٹولی کا ایک امیر تھا۔ ان کی تعداد چھ سو سے ایک ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ ان کے امراء مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ عبدالرحمٰن بن عدیس البلوی
۲۔ کنانہ بن بشر اللیثی
۳۔ سودان بن حمران السکونی

۴۔ قیترۃ السکونی

ان سب کا امیر غافقی ابن حرب العکی تھا۔

ان لوگوں نے اپنے اصل مقصد (فساد و جنگ) کو عام لوگوں پر ظاہر نہیں کیا بلکہ یہ بات بنا دی کر وہ حج کو جا رہے ہیں ان کے ساتھ ابن السوداء (عبداللہ بن سبا) بھی تھا۔

اہلِ کوفہ بھی چار گروہوں میں بٹ کر نکلے۔ ان کے سردار مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ زید بن صوحان العبدی

۲۔ اشتر نخعی

۳۔ زیاد بن نضر حارثی

۴۔ عبداللہ بن اصم العامری

ان کی تعداد مصریوں کی تعداد کے برابر تھی۔ ان سب کا سردار عامر بن اصم تھا۔

اہلِ بصرہ بھی چار گروہوں میں نکلے۔ ان کے سردار مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ حکیم بن جبلہ العبدی

۲۔ ذریح بن عباد العبدی

۳۔ بشر بن شریح القیسی

۴۔ ابن المحرش الحنفی

ان کی تعداد بھی اہلِ مصر کے برابر تھی۔ ان سب کا سردار حرقوص بن زہیر السعدی تھا۔

ان تینوں شہروں کے فسادیوں کی خواہشات مختلف تھیں۔ اہلِ مصر جیسا کہ ابن سباؑ نے انھیں سکھایا تھا، حضرت علیؓ اور محمد بن ابوبکر (جو حضرت علیؓ کا ربیب تھا اور جس کی والدہ سے حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد شادی کر لی تھی) کو چاہتے تھے۔ محمد بن ابی حذیفہ بھی اسی کے حق میں تھا۔ اہلِ بصرہ چاہتے تھے کہ خلیفہ طلحہؓ بن عبیداللہ ہوں۔ اہلِ کوفہ زبیرؓ بن العوام کو خلیفہ بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ بغرض ہر گروہ یہی چاہتا تھا کہ معاملہ اسی کے حق میں فیصل ہو۔ لیکن حضرت عثمانؓ کو معزول کرنے میں سب متفق تھے۔

جب یہ قافلے مدینہ پہنچے تو اہلِ بصرہ نے ذی خشب، اہلِ کوفہ نے اعوص اور اہلِ مصر نے ذی المروہ پر ڈیرے ڈالے اہلِ مصر اور اہلِ بصرہ کو دو اشخاص زیاد بن نضر اور عبداللہ بن اصم نے مشورہ دیا کہ ابھی جلدی نہ کرو۔ ہم مدینہ جاتے ہیں اور وہاں کے حالات کا پتا چلاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اہلِ مدینہ نے ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رکھی ہیں۔ یہ حال اس وقت ہے جبکہ تفصیلات کا انہیں علم نہیں ہے۔ لیکن جب وہ تمام حالات سے آگاہ ہوں گے تو معاملہ اور بھی زیادہ بگڑ جائے گا اور ہم کسی صورت میں بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ہم مدینہ جا کر معلوم کرتے ہیں اگر انہوں نے

کوئی تیاری نہیں کی اور ان کی تیاریوں کے متعلق ہمارے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے وہ غلط ثابت ہوئی تو پھر ہمارا مقصد بہت جلد حاصل ہو جائے گا۔

چنانچہ یہ دونوں آدمی مدینہ میں آئے اور ازواج مطہراتؓ، حضرت علیؓ، طلحہؓ و زبیرؓ سے ملے اور کہا کہ ہم صرف حضرت عثمانؓ سے اپنے بعض عمال کو تبدیل کرانے آئے ہیں۔ اس کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں۔ آپ ہمیں مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں۔ لیکن ان سب نے ان کو انتہائی حقارت سے دھتکار دیا۔ دونوں آدمی مدینہ کے حالات معلوم کر کے اور اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس چلے آئے اور اپنے ساتھیوں سے سارے حالات بیان کر دئے۔ اس کے بعد مصریوں کا ایک وفد حضرت علیؓ کے پاس، اہل بصرہ کا ایک وفد طلحہؓ کے پاس اور اہل کوفہ کا ایک وفد زبیرؓ کے پاس آیا۔ دراصل ہر فریق چاہتا تھا کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کی جائے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ اور اگر کوئی آڑے آئے تو اس کا سر کچل دیا جائے۔ چنانچہ اہل مصر حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان سے خلافت قبول کر لینے کی درخواست کی۔ لیکن حضرت علیؓ نے انہیں جھڑک کر نکال دیا۔ یہی سلوک حضرت زبیرؓ نے اہل کوفہ اور حضرت طلحہؓ نے اہل بصرہ کے ساتھ کیا اور ان سے انتہائی سختی و حقارت کا برتاؤ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے اپنے ایک ایک بیٹے کو اور طلحہؓ نے اپنے دونوں بیٹوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔

حضرت علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے اس حقارت آمیز سلوک کے بعد یہ لوگ مدینہ سے باہر نکلے۔ ظاہر تو انہوں نے یہی کیا کہ اب وہ مدینہ سے واپس جا رہے ہیں، لیکن پہنچے وہ سیدھے اپنے اپنے لشکروں میں جو مدینہ سے تین تین میل کے فاصلہ پر پڑے ہوئے تھے دراصل وہ چاہتے یہ تھے کہ مدینہ والے متفرق ہو کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں اور بے خبری میں ان پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بے خبری میں اچانک مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ پر حملہ کر کے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ مدینہ والے اس ناگہانی حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں۔

اہل مصر حضرت علیؓ کے پاس آئے۔ حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا:

"تم واپس کیوں آ گئے؟"

انہوں نے کہا:

"ہم نے ایک قاصد کو پکڑا ہے جس کے پاس سے حضرت عثمانؓ کا ایک خط والیِ مصر کے نام برآمد ہوا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ جب ہم واپس پہنچیں تو ہمیں قتل کر دیا جائے۔"

یہی بات اہل بصرہ نے طلحہؓ اور اہل کوفہ نے زبیرؓ سے کہی۔

اس پر حضرت علیؓ نے اہل کوفہ اور اہل بصرہ سے کہا کہ:

"جب تم علحدہ علحدہ راستوں پر جا رہے تھے اور تمہاری منزلِ مقصود علحدہ علحدہ تھی تو تم نے یہ کیسے جان لیا کہ اہل مصر کے بارہ میں اس قسم کا خط لکھا گیا ہے۔ خدا کی قسم یہ بات تو مدینہ میں اور تمہاری باہمی سازش سے بنائی گئی ہے۔"

انہوں نے جواب دیا: "خواہ کچھ بھی کہو ہم نہیں چاہتے کہ عثمانؓ خلیفہ رہیں۔ ہم تو ان کو معزول کر کے ان کی جگہ دوسرا خلیفہ

بنانا چاہتے ہیں:

حضرت عثمانؓ اس دوران میں اپنے گھر سے نکلتے تھے، مسجد میں جاکر نماز پڑھاتے تھے۔ خود یہ باغی بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے
اور کسی کو مسجد میں جانے سے روکتے بھی نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے شہر کے اہم ناکوں، بازاروں اور گلیوں میں پہرہ لگا دیا تھا اور کسی
جگہ لوگوں کا اجتماع نہ ہونے دیتے تھے۔

یہ حالت دیکھ کر حضرت عثمانؓ نے تمام علاقوں میں اپنی مدد کے لیے خطوط بھیجے جن میں آپ نے لکھا:

"خدا تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آپؐ کو حکم دیا گیا وہ آپؐ نے
لوگوں تک پہنچایا۔ پھر آپؐ کی وفات ہوگئی اور آپؐ کے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ عمرؓ نے ایک مجلسِ شوریٰ قایم کر دی جس نے
بغیر میرے طلب کیے خلافت کا ذمہ دار مجھے بنا دیا۔ میں نے ایسے عامل مقرر کیے جن کو لوگ پسند کرتے تھے۔ لیکن ان مفسدین نے بغیر کسی
وجہ کے محض اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنا خبث ظاہر کرنا اور مجھ پر اور میرے عمّال پر جھوٹے اور بے بنیاد الزامات
لگانے شروع کر دیے۔ تاہم میں نے صبر سے کام لیا اور ایک مدت تک ان کی ان کارروائیوں کو دیکھتا رہا۔ لیکن انہیں کوئی سزا
نہیں دی۔ تب انہوں نے اللہ عز وجل کے برخلاف بھی جرأت کی اور اس بستی پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت گاہ ہے،
آپؐ کا حرم اور آپؐ کا مدفن ہے، حملہ کر دیا۔ جو شخص ہمارے ساتھ مل کر ان سے جہاد کرنا چاہے اس کو اس کار خیر میں عجلت سے کام
لینا چاہیے۔"

جب یہ خط بلادِ اسلامیہ میں پہنچا تو ایک ہیجان برپا ہوگیا اور باوجود سخت مشکلات و تکالیف کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو
چھوڑ کر ان باغیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت معاویہؓ نے حبیب بن سلمہ فہری کو ایک لشکر دے کر
بھیجا۔ عبداللہ بن ابی سرح نے مصر سے معاویہ بن خدیج السکونی کو روانہ کیا۔ کوفہ سے قعقاع بن عمرو نکلا۔ اس کے علاوہ ہر شہر میں
با اثر لوگوں نے اہلِ شہر کو جہاد اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی مدد کے لیے اُبھارنا شروع کیا۔

ادھر یہ باغی حضرت علیؓ کے پاس آئے اور آپ سے کہنے لگے کہ "ہمارے لیے عثمانؓ کو قتل کرنا جائز ہو گیا ہے آپ ہماری
مدد کیجیے۔"

حضرت علیؓ نے کہا:

"خدا کی قسم میں کسی صورت میں بھی تمہاری مدد نہیں کروں گا۔"

وہ کہنے لگے:

"تو پھر آپ نے ہمیں ایسا لکھا کیوں تھا؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ:

"میں نے کبھی تم کو کوئی خط نہیں لکھا۔"

جب فتنہ کے سرغنوں نے یہ جواب سُنا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ حیرت کے آثار ان کے چہروں سے

نمایاں تھے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مدینہ کے جو لوگ فتنہ پردازوں کے مددگار تھے وہ اہلِ مصر کو لکھا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ اس کام میں ان کے پورے شریک ہیں۔ مفسد اسی بنا پر لوگوں کو حضرت علیؓ کا نام لے کر ابھارتے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف اشتعال دلاتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ مدینہ سے اہلِ مصر کے نام حضرت علیؓ کی طرف سے خط لکھے بھی گئے ہوں۔ اگرچہ حضرت علیؓ کو ان کی بالکل خبر نہ تھی۔

حضرت عمروؓ بن العاص اس وقت مدینہ میں تھے۔ جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تو وہ فوراً مدینہ سے فلسطین چلے گئے اور وہیں حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سنی۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جب پہلے پہل فتنہ کے سرغنے مدینہ آئے اور وہاں یہ بات مشہور کی کہ وہ خلیفہ کو معزول کرنا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اسے قتل کرنا چاہتے ہیں تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ ان کی مدد کریں اور ان لوگوں کو مدینہ سے نکال دیں۔ کیونکہ وہ ان کا مدینہ میں آنا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس طرح ان کو مرکزِ خلافت پر حملہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اب ان کی رائے پر ہی چلیں گے اور جو کچھ وہ مشورہ دیں گے اسی کو قبول کریں گے۔ چنانچہ حضرت علیؓ مہاجرین اور انصارؓ کی ایک جماعت لے کر گئے۔ جب فسادی دوبارہ مدینہ لوٹے تو حضرت عثمانؓ مسجد میں گئے اور وہاں لوگوں کو فتنہ و فساد سے باز رہنے کے متعلق خطبہ دیا۔ گھر لوٹے تو مروان، سعید اور بنی امیہ کے کچھ اشخاص کو وہاں موجود پایا۔ مروان نے آپ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان فسادیوں سے کچھ کہوں۔ آپ نے خطبہ میں بہت ہی نرمی سے کام لیا ہے حالانکہ سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ حضرت عثمانؓ کی بیوی نائلہ نے تو منع کیا لیکن حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔

اس پر مروان فسادیوں کے پاس گیا اور ان سے بہت سختی کے ساتھ کلام کیا۔ وہ حضرت علیؓ کے پاس گئے اور سارا حال سنایا۔ حضرت علیؓ کو بہت غصہ آیا، وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے مروان کو بہت ہی ڈھیل دے رکھی ہے اس نے آپ کی اجازت سے باغیوں کے ساتھ سخت کلامی کی ہے اس لیے اب میں آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ آپ جانیں اور باغی جانیں۔

حضرت عثمانؓ نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا اور قرابت کا واسطہ دے کر حضرت علیؓ سے درخواست کی کہ وہ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں اور ان کی مدد کرتے رہیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے جواب دے دیا اور کہا کہ:

"آپ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کا پاس نہ کرتے ہوئے مروان اور بنی امیہ کے دوسرے لوگوں کے مشوروں پر کان دھرا۔"

حضرت عثمانؓ نے اس الزام کو ماننے سے انکار کر دیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

"تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور میرے ساتھ قطع رحمی کی ہے۔" [1]

---

[1] محض مفروضہ اور بے بنیاد روایت ہے۔ (مترجم)

(۲۱)

مدینہ کا محاصرہ

مفسدین نے مدینہ میں داخل ہونے اور اس کا محاصرہ کر لینے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ مصری مدینہ میں داخل ہو گئے تھے اور مدینہ والوں کو بے بس کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ دوسرے شہروں کے لوگ بھی مدینہ میں آ گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ اپنے گھر سے نکلتے تھے اور مسجد میں جا کر نماز پڑھاتے تھے۔ لیکن وہ کچھ تعرض نہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کے مدینہ پر قبضہ کر لینے کے بعد جو پہلا جمعہ آیا تو حضرت عثمانؓ نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں آئے اور خطبہ دیا جس میں آپ نے فسادیوں کے متعلق بعض باتیں کہیں۔ اہلِ مدینہ میں سے آپ کی باتوں کی تائید محمد بن مسلمہ اور زید بن ثابت نے کی۔ اس پر فسادی جو مسجد میں موجود تھے جوش میں آ گئے اور انہوں نے اہلِ مدینہ اور حضرت عثمانؓ پر پتھر برسانے شروع کر دئے۔ جس سے حضرت عثمانؓ بیہوش ہو گئے اور اسی بیہوشی کی حالت میں آپ کو گھر پہنچایا گیا۔ مصریوں کو اہلِ مدینہ میں سے سوائے تین افراد کے اور کسی سے مدد کی کوئی امید نہ تھی، اور وہ یہ تھے :

۱۔ محمد بن ابی بکر ،

۲۔ محمد بن ابی حذیفہ ،

۳۔ عمار بن یاسر۔

بعض صحابہؓ تو ان بدبختوں سے جنگ کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے جن میں ذیل کے صحابہؓ بھی شامل تھے :

۱۔ حضرت سعدؓ بن مالک

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ

۳۔ حضرت زیدؓ بن ثابت

۴۔ حضرت امام حسنؓ

لیکن حضرت عثمانؓ نے کہلا بھیجا کہ آپ لوگ ان فسادیوں سے بالکل تعرض نہ کریں۔ اور یہ واپس آ گئے۔

حضرت عثمانؓ ان باغیوں کے مدینہ میں داخل ہونے کے بیس روز بعد تک لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ لیکن پھر انہوں نے آپ کا مسجد میں آنا جانا بند کر دیا اور آپ کی جگہ غافقی نماز پڑھانے لگا جس کو مصریوں، کوفیوں اور بصرہ کے لوگوں نے متفقہ طور پر اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔ ساتھ ہی اہلِ مدینہ پر سختیاں بھی شروع کر دیں اور ان کا اپنے گھروں سے باہر نکلنا تقریباً بالکل بند کر دیا۔ کوئی شخص بغیر ہتھیار لگائے اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ محاصرہ چالیس روز تک رہا۔ جو شخص ان سے تعرض کرتا وہ اسے قتل کر دیتے۔ لیکن اس سے پہلے تیس روز تک انہوں نے قتل و غارت سے اجتناب کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے آخری دنوں میں بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ آپ کو اپنے اوپر بھی کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔

مروان اور بنی امیہ آپ کو جس طرف چاہتے پھیر دیتے تھے۔ آپ ان لوگوں سے وعدے کرتے تھے لیکن جب اپنے گھر آتے تو مروان آپ کی رائے کو بدل ڈالتا تھا اور آپ کو اپنے وعدے سے منحرف کرا دیتا تھا[1] کیونکہ اس کو خیال تھا کہ فوجیں مختلف شہروں سے حضرت عثمانؓ کی مدد کو چل چکی ہیں اور مدینہ پہنچا ہی چاہتی ہیں۔ اب فکر کس بات کا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ معاملات کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھایا جاتا اور فسادیوں کو بھڑکنے کا موقعہ نہ دیا جاتا تاکہ وُہ فوجیں اچانک آ کر اہلِ فتنہ و فساد کا سر کچل سکتیں۔ بنی امیہ کے لوگوں پر حضرت عثمانؓ انتہائی بھروسا کرتے تھے اس سے عام لوگوں میں بہت ناراضی پھیلتی تھی اور ان کو ان لوگوں کا اثر و اقتدار بہت ہی ناگوار گزرتا تھا ادھر فسادی حضرت عثمانؓ کے کسی عذر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ حکومت چھوڑ دیں اور پھر مسلمان باہمی مشورہ سے کسی اور کو خلیفہ بنا لیں۔ اور دُوسرا یہ کہ حضرت عثمانؓ اپنے رشتہ داروں میں سے ان اشخاص کو جو ان کے خاص رازدار تھے اور امورِ سلطنت میں انہی کا عمل دخل تھا ان کے حوالے کر دیں تاکہ وُہ ان سے اس خیانت کا بدلہ لے سکیں جو انہوں نے مسلمانوں سے اور خود خلیفہ سے کی۔ ہے وہ خیانت ان کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ مروان بن الحکم نے حضرت عثمانؓ کے نام سے عبداللہ بن ابی سرح امیرِ مصر کو ایک خط لکھا تھا جس میں بعض مصری رؤساء کو قتل کرنے، کوڑے لگانے اور مختلف سزائیں دینے کا حکم دیا تھا[2]

بنو امیہ خطرے کو بالکل اپنے سر پہ کھڑا دیکھتے تھے۔ ادھر موت حضرت عثمانؓ کا انتظار کر رہی تھی۔ مفسدین کسی صورت میں بھی اپنے ارادوں کو ترک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ اہلِ مدینہ خاموشی اور سکون سے تمام حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گزشتہ زمانہ میں خلافت نے ان کو شکنجہ میں کسا ہوا تھا۔ ڈر اور خوف ہر وقت مسلمانوں کے سروں پر مسلط رہتا تھا جس کی وجہ سے خلافت کے نام سے بھی ان کو وحشت ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ میں خلافت ضعف اور کمزوری کا دوسرا نام ہو گیا تھا۔ حد یہ تھی کہ مفسدین کو یہ جرأت ہو گئی تھی کہ وہ علی الاعلان سیکڑوں لوگوں کے سامنے مسجد میں خطبہ پڑھتے ہوئے خلیفہ پر پتھر برسائیں[3]

بنی امیہ کے لوگ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ کا اس فتنہ میں بہت بڑا ہاتھ ہے، اس لیے ایک دُوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات اُبھرنے لگے۔ جو باتیں دلوں میں چھپی ہوئی تھیں وہ زبانوں پر آنے لگیں۔ اپنے مفادات کے لیے ان لوگوں نے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا اور آپس میں ہی ایک دُوسرے کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ حالت

---

[1] ایک خلیفہ کے متعلق جس کو خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو اور جس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہو کہ خدا تمہیں ایک قمیص (خلافت) پہنائے گا تم اسے کو مت اتارنا، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے کہنے میں آ کر لوگوں سے وعدہ خلافیاں کرتا تھا، کس قدر بعید از قیاس اور دور از عقل بات ہے۔

[2] یہ واقعہ سرے سے غلط ہے جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر آئے ہیں۔

[3] صحابہؓ پر حضرت عثمانؓ کی مدد نہ کرنے کا الزام قطعی بے بنیاد ہے اور ہم شروع میں اس پر تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔ (مترجم)

یہاں تک پہنچی کہ حضرت علیؓ فتنہ کے ان ایام میں مدینہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اگرچہ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ محض اپنی ذاتی سعی و کوشش سے اس فتنہ و فساد کا قلع قمع ہرگز نہ کر سکتے تھے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو بھول جاتے کیونکہ جس فتنہ سے وہ دوچار تھے اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ تھی کہ ہر فریق دوسرے فریق کے عیوب گنوائے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر مسلمانوں کے سربرآوردہ اشخاص اس وقت متفق ہوتے تو وہ ضرور اس سیلاب کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے تھے جو انتہائی ہولناکی کے ساتھ ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا لیکن دلوں میں باہمی محبت و الفت کی جگہ نفرت و حقارت نے لے لی تھی۔ نادان اور حقیقت ناشناس لوگ آگے آ گئے تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے سامنے ہے۔

سب سے بڑی غلطی جو حضرت عثمانؓ نے کی وہ یہ تھی کہ جب فساد کے بانی اور فتنہ کے سرغنے آپ کے پاس لائے گئے اور آپ نے ان پر ثابت کر دیا کہ وہ محض فساد اور بغاوت کے لیے آئے ہیں تو آپ نے ان کو بغیر کوئی سزا دئے چھوڑ دیا حالانکہ آپ کو چاہیے تھا کہ ان کو عبرت ناک سزائیں دیتے جس سے فتنہ کا قلع قمع ہو جاتا اور پھر کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا موقع بھی دیا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب تمام صوبوں کے والیوں نے متفقہ طور پر آپ کو مشورہ دیا تھا کہ سانپ کے پھن اٹھانے سے پہلے ہی اس کو مار ڈالنا چاہیے۔ اس وقت آپ کو کوئی مضبوط قدم اٹھانا چاہئے تھا اور اس معاملہ میں کمزوری نہیں دکھانی چاہیے تھی لیکن آپ نے ان کی باتوں کی پروا نہ کی اور ان کے مشورہ کو نہ مانا بلکہ اس ڈر سے نرمی کا پہلو اختیار کیا کہ کہیں آپ ہی فتنہ کا دروازہ کھولنے کا باعث نہ بنیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آئندہ بھی جب کبھی وہ آپ کے پاس آئے یا انہوں نے آپ پر اعتراضات کیے تو آپ نے محض اپنی پوزیشن صاف کرنے اور اپنی بے گناہی واضح کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ لیکن کوئی عملی قدم ان کے خلاف نہ اٹھایا، حالانکہ ان مفسدین کی جماعت پر معقول باتوں اور براہینِ قاطعہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا وعظ و نصیحت سے ان کے دل بالکل نہ پسیجتے تھے۔ کیونکہ ان کا مقصد صرف فتنہ و فساد پیدا کرنا اور بغاوت پھیلانا تھا۔ ایسی جماعتیں صرف قوت سے ڈرتی ہیں۔ سختی اور قہر کے سامنے سر جھکاتی ہیں اور قوت و سختی ہی سے مغلوب ہو سکتی ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کو ڈھیل دے کر ان میں جرأت و دلیری پیدا کر دی۔ یہ فسادی وعظ و نصیحت پر کان دھرنے والے اور دلائل کی رُو سے اپنے کاموں سے باز آنے والے نہیں تھے بلکہ محض فتنہ و فساد پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ آپ کی نرمی اور کمزوری نے ان کو فتنہ و فساد پر جرأت دلائی۔

اس فتنہ کے متعلق مورخین کی رائیں الگ الگ ہیں۔ ہر مورخ نے اس کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے اپنا علٰحدہ نظریہ قایم کیا ہے۔ لیکن آج کا مؤرخ، جس کے سامنے پچھلے مورخین کی تمام رائیں موجود ہیں۔ اس فتنہ کے اسباب پر بحث کرنے سے پہلے محسوس کرتا ہے کہ مؤرخینِ سلف نے اپنی بحث کو حدِ اعتدال پر نہیں رکھا بلکہ یا تو وہ کلیۃً ایک فریق کے حق میں ہو گئے ہیں یا دوسرے فریق کے، اس لیے ضروری ہے کہ اس معاملہ پر تفصیلی بحث کی جائے، اتنی مکمل بحث جس کے پیشِ نظر قارئینِ کرام اس فتنہ کے متعلق ایسی محکم رائے قایم کر سکیں جو واقعات کے بالکل مطابق ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مفسدین جو مدینہ میں خلیفہ کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے ان کا شروع میں صرف یہ مطالبہ تھا کہ حضرت عثمانؓ خلافت سے معزول ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ مطمئن ہو کر اپنے شہروں کو واپس چلے جاتے۔ کیونکہ ان کی بات پوری

ہو جاتی۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں حضرت عثمانؓ کے اموی رازداروں خصوصاً مروان بن الحکم نے حضرت عثمانؓ کو ایسا کرنے سے روکا اور اس امید پر اس معاملہ کو ڈھیل دی کہ کچھ عرصہ کے بعد فوجیں حضرت عثمانؓ کی مدد کو پہنچ جائیں گی اور سختی کے ساتھ مفسدین کو کچل کر فتنہ فرو کر دیں گی۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ اگر شامی فوجیں وقت پر مدینہ پہنچ جاتیں تو مفسدین کا پتا بھی نہ ملتا۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ مفسدین نے جو مختلف شہروں سے اکٹھے ہو کر آتے تھے، اگرچہ اپنے اپنے شہروں کو واپس چلے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ مدینہ والوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر پھر مدینہ واپس آ گئے تھے۔ مصریوں نے آتے ہی یہ دعویٰ کیا تھا کہ عبداللہ بن ابی سرح والیِ مصر نے ان کے ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا ہے جو حضرت عثمانؓ کے پاس ابنِ ابی سرح کی شکایت لے کر آیا تھا اور وہ حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہؓ کے پاس اس کی شکایت لے کر آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضرت عثمانؓ سے پورا پورا انصاف کرنے کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

"کسی ایسے آدمی کا نام تجویز کرو جس کو ابن ابی سرح کی جگہ تمہارا والی مقرر کیا جائے۔"

انہوں نے محمد بن ابی بکرؓ کا نام تجویز کیا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے مطالبہ پر اس کو وہاں کا والی مقرر کر دیا۔ جب حضرت علیؓ، محمد بن مسلمہ وغیرہ مہاجرین اور انصار کے سرکردہ اشخاص نے ان لوگوں سے جا کر کہا کہ خلیفہ نے ان کے کہنے پر چلنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لئے تم اپنے اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ تو انہوں نے یہ بات قبول کر لی اور چلے گئے۔ لیکن فوراً ہی مدینہ واپس آ گئے اور بہانہ یہ بتایا کہ مصریوں نے ایک قاصد پکڑا ہے جو عبداللہ بن ابی سرح کے پاس یہ پیغام لے کر جا رہا تھا کہ ان لوگوں میں سے بعض کو قتل اور بعض کو جلا وطن کر دو وغیرہ وغیرہ۔ قاصد حضرت عثمانؓ کا ایک غلام تھا جس کو آپ نے اپنے اونٹوں کا نگہبان بنایا ہوا تھا۔ خط کی طرزِ تحریر بھی حضرت عثمانؓ سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ جو مہر اس پر لگی ہوئی ہے وہ بھی حضرت عثمانؓ کی ہے۔ اس وجہ سے اب ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیں۔ اہلِ کوفہ و بصرہ اپنے مصری بھائیوں کی مدد اور پشت پناہی کے لیے آئے ہیں۔

اسی جگہ ایک دوسری روایت محمد بن مسلمہ کی درج کی جاتی ہے جس کو طبری نے نقل کیا ہے:

محمد بن مسلمہ کہتے ہیں: "میں چند لوگوں کے ہمراہ مصریوں کے پاس پہنچا ان کے چار سردار تھے:

۱۔ عبدالرحمٰن بن عدیس البلوی

۲۔ سودان بن حمران المرادی

۳۔ عمرو بن الحمق الخزاعی

---

[1] لیکن یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ خلیفہ معزول نہیں ہو سکتا اور حضرت عثمانؓ کو تو حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر فرمایا تھا کہ "ایک قمیص خدا تعالیٰ تمہیں پہنائے گا، لوگ وہ قمیص اتارنا چاہیں گے مگر تم مت اتارنا۔" اس میں مروان بن الحکم اور آپ کے اموی رازداروں کے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مترجم)

۴۔ابن النباع۔

وہ اپنے اپنے خیموں میں تھے میں نے ان کو سمجھایا بجھایا، فتنہ کا خوف دلایا اور ان کو بتلایا کہ اگر خدانخواستہ حضرت عثمانؓ قتل کر دئے گئے تو امت میں ایک انتشار برپا ہو جائے گا جو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلے گا۔ تم اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ اور فتنہ پیدا کرنے والے نہ بنو۔ اس کے بدلے میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اس جھگڑے میں تم جس جس شخص کو ناپسند کرتے ہو میں اس کو برطرف کرا دوں گا۔"

انہوں نے کہا:

"اگر ایسا نہ ہو سکا تو؟"

میں نے جواب دیا:

"پھر تم جاننا اور تمہارا کام۔"

وہ اس پر راضی ہو گئے اور میں لوٹ آیا۔

واپس مدینہ آکر میں حضرت عثمانؓ سے ملا اور تنہائی میں ان سے کچھ باتیں کرنی چاہیں، وہ مجھے تنہائی میں لے گئے۔

میں نے ان سے کہا:

"آپ اپنے بارہ میں کچھ خوف کیجئے۔ یہ قوم آپ کے خون کی پیاسی ہے۔ موقعہ پڑنے پر آپ کے ساتھی نہ صرف یہ کہ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے بلکہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کریں گے۔"

حضرت عثمانؓ نے میری بات سے اتفاق کیا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ میں اُن کے پاس سے چلا آیا۔

کچھ دیر کے بعد حضرت عثمانؓ مسجد میں گئے اور وہاں خطبہ پڑھا جس میں بیان کیا کہ:

"مصری ایک کام کے لیے آئے تھے لیکن یہاں آکر ان کو اس کے بالکل برعکس باتوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ لوٹ گئے۔"

میں نے چاہا کہ حضرت عثمانؓ سے احتجاج کروں مگر خاموش ہو گیا۔ اسی دوران میں یہ خبر پہنچی کہ مصری واپس آگئے ہیں اور وہ سویدا ریک پہنچ گئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے مجھ کو بلا بھیجا اور فرمایا:

"ابو عبدالرحمٰن! یہ لوگ پھر آ گئے ہیں تمہاری ان کے بارہ میں کیا رائے ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ لوگ کوئی نیک ارادہ لے کر نہیں آئے۔"

آپ نے فرمایا: "پھر جاؤ اور ان کو لوٹا دو۔"

میں نے جواب دیا:

"میں تو یہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "کیوں؟"

میں نے جواب دیا:

"اس لیے کہ میں نے ان لوگوں کو آپ کی طرف سے چند باتیں چھوڑ دینے کی ضمانت دی تھی۔ لیکن وہ باتیں آپ نے نہیں چھوڑیں۔"

آپ نے اس پر صرف یہ فقرہ کہا،

واللہ المستعان۔ (اللہ ہی مدد کرنے والا ہے)

اس کے بعد ابن عدیس میرے پاس آیا اس کے ساتھ سودان بن حمران اور اس کے دو ساتھی تھے۔ وہ کہنے لگے،

"ابو عبدالرحمٰن! آپ ہمارے پاس آئے تھے اور ہم سے کچھ وعدہ نے کر کے ہم کو لوٹا دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ حضرت عثمانؓ ان باتوں کو چھوڑ دیں گے جو ہم ناپسند کرتے ہیں!"

میں نے کہا: "بے شک!"

اس پر انھوں نے ایک چھوٹا سا خط نکالا اور کہنے لگے: "ہمیں، رستہ میں صدقہ کا ایک اونٹ ملا جس پر حضرت عثمانؓ کا غلام سوار تھا ہم نے اس کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں یہ خط پایا، اس خط میں لکھا ہوا تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب تمہارے پاس عبدالرحمٰن بن عدیس آئے تو اس کو سو کوڑے مارو۔ اس کا سر اور داڑھی منڈوا دو، اور جب تک میرا دوسرا حکم نہ پہنچے اس کو قید میں رکھو۔ یہی سلوک عمر بن الحمق، سودان بن حمران اور مروہ بن النباع کے ساتھ کرنا۔"

میں نے ان سے کہا:

"کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ خط لکھا ہے؟"

انہوں نے کہا:

"اگر یہ خط حضرت عثمانؓ نے اپنی مرضی سے نہ بھی لکھا ہو تو مروان نے ان پر زور ڈال کر لکھوایا ہے۔"

پھر وہ کہنے لگے:

"تم ہمارے ساتھ حضرت عثمانؓ کے پاس چلے چلو ہم نے حضرت علیؓ سے بھی بات کی ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ نماز ظہر کے بعد وہ ان سے گفتگو کریں گے۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ:

"ہم نے کئی اور صحابہؓ سے بھی اس معاملہ کے متعلق بات کی تھی لیکن انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کچھ کہنے کے متعلق معذوری ظاہر کی۔"

محمد بن مسلمہ کہتے ہیں:

"چنانچہ میں اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور آپ سے عرض کیا" مصری دروازہ پر کھڑے ہیں آپ ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دیں۔" اس وقت مروان بھی آپ کے پاس بیٹھا تھا وہ کہنے لگا،

"آپ مجھے اجازت دیجئے میں ان سے بات کروں گا۔"

اس پر حضرت عثمانؓ نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تمہیں اس معاملہ میں بولنے کا کوئی اختیار نہیں۔ تب مروان وہاں سے چلا گیا۔ حضرت علیؓ نے آپ کو خط والا سارا معاملہ بتایا۔ حضرت عثمانؓ نے قسم کھائی کہ انہوں نے یہ خط نہیں لکھا نہ انہیں اس خط کے لکھے جانے کا علم ہے۔ محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی تصدیق کی۔

اس پر حضرت علیؓ نے کہا :

"تو پھر ان کو اپنے پاس بلا لیجئے تاکہ وہ آپ کا عذر سن لیں۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میری مروان سے رشتہ داری اور قرابت داری ہے۔ تم خود ہی جاکر ان سے بات کرو کیونکہ وہ تمہاری بات مانتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مجبوراً حضرت عثمانؓ کو انہیں بلانا پڑا۔ وہ آئے اور سلام کیا۔ ابن عدیس نے بات کرنی شروع کی۔ پہلے اس نے وہ سب کچھ بتلایا جو ابن سعد نے مصر میں کیا تھا۔ پھر کہا کہ ہم مصر سے یہ ارادہ لے کر چلے تھے کہ یا تو آپ کو قتل کر دیا جائے یا آپ خلافت چھوڑ دیں۔ لیکن محمد بن مسلمہ نے ہمیں اس شرط پر لوٹا دیا تھا کہ جو کچھ ہم نے مطالبہ کیا تھا وہ آپ پورا کر دیں گے (محمد بن مسلمہ نے اس کی تصدیق کی)

پھر کہنے لگے :

"ہم واپس اپنے شہروں کو جا رہے تھے۔ جب ہم بویب پہنچے تو وہاں آپ کا ایک غلام ملا۔ ہم نے اس کے پاس سے آپ کا ایک خط جس پر آپ کی مہر بھی لگی ہوئی تھی، اور جو عبداللہ بن سعد کے نام لکھا گیا تھا برآمد کیا۔ اس خط میں آپ نے عبداللہ کو ہمیں کوڑے لگانے، سزائیں دینے اور قید کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیجئے! یہ ہے وہ خط۔"

حضرت عثمانؓ کہنے لگے :

"خدا کی قسم! نہ میں نے یہ لکھا، نہ کسی کو لکھنے کا حکم دیا، نہ اس قسم کا خط لکھنے کا میری طرف سے کسی کو اشارہ ہوا، نہ مجھے اس کے لکھے جانے کا علم ہے۔"

محمد بن مسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے اور حضرت علیؓ نے کہا :

"یہ بالکل سچ ہے۔"

اس پر مصری کہنے لگے :

"تو پھر یہ خط کس نے لکھا؟"

حضرت عثمانؓ نے کہا : "مجھے معلوم نہیں۔"

وہ کہنے لگے :

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مروان آپ کے نام سے ایک خط لکھے، آپ ہی کے غلام کو وہ خط دے کر بھیجے، مسلمانوں کے صدقات کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ اس کو بطور سواری دے، آپ ہی کی مہر اس پر لگائے، آپ کے عمال کو اتنی بڑی

بات کا حکم دے اور آپ کو اس بات کا علم تک نہ ہو؟"

آپ نے فرمایا: "بے شک ایسا ہو سکتا ہے!"

وہ کہنے لگے:

"ہم نے آپ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا، آپ خلافت چھوڑ دیجئے۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"میں وہ قمیص ہرگز نہیں اتار سکتا جو خدا نے مجھے پہنائی ہے۔"

اس پر طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں، شور و شغب بہت زیادہ ہو گیا۔ میں یہ خیال کرنے لگا کہ کہیں یہ سچ مچ حضرت عثمانؓ پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت علیؓ کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مصریوں سے کہا:

"اب یہاں سے نکلو۔"

چنانچہ وہ وہاں سے نکل گئے۔ میں اپنے گھر آ گیا۔ حضرت علیؓ اپنے گھر چلے گئے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اس وقت تک نہ ہٹے جب تک آپ کو شہید نہ کر دیا۔

اگر یہ روایت صحیح ہو تو مورخ یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کا یہ غلام مدینہ میں موجود تھا اور صدقہ کا وہ اونٹ بھی جس پر غلام سوار تھا اور جس کو مصریوں نے پکڑا تھا تو پھر حضرت عثمانؓ نے اس غلام سے اس شخص کے بارہ میں کیوں نہیں پوچھا جس نے اس کو وہ خط دیا تھا؟

آپ نے اس غلام سے یہ کیوں نہ دریافت کیا کہ اس کا مصر جانے کا مقصد کیا تھا؟

آپ نے اس سے یہ سوال کیوں نہ کیا کہ صدقہ کا اونٹ اس کو کس نے دیا تھا؟

آپ نے اونٹوں کے رکھوالے سے جواب طلب کیوں نہ کیا کہ میری اجازت کے بغیر یہ اونٹ غلام کے حوالے کر دینے کا تمہیں کیا اختیار تھا؟

اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ کام کس کا ہوگا اور غلام کو مصر کس نے بھیجا ہوگا اور اس کے بعد مصری بھی بدلہ لینے میں حق پر تھے۔

لیکن ایک اور چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ واقعہ جس کو اکثر مورخین نے نقل کیا ہے اگر صحیح ہو (اور ہمیں اس کے صحیح ماننے میں کوئی شک بھی نہیں کیونکہ متفقہ طور پر سب مورخین اسے نقل کرتے چلے آئے ہیں) اور مصریوں نے قاصد کو اسی حالت میں پایا ہو جس کا انہوں نے ذکر کیا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب کام حضرت عثمانؓ کے پس غیبت اور آپ کے علم کے بغیر کیا گیا۔ خصوصاً جب کہ ایک دوسری روایت بھی ہے کہ جب انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ:

"کیا ہم محمد بن مسلمہ کے اس وعدہ پر مدینہ سے نہیں چلے گئے تھے کہ آپ نے جو زیادتیاں کی ہیں ان سب سے دست بردار ہو جائیں گے اور جو چیزیں ہمیں ناپسند تھیں وہ چھوڑ دیں گے اور آپ نے خود بھی اس امر کا اقرار کر لیا تھا۔" تو حضرت عثمانؓ نے کہا:

"میں اب بھی اسی بات پر قایم ہوں۔"

وہ کہنے لگے:

"تو پھر آپ نے وہ خط کیوں اپنے عامل کو بھیجا جس کو ہم نے آپ کے قاصد کے قبضہ سے برآمد کیا؟"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا نہ مجھے علم ہے اور نہ میں نے ایسا کیا۔"

انہوں نے کہا:

"آپ کا قاصد آپ کے اونٹ پر تھا طرزِ تحریر آپ کے کاتب کی تھی اور اس پر آپ کی مُہر لگی ہوئی تھی۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

"اُونٹ کو چرایا جا سکتا ہے، طرزِ تحریر نقل کی جا سکتی ہے اور مُہر بھی دُوسری بنوائی جا سکتی ہے۔"

وُہ کہنے لگے:

"پھر ہم آپ کے خلاف کچھ نہیں کہتے لیکن آپ اپنے فاسق عمال کو برطرف کر دیجئے اور ان کی جگہ ایسے عامل مقرر کیجئے جو ہم سے انصاف کریں اور ہمارے مطالبات مانا کریں۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

"اگر میں تمہاری خواہشات پر عمل کرنے لگوں، جس کو تم عامل بنانا چاہو اسی کو عامل بناؤں، جس کو تم معزول کرنا چاہو اس کو معزول کر دُوں تو میری حکومت کہاں رہی تمہاری حکومت ہو گئی۔"

وُہ کہنے لگے:

"آپ کو ایسا ضرور کرنا پڑے گا ورنہ دُو صورتیں ہیں، یا آپ معزول ہو جائیے اور یا قتل ہونے کے لیے تیار رہیے۔ اب جو کرنا ہو وہ سوچ لیجئے۔"

آپ نے فرمایا:

"میں وہ قمیص اتارنے کے لیے ہرگز تیار نہیں جو خدا نے مجھے پہنائی ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس خط کے معاملہ میں ہم کسی شک میں نہیں اور ہمیں یقین ہے حضرت عثمانؓ اس خط کے اتہام سے بالکل بری ہیں آپ نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔ یہ خط یقیناً مروان یا حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ داروں میں سے کسی نے لکھا تھا اور حضرت عثمانؓ کی مرضی اور علم کے بغیر لکھا تھا۔ بنی امیہ کی یہی سیاست تھی۔[1]

---

[1] شروع میں ثابت کیا جا چکا ہے نہ یہ خط حضرت عثمانؓ نے لکھوایا اور نہ مروان یا حضرت عثمانؓ کے قریبی آدمیوں میں سے کسی نے لکھا، بلکہ یہ ان مفسدین کا خود بنایا ہوا تھا۔ (مترجم)

(۲۲)

تشویشناک صورتِ حال

جس وقت مفسدین، حضرت عثمانؓ کا عامل مصر کے نام خط لے کر دوبارہ مدینہ میں داخل ہوئے تو حضرت علیؓ مدینہ چھوڑ کر خیبر میں مقیم ہو گئے۔ وہ حضرت عثمانؓ سے اس بات پر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی رائے پر اپنے مشیروں کی رائے کو ترجیح دی تھی۔

جب حضرتِ عثمانؓ نے دیکھا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ بنی اُمیّہ ان کی مدافعت سے بالکل عاجز آ گئے ہیں اور اہلِ مدینہ نے ان کو چھوڑ دیا ہے تو حضرت علیؓ کو بلانا چاہا اور انہیں ایک خط لکھا۔ اس خط کو ابو العباس المبرد صاحب کامل نے اس طرح نقل کیا ہے:

"اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ لوگ میری جان کے درپے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک وہ میرا خون نہ بہالیں گے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

ساتھ ہی ایک شعر بھی نقل کیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اگر واقعی میں ایسی چیز ہوں جس کو کھالینا ہی مناسب ہے تو آپ ہی آ کر اس کو کھانے والے بنیں ورنہ پھر میری مدد کیجئے۔ ایسا نہ ہوا تو میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاؤں گا۔"

ادھر حضرت علیؓ کی غیر موجودگی میں طلحہ بن عبیداللہ ان لوگوں کی خواہشات کا مرکز بن گئے تھے۔ شاید وہ خود اپنے لیے خلافت کے خواہشمند تھے[1] لوگ چھپ چھپ کر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جب حضرت علیؓ آئے اور حضرت عثمانؓ نے ان سے لوگوں کے ہٹانے کو کہا تو وہ طلحہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا:

"طلحہ! یہ کیا بات ہے تم اس معاملہ میں کیوں پھنس گئے؟"

اس کے بعد وہ بیت المال میں گئے اور لوگوں کو کچھ مال دیا جس پر انہوں نے طلحہ کو چھوڑ دیا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے علٰحدگی میں یہ سارا حال کہہ دیا۔ طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے پاس معافی مانگنے آئے تو آپ نے ان سے کہا:

---

[1] حضرت طلحہؓ پر یہ الزام لگانا قطعاً درست نہیں۔ آپ نے اپنے دونوں لڑکوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت اور باغیوں سے مقابلے کے لیے اس حالت میں بھیجا کہ باغی ہزاروں کی تعداد میں ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھے اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے مقابلہ کرنے کے لیے پانچ چھ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ اس صورت میں حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کا اپنے لڑکوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے بھیجنا صریحاً ان کو موت کے منہ میں دھکیلنا تھا۔ کیا ایسا شخص جس کو کسی شخص سے بغض و عناد ہو وہ اس کی حفاظت کے لیے اپنے بچوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے؟ یہ کام صرف انتہائی جاں نثاروں کا ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ مورخین نے ایسی باتیں جو عقل و قیاس سے کوسوں دور ہیں اپنی تاریخوں میں بلا سوچے سمجھے درج کر دیں۔ (مترجم)

"خدا کی قسم تم درحقیقت معافی مانگنے نہیں آئے ہو بلکہ صرف اس وجہ سے آئے ہو کہ تم مغلوب ہو چکے ہو۔"

ہمارے پاس اس امر کا بیّن ثبوت موجود ہے کہ طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے اور حضرت عثمانؓ کہا کرتے تھے:

"اے اللہ! مجھے طلحہ کے شر سے بچا۔"

آپ یہ بھی کہا کرتے تھے:

"میں نے طلحہ کو بے شمار مال و دولت سے نوازا لیکن وہ میرے خون کا پیاسا ہے اور لوگوں کو میرے خلاف ابھارتا ہے۔ اے اللہ! تو اس کو کچھ نہ دے اور اس کی سرکشی کا مزا اس کو چکھا۔"

وہ لوگ جو "واقعہ دار" کے موقعہ پر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دن موجود تھے، بیان کرتے ہیں کہ اس دن طلحہ نے اپنے آپ کو کپڑوں میں چھپا رکھا تھا اور وہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر آپ کے گھر میں تیر مارتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب محاصرین حضرت عثمانؓ کے گھر میں دروازے کی راہ سے داخل نہ ہو سکے تو یہ طلحہ ہی تھے جنہوں نے ان کو صلاح دی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پیچھے ایک انصاری کے گھر میں داخل ہو کر اور اس کی دیوار پھاند کر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیں۔ انہوں نے ان لوگوں کو اس مکان پر چڑھانے میں مدد بھی دی۔

زبیر بن العوام بھی اگرچہ حضرت عثمانؓ کے مخالفین میں سے تھے۔ لیکن ان کے بیٹے عبداللہ نے حضرت عثمانؓ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ان غوغائیوں کا مقابلہ کیا اور ان کو وہاں سے ہٹا دیا۔[1]

جب ہم یہ واقعات دیکھتے ہیں تو ہمیں اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی کہ دونوں صاحبان خلافت کے متمنی تھے اور ان کو یقین تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد خلافت کے یہی وارث ہوں گے۔ ان کو یہ خیال بھی تھا کہ جب حضرت علیؓ خلافت سے پہلی، دوسری اور تیسری مرتبہ محروم ہو چکے ہیں تو اس موقعہ پر بھی وہ خلافت حاصل نہیں کر سکیں گے اور چوتھی مرتبہ بھی ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

یہ بات یقینی ہے کہ جب فتنہ شدت اختیار کر چکا تو اس وقت یہ امر حضرت علیؓ کی طاقت سے باہر ہو چکا تھا کہ وہ ان مفسدین کو مدینہ سے باہر نکال دیتے۔ اگر ایسا کرنا آپ کے امکان میں ہوتا تو آپ ضرور ایسا کرتے خصوصاً جب حضرت عثمانؓ

---

[1] کیا عجیب مخالفت ہے کہ اپنے دشمن کی حفاظت کے لیے اپنے لڑکے کو بھیجا جا رہا ہے۔ اگر ان کو خلافت کی خواہش ہوتی تو کون سا امر مانع تھا کہ وہ باغیوں کے ساتھ مل جاتے لیکن بجائے باغیوں کے ساتھ ملنے کے، جو ان کی مطلب برآری کا سہل ترین ذریعہ تھا، وہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ مل جاتے ہیں جن سے ان کو از حد دشمنی تھی اور ان کی حفاظت کے لیے اپنے لڑکوں کو بھی تلواروں کی دھاروں پر رکھ دیتے ہیں۔ کیا ان باتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہؓ کے خلاف یہ الزامات محض اتہام کی صورت رکھتے ہیں اور اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ صحابہؓ حضرت عثمانؓ کے خلاف تھے اور وہ حضرت عثمانؓ کی اعانت و امداد سے دست کش ہو گئے تھے۔ (مترجم)

کا محاصرہ اور بھی سخت ہو گیا اور محاصرین نے آپ کے لیے پانی بھی بند کر دیا۔ حضرت علیؓ نے پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر حضرت علیؓ اور ازواجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ ان کو پانی پہنچائیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے ایک بیوی حضرت اُمِ حبیبہؓ نے جو حضرت معاویہؓ کی حقیقی بہن تھیں، چاہا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پانی لے کر جائیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں۔ محاصرین نے ان کو لوٹا دیا۔ تلوار سے ان کے خچر کے پالان کی رسّی کاٹ ڈالی جس سے اس کی زین اُلٹ گئی اور حضرت اُمِ حبیبہ اس پر سے گر پڑیں۔ اگر بعض لوگ جھپٹ کر حضرت اُمِ حبیبہؓ کو بچا نہ لیتے تو وہ بھی شہید ہو جاتیں۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ دیکھا تو حج کی تیاری شروع کر دی اور اپنے بھائی محمد بن ابی بکر سے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ حضرت عائشہؓ اہلِ مصر کے سخت خلاف تھیں کیونکہ وہ حضرت علیؓ کو چاہتے تھے اور حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے نفرت کرتی تھیں[1] جب مروان بن الحکم آپ کے پاس آیا اور آپ سے حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے مدینہ میں ہی ٹھہرنے کی درخواست کی تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا:

"کیا تم چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو اُمِ حبیبہؓ کے ساتھ کیا گیا۔ اگر میرے ساتھ ایسا کیا گیا تو مجھے تو کوئی ایسا آدمی بھی نظر نہیں آتا جو میری مدد کو پہنچے۔"

البتہ حضرت علیؓ نے جب دیکھا کہ حضرت عثمانؓ کے پاس پانی جانا بالکل بند ہو گیا ہے تو وہ ایک رات محاصرین کے پاس آئے اور ان سے کہا:

"اے لوگو! تم تو وہ کام کر رہے ہو جو مومنوں کو بالکل زیب نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ کافر بھی یہ کام نہیں کرتے۔ تم کیوں عثمانؓ کا کھانا پینا بند کر رہے ہو۔ رومی اور فارسی بھی جب کسی کو قید کرتے ہیں تو اس کو کھانا پانی دیتے ہیں۔ اس شخص نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اس کے قتل کے درپے ہو؟"

لیکن انہوں نے حضرت علیؓ کی بات بھی ماننے سے انکار کر دیا اور آپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم کھانے یا پینے کی کوئی چیز عثمانؓ تک نہیں پہنچنے دیں گے۔"

اس پر حضرت علیؓ اپنا عمامہ حضرت عثمانؓ کے گھر میں پھینک کر چلے گئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ آئے تھے مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو اس سلوک کا علم ہوا جو مفسدین نے حضرت علیؓ اور اُمِ حبیبہؓ کے ساتھ کیا تھا تو وہ بھی مجبوراً اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور پانی پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کی[2]

---

[1] یہ الزام بھی ویسا ہی غلط ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کا حضرت عثمانؓ کے خلاف ہونے کا الزام۔ واقعہ یہی ہے حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ سے کسی قسم کی کدورت نہ تھی۔

[2] یہ عجیب تماشا ہے کہ ایک طرف تو حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ خلافت کے اس درجہ متمنی ہیں کہ حضرت عثمانؓ جیسے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

محاصرہ کے دوران میں ہی حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو امیرالحج بنا کر بھیجا۔ اس کے بعد ان کو ایک خط ارسال کیا اور کہلا بھیجا کہ اس خط کو حج اکبر کے دن حاجیوں کے مجمع میں پڑھ کر سنا دیں۔ اس خط میں آپ نے اس سخت محاصرہ کا ذکر کیا اور بتلایا کہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں اور آپ کی جان لیے بغیر ٹلنے والے نہیں۔ اس کے بعد لوگوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ان کی مدد کے لیے مدینہ پہنچیں۔

آپ کا یہ دل دہلا دینے والا پیغام حجاج کے عظیم الشان مجمع میں سنا دیا گیا جس سے لوگوں میں زبردست جوش پھیل گیا اور تمام حاجی حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ پہنچنے کے لیے تیار ہونے لگے۔

محاصرہ کی اس شدت کے دوران میں دارِ آلِ حزم سے تھوڑا بہت پانی لوگوں کی آنکھ بچا کر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا دیا جایا کرتا تھا جب باغیوں کو اس کا پتا چلا تو وہ آل حزم کے گھروں کی بھی کڑی نگرانی کرنے لگے۔

جب بہت ہی سختی ہونے لگی تو آپ چھت پر چڑھے اور باغیوں سے فرمایا :

" میں تمہیں اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے " بئر رومہ " اپنے مال سے نہیں خریدا تھا اور کیا میرا اس میں اتنا بھی حصہ نہیں ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا ؟"

انہوں نے جواب دیا : " بے شک ! "

آپ نے فرمایا :

" تو پھر مجھے اس سے پانی کیوں نہیں لینے دیا جاتا ؟ "

اس کے بعد آپ نے ان سے پوچھا :

" میں تمہیں اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے یہ زمین اپنے پاس سے خرید کر مسجد نبویؐ کی توسیع نہیں کی تھی ؟ "

انہوں نے کہا : " یقیناً ! "

آپ نے فرمایا :

" کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ کبھی میری طرف سے اس میں کسی کو نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہو ؟ "

اس کے بعد آپ نے اسی قسم کے کچھ اور امور کا ذکر کیا لیکن ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

محاصرہ شدت پکڑتا گیا۔ جب باغیوں کو معلوم ہوا کہ حج ختم ہو چکا ہے اور حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے مکہ سے فوجیں چل پڑی ہیں تو ان میں سخت گھبراہٹ پھیل گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ اگر جلدی نہ کی گئی تو ان کی خیر نہیں۔ اس پر انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جلیل القدر صحابیؓ کی دشمنی تک انہوں نے اپنے دل میں پال رکھی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے گھروں میں صرف اس لیے بیٹھ جاتے ہیں، حضرت عثمانؓ کو محض اس لیے پانی نہیں پہنچا سکتے کہ حضرت علیؓ اور حضرت امّ حبیبہؓ کے ساتھ باغیوں کا ناروا سلوک انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ (مترجم)

ارادہ کر لیا۔ جب وہ اس مقصد کے لیے آپ کے گھر میں داخل ہونے لگے تو حضرت حسنؓ بن علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ، حضرت طلحہؓ کے دونوں لڑکوں اور کئی اور صحابہؓ نے جو حضرت عثمانؓ کے گھر میں موجود تھے، ان کا سخت مقابلہ کیا لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کو لڑنے سے روک دیا اور ان کو ان کے گھروں پر بھیج دیا۔

یہ ایک اور مضبوط دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت عثمانؓ نے ہرگز وہ خط نہیں بھیجا تھا جو مصریوں کے ہاتھ لگا تھا۔ اگر خلیفۂ ثالث ان لوگوں میں سے ہوتے جو فتنہ کے سرغنوں کا سر کچلنا چاہتے تھے تو کبھی آپ اپنے اعوان و انصار کو مدافعت کرنے سے نہ روکتے اور ان کو ان کے گھر واپس نہ بھیجتے۔ حضرت عثمانؓ نے جو کچھ کیا وہ اس وجہ سے کیا کہ کہیں فتنہ نہ پھوٹ پڑے۔ اس فتنہ کا آپ کو اپنے تمام ایامِ خلافت میں بڑا خوف تھا۔ آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ یہ فتنہ آپ کے زمانہ میں، آپ کے ہاتھوں اور آپ کے حکم سے پھوٹے۔

(۲۴)

مدینہ ایامِ محاصرہ میں

ہم نے فتنہ کے اسباب، اس کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے متعلق کافی وضاحت سے بحث کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے معاملہ کے ہر پہلو کا جائزہ لے کر ایک بہت بڑے فرض کو انجام دیا ہے۔ مورخین نے فتنہ کے اسباب کے بیان میں بحث کو طول نہیں دیا اور وضاحت سے اس معاملہ پر روشنی نہیں ڈالی۔ ہم نے تاریخ کے جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر تمام جماعتوں اور گروہوں کے خیالات و افکار اور رائے عامہ کے عواطف و جذبات پر بحث کی ہے۔ کیونکہ ہم اس کتاب کو محض حضرت عثمانؓ کی سوانح حیات بنا دینا نہیں، بلکہ ملتِ مسلمہ کی تاریخ اور اس کی پراگندہ حالی کی نفسیاتی تصویر کا درجہ بھی دینا چاہتے تھے۔

اہلِ مدینہ نے اس بغاوت کے وقت عجیب و غریب روش اختیار کر لی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ متحد ہو کر اس فتنہ کا مقابلہ کرتے اور اس بغاوت کا سر کچلتے، انہوں نے اپنی اس عجیب و غریب روش کی بنا پر مفسدین اور باغیوں کے ہاتھ مضبوط کر دئے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ مدینہ بھی حضرت عثمانؓ کے محاصرہ اور قتل میں بالواسطہ شریک تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو بالکل چھوڑ دیا اور محاصرہ کی تمام مدت میں بالکل خاموش رہے۔ انہوں نے اس فتنہ کے فرو کرنے میں کوئی مدد نہیں کی اور ان شورہ پشت لوگوں کے کچلنے میں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔[1]

مستشرقین کہتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ ایک لمبے عرصہ تک مخفی رہنے کے بعد جاہلی عصبیت کا دوبارہ پیدا ہو جانا اور حضرت عثمانؓ کی کمزوری اور لوگوں کا علی الاعلان آپ کے خلاف متحدہ محاذ بنا لینا ہے۔ اگر یہ رائے سچ ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب نے کس حد تک اسلام کا اثر قبول کیا۔ عربوں کے ایک نئے دین میں داخل ہو جانے سے جاہلیت کے تمام جھگڑے ختم ہو گئے تھے۔

---

[1] اس الزام کا جواب ہم پیش لفظ میں دے چکے ہیں۔ (مترجم)

یہ بات یقینی ہے کہ قدیم وجدید، موروثی مذہب اور نئے دین (اسلام) کا باہمی نزاع اگرچہ کافی دیر تک چلا لیکن پھر بھی عربوں کے اسلام میں داخل ہونے کے باوجود جاہلیت کی باتوں کو پوری طرح کچلا نہ جا سکا۔ جاہلی جھگڑے وقتاً فوقتاً ہوتے رہے اور یہ دشمنی ایک لمبے عرصے تک جاری رہی۔

اسلام قبائلی اور جنسی تعصب کو مٹانے آیا تھا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں۔ وہ بلند آواز سے یہ اعلان کرتا تھا:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان واضح طور پر کھلے الفاظ میں بیان کر دیا تھا:

انما المؤمنون اخوۃ۔

(تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں)

مسلم میں ایک روایت آتی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص عصبیت کو اُبھارتا، عصبیت کی طرف بلاتا یا عصبیت کو اُبھارنے میں مدد کرتا ہے اور اسی مقصد کے لیے لڑتا اور مارا جاتا ہے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔"

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کرا دی تھی حالانکہ قریشیوں اور اہلِ مدینہ میں دیرینہ دشمنی اور قدیم عداوت چلی آتی تھی۔ لیکن پھر بھی جاہلی عصبیت کلی طور پر مٹ نہ سکی اور اگر کسی نے اس کو بھڑکانا چاہا تو اس نے پھوٹ پڑنے کے لیے زور لگایا۔ لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اس کو بالکل مٹا دیا اور اُس کے اُبھرنے کی کوئی راہ نہ چھوڑی۔ یہی کام حضرت صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے کیا۔ لیکن جب خلافت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی تو چونکہ حضرت عثمانؓ کمزور اور ضعیف تھے اس لیے عصبیت اپنے پورے زور سے ظاہر ہوئی۔ بنو امیہ اسلام میں بھی اسی طرح اپنا تسلّط قایم کرنے کے ارادے کرنے لگے جیسا کہ جاہلیت کے زمانہ میں ان کا دستور تھا۔ قبائل نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اپنی پرانی سرشت اختیار کر لی اور پُرانے جھگڑے قصّے پھر اُبھرنے لگے۔

اس منحوس عصبیت نے سب سے پہلے عراق میں اپنا رنگ جمایا۔ عرب، عراق میں قبائلی عصبیت کو ساتھ لے کر داخل ہوئے اور اس کا پہلا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ بصرہ اور کوفہ مختلف قبائل میں بٹ گئے، کوفہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا، ایک شرقی اور ایک غربی۔ شرقی حصّہ میں یمنی تھے اور غربی میں نزاری۔ ہر فریق نے قبائل کے لحاظ سے زمین کی تقسیم کر لی۔ شعبی کہتا ہے کہ کوفہ میں یمنی نزاریوں سے زیادہ تھے۔ یمنی بارہ ہزار تھے اور نزاری آٹھ ہزار۔ اس عصبیت نے شدید نزاع کی صورت اختیار کر لی۔ کوفہ اور بصرہ کے عربوں میں جب لڑائی ٹھنی تب بھی یہ تفریق قائم رہی۔ ہر شہر کے ہر قبیلہ نے دوسرے شہر کے اسی قبیلہ کے ساتھ لڑائی کی جو اس کا مدِمقابل تھا۔ کوفہ کے یمنی بصرہ کے یمنیوں سے لڑتے تھے، کوفہ کے ربیعہ بصرہ کے ربیعہ سے جنگ کرتے تھے اور کوفہ کے نضر بصرہ کے نضر سے برسرِپیکار ہوتے تھے۔

عصبیت کو بھڑکانے والی ایک چیز اور بھی تھی اور وہ یہ کہ عراق کے اکثر باشندے فارس سے آئے ہوئے تھے۔ عرب

بہت کم تھے۔ موالی جن پر جزیہ واجب ہوتا تھا، پانچ لاکھ سے بھی زیادہ تھے۔ یہ ان لوگوں کے علاوہ تھے جو ایرانیوں میں سے اسلام لائے تھے یہ موالی عربوں کے حلیف تھے اور ان کی ولایت میں ان کی حمایت کی وجہ سے داخل ہوئے تھے وہ عربوں کو اپنا سردار تصور کرتے تھے۔ ان موالیین میں سے ہر قوم اسی قبیلہ کی حمایت کرتی تھی جس کے وہ موالی اور حلیف تھے۔ اسی وجہ سے عراق مختلف گروہوں اور قبائل میں بٹ گیا تھا۔ ہر گروہ اپنی اپنی ذاتی اغراض اور اپنے اپنے مخصوص مصالح کے مطابق عمل کرتا تھا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس وقت مدینہ کی حالت بھی بالکل وہی تھی جو عراق اور شام کی تھی۔ مدینہ کے باشندوں میں سے بنو ہاشم حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور بنو امیہ حضرت عثمانؓ کے۔ ان کے درمیان انصار نے عجیب و غریب رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ عموماً ان کا موقف یہ تھا کہ مہاجرین نے ان کا حق غصب کر لیا ہے اور تمام سلطنت پر خود ہی قابض ہو گئے ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ مدینہ میں بنو ہاشم و بنو امیہ، اور مہاجرین و انصار کے درمیان اختلاف جو جاہلی عصبیت کی ایک نشانی تھا، وہی سب سے بڑا سبب اس بات کا تھا کہ مدینہ کے باشندے حضرت عثمانؓ کے محاصرہ کے ایام میں بالکل الگ تھلگ رہے انہوں نے خلیفہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا لیکن خاموش بیٹھے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف قوم کو جرأت اسی لیے ہوئی کہ آپ میں حد درجہ نرمی تھی۔ نیز بڑھاپے کی کمزوری اور بعض ایسی باتوں نے جن کو آپ سے پہلے خلفاء نہیں کیا کرتے تھے، جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مہاجرین اور انصار میں اس امر کی طاقت نہ تھی کہ اگر وہ سب معاملات پر سنجیدگی سے غور کرتے، آپ کی سیاست پر راضی رہتے، جاہلی عصبیت ان کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرتی اور مصریوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تو مصری جن کی تعداد ایک ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں تھی، ہرگز اہل مدینہ اور ان کے ساتھ مہاجرین و انصار پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

اہل مدینہ اکثر شکایات کرنے والوں کی شکایتوں پر بہت کان دھرا کرتے تھے اور جو کچھ وہ لوگ حضرت عثمانؓ سے شکایتیں کرتے تھے اہل مدینہ ان کی ہمدردی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ اکثر اوقات وہ حضرت عثمانؓ اور بنی امیہ پر اس سلسلہ میں اعتراضات بھی کیا کرتے تھے اور انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرایا کرتے تھے۔ اس طرح وہ خلافت کے نام کی بے عزتی کرتے تھے جس کا احترام کرنا ہر مسلم کا فرض تھا۔[1]

مختلف شہروں کے مفسدین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ حضرت عثمانؓ پر بعض اعتراضات کیا کرتے تھے جن میں سے کچھ ہم گزشتہ فصلوں میں بتا آئے ہیں وہ تمام اعتراضات ہم یک جائی طور پر نیچے حاشیہ میں درج کرتے ہیں[2]۔ یہ وہ امور تھے

---

[1] صحابہؓ پر ان الزامات کے متعلق پیش لفظ میں بحث ہو چکی ہے۔ (مترجم)

[2] حضرت عثمانؓ پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱ منیٰ اور عرفہ میں پوری نماز پڑھنا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشین وہاں نماز قصر پڑھا کرتے تھے۔

۲۔ جمعہ کے دن زوراء کے مقام پر تیسری اذان کی زیادتی کرنا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

جن کے بارہ میں مہاجرین، انصار اور اہلِ مدینہ بھی حضرت عثمانؓ کو قصوروار ٹھہراتے تھے اور فتنہ کے سرغنوں کے ہاتھوں میں تو یہ اعتراضات ایک زبردست حربہ تھے ہی جس سے کام لے کر وہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے ۔ یہی امور اہلِ مدینہ کے حضرت عثمانؓ کو چھوڑ دینے کا باعث بنے۔

حضرت عثمانؓ نے بھی ایامِ محاصرہ میں اہلِ مدینہ کے سکوت اور ان کی دست کشی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہی باتیں فتنہ انگیز گروہ کو جرأت دلا رہی ہیں کہ وہ جتنی سختی آپ پر کر سکیں کریں اور آپ کے خلاف گندگی پھیلانے اور آپ پر اعتراضات کرنے میں جس قدر بڑھنا چاہیں بڑھ جائیں۔ اگر اہلِ مدینہ کے دل آپ کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے نہ ہوتے تو ضرور تھا کہ وہ آپ کی مدد کے لیے آتے اور امیر المومنین اور خلافت کے دفاع میں تلوار اٹھاتے۔

آپ کی امامت اور سیاست پر بے شمار اعتراضات کیے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہؓ نے ایک خط کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۳۔ حضرت ابوذرؓ کو شام سے نکال کر مدینہ اور مدینہ سے نکال کر ربذہ بھیج دینا۔

۴۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کا ان کے ہاتھ سے نکل کر اریس نامی کنویں میں گر پڑنا۔

۵۔ اپنے اہل و عیال اور اپنے چچا زاد بھائیوں میں ولایات تقسیم کر دینا اور ولید بن عقبہ کو شراب پینے کی سزا دینے میں تاخیر کرنا۔

۶۔ اپنے اہل و عیال اور چچیرے بھائیوں میں جائدادیں تقسیم کر دینا اور ان کو لوگوں کے سروں پر مسلط کر دینا۔

۷۔ صرف اپنے رشتہ داروں کی رائے اور مشورہ پر چلنا اور مہاجرین و انصار کو مشورہ اور امورِ سلطنت میں شریک نہ کرنا۔

۸۔ مروان کو افریقہ کے غزوہ کا خمس (پانچواں حصہ جو خلیفہ کے لیے مخصوص ہوتا ہے) دے دینا۔

۹۔ عبد اللہ بن خالد بن اسید کو چار لاکھ درہم دے دینا۔

۱۰۔ حارث بن الحکم کو مدینہ میں ایک جگہ دے دینا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عطا فرما دی تھی۔

۱۱۔ حارث بن الحکم سے اپنی بیٹی عائشہ کا نکاح کر دینا اور اپنے داماد کو ایک ہزار درہم بیت المال میں سے دے دینا۔

۱۲۔ ابوسفیان بن حرب کو دو ہزار درہم دے دینا۔

۱۳۔ مدینہ کے اردگرد سرکاری چراگاہ بنا دینا لیکن بنی امیہ کو اس میں داخل نہ ہونے سے مستثنیٰ کرنا۔

۱۴۔ حکم بن ابی العاص کو جسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکال دیا تھا مدینہ واپس بلا لینا اور اس کو ایک ہزار درہم دے دینا۔

۱۵۔ خیزران کو کوڑے مارنا۔

۱۶۔ اونچی اونچی عمارتیں بنانا آپ نے مدینہ میں سات گھر بنائے، اپنی بیوی نائلہ کو ایک گھر اور اپنی بیٹی عائشہ کو ایک گھر دیا۔ اور ان کے علاوہ اپنے اہل و عیال اور ہر بیٹی کو ایک ایک گھر دیا۔

۱۷۔ عبد اللہ بن مسعود کو اتنا پیٹا کہ ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ (مؤلف)

مسودہ تیار کیا، جس میں آپ کے خلاف مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے:

حضرت عثمانؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف کام کیے ہیں۔ اونچی اونچی عمارتیں بنوائی ہیں۔ ولایات اور حکومت کا سارا کام اپنے اہل وعیال اور چچیرے بھائیوں میں تقسیم کر دیا ہے جو ابھی ناتجربہ کار اور بچے ہیں جن کو نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل رہی ہے اور نہ امورِ سلطنت کا کوئی تجربہ ہے۔ حد یہ ہے کہ ولید بن عقبہ امیر کوفہ صبح کی نماز نشہ کی حالت میں پڑھاتا ہے اور بجائے دو کے چار رکعتیں پڑھا دیتا ہے اور نماز پڑھا کر مقتدیوں سے کہتا ہے کہ اگر تم ایک رکعت اور زیادہ پڑھنا چاہو تو میں وہ بھی پڑھا دوں۔ لیکن آپ نے اس پر حد جاری نہیں کی اور فرمایا کہ اس پر حد اس وقت لگائی جائے گی جب یہ شہادت دی جائے کہ یہ شخص شراب پیتا ہے اور بار بار پیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مہاجرین اور انصار کو بالکل عضوِ معطل کی طرح چھوڑ رکھا ہے۔ کوئی کام بھی ان کے سپرد نہیں کیا جاتا۔ ان سے کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا اور اپنی رائے کو ان کی رائے پر مقدم کیا جاتا ہے۔ مدینہ کے ارد گرد چراگاہ بنائی ہوئی ہے اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ جاگیریں، وظیفے، عطیے ان لوگوں کو دیے جاتے ہیں جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحبت نہیں رہی اور وہ لڑائیوں اور مہموں میں بھی کوئی حصہ نہیں لیتے۔ خیزران کو بے تحاشا کوڑے مارے اور آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے برسائے (ان امور کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں) اس خط کا مسودہ تیار ہونے پر یہ طے کیا گیا کہ یہ خط حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں پہنچا دیا جائے۔

جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے یہ خط تیار کیا تھا وہ عمار بن یاسر اور مقداد بن الاسود سمیت دس صحابہ تھے۔ جب یہ لوگ خط لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس چلے تو خط تو عمار کے ہاتھ میں دے دیا اور خود آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف عمار باقی رہ گئے۔

انہوں نے پروا نہ کی اور خط لیے حضرت عثمانؓ کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کے پاس مروان بن الحکم اور آپ کے اہل وعیال موجود تھے۔ حضرت عمار نے یہ خط حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے پڑھا اور کہنے لگے:

"تم نے یہ خط لکھا ہے!"

انہوں نے جواب دیا: "ہاں!"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"تمہارے ساتھ اور کون شریک تھا!"

انہوں نے جواب دیا:

"میرے ساتھ چند لوگ تھے جو آپ کے ڈر کی وجہ سے آپ کے پاس نہ آ سکے"

حضرت عثمانؓ نے کہا: "وہ تھے کون؟"

انہوں نے جواب دیا: "یہ تو میں نہیں بتا سکتا"

حضرت عثمانؓ نے کہا: "پھر تم نے یہ جرأت کیوں کی!"

مروان کہنے لگا،

"امیر المومنین! یہ سیاہ غلام (عمار) لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اگر آپ اس کو قتل کر دیں تو دوسرے اس کا حشر دیکھ کر عبرت پکڑیں گے۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا: "اس کو مارو۔"

دوسرے لوگوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ نے بھی ان کو مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ عمار کا پیٹ پھٹ گیا اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔

اس کے بعد لوگوں نے انہیں گھسیٹ کر گھر کے دروازہ پر ڈال دیا۔ بنو مغیرہ جو عمار کے حلیف تھے یہ دیکھ کر طیش میں آ گئے۔

عمارؓ بڑے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشورہ کی مجلس میں آپ کو شریک کرتے تھے۔ آپ کی کئی فضیلتیں مروی ہیں۔ آپ کا مرتبہ مسلمانوں میں بے حد بلند تھا۔

حضرت عمارؓ کے ساتھ اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے میں پیش پیش تھے انہوں نے حضرت علیؓ کی بے انتہا خدمت کی اور صفین میں شہید ہوئے۔[1]

خلاصہ یہ کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف کئی عوامل کام کر رہے تھے۔ ایک تو باغی، کہ جو کچھ ان کے سر میں سما جاتا تھا اس کے کرنے پر تل جاتے تھے اس لیے کہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو ان کے لیے سخت خطرہ تھا۔ دوسرے اہلِ مدینہ جو حضرت عثمانؓ کو چھوڑ بیٹھے تھے اور اس معاملہ میں بالکل خاموش تھے۔ ان میں سے بعض خاموشی کی حد سے گزر کر حضرت عثمانؓ کے خلاف آمادۂ پیکار بھی تھے۔ تیسرے بنو امیہ جو چاہتے تھے کہ معاملہ کو یہاں تک ڈھیل دی جائے کہ فوجیں مدینہ پہنچ جائیں۔ اگر حضرت عثمانؓ کوئی وعدہ کرتے تو وہ اسے تڑوا دیتے۔[2] اگر آپ لوگوں کے مطالبات کو ماننے کا ارادہ کرتے بھی تو وہ آپ کو اس ارادہ سے پھیر دیتے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ انہی کے کہنے پر چلیں اور خلافت سے معزول ہونے سے بالکل انکار کر دیں۔[3]

---

[1] تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے شدید ترین دشمنوں سے بھی عفو اور درگزر کا سلوک کیا اور باوجود عمال کے بار بار اصرار کرنے کے آپ نے ان کو کوئی سزا نہیں دی حالانکہ آپ بڑی آسانی سے ان کو عبرت ناک سزائیں دے سکتے تھے اور کوئی شخص بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ ایک معمولی سی بات پر حضرت عمارؓ کے ساتھ یہ سلوک کرتے؟ اس واقعہ پر غور کرنے کے ساتھ خط کی اصلیت بھی سمجھ میں آجاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ محض ایک من گھڑت واقعہ ہے اور اصلیت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

[2] حضرت عثمانؓ جیسے مقدس اور پاکباز انسان پر یہ الزام لگانا خود الزام لگانے والوں کے خبثِ باطنی کی دلیل ہے۔ حضرت عثمانؓ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

[3] جس صورت میں کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو خلعتِ خلافت اتارنے سے منع فرمایا تھا تو بنی امیہ کے کہنے سے معزول ہو جانے یا معزول ہونے سے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مترجم)

جو عوامل حضرت عثمانؓ کی شہادت کا باعث ہوئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ دوسروں کی رائے پر نہ چلتے تھے۔ اگر آپ دوسروں کے مشوروں پر چلتے تو آپ کی زندگی بچ جاتی۔ مغیرہ بن شعبہ نے آپ کے بچانے کی ایک تدبیر سوچی۔ وہ حالت محاصرہ میں آپ سے ملے اور کہنے لگے،

"امیر المومنین! آپ لوگوں کے امام ہیں، آپ پر جو مصیبت پڑی ہوئی ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ میں آپ کے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہوں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں،

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نکل کر ان کا مقابلہ کریں۔ آپ کے پاس فوج اور قوت کافی ہے۔ آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر، اس لیے فتح آپ ہی کی ہوگی۔

۲۔ دوسری یہ کہ ہم آپ کے لیے ایک چور دروازہ گھر کے دروازہ کے علاوہ بنا دیتے ہیں آپ اس دروازہ سے نکل جائیے اور سواری پر بیٹھ کر مکہ چلے جائیے وہاں آپ ان کے ہاتھوں سے بالکل محفوظ ہوں گے اور وہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔

۳۔ اگر یہ دونوں باتیں آپ کو منظور نہ ہوں تو پھر آپ شام چلے جائیے وہاں معاویہ جیسا زبردست شخص موجود ہے اور یہ لوگ وہاں آپ کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔"

لیکن حضرت عثمانؓ نے مغیرہ کے مشورہ کو نہ مانا۔ واقعہ یہ ہے کہ مغیرہ کی تدبیریں دور اندیشی اور معقولیت کے لحاظ سے بہت بڑا مرتبہ رکھتی تھیں۔ اگر حضرت عثمانؓ ان پر عمل کرتے تو کبھی وہ نہ ہوتا جو ہوا۔[1]

(۲۴)

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ

ابو جعفر بن مکی الحاجب کہتے ہیں،

"میں نے محمد بن سلیمان سے جو ایک ظریف الطبع ادیب اور نہایت عقلمند شخص تھا اور ریاضیات اور فلسفہ کا ماہر تھا حضرت علیؓ

---

[1] پہلی بات تو حضرت عثمانؓ نے اس لیے نہیں مانی کہ وہ اپنی ذات کے لیے مسلمانوں کو آپس میں لڑانا اور ان کا کشت و خون کرانا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ بعد کے لوگوں نے کیا اور نتیجہ سوائے بربادی اور تباہی کے کچھ نہ نکلا۔

دوسری ترکیب انتہائی بزدلی پر دلالت کرتی تھی اس لیے رسول اللہ کا جانشین اسے کس طرح منظور کر سکتا تھا۔

تیسری تجویز کو آپ نے اس لیے قبول نہ کیا کہ حضرت امیر المومنین عثمانؓ بن عفان کسی صورت اور کسی حالت میں بھی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کو چھوڑ کر کہیں باہر جانا پسند نہیں فرماتے تھے خواہ اس میں ان کی جان ہی چلی جائے۔

اس سے پہلے حضرت معاویہؓ نے بھی حضرت امیر المومنین کے سامنے تقریباً یہی تجاویز پیش کی تھیں مگر آپ نے بڑی سختی کے ساتھ ان کو مسترد کر دیا تھا۔
(مترجم)

حضرت عثمانؓ کے باہمی تعلقات کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا:

یہ ایک بہت پرانی عداوت تھی جو عبد الشمس اور بنی ہاشم میں چلی آ رہی تھی۔ حرب جو بنی امیہ کا ایک ممتاز فرد تھا عبد المطلب بن ہاشم سے نفرت رکھتا تھا۔ ابو سفیان، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا اور کئی بار آپ سے جنگ و جدال بھی کر چکا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح حضرت علیؓ سے کر دیا اور دوسری بیٹی کا حضرت عثمانؓ سے۔ لیکن جو تعلق حضور علیہ السلام کو حضرت علیؓ سے بیاہی ہوئی بیٹی فاطمہؓ سے تھا وہ حضرت عثمانؓ سے بیاہی ہوئی اپنی دونوں بیٹیوں سے نہیں تھا۔ حضرت فاطمہؓ سے زیادہ تعلق کی ایک وجہ حضرت علیؓ بھی تھے کیونکہ حضرت علیؓ آپ کے قریبی رشتہ دار تھے اور اخلاص میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ سے ایسا کوئی تعلق نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کو یہ بات بہت محسوس ہوئی اور دونوں بہنوں میں بھی کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ پھر یہ بھی اتفاق ہوا کہ حضرت علیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کئی جنگوں میں بنی عبد الشمس کے بے شمار لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ اس لیے دشمنی اور بھی بڑھ گئی۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چند نفوس پر مشتمل ایک جماعت حضرت علیؓ کے پاس آئی جن میں حضرت عثمانؓ نہ تھے۔ آپ فاطمہؓ کے گھر ان لوگوں کے ساتھ بھی نہ آئے جنہوں نے خلافت کی بیعت نہ کی تھی۔ حضرت علیؓ کو خلافت کی خواہش تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں اس کا اظہار آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب چھ آدمیوں پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا تو اس وقت حضرت علیؓ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور جو کچھ آپ کے دل میں پوشیدہ تھا وہ ظاہر کر دیا۔

ان دونوں کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ حضرت علیؓ نے جب بھی آپ کو ٹوکا بجا طور پر ٹوکا اور کسی کام سے آپ کو منع نہیں کیا جب تک وہ کام شریعت کی رُو سے منع کیے جانے کے قابل نہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ اپنی ذات سے بہت کمزور اور ضعیف تھے، آپ نے تمام کاروبارِ سلطنت مروان کے سپرد کر دیا، وہ آپ کو جس طرف چاہتا پھیر دیتا۔ دراصل خلافت پر قابض وہی تھا صرف نام حضرت عثمانؓ کا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے کیے ہوئے وعدہ کو پسِ پشت ڈال دیا تو حضرت علیؓ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے حضرت عثمانؓ سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ حضرت عثمانؓ نے ان سے بعد میں معذرت چاہی بھی لیکن اس وقت اس کا کوئی فائدہ نہ تھا اور معاملہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ پھر کسی کے بنائے نہ بن سکا۔[1]"

جعفر کہتے ہیں میں نے محمد بن سلیمان سے کہا: "کیا آپ کا خیال ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کی نسبت زیادہ تکلیفیں اٹھائیں؟"

---

[1] یہ محض ایک شخص کی ذاتی رائے ہے اور انہی واہی تباہی خیالات کا عکس جو عوام کالانعام کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور حضرت عثمانؓ کے بدترین مخالفوں اور مفسدینِ امت کے پھیلائے ہوئے تھے۔ نہ ان میں سے کوئی بات سچ ہے نہ الزامات کا کوئی سر پیر ہے۔ بازار میں بیٹھ کر جو باتیں محمد بن سلیمان نے سنیں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر انہی کو جعفر سے روایت کر دیا۔ ایسی حالت میں اس کے بیان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو مذکورہ بیان سے صاف ہو رہا ہے کہ یہ نظریات کافی حد تک ایک منافق کے نظریات سے مشابہ ہیں۔ کیونکہ اس شخص نے در پردہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی ہے (العیاذ باللہ) (ہاشمی)

محمد بن سلیمان نے کہا :

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے حضرت عثمانؓ تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مقابلے میں کوئی چیز ہی نہیں تھے۔ اگر وہ دونوں نہ ہو چکے ہوتے تو حضرت عثمانؓ کو خلافت کسی صورت میں بھی نہ مل سکتی۔ حضرت عثمانؓ کو بھی پہلے خلافت کی خواہش نہ تھی، نہ ان کے ذہن میں پہلے کبھی یہ بات آئی تھی لیکن ایک امر کی وجہ سے حضرت عثمانؓ ان کے مقابلے میں اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند تھے وہ یہ کہ دونوں بنی عبد مناف سے تھے اور یہ فطری بات ہے کہ انسان اپنے دور کے رشتہ دار کے مقابلہ میں اپنے قریبی رشتہ دار سے اقتدار حاصل کرنے میں زیادہ مقابلہ کرتا ہے۔"

جعفر کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن سلیمان سے پوچھا :

"اس بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ خلافت چھوڑ دیتے اور قتل نہ کیے جاتے تو حضرت علیؓ آسانی کے ساتھ خلافت کا کام سرانجام دے سکتے تھے، اگر حضرت عثمانؓ کے معزول ہونے کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت کی جاتی؟"

انہوں نے کہا :

"نہیں! یہ کس طرح ہو سکتا تھا بلکہ حضرت عثمانؓ کے زندہ ہونے کی صورت میں معاملات اور بھی زیادہ بگڑ جاتے کیونکہ حضرت عثمانؓ کو ہر دم اس بات کی اُمید ہوتی کہ کبھی نہ کبھی خلافت پھر ان کے پاس آ جائے گی اور وہ ہمہ وقت اس امر کے لیے کوشاں رہتے۔ اگر وہ قید میں ہوتے تو معاملات انتہائی نازک صورت اختیار کر لیتے کیونکہ آپ کے حامی برابر آپ کا نام لے کر لوگوں کو بھڑکاتے رہتے اگر قید میں نہ ہوتے، آزاد رہتے تو وہ اس بات کا خوب پروپیگنڈا کرتے کہ میں مظلوم ہوں اور مجھ سے بالجبر خلافت چھین لی گئی ہے۔ اس طرح لوگ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حضرت علیؓ کے خلاف مجتمع ہو جاتے اور فتنہ شدت اختیار کر لیتا۔"

جعفر نے ان سے پھر پوچھا :

"آپ کا امامت کے بارہ میں کیا خیال ہے اور اس کے اصل اور منبع کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟"

وہ کہنے لگے :

"میں اس کی اصل کے متعلق صرف دو باتیں جانتا ہوں۔ ایک یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کے سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی اور نہ کسی شخص کا اس معاملہ میں نام ہی لیا بلکہ اس کو مبہم رکھا اور رمز و کنایہ میں ایسی باتیں کہیں جن سے کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہوتی تھی اور حضرت علیؓ ان کو پیش کر کے اپنا حق کسی طرح بھی نہیں منوا سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے سقیفہ والے دن اپنے لیے کوئی نصِ صریح موجود نہ ہونے کی بنا پر کسی قسم کا جھگڑا نہ کیا بلکہ خاموش ہو رہے۔ بادشاہ جب اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا جانشین بناتے ہیں تو فرمان جاری کر کے اور منبروں پر خطبے پڑھ کر اس امر کا بڑے واضح الفاظ میں اعلان کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے اس ارادہ سے مملکت کا بچہ بچہ واقف ہو جائے، تاکہ بعد میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے اور کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو سکے۔ خلافت کا معاملہ ایسا آسان اور چھوٹا سا معاملہ نہیں تھا جو اس طرح اشتباہ میں رہتا۔ شاید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس معاملہ کو اس طرح مبہم رکھنے میں یہ مصلحت ہو کہ کہیں منافقین کی طرف سے شور و غوغا اور فساد برپا نہ ہو کہ یہ نبوت کا ہے کو ہوئی بادشاہت ہو گئی

---

[1] جو بدبخت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ناپاک الزام لگائے کہ معاذاللہ حضورؐ نے منافقین کے ڈر سے امرِ خلافت کو (باقی صفحہ آیندہ پر)

جسے نبی نے اپنے بعد اپنی اولاد اور خاندان کو سونپ دیا ہے۔ چونکہ آپ کی اولاد میں سے بوجہ صغرسنی کے کوئی حکومت سنبھالنے کا اہل نہیں اس لیے حکومت کی ذمہ داری حضرت علیؓ کے سر ڈال دی ہے لیکن درحقیقت یہ حضرت فاطمہؓ کے لیے جو آپ کی بیٹی ہیں اور ان کی اولاد کے لیے ہے۔ پس حقیقۃً بات یہ ہے کہ آپ نے محض اشاروں اور کنایوں میں اپنے بعد اپنے جانشین کا ذکر کیا مثلاً حضرت علیؓ کو کہا:

انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی۔

(تو مجھ سے وہی درجہ رکھتا ہے جو موسٰی کے بعد ہارون کا تھا)

من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ۔

(جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کا دوست ہے)

لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔

(حضرت علیؓ کے مانند کوئی نوجوان نہیں اور ذوالفقار سے بہتر کوئی تلوار نہیں)

لیکن ان اشاروں کنایوں سے کوئی واضح بات معلوم نہیں ہوتی جس کی بنا پر حضرت علیؓ اپنا حق خلافت پر قایم کر سکتے اور اپنے مدِمقابل کو خاموش کر سکتے۔

دُوسرا امر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ کے لیے کچھ آدمیوں کی ایک کمیٹی قایم کی لیکن خلافت کے لیے کسی ایک آدمی کی تخصیص نہیں کی۔ اس لیے اس کمیٹی کا ہر ممبر یہی خیال کرنے لگا کہ وہی خلافت کے لیے موزوں ہے اور ملک و سلطنت کا انتظام کرنے کا وہی حقدار ہے۔ یہی خیالات ان کے دل و دماغ میں چکر لگانے لگے اور اسی وجہ سے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے درمیان مخالفت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مبہم رکھا، کیا وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کی رائے کی کوئی قدر کی جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتا ہے:

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ (مائدہ ع ۱۰)

(یعنی اے رسول! جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر اتارا ہے وہ تو لوگوں تک پہنچا دے، اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو تُو نے پیغام رسالت پہنچانے کا فرض ادا نہ کیا)

لیکن اس آیت کی موجودگی میں یہ شخص نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت علیؓ کو منافقوں کے ڈر سے مبہم رکھا انا للہ وانا الیہ راجعون محمد بن سلیمان کی یہ رائے نہ صرف اس کے کی بدظنی پر دلالت کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے باہمی تعلقات کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا ہے کہ اس قابل بھی نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔

(مترجم)

پیدا ہو گئی جو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر منتج ہوئی ہے

آپ کی شہادت کا بڑا سبب حضرت طلحہ کی مخالفت تھی ان کو یہی خیال تھا کہ حضرت عمرؓ کے بعد کئی وجوہات کی بنا پر خلافت انہی کا حق ہے۔ ایک یہ کہ وہ سابقون الاولون میں سے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے چچازاد بھائی تھے اور حضرت ابوبکرؓ کی اس زمانہ کے لوگوں میں بہت بڑی عزت اور قدر و منزلت تھی۔ تیسرے یہ کہ وہ بہت سخی تھے وہ خود حضرت عمرؓ سے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جھگڑے تھے اور چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے بعد کاروبارِ خلافت انہی کو تفویض کر دیں۔ جب حضرت عثمانؓ تختِ خلافت پر متمکن ہو گئے تو ان کے دل میں ان کے خلاف کدورت پیدا ہو گئی اور انہوں نے اہلِ مدینہ، بدوؤں اور ان فسادیوں کو آپ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور انھیں شہ دینے لگے۔ اس کام میں حضرت زبیرؓ نے بھی ان کی مدد کی۔ وہ بھی اپنے لیے خلافت چاہتے تھے۔ خلافت حاصل کرنے کا زیادہ موقعہ انہی دونوں کو تھا۔ حضرت علیؓ کو اتنا نہیں تھا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی طاقت کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پاش پاش کر دیا تھا[1] اور لوگ ان کو بالکل بھلا بیٹھے تھے۔ جن لوگوں کو ان کے اصلی جوہر اور خصائص کا پتا تھا وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی وفات پا چکے تھے اور آپ کے بعد حضرت علیؓ کا پالا ایسے لوگوں سے پڑا تھا جن کو آپ کی حقیقی قدر و منزلت کا پتا نہ تھا۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور آپ کے داماد ہیں۔ مزید برآں ان کو قریش کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ قریش کی مخالفت سے سوائے آپ کے اور کسی کو بھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ قریش کو جتنا بغض آپ سے تھا اتنا ہی تعلق حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے تھا۔ یہ دونوں حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ میں قریش سے بہت خلا ملا رکھتے تھے اور انعام و اکرام کے وعدہ سے ان کو پھسلاتے رہتے تھے۔ خود اپنے اور لوگوں کے خیال میں در اصل یہی دونوں خلیفہ تھے اگرچہ ظاہری طور پر ان کو خلافت حاصل نہ تھی۔

جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے تو حضرت طلحہؓ نے خلافت پر قابض ہو جانا چاہا اور اگر اشتر اور اس کے ساتھ یہ مفسدین نہ ہوتے تو حضرت علیؓ خلافت حاصل نہ کر سکتے۔ جب طلحہؓ اور زبیرؓ خلافت پر قابض نہ ہو سکے تو انہوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ مقابلہ کی ٹھانی۔ حضرت عائشہؓ کو اپنے ساتھ ملایا[2] اور عراق کا قصد کیا جہاں ان کے مددگار موجود تھے وہاں انہوں نے فتنہ کو ہوا دی جس کے نتیجہ میں جنگِ جمل اور دوسری لڑائیاں ہوئیں۔

اس اختلاف کے متعلق جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوا اور جو آپ کے بعد اٹھا، یہ ایک بڑے[3] آدمی کی رائے ہے جس کو ہم نے اس لیے بیان کیا ہے کہ ہم قارئین کو تفرقہ اور فتنہ کے کچھ اسباب اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان اختلاف و

---

[1] ہم پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ جلیل المرتبت صحابہ کرامؓ کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ خود خلافت کے خواہشمند تھے اور اپنے آپ کو اس کے لیے موزوں سمجھتے تھے، صرف ایسے ہی شخص کے لیے موزوں ہو سکتا ہے جسے عقل و خرد سے حصہ نہ ملا ہو یا جسے واقعات تاریخی کا صحیح علم نہ ہو اور یا پھر اسے صحابہؓ سے للّٰہی بغض ہو مگر واقعات کی موجودگی میں کوئی صحیح الدماغ انسان ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ [2] یہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی دیانت و امانت اور للّٰہیت پر مصنف کا کھلا حملہ ہے اور وہ بھی بلا دلیل۔ [3] مذکورہ بالا تمام بیانات خالص مفسدانہ نظریات پر مبنی ہیں اور ان میں جتنی باتیں بیان ہوئی ہیں وہ قطعاً غلط اور بے سند و بے اصل ہیں۔ [4] تعجب ہے کہ مصنف محمد بن سلیمان جیسے شخص کو بڑا آدمی سمجھتا ہے جسے نہ مزاجِ نبوت کی شناخت ہے نہ مقامِ صحابہ کی۔ محمد بن سلیمان کے قول کو مستند قول سمجھ کر پیش کرنا تنقیدی نظر کے فقدان پر دلالت کرتا ہے۔ (ہاشمی)

خصومت سے کہ یہ پہلو نمایاں ہے جس نے مسلمانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے افتراق و انشقاق کا بیج بو دیا اور ان کے مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات کی ایک ایسی گہری خلیج حائل ہوگئی جو آج تک نہ پاٹی جاسکی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے خلاف کبھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور نہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ خود حضرت عثمانؓ نے بھی آپ پر اس قسم کا کبھی کوئی الزام نہیں لگایا اور ان باتوں میں سے کبھی کوئی بات آپ کی طرف منسوب نہیں کی۔ حضرت علیؓ کی حضرت عثمانؓ سے ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے سلطنت کا تمام کام بنی امیہ کے سپرد کر دیا تھا اور انہی کو مناصب اور اعلیٰ مراتب سے نوازا تھا۔ ہم پچھلی فصلوں میں ان تمام باتوں کا ذکر کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ کس طرح حضرت عثمانؓ ان لوگوں پر بھروسا اور اعتبار کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ اگر چاہتے تو دوسرے مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ مل سکتے تھے جو بنی امیہ کے لوگوں سے زیادہ ولایات کے حقدار تھے اور عطیات و اموال حاصل کرنے کے بھی۔

جو لوگ کتب سیر و اخبار خصوصاً ابن حدید کی شرح نہج البلاغہ کا مطالعہ کریں ان کو پتا چلے گا کہ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہ اختلاف فتنہ یا بغاوت سے متعلق نہیں تھا اور حضرت علیؓ پر فتنہ پھیلانے اور فسادیوں کی مدد کرنے کا الزام کسی صورت میں عائد نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ نے جو روش اس موقع پر اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ آپ اس معاملہ سے بالکل علٰحدہ اور خانہ نشین ہو گئے تھے اور کسی کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو کئی مفید مشورے دئے ——————— اور باوجود وعدوں کے ان باتوں کی اصلاح نہ کی جن کی اصلاح کرنے کا آپ نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ کے صلاح کار حضرت عثمانؓ کو وہ باتیں قبول کرنے سے روکتے ہیں جو یہ فسادی چاہتے ہیں اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اصلاح حال کی جو ذمہ داریاں حضرت عثمانؓ پر عاید ہوتی تھیں ان کو پورا کرنے میں روک بنتے ہیں تو اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کو آیندہ کوئی مشورہ دینا بالکل چھوڑ دیا۔[1]

جب ہم کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اپنے واسطے خلافت چاہتے تھے اور اس امر میں اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے تو ہمارا مطلب اس سے یہ ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد میں آپ کو خلافت کی خواہش تھی لیکن آپ نے شیخین کے عہد میں جمہور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف کوئی بات نہیں کی اور جو فیصلہ انہوں نے کیا اس کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ اسی طرح انہوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی آپ کے مقابلہ میں اپنے لیے کوئی کوشش نہیں کی اور اس کے لیے آواز نہیں اٹھائی اگرچہ ان کا خیال یہی تھا کہ وہ خلافت کے لیے حضرت عثمانؓ سے زیادہ حقدار ہیں۔ جب حضرت عثمانؓ کے آخر عہد میں فتنہ و فساد اور بغاوت پھوٹی اور جب آپ نے یہ دیکھا کہ بنو امیہ اور خصوصاً مروان ابن الحکم نے حضرت عثمانؓ پر پورا تسلط پا لیا ہے وہ ان کی رائے کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے اور صرف انہی کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں تو دل برداشتہ ہو کر علٰحدگی اختیار کر لی۔ جو لوگ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے اسباب پر بحث کرتے ہیں وہ اس سے انکار نہیں کرتے کہ آپ کی شہادت کا سب سے بڑا سبب آپ کا اپنے ناعاقبت اندیش صلاح کاروں[2]

---

[1] قطعاً بے بنیاد بات ہے۔ [2] ہم اس کا جواب دے چکے ہیں کہ حضرات صحابہؓ اس طرح کی خواہشات اور طلب سے پاک تھے۔ (ہاشمی)

کے مشاوروں پر چلتا اور ان کی باتوں اور مشوروں کو قبول کرتا تھا۔ ان کا مشیر مروان بن الحکم تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی شخص تھا جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو جام شہادت پینا پڑا۔

زبیر بن بکار حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں:

"میں نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں اپنے والد سے کبھی کچھ نہیں سنا۔ نہ وہ آپ پر کوئی تہمت لگاتے تھے نہ آپ پر لگائے ہوئے اعتراضات کا رد کرتے تھے۔ میں نے بھی اس ڈر سے کہ کہیں کوئی ناگوار طبع بات نہ ہو جائے ان سے اس بارہ میں کچھ نہ پوچھا۔

ایک دفعہ ہم رات کو بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کہ حضرت عثمانؓ آگئے اور ہمارے ساتھ کچھ کھانا بھی کھایا۔ کھانے کے بعد انہوں نے میرے والد سے حضرت علیؓ کی شکایت کی کہ انھوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

حضرت عباس نے کہا کہ آپ کے متعلق صرف علیؓ ہی اکیلے نہیں کہتے بلکہ دوسرے لوگ بھی کہتے ہیں۔ آپ لوگوں پر تہمت لگاتے ہیں اور لوگ آپ پر تہمت لگاتے ہیں۔ آپ ان کے بدخواہ ہیں وہ آپ کے، پس جو کچھ آپ ان سے کرتے ہیں وہی آپ سے کرتے ہیں پھر گلہ کس بات کا؟

اس پر حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا کہ:

"آپ اس معاملہ میں پڑ کر میرے اور لوگوں کے درمیان صُلح کرا دیں۔"

عباس نے کہا:

"کیا میں یہ بات لوگوں کو آپ کی طرف سے کہہ دوں؟"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا،

"ہاں بے شک کہہ دیں۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹنے لگے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد پھر واپس آئے اور کہنے لگے،

"ابھی لوگوں سے اس کا تذکرہ نہ کریں۔"

ہم نے دروازہ پر جو نظر کی تو مروان بن الحکم دروازہ میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا اور وُہی تھا جس نے ان کو ان کی پہلی رائے سے پھیر دیا تھا۔

ابو العباس المبرد اپنی کتاب "کامل[1]" میں حضرت علیؓ کے غلام "قنبر" سے روایت کرتے ہیں:

---

[1] اس جگہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ کتاب "کامل" کوئی باقاعدہ تاریخی کتاب نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادبی کتاب ہے جس میں بعض تاریخی واقعات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایک اہم معاملہ کے متعلق کسی ادبی کتاب میں درج کی ہوئی رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ (مترجم)

"میں حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے پاس گیا۔ ان دونوں نے چاہا کہ تنہائی میں کچھ باتیں کریں۔ حضرت علیؓ نے میری طرف اشارہ کیا اور میں وہاں سے کچھ دُور چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ پر ناراض ہو رہے تھے اور حضرت علیؓ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا:

"آخر آپ بولتے کیوں نہیں؟"

حضرت علیؓ کہنے لگے کہ:

اگر میں کچھ کہوں گا تو آپ کو بُرا لگے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ سے کچھ باتیں کروں تو وہ آپ کی ناراضی کا موجب نہ ہوں بلکہ ایسی باتیں ہوں جن کو آپ پسند کرتے ہوں۔"

ابوالعباس کہتے ہیں:

"اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے بھی آپ کے ساتھ اتنی ہی زیادتی کی ہے جتنی آپ نے مجھ پر کی تو اس صورت میں آپ مجھ پر ناراض ہوں گے اور میں یہ نہیں چاہتا، کیونکہ مجھے آپ کی ناراضی اور عتاب منظور نہیں۔"

واقدی کتاب الشوریٰ میں ابن عباس سے روایت کرتا ہے:

"ایک دن حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ پر ناراض ہو رہے تھے، میں بھی وہیں تھا۔ وہ حضرت علیؓ سے کہہ رہے تھے کہ آپ نے فتنۂ تفرقہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ حالانکہ آپ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اسی طرح اطاعت کیا کرتے تھے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے۔ میں ان دونوں سے الگ نہیں ہوں۔ اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں تو میں بھی آپؐ کا داماد ہُوں اور اس بنا پر کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو بیٹیاں میرے ساتھ بیاہی تھیں، میں آپ سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتا ہوں۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ خلافت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کے واسطے مخصوص کر دی تھی جیسا کہ آپ نے حضورؐ کی وفات کے بعد اس بات کو پیش کیا تھا تو پھر آپ نے شیخین کی بیعت کیوں کر لی تھی؟ اگر وہ دونوں اس مرتبہ کے لائق نہیں تھے تو آپ نے ان کی اطاعت کا جُوا اپنے کندھوں پر کیوں رکھ لیا تھا۔ اگر وہ اس مرتبہ کے لائق تھے تو میں ان دونوں سے دین میں، حسب میں اور قرابتِ رسولؐ میں کسی طرح سے کم نہیں ہُوں پھر آپ میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کیوں نہیں کرتے جیسا ان دونوں کے ساتھ کرتے تھے؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا:

"پہلی بات یہ ہے کہ اگر میں تفرقہ کا دروازہ کھول رہا ہُوں اور اس کے لیے راہ صاف کر رہا ہُوں تو اس امر سے مَیں خدا کی پناہ چاہتا ہُوں لیکن میں آپ کو اس بات سے روکتا ہُوں جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ روکتا ہے اور آپ کو ہدایت کی طرف راہ دکھاتا ہوں۔ باقی رہا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا معاملہ، تو اگر انہوں نے وُہ کچھ لے لیا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے واسطے مقرر کیا تھا تو اس کا آپ کو اور دُوسرے مسلمانوں کو بھی پتا ہوگا۔ مجھے تو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اس معاملہ کو طول ہی نہیں دیا۔ اگر وہ میرا حق نہیں تھا بلکہ مسلمان ہی مل کر خلافت کا فیصلہ کرنے والے تھے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ لیکن اگر وہ میرا حق تھا اور دُوسروں کا نہیں تھا تو میں نے صدقِ دلی اور خوشی سے وہ انہی کو عطا کر دیا اور ملّت کی اصلاح چاہنے کے لیے میں نے خلافت پر

اصرار کرنا پسند نہیں کیا۔ باقی رہا میرے، آپ کے اور ان دونوں کے درمیان برابری کا معاملہ، تو آپ ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی برابری کا دعوٰی نہیں کر سکتے۔ ان کے سپرد ملک و ملت کا انتظام کیا گیا تھا اور انہوں نے اس کو بہت خوش اسلوبی سے چلایا اور اپنی ذات کے لیے کوئی نفع بھی حاصل نہ کیا۔ لیکن آپ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ کی عمر تھوڑی رہ گئی ہے۔ کب تک آپ زندہ رہیں گے آخر ایک دن خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ بنی امیہ کو لوگوں کی عزتیں اور مال و دولت لوٹنے سے روکئے۔ خدا کی قسم! اگر آپ کے عمال میں سے کوئی عامل کسی پر ظلم کرتا ہے تو اس کے گناہ میں آپ بھی اس کے برابر کے شریک ہیں۔"

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"آپ کی مرضی! اگر آپ کا یہی خیال ہے تو میرے عمال میں سے جس جس کو آپ اور دوسرے مسلمان ناپسند کرتے ہیں اس کو معزول کر دیجئے۔"

جب حضرت علیؓ چلے گئے تو مروان بن الحکم نے آپ کو ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا "لوگ آپ پر زیادتی کریں گے، آپ ان میں سے کسی کو معزول نہ کیجئے۔"

ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اگرچہ حضرت عثمانؓ سے ناراض تھے اور آپ کی سیاست کو بالکل پسند نہ کرتے تھے لیکن آپ فتنہ کے حق میں نہ تھے۔ آپ نے نہ اس کی کوشش کی اور نہ کبھی اس کے متعلق کوئی اشارہ کیا۔ مفسدین میں سے جو لوگ آپ کی تائید اور مدد حاصل کرنے آپ کے پاس آتے تھے آپ ان سے بہت سختی اور شدت سے پیش آتے تھے اور ان کو مایوس لوٹا دیتے تھے آپ نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ حضرت عثمانؓ کو فتنہ فرو کرنے اور مفسدین کو ان کے شہروں میں لوٹانے کے لیے ان کے کچھ مطالبات مان لینے میں کچھ تامل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن حضرت عثمانؓ ان سے وعدہ کرتے تھے کہ وہ انہی کے کہنے پر عمل کریں گے اور جن جن عمال کو وہ ہٹانا چاہیں گے ہٹا دیں گے اور مروان اور اس کے بھائی بند آپ کو اس وعدہ سے منحرف کروا دیتے تھے۔ اس طرح حضرت علیؓ کی عزت پر حرف آتا تھا اور آپ کو اس بات کا سخت رنج ہوتا تھا کہ حضرت عثمانؓ ان کی رائے کو مروان کی رائے کے مقابلہ میں بے وقعت سمجھتے ہیں۔

ایک اور چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے بھی کبھی حضرت علیؓ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ فتنہ کی تائید کر رہے ہیں اور ان کے خلاف لوگوں کو بھڑکا رہے ہیں۔ وہ حضرت علیؓ پر صرف یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ ان کی تائید میں بہت ہی سستی سے کام لے رہے ہیں۔ ادھر حضرت علیؓ کا جواب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ ان کی نصیحت کو نہیں سنتے۔ وہ ان سے وعدہ کرتے ہیں اور زبان دیتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو اس سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنے وعدہ سے منکر ہو جاتے ہیں[1] جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفسدین حضرت علیؓ پر الزام لگاتے اور تہمت دھرتے ہیں کہ وہ بھی امیر المومنین کے شریک ہیں۔ اس چیز سے حضرت علیؓ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کے متعلق یہ نہ کہا جائے

---

[1] مندرجہ بالا اعتراضات کی حقیقت حضرت عثمانؓ پر بے بنیاد اتہام سے قطعاً زیادہ نہیں۔ حضرت عثمانؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفۂ رسول اللہ کے متعلق وعدہ خلافی کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (مترجم)

کہ انہوں نے وعدہ کیا لیکن ایفا نہ کیا۔ زبان دی لیکن اس سے پھر گئے۔

(۲۵)

کیا حضرت عثمانؓ غلطی پر تھے؟

کتب سیر کے قدیم مؤلفین نے اس بحث میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ بعض نے حضرت عثمانؓ پر تنقید کی ہے اور بعض نے ان کو غلطیوں سے مبرا قرار دیا ہے، اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے سرے سے ان کی ساری سیاست سے بیزاری کا اظہار کیا ہے اور ان کی کمزوری، نرمی اور رقیق القلبی کو اس فتنہ کا باعث ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے جنہوں نے اسلام کے لیے وہ حالات پیدا کر دیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو مسلمان ہلاکت کے گڑھے میں گر کر ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو جاتے۔ لیکن بعد کے مصنفین میں سے اکثر نے حضرت عثمانؓ کا دفاع کیا اور جو کمزوریاں ان سے صادر ہوئی تھیں ان کے لیے عذر تلاش کیے ہیں۔ ہم نے بھی جہاں تک ممکن ہوا یہی راستہ اپنے لیے منتخب کیا ہے[1]

مرتضیٰ جو متقدمین علماء اسلام میں سے ہے حضرت عثمانؓ کی سیاسی غلطیوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وہ شخص جو حضرت عثمانؓ کو بری الذمہ قرار دیتا ہے اس کی اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ حضرت عثمانؓ کو اپنے ان فاسق عمال کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا جن کو آپ نے مختلف ولایات میں مقرر کیا تھا، اس لیے آپ پر اس بارہ میں کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے بےخبری میں ایسا کیا، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جن جن ایسے فاسق لوگوں کو آپ نے والی مقرر کیا وہ پہلے ہی بےحیائی، بدکاری اور دین سے استہزاء کرنے میں مشہور رہتے تھے۔ اس امر میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ کے شراب پینے اور دین کے ساتھ استہزاء کرنے کا الزام کوفہ کا والی ہونے کے بعد نہیں لگایا گیا بلکہ پہلے ہی اس کی تمام عادات و خصائل عام لوگوں میں مشہور تھیں تو حضرت عثمانؓ سے جو اس کے بہت ہی قریبی رشتہ دار تھے وہ کس طرح مخفی رہ سکتی تھیں!

کوفہ میں اس کا شراب پینا اور نشہ میں مدہوش ہو جانا، لوگوں کا وہاں آ جانا اور اس کے ہاتھ سے بےخبری میں انگوٹھی اتار لینا کوئی راز نہیں ہے۔ لیکن جب لوگ یہ شکایت لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس جاتے ہیں تو حضرت عثمانؓ اس کو اس وقت تک کوڑے لگانے اور معزول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں جب تک پورا مقدمہ ان کے سامنے پیش نہ ہو۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں بیان دیں، جرح ہو اور پھر فیصلہ کیا جائے[2] اگر حضرت علیؓ آپ پر سخت زور نہ دیتے تو آپ کبھی اس کو معزول نہ کرتے۔"

---

[1] صحیح اور درست اور ٹھیک راستہ یہی ہے کہ جو غلط، بیہودہ اور نامعقول اعتراضات مخالف، مفسد اور فتنہ انگیز لوگوں نے حضرت خلیفہ ثالث پر لگائے ان کا دلائل اور براہین سے رد اور دفعیہ کیا جائے اور ان کو ہرگز قبول نہ کیا جائے۔

[2] یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس معاملہ میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ کیا بغیر تحقیقات کسی شخص پر حد قایم کرنا اور اسے ولایت سے معزول کر دینا انصاف کہلایا جا سکتا ہے؟ (مترجم)

"پھر لوگ صرف اس وجہ سے حضرت عثمانؓ سے ناراض تھے کہ آپ نے اپنے اقارب کو محض اقارب ہونے کی بنا پر مختلف علاقوں کی تولیت سپرد کر دی بلکہ اس وجہ سے ناراض تھے کہ وہ عامل عامۃ المسلمین پر مختلف شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے اور قسم قسم کی تہمتیں ان پر لگاتے تھے اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرؓ بن الخطاب اپنے عزیز و اقارب کو کوئی عہدہ دینے سے ڈرتے تھے۔"

"سعید بن العاص نے کوفہ میں کہا:

سواد قریش کا باغ ہے اور ان کو یہ حق ہے کہ وہ اس میں سے جتنا چاہیں پھل لے لیں اور جتنا چاہیں چھوڑ دیں۔"

اس پر لوگوں نے کہا:

وہ چیز جو خدا نے ہمیں دی ہے اس پر آپ اپنا اور اپنی قوم کا قبضہ کس طرح جما سکتے ہیں؟"

جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ کوفہ والوں نے سعید کو مدینہ سے آتے ہوئے کوفہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ لوگوں کی حضرت عثمانؓ سے بھی اس بارہ میں بڑی گرم گرم گفتگو ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ حضرت عثمانؓ کو بھی تختِ خلافت سے اتارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے مجبور ہو کر ابو موسیٰ کو وہاں کا والی بنایا۔

حضرت عثمانؓ نے سعید کو اپنی مرضی سے ولایت سے علٰحدہ نہیں کیا۔ وُہ تو کبھی ایسا نہ کرتے، بلکہ اہلِ کوفہ نے اپنے زور سے اس کو علٰحدہ کرایا۔"

"باقی رہا یہ امر کہ لوگوں نے ان پر عاملِ مصر کو خط لکھنے کا الزام لگایا لیکن انہوں نے اس سے انکار کیا۔ تو آپ کے واسطے ضروری تھا کہ اس تمام معاملہ کی تحقیقات کرتے، اس قاصد کو طلب کرتے اور اس سے تمام واقعہ کی تفصیل پُوچھتے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتے۔ پھر جب ان کو معلوم ہُوا تھا کہ مروان نے یہ کام کیا ہے اور اس نے بعض مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا تھا تو آپ کا فرض تھا کہ اس کو قرارِ واقعی سزا دیتے اور آیندہ کے لیے اس کو اپنا قرب کسی طرح بھی نہ بخشتے۔"[1]

"یہ بھی غلط ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ کا قتل ضروری ہی تھا تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں تھا کہ عوام اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے۔ کیونکہ جن لوگوں نے آپ کو قتل کیا وہ آپ کے قتل کے ارادہ سے ہرگز نہیں آئے تھے بلکہ اس امر کے ثابت ہونے کے بعد کہ آپ نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ خلافت چھوڑ دیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر لوگوں نے آپ کا محاصرہ کر لیا اور آپ کو مجبور کرنے لگے کہ آپ خلافت چھوڑ دیں۔ آپ اپنے گھر میں مقیم ہو گئے اور بنی امیہ کے اوباش آپ کے پاس جمع ہو کر آپ کی مدافعت کرنے لگے۔[2] جو شخص آپ کے گھر کے قریب آنا چاہتا اس کو پتھر مارتے، اس پر

---

[1] خط کا واقعہ سراسر فرضی اور من گھڑت ہے۔ اس پر ہم پہلے تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ نہ یہ خط مروان نے لکھا نہ حضرت عثمانؓ کا غلام اس خط کو لے کر گیا۔ اگر ایسا تھا تو باغی اس غلام کو لا کر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش کرتے اور عرض کرتے کہ اس سے پوچھیے۔

[2] نہ معلوم اس مورخ کے ذہن سے یہ بات کس طرح فراموش ہو گئی کہ حضرت عثمانؓ کی مدافعت کرنے میں حضرت علیؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ کے لڑکے بھی شامل تھے۔ (مترجم)

بتدریج لڑائی، دنگا، فساد اور بالآخر آپ کے قتل تک نوبت پہنچی۔ لیکن دراصل مقصود لڑائی اور قتل نہ تھا بلکہ معاملات نے آہستہ آہستہ یہ صورت اختیار کی۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ظالم کسی انسان کے مال و متاع پر قابض ہو جائے تو مغلوب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وُہ اپنے مال کو بچانے کے لیے کچھ جدّوجہد کرے۔ البتہ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مال بچانے کے ساتھ ساتھ اس کو قتل بھی کر ڈالے۔ لیکن اگر بغیر قصد اور ارادہ کے معاملہ اس حد تک پہنچ جائے کہ مال کے ساتھ اس کی جان کو بھی خطرہ ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے اگر اس غاصب کو قتل بھی کرنا پڑے تو مجبوراً اس کو یہی کرنا چاہیے۔ جب حضرت عثمانؓ کی طرف سے محاصرین کے مطالبات کو ماننے میں دیر ہُوتی تو انہیں یہ خوف لاحق ہُوا کہ اگر جلدی فیصلہ نہ کیا گیا تو حضرت عثمانؓ نے اپنی مدد کے لیے سلطنت کے مختلف حصّوں میں جو خطوط لکھے تھے اور اس کے نتیجہ میں جو فوجیں آپ کی مدد کے لیے آ رہی تھیں وُہ مدینہ پہنچ جائیں گی اور قتلِ عام شروع ہو جائے گا۔ اس صورت میں زبردست فتنہ کا احتمال ہے۔ اس لیے انہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر ڈالا۔[ل]

"حکم ابن ابی العاص کو مدینہ واپس بلانے میں حضرت عثمانؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح خلاف ورزی کی تھی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طائف کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی سفارش کی۔ لیکن آپؐ نے سفارش رد کر دی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کے واپس بلانے کی سفارش کی لیکن آپ نے بھی اس کو رد کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہُوئے تو انہوں نے پھر اس کی سفارش کی، اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا:

"رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کو نکالا ہے اور آپ مجھے اس کے بلانے کو کہتے ہیں۔ آج کے بعد آپ اس کام کے لیے میرے پاس تشریف نہ لائیے گا۔"

جب حضرتِ عثمانؓ خود خلیفہ ہُوئے تو آپ نے اس کو اور اس کے اہل و عیال کو واپس بلا لیا۔ کبار صحابہ کو یہ بہت ناگوار گزرا اور انھوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس اس کی شکایت کی تو آپ نے کہا:

"وہ میرا رشتہ دار ہے اور میں اب اس کو واپس نہیں کر سکتا۔"

اس پر وُہ بہت ناراض ہُوئے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو مدینہ واپس بلا لیا ہے جس کو خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطن کیا تھا اور اس پر لعنت بھیجی تھی حتّٰی کہ اس کا نام بھی مطرید رسولؐ اللہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دھتکارا ہوا) پڑ گیا تھا اور آپ نے اس کی عزّت و تکریم کے ساتھ اس کو مال و دولت سے بھی نوازا ہے۔"

مرتضٰی نے اپنی تنقید میں حضرت عثمانؓ کے عمال میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا جس میں کیڑے نہ نکالے ہوں۔ اس نے

[ل] ظاہر ہے کہ اس بیان کا مصنف حضرت عثمانؓ کا بہت ہی بڑا دشمن اور معاند ہے اور مفسدوں کا نہایت معاون اور ہمدرد۔ جس نے مفسدین پر سے فساد کی ساری ذمہ داری ہٹا کر حضرت عثمانؓ پر ڈالنی چاہی ہے اور وہ بھی بڑے مضحکہ خیز طریقہ سے۔ میں کہتا ہوں باغیوں کو کب یہ حق تھا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر یوں فتنہ برپا کرتے! پھر اس دوران میں جو نامعقول اور بیہودہ حرکات انہوں نے کی ہیں کیا کوئی شریف اور امن پسند انسان ایسی حرکات کر سکتا ہے؟ انہی حرکات سے ان کی شرافت کا پول کھل جاتا ہے۔ (مترجم)

یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے اہلِ بیت کو بے شمار مال و دولت عطا کی تھی جو در اصل مسلمانوں کا مال تھا۔ اس نے بیان کیا ہے کہ حارث بن کلدہ کے غلام زیاد بن عبید اللہ کو حضرت ابو موسیٰ اشعری والی بصرہ نے کافی مال و اسباب دے کر بھیجا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو اپنے بیٹوں اور اہل و عیال میں تقسیم کر دیا۔ جب زیاد نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ رو پڑا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: "تم کیوں روتے ہو؟"

زیاد نے کہا:

"میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو بھی خلیفہ ہونے کی حالت میں دیکھا ہے۔ ان کے ایک بیٹے نے بیت المال کی کسی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حضرت عمرؓ نے اس کو جھڑک دیا اور لڑکا روتا ہوا باہر نکل گیا اور آپ نے اپنے بیٹوں کو یہ سارا مال تقسیم کر دیا ہے۔"

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا:

"حضرت عمرؓ بن الخطاب اپنے اہل و عیال اور قرابت داروں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کچھ نہیں دیا کرتے تھے اور میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے لیے اپنے اہل و عیال، بیٹوں اور قرابت داروں کو مال و دولت سے نوازتا ہوں۔"

مرتضیٰ، عبد اللہ بن مسعودؓ کو سزا دینے، ابو ذر غفاریؓ کو مدینہ سے ربذہ بھیج دینے اور وہاں ان کے غریب الوطنی کے عالم میں وفات پا جانے کا بھی ذکر کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے معاویہ کو حکم دیا تھا کہ ابو ذر کو بڑی تکلیفیں دے کر شام سے مدینہ بھیج دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا حالانکہ مسلمانوں میں ان کا مرتبہ بہت ہی بلند تھا وہ ایک جلیل القدر صحابی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب تھے۔[1]

حضرت عثمانؓ کے خلاف مرتضیٰ کی تنقید پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہم پہلے ہی ان امور کے بارہ میں بحث کر چکے ہیں البتہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک گمراہ شخص کی رائے حضرت عثمانؓ کی خلافت اور سیاست کے بارہ میں ہے (اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص حضرت عثمانؓ کے متعلق جو کہے وہ تھوڑا ہے۔ ایسے لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں ان کے دلوں میں اس سے زیادہ بغض بھرا ہوا ہے)

بعض قدیم مؤرخین حضرت عثمانؓ کو بالکل بری الذمہ قرار دیتے ہیں اور آپ کی سیاست اور آپ کے عمال کو نکتہ چینی سے بالکل مبرا سمجھتے ہیں۔ جو جو اعتراض آپ پر کیے جاتے ہیں انہوں نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ بایں ہمہ ہر تنقید کو فضول قرار نہیں دیا جا سکتا اور ہر اعتراض کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ کوئی بھی حضرت عثمانؓ کی کمزوری اور بنو امیہ کو رعایا پر مسلط کر دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ بعض صحابہ پر سختی کرنے کی کوئی معقول وجہ تلاش بھی کر لی جائے لیکن اس امر سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ آپ بہت نرم دل تھے اور آپ کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر بنو امیہ لوگوں کے سروں پر مسلط ہو گئے تھے جس سے حضرت

---

[1] ان اعتراضات کے جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ (مترجم)

عمر فاروقؓ بہت ڈرا کرتے تھے۔[1]

معاصر مؤرخین حضرت عثمانؓ کی سیاست کے متعلق ایک جدید نظریہ قائم کرتے ہیں جو قدما کے نظریوں سے کافی مطابقت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر بعض معاصر مؤرخین کی آرا درج ذیل کی جاتی ہیں۔

خضری مرحوم یہ رائے ظاہر کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہا درجہ کی محبت تھی۔ عرب عدل اور مساوات کے بھی بہت دلدادہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو آزادی، عدل اور مساوات کی شیرینی چکھا دی تھی۔ عبد اللہ بن سبا نے ان کی خلقی کمزوریوں کو بھانپ لیا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اہل بیت کی بہت تعظیم ہے، لوگوں میں حضرت علیؓ کے متعلق پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا کہ جس طرح ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اسی طرح حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں اور چونکہ وہ حق پر ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کا حق ان کو دیا جائے اور جو شخص ان کا حق چھینتا ہے وہ ظالم اور غاصب ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حضرت علیؓ کی تعریف کے پل باندھنے شروع کر دیے اور آپ کے درجہ کو اتنا چڑھایا کہ الوہیت کا مرتبہ دے دیا۔ ظاہر ہے کہ خود حضرت علیؓ اس کے نظریات سے کسی طرح موافقت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کو اس سے کیا غرض تھی، اسے تو اپنا مطلب نکالنا تھا۔ اس طرح لوگوں کی نظروں میں اس کی وقعت بہت بڑھ گئی اور اس کے لیے اپنے نظریات لوگوں میں پھیلانا بہت آسان ہو گیا۔ اس شخص کو ان لوگوں سے خدا واسطے کا بیر تھا جن کے ہاتھوں میں خلافت و سلطنت کے امور تھے۔ چنانچہ اس نے پہلے اپنا اعتبار قائم کر کے ان عمال کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا۔ اس کے لیے اس نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ عرب عدل و مساوات کے بہت دلدادہ تھے، اور جمہور کو یہ کہہ کر بڑی آسانی سے بھڑکایا جا سکتا تھا کہ فلاں شخص کے ہاتھوں تمہاری آزادی خطرہ میں ہے تم اس سے عدل و انصاف کی امید بالکل نہ رکھو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور حضرت عثمانؓ اور آپ کے عمال کے خلاف اس طرح پروپیگنڈہ شروع کیا کہ کبھی تو کہا عمال نوجوان ہیں انھیں معاملات سلطنت کی کچھ خبر نہیں اور وہ بالکل ناتجربہ کار ہیں۔ کبھی یہ کہا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار ہیں، کبھی یہ کہا کہ وہ ظالم ہیں اور لوگ ان کے ہاتھوں نالاں ہیں وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں کر کے اس نے ہر شہر میں اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ اب لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ ہر شہر کا گروہ دوسرے شہر کے لوگوں کو ان فرضی مظالم کی تفصیل بھیجنے لگا جو اس شہر کے عامل نے وہاں کے مسلمانوں پر کیے۔ یہ خطوط عامۃ المسلمین میں اعلانیہ پڑھے جاتے تھے۔ سادہ لوح مسلمانوں کو جب ان فرضی مظالم کا پتا چلتا جو ان کے خیال میں ان کے بھائیوں پر وہاں کے ظالم عمال نے روا رکھے ہوئے تھے، تو ان کے دلوں میں ان عمال کے خلاف نفرت کے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے رحم کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور وہ کہتے تھے:

"ہم تو ان مظالم سے امن میں ہیں جن میں ہمارے دوسرے مسلمان بھائی مبتلا ہیں"۔

ان کو کیا پتا تھا کہ وہ دوسرے شہروں میں ان کے بھائی ان کے لیے درد اور ترحم کے جذبات اپنے اندر رکھتے ہیں اور خود شکر کرتے ہیں کہ وہ ہر مصیبت اور ظلم سے محفوظ ہیں۔ غرضیکہ ان خطوط نے عامۃ المسلمین میں عمال کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دیے لیکن جو کچھ ان خطوط میں لکھا جاتا تھا اس میں کسی قسم کی سچائی نہ ہوتی تھی اور وہ سو فیصدی جھوٹ کا پلندا ہوتے تھے۔

وہ لوگ حضرت معاویہ میں کیڑے ڈالتے تھے حالانکہ انہیں حضرت عثمانؓ نے والی مقرر نہیں کیا تھا بلکہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ولایت ملتی چلی آئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کو ولایت سے نوازا۔ بہت ہی کم عمال ایسے ہیں جو حضرت عمرؓ کی ساری زندگی میں اپنے عہدہ پر قایم رہے ہوں۔ لیکن حضرت معاویہ ان لوگوں میں سے ہیں جو حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ سے لے کر آخر زمانہ تک والی بنے رہے۔ تمام ولایات میں سب سے زیادہ پرسکون اور سب سے زیادہ عدل سے بہرہ ور ولایت شام کی تھی۔ حضرت معاویہؓ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ سوائے ابوذر والے اعتراض کے سب ایسے ہیں جو انتہائی لایعنی اور فضول ہیں اور ان پر بحث کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔ لیکن ابوذر والے معاملہ میں بھی اگر ایک منصف مزاج شخص غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ حضرت ابوذر کا عمل اور آپ کی دعوت بالکل ناقابل عمل تھی بلکہ اس پر عمل کرنے سے ملت میں انشقاق و افتراق برپا ہو جاتا۔ لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ تمام عیش و آرام پر لات مار کر فقیرانہ زندگی بسر کریں اور مال و دولت کو ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا جو اس کے مستحق نہ تھے۔ لوگ عبداللہ بن ابی سرح پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ظالم تھا بلکہ اس وجہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا کیونکہ وہ مرتد ہو کر کافروں سے جا ملا تھا جو آپؐ سے برسر جنگ تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس کی سفارش کی اور وہ خود بھی تائب ہو کر بحیثیت مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کو معاف کر دیا۔ اب سوچیے کہ جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف فرمایا اور اس کے ساتھ ہی اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا تو پھر کس شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس پردہ کو ہٹانے کی کوشش کرے؟

عبداللہ بن سعد ہرگز ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو کر مدینہ پر چڑھ آتے تھے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ لوگ ان پر الزام لگاتے ہیں جو اس وقت بچے تھے اور عبداللہ بن سعد سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ وہ لوگ حضرت عثمانؓ پر ولید بن عقبہ کو والی بنانے کی وجہ سے الزام لگاتے ہیں حضرت عثمانؓ نے اس کو والی نہیں بنایا تھا بلکہ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ سے ہی جزیرہ کا والی تھا۔ حضرت عثمانؓ نے صرف یہ کیا تھا کہ اس کو جزیرہ سے کوفہ منتقل کر دیا تھا۔ جب وہ کوفہ میں آیا تو لوگوں کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی اور اس نے بہت اچھی طرح حکومت کی لیکن پھر اس پر شراب پینے کا الزام لگا کر شور و شغب برپا کر دیا گیا اور اس کے خلاف شہادت دی گئی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ لوگ اپنی شہادت میں سچے تھے یا جھوٹے۔ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کے شہادت دینے کے بعد اس پر حد قایم کی اور اسے معزول کر دیا۔ ان واقعات کی روشنی میں معلوم نہیں لوگ خواہ مخواہ حضرت عثمانؓ کے خلاف کیوں شور برپا کرتے ہیں۔

مفسدین سعید بن العاص پر عیب لگاتے ہیں حالانکہ اہل کوفہ کو خود اس بات کا اعتراف تھا کہ سعید بہترین عامل، عادل

اور منصف مزاج شخص تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الزامات میں جو یہ لوگ عمال پر لگاتے تھے اور ظلم و جور کی ان داستانوں میں جو یہ مفسدین ہر چہار طرف پھیلاتے تھے کسی قسم کی سچائی نہیں تھی۔ ان کے پھیلانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بُرا اثر پیدا کیا جائے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے، کیونکہ لوگ ان اقوال اور الزامات کو بغیر کسی شک و شبہ کے قبول کر لیتے تھے اور ان کی تصدیق میں کسی دلیل و بُرہان کی ضرورت نہ سمجھتے تھے کیونکہ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ادلہ و براہین، عقلی حجتیں اور منطقی نتائج جماعتوں اور مجموں کو متاثر نہیں کرتے۔

اس فتنہ کے بڑھنے میں اصحاب الرائے اور بڑے بڑے لوگوں نے بہت مدد دی کیونکہ انہوں نے فتنہ کو بڑھنے سے پہلے نہیں روکا اور اس کے انسداد کی کوئی فکر نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ کے نائبین امراً ایسا کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے کیونکہ خلیفہ نے ان کے ہاتھوں کو اس ڈر سے پکڑا ہوا تھا کہ اگر سختی کی گئی تو فتنہ کا ایسا دروازہ کُھل جائے گا جس کے متعلق آپ نے انتہائی کوشش کی تھی کہ وہ بند رہنے دیا جائے۔"

پروفیسر نجار کا یہ خیال ہے کہ "حضرت عثمانؓ کا بھی اس فتنہ میں کسی دوسرے سے کم حصہ نہیں ہے۔ جب ان کو معلوم تھا کہ وُہ بہت کمزور اور نرم طبیعت ہیں تو ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ خلافت سے دست بردار ہو جاتے اور اپنے قتل سے اُمت کو ایک مصیبتِ عظمیٰ میں مبتلا نہ کرتے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ جو شخص ان حوادث کی تفصیل پڑھے جو حضرت عثمانؓ کے قتل سے پہلے رونما ہُوئے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وُہ قریش کے سربر آوردہ لوگوں کو ہر قسم کے الزامات سے بری قرار دے سکے۔ اگرچہ یہ بھی مشکل ہے کہ ان پر فسادیوں کے ساتھ کسی حقیقی عملی قدم اٹھانے کا الزام لگایا جا سکے۔ مگر وہ غفلت کے مجرم ضرور تھے۔ چنانچہ سب سے بڑا اعتراض جو ان پر آتا ہے وُہ یہی ہے کہ انہوں نے خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے میں انتہائی لاپروائی سے کام لیا اور آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کیے جو حضرت عثمانؓ جیسے انسان کے مرتبہ سے بعید تھے۔ ایسے الفاظ انتہائی نازک زمانہ میں اور فتنہ کے سرغنوں کے سامنے کہے گئے جن کو وہ لوگ اپنی بغاوت کی تائید اور اپنے اٹھائے ہُوئے فساد کے جواز میں استعمال کرتے تھے۔"

مصنف ' اشہر مشاہیر الاسلام ' لکھتا ہے :

" بنی امیہ کو تمام معاملاتِ حکومت سپرد کر دینا، انہی کو اپنا مشیر اور رازدار بنا لینا ایک ایسا امر تھا جس نے مہاجرین کو بہت برانگیختہ کر دیا تھا اور دُور اندیش لوگوں کو اس بات کا ڈر پیدا ہونے لگا تھا کہ کہیں حکومتِ اسلامیہ اموی رنگ میں نہ رنگ جائے۔ وہ کہتے تھے کہ حکومت ان لوگوں کا حق نہیں ہے بلکہ یہ تمام مسلمانوں کا اور خصوصاً سابقون الاوّلون اور مہاجرین کا حق ہے لیکن

---

[1] یہ لایعنی الزام لگاتے ہُوئے نہ معلوم مصنفین کو وہ مشہور حدیث کیوں بھول جاتی ہے جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ سے یہ فرمایا تھا کہ "خدا تعالیٰ تمہیں ایک قمیص (خلافت) پہنائے گا تم اس کو مت اتارنا۔" تو حضرت عثمان کس طرح اس قمیص کو اتار کر حضور علیہ السلام کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتے تھے؟ (مترجم)

حضرت عثمانؓ نہ چاہتے تھے کہ اپنے رشتہ داروں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیں، اسی وجہ سے انھوں نے اُمت کے مطالبہ کا کوئی جواب نہ دیا (یہ کہنا ظلم ہے کہ آپ نے امت کے مطالبہ کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اہلِ فتنہ کے مطالبوں کا کوئی جواب نہ دیا) اس اصرار کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں :

۱۔ ان کی قوم (بنو امیہ اور ان کے رشتہ داروں) نے ان کو کمزور پا کر ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔

۲۔ حضرت عثمانؓ کو یہ ڈر ہوا کہ اگر وہ اپنی قوم سے الگ رہے اور اپنے اہل و عیال اور خاندان سے علحدگی اختیار کر لی اور عمال نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی تو ان کے خاندان کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو باغیوں کے مقابلہ میں آپ کی طرف سے کھڑا ہو سکے۔ اس وجہ سے آپ نے اپنے رشتہ داروں کو ہی ہر معاملہ میں ترجیح دی اور مختلف علاقوں پر انہی کو والی اور حاکم بنایا۔ جب اس طرزِ عمل کے خلاف شور و غل برپا ہوا، حضرت عثمانؓ کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی اور لوگوں نے ان کو معزول کرنے کے لیے آوازیں اٹھانی شروع کیں تو حضرت عثمانؓ کو بہت فکر پیدا ہوا اور یقین ہوا کہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے ان شکایتوں پر کان نہ دھرا، ولایات پر اپنے رشتہ داروں کو ہی باقی رکھنے پر اصرار کیا اور انہی کے مشوروں پر اعتماد کیا۔ اس پر عامۃ المسلمین اور صحابہ میں بڑا ہیجان برپا ہو گیا اور باغیوں نے اسی بات کو لے کر آپ سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا۔ یہی چیز تھی جو فتنہ کی آگ بھڑکانے کا موجب ہوئی اور آگے چل کر اس آگ نے ایسی شکل اختیار کر لی جس کا بجھانا کبار صحابہ اور اُمت کے بڑے بڑے آدمیوں کی طاقت سے بھی باہر ہو گیا۔ اب لوگ پچھتانے کہ کاش وہ پہلے ہی سے ایسا انتظام کرتے جس سے یہ فتنہ بڑھنے نہ پاتا لیکن اس وقت ان کا پچھتاوا بالکل بے سود تھا۔"

(۲۶)

حادثۂ فاجعہ

مفسدین نے دیکھا کہ اگر خلیفہ کا محاصرہ زیادہ طویل ہو گیا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے اور فوجیں آکر ہمارا کام تمام کر دیں گی۔ شروع میں ان کا یہ خیال تھا کہ جب حضرت عثمانؓ اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا دیکھیں گے تو وہ خلافت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن جب دن گزرتے چلے گئے، محاصرہ جاری رہا۔ حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں مقیم ہو گئے اور آپ کے اعیان و انصار نے آپ کو ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے تدابیر اختیار کرنی شروع کیں تو ان کو معلوم ہوا کہ اگر اب وہ کوئی یقینی فیصلہ کیے بغیر یہاں سے اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے تو حضرت عثمانؓ کے عمّال انہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دروازہ سے حملہ آور ہوئے اور اس کو جلا دیا۔ اس پر گھر میں جو اشخاص جمع تھے انہوں نے حضرت عثمانؓ کے منع کرنے کے باوجود ان کا زبردست مقابلہ کیا۔ ان لوگوں میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں :

مغیرہؓ بن الاخنس بن شریق، حسنؓ بن علیؓ، محمدؓ بن طلحہؓ، عبداللہؓ بن زبیرؓ، مروان، ابوہریرہؓ۔

دونوں فریقوں میں زبردست جنگ ہوئی اور مفسدین دروازے کی راہ سے حضرت عثمانؓ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جب ان محاصرین نے دیکھا کہ دروازہ کی راہ سے گھر میں داخل ہونا ان کو بہت مہنگا پڑے گا تو انہوں نے کسی اور راہ سے گھر میں داخل ہونے کی ٹھانی۔ چنانچہ وہ حضرت عثمانؓ کے پڑوسی عمرو بن حزم کے گھر میں داخل ہو کر اور اس کی دیوار پھاند کے حضرت عثمانؓ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دروازہ پر جو لوگ موجود تھے ان کو اس کا علم ہی نہ ہو سکا۔ جو شخص سب سے پہلے آپ کے گھر میں داخل ہوا اس نے آپ سے خلافت سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا اور وعدہ کیا کہ اگر آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں تو محاصرین آپ سے بالکل تعرض نہ کریں گے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اس قمیص کو اتارنے کے لیے تیار نہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنائی ہے۔ اس پر وہ شخص آپ کے پاس سے چلا گیا۔

اس کے بعد محمد بن ابی بکر آپ کے پاس پہنچا اور آپ کی ریش مبارک کو پکڑ کر کہنے لگا:

"اے نعثل! خدا تجھے ذلیل کرے۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"میں نعثل نہیں ہوں بلکہ میں عثمانؓ اور امیر المومنین ہوں۔"

اس نے کہا:

"معاویہ اور فلاں فلاں آپ کے کیا کام آسکتے ہیں؟"

اس دوران میں وہ آپ کی داڑھی کو برابر پکڑے رہا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا:

"اے میرے بھتیجے! اگر تیرا باپ اس وقت یہاں ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔"

اس نے جواب دیا:

"اگر میرا باپ آپ کو ایسے کام کرتے دیکھتا تو ضرور آپ کے خلاف کھڑا ہو جاتا۔ اور میں تو داڑھی پکڑنے سے بھی زیادہ سخت کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا:

"میں تیرے خلاف خدا ہی سے مدد چاہتا ہوں۔"

اس پر اس نے داڑھی چھوڑ دی اور وہاں سے نکل گیا۔

اس کے بعد آپ پر قتیرہ، سودان بن حمران اور غافقی نے حملہ کیا۔ غافقی نے لوہے کی ایک سلاخ آپ کے سر پر ماری اور حضرت عثمانؓ کے سامنے جو قرآن شریف پڑا ہوا تھا اس کو لات مار کر لڑھکا دیا[1]۔ وہ قرآن مجید لڑھک کر آپ کے پاس آگیا اور

---

[1] قرآن کریم کی اس صریح توہین کے بعد مرتضیٰ جیسے مصنف ہی کہہ سکتے ہیں کہ مفسدین کی نیت نیک تھی۔ ایسا کام تو شریف غیر مسلم بھی نہیں کرتے جو نام کے مسلمانوں نے کیا۔
(مترجم)

آپ کے سر سے خون کے قطرے اس پر گر پڑے۔ اس کے بعد سودان آپ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا لیکن آپ کی بیوی نائلہ بیچ میں آگئیں۔ اس پر اس نے تلوار سے وار کیا اور اس کی تین انگلیاں کاٹ دیں[1]۔ جس شخص کے وار سے حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اس کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سودان بن حمران تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ کنانہ بن البشر التجیبی تھا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کا ایک غلام آپ کی مدد کے لیے کچھ لوگوں کو لے کر اندر آیا اور سودان پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس پر قتیرہ نے اس غلام کو مار ڈالا اور گھر میں جو کچھ تھا اس کو لوٹ کر باہر نکل گئے۔

جب یہ لوگ حضرت عثمانؓ کو شہید کر کے آپ کے کمرہ سے باہر نکلے تو حضرت عثمانؓ کے ایک غلام نے قتیرہ پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ باہر نکلتے وقت انہوں نے گھر میں جو کچھ تھا وہ لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ عورتوں کے بدن پر جو زیور تھا وہ بھی اتار لیا۔ کلثوم تجیبی نے حضرت نائلہ کی چادر اتار لی تھی[2]۔ حضرت عثمانؓ کے ایک اور غلام سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں عمرو بن الحمق حضرت عثمانؓ کے کمرہ میں داخل ہوا۔ حضرت عثمانؓ میں ابھی کچھ جان باقی تھی وہ آپ کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور آپ پر سات وار کیے۔ ان لوگوں نے آپ کا سر بھی کاٹ لینا چاہا جس پر عورتوں نے چلّانا شروع کر دیا اور ابنِ عدیس نے کہا: "چھوڑ دو۔" عمیر بن ضابی نے آکر آپ کی ایک پسلی توڑ ڈالی اور کہا:

"اس نے میرے باپ کو قید میں ڈال دیا تھا اور وہ قید ہی میں مر گیا تھا۔"

اب ان لوگوں نے اپنے ساتھیوں میں منادی کرا دی کہ بیت المال کی طرف چلو اور جو کچھ اس میں ہے لوٹ لو۔ بیت المال کے محافظ خزانہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بیت المال میں سونے کی صرف دو تھیلیاں تھیں جو ان لوگوں نے لوٹ لیں[3]۔

حضرت عثمانؓ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو بروز جمعہ شہید کیے گئے[4]۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ محاصرین نے حضرت عثمانؓ سے مروان کو ان کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا تھا لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ محاصرین میں سے بعض لوگ بنی زہرہ میں سے تھے جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے طرفدار بن کر آئے تھے۔ اس لیے کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں سزا دی تھی اور عبداللہ بن مسعود ان کے حلیفوں میں سے تھے۔ بعض لوگ بنی مخزوم اور ان کے حلیفوں میں سے تھے جو عمار بن یاسر کی وجہ سے آئے تھے۔ بعض لوگ غفار اور ان کے حلیفوں میں سے تھے جو ابو ذر کی وجہ سے آئے تھے۔ تیم بن مرہ کی شمولیت

---

[1] عورتوں پر حملہ کرنے والے بھی مرتضیٰ کے نزدیک امن پسند انسان تھے۔

[2] ملاحظہ فرمایا آپ نے! ایسے گمراہ لوگ بھی مرتضیٰ کے نزدیک دین کے حامی اور ملّت کے غمخوار ہیں۔

[3] دشمنی میں آدمی کتنا بے اصول ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے خلیفہ کو قتل کرنے اور مسلمانوں کے بیت المال کو لوٹنے والے سنگدلوں کو مرتضیٰ جیسے مصنف اپنے مطالبے اور اپنے افعال میں حق بجانب سمجھتے ہیں اور یہ صرف اس وجہ سے کہ ان کو عثمانؓ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

[4] عیسوی تاریخ ۱۷ جون ۶۵۶ء تھی۔ (مترجم)

محمد بن ابی بکر کی وجہ سے تھی۔

جب حضرت علیؓ کو یہ خبر پہنچی کہ یہ لوگ حضرت عثمانؓ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ اور اپنے غلاموں کو ہتھیار دے کر حضرت عثمانؓ کے گھر ان کی مدد کے لیے بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ حضرت زبیرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ اور حضرت طلحہؓ نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی اسی مقصد کے لیے بھیجا۔ اسی طرح سے اکثر صحابہؓ نے اپنے اپنے بیٹوں کو حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے بھیج دیا[1]۔ چنانچہ انہوں نے دروازہ پر حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کو دروازہ کی راہ سے گھر میں داخل نہ ہونے دیا۔ اسی مقابلہ میں حضرت حسنؓ، حضرت علیؓ کا غلام قنبر اور محمدؓ بن طلحہؓ زخمی ہو گئے۔ حملہ آوروں نے کچھ لوگوں کو دروازہ پر مقابلہ کے لیے چھوڑا اور کچھ لوگ ایک انصاری پڑوسی کے مکان میں داخل ہو کر اور دیوار پھاند کے حضرت عثمانؓ کے گھر میں داخل ہو گئے ان لوگوں میں محمد بن ابی بکر اور دو آدمی اور تھے۔ حضرت عثمانؓ کے پاس آپ کی بیوی، اہل و عیال اور آپ کے آزاد کردہ غلام تھے جو لڑائی میں مشغول تھے۔ محمد بن ابی بکر نے آگے بڑھ کر آپ کی داڑھی پکڑلی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا: "اے محمد! اگر تیرا باپ اس وقت موجود ہوتا تو کبھی تیرے اس فعل کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا۔"

اس نے شرمندہ ہو کر داڑھی چھوڑ دی اور وہاں سے نکل کر اپنے گھر چلا گیا۔ محمد بن ابی بکر کے بعد وہ دونوں آدمی آپ کے پاس پہنچے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آپؓ کے سامنے اس وقت قرآن شریف رکھا ہوا تھا اور آپ اس کی تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عثمانؓ کی بیوی چیخنے چلانے لگیں کہ امیرالمومنین شہید کر دیے گئے۔

جب یہ آواز دروازہ پر ان لوگوں کو پہنچی جو فتنہ پردازوں کا مقابلہ کر رہے تھے تو وہ اندر بھاگے اور آ کر دیکھا کہ آپ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ جب صحابہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ بے تحاشہ آپ کے گھر کی طرف بھاگے۔ حضرت علیؓ نے گھر میں آ کر اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ:

"جب تم دروازہ پر تھے تو لوگوں کو امیرالمومنین کے شہید کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

اور آگے بڑھ کر حسنؓ کو ایک طمانچہ مارا اور حسینؓ کو بھی[2]۔ محمد بن طلحہ اور عبداللہ بن زبیر کو بھی بُرا بھلا کہا۔ حضرت علیؓ نے آپ کی بیوی حضرت نائلہ سے پُوچھا:

"آپ تو ان کے پاس ہی تھیں ان لوگوں میں سے کس نے انھیں شہید کیا؟"

انہوں نے کہا: "دو آدمی آپ کے پاس آئے تھے انہوں نے ہی یہ کام کیا۔" اور ساتھ ہی محمد بن ابی بکر کا واقعہ بھی بیان کیا اس پر

[1] ان واقعات کی روشنی میں صحابہؓ پر یہ الزام کس قدر غلط ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کی مدد سے دست کش ہو گئے تھے۔ انسان اپنے آپ خطرہ میں پڑنا گوارا کر لیتا ہے مگر یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی اولاد کو کسی طرح کی تکلیف پہنچے۔ ان بزرگوں کے اپنے جگر گوشوں کو موت کے منہ میں دھکیل دینے سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ جن پر ناسمجھ اور کم سواد مصنف حضرت عثمانؓ سے رنجش کے الزامات لگاتے ہیں درحقیقت خلافت اور خلیفہ کے نہایت درجہ جاں نثار تھے۔

[2] اللہ اللہ! اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ عثمانؓ کا مخالف تھا اور ان سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ (مترجم)

حضرت علیؓ نے متعجب ہوئے بغیر کہا:

"میں اس کو قتل کرنے گیا تھا لیکن اس کی باتیں سن کر میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ باقی دو آدمیوں کا مجھے پتا نہیں۔ خدا کی قسم حضرت عثمانؓ کی شہادت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور وہ میری بے خبری میں شہید کر دیے گئے۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ آپ کے گھر میں بنی امیہ کے اٹھارہ اور آدمی بھی قتل کیے گئے تھے۔

آپ کی شہادت سے متاثر ہو کر حضرت حسانؓ بن ثابت نے کئی پُر درد مرثیے لکھے جن میں حضرت عثمانؓ کی شہادت پر اظہار رنج و الم کرنے کے علاوہ ان لوگوں کے رویہ پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا جنھوں نے اس نازک وقت میں حضرت عثمانؓ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا، اور بے فکر ہو کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ ان مراثی میں سے چند کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"حضرت عثمانؓ کو انصار نے آپ کی موت کے قریب ذلیل و خوار کیا۔

حالانکہ انصار آپ کی دوستی اور محبت کا دم بھرتے تھے۔

آپ کو بلوائیوں میں تنہا مصیبت و بلا کے حوالے کر دیا گیا جو تمام اہل شہر کے لیے نہایت درجہ باعثِ ننگ ہے۔

اس وقت اہل حیا کہاں چلے گئے تھے جب آپ پر پانی بند کیا گیا؟

زبیرؓ اور طلحہؓ کی طرف سے کون عذر کر سکتا ہے؟

پھر محمد بن ابی بکر اور ان کے پیچھے عمار اعلانیہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچ گئے۔

اور حضرت علیؓ اپنے گھر میں بیٹھ کر صرف لوگوں سے حال دریافت کرتے رہے۔"[1]

ایک اور مرثیہ میں کہتے ہیں:

"جو موت کا طالب ہو اور موت اس کو محبوب ہو وہ حضرت عثمانؓ کے دروازے پر آ کر دیکھ لے۔

اگر تم بروزِ شہادت خلیفۃ اللہ کی عزت اور مرتبہ پر نظر کرتے تو کیوں ایسے بُرے کام میں مشغول ہوتے؟

---

[1] ان مرثیوں میں جنھیں حضرت حسانؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے انصار، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ پر حضرت عثمانؓ کی مدد نہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے حالانکہ انصار نے باغیوں کے حملہ کے وقت حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر عرض کیا تھا کہ وہ انھیں مقابلہ کرنے اور باغیوں سے لڑنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے مسلمانوں میں خونریزی ہو۔ مجبور ہو کر صحابہ واپس چلے گئے۔ اگر ان کو اجازت مل جاتی تو وہ ضرور آپ کے ساتھ ہو کر باغیوں سے لڑتے۔ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ نے باوجود حضرت عثمانؓ کے منع کرنے کے اپنے بیٹوں کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ کے دروازہ پر بھیج دیا۔ اس صورت میں انصار اور حضرات طلحہؓ، زبیرؓ و علیؓ پر کس طرح کوئی الزام آ سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کسی نے یہ اشعار کہہ کر حضرت حسانؓ کی طرف منسوب کر دیے ہیں جس طرح "نہج البلاغہ" میں حضرت علیؓ کی طرف کئی اقوال منسوب کر دئے گئے ہیں لیکن دراصل وہ ان کے نہیں۔ حضرت حسانؓ سب باتیں دیکھتے ہوئے ایسے اشعار کبھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ (مترجم)

عثمانؓ بڑے استقلال اور پورے صبر سے کام لیتے ہوئے مقتول ہوئے۔
میری ماں اور اس کی تمام اولاد آپ پر سے قربان ہو۔
کیا ہم اہلِ شام اور ان کے امیر سے ان کی غفلت پر کبھی راضی ہو سکتے ہیں!
باوجودیکہ وہ خیر خواہ تھے مگر آپ کی مدد کو نہ آسکے۔
میں تو ضرور ان لوگوں کو الزام دوں گا جب تک زندہ ہوں اور میرا نام حسان ہے۔
اگرچہ وہ لوگ غائب ہوں یا حاضر، بہت جلد اپنے ملکوں میں سُن لیں گے۔ اللہ اکبر!
اے قاتلینِ عثمانؓ! جس شخص کے سر پر سفید بال (یعنی اسلام میں عمر گزاری اور بوڑھے ہوئے) اور پیشانی پر سجدے کے نشان تھے اور راتیں تسبیح و تہلیل اور تلاوتِ قرآن میں گزارتا تھا افسوس تم نے ایسے بزرگ شخص کو قربانی بنا کر ذبح کر ڈالا۔"

پھر مفسدین کے سرکردہ آدمیوں اور لشکروں کے ان لوگوں کی جنہوں نے مدینہ میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ اس طرح ہجو بیان کرتے ہیں:

"تم نے کفار اور دشمنانِ خدا کی لڑائی اور جہاد ترک کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کے پاس ہم سے لڑے۔
تم نے یہ بُری راہ اختیار کی اور مسلمانوں کے طریقہ کو چھوڑ دیا اور یہ بُرا کام تو بدکار اور عمداً امرِ بد کے مرتکب ہونے والا کا ہے۔
اصحابِ رسولِ خدا بروزِ شہادت قربانیوں کی طرح مسجد کے دروازہ پر مذبوح پڑے تھے۔
میں ابو عمرو (حضرت عثمانؓ) کی مصیبت پر روتا ہوں جو بقیع غرقد[1] میں ابدی نیند سوئے پڑے ہیں۔"

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ شہید کیے گئے تو حضرت علیؓ مسجد میں تھے۔ چنانچہ ابن عبدالبر ابو جعفر انصاری سے روایت کرتا ہے:

"میں مصریوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے مکان میں گیا تھا۔ جب انہوں نے آپ پر حملہ کیا تو میں دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہوا، وہاں ایک گوشہ میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کے سر پر سیاہ عمامہ تھا۔ وہ مجھے اس طرح ہانپتا کانپتا ہوا دیکھ کر بولا کہ کیوں ایسے بدحواس ہو رہے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا گیا۔ اس شخص نے کہا: "تم پر قیامت تک لعنت پڑتی رہے گی۔" میں نے غور سے دیکھا تو وہ حضرت علیؓ تھے۔"

حضرت عثمانؓ کی مدتِ خلافت بارہ دن کم بارہ سال تھی۔ آپ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں پچھتر سال تھی اور بعض کا خیال ہے نوے سال تھی۔

---

[1] بقیع غرقد وہ مقام ہے جہاں حضرت عثمانؓ کا مزار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو تین دن تک دفن نہیں کیا جا سکا۔ آخر تیسرے روز حکیم بن حزام قریشی اور جبیر بن مطعم نے اس بارہ میں حضرت علیؓ سے بات چیت کی۔ جب فسادیوں نے یہ سُنا تو وہ راستہ میں پتھر لے کر بیٹھ گئے۔ آخر چند لوگوں کی مدد سے جن میں زبیرؓ، حسنؓ، ابوالجہم بن حذیفہ اور مروان تھے۔ حضرت عثمانؓ کے جنازہ کو رات کے وقت جنت البقیع سے باہر حش کوکب میں لایا گیا اور نمازِ جنازہ کے بعد آپ کے جسم کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جب معاویہ کا زمانہ آیا تو یہ جگہ جنۃ البقیع میں شامل کر دی گئی اور انہوں نے حکم دیا کہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی قبر کے ارد گرد دفن کیا جائے۔

حضرت نائلہ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کو خط لکھا جس میں بیان کیا کہ کس طرح باغی حضرت عثمانؓ کے گھر میں داخل ہوئے اور کس طرح ان کو شہید کیا۔ محمد بن ابی بکر نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کا بھی سارا حال لکھا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمانؓ کی پھٹی ہوئی خون آلود قمیص بھی بھیجی۔ اپنے بال بھی قمیص کے بٹنوں میں لگائے اور اپنی کٹی ہوئی انگلیاں بھی اسی کے ساتھ لٹکا دیں۔ یہ سب چیزیں انہوں نے نعمان بن بشیر انصاری کو دیں کہ وہ انہیں معاویہ کے حوالے کر دیں۔ نعمان شام جاتے ہوئے یزید بن اسید سے ملے جس کو حضرت معاویہ نے حضرت عثمانؓ کی مدد کے لیے چار ہزار آدمی دے کر بھیجا تھا۔ انہوں نے ان کو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سنائی جس کو سُن کر یہ لوگ شام لوٹ گئے۔ ان کے ساتھ ہی نعمان بن بشیر بھی حضرت معاویہ کو یہ چیزیں حوالے کرنے شام چلے گئے۔

حضرت عثمانؓ خوب صورت، گندم گوں، چوڑے چکلے شانوں والے تھے۔ آپ کے سر پر گھنے بال تھے اور داڑھی بھرواں اور طویل تھی۔

باقی رہا ہمارا اس فتنہ کے بارہ میں موقف تو اس کے متعلق حضرت انسؓ بن مالکؓ سے زیادہ بے نظیر فقرہ اور کسی نے استعمال نہیں کیا۔ جب آپ سے کسی نے کہا کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی تو آپ نے جواب دیا :

"تم جھوٹ بولتے ہو، خدا کی قسم ہمارے دل میں ان دونوں کی محبت مجتمع ہے۔"

اسی جملہ پر ہم اس داستانِ غم کو ختم کرتے ہیں۔

(۲۷)

جائے عبرت

جب ہم متذکرہ بالا حالات پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں شرم و ندامت سے نیچی ہو جاتی ہیں کہ مسلمانوں نے اس زمانہ میں فتوحات کو وسعت دینے، فتح و ظفر کا سلسلہ جاری رکھنے، اسلام کو پھیلانے اور اپنی تہذیب کے نقوش اُبھارنے کی بجائے اپنی قوتیں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور فتنے برپا کرنے میں ضائع کر دیں۔ یہ دیکھ کر اور زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ کے اسباب اب بھی اسی طرح کارفرما ہیں۔

ہماری اور ہمارے اسلاف کی حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا ہے۔ آج کے مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو قرونِ سابقہ کے مسلمانوں جیسا ہو۔ وہ اخلاق و اعمال میں بلند درجہ رکھتے تھے مگر ہم نہ اخلاق میں بہتر ہیں نہ اعمال میں۔ وہ دنیا بھر کے حاکم اور سردار تھے، ہم جگہ جگہ دھکے کھاتے پھر رہے ہیں اور ساری دنیا کی نظروں میں ذلیل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ایک عظیم الشان حکومت قائم کر کے دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ ایک جہان ہماری عملداری میں تھا۔ لیکن یہ عملداری اسی وقت تھی جب تک کہ عربوں اور مختلف قبائل اور خاندانوں میں کُلی طور پر اتحاد و اتفاق تھا۔ اور جب یہ اتحاد و اتفاق، افتراق و انشقاق میں تبدیل ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ وہ خود ہی تباہ ہوئے بلکہ اپنے ساتھ اس عظیم الشان اسلامی سلطنت اور اس جلیل القدر تہذیب و تمدن کو بھی مٹا کے رکھ دیا جس نے یورپ تک اپنی روشنی پھیلا دی تھی۔

عربوں کے افتراق کا یہ نتیجہ ہُوا کہ زمین و آسمان بدل گئے۔ ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹ کر بالآخر خاتمہ کے قریب پہنچ گئی اور فاتحینِ عالم کی اولاد اپنے ہی ملکوں، اپنے ہی شہروں میں ذلیل و خوار بن کر رہ گئی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ا۔ عربی مآخذ

(جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے)

نام کتاب	مؤلف	نام کتاب	مؤلف
۱۔ فتوح الشام	واقدی	۱۹۔ الکامل	مبرد
۲۔ سیرۃ النبویہ	ابنِ ہشام	۲۰۔ المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداء اسمٰعیل
۳۔ الطبقات الکبریٰ	ابنِ سعد	۲۱۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ	ابنِ حجر عسقلانی
۴۔ الامامۃ والسیاسۃ	ابنِ قتیبہ	۲۲۔ صحیح البخاری	بخاری
۵۔ المعارف	ابنِ قتیبہ	۲۳۔ تاریخ الخمیس	دیار بکری
۶۔ فتوح البلدان	بلاذری	۲۴۔ شرح نہج البلاغۃ	ابنِ ابی الحدید
۷۔ انساب الاشراف	بلاذری	۲۵۔ عمرو بن العاص	حسن ابراہیم حسن
۸۔ تاریخ الیعقوبی	احمد بن یعقوب	۲۶۔ فتوح مصر واعمالہا	ابنِ اسحاق
۹۔ تاریخ الامم والملوک	طبری	۲۷۔ وفیات الاعیان	ابنِ خلکان
۱۰۔ العقد الفرید للملک السعید	قرطبی	۲۸۔ الفخری	ابنِ طباطبا
۱۱۔ الاغانی	اصفہانی	۲۹۔ فتوح مصر	ابنِ عبدالحکم
۱۲۔ تاریخ ابنِ خلدون	ابنِ خلدون	۳۰۔ العقد الفرید	ابن عبدربہ
۱۳۔ انساب القرشیین	مقدسی	۳۱۔ مختصر تاریخ الدول	ابن العبری
۱۴۔ الاستیعاب	ابنِ عبدالبر	۳۲۔ المواعظ والاعتبار	مقریزی
۱۵۔ تاریخِ دمشق	ابنِ عساکر	۳۳۔ مروج الذہب	مسعودی
۱۶۔ معجم البلدان	یاقوت حموی	۳۴۔ الخلفاء الراشدون	عبدالوہاب النجار
۱۷۔ الکامل	ابنِ اثیر	۳۵۔ تاریخ الامم الاسلامیہ	محمد الخضری
۱۸۔ اسد الغابہ	ابنِ اثیر	۳۶۔ التمدن الاسلامی	جرجی زیدان

۳۷ - الاموال	ابن سلام	۴۹ - عہد المامون	رفاعی
۳۸ - کتاب الخراج	ابی یوسف	۵۰ - مسند حنبل	احمد بن حنبل
۳۹ - کتاب الخراج	یحییٰ بن آدم	۵۱ - الموطا	انس بن مالک
۴۰ - فتح العرب للشام	حداد	۵۲ - الملل والنحل	شہرستانی
۴۱ - الاخبار الطوال	دینوری	۵۳ - الفصل فی الملل والنحل	ابن حزم
۴۲ - تاریخ التشریع الاسلامی	خضری	۵۴ - الفرق بین الفرق	بغدادی
۴۳ - فجر الاسلام	احمد امین	۵۵ - رسائل اخوان الصفا	
۴۴ - حاضر العالم الاسلامی (مع ضمیمہ جات و حواشی)	امیر شکیب	۵۶ - انتصار	خیاط المعتزلی
۴۵ - خطط الشام	محمد کرد علی	۵۷ - عیون الاخبار	ابن قتیبہ
۴۶ - الادارۃ الاسلامیہ فی عز العرب	محمد کرد علی	۵۸ - الحیوان	جاحظ
۴۷ - البیان والتبیین	جاحظ	۵۹ - منہاج السنۃ	ابن تیمیہ
۴۸ - دیوان حسان بن ثابت	حسان بن ثابت	٭	٭

ب - انگریزی مآخذ

۱ - مختصر تاریخِ عرب	امیر علی	۸ - تاریخ التواریخ	مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی
۲ - فتح العرب والمصر	الفریڈ بٹلر	۹ - وجہۃ الاسلام	مختلف مصنفین
۳ - تاریخِ فارس	بنجمن	۱۰ - عروج وزوال سلطنتِ روما	گبن
۴ - تاریخِ شہنشاہیتِ قسطنطنیہ	اومان	۱۱ - التاریخ العالم	ولز
۵ - تاریخ العرب	جیلمان	۱۲ - المحمدیہ	مارگولیتھ
۶ - الخلافۃ تقدمہا وسقوطہا	سر ولیم میور	۱۳ - مقالاتِ مختلفہ	گب
۷ - تذکرہ دی غوبی	دی غوبی	۱۴ - انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا	

ج - فرانسیسی مآخذ

۱۔ الثلاثہ	لامنس	۱۲۔ رسائل و مقالاتِ مختلفہ	نولڈیکے
۲۔ تاریخِ شام	"	۱۳۔ " "	ہارٹمین
۳۔ معاویہ	"	۱۴۔ " "	فان کریمر
۴۔ یزید	"	۱۵۔ " "	سپرنگر
۵۔ تاریخ العرب	ہوار	۱۶۔ " "	سترک ہرونیہ
۶۔ الاسلام	ماسیہ	۱۷۔ " "	غروسہ
۷۔ الاسلام	مونتہ	۱۸۔ " "	ڈوزی
۸۔ تمدن العرب	لیبان	۱۹۔ " "	دینہ
۹۔ حیاتِ محمد	درمنغہام	۲۰۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ	
۱۰۔ عقیدۃ الاسلام و شریعۃ	گولڈسیہر	۲۱۔ دائرۃ المعارف الافرنسیہ	
۱۱۔ اولیات الاسلام	پرنس کیتانی	☆	

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا

آپ انھیں (صحابہ) دیکھیں گے کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں، کبھی سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ (الفتح : ۲۹)



حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ

(۱)

بیعتِ خلافت

مدینہ کی فضا پر ظلمت کے بادل چھا رہے تھے۔ اہلِ مدینہ اسلام کی شان و شوکت کی پرانی داستانیں اور عظیم الشان فتوحات بھول چکے تھے۔ ہر طرف یاس و نومیدی کا غلبہ تھا۔ مسلمانوں کی جمعیت جو کسی زمانے میں موتیوں کی طرح ایک لڑی میں پروئی ہوئی تھی اب منتشر ہو چکی تھی۔ مفسدہ پرداز عنصر نے بغاوت پھیلا کر فتنہ کو عروج پر پہنچا دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ دارالخلافہ میں شہید کیے جا چکے تھے۔ اب مسلمانوں کو اپنا مستقبل نہایت تاریک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ خلیفہ کی مدد سے کوتاہی کر کے اور باغیوں کو مدینہ پر غلبہ پانے کا موقع دے کر انہوں نے بڑی زبردست غلطی کی ہے۔ جب یہ خیال ان کے دل میں آتا تھا کہ خلیفہ کی لاش بیعتِ خلافت میں بے گور و کفن پڑی ہے اور کسی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ جائے اور غسل دے کر میت کو دفن کر سکے، تو ان پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

آخر وہ مسجدِ نبوی میں جمع ہوئے اور آئندہ ہونے والے خلیفہ کے بارے میں مشورہ کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کی رائے دی۔ چنانچہ وہ اکٹھے ہو کر حضرت علیؓ کے پاس آئے اور ان سے بیعت لینے کی درخواست کی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"خلیفہ مقرر کرنا تمہارا حق نہیں، اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا حق ہے۔ جس کو وہ پسند کریں وہی خلیفہ ہو سکتا ہے۔ ہم سب مل کر غور کریں گے اور پھر کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔"

حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ خلیفہ کے انتخاب میں کچھ دیر لگے۔ کیونکہ اس وقت زبردست فتنہ پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے باغی مدینہ میں موجود تھے اور من مانی کر رہے تھے۔ اس لیے آپ کی خواہش تھی کہ جوش و خروش ٹھنڈا ہو لے، فتنہ دب جائے اور غبار چھٹ جائے تو خلافت کے مسئلہ کو چھیڑا جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑ دیا گیا تو نئے خلیفہ کو سوائے پریشانیوں کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن باغی چاہتے تھے کہ خلافت کا فیصلہ فوراً ہو جائے، تاخیر ان کے لیے سخت خطرہ کا باعث تھی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک شخص نے کہا:

"حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر جلد ہی تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل جائے گی۔ جب مسلمان سنیں گے کہ خلیفہ کو اس طرح قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ابھی تک کوئی اور خلیفہ منتخب نہیں ہوا تو ہر شخص انتقام کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ اس صورت میں ہماری

خیر نہیں ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس چلو اور ہر قیمت پر اُن سے بیعت کر لو۔ اس طرح لوگ اطمینان اور سکون سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ حضرت علیؓ کے پاس پہنچے۔ اشتر جو باغیوں کا سردار تھا آپ کے پاس آیا اور کہا:

"اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔"

حضرت علیؓ نے کچھ تردد کیا لیکن اشتر نے کہا کہ:

"مصلحت اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آپ جلد از جلد بیعت لے لیں۔ کیونکہ جب یہ خبر اسلامی شہروں میں پہنچے گی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیے گئے اور ابھی تک کسی شخص کی بیعت نہیں کی گئی تو ہر عامل اپنی ولایت میں خود مختاری کا اعلان کر دے گا۔ اسلامی مملکت میں انتشار پھیل جائے گا اور اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔"

یہ سُن کر حضرت علیؓ نے بیعت لینے پر آمادگی ظاہر کر دی اور اشتر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بیعت کر لی۔ اس کے بعد یہ لوگ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے پاس گئے اور ان کو اپنے ساتھ لاتے ان دونوں نے آکر بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ کے خیال میں بھی ان دونوں کی بیعت ضروری تھی۔ کیونکہ یہ اہلِ شوریٰ میں سے تھے۔ ان کو خود بھی خلافت کی خواہش تھی اور باغیوں میں سے کچھ لوگ بھی ان کی تائید میں تھے۔

طبری نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی بیعت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ نے ان دونوں کو اپنی بیعت کے لیے بلایا تو شروع میں انہوں نے تردد کیا لیکن اشتر نے اپنی تلوار کھینچ لی اور حضرت طلحہؓ سے کہا:

"یا تو بیعت کر لو ورنہ ابھی تمہاری گردن مار دُوں گا۔"

اس پر انہوں نے اور حضرت زبیرؓ نے بیعت کر لی۔

چند انصار نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی جن میں حسانؓ بن ثابت، کعبؓ بن مالک، زیدؓ بن ثابت اور نعمان بن بشیر شامل تھے۔

بنو امیہ کے اکثر افراد شام کی طرف بھاگ گئے اور انہوں نے بھی بیعت نہیں کی۔

(۲)

علیؓ بن ابی طالب

مختصر حالات حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ آپ کے والد کا نام ابو طالب اور والدہ کا نام فاطمہ بنتِ اسد تھا۔ آپ ہجرت سے اکیس سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کی غربت کا خیال رکھتے ہوئے حضرت علیؓ کو اپنے گھر میں پرورش کیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو حضرت علیؓ آپ پر ایمان لانے والے اوّلین اشخاص میں سے تھے۔ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی

جانب ہجرت فرمائی، حضرت علیؓ خطرات کو جانتے بوجھتے حضورؐ کے بستر پر سو گئے اور اس طرح قربانی کی ایک بے نظیر مثال پیش کی۔
جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچ کر نکل گئے ہیں تو انہیں بڑا طیش آیا اور انہوں نے حضرت علیؓ کو قتل کر دینا چاہا۔ لیکن وُہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھی ہوئی امانتیں ان کے اصل مالکوں کو پہنچا کر خود بھی مدینہ تشریف لے آئے۔ مدینہ میں آپ کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے کر دی۔ حضرت علیؓ سوائے غزوہ تبوک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر جنگ میں شریک رہے۔ تمام غزوات میں آپ نے بے نظیر شجاعت، بہادری اور دلیری کا ثبوت دیا۔ دشمنوں کی صفوں میں بے دھڑک گھس جاتے تھے اور اس بے جگری سے حملہ کرتے تھے کہ مقابل کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑتی تھی۔

مسلمانوں میں خلافت کی ضرورت کا احساس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خلیفہ نامزد کیے بغیر ہی اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد لوگوں کو خلافت کی ضرورت کا احساس ہوا لیکن اس بارے میں ہر گروہ کی رائے الگ تھی۔ انصار چاہتے تھے کہ خلیفہ ہم میں سے ہو اور مہاجرین کہتے تھے خلافت ہمارا حق ہے۔

انصار کی دلیل یہ تھی کہ انہوں نے ہر موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مدد کی ہے۔ وُہ ہر جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش لڑتے رہے ہیں یہاں تک کہ سارا عرب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع ہو گیا۔ آپ اس دُنیا سے رخصت ہوتے وقت انصار سے بے حد خوش تھے۔

انصار کے مقابلہ پر مہاجرین کی دلیل یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان پر بھی مظالم توڑے گئے لیکن انہوں نے ہر تکلیف پر صبر اختیار کیا۔ وُہ اپنی قلتِ تعداد کے باوجود کبھی کفار سے مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قوم اور ہم خاندان ہیں۔ وہ قریش میں سے ہیں اور عرب ان کے سوا اور کسی کے آگے سر نہیں جھکائیں گے اس لیے خلافت انہی کا حق ہے۔

ان دلائل کو سُن کر جب انصار نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے، تو مہاجرین نے اس تجویز کو سختی سے ٹھکرا دیا۔ قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آتیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ گئے اور دونوں فریق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر راضی ہو گئے۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت ہو چکی تو حضرت علیؓ نے جو اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے، بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ،

"خلافت صرف اہلِ بیت کا حق ہے۔ بنی ہاشم کا خاندان ابوبکرؓ کے خاندان سے زیادہ معزز ہے اور عرب بھی بنو ہاشم ہی کے مطیع ہو سکتے ہیں۔ اگر انصار کے سامنے مہاجرین اپنی خلافت کے لیے یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں تو اس صورت میں آلِ نبی دوسروں سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں اور ان سے خلافت چھیننا بہت بڑا

ظلم ہے۔"

خلافت کے بارے میں شیعوں کا نظریہ

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان فتوحات میں مشغول تھے اس لیے کسی کو خلافت کے بارے میں غور کرنے کا خیال ہی پیدا نہیں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مسلمان اندرونی مناقشات میں مبتلا ہو گئے۔ آپؓ کی شہادت کے بعد جب زمامِ خلافت حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی تو آپ کے حامیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے یہ کہنا شروع کیا کہ امامت مصالح عامہ میں سے نہیں ہے جس کو امت کی صوابدید کے لیے اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ مسلمانوں کی جماعتوں کو خلیفہ کے انتخاب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ امامت دین کا ایک رُکن اور اسلام کا ایک ستون ہے۔ نبی اس سے غفلت نہیں برت سکتا اور امت کے سپرد یہ معاملہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود امام کی تعیین کرے۔ امام چھوٹے بڑے ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ وہ امام ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہے۔"

اس نظریہ کے حاملین اپنی دلیل میں کئی احادیث بھی پیش کرتے ہیں۔ اسی نظریہ سے وصیت کا نظریہ بھی پیدا ہوا اور حضرت علیؓ کا لقب "وصی" قرار دیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے وصیت کی تھی اس لیے حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔

اسی نظریہ کے تحت حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ کے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ کی بیعت کی گئی۔ جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہونے کا ارادہ کیا تو اسی نظریہ کے پیشِ نظر حضرت امام حسینؓ اپنے بڑے بھائی پر ناراض ہوئے۔ آخر یہی نظریہ حضرت امام حسینؓ کے یزید کی بیعت سے انکار کرنے اور مسلمانانِ عراق کو اپنی بیعت اور تائید و نصرت کے لیے بلانے کا موجب ثابت ہوا۔

خلفاءِ ثلاثہ کی نظروں میں حضرت علیؓ کا مقام

ہمارا خیال ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی، آخری وقت میں حضرت علیؓ ہی کی خلافت کے لیے سوچتے تھے اور جانتے تھے کہ علیؓ آپ کے بعد لوگوں کی راہ نمائی اسی طریق پر کریں گے جس طریق پر حضرت ابُوبکرؓ اور وہ خود کر چکے تھے۔ آپ نے حالتِ نزع میں اس امر کی طرف اشارہ کیا بھی تھا لیکن حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کرنا آپ نے پسند نہیں فرمایا بلکہ خلافت کے معاملہ کو چھ آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ آپ کا غالب گمان یہی تھا کہ قوم حضرت علیؓ ہی کو خلافت کے لیے منتخب کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے حق میں قوم کا اتفاق ہو گیا۔

تینوں خلفاؓ کے عہد میں حضرت علیؓ ان سے بے حد قریب تھے اور تینوں کو ان پر بے حد اعتماد تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ آپ کے خاص مشیروں میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ ہر اہم معاملہ میں ان سے مشورہ لیتے اور احکامِ شرعیہ میں ان سے استفتاء فرماتے تھے۔ سلطنت کے کاموں میں حضرت علیؓ پوری طرح دخیل تھے۔ آپ کے مشوروں کی قدر کی جاتی تھی۔ آپ کی رائے بڑے غور سے سُنی جاتی اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں بھی حضرت علیؓ امورِ سلطنت میں اسی طرح

دخیل رہے جس طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھے لیکن جب حضرت عثمانؓ نے بنی امیہ کو مناصب جلیلہ سے نوازنا شروع کیا تو حضرت علیؓ نے اس بات کو ناپسند فرمایا اور اس کے بعد اس دلچسپی سے ملکی معاملات میں حصّہ نہیں لیا جس طرح پہلے لیتے تھے۔

قریش کی مخالفت یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قریش حضرت علیؓ کی حکومت و خلافت کو ناپسند کرتے تھے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی حضرت علیؓ سے قریش کی مخالفت کا علم تھا اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے خلافت کا مسئلہ مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دیا۔ اگر قریش کی مخالفت کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ اپنی زندگی ہی میں حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کر جاتے کیونکہ حضرت علیؓ دوسروں کے مقابلہ میں خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔

(۳)

قاتل کون ہے؟

قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام کا مطالبہ اور حضرت علیؓ کا جواب بیعتِ خلافت کے بعد حضرت علیؓ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"اللہ عزّ وجلّ نے ہماری ہدایت کے لیے ایک کتاب اتاری جس میں خیر اور شر سب کچھ مذکور ہے۔ شر کو چھوڑ دو تم پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں وہ ادا کرو، تمہیں جنّت ملے گی۔ خدا تعالیٰ نے زمینِ حرم کو محترم قرار دیا ہے اور مسلمان کی جان کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کو اخلاص و اتحاد کی بڑی تاکید کی ہے۔ مسلمان وُہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ بجز اس صورت کے کہ کسی پر کوئی شرعی حق واجب ہو مسلمان کو دُکھ دینا جائز نہیں ہے سوائے اس کے کہ قانوناً اسے سزا دی جائے۔ خدا کے بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ قیامت کے روز زمینوں اور مویشیوں کے متعلق بھی تم سے باز پرس کی جائے گی۔ اللہ عزّ وجلّ کی اطاعت کرو اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو۔ جہاں کہیں کوئی بھلائی کی بات دیکھو اسے قبول کرو اور جہاں بدی نظر آئے اس سے پرہیز کرو۔ اس زمانہ کو یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے اور کمزور تھے۔"

اس خطبہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ رعایا کا ہر شخص دوسروں سے قطع نظر کر کے صرف اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ لوگ فتنہ سے نبٹنے اور حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کی باتیں چھوڑ دیں۔ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے انتشار اور اختلاف پھیلے۔ دنیا کی حرص و آرزو ترک کر کے خالصۃً خدا تعالیٰ کے ہو جائیں۔ جو کچھ خلیفہ حکم دے اس کو بجا لائیں اور جس چیز سے وُہ منع کرے اس سے باز آ جائیں۔

لیکن آپ لوگوں سے ایک امرِ محال کی توقع فرما رہے تھے۔ اُن سے اس چیز کا مطالبہ کر رہے تھے جس کا دینا ان کی

طاقت سے باہر تھا۔ مسلمانوں کو زبردست فتوحات کے نتیجہ میں دنیا ہاتھ آگئی تھی اور اُسے وہ اس وقت تک چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے جب تک کہ وہ خود ان کو نہ چھوڑ دے۔ وہ سیاست کے جھمیلوں سے بھی باز آنے والے نہ تھے۔ اس طرح حضرت علیؓ کا دورِ خلافت ایک عجیب دور ہے۔ حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں لیکن وہ سراسر دنیا کی طرف جھکے جا رہے تھے اور دھڑے بندیاں قائم ہو رہی تھیں۔

جاہلی عصبیت پھر سر اٹھا رہی تھی۔ مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ہر گروہ طاقت اور حکومت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور دوسری طرف بنو امیہ، جن کے دل میں اس اقتدار کی خواہش رہ رہ کے چٹکیاں لے رہی تھی جو اسلام کے بعد اُن سے چھن گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کو وسیلہ اور سبب بنایا اور حضرت علیؓ سے آپ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگے۔

لیکن حضرت علیؓ کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ کسی شخص کو بھی یقینی طور پر حضرت عثمانؓ کے اصلی قاتل کا پتا نہ تھا۔ آپ پر کئی اشخاص نے حملہ کیا۔ جب آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہؓ سے آپ کے قاتل کے متعلق پُوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

"مجھے معلوم نہیں، کئی آدمی گھر میں داخل ہُوئے جن کو میں نہیں جانتی، البتہ ان کے ساتھ محمد بن ابوبکرؓ تھا۔"

محمد بن ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کے پاس آنے کے واقعہ سے انکار نہیں کیا لیکن اس نے قتل میں شرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے بتلایا کہ جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا اور آپ کی داڑھی پکڑ کر کھینچی تو حضرت عثمانؓ نے یہ کہا کہ اگر تیرا باپ اس وقت زندہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اس پر وہ شرمندہ ہو کر لوٹ آیا۔

قاتل کے متعلق یہ یقینی بات ہے کہ وہ کوئی فردِ واحد نہیں تھا۔ یہ بھی بہت حد تک ممکن ہے کہ خود باغیوں ہی کو اس وقت قاتلوں کے نام کا پتا نہ ہو۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مدت گزر جانے کے بعد کسی شخص نے یہ اعتراف کر لیا ہو کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھا، جس کی وجہ سے مورخین نے اس کا نام قاتلینِ عثمانؓ کے زمرہ میں درج کر لیا۔ مزید برآں مفسدین تمام شہر پر قابض تھے، وہ کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ اُن کی نظروں کے سامنے اُن سے انتقام لینے کے منصوبے باندھے جائیں۔

چنانچہ جب حضرت علیؓ کی بیعت ہو چکی اور حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور کچھ اور صحابہؓ آپ کے پاس آئے اور قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لینے کا مطالبہ کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"جو کچھ آپ لوگ چاہتے ہیں میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن میں ایسے لوگوں کے خلاف اس وقت کس طرح کارروائی کر سکتا ہُوں جنہوں نے سارے مدینہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جو ظلم آپ پر چاہتے ہیں توڑتے ہیں۔ آپ لوگ خود ہی بتائیں کہ کیا اس صورت میں ان سے کسی طرح قصاص لیا جا سکتا ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"میں بھی قصاص لینے کے معاملہ میں آپ سے متفق ہُوں لیکن اس کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت شورش پھیلی ہوئی ہے حالات سازگار ہو جائیں اور امرِ خلافت مستحکم ہو جائے تب میں ضرور قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام لوں گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ جواب نہایت معقول اور مدلل تھا۔ اول تو ٹھیک طور پر یہی معلوم نہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کا قاتل کون ہے! لیکن اگر پتا لگ بھی جاتا تب بھی اس سے قصاص لینا یا ان مفسدین کے خلاف کوئی کارروائی کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس وقت مفسدین اپنی من مانی کر رہے تھے اور ان کے سامنے کسی کو چوں و چرا کرنے کا حق نہ تھا۔ اس صورت میں حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قاتل سے قصاص لینا چاہتے بھی تو یہ مفسدین شمشیر بدست آپ کے مقابلہ میں آجاتے۔ اس کے نتیجہ میں اتنا فتنۂ عظیم برپا ہوتا اور اس قدر قتل و غارت ہوتا کہ اس کے سامنے لوگ حضرت عثمانؓ کی شہادت بھی بھول جاتے۔

(۴)

مملکت میں اختلافات

عہدِ عثمانی کے عمال کی برطرفی

حضرت علیؓ نے خلافت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ عہدِ عثمانی کے تمام عمال کو معزول کر دیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ کا فوراً ہی ان عمال کو معزول کر دینا ایک زبردست غلطی تھی۔ سیاست ملکی کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو اس وقت تک اپنے عہدوں پر برقرار رکھا جاتا جب تک وہ آپ کی بیعت نہ کر لیتے۔ جب تمام عمال آپ کے مطیع ہو جاتے تب آپ جس کو چاہتے معزول کرتے اور جس کو چاہتے معزول شدہ عامل کی جگہ نیا عامل بناتے۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حضرت علیؓ جس وقت خلیفہ بنے ہیں، باغی مدینہ پر مسلط تھے اور مدینہ والے ان کے سامنے زبان تک نہ ہلا سکتے تھے۔ ان باغیوں کا حضرت عثمانؓ سے بڑا مطالبہ یہی تھا کہ آپ اپنے عمال کو برطرف کر دیجئے، اور جب ان کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو بڑھتے بڑھتے فتنہ نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ اب ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ان سے مطالبہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کے تمام عمال کو برطرف اور ان کے تمام مددگاروں کو امورِ سلطنت سے بے دخل کر دیجئے۔ اگر حضرت علیؓ ان کے اس مطالبہ کو نظرانداز کر دیتے اور عہدِ عثمانی کے عمال کو اپنے اپنے علاقوں میں برقرار رہنے دیتے تو یہ مفسدین حضرت علیؓ سے بھی وہی سلوک کرتے جو اس سے پہلے انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کیا تھا پھر ذاتی طور پر حضرت علیؓ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان عمال کو برقرار رکھا جائے۔

جب حضرت علیؓ نے عہدِ عثمانی کے عمال کو معزول کرنے کا ارادہ کیا تو مغیرہؓ بن شعبہ آپ کے پاس آئے اور کہا:

"عمال کو معزول کرنے میں جلدی نہ کیجئے بلکہ فی الحال معاویہؓ، ابنِ عامرؓ اور دیگر عمال کو ان کی جگہوں پر برقرار رہنے دیجئے۔ جب وہ آپ کی اطاعت قبول کر لیں اور فوجوں کی بیعت کی خبر بھی آجائے تب آپ کو اختیار ہے خواہ ان کو معزول کر دیں یا بحال رکھیں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اچھا میں سوچوں گا۔"

دوسرے روز وہ پھر آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"میں نے کل آپ کو جو مشورہ دیا تھا آج اس کے خلاف دیتا ہوں۔ آپ عمّال میں جو ردّ و بدل کرنا چاہتے ہیں جس قدر جلد ممکن ہو کر دیجئے تاکہ آپ کو ہر طرف سے اطمینان ہو جائے۔"

ابھی مغیرہؓ بن شعبہ حضرت علیؓ سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ عبداللہؓ بن عباسؓ مکہ سے مدینہ پہنچے۔ حضرت علیؓ کے مکان پر جا کر پتا چلا کہ مغیرہؓ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ وُہ ان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب مغیرہؓ باتیں کر کے باہر نکلے تو عبداللہؓ حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور پُوچھا کہ:

"مغیرہ کیوں آئے تھے؟"

حضرت علیؓ نے سارا واقعہ سُنایا۔ انہوں نے کہا:

"مغیرہ نے کل آپ کو نصیحت کی تھی لیکن آج آپ کو دھوکا دیا۔"

حضرت علیؓ نے پُوچھا:

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کل انہوں نے مجھے نصیحت کی اور آج دھوکا دیا؟"

عبداللہؓ بن عباس نے جواب دیا:

"آپ جانتے ہیں کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی دنیا دار ہیں۔ اگر آپ اُن کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھیں گے تو انہیں اس امر کی کوئی پروا نہیں ہوگی کہ کون شخص خلافت کی گدی پر متمکن ہوا۔ لیکن اگر آپ انہیں معزول کر دیں گے تو وُہ جھٹ کہہ دیں گے کہ خلافت کا معاملہ بغیر شوریٰ کے آپس ہی میں طے کر لیا گیا اس لیے علیؓ کی خلافت جائز نہیں۔ وہ آپ پر یہ الزام لگائیں گے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے میں حصہ لیا۔ اس طرح ایک فتنہ برپا ہو جائے گا اور اہلِ شام و عراق آپ کے خلاف ہو جائیں گے مجھے طلحہؓ اور زبیرؓ کی طرف سے بھی اندیشہ ہے کہ کہیں یہ آپ کے خلاف نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔"

حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"ایک دُنیا دار تو یہ کر سکتا ہے کہ بربنائے مصلحت ان عمّال کو برقرار رہنے دے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اُن میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہیں رکھوں گا۔ اگر وہ میرے احکام کی اطاعت کریں گے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوگا ورنہ پھر تلوار سے ان کا علاج کیا جائے گا۔"

حضرت ابنِ عباسؓ نے دوبارہ حضرت علیؓ کو سمجھایا اور کہا:

"اگر ایسا کیا گیا تو سارا عرب آپ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا اور آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ عمّال آپ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے اور انتقامِ عثمانؓ کے مطالبے کے بہانے آپ کے مقابلہ پر کھڑے ہو جائیں گے۔"

لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ قبول نہ کیا بلکہ فرمایا:

"تم شام جاؤ، میں نے تمہیں وہاں کا والی مقرر کر دیا ہے۔"

حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا:

"آپ جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک نہیں ہے۔ معاویہؓ بنی امیہ کے ایک فرد، حضرت عثمانؓ کے چچازاد بھائی اور شام کے عامل ہیں۔ ان کو زبردست طاقت حاصل ہے۔ اگر میں وہاں گیا تو وہ حضرت عثمانؓ کے بدلہ میں میری گردن اڑا دیں گے۔ نرم سے نرم سلوک اگر انہوں نے میرے ساتھ کیا تو وُہ یہ ہوگا کہ مجھے قید کر دیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ پہلے ان کو بیعت کے لیے خط لکھیں۔"

نئے عمّال کا تقرر

لیکن حضرت علیؓ نے یہ منظور نہ کیا اور نئے عمّال کو ان کے مقرر کردہ علاقوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ عثمان بن حنیف کو بصرہ، عمارہ بن شہاب کو کوفہ، عبیداللہ بن عباس کو یمن، قیس بن سعد بن عبادہ کو مصر اور سہل بن حنیف کو شام کی طرف روانہ کیا۔

شام کے نئے عامل سہل بن حنیف جب تبوک کے مقام پر پہنچے تو انہیں حضرت معاویہؓ کے سواروں کا ایک دستہ ملا۔ انہوں نے ان سے پوچھا:

"تم کون ہو؟"

سہل نے جواب دیا:

"میں شام کا نیا امیر ہُوں۔"

ان سواروں نے کہا:

"اگر تمہیں حضرت عثمانؓ نے بھیجا ہے تب تو خیر، ورنہ جس نے تمہیں بھیجا ہے اسی کے پاس واپس چلے جاؤ۔"

سہل بن حنیف نے ان سے کہا:

"تمھیں پتا بھی ہے کہ مدینہ میں کیا کچھ ہو چکا ہے؟"

انہوں نے کہا:

"ہمیں سب کچھ پتا ہے۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم حضرت علیؓ کے پاس واپس چلے جاؤ۔"

چنانچہ مجبور ہو کر وہ واپس ہو گئے۔

مصر کے نئے عامل قیس بن سعد مصر روانہ ہُوئے۔ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ "ایلہ" کے مقام پر انہیں بھی سواروں کا ایک دستہ ملا جس نے اُن سے پُوچھا کہ وُہ کون ہیں؟

اُنہوں نے اس وقت ٹھیک ٹھیک حالات بتانے مناسب نہ سمجھے اور یہ کہا کہ میں قاتلینِ عثمانؓ میں سے ہوں اور پناہ کا طالب ہوں۔

وہ سوار اُن کو لے کر مصر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اصل واقعہ بتایا؛ اس وقت وہاں تین گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے غیر مشروط طور پر ان کی امارت قبول کر لی۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ اگر حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لیا تو ہم ان کے ساتھ ہیں ورنہ ہمارا اور ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ ہم حضرت علیؓ کے ساتھ اس وقت تک ہیں جب تک کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام نہ لیں۔ کیونکہ قاتلینِ عثمانؓ ہمارے عزیز ہیں۔

قیس نے یہ تمام حالات حضرت علیؓ کو لکھ بھیجے۔

عثمان بن حنیف کو جو بصرہ کے والی مقرر کیے گئے تھے، کسی نے نہیں روکا اور وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ مصر کی طرح یہاں بھی تین جماعتیں بن گئیں:

ایک جماعت نے غیر مشروط طور پر ان کی امارت قبول کر لی۔
ایک جماعت قاتلینِ عثمانؓ کی ہمدردی کا دم بھرنے لگی۔
تیسری جماعت نے کہا:

"ہماری نظریں اہلِ مدینہ پر ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کریں گے وہی ہم بھی کریں گے۔"

کوفہ کے نئے والی عمارہ بن شہاب جب کوفہ کے قریب پہنچے تو انہیں طلیحہ بن خویلد اسدی ملا جو اس مطالبہ کا سرگرم حامی تھا کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس نے عمارہ سے کہا کہ:

"اہلِ کوفہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے سوا کسی کی امارت تسلیم نہ کریں گے، اس لیے بہتر ہے کہ مدینہ واپس چلے جاؤ ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔"

چنانچہ وہ کوفہ میں داخل نہ ہو سکے اور واپس مدینہ آگئے۔

عبیداللہ بن عباس یمن میں آئے۔ یہاں آکر انہیں پتا چلا کہ سابق امیر یعلیٰ بن امیہ بیت المال کی ساری رقم لے کر اُن کے آنے سے پہلے مکہ روانہ ہو چکے ہیں۔ عبیداللہ نے بغیر کسی مخالفت کے یمن کی امارت سنبھال لی۔

سہل بن حنیف شام سے مایوس ہو کر واپس مدینہ آچکے تھے۔ حضرت علیؓ نے حجاج بن غزیہ کے ہاتھ ایک خط حضرت معاویہؓ کو بھیجا جس میں انہیں بیعت کی دعوت دی۔ حضرت معاویہؓ نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے تین ماہ بعد انہوں نے بنی عبس کے ایک شخص کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔ اس نے آکر کہا:

"میں نے شام میں پچاس ہزار شیوخ کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ اُن کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہیں، انہوں نے حضرت عثمانؓ کی قمیص جس پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں، نیزوں پر اٹھا رکھی ہے اور قسم کھائی ہے کہ جب تک وہ قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام نہ لے لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔"

اس سے حضرت علیؓ کو پتا چل گیا کہ معاویہؓ ان کی خلافت کو کسی طرح بھی تسلیم نہ کریں گے اور بغیر اُن سے لڑے اُن پر قابو نہیں پایا جا سکے گا۔

(۵)

اضطراب

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے بیعت فسخ کرنے کے اسباب

بعض مورخین حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ کے بیعت توڑنے کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ بیعت کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو لکھا کہ لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ میرا ان کی شہادت میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اب باہمی مشورہ کے بعد مجھے خلافت سپرد کی گئی ہے اس لیے جب میرا یہ خط آپ کو ملے تو اہلِ شام سے میرے لیے بیعت لیجئے اور میرے پاس شام کے معزز لوگوں کا وفد بھیجئے۔

جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کا مذکورہ بالا خط ملا تو انہوں نے بنی عبس کے ایک شخص کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہوں نے اسی قاصد کو حضرت زبیرؓ بن العوام کے نام بھی ایک خط دیا جس میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

معاویہؓ بن ابی سفیان کی طرف سے امیرالمومنین عبداللہؓ الزبیر کے نام۔ بعد سلام کے واضح ہو کہ میں نے آپ کے لیے اہلِ شام سے بیعت لے لی ہے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے آپ کو امیرالمومنین مان لیا ہے۔ اب آپ کو چاہئے کہ کوفہ اور بصرہ والوں کو اپنے ساتھ ملائیں کیونکہ اگر ان دو شہروں کے لوگوں نے آپ کی اطاعت قبول کر لی تو آپ کے لیے راستہ بالکل صاف ہے۔ آپ کے بعد میں نے طلحہؓ بن عبیداللہ کے لیے بیعت لی ہے۔ اب آپ کو چاہیے کہ علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے انتقام کا مطالبہ کریں اور لوگوں کو اپنی طرف بلائیں۔ آپ دونوں کی طرف سے اس معاملہ میں پوری کوشش اور جلدی ہونی چاہیے۔ خدا تعالیٰ آپ دونوں کو کامیاب اور آپ کے دشمنوں کو خائب و خاسر کرے۔"

جب یہ خط حضرت زبیرؓ کے پاس پہنچا تو وہ بیحد خوش ہوئے اور طلحہؓ کو بھی یہ خط دکھایا۔ حضرت معاویہؓ نے جو کچھ انہیں لکھا تھا انہوں نے اس میں کسی قسم کا شک نہیں کیا اور معاویہؓ کی نصائح پر عمل کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے خلاف ہو گئے اور اپنی بیعتیں توڑ دیں[1]۔

ہمیں پورے طور پر اس خط کی صحت کا یقین نہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ معاویہؓ ان کو ایسا خط تحریر کریں جو بعد میں اُن کے خلاف بطور حجت استعمال کیا جا سکے۔ لیکن حضرت معاویہؓ سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کو حضرت علیؓ سے لڑنے کے لیے اکساتے

---

[1] شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۔۔

اور اپنی مدد کا یقین دلاتے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان دونوں حضرات نے حضرت علیؓ کی بیعت خوشی سے نہیں کی بلکہ بالجبر کی تھی اور ان دونوں کی تائید میں دو گروہ بھی تھے جو ان کی خلافت چاہتے تھے۔

بظاہر ان دونوں کے بیعت فسخ کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی جگہ کے والی بن جائیں۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ حضرت علیؓ انہیں بڑے بڑے صوبوں میں سے کسی صوبہ کا والی بنا دیں گے۔ لیکن جب انھیں اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے بیعت فسخ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ دونوں حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے :

"اے علیؓ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے آپ کی بیعت کس چیز پر کی تھی۔"

حضرت علیؓ نے جواب دیا :

"آپ نے بیعت اس چیز پر کی تھی کہ آپ میری اطاعت کریں گے جس طرح آپ نے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی اطاعت کی تھی۔"

ان دونوں نے کہا :

"نہیں، ہم نے بیعت اس بات پر کی تھی کہ آپ امورِ خلافت میں ہمیں بھی شریک کریں گے۔"

حضرت علیؓ نے ان کی اس بات کو سختی سے رد کر دیا جس پر یہ ناراض ہو کر آپ کے پاس سے چلے آئے۔[1]

جب حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو اس کا پتا چلا تو وہ حضرت علیؓ کے پاس آتے اور ان سے کہا :

"میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ولایت کے طالب ہیں۔ آپ زبیرؓ کو بصرہ کا والی مقرر کر دیجئے اور طلحہؓ کو کوفہ کا۔"

حضرت علیؓ ہنسے اور کہنے لگے :

"کیا میں عراقین میں ان جیسے آدمیوں کو والی مقرر کر سکتا ہوں جن سے وہاں کے لوگوں کو کسی بھلائی کی امید نہیں ہو سکتی۔ اگر میں کسی سے ڈر کر ہی اسے عامل مقرر کرتا تو معاویہؓ ہی کو شام کا عامل نہ بنا دیتا۔ میں نے ان دونوں کی بھلائی کے لیے ایک تدبیر سوچی تھی لیکن ان دونوں نے ولایت کے لالچ میں اس موقع کو بھی کھو دیا۔"[2]

اس کے بعد طلحہؓ اور زبیرؓ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے :

"امیر المومنین! ہم عمرہ کے لیے جا رہے ہیں۔ اگر آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔"

حضرت علیؓ نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور فرمایا :

"تمہارا اصل مقصد عمرہ کرنا نہیں ہے بلکہ مجھ سے غداری کرنا اور اپنی بیعت توڑنا ہے، جہاں تمہارا جی چاہے چلے جاؤ۔"

---

[1] ابن قتیبہ

[2] ابن ابی الحدید یہ کہتا ہے کہ وہ شخص جس نے حضرت علیؓ کو ان دونوں کو بصرہ اور کوفہ کی ولایت سپرد کرنے کا مشورہ دیا تھا وہ مغیرہؓ بن شعبہ تھے۔

چنانچہ وہ مدینہ سے چلے گئے۔[1]

شام پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں

جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلافات کی خبریں مدینہ میں پھیلیں تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ اب کیا ہوگا۔ حضرت معاویہؓ بڑی طاقت اور قوت کے مالک تھے۔ سارا شام ان کے زیرِ نگیں تھا۔ ایسے شخص کا دربارِ خلافت سے باغی ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لوگ حضرت علیؓ کے آئندہ اقدام کے منتظر تھے خصوصاً جب سے انہوں نے یہ سنا تھا کہ حضرت حسنؓ نے اپنے والد کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ان والیوں سے جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی کوئی تعرض نہ کریں اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں کیونکہ عرب ہزار چکر کھائیں گے پھر پھر کر آپ ہی کے پاس آئیں گے۔ اس وقت سے لوگوں کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا تھا کہ دیکھیے آئندہ کیا ظہور میں آتا ہے۔ آخر انہوں نے زیاد بن حنظلہ کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔

جب زیاد حضرت علیؓ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے کہا؛

---

[1] اس باب میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض اتہام ہے اور کسی مستند تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ باقی رہی ان دونوں کی حضرت علیؓ سے مخالفت، تو جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد بھی مدینہ میں امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ باغی مدینہ میں موجود تھے اور فتنہ و فساد کی کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ جاہل بدوی جو لوٹ مار کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے وہ بھی ان مفسدین کے ساتھ تھے۔ حضرت علیؓ نے کوشش کی کہ ان لوگوں کو مدینہ سے نکال دیا جائے لیکن انہیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ (تاریخ طبری ص ۳۰۸۱)

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ جو دونوں جلیل القدر صحابہؓ میں سے تھے پہلے تو انتظار کرتے رہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں اور فتنہ و فساد رفع ہو جائے لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور مدینہ اسی طرح ان مفسدین کی آماجگاہ بنا رہا۔ ان دونوں نے حضرت علیؓ سے شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لیا جائے لیکن حضرت علیؓ بھی مجبور تھے انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ آخر جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو وہ خود عملاً اس شورش کو رفع کرنے کے لیے مکہ روانہ ہو گئے تاکہ فوجوں کی امداد حاصل کر کے ان باغیوں کا قلع قمع کریں۔ حضرت عائشہؓ بھی مدینہ میں شورشوں کا حال سن کر مکہ میں مقیم تھیں۔ یہ دونوں اس شورش کو فرو کرنے کے سلسلہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان الفاظ میں مدینہ کی بدامنی کا نقشہ کھینچا: انا تحملنا بجليتنا هرابا من المدينة من غوغاء اعراب وفارقنا قوما حيارى لا يعرفون حقا ولا ينكرون باطلا ولا يمنعون انفسهم۔ (تاریخ طبری ص ۳۰۹۹)

یعنی ہم اعراب کے شور و شر کے خوف سے مدینہ سے بھاگ آئے ہیں۔ ہم نے وہاں ایسی حیران قوم کو چھوڑا ہے جو نہ حق کو پہچانتی ہے اور نہ باطل سے احتراز کرتی ہے اور نہ اپنی جانوں کی حفاظت کرتی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مشوروں کے بعد ایک لشکر تیار کیا گیا لیکن ایسا کرنے سے ان تینوں کا مقصد حضرت علیؓ سے بغاوت کرنا نہ تھا بلکہ محض اس شورش کو جو مفسدین کی فتنہ پردازی سے تمام عالمِ اسلام میں پھیل گئی تھی، رفع کرنا تھا۔

(مترجم)

"زیاد! تیاری کرو۔"

اس نے پوچھا:

"امیر المومنین! کس چیز کی تیاری؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"شام پر چڑھائی کرنے کی۔"

زیاد نے لوگوں کو آکر بتایا کہ جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔

حضرت علیؓ نے اسی وقت سے جنگی تیاری شروع کر دی۔ لشکر کو منظم کیا۔ اپنے بیٹے محمد الحنفیہؒ کو جھنڈا سپرد کیا۔ عبداللہؓ بن عباس کو میمنہ پر، عمر بن سفیان کو میسرہ پر اور ابولیلیٰ عمر بن الجراح کو مقدمہ پر مقرر کیا اور مدینہ میں اپنا قائم مقام قثم بن عباس کو بنایا۔

جب لشکر کی تنظیم ہو چکی تو آپ اہلِ مدینہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور انہیں خلافت کے باغیوں سے جنگ کرنے کے لیے چلنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا:

"اللہ عزوجل نے اپنے رسولؐ کو ایک ناطق کتاب کے ساتھ ہدایت دے کر اور ایک واضح اور قائم امر کے ساتھ بھیجا۔ جس سے کوئی شخص سوائے اس کے کہ اس کی قسمت میں ہلاکت ہو ہلاک نہیں ہوتا۔ مبتدعات اور شبہات انسان کو ہلاک کرنے والے ہیں سوائے اس شخص کے جس کو اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ تم اس کے خلیفہ کے احکام کی اطاعت بلا چون وچرا کرو۔ خدا کی قسم اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسلام کے غلبہ کو تم سے دور کر دے گا اور پھر کبھی تمہیں وُہ غلبہ نصیب نہ ہوگا۔ ایسی قوم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ جو تمہارے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتی ہے۔ شاید تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس فساد کو جو آفاقیوں نے ڈال دیا ہے، دور کر دے۔"

حضرت عائشہؓ کی بصرہ کو روانگی

ابھی حضرت علیؓ مدینہ سے شام کی طرف خروج کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عائشہؓ نے قصاصِ عثمانؓ کے نام پر مکہ میں ایک فوج جمع کر لی ہے۔ آپ نے اس تمام صورتِ حال سے اہلِ مدینہ کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ جب تک وہ لوگ مدینہ پر حملہ نہیں کریں گے ہم خاموش رہیں گے اور ان لوگوں سے تعرض نہیں کریں گے۔ اگر ان لوگوں نے ہم سے لڑائی نہ چھیڑی تو ہم بھی ان سے لڑائی نہیں چھیڑیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ کا لشکر بصرہ کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔ اس پر آپ بھی اپنے لشکر کو ہمراہ لے کر ان کی طرف چلے۔ آپ کو حضرت عائشہؓ کی لشکر کشی کا بے حد رنج تھا۔ آپ فرماتے تھے:

"اگر ان لوگوں نے ہم سے لڑائی چھیڑ دی تو مسلمانوں کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔"

جب اہلِ مدینہ کو معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے انتقام کے لیے نکلی ہیں تو ان میں سے اکثر نے حضرت علیؓ کے ساتھ جانے سے معذوری ظاہر کی۔ ان کا کہنا تھا:

"ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں، کیونکہ معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے۔ ایک جانب امیر المومنین ہیں اور ایک جانب اُمّ المومنین۔ ہم اس وقت تک مدینہ ہی میں مقیم رہیں گے جب تک حالات کھل کر ہمارے سامنے نہیں آ جائیں گے"۔

اس طرح حضرت علیؓ اہلِ مدینہ میں سے بہت کم لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر سکے۔ اہلِ بدر میں سے صرف چھ آدمی آپ کے ساتھ تھے۔

ان حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو اپنی خلافت کے اوائل ہی میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر طرف سے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ فلاں قبیلہ نے بیعت سے انکار کر دیا، فلاں عامل نے بیعت سے انکار کر دیا۔ کوفہ اور بصرہ میں مختلف جماعتیں بن گئی تھیں۔ بعض جماعتیں حضرت علیؓ کی اطاعت پر راضی تھیں۔ بعض سرے سے آپ کی خلافت کو قبول کرنے ہی سے منکر تھیں۔ دوسری جگہوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس لیے کوئی بعید نہیں کہ حضرت علیؓ کی اطاعت اور آپ کو خلیفہ ماننے کے سوال پر سلطنت کے ہر حصہ میں جو اختلافات پیدا ہو رہے تھے ان کی موجودگی میں اہلِ مدینہ نے حضرت علیؓ کی اس وقت تک مدد کرنے سے انکار کر دیا ہو جب تک حالات کُلّی طور پر حضرت علیؓ کے حق میں ساز گار نہیں ہو جاتے۔

(۶)

بصرہ کی جانب کوچ

حضرتِ طلحہؓ اور زبیرؓ کا مکہ پہنچنا حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچے اور وہاں جا کر اعلان کر دیا کہ ہم سے حضرت علیؓ کی بیعت بجبراً کرائی گئی تھی اس لیے ہم نے ان کی بیعت توڑ دی ہے۔

گو ہم حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے موقف پر تنقید کرنا تو نہیں چاہتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ان دونوں نے جو کچھ کیا اس سے اسلام کو بے حد نقصان پہنچا اور وحدتِ اُمت پارہ پارہ ہو گئی۔ اگر یہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہ کر دین کی خدمت کرتے تو اسلام ایک زبردست فتنہ سے بچ جاتا، دُوسرے شہروں کو خلیفہ کے مقابلہ میں بغاوت کی جرأت نہ ہوتی اور اس طرح مسلمانوں کے درمیان آپس میں تلوار نہ چلتی۔ وہ ایسا نہ کرتے تو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے اسلام کو جو زبردست نقصان پہنچا تھا اس کی کافی حد تک تلافی ہو جاتی اور مسلمان پھر وہی شان و شوکت حاصل کر لیتے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔

حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کے لیے حضرت عائشہؓ کا اہلِ مکہ کو اُبھارنا ام المومنین حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے حج کے لیے مکہ تشریف لائی تھیں۔ جب حج کر کے واپس جانے لگیں تو حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کی خلافت کی خبر ملی۔ یہ خبر سن کر آپ مکہ واپس ہو گئیں۔ راستہ میں تو کچھ نہ بولیں لیکن جب کعبہ کے دروازہ پر پہنچیں اور لوگ ارد گرد جمع ہو گئے تو کھڑی ہوئیں اور اس طرح خطاب کیا:

"لوگو! مختلف مقامات کے مفسدین نے اہلِ مدینہ کے غلاموں کی مدد سے حضرت عثمانؓ کو مظلوم شہید کر دیا۔ ان لوگوں نے پہلے حضرت عثمانؓ پر کچھ الزامات لگائے اور جب انھیں ثابت نہ کر سکے تو بغاوت کر دی۔ جس خون کو خدا نے حرام کر دیا تھا اسے بہایا۔ بلدِ حرام (مدینہ) اور شہرِ حرام (ذو الحجہ) کی تقدیس کو توڑا۔ انہوں نے حرام مال لوٹا۔ خدا کی قسم عثمانؓ کی ایک انگلی ان بلوائیوں کی ساری دُنیا سے زیادہ محترم ہے۔ یہ فتنہ ابھی دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس لیے تم لوگ خلیفۂ مظلوم کا خون رائگاں نہ جانے دو اور قاتلوں سے قصاص لے کر اسلام کی عزت بچاؤ۔"

جب لوگوں نے حضرت عائشہؓ کی تقریر سُنی تو اُن میں حضرت عثمانؓ کے قصاص کا زبردست جوش پیدا ہوا۔ سب سے پہلے عبداللہ بن عامر الحضرمی جو مکہ میں حضرت عثمانؓ کا عامل تھا، کھڑا ہوا اور اعلان کیا:

"سب سے پہلے میں حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ سے بنی امیہ کے اکثر لوگ بھاگ کر مکہ آ گئے تھے۔ انہوں نے اس موقع کو اپنے لیے بہت غنیمت سمجھا اور جوق در جوق حضرت عائشہؓ کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ مروان، ولید بن عقبہ، عبداللہ بن عامر امیر بصرہ، یعلی بن امیہ امیر یمن بھی حضرت عائشہؓ سے آ کر مل گئے۔ یعلی بن امیہ یمن سے بہت سا مال و اسباب لے کر آئے تھے۔ اسی دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینہ سے آ کر حضرت عائشہؓ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ طویل بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ بصرہ کی طرف کوچ کیا جائے۔ حضرت عائشہؓ لوگوں کے دل یہ کہہ کر اُبھارتی جاتی تھیں:

"لوگو! اسلام اس وقت زبردست فتنہ سے دوچار ہے۔ ہمارا مقصد اصلاحِ اُمت ہے۔ تم اپنے بھائیوں کے پاس چلو اور ان کو اس کارِ خیر میں شامل ہونے کی ترغیب دو۔ شاید اس طرح خدا تعالیٰ حضرت عثمانؓ کا انتقام مفسدین سے لے لے۔"

حضرت عائشہؓ کا بصرہ کی جانب کوچ کرنا

طبری اور ابنِ اثیر نے اس فوج کے بصرہ کی جانب کوچ کرنے کی تفصیل اس طرح لکھی ہے:

حضرت عائشہؓ کی دعوت پر سب سے پہلے عبداللہ بن عامر اور بنی امیہ نے لبیک کہا جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ سے مکہ بھاگ آئے تھے۔ پھر ابنِ عامر امیر بصرہ اور یعلی بن امیہ امیر یمن بھی اپنی معزولی کی خبر سُن کر آپ سے آ کر مل گئے۔ یعلی بن امیہ اپنے ساتھ چھ سو اُونٹ اور کثیر مال و دولت لائے تھے۔ لشکر مقام ابطح میں ٹھہرایا گیا۔ اسی دوران میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی مدینہ سے مکہ پہنچے اور حضرت عائشہؓ سے ملے۔ حضرت عائشہؓ نے ان سے مدینہ کا حال احوال دریافت فرمایا۔ ان دونوں نے کہا:

"ہم مدینہ سے بدوؤں اور شور و شر کرنے والے لوگوں کے خوف سے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے وہاں لوگوں کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ حیران و سرگردان ہیں نہ حق کو پہچان سکتے ہیں، نہ باطل سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اپنی حفاظت پر قادر ہیں۔"

یہ سُن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا :

"باہم مشورہ کر لو اور پھر اس شورش کو دبانے کے لیے جس طرف مناسب ہو کوچ کرو۔"

بعض لوگوں نے شام چلنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں سے اس مقصد کے لیے مدد حاصل کی جا سکے۔ لیکن عبداللہ بن عامر نے کہا :

"شام میں اس غرض کے لیے معاویہؓ کافی ہیں۔ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہمیں بصرہ چلنا چاہیے اور وہاں سے مالی اور فوجی مدد حاصل کرنی چاہیے۔"

حضرت عائشہؓ کی رائے مدینہ چلنے کی تھی لیکن جب بعض اور لوگوں نے بھی بصرہ چلنے کا مشورہ دیا تو حضرت عائشہؓ مجبور ہو گئیں آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر ازواجِ مطہرات کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے منظور نہ کیا اور مدینہ واپس جانے کو ترجیح دی۔

فوج کے لیے سازوسامان کی بھی ضرورت تھی۔ یعلیٰ بن امیہ اور ابن عامر اپنے اپنے علاقوں سے بہت کچھ مال واسباب لائے تھے جو انہوں نے فوج کے سازوسامان پر خرچ کیا۔ ایک آدمی مکہ میں منادی کرتا پھرتا تھا :

"لوگو! اُم المومنینؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ بصرہ کی جانب کوچ کر رہے ہیں جو شخص اسلام کی سربلندی کے لیے مفسدین سے لڑنا اور حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس سواری اور ہتھیار نہیں ہیں وہ ہمارے پاس آئے۔ ہم اسے سب چیزیں مہیا کر دیں گے۔"

جب مکہ سے روانگی ہوئی تو تقریباً دو ہزار کا لشکر جو مکہ اور مدینہ کے لوگوں پر مشتمل تھا حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھا۔ راستے میں بدو بھی فوج کے ساتھ ملتے جاتے تھے۔ جب یہ لشکر بصرہ پہنچا تو اس کے افراد کی تعداد تین ہزار ہو چکی تھی۔[1]

جب یہ لشکر مکہ سے چلا تو اُم الفضل بنتِ حارث نے قبیلہ جُہینہ کے ایک شخص کو حضرت علیؓ کے پاس ایک خط دے کر بھیجا جس میں مکہ کے تمام واقعات اور اس لشکر کے تمام حالات، اس کی تعداد اور اس میں شامل ہونے والے لوگوں کی تفصیلات درج تھیں۔

بصرہ پہنچنے سے پہلے ہی حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے بصرہ کے سربرآوردہ لوگوں کو اپنی آمد کی غرض سے اطلاع دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کارِ خیر میں اُن کی مدد کریں۔

لشکر جب بصرہ کے قریب پہنچا تو سعیدؓ بن العاص اور مغیرہؓ بن شعبہ ان لوگوں سے ملے۔ سعیدؓ بن العاص نے حضرت عائشہؓ سے پُوچھا :

"ام المومنین! کہاں کا قصد ہے؟"

انہوں نے کہا :

"بصرہ کا۔"

سعیدؓ نے پُوچھا :

---

[1] ابنِ اثیر

"بصرہ جا کر آپ کیا کریں گی؟"

انہوں نے جواب دیا :

"میں عثمانؓ کے انتقام کا مطالبہ کروں گی۔"

سعیدؓ بن العاص نے کہا :

"عثمانؓ کے قاتل تو آپ کے ساتھ ہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے بعد سعیدؓ مروان کے پاس آئے اور اس سے پوچھا :

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے کہا :

"بصرہ!"

سعیدؓ نے پوچھا :

"بصرہ جا کر کیا کرو گے؟"

مروان نے کہا :

"ہم وہاں یہ مطالبہ کریں گے کہ عثمانؓ کے قاتلوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔"

سعیدؓ نے کہا :

"عثمانؓ کو ان دونوں آدمیوں (طلحہؓ اور زبیرؓ) نے قتل کیا۔ یہ دونوں خلافت اپنے لیے چاہتے تھے۔ جب یہ اپنی سازش میں کامیاب ہو چکے تو اب ایک خون کو دوسرے خون کے ذریعہ اور ایک گناہ کو توبہ کے ذریعہ دھونا چاہتے ہیں۔"[1]

ابنِ اثیر یہ لکھتا ہے کہ جب یہ لشکر مقام ذات عرق میں پہنچا تو سعیدؓ بن العاص آئے اور انہوں نے مروان بن حکم اور اس کے ساتھیوں سے کہا :

"تم کہاں جا رہے ہو حالانکہ جن لوگوں سے تمہیں انتقام لینا ہے وہ تو تمہارے ساتھ اونٹوں پر سوار ہیں ان کو قتل کرو اور اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔"

مروان نے جواب دیا :

"ہم اس لیے جا رہے ہیں کہ عثمانؓ کے تمام قاتلوں کو قتل کریں۔"

مروان سے باتیں کرنے کے بعد سعیدؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا :

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ

"اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کسے خلیفہ بناؤ گے؟"

ان دونوں نے کہا:

"ہم اپنے میں سے جس کو چاہیں گے خلیفہ بنا لیں گے۔"

سعیدؓ نے کہا:

"حضرت عثمانؓ کے کسی بیٹے کو خلیفہ کیوں نہیں بناؤ گے حالانکہ تم حضرت عثمانؓ کے انتقام کے لیے نکلے ہو؟"

ان دونوں نے کہا:

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم مہاجرین کے معززین کو چھوڑ کر یتیموں کو خلیفہ بنا لیں؟"

سعیدؓ نے کہا:

"معلوم ہو گیا کہ اس لشکر کشی کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کی خلافت کا راستہ صاف ہو جائے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی قوم کے چند آدمیوں اور حضرت عثمانؓ کے دو بیٹوں ابان اور ولید کو لے کر واپس چلے گئے۔

امیر بصرہ کے قاصدوں کے سامنے حضرت عائشہؓ کی تقریر

جب عثمانؓ بن حنیف امیر بصرہ کو اس لشکر کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے دو آدمیوں عمران بن حصین اور ابو الاسود دوئلی کو تحقیقِ احوال کے لیے بھیجا۔ وہ دونوں حضرت عائشہؓ کے پاس آئے اور ان کے آنے کی غرض پوچھی۔ حضرت عائشہؓ نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل تقریر کی:

"خدا کی قسم میرے رتبہ کے اشخاص کسی بات کو چھپا کر گھر سے نہیں نکل سکتے۔ اور نہ کوئی ماں اپنے بیٹوں سے اصل حقیقت چھپا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قبائل کے آوارہ گردوں نے مدینہ پر جو حرم محترم تھا حملہ کیا اور وہاں فتنے برپا کیے۔ انہوں نے فتنہ پردازوں کو پناہ بھی دے رکھی ہے۔ اس بنا پر وہ خدا اور رسولؐ کی لعنت کے مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے بے گناہ خلیفۃ المسلمین کو قتل کیا، معصوم خون کو حلال جان کر بہایا، جس مال کا لینا انہیں جائز نہ تھا اس کو لوٹا، حرم محترم نبوی کی بے عزتی کی، ماہِ مقدس کی توہین کی، لوگوں کی آبرو ریزی کی، مسلمانوں کو بے گناہ مارا پیٹا، اور ان لوگوں کے گھروں میں زبردستی اُتر پڑے جو ان کو ٹھہرانے کے روادار نہ تھے۔ وہ نقصان رسا ہیں نفع رساں نہیں۔ نیک دل مسلمانوں میں نہ اُن سے بچنے کی قدرت ہے اور نہ وہ ان کے ہاتھوں مامون ہیں میں مسلمانوں کو لے کر لوگوں کو یہ بتانے نکلی ہوں کہ عام مسلمانوں کو جنہیں میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں، ان سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ کن کن جرائم کے مرتکب ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

لا خیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس۔

(یعنی ان کی سرگوشی میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں لیکن یہ کہ خیرات یا عام نیکی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرائیں،

ہم اصلاح کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں جس کا خدا اور رسولؐ نے ہر چھوٹے بڑے اور زن و مرد کو حکم دیا ہے۔
یہ ہے ہمارا مقصد جس کی نیکی پر ہم تمہیں آمادہ کر رہے ہیں اور جس کی برائی سے تمہیں روکنا چاہتے ہیں۔"

امیرِ بصرہ کے قاصدوں کا حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس آنا حضرت عائشہؓ سے رخصت ہو کر یہ لوگ حضرت طلحہؓ کے پاس گئے اور پوچھا کہ "آپ کے آنے کی غرض و غایت کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:

"عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ!"

والیِ بصرہ کے قاصدوں نے پوچھا:

"کیا آپ نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی تھی؟"

انہوں نے جواب دیا:

"ہاں، لیکن تلوار میری گردن پر رکھی ہوئی تھی۔"

حضرت طلحہؓ کے پاس سے اُٹھ کر یہ دونوں حضرت زبیرؓ کے پاس آئے، انہوں نے بھی ان کو وہی جواب دیا جو حضرت طلحہؓ نے دیا تھا۔

تمام حالات سے اطلاع پا کر یہ دونوں قاصد عثمانؓ بن حنیف کے پاس واپس آ گئے اور جو کچھ سُنا تھا اُسے بتا دیا۔

(۷)

اہلِ بصرہ میں اختلاف

عاملِ بصرہ کی طرف سے مقابلہ کا عزم جب حضرت عائشہؓ کا لشکر بصرہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے عامل عثمانؓ بن حنیف نے اس تازہ صورتِ حال کے متعلق لوگوں سے مشورہ لیا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ بعض نے کہا بہتر یہ ہے کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور اس طرح فتنہ بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن عثمان نے کہا کہ: "میں ان کو بصرہ میں داخل ہونے سے اس وقت تک روکے رکھوں گا جب تک کہ امیر المومنین یہاں نہیں پہنچ جاتے۔"

عاملِ بصرہ کی تقریر اس نے مسجد میں ایک تقریر بھی کی جس میں کہا:

"اے لوگو! تم نے اللہ کی بیعت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تمہارے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا وہ اپنا نقصان آپ کرے گا۔ لیکن جو شخص اللہ سے اپنے کیے ہوئے وعدہ کو پورا

کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اجرِ عظیم دے گا۔ خدا کی قسم اگر علیؓ کے علاوہ اور کوئی شخص خلافت کا حقدار ہوتا تو علیؓ کبھی خلافت قبول نہ کرتے۔ اگر لوگ علیؓ کے علاوہ کسی اور شخص کی بیعت کر لیتے تو علیؓ کو بھی اس کی بیعت میں کوئی عذر نہ ہوتا، وہ نئے خلیفہ کی پورے طور پر اطاعت کرتے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے کوئی پرخاش نہیں۔ ان دونوں (حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ) نے علیؓ کی بیعت کی تھی لیکن اس سے ان کی غرض خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنا نہ تھا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی بجائے بندوں سے ثواب حاصل کرنا چاہا۔ اب یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بیعت مجبوری کی حالت میں کی تھی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کدھر ہیں۔ جدھر عامۃ المسلمین ہیں ادھر ہی ہدایت ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ عامۃ المسلمین نے علیؓ کی بیعت کر لی ہے۔ کیا اب بھی حق کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی رہا؟"

حکیم بن جبلہ کی تقریر

عثمان بن حنیف کے بعد حکیم بن جبلۃ العبدی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:
"اگر یہ لوگ بصرہ میں داخل ہوئے تو ہم ان سے لڑیں گے۔ اگر سارے لوگ بھی میرا ساتھ چھوڑ دیں تو میں ان سے اکیلا لڑوں گا۔ مجھے حق و انصاف کے راستہ میں کسی روک کی پروا نہ ہو گی۔ جو شخص ان لوگوں سے لڑائی کرتے ہوئے مارا جائے گا وہ یقیناً شہادت کا اجر حاصل کرے گا۔"

اہلِ بصرہ میں اختلاف

تاہم تمام اہلِ بصرہ متفقہ طور پر عثمان بن حنیف کے ساتھ نہیں تھے۔ بعض کہتے تھے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھی جس مقصد کے لیے کھڑے ہوئے ہیں وہ بالکل درست ہے۔ بعض کہتے تھے: نہیں، خواہ کچھ بھی ہو حضرت علیؓ کی بیعت پر قایم رہنا چاہیے۔ اس طرح اہلِ بصرہ میں آپس میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض اشخاص حضرت عائشہؓ کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ وہ شہر میں ضرور داخل ہوں۔ ان کے مقابلہ میں ایک جماعت امیر المومنین حضرت علیؓ کے مقرر کردہ عامل کے ساتھ بایں عزم کھڑی ہو گئی کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر کو شہر میں داخل ہونے سے بہر حال روکا جائے گا خواہ اس غرض کے لیے تلوار چلانا اور جنگ کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

عاملِ بصرہ کا مقابلہ کے لئے نکلنا

بہر کیف عثمان بن حنیف اپنے ساتھیوں کو لے کر بصرہ سے باہر نکلا اور مقام مربد کے بائیں جانب قیام کیا۔ حضرت عائشہؓ بھی اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھیں اور مربد کے دائیں جانب قیام فرمایا۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے تو حضرت طلحہؓ آگے بڑھے اور دونوں فوجوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا۔ ان کے فضائل بیان کیے، ان کی مظلومیت کے واقعات دہرائے۔ اس کے بعد لوگوں کو ان کے خون کا بدلہ لینے کی ترغیب دی۔ حضرت طلحہؓ کے بعد حضرت زبیرؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی اسی قسم کی تقریر کی جس قسم کی حضرت طلحہؓ نے کی تھی۔ جب یہ دونوں اپنی تقریریں ختم کر چکے تو دائیں طرف سے ان کے ساتھیوں نے پکار کر کہا کہ جو کچھ آپ نے کہا بالکل درست اور سچ کہا۔ لیکن بائیں طرف سے ان کے مخالفین کی آوازیں آئیں کہ جو کچھ کہا بالکل غلط کہا۔ آپ لوگوں نے پہلے حضرت علیؓ کی بیعت کی اور پھر اس کو توڑ کر ان کے

خلاف محاذ قایم کر لیا۔

اس طرح ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور ہر طرف سے شور و غل مچنے لگا۔ آخر اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کھڑی ہوئیں۔ آپ کی آواز کافی بلند تھی۔ آپ نے لوگوں کو خاموش ہو جانے کو کہا۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو آپ نے حمد و ثنا کے بعد یہ تقریر کی :

حضرت عائشہؓ کی تقریر "لوگ عثمانؓ پر اعتراض اور ان کے عُہدہ داروں کی برائیاں کرتے تھے۔ وہ مدینہ آکر ہم سے صلاح و مشورہ کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی نسبت جب ہم ان لوگوں کی شکایتوں پر غور کرتے تھے تو انہیں بے گناہ، پرہیزگار، راست گفتار اور ان ہنگامہ کاروں کو گنہگار، غدار اور دروغ گو پاتے تھے۔ ان کے دل میں کچھ اور تھا اور زبان پر کچھ اور۔ جب ان کی تعداد بڑھ گئی تو بے قصور او بلا سبب عثمانؓ کے گھر میں گھس گئے اور جس خون کا بہانا جائز نہ تھا اس کو بہایا۔ جس مال کا لینا درست نہ تھا اس کو لوٹا۔ جس سرزمین کا احترام ان پر فرض تھا اس کی بے حرمتی کی۔

وہ کام جو ہمیں اب کرنا ہے، جس کے خلاف ہمارا ہر قدم ناجائز ہوگا وہ عثمانؓ کے قاتلوں کی گرفتاری اور کلامِ الٰہی کے احکام کا مضبوطی سے اجرا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے :

الم تر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتاب یدعون الی کتاب اللہ لیحکم بینہم ثم یتولّی فریق منہم وھم معرضون۔

(یعنی کیا تم ان کو نہیں دیکھتے جن کو کتاب اللہ کا ایک حصہ دیا گیا کہ کتاب الٰہی کی طرف ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔ پھر یہ حال ہے کہ ان کا ایک فرقہ اعراض نہ اس سے منحرف ہوتا ہے)"

عاملِ بصرہ کے بعض ساتھیوں کا حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر کو سمجھانا

جب لوگوں نے حضرت عائشہؓ کی یہ تقریر سُنی تو عثمان بن حنیف کے ساتھی دو حصّوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ نے کُھلم کھلا حضرت عائشہ کی طرفداری شروع کر دی، دوسرا حصہ بدستور مخالف رہا۔ آخر ان دونوں فریقوں میں باہم تکرار شروع ہوگئی جس کو دیکھ کر حضرت عائشہؓ پیچھے ہٹ آئیں اور اپنی فوج کو بھی پیچھے ہٹا لیا۔ عثمان بن حنیف کی فوج کا وہ حصہ جو حضرت عائشہؓ کی تقریر سُن کر ان کا حامی بن گیا تھا کچھ دیر کی تکرار کے بعد حضرت عائشہؓ کے لشکر سے آملا۔ عثمان کے بعض حامی بھی حضرت عائشہؓ کو سمجھانے بجھانے کے لیے آپ کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک شخص جاریہ بن قدامۃ العبدی تھا اس نے آکر حضرت عائشہؓ سے کہا :

"ام المومنینؓ! خدا کی قسم عثمانؓ کی شہادت اس سے بہت کمتر ہے کہ آپ جیسی شخصیت مسلمانوں سے لڑنے اپنے گھر سے نکلے۔ آپ نے اس پردہ کو جو خدا تعالیٰ نے آپ کے لیے بنایا تھا ہٹا دیا۔ اور اس حرمت کو جو خدا تعالیٰ نے آپ کے لیے مقرر کی تھی توڑ دیا۔ آپ یہ تو سوچیے کہ جو شخص آپ سے لڑنے کا ارادہ کرے گا وہ ضرور آپ کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کرے گا۔ آپ ان تمام باتوں پر غور کیجیے اگر آپ اپنی مرضی سے اس لشکر کے ساتھ آئی ہیں تو آپ کے لیے یہ بہتر ہے کہ واپس مدینہ تشریف لے جائیں، اور

اگر ان لوگوں نے آپ پر جبر کر کے اپنے ساتھ ملا لیا ہے تو اس کے خلاف آپ لوگوں سے مدد طلب کیجئے میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔"

بنی سعدؓ کا ایک نوجوان حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا :

"اے زبیرؓ ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری تھے اور اے طلحہؓ ! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیروں کی بوچھاڑ کو اپنے ہاتھ پر روکا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ امّ المومنینؓ تمہارے ساتھ ہیں کیا تم اپنی عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لاتے ہو ؟"

ان دونوں نے جواب دیا :

"نہیں !"

اس پر اس شخص نے کہا :

"بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے اپنی عورتوں کی تو حفاظت کی لیکن اپنی ماں (حضرت عائشہؓ) کو میدانِ جنگ میں تلواروں، نیزوں اور بھالوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور ان کی عزت و حرمت کا کوئی خیال نہ کیا۔ کیا یہی انصاف ہے !"

(۸)

بصرہ کی فتح

والیِ بصرہ کی طرف سے لڑائی کا آغاز جب اس طور پر دونوں فریقوں میں جوش پیدا ہو گیا اور دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور غصہ کے جذبات بھر گئے تو بعض شر پسندوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور عامۃ المسلمین کو بھڑکا کر جنگ کی بھٹی دہکا دی۔ لڑائی عثمان بن حنیف والیِ بصرہ کے ساتھیوں کی طرف سے شروع ہوئی۔ ان میں سب سے پیش پیش حکیم ابن جبلہ تھا۔ اسی نے حملہ کی ابتدا کی اور حضرت عائشہؓ کی فوج پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں نے صرف مدافعانہ پہلو اختیار کیا اور حکیم کے دستے کے حملوں کو روکتے رہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی پہل نہ کی۔ جب رات آگئی تو دونوں فوجیں علیٰحدہ علیٰحدہ ہو گئیں اور دوسرے دن کی لڑائی کے لیے تیاریاں کرنے لگیں۔

دوسرے دن عثمان بن حنیف اور حکیم بن جبلہ اپنی فوج کو لے کر باہر نکلے۔ حکیم حضرت عائشہؓ کی نسبت ناشائستہ کلمات کہہ رہا تھا۔ قبیلہ عبدالقیس کے ایک مرد اور ایک عورت نے اس کو ٹوکا۔ حکیم نے طیش میں آکر دونوں کو قتل کر ڈالا اور حضرت عائشہؓ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کی طرف سے برابر اس امر کا اعلان ہوتا رہا کہ جنگ بند کر دی جاتے اور صلح کی شرائط طے کر لی جائیں۔ لیکن عثمان اور حکیم لڑائی سے باز نہ آئے۔ دن بھر جنگ ہوتی رہی جس میں حضرت عائشہؓ کا پلّہ بھاری رہا اور عثمان کی فوج کے کثیر آدمی مقتول ہوئے۔ جب سورج چھپ گیا تو لڑائی بند ہوئی۔

لڑائی کا اختتام اور فریقین کے درمیان شرائطِ صلح حضرت عائشہؓ کی جانب سے اس وقت بھی صلح کی پیش کش کی گئی جس کو عثمان نے

قبول کر لیا۔ یہ طے پایا کہ عثمان ایک قاصد مدینہ بھیجے گا جو وہاں کے لوگوں سے تمام حالات دریافت کرے گا۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ کو حضرت علیؓ کی بیعت کرنے پر زبردستی مجبور کیا گیا تھا تو عثمان ان سے کوئی تعرض نہیں کرے گا اور بصرہ ان کے حوالے کر کے خود وہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن اگر یہ پتا چلا کہ ان دونوں نے اپنی مرضی سے حضرت علیؓ کی بیعت کی تھی تب انھیں بصرہ چھوڑ کر جانا ہوگا۔

شرائطِ صلح کے مطابق قاضیٔ بصرہ کا مدینہ پہنچنا اس معاہدہ کے بموجب قاضیٔ بصرہ کعب بن سور مدینہ روانہ ہوئے آپ جمعہ کے روز وہاں پہنچے اور سیدھے مسجد نبوی میں گئے۔ انہوں نے مسجد میں داخل ہو کر بآوازِ بلند لوگوں سے خطاب کیا:

"اے اہلِ مدینہ! میں بصرہ کے لوگوں کی جانب سے تمہاری طرف سفیر ہو کر آیا ہوں اور تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا طلحہؓ اور زبیرؓ کو زبردستی حضرت علیؓ کی بیعت پر مجبور کیا گیا تھا یا ان دونوں نے اپنی خوشی سے بیعت کی تھی؟"

یہ سن کر تمام حاضرین چپ رہے صرف حضرت اسامہؓ بن زید اٹھے اور انھوں نے کہا:

"ان دونوں کو زبردستی بیعت کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ سہل بن حنیف اسامہؓ پر ٹوٹ پڑے۔ دیگر صحابہؓ کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں سہل اسامہؓ کو قتل نہ کر دیں۔ وہ اسامہؓ کی مدد کے لیے اٹھے۔ حضرت صہیبؓ بن سنان، حضرت ابو ایوبؓ بن زید اور حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے اٹھ کر اسامہؓ کے قول کی تصدیق کی اور انہیں سہل کے ہاتھوں سے بچایا۔ کعب بن سور نے واپس بصرہ آکر تمام حالات سے عثمان کو اطلاع دے دی۔

اس تمام قصہ میں یہ بات سب سے عجیب ہے کہ والیٔ بصرہ کا سفیر دار الخلافہ میں آتا ہے جو حضرت علیؓ کے حامیوں اور مددگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن کسی شخص کو اس وقت تک اس کے آنے کا پتا نہیں چلتا، جب تک کہ وہ مسجد نبوی میں داخل نہیں ہو جاتا۔ نہ کوئی شخص اسے اس بات ہی پر ٹوکتا ہے کہ ایسے اہم معاملہ میں خلیفہ سے مشورہ لیے بغیر اسے مجمع سے خطاب کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ نہ حضرت علیؓ ہی اسے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ پھر ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بصرہ کے عامل کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ وہ خلیفۃ المسلمینؓ کو ان تمام حالات کی اطلاع دے جو اس کے شہر میں پیدا ہو چکے تھے حالانکہ یہ اتنے اہم واقعات تھے کہ ان کے متعلق خلیفہ کو اطلاع دینا والی کا سب سے پہلا کام تھا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ حکیم بن جبلہ کو حضرت عائشہؓ کی فوج سے لڑنے کی اجازت دے دیتا ہے، حالانکہ اس کا فرض تھا کہ جب تک اس امر کے متعلق خلیفہ کا کوئی واضح حکم نہ آجاتا وہ لڑائی سے باز رہتا جبکہ خود حضرت عائشہؓ بھی لڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

شرائطِ صلح پر حضرت علیؓ کی ناراضگی جب حضرت علیؓ کو عثمان بن حنیف کے اس معاہدے کا پتا چلا جو اس نے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے کیا تھا۔ تو آپ کو بے حد

غصہ آیا اور آپ نے اسے لکھا :

"اگر طلحہؓ اور زبیرؓ پر جبر بھی کیا گیا تھا تو یہ جبر مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے تھا نہ کہ متفرق کرنے کے لیے ۔ اگر ان کا ارادہ بیعت توڑنے کا ہے تو ان کا کوئی عذر نہ سُنا جائے اور اگر اس کے علاوہ ان کا کچھ اور مقصد ہے تو اس پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے اور ان سے گفتگو کی جا سکتی ہے ۔"

والیٔ بصرہ کا شہر خالی کرنے سے انکار کرنا والیٔ بصرہ کے نام حضرت علیؓ کا خط اور کعب بن سور قاضیٔ بصرہ، دونوں بصرہ ساتھ ساتھ پہنچے ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ نے عثمان بن حنیف پر زور دیا کہ وہ حسبِ معاہدہ شہر خالی کر دے ۔ لیکن اس نے انکار کیا ، اور حضرت علیؓ کا خط پیش کر کے کہا کہ اس پہلو کی طرف ہماری نظر نہیں گئی تھی ، میں شہر خالی نہیں کر سکتا ۔

والیٔ بصرہ کی گرفتاری اس پر رات کو حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے آدمیوں نے عثمان بن حنیف کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور گھر میں داخل ہو کر اسے قید کر لیا ۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے حکم دیا کہ اسے چھوڑ دیا جائے اور اجازت دی جائے کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے ۔ چنانچہ آپ کے حکم کی تعمیل میں اسے رہا کر دیا گیا اور وہ مدینہ چلا گیا ۔

بصرہ کی فتح عثمان کے ساتھیوں کو جب اس واقعہ کا پتا چلا تو انہوں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ ان کا سردار حکیم بن جبلہ تھا ۔ یہ شخص اور اس کے ساتھی اس فتنہ میں شریک تھے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف برپا کیا گیا تھا ۔ ان کو پتا تھا کہ اگر انہوں نے حضرت عائشہؓ کے لشکر کو نہ روکا تو وہ ضرور حضرت عثمانؓ کے قصاص میں قتل کر دیے جائیں گے ۔ چنانچہ وہ جی توڑ کر لڑے ۔ لیکن شکست کھائی ۔ حضرت عائشہؓ کے لشکر نے ان لوگوں کو خصوصیت سے اپنی تلواروں کا نشانہ بنایا جو حضرت عثمانؓ کے خلاف سازش میں شریک تھے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے ایک شخص حرقوص بن زہیر کے جسے اس کے قبیلہ نے پناہ دے دی تھی اور کوئی شخص بھی بچ کر نہ جا سکا ۔

جب لڑائی ختم ہو گئی تو چُن چُن کر ایسے لوگوں کو لایا گیا جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل یا آپ کے خلاف سازش میں حصہ لیا تھا اور اُن کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ یہ آخری معرکہ ۲۴ ربیع الثانی ۳۶ھ کو پیش آیا ۔

جب بصرہ فتح ہو گیا تو حضرت عائشہؓ ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے اہلِ شام کو ایک خط لکھا جس میں بصرہ کے تمام حالات درج کیے ، اس خط میں لکھا تھا :

اہلِ شام کے نام حضرت عائشہؓ کا مکتوب "اما بعد ہم تمہیں اللہ تعالیٰ اور اسلام کی یاد دلاتے ہیں کتابِ الٰہی کو اس کے احکام کے اجرا سے قائم رکھو ۔ خدا سے ڈرو اور اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو ۔ اس کی کتاب کا ساتھ نہ چھوڑو ۔ ہم نے بصرہ آ کر بصرہ کے لوگوں کو کتابِ الٰہی کی اقامت کی دعوت دی صلحائے امت نے ہماری دعوت قبول کر لی لیکن شریروں اور مفسدوں نے ہماری مخالفت کی ۔ انہوں نے تلوار سے ہمارا مقابلہ کیا اور کہا کہ ہم تمہیں بھی عثمانؓ کے

ساتھ روانہ کر دیتے ہیں، دشمنی اور عداوت سے انہوں نے ہمیں کافر بنایا۔ ہماری نسبت نازیبا باتیں کہیں۔
ہم نے ان کو قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھ کر سنائی:

الم تر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتٰب یدعون الی کتاب اللّٰہ لیحکم بینھم ثم یتولی فریق منھم وھم معرضون۔

(یعنی کیا تم نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہیں کتاب الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا۔ ان کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے لیکن پھر ان میں سے ایک فریق اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور وہ اعراض کرتے ہیں)

یہ سن کر لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی۔ اور بعض نے اختلاف کیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمارے ساتھیوں پر تلواریں چلائیں۔ بصرہ کے والی عثمان بن حنیف نے انہیں قسم دی کہ وہ ہم سے لڑیں لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے ذریعہ ہماری مدد کی۔ ہم نے چھبیس روز تک ان کو کتاب الٰہی کے احکام کی دعوت دی یعنی یہ کہ مجرموں کے علاوہ دوسرے بے گناہوں کی خونریزی سے احتراز کیا جائے۔ انہوں نے ہمارے خلاف دلائل قائم کئے۔ پھر بھی ہم نے صلح کر لی لیکن انہوں نے ازراہ بدعہدی وخیانت فوج جمع کی۔ خدا نے عثمانؓ کے قصاص کا سامان کر دیا اور ایک شخص حرقوص بن زہیر کے سوا ان مفسدین اور شورش پسندوں میں سے اور کوئی نہیں بچا۔ خدا نے قیس، رباب اور ازد کے قبیلوں کے ذریعہ ہماری اعانت فرمائی۔ دیکھو! عثمانؓ کے قاتلوں کے سوا جب تک خدا ان سے اپنا حق نہ لے لے اوروں سے اچھی طرح پیش آؤ لیکن ان خیانت کاروں کی طرف داری نہ کرنا، نہ ان کی حفاظت کرنا۔ نہ اُن لوگوں سے جو سزائے الٰہی کے مستوجب ہیں، رضامندی ظاہر کرنا کہ ایسا نہ ہو تمہارا شمار بھی انہی ظالموں میں ہو جائے۔"

اسی طرح کے خطوط اہلِ کوفہ، اہلِ یمامہ اور اہلِ مدینہ کے نام بھی لکھے گئے۔

جب ہم ان واقعات کو پڑھتے ہیں تو ہمارے لیے سوائے افسوس کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وہ لوگ جو حضرت عثمانؓ کے قصاص کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے خواہ وہ بنی امیہ تھے یا دوسرے قبائل کے لوگ، اور جن میں طلحہؓ اور زبیرؓ بھی شامل تھے، یہ چاہتے تھے کہ ہر وہ شخص جو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کرنے والے مفسدین کے ساتھ مدینہ میں آیا تھا واجب القتل ہے۔ چنانچہ اس کا عملی تجربہ انہوں نے بصرہ میں کیا۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے خون کے بدلے تین ہزار اہل قبلہ کا خون بہائیں۔ اگر ان لوگوں میں اُن مدینہ والوں، ان کے غلاموں اور دیگر بدوی لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے جنہوں نے قاتلینِ عثمانؓ اور مفسدین کے ساتھ مل کر حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی تھی، تو ایسے لوگوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت یہ چاہتی تھی کہ ان سب کو قتل کیا جائے۔ لیکن ان کا یہ خیال خدا تعالیٰ کے احکام اور اس کی

شریعت کے قطعاً مخالف تھا۔ خدا تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

و من قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل۔

(یعنی جو شخص مظلوم قتل کر دیا جائے ہم اس کے ولی کو قصاص کا اختیار دیتے ہیں لیکن وہ قصاص لیتے وقت قتل میں شدت اختیار نہ کرے)

لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ یقیناً اسراف فی القتل تھا جس کی اللہ تعالیٰ کبھی اجازت نہیں دیتا۔ ان باتوں کے علاوہ سب سے بڑا نقصان جو اُمتِ محمدیہ کو پہنچ رہا تھا، یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پھیل گئی تھی اور وُہ لوگ جو کبھی اپنی تلواروں کو دشمنانِ اسلام کے خلاف استعمال کرتے تھے اب اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے، جو حضرت عثمانؓ کے انتقام کا نام لے کر حضرت علیؓ کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے تھے، ہرگز یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ خلیفۂ وقت کا مقابلہ کرتے؛ اُمتِ محمدیہ کو پارہ پارہ کرتے اور ایسا فتنہ پھیلاتے جس کے متعلق ہر شخص جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ بدامنی اور افتراقِ اُمت کی صورت میں نکلے گا۔

(۹)

صلح کی کوششیں

حضرت علیؓ کو شام آنے سے روکنے کے لیے حضرت معاویہؓ کی تدبیر

حضرت علیؓ نے سب سے پہلے شام جانے کا ارادہ کیا تھا تاکہ حضرت معاویہؓ کو بیعت پر مجبور کیا جائے اور جب معاویہ کو حضرت علیؓ کے اس ارادہ کا پتا اپنے ان جاسوسوں کے ذریعہ چل گیا جو مدینہ میں اس لیے مامور تھے کہ وہ یہاں کے واقعات سے حضرت معاویہؓ کو خفیہ طور پر اطلاع دیتے رہیں۔ انھوں نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں جن سے حضرت علیؓ کی توجہ ان سے ہٹ جائے اور وہ شام میں داخل نہ ہو سکیں۔ چنانچہ خطوط بھیج کر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ کے خلاف ابھارنا شروع کیا۔ انھیں خلافت اور ملک کا لالچ دیا اور ان سے وعدہ کر لیا کہ شام ان کی بیعت کرلے گا۔ چنانچہ وُہ دونوں ام المومنین کو لے کر بصرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

ان تمام واقعات کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

حضرت علیؓ کا مدینہ سے چل کر ربذہ میں قیام

جب حضرت علیؓ کو پتا چلا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے بصرہ کا قصد کیا ہے تو انھوں نے شام کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پہلے اس جدید انتشار کو دُور کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ حضرت عائشہؓ کی فوج کے بصرہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس کے مقابلہ پر پہنچ جائیں لیکن جب آپ 'ربذہ' پہنچے تو آپ کو پتا چلا کہ بصرہ پر حضرت عائشہؓ کا

قبضہ ہو چکا ہے اور اب ان کی فوجوں نے کوفہ کا قصد کیا ہے۔ یہ خبر سن کر آپ بہت خوش ہوئے کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ اہل کوفہ کو اُن سے بہت محبت اور تعلق ہے۔ آپ نے اہالیانِ کوفہ کے نام ایک خط لکھا۔

اہالیانِ کوفہ کے نام حضرت علیؓ کا خط

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! میں نے تمہیں منتخب کیا ہے اور میں تم ہی میں آکر اُتروں گا۔ کیونکہ تم خدا تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ جو شخص میری مدد کرے گا وہ حق و صداقت کی پیروی کرے گا اور اس ذمہ داری کو پورا کرے گا جو اس کے سر ہے۔"

حضرت علیؓ کا اپنے سفیروں کو کوفہ کی جانب روانہ کرنا

ساتھ ہی امیر المومنینؓ نے یہ بھی ارادہ کیا کہ وہ چند قابلِ اعتماد آدمیوں کو کوفہ بھیجیں تاکہ ان کے ذریعہ پتا لگ سکے کہ کوفہ والوں کا موقف کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے محمد بن ابی بکر اور محمد بن عوف کو اس غرض کے لیے بھیجا اور خود "ربذہ" میں مقیم رہ کر لڑائی کی تیاری کرتے رہے۔ مدینہ بھی کہلا کر بھیجا کہ جو شخص ہم سے آکر ملنا چاہے وہ آجائے۔ اس طرح کئی ہزار کی جمعیت آپ کے گرد اکٹھی ہو گئی۔ ایک دن آپ کھڑے ہوئے اور مندرجہ ذیل تقریر فرمائی:

فوج کے سامنے حضرت علیؓ کی تقریر

"بے شک ہمیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے، ہمارا مرتبہ بلند کیا ہے، ہمیں ذلت، قلت، نفرت و حقارت اور دوری کے بعد بھائی بھائی بنایا ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا لوگ اسی راستہ پر چلتے رہے۔ اسلام ان کا دین تھا۔ حق ان کے درمیان تھا اور کتاب اللہ ان کی رہبر تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ ان مفسدہ پرداز لوگوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے جن کو شیطان نے اس لیے منتخب کیا تھا کہ ان کے ذریعہ اُمت میں تفرقہ انگیزی پیدا ہو جائے۔ ضروری ہے کہ اس امت میں اسی طرح تفرقہ پھیلے جس طرح پہلی امتوں میں پھیلا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے آئندہ ہونے والے شر کے لیے پناہ مانگتے ہیں لیکن جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا اور یہ اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھ لیا۔ اس لیے تم اپنے دین کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایت کو اختیار کرو۔ آپ کی سنت کی پیروی کرو، جہاں کہیں تمہیں کوئی مشکل پیش آئے اس کا حل قرآنِ کریم میں تلاش کرو اور جو چیز قرآن سے معلوم ہو اسے اختیار کرو اور جس چیز سے قرآنِ کریم انکار کرتا ہو اس کو رد کر دو۔ اللہ تعالیٰ کے پروردگار، اسلام کے سچے دین، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور قرآن کریم کے حَکَم و امام ہونے پر راضی رہو۔"

یہ خطبہ دینے کے بعد آپ اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھے اور مقام "ذی قار" میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں آپ کو عاملِ بصرہ عثمان بن حنیف ملا اور ان تمام واقعات سے آگاہ کیا جو بصرہ میں پیش آئے تھے۔

اہلِ کوفہ کی حمایت حاصل کرنے میں حضرت علیؓ کے قاصدوں کی ناکامی

حضرت علیؓ کے دونوں قاصد کوفہ پہنچے اور عاملِ کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں پہنچ کر حضرت علیؓ کا خط انہیں دیا۔ وہ دوسرے لوگوں سے بھی ملے مگر انہیں حضرت علیؓ کی حمایت پر کمربستہ کرتے رہے۔ آخر شہر کے چند معززین حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ باہر نکلنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابوموسیٰ اشعریؓ نے جواب دیا کہ یہ ایک فتنہ ہے جس سے بالکل الگ رہنا چاہیے۔ اس میں سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس رائے سے ان معززین نے پورا اتفاق کیا اور کوئی شخص باہر نکل کر حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس پر حضرت علیؓ کے قاصدوں کو بڑا طیش آیا اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰؓ کو بہت کچھ سخت سُست کہا۔ جس پر انہوں نے کہا:

"خدا کی قسم حضرت عثمانؓ کی بیعت کا طوق میری گردن میں ہے۔ حضرت علیؓ بھی ان کی بیعت کر چکے تھے۔ اگر لڑنا ضروری ہی ہے تو ہم اس وقت تک کسی سے نہیں لڑیں گے جب تک تمام قاتلینِ عثمانؓ سے خواہ وہ کہیں ہوں انتقام نہ لے لیں۔"

حضرت علیؓ کا دوبارہ اپنے قاصدوں کو کوفہ روانہ کرنا

محمد بن ابی بکر اور محمد بن عوف کوفہ والوں سے ناامید ہو کر مقام 'ذی قار' میں حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور تمام حالات سے ان کو آگاہ کر دیا۔ آپ نے حضرت ابنِ عباسؓ اور اشترؔ کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو ان کی مدد پر آمادہ کر سکیں لیکن وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر آپ نے اپنے بیٹے حضرت حسنؓ اور عمار بن یاسر کو بھیجا۔ یہ دونوں کوفہ آ کر حضرت ابوموسیٰؓ سے ملے۔ لیکن ابوموسیٰؓ برابر اپنی اس رائے پر قایم رہے کہ جب تک فتنہ دُور نہ ہو جائے لڑائی سے اجتناب کرنا اور تلواروں کو میانوں میں ڈالے رکھنا چاہیے۔

اس پر کوفہ کے ایک شخص قعقاع بن عمرو نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی:

کوفہ میں قعقاع کی مؤثر تقریر

"اے اہلِ کوفہ! ہمارے امیر (ابوموسیٰ اشعریؓ) نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن نظامِ خلافت کا باقی رہنا بھی بیحد ضروری ہے۔ اگر نظامِ خلافت کا وجود نہ ہو تو نہ ظالم سے انتقام لیا جا سکتا ہے، نہ مظلوم کی مدد کی جا سکتی ہے اور نہ ملکی انتظام برقرار رہ سکتا ہے۔ حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کیا جا چکا ہے وہ تمہیں اصلاح کی طرف دعوت دیتے ہیں تمہیں اس دعوت کو قبول کرنا چاہیے، ان کی مدد کے لیے چلنا چاہیے اور دل وجان سے ان کی پیروی کرنی چاہیے۔"

قعقاع کے بعد حضرت حسنؓ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو امیرالمومنین کی مدد کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ ہم کل روانہ ہوں گے جو لوگ ہمارے ساتھ چلنا چاہیں وہ چلیں۔ جو لوگ خشکی کے راستہ جانا چاہیں وہ خشکی کے راستہ جائیں اور

جو دریا کے راستہ جانا چاہیں وہ دریا کے راستے حضرت علیؓ کی فوجوں تک پہنچیں۔

نو ہزار اہلِ کوفہ کا حضرت علیؓ کی مدد کو پہنچنا

چنانچہ آپ کے ساتھ نو ہزار آدمی ہو گئے۔ کچھ لوگ خشکی کے راستہ اور کچھ دریا کے راستے مقام "ذی قار" میں حضرت علیؓ سے جا کر مل گئے۔ حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا :

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم اہلِ بصرہ کے مقابلہ میں میرا ساتھ دو۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اصلاح کی کوشش کروں۔ اگر اہلِ بصرہ باز آ گئے تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اگر انہوں نے کجی اختیار کی اور اپنی ضد پر قائم رہے تو بھی ہم ان کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آئیں گے اور لڑائی سے اس وقت تک گریز کریں گے جب تک وہ ظلم اور لڑائی کی ابتدا نہ کریں۔ ہم اصلاح کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے اور ہر حال میں فساد کے مقابلہ میں اصلاح کو ترجیح دیں گے۔"

بصرہ کی جانب سفیر کا روانہ کرنا

امیر المومنینؓ کی یہ رائے ہوئی کہ بصرہ والوں کی جانب ایک سفیر روانہ کیا جائے جو انہیں فتنہ کے نتائج و عواقب سے خبردار کرے اور ان کو دربارِ خلافت کی اطاعت اور اتحاد بین المسلمین کی دعوت دے۔ چنانچہ آپ نے قعقاع بن عمرو کو جو کوفہ کے معززین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے تھے بلایا اور ان سے کہا :

"طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس جاؤ اور ان کو اس بات پر آمادہ کرو کہ افتراق کی کوششوں کو ترک کر دیں تاکہ مسلمان اکٹھے ہو کر پیار محبت کے ساتھ رہ سکیں۔"

قعقاع نے رضامندی ظاہر کی۔ حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا :

"اگر ان دونوں سے گفتگو کرنے کے دوران میں کوئی ایسا مسئلہ پیش آ جائے جس کے متعلق میں نے تمہیں کوئی ہدایت نہ دی ہو تو اس موقع پر تم کیا کرو گے ؟"

قعقاع نے جواب دیا :

"ہم ان سے انہی معاملات کے متعلق گفتگو کریں گے جن کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی بات پیش آ گئی جس کے متعلق آپ کی رائے ہمیں معلوم نہ ہوئی تو ہم اجتہاد سے کام لیں گے اور وہی بات ان سے کہیں گے جو مناسب اور ضروری ہو گی۔"

حضرت علیؓ کے سفیر کا حضرت عائشہؓ و طلحہؓ و زبیرؓ سے ملنا اور انہیں مصالحت کے لیے آمادہ کرنا

حضرت علیؓ نے اس جواب پر اطمینان کا اظہار فرمایا اور قعقاع بصرہ کی جانب روانہ ہوئے۔ بصرہ پہنچ کر وہ سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے ملے اور ان سے پوچھا :

"آپ کا اس شہر میں آنے کا مقصد کیا ہے ؟"

انہوں نے فرمایا : "میرا یہاں آنے کا مقصد لوگوں کی اصلاح ہے۔"

قعقاع نے درخواست کی کہ طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی اپنے پاس بلوا لیجیے تاکہ آپ میری اور ان کی باتیں سن سکیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ان دونوں کو بلا بھیجا۔ جب وُہ آئے تو قعقاع نے ان سے کہا:

"میں نے اُم المومنینؓ سے پُوچھا کہ آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرا یہاں آنے کا مقصد لوگوں کی اصلاح کرنا ہے۔ کیا آپ دونوں کو اس مقصد کے بارے میں اُم المومنینؓ سے اتفاق ہے؟"

دونوں نے کہا:

"ہم اُم المومنینؓ سے پُوری طرح متفق ہیں۔"

قعقاع نے پُوچھا:

"مجھے بتایئے کہ اس اصلاح کی کیا صورت ہے تاکہ اگر وُہ مناسب ہو تو ہم بھی اس پر عمل کریں۔"

دونوں حضرات نے جواب دیا:

"اصلاح کی صرف یہ صورت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو قتل کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کو پسِ پشت ڈال دیا۔ قرآن کا احیا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لے لیا جائے۔"

قعقاع نے کہا:

"تم نے بصرہ کے ان لوگوں کو جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حصہ لیا تھا قتل کرنا شروع کیا۔ لیکن اگر تم اختیارات اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو تمہارا دعویٰ زیادہ مضبوط ہوتا۔ تم نے یہاں کے پانچ سو ننانوے آدمیوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل کے جرم میں قتل کیا جس کی وجہ سے چھ ہزار آدمی تمہارے مخالف ہو گئے اور انہوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا۔ تم نے ایک آدمی حرقوص بن زہیر کو جس پر تمہارا قابو نہ چل سکا تھا گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن چھ ہزار آدمی اس کی حمایت میں تمہاری مزاحمت کے لیے کھڑے ہو گئے جس پر مجبور ہو کر تمہیں اس کی گرفتاری اور قتل کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ کیا تمہارا اسے چھوڑنا تمہارے قول کے مطابق قرآن کو ترک کرنا نہیں ہے؟ کیا تم نے اسے چھوڑ کر خود بخود اپنے اس دعویٰ کو ترک نہیں کر دیا جو تم لے کر کھڑے ہوئے ہو؟ اگر تم اس ایک آدمی کے لیے ان سے لڑتے تو وہ یقیناً تم پر غالب آجاتے اور اس چیز سے تم بچنا چاہتے ہو۔"

قعقاع کی یہ تقریر سُن کر حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے پُوچھا:

"تب اس فتنہ کا سدِباب کس طرح کیا جائے؟"

قعقاع نے جواب دیا:

"اس فتنہ کے سدِباب کی صرف یہ صورت ہے کہ سکون پیدا کیا جائے۔ جب سکون پیدا ہو جائے گا تو ہر قسم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر تم حضرت علیؓ کی بیعت کر لو تو یہ اُمت کی بہتری، اس کی عافیت اور سلامتی کے لیے ایک نیک فال ہو گی اور اس طرح حضرت عثمانؓ کا قصاص بھی لیا جا سکے گا۔ لیکن اگر تم نے بیعت سے انکار کیا اور اپنے مطالبہ پر اڑے رہے تو یہ نہ صرف اُمت کی بدبختی کا موجب ہو گا بلکہ حضرت عثمانؓ کا قصاص لینا بھی ناممکن ہو جائے گا اس لیے آپ وُہ راستہ اختیار کیجئے جس میں اُمت کی بھلائی اور عافیت ہو اور

ایسی روش اختیار کیجئے کہ نہ ہم مصیبت میں پڑیں اور نہ آپ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اُمت تباہ ہو جائے گی۔"

قعقاع کی یہ بات، ان تینوں کے دل کو لگی اور انہوں نے اس سے پورا اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا:

"آپ کی باتیں مناسب اور درست ہیں۔ اگر حضرت علیؓ کی بھی یہی رائے ہے جو آپ کی ہے تو یہ معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے اور مصالحت بڑی آسانی سے ہو جائے گی۔"

حضرت علیؓ کا اپنی فوج کو بصرہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دینا

قعقاع واپس حضرت علیؓ کے پاس آئے اور سارا ماجرا انہیں سنایا۔ حضرت علیؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ اب مصالحت کی راہ آسان ہو گئی۔ آپ نے تمام فوج کو جمع کیا اور ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"میں کل بصرہ کی جانب کوچ کر رہا ہوں، تم سب میرے ساتھ چلو۔ لیکن جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل میں کسی قسم کا بھی حصّہ لیا ہے انہیں چلنے کی ضرورت نہیں۔"

اس طرح جنگ کے وہ بادل جو کئی مہینے سے افقِ عرب پر چھائے ہوئے تھے چھٹنے شروع ہو گئے۔ قبائلِ بصرہ کے کئی وفود کوفہ کے قبائل کے پاس آئے اور ان کو یقین دلایا کہ وہ ان کے خلاف جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

مصالحت کی خبروں سے قاتلینِ عثمانؓ میں گھبراہٹ

اس وقت پر صرف ایک گروہ ایسا تھا جس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی تھی اور ان کو شہید کر دیا تھا۔ جب حضرت علیؓ نے یہ اعلان کیا کہ وہ لوگ ہمارے ساتھ نہ چلیں جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے قتل میں کسی قسم کا بھی حصّہ لیا ہے تو وہ بڑے گھبرائے۔ ان کو معلوم تھا کہ اگر حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان صلح ہو گئی تو ان کی خیر نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ جن میں عبداللہ بن سبا، ابن سوداء، اشتر وغیرہ شامل تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ابنِ سبا نے کہا کہ اگر مسلمانوں میں باہم صلح ہو گئی تو یہ صلح ہمارے لیے موت کا پروانہ ہو گی۔ بعض لوگوں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کو شہید کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن دُوسروں نے کہا کہ اس سے زیادہ بیوقوفی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس طرح تمام عالمِ اسلامی کے مسلمان ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی قتل ہونے سے بچ نہیں سکے گا۔

مصالحت کو ناکام بنانے کے لیے قاتلینِ عثمانؓ کی سازش

آخر ابن السوداء نے ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا:

"ہمارے لیے بہترین طریق کار یہ ہے کہ ہم حضرت علیؓ کے لشکر کے ساتھ ساتھ لگے رہیں۔ اگر حضرت علیؓ کی طرف سے اعتراض کیا جائے تو یہ جواب دے دیں کہ ہم آپ کے ساتھ اس لئے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے مصالحت کی گفتگو ناکام ہو جائے تو ہم آپ کے کام آ سکیں۔ جب دونوں فریق ملیں تو ہماری طرف سے اس امر کی پُوری کوشش ہونی چاہیے کہ دونوں میں صلح کی بات چیت کامیاب نہ ہونے پائے تاکہ اس طرح جنگ کی صورت پیش آ جائے اور علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ آپس میں مصروفِ پیکار ہو جائیں۔ اس طرح ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

ابن السوداء کی اس رائے کو سب فتنہ پردازوں نے پسند کیا اور اُٹھ کر اپنے اپنے خیموں میں آگئے۔ دوسرے لوگوں کو پتا بھی نہ تھا کہ یہ مفسدین کیسا ناپاک کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱۰)

معرکۂ جمل

حضرت علیؓ کی بصرہ کو روانگی

امیر المومنین حضرت علیؓ کا لشکر "الطف" کی جانب سے بصرہ کی طرف بڑھا۔ سب سے آگے ایک ہزار سواروں کا ایک دستہ تھا۔ یہ دستہ انصار کا تھا۔ اس کی قیادت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوایوبؓ انصاری کر رہے تھے۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے، ٹوپی اور سفید کپڑے پہنے ہوئے جھنڈا ہاتھ میں اور تلوار کمر میں حمائل۔ اس دستہ کے بعد ایک ہزار سواروں کا ایک دستہ اور تھا جس کی قیادت خزیمہ بن ثابت انصاری کر رہے تھے۔ آپ زرد عمامہ اور سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس دستہ کے بعد ایک ہزار سواروں کا ایک اور دستہ تھا۔ اس کی قیادت عمار بن یاسر کر رہے تھے۔ آپ سیاہ عمامہ اور سفید کپڑوں میں تھے۔ اس دستہ میں کئی مہاجر و انصار صحابہؓ اور ان کے بیٹے شامل تھے۔ اس کے بعد قیس بن سعد بن عبادہ کا دستہ تھا۔ قیس کے بعد عبداللہ بن عباس کا دستہ تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی دستے تھے۔ سب سے آخر میں حضرت علیؓ تھے۔ آپ کے اردگرد آپ کے تین بیٹے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور محمدؒ بن الحنفیہ۔ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور بنی ہاشم کے نوجوان تھے۔ ان کے پیچھے وہ صحابہؓ تھے جو بدر کی جنگ میں شامل ہو چکے تھے۔

صلح کی بات چیت کا شروع ہونا

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی اپنے لشکر کو لے کر بصرہ سے نکلے۔ حضرت علیؓ نے انہیں کہلا کر بھیجا کہ قعقاع کی زبانی جو گفتگو ہوئی اگر آپ لوگ اس پر قائم ہیں تو آئیے اور سب معاملات طے کر لیجئے۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کی طرف سے جواب گیا کہ ہم اس گفتگو پر قائم ہیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے سفیر ایک دوسرے کے لشکر میں آنے لگے اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی۔ تمام لوگوں کو خیال تھا کہ اب صلح ہونے میں دیر نہیں لگے گی اور تمام معاملات باحسن الوجوہ طے ہو جائیں گے۔

حضرت علیؓ بصرہ کے قریب "زاویہ" کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ آپ نے وہاں نمازیں پڑھیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہانے سے محفوظ رکھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو بھی اس بات کی تاکید کر دی کہ وہ اپنی طرف سے ہرگز ہرگز جنگ شروع نہ کریں اور ایک تیر تک نہ چلائیں۔

قاتلینِ عثمانؓ کا حضرت عائشہؓ کی فوج پر حملہ

اس موقعہ پر ان لوگوں میں جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حصہ لیا تھا سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ انہوں نے پہلے ہی سازش کر رکھی تھی۔ جب رات آئی تو ان لوگوں نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے لشکر پر بے خبری میں حملہ کر دیا اور لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا۔

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے آدمیوں نے بھی ہتھیار سنبھالے اور اس طرح دونوں فریقوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ہر فریق یہی سمجھتا تھا کہ دوسرے فریق نے اس پر زیادتی کی ہے اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بے خبری میں اس پر حملہ کر دیا ہے۔ اس طرح گو لڑائی کی آگ تو بھڑک اٹھی لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ نہ حضرت علیؓ نے جنگ میں پہل کی اور نہ حضرت عائشہؓ نے، جو کچھ ہوا ان مفسدہ پرداز لوگوں کی سازش سے ہوا جنہوں نے یہ سمجھ کر کہ اب ان کی خیر نہیں، جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا۔

جنگِ جمل

جب لڑائی شروع ہوئی تو حضرت علیؓ نے اپنا جھنڈا اپنے بیٹے محمدؒ کے حوالے کیا اور ان سے کہا "حملہ کرو!" لیکن انہوں نے کچھ توقف کیا۔ حضرت علیؓ نے پھر کہا "حملہ کرو!"۔ انھوں نے کہا "ابا جان! آپ دیکھتے نہیں دوسری طرف سے بارش کی طرح تیر برس رہے ہیں اس صورت میں حملہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟" آپ نے ان کے سینے میں مُکا مارا، جھنڈا اُن کے ہاتھ سے چھین کے خود آگے بڑھ کر حملہ کیا اور بصرہ کے لشکر کو پیچھے ہٹا دیا۔ اس کے بعد آپ لوٹے اور محمد کے ہاتھ میں دوبارہ جھنڈا دے کر کہا کہ اب حملہ کرو، انصار تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور پے در پے حملے کر کے بصرہ والوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

لڑائی کے دوران میں حضرت علیؓ اپنے لشکر سے آگے بڑھے اور حضرت زبیرؓ کو آواز دے کر بلایا۔ حضرت زبیرؓ اپنے لشکر سے نکلے اور ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ دونوں کے گھوڑوں کی گردنیں آپس میں مل گئیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت زبیرؓ سے کہا:

"زبیرؓ! بتاؤ تو سہی آخر تم کس بنا پر میرے مقابلہ کے لیے آئے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا:

"حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے!"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"میں قاتلینِ عثمانؓ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کیا تمہیں وہ واقعہ یاد نہیں جب ہم دونوں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تم علیؓ سے لڑو گے لیکن تمہاری یہ لڑائی حق و انصاف پر مبنی نہیں ہوگی۔"

حضرت زبیرؓ نے جواب دیا:

"واقعی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول یاد آ گیا۔ اگر مجھے یہ واقعہ پہلے یاد آ چکا ہوتا تو میں کبھی آپ کے مقابلے کے لیے نہ نکلتا۔"

چنانچہ وہ اپنے لشکر میں لوٹ آئے اور واپسی کا ارادہ کرنے لگے۔ جب اُن کے بیٹے عبداللہؓ بن زبیرؓ کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے آپ کو روکنے کی کوشش کی اور آپ پر بزدلی کا الزام لگایا۔ یہ سن کر حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے لشکر پر چند بار حملے کئے اور اپنے بیٹے سے کہا:

"کیا بزدل اسی طرح حملے کیا کرتے ہیں!"

یہ کہا اور لشکر چھوڑ کر باہر نکل آئے اور مکہ کی راہ لی لیکن راستے میں بنی تمیم کے ایک شخص عمرو بن جرموز نے آپ کو شہید کر دیا۔[1]

لڑائی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس دوران میں حضرت عائشہؓ اپنے ہودج پر سوار تھیں جسے چاروں طرف سے زرہوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ صرف اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ آپ لڑائی کا منظر دیکھ سکتی تھیں۔ اہل بصرہ اور بڑے بڑے بہادر لوگ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے چاروں طرف کھڑے آپ کی حفاظت کر رہے تھے کہ کہیں خدانخواستہ آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔ حضرت عائشہؓ کی حفاظت کرتے ہوئے کئی آدمی جاں بحق ہو گئے لیکن کسی نے ہٹنے کا نام نہ لیا۔

جب حضرت علیؓ نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کا اونٹ میدان جنگ میں کھڑا ہے اور لوگ پروانہ وار اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں تو آپ نے سوچا کہ جب تک اونٹ کو درمیان سے نہ ہٹایا جائے گا، لڑائی بند نہ ہو سکے گی۔ حضرت عائشہؓ کی حفاظت کے لیے لوگ برابر کٹتے چلے جائیں گے لیکن پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیں گے۔ چنانچہ آپ نے اپنے بعض ساتھیوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں ——— ان لوگوں نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے اونٹ تک پہنچ کے اس کی کونچیں کاٹ دیں جس سے وہ سینہ کے بل گر پڑا۔ حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابی بکرؓ جو حضرت علیؓ کی فوج کے ساتھ تھے اور عمارؓ بن یاسر نے حضرت عائشہؓ کے ہودج کو اونٹ سے الگ کیا اور آپ کو اتار کے میدان جنگ سے باہر لے گئے۔

حضرت عائشہؓ کی فوج کی پسپائی

اب اہل بصرہ میدانِ جنگ میں بغیر کسی سردار کے رہ گئے۔ زبیرؓ پہلے ہی جا چکے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو بھی میدانِ جنگ سے ہٹا دیا گیا۔ طلحہؓ شہید ہو چکے تھے۔ اہلِ بصرہ میں بھی اتفاق نہ تھا۔ ان کا ایک فریق حضرت علیؓ کا حامی تھا اور دوسرا فریق حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے ساتھ تھا۔ احنف بن قیس کی سرکردگی میں ایک فریق نے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ لوگ دل چھوڑ بیٹھے اور پسپا ہو گئے۔ میدانِ جنگ تھوڑی دیر میں فوجوں سے خالی ہو گیا۔ البتہ دونوں فریق دس ہزار لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

یہ لڑائی ۲۰ جمادی الثانی ۳۶ھ جمعرات کے دن پیش آئی۔

لڑائی کے خاتمہ پر جب سورج غروب ہو رہا تھا حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ کا ایک چکر لگایا۔ اکابر صحابہؓ اور اسلام کے جانباز سپاہی جنہوں نے کبھی دشمنانِ اسلام کے مقابلہ پر اپنی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا تھا اب آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑے پڑے تھے۔ حضرت علیؓ یہ نظارہ دیکھ کر سخت متاثر ہوئے۔ چلتے چلتے آپ حضرت طلحہؓ کی لاش کے پاس پہنچے آپ نے فرمایا "ان کو بٹھاؤ"۔ لوگوں نے انہیں بٹھایا۔ حضرت علیؓ نے اس وقت یہ فرمایا:

---

[1] بعض مورخین نے حضرت زبیرؓ کی لشکر سے واپسی کے متعلق ایک اور روایت بیان کی ہے لیکن کسی نے بھی آپ کی واپسی کے متعلق اختلاف نہیں کیا۔

"اے ابو محمد! مجھے یہ بات سخت ناپسند تھی کہ میں تمہیں آسمان کے ستاروں کے نیچے اس وادی میں خون میں لتھڑا ہوا دیکھوں۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ تم جہاد فی سبیل اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں قابلِ قدر اور نمایاں حصہ لے چکے تھے۔"

اس کے بعد آپ نے سب مقتولین کی نمازِ جنازہ ادا فرمائی اور پھر ان سب کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

حضرت علیؓ کا بصرہ میں داخل ہونا جنگ کے بعد حضرت علیؓ بصرہ میں داخل ہوتے۔ بصرہ کے بیت المال میں جس قدر خزانہ تھا وہ سب آپ نے لوگوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ کل فوج بارہ ہزار تھی ہر شخص کو پانچ پانچ سو درہم ملے۔ ایک شخص جو لڑائی میں حاضر نہ تھا آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"اے امیر المؤمنینؓ! میں دل سے آپ کا شریک تھا، گو میرا جسم لڑائی میں حاضر نہ تھا۔ آپ مالِ غنیمت میں سے مجھے بھی کچھ عنایت فرمائیں۔"

چنانچہ آپ نے اسے بھی کچھ مال دیا۔

حضرت علیؓ کے بعض ساتھیوں نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اہلِ بصرہ نے چونکہ ہتھیار اٹھائے ہیں اور وہ امامِ وقت سے برسرِ جنگ ہوئے ہیں اس لیے انہیں غلاموں کے طور پر فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت علیؓ نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا:

"آپ نے ان کا خون تو ہم پر حلال کر دیا تھا، اب انھیں قید کرنے اور غلام بنانے سے کیوں منع فرما رہے ہیں؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"میں دارالاسلام میں تمہیں غریب مسلمانوں کو غلام بنانے کی اجازت کیونکر دے سکتا ہوں، اہلِ بصرہ میدانِ جنگ میں جو مال واسباب اور ہتھیار تمہارے خلاف لڑنے کے لیے لے گئے تھے وہ تو مالِ غنیمت میں شامل ہو سکتا ہے لیکن وہ مال واسباب جو انہوں نے اپنے گھروں میں چھپا لیا ہے وہ انہی کا حق ہے اس میں سے تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔"

حضرت عائشہؓ کی مدینہ کو روانگی بصرہ میں جس مکان میں حضرت عائشہؓ مقیم تھیں حضرت علیؓ وہاں گئے اور آپ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ حضرت عائشہؓ کے مدینہ روانہ ہونے کا سامان کیا جائے۔ چنانچہ حکم کے بموجب تمام تیاری کی گئی۔ جب حضرت عائشہؓ روانہ ہونے لگیں تو حضرت علیؓ خود ان کی مشایعت میں بصرہ سے کچھ دُور تک تشریف لے گئے۔

حضرت عائشہؓ نے روانہ ہوتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم! میرے اور علیؓ کے درمیان خاندانی شکر رنجیوں کے سوا کوئی دشمنی نہ تھی، میں انہیں بہترین انسان سمجھتی ہوں۔"

حضرت علیؓ نے بھی اس کے جواب میں فرمایا:

"لوگو! ام المومنینؓ نے سچ فرمایا۔ میرے اور ان کے درمیان معمول خاندانی شکر رنجیوں سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ہیں۔"

حضرت عائشہؓ یکم رجب ۳۶ھ کو ہفتہ کے دن رات کے وقت بصرہ سے روانہ ہوئیں۔ حضرت علیؓ نے ایک منزل تک اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ بھیجا۔

حضرت علیؓ کا اہلِ بصرہ کو امان دینا

اس طرح اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے اہلِ بصرہ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ ان سے بیعت لی۔ عبداللہ بن عباسؓ کو وہاں کا والی مقرر کیا اور خراج اور بیت المال کا افسر زیاد بن ابی سفیان کو بنایا۔

مروان بن الحکم، عبداللہ بن زبیرؓ اور بنی امیہ کے دوسرے اشخاص بصرہ کے ایک گھر میں چھپ گئے تھے۔ حضرت علیؓ کو اس کا پتا چل گیا لیکن آپ بالکل خاموش رہے اور ان کو امان دے دی۔ جنگ کے روز بھی آپ کا ایک آدمی منادی کرتا پھر رہا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا اسے امان دے دی جائے گی اور جو شخص اپنے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے بھی امان دے دی جائے گی۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ مروان بن الحکم نے ہی حضرت طلحہؓ کو تیر مار کر شہید کر دیا تھا کیونکہ اسے پتا چلا تھا کہ حضرت طلحہؓ میدانِ جنگ چھوڑ کر واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(۱۱)

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کا تقابل

تاریخِ اسلام کے جس دور کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ انتہائی افسوسناک دور تھا۔ وہ مسلمان جن کی تلواریں کبھی دین کو سربلند کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں اب اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانے کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ مسلمان جو کبھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تھے جسے کوئی طاقت کمزور کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتی تھی اپنے باہمی اختلافات کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹ کر اپنی طاقت کھو چکے تھے۔ گو ہر فریق اپنے اپنے حق میں دلائل دے رہا تھا لیکن کامل طور پر کسی کو اپنے برحق ہونے کا یقین نہ تھا۔ حضرت زبیرؓ بن عوام نے ایک دفعہ لوگوں میں خطبہ دیا اور اس میں اس فتنہ کا بھی ذکر کیا۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا:

"تعجب ہے آپ موجودہ حالات کو فتنہ سے تعبیر کر رہے ہیں اور خود اس میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔"

انہوں نے جواب کہا:

"خدا کی قسم! میں نے آج تک کسی کام میں اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈالا جب تک مجھے یقین نہیں ہو گیا کہ حق

کس طرف ہے۔ لیکن موجودہ واقعات کے متعلق مجھے اب تک یقین نہیں کہ حق کس طرف ہے!"

حضرت طلحہؓ سے بھی ایک ایسی روایت مروی ہے انہوں نے ایک دفعہ فرمایا:

"میں وثوق کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ آیا میں حق پر ہوں یا ناحق پر۔"

یہی سبب تھا جس نے کئی جلیل القدر صحابہؓ کو اس نزاع سے بالکلیہ علیحدہ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے نہ حضرت علیؓ کی بیعت کی اور نہ آپ کے خلاف کسی قسم کی کوئی سرگرمی دکھائی بلکہ عزلت اور گوشہ نشینی کو ترجیح دی۔ ان لوگوں میں سے مشہور یہ صحابہؓ ہیں:

حضرت عبداللہؓ بن عمر بن الخطاب، حضرت محمدؓ بن مسلمہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہؓ بن سلام۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فرمایا کرتے تھے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ جب لوگوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو میں اپنی تلوار کو لے کر مدینہ سے باہر نکلوں اسے اُحد پہاڑ پر مار مار کر ٹکڑے کر دوں۔ اس کے بعد گھر واپس آ کر گوشہ نشینی اختیار کر لوں اور مطلق باہر نہ نکلوں۔ یہاں تک کہ میرا جنازہ ہی گھر سے باہر نکلے۔"

پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عثمانؓ کے انتقام کے نام سے تحریک اٹھی، جنگ جمل میں کس طرح حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے لشکر کو شکست ہوئی اور کس طرح حضرت عائشہؓ کی مدینہ کو واپسی عمل میں آئی اور وہ اس کے بعد کبھی جنگ کے لیے باہر نہیں نکلیں۔

اس موقعہ پر حضرت عائشہؓ کی بہادری اور جرأت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میدانِ جنگ میں آپ پر اور آپ کے اونٹ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن آپ نے کسی قسم کی گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نہایت دلیری سے اپنے ساتھیوں کو مقابلہ کے لیے اُبھارتی اور جرأت دلاتی رہیں۔ جنگ کے دوران میں آپ کے مخالفوں کا سارا زور آپ کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی حفاظت کی خاطر آپ کے گرد و پیش ستر بہادر مارے گئے لیکن آپ نہایت بے خوفی سے میدانِ جنگ میں ڈٹی رہیں۔

لیکن باوجود بہادری کے ایسے شاندار مظاہرہ کے آپ کو حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ مشہور مؤرخ نجار اپنی کتاب "الخلفاء الراشدون" میں لکھتا ہے:

"حضرت عائشہؓ کے لیے یہ مناسب[1] نہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتیں اور حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کے لئے خود کھڑی ہو جاتیں۔ انہیں پتا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے کئی رشتہ دار موجود تھے جو آپ کے خون کا انتقام لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ شام میں حضرت معاویہؓ نے اسی بات کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ انہیں حق تھا کہ آپ کے قصاص کا مطالبہ کرتے اور وہ ایسا کرنے پر قادر بھی تھے لیکن حضرت عائشہؓ ان لوگوں میں سے نہیں تھیں جنہیں خدا تعالیٰ نے ایسا مطالبہ کرنے کا اختیار دیا ہو۔ وہ حضرت عثمانؓ کی رشتہ دار نہیں تھیں۔ اگر آپ اس قضیے میں دخل نہ دیتیں تو یہ سارا جھگڑا خود بخود تھوڑے دنوں کے بعد بصرہ ہی میں ختم

---

[1] یہ حضرت عائشہؓ کی اجتہادی غلطی کہی جا سکتی ہے اور کسی اُمتی کو ان پر تنقید کرنے کا حق نہیں ہے۔ مزید آنکہ دونوں حضرات سازش کے شکار ہوئے تھے العیاذ باللہ ان کی نیتوں میں کوئی فساد نہیں تھا۔ (ہاشمی)

ہو جاتا اور مسلمانوں کو ایک خونریز جنگ، تفرقہ اور اختلاف سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔

یہی حال حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا تھا وہ بھی حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں میں سے نہ تھے اور انہیں حضرت عثمانؓ کے خون کا انتقام لینے اور اس غرض کے لیے آواز اٹھانے کا کوئی اختیار نہ تھا۔[1]

اب ہم حضرت علیؓ کی عظیم الشان شخصیت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کو مختلف دبیز پردوں میں اس طرح چھپا دیا گیا ہے کہ تاریخ دان کے لیے اس کے صحیح خدوخال متعین کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ آپ کے متعلق فی مبالغہ آمیز اور جھوٹی باتیں مشہور کر دی گئی ہیں، آپ کی توصیف اور تنقیص دونوں میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ فتنہ کو فرو کرنے میں آپ نے پوری حکمت عملی سے کام نہیں لیا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو راضی کر کے انہیں بصرہ اور کوفہ کی ولایت سپرد کر دیتے۔ ایسا کرنے میں خدا تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی بھی نہ ہوتی اور رعایا بھی پوری طرح مطیع رہتی۔ اس طرح فتنہ اٹھنے کا کوئی امکان ہی نہ رہتا۔ اگر حضرت علیؓ کو اس بات کا ڈر تھا کہ ان دونوں کو اگر بصرہ اور کوفہ کی ولایت سپرد کی گئی تو کہیں یہ وہاں کے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا نہ دیں تو اس کا آسان علاج یہ تھا کہ شروع میں حکمتِ عملی سے کام لے کر ان دونوں کو ان کے حسب منشا ولایت سونپ دی جاتی۔ لیکن جب حضرت علیؓ کی خلافت خوب مستحکم ہو جاتی تو ہٹا دیا جاتا۔ اس طرح یہ دونوں حضرت علیؓ کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکتے۔

لیکن ان مؤرخین کا یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ امیر المومنینؓ نے ان دونوں کو کوفہ اور بصرہ کی ولایت سپرد نہ کر کے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اگر آپ عراقین (کوفہ اور بصرہ) کی ولایت انہیں سپرد کر دیتے تو یہ علاقے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے نکل جاتے اور یہ دونوں وہاں اپنی من مانی کرتے۔ انھیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔ ان کی حمایت میں پہلے ہی ایک گروہ وہاں موجود تھا۔ ادھر شام سے معاویہؓ بھی انہیں انگیخت دلا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں امیر المومنینؓ پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

البتہ یہ کہنے سے باز نہیں رہا جا سکتا کہ حضرت علیؓ کا دباؤ اپنی فوجوں پر اس سختی کے ساتھ نہیں تھا جس سختی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا ذریعۂ اطلاعات بھی بہت کمزور تھا۔ اکثر باتوں کا آپ کو علم ہی نہ ہوتا تھا۔ حضرت عمر بن الخطاب مدینہ میں بیٹھے ہوئے عراق، ایران، آرمینیا، شام، مصر اور روم میں پڑی ہوئی فوجوں کے تمام حالات سے مکمل طور پر آگاہ رہتے تھے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ لیکن ادھر حضرت علیؓ کی زیر کمان فوج میں ایک بہت بڑا عنصر فتنہ پردازوں کا موجود تھا۔ ان لوگوں کے باقاعدہ اجتماع ہوتے تھے، سازشیں ہوتی تھیں، مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے مختلف تدبیروں کے بارے میں مشورے ہوتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ حضرت علیؓ ان سب باتوں سے بالکل بے خبر تھے اور آپ کو مطلق پتا نہ تھا کہ خود آپ کے لشکر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اگر آپ کا ذریعۂ اطلاعات مضبوط ہوتا۔ فوج پر آپ کا دباؤ کمزور نہ ہوتا تو یہ مفسدین کبھی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکتے اور مسلمانوں کے درمیان وہ خون ریزی نہ ہوتی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

---

[1] ان تمام باتوں کے باوجود یہی سمجھنا چاہیے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ سے اجتہادی غلطی صادر ہوئی۔ اس سلسلے میں مورخ نگار کے ریمارکس مناسب نہیں ہیں۔ (ہاشمی)

خضری مرحوم اپنی کتاب "محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ" میں لکھتے ہیں :

"ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں فریقوں کو غلطیوں سے بالکل مبرا ٹھہرا سکیں۔ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ یہ مطالبہ لے کر اٹھے تھے کہ حضرت عثمانؓ کے خونِ ناحق کا بدلہ لیا جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ ان کی نظروں سے یہ حقیقت کس طرح پوشیدہ ہو گئی کہ ایسے معاملات انفرادی طور پر طے نہیں کیے جاتے بلکہ امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ صرف امام ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاملات کی اچھی طرح چھان بین کرے اور جس پر چاہے حد قائم کرے اور جس کو چاہے چھوڑ دے۔

اگر عامۃ المسلمین یہ دیکھتے کہ حضرت علیؓ خلافت اور امامت کا کام ٹھیک طور پر بجا نہیں لا رہے تو اس صورت میں کبار صحابہؓ کا یہ فرض تھا کہ وہ دوسرے معاملات کو چھوڑ کر سب سے پہلے امر خلافت کی طرف متوجہ ہوتے اور اس شخص کو خلافت تفویض کرتے جس پر سب لوگوں کا اتفاق ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ حضرت عثمانؓ کے انتقام کا سوال اٹھاتے۔ لیکن اس کے برعکس امت کے معزز ترین افراد بطور خود انتقام لینے کے لیے کھڑے ہو گئے لوگوں کو اپنی طرف بلایا لیکن امام کی طرف رجوع نہ کیا۔ تعجب ہے کہ اپنی سابقیتِ اسلام اور بے نظیر علم و فضل کے ہوتے ہوئے یہ ضروری امر ان سے کس طرح پوشیدہ ہو گیا۔

ان لوگوں سے قطع نظر جب ہم حضرت علیؓ کی طرف اپنی نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان میں وہ حکمتِ عملی نہیں تھی جس سے کام لے کر وہ اس زبردست انتشار کو جو امت میں پیدا ہو گیا تھا دور کرتے۔

اس فتنہ کو بھڑکانے میں سب سے زیادہ حصہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حصہ لیا تھا۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ امت کو کسی قسم کی بھلائی سے حصہ مل سکے۔ انہوں نے مختلف تدابیر اختیار کر کے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا اور عین اس وقت جبکہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی انہوں نے اپنی فتنہ پردازی کو کام میں لا کر اور دونوں کو ایک دوسرے سے برگشتہ کر کے ایک دوسرے کے خلاف بھڑا دیا۔ ہر گروہ یہی سمجھتا تھا کہ دوسرے نے غداری اور دھوکا بازی کی ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ حضرت علیؓ نے ان کو اپنی فوج میں رکھا اور ان سے مدد لی۔ حالانکہ ہر طرف سے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے انتقام لینے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کے درمیان اتفاق ہو گیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔ اسی لیے ان لوگوں کی پوری کوشش اس بات کے لیے تھی کہ صلح کی کوئی بات چیت پروان نہ چڑھ سکے اور کسی طرح دونوں لشکر ایک دوسرے سے بھڑ جائیں۔ محض ان لوگوں کا حضرت علیؓ کی فوج میں رہنا ہی لوگوں کے اس یقین کے لیے کافی تھا کہ حضرت علیؓ بھی حضرت عثمانؓ کا خون بہانے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک تھے۔ اگرچہ حضرت علیؓ اس الزام سے قطعی طور پر انکار کرتے تھے اور واقعی ان کا انکار بالکل صحیح تھا لیکن اس موقعہ پر جب دلوں میں جوش بھرا ہوا تھا حضرت علیؓ کی باتوں کا کون

یقین کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد ہوتی ہے۔ کسی فعل سے کسی شخص کی برأت کے لیے محض یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوتا کہ اس نے یہ فعل نہیں کیا بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر ایسی چیز سے مجتنب رہے جو شک وشبہ پیدا کرنے والی ہو۔ اسی طرح کسی رئیس اور سردار کے مرکز کی مضبوطی کے لیے یہ امر کافی نہیں ہوتا کہ اس کے پاس اتنی قوت ہو جس سے وہ اپنے مخالفین پر غالب آجائے۔ بلکہ قوت کے ساتھ ساتھ اسے مختلف تدابیر اور حکمتِ عملی سے بھی کام لینا چاہیے تاکہ جو فتنہ ایک بار اس کے خلاف اُٹھے وہ دوبارہ اُٹھ ہی نہ سکے۔"

جنگِ جمل کے موقع پر حضرت علیؓ کی سیرت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ آپ جنگ کے بعد اپنے مخالفین سے نہایت رحمی اور حلم سے پیش آئے۔ نہ کسی کو قتل کیا، نہ کسی کا مال چھینا اور نہ کسی کو قید کیا۔

اگر دیکھا جائے تو جنگِ جمل دراصل اہلِ بصرہ پر اہلِ کوفہ کی فتح تھی۔ اپنی کتاب "عثمانؓ بن عفان" میں ہم نے دونوں شہروں کے باشندوں کے درمیان جاہلی عصبیت کے اثر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ قریش کے سرداروں میں سے تھے ان دونوں کی شہادت نے قریش کے باقی قبائل کی سرداری پر بہت بُرا اثر ڈالا ان کی حیثیت دوسرے قبائل کے مقابلے میں بہت گر گئی اور ان کی قوت کو بہت نقصان پہنچا۔ جنگِ جمل میں حضرت علیؓ کی کامیابی قریش کی حضرت علیؓ سے نفرت اور اہلِ کوفہ کی جانب سے حضرت علیؓ کی امداد ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ اپنا مرکز مدینہ سے کوفہ منتقل کرنے پر مجبور ہو گئے تاکہ آپ قریش کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکیں اور کوفہ میں رہ کر وہاں کے باشندوں کی مدد ہر وقت حاصل کر سکیں۔

(۱۲)

عراق اور شام

جنگِ جمل کے بعد ۳۶ھ میں حضرت علیؓ نے اپنا دار الخلافہ مدینہ کی بجائے کوفہ کو بنا لیا۔ دار الحکومت کی یہ تبدیلی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سات ماہ بعد وقوع میں آئی۔ خلافت کے ابتدائی چار ماہ آپ نے مدینہ میں گزارے اور بقیہ تین مہینے اس سفر میں جس میں جنگِ جمل وقوع میں آئی تھی۔ اس سے پہلے کسی خلیفہ نے کوفہ کا دورہ تک نہ کیا تھا۔ جب حضرت علیؓ نے اسے اپنا دار الخلافہ بنانے کا فیصلہ کیا تو وہاں کے باشندوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو ماسینیون کوفہ کے متعلق اپنے ایک مضمون میں بیان کرتا ہے کہ زمانۂ اسلام میں پہلا شہر جو آباد کیا گیا وہ مدینہ منورہ تھا۔ لیکن تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کوفہ نے جو ترقی کی اس کا مقابلہ مدینہ نہیں کر سکتا۔ کوفہ کو اس وقت دار الخلافہ بنایا گیا جب مسلمان ایران پر قابض ہو کر ایرانیوں کے تہذیب و تمدن کو اپنا چکے تھے۔

موسیو ماسینیون لکھتا ہے کہ کوفہ کو آباد کرنے میں سب سے زیادہ حصہ اہلِ یمن کا تھا۔ یمنیوں نے اس سے پہلے بھی کئی شہر آباد کیے ہوئے تھے۔ یمن نہایت سرسبز علاقہ ہے زراعت کے لیے موزوں ہے اور عرب کے دیگر حصّوں کے مقابلہ میں زیادہ آباد ہے۔ اسلام سے کافی عرصہ پیشتر اہلِ یمن، تہذیب و تمدن کے میدان میں بہت ترقی کر چکے تھے۔ جن لوگوں نے "تاریخِ اسلام" کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ اہلِ یمن کا عربی تہذیب و تمدن کو نشوونما دینے میں بہت زیادہ حصّہ ہے۔ مصر میں انہوں نے اس تہذیب و تمدن کو جلا دی، فسطاط کی آبادکاری میں حصّہ لیا اور اندلس میں اس تہذیب کو پروان چڑھایا۔

کوفہ نے علم و ادب کے میدان میں بہت ترقی کی۔ اس میں ہر قبیلہ کا علٰحدہ علٰحدہ محلہ تھا۔ یہاں علم الانساب کو بے حد عروج حاصل ہوا۔ سیکڑوں نسّاب کوفہ میں موجود تھے جو مختلف قبیلوں سے وابستہ تھے اور اپنے اپنے قبیلہ کو اس کے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

یہاں عالمِ اسلامی کے ممتاز عالم اور رہنما موجود تھے۔ کئی صحابہؓ بھی یہاں آکر آباد ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہاں علومِ دینیہ کا بے حد چرچا تھا۔

سیاسیات میں بھی اہلِ کوفہ جوش و خروش سے حصّہ لیتے تھے۔ یہاں کے لوگ حضرت علیؓ کے پُرجوش حامی تھے۔

کتابت اور خوشنویسی میں یہاں کے بعض لوگوں کو کمال حاصل تھا۔ چنانچہ "خطِ کوفی" اب تک مشہور ہے اور قرآن مجید زیادہ تر اسی خط میں لکھا جاتا ہے۔

نحو یہاں پروان چڑھی۔ چونکہ اس شہر کے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ اپنے فصیح و بلیغ خُطبے دیا کرتے تھے اس لئے فصیح و بلیغ نثر کو بھی یہیں عروج حاصل ہوا۔

اپنے مضمون کے خاتمہ پر موسیو ماسینیون کوفہ کی موجودہ حالت کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتا ہے کہ اب کوفہ کی شان و شوکت جو اُسے ابتدائی زمانۂ اسلام میں حاصل تھی ختم ہو چکی ہے۔ اب یہ عراق کا ایک معمولی قصبہ ہے اور دُوسرے شاندار اور بڑے بڑے شہروں کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں لیکن علم و ادب کے میدان میں اس نے جو ترقی کی اس کی یاد آج تک لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوئی اور یہاں کے علماء کے تذکرے اب تک زبان زدِ خلائق ہیں۔

شہر کوفہ جہاں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ترقی پذیر تھا۔ وہاں اس شہر میں ایسے لوگ کثرت سے موجود تھے جو حضرت علیؓ کے پُرجوش حامی تھے۔ یہی دیکھ کر حضرت علیؓ نے اسے اپنا دار الخلافہ بنانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو اہلِ حجاز پر پُورا بھروسا نہیں تھا کہ وُہ جان و دل سے آپ کی حمایت کریں گے۔ اس کے برخلاف اہلِ عراق سے آپ مطمئن تھے کہ وہ آپ کے دشمنوں کے خلاف آپ کی مدد کریں گے۔ اسی لیے آپ حجاز کو چھوڑ کر عراق تشریف لے آئے۔

لیکن اعرابِ عراق کے متعلق حضرت علیؓ کی توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ یہ لوگ نہایت سرکش تھے اور ہمیشہ حکومتِ وقت کی مخالفت پر کمربستہ رہتے تھے، بدوی اخلاق و عادات ان پر غالب تھے۔ ان لوگوں نے عراق کی فتوحات، ایران اور آرمینیا کی تسخیر میں قابلِ قدر حصّہ لیا تھا۔ ان کی کئی شاخیں تھیں ان میں سے اکثر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد

اختیار کر لیا تھا لیکن جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف سخت گیر پالیسی اختیار کی تو یہ لوگ دوبارہ اسلام لے آئے۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کبھی فوجی خدمت نہ لی۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں عراق اور ایران کی تسخیر کے لیے اسلامی فوجیں جا رہی تھیں اور لڑنے والے لوگوں کی سخت ضرورت تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ آپ ایسے لوگوں سے مدد لیں جو ایک مرتبہ پہلے مسلمانوں کو دھوکا دے چکے تھے اور انہوں نے ایک انتہائی نازک وقت میں ارتداد اختیار کر لیا تھا۔ مثنیٰ بن حارثہ نے آپ سے سفارش کی کہ اس وقت لوگوں کی شدید ضرورت ہے ایرانیوں نے ہمارے مقابلے کے لیے زبردست لشکر تیار کئے ہیں اس لیے ان لوگوں کو فوج میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹے اور ان لوگوں کو اسلامی لشکر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے لوگوں کو عراق کا رُخ کرنے اور دشمنانِ اسلام سے لڑنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ لوگ جوق در جوق اسلامی لشکر میں شامل ہونے شروع ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے ایسے لوگوں کو، جنہوں نے ارتداد اختیار کیا تھا، لیکن بعد میں اپنے فعل پر پشیمان ہونے تھے اور اب تک ان سے خلافِ اسلام کوئی فعل صادر نہیں ہوا تھا، اسلامی لشکر میں شامل کر لیا۔ لیکن انہیں فوج کا کوئی عہدہ سپرد نہیں کیا گیا۔ فوج کے سالاروں کو ہدایت تھی کہ وہ ان لوگوں کو فوج کا امیر اور سردار نہ بنائیں۔

جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو ان لوگوں کو زیادہ آزادی ملی اور یہ کثرت سے فوج میں جانے لگے۔ چنانچہ لڑائیاں زیادہ تر عراق کے اطراف و جوانب میں ہو رہی تھیں اس لیے ان لوگوں کو عراق میں جانے کا موقع ملا اور اس علاقہ میں ان کے پاؤں اچھی طرح جم گئے۔ بصرہ اور کوفہ پر بھی ان کا تسلط ہو گیا۔ یہ لوگ آزاد منش تھے۔ پہلے بھی خلیفہ کے مقابلہ میں سرکشی دکھا کر اسلام سے ارتداد اختیار کر چکے تھے۔ ان کی یہ خو عرصہ گذر جانے پر بھی نہ گئی۔ قریش کی ولایت اور حکومت انہیں دل سے ناپسند تھی اس لیے یہ جا و بے جا طور پر عمّال اور والیوں پر نکتہ چینیاں کرنے لگے۔ کوئی امیر ایسا نہ تھا جس کی شکایتیں انہوں نے دربارِ خلافت میں نہ کی ہوں، کوئی والی ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے طرح طرح کے جھوٹے سچے الزامات نہ لگائے ہوں۔ ان کا ہر شخص اپنی غرض کا بندہ تھا اور دوسرے کے تسلط کو ناپسند کرتا تھا۔ اس طرح اس علاقہ میں ایک انتشار برپا ہو گیا۔ گروہ بندیاں قائم ہو گئیں اور عراق شرپسندوں کا مسکن بن گیا جن کے درمیان کسی قسم کا اتحاد نہ تھا۔

اہلِ عراق کے مقابلہ میں اہلِ شام میں مکمل اتحاد تھا۔ شام ان دنوں چار صوبوں میں منقسم تھا:

۱۔ فلسطین

۲۔ اردن

۳۔ دمشق

۴۔ حمص

جزیرہ اور آرمینیا کے علاقے بھی شامیوں کے تسلط میں تھے۔ شام میں بھی عراق کی طرح مہاجرین، انصار اور قبائل عرب موجود تھے جنہوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تھا اور اب وہ اس کی سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ عراق کی طرح یہاں بار بار امیر اور والی بدلے نہیں جاتے تھے بلکہ ان کے امیر حضرت عمرؓ کے بعد سے حضرت معاویہؓ بن ابوسفیان ہی تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں چار صوبوں کی ولایت سپرد کی تھی۔ جزیرہ اور آرمینیا کی ولایت پر حضرت عثمانؓ نے ان کو مقرر فرمایا۔ حضرت معاویہؓ کی اطاعت اہل شام نے نہایت فرمانبرداری سے کی اور کسی شخص کے دل میں ان پر اعتراض اور تنقید کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے سیاستدان تھے نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے تمام صوبہ کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا، اور کسی شخص کو ان سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں دوسرے والی تھوڑے سے عرصہ کے بعد تبدیل کر دیے جاتے تھے حضرت معاویہؓ کی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ بہت طویل عرصہ تک اسی علاقہ کے والی بنے رہے۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب کو یہ بات میسر نہ تھی آپ مدینہ چھوڑ کر عراق تشریف لے آئے تھے یہاں کے لوگ زبان سے تو آپ کی اطاعت کا اقرار کرتے اور آپ کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے لیکن درپردہ آپ کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ لوگ انتہائی درجہ کے خود غرض تھے جب کبھی طوعاً و کرہاً انہیں حضرت علیؓ کا کوئی حکم بجا لانا پڑتا اور آپ کی اطاعت کرنی پڑتی تو یہ ظاہر کرتے کہ ایسا کر کے انہوں نے حضرت علیؓ پر زبردست احسان کیا ہے اور انہیں بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ انہیں اپنے ہر کام میں شریک کریں اور حکومت میں ان کا بھی حصہ ہو۔ حضرت علیؓ کی کسی اپیل کا اس وقت تک جواب نہیں دیتے تھے جب تک آپ انہیں اپنے خفیہ اور ضروری امور سے مطلع نہ کرتے تھے اور مشورہ کرتے وقت انہیں بھی شریک نہ کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا لشکر کبھی بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا اور دشمن پر کبھی فتح یاب نہیں ہو سکتا کیونکہ فتح کی پہلی شرط یہ ہے کہ فوج اپنے افسروں کے احکام کی بلا چون و چرا اور آنکھیں بند کر کے اطاعت کرے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ باوجود اس کے کہ ان کا پایہ مسلمانوں میں اتنا بلند نہیں، کس طرح حضرت علیؓ پر فتح یاب ہو گئے اور حضرت علیؓ اسلام میں سابقیت اور فضیلت حاصل ہونے کے باوجود کس طرح ان کے مقابلے میں بے بس ہو گئے۔

حضرت معاویہؓ اہل عراق کی سرشت اور رگ رگ سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنے اس علم سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔ ان کی کامیابی یقینی بھی تھی کیونکہ اتحاد، یک جہتی اور امیر کی آنکھیں بند کر کے اطاعت کرنا کامیابی اور فتح و ظفر کے زبردست عوامل ہیں۔

حضرت علیؓ عراقیوں اور شامیوں کی سرشت سے بالکل ناواقف تھے انہیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ شامیوں کے دلوں میں حضرت معاویہؓ کی کتنی قدر و منزلت ہے۔ حضرت معاویہؓ کے لیے ایک اور بات بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی وہ یہ کہ آپ مدت مدید سے شام کے تمام ضلعوں پر حاکم تھے۔ اگر آپ صرف دمشق کے علاقہ پر حاکم ہوتے تو کبھی آپ کو وہ طاقت حاصل نہ ہوتی

جو شام کے تمام ضلعوں کے اپنے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے آپ کو حاصل ہوئی۔ اگر آپ صرف ایک علاقہ کے حاکم ہوتے تو حضرت علیؓ کے مقابلہ میں آپ کو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔

حضرت معاویہؓ کی کامیابی کا ایک اور سبب بھی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اہلِ شام کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے مظلومانہ قتل میں شریک تھے اور چونکہ حضرت عثمانؓ کا خون حضرت علیؓ کی گردن پر ہے اس لیے اُن سے لڑنا واجب ہے۔ لوگوں کو جوش دلانے کے لیے حضرت معاویہؓ کے پاس چند چیزیں ایسی بھی پہنچ گئی تھیں جن کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی حضرت عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص اور حضرت نائلہؓ کی انگلیوں کی نمائش ایک سال تک دمشق کے منبر پر کی۔ آپ موقعہ بموقعہ یہ چیزیں لوگوں کو دکھاتے۔ ان کے دلوں میں جوش پیدا کرتے تھے اور انہیں اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ علیؓ خلافت کے غاصب اور مظلوم خلیفہ کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہیں۔ ان چیزوں سے بہتر اور کون سی چیز لوگوں کو جوش دلانے کی ہو سکتی تھی۔ ذرا اپنے ذہن میں خلیفہ کی خون آلود قمیص اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیوں کا منظر لائیے جو ہر وقت لوگوں کی نظروں کے سامنے رہتی تھیں اور پھر اس جوش کا اندازہ کیجئے جو ان چیزوں کے دیکھنے سے اہلِ شام کے دلوں میں پیدا ہوتا تھا۔ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہ تھا جس سے کام لے کر اپنے ساتھیوں کے دلوں میں جوش پیدا کرتے اور اس طرح ان کی بہادری کو کام میں لاتے۔

یہ امور حضرت معاویہؓ کی تقویت کا زبردست موجب ثابت ہوئے۔ انھوں نے آپ کی قوت اور رسوخ کو بڑھایا اور آپ کو کسی قسم کی مخالفت پیش نہ آئی۔ برخلاف اس کے حضرت علیؓ کو اپنے لشکر میں وہ "نفوذ" حاصل نہ ہو سکا جو حضرت معاویہؓ کو اپنے لشکر میں تھا۔

حضرت علیؓ اہلِ عراق کی شرارتوں اور ان کی خواہشات سے بالکل ناواقف تھے۔ اہلِ عراق میں کسی قسم کا اتحاد اور اتفاق نہ تھا۔ ان کے حالات میں ابتری پیدا ہو رہی تھی۔ اسی لیے آپ کو ان کی اطاعت حاصل کرنے میں سخت دشواری پیش آئی اور حضرت معاویہؓ کے لیے یہ بات بہت آسان ہو گئی کہ وہ مختلف حیلوں سے کام لے کر اہلِ عراق کو حضرت علیؓ کی امداد سے روک دیں۔

(۱۳)

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ

پچھلی فصل میں ہم نے ان واقعات کا تجزیہ کیا تھا جو شام اور عراق میں رُونما ہو رہے تھے۔ اور بتایا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین تنازعات میں شام اور عراق والے کیا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ اس فصل میں ہم حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اخلاق و عادات پر بحث کریں گے۔

ایک مورخ کے لیے ان اسباب کا معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان خصومت و عداوت کا موجب بنے۔ اسی طرح وہ اسباب ظاہر و باہر ہیں جن کی بنا پر عرب کے بعض قبائل اور جماعتوں نے امام وقت اور خلیفۃ المسلمین حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کا ساتھ دیا جنہیں علم و فضل اور تقویٰ و پرہیزگاری میں حضرت علیؓ سے کوئی نسبت نہ تھی۔

وُہ جماعتیں جو اسلامی فتوحات کی کثرت اور مغلوب قوموں کے خزانوں کے عرب میں منتقل ہو جانے کے بعد عیش و عشرت کی زندگی گزارنا اور غلبہ و اقتدار حاصل کرنا چاہتی تھیں وہ حضرت علیؓ میں اپنے لیے کوئی کشش نہیں پاتی تھیں۔ حضرت علیؓ ان کی خواہشوں اور آرزوؤں کو پورا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آپ کا مطمح نظر حق و انصاف قائم کرنا تھا۔ آپ کسی کمزور و بے کس کو غریب جان کر اس کے حقوق کی طرف سے پہلو تہی نہ کرتے تھے اور نہ بڑے آدمیوں اور امیر کبیر انسانوں کے متعلق یہ برداشت کر سکتے تھے کہ وہ دولت و ثروت کے نشہ میں چُور ہو کر کسی قسم کی بدعنوانی کریں۔ عام انسانوں کے ساتھ ہی آپ کا یہ حال نہ تھا بلکہ اپنے بیٹوں، رشتہ داروں، دوستوں اور مددگاروں کے ساتھ بھی آپ کا سلوک اسی قسم کا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے بھائی حضرت عقیلؓ نے ایک دفعہ بیت المال سے کچھ رقم لینی چاہی جس کے وہ حقدار نہ تھے۔ حضرت علیؓ نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ آپ کو چھوڑ کر معاویہؓ سے جا ملے۔ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ انہیں تین لاکھ دینار دے دیے جائیں۔ حضرت عقیلؓ نے اس وقت یہ فقرہ کہا:

ان اخی خیر لی فی دینی و معاویۃ خیر لی فی دنیای۔

"دین کے لحاظ سے میرے بھائی (علیؓ) میرے لیے بہترین آدمی ہیں اور دنیا کے لحاظ سے معاویہؓ میرے لیے بہترین شخص ہیں۔"

ظاہر ہے کہ جو شخص اس سیرت کا مالک ہو اس کی طرف لالچی اور صاحبِ اغراض لوگ جنہیں دنیا کمانے سے غرض ہوتی ہے توجہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس قسم کے تمام لوگ حضرت معاویہؓ سے جا ملے اور ان کی مدد کرنے، ان سے مل کر حضرت علیؓ کے خلاف جنگوں میں شریک ہونے لگے۔ اس کے بدلہ میں حضرت معاویہؓ نے ان پر داد و دہش کی بارش شروع کر دی اور انہیں آپ کے پاس سے وُہ کچھ حاصل ہوا جو امیر المومنین حضرت علیؓ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت علیؓ میدانِ سیاست کے شہسوار نہیں تھے۔ لیکن آپ زُہد و ورع، تقویٰ اور خدا ترسی کے لحاظ سے ایک بے مثل انسان تھے۔ فقہی مسائل کے استخراج میں آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ شریعت کے احکام کی بجا آوری میں آپ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ نفسانی خواہشات کے پاس تک نہ پھٹکتے تھے۔ جرأت، دلیری اور بہادری میں طاق تھے۔ دنیا بنانے سے پہلے آخرت سدھارنے کی فکر کرتے تھے اور بندوں کو خوش کرنے سے پہلے خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی تدابیر اختیار کرتے تھے۔ غرضیکہ آپ اسلامی اخلاق کے کامل مظہر اور حقیقی طور پر دینی مصلح تھے۔

عدی بن حاتم آپ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ جو بات کہتے تھے میزانِ عدل پر پُوری اُترتی تھی۔ جو فیصلہ کرتے تھے محکم دلائل پر مبنی ہوتا تھا۔ حکمت آپ کے گھر کی لونڈی تھی اور علم کے چشمے آپ کے دل سے ہمیشہ پھوٹتے رہتے تھے آپ دنیا اور اس کی شان و شوکت سے دُور بھاگتے تھے اور رات اور اس کی وحشت ناکی سے اُنس کرتے تھے۔ آپ بجد آنسو بہانے والے اور خوب غور و فکر کرنے والے تھے۔ تنہائی میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرتے تھے اور اپنی پچھلی زندگی پر افسوس (اگرچہ وہ انتہائی پاکیزہ تھی)، آپ کا لباس نہایت معمولی اور کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا۔ گزارہ کے لیے اتنا ہی لیتے تھے جو آپ کو بمشکل کافی ہوتا تھا۔ وہ ہم لوگوں سے کسی طرح کا امتیاز نہ رکھتے تھے۔ اہلِ علم اور اہلِ دین کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ مسکینوں اور محتاجوں سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ کسی طاقتور آدمی کی شرارتوں اور ظلم سے ڈرتے نہ تھے اور آپ کے دربار سے کوئی کمزور آدمی مایوس ہو کر نہ لوٹتا تھا۔ میں نے ایک دن آپ کو کافی رات گئے مسجد کی محراب میں اس حالت میں کھڑا دیکھا کہ آپ کے آنسو ٹپ ٹپ آپ کی داڑھی پر گر رہے تھے اور اسے تر کر رہے تھے۔ آپ زار و قطار رو رہے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے:

"اے دنیا! میں نے تجھے تین طلاقیں دیں، میں تیری طرف کسی صورت میں بھی مائل نہیں ہو سکتا۔"

جہاں آپ اپنے نفس کا شدت سے محاسبہ کرتے تھے وہاں اپنے عمّال کی بھی سختی سے بازپرس کرنے میں تامل نہ کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اکثر عمّال آپ سے ناراض ہو کر آپ کی حمایت اور مدد سے دست کش ہو گئے۔ ایسے لوگوں میں مصقلہ بن ہبیرۃ الشیبانی اور آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہؓ بن عباسؓ بھی تھے، حالانکہ عبداللہؓ بن عباسؓ شروع میں آپ کے زبردست حامیوں اور مددگاروں میں تھے۔ آپ کے بے لاگ ہونے نے حضرت زبیرؓ اور طلحہؓ کو آپ سے ناراض کر دیا حالانکہ اگر آپ کوشش کرتے تو وہ آپ کے حامیوں میں شامل ہو سکتے تھے۔ اسی طرح آپ نے حضرت عمروؓ بن العاص کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی اور انھیں اپنا مخالف بنا لیا۔ ابن عباسؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ معاویہؓ، ابنِ عامر اور حضرت عثمانؓ کے مقرر کیے ہوئے دُوسرے عمّال کو اس وقت تک معزول نہ کریں جب تک وہ آپ کی بیعت میں شامل نہ ہو جائیں اور لوگوں کا موجودہ جوش و خروش ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا:

"میں دین میں مداہنت سے کام لینا نہیں چاہتا۔"

اس پر انہوں نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے تو کم از کم معاویہؓ کو ان کی جگہ پر رہنے دیں باقیوں کو بیشک معزول کر دیں، کیونکہ معاویہؓ بڑی جرأت والے شخص ہیں۔ شام پر ان کا پورا تسلط ہے اور شامی ان کی بات بہت مانتے ہیں مزید برآں انہیں حضرت عمرؓ نے شام کی ولایت سپرد کی تھی۔ لیکن آپ ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہے اور فرمایا:

"خدا کی قسم! میں معاویہؓ کو دو دن کے لیے بھی عامل نہیں رہنے دُوں گا۔"

اگر آپ چاہتے تو ڈپلومیسی سے کام لے کر انہیں شروع میں ان کے عہدہ پر برقرار رہنے دیتے اور جب آپ کی حکومت اچھی طرح مستحکم ہو جاتی تو معزول کر دیتے، لیکن حیلے اور دھوکے آپ کے مذہب میں داخل نہ تھے۔ آپ جس بات کو حق سمجھتے تھے، برملا کہہ دیتے تھے اور یہ نہ دیکھتے تھے کہ اس کا اثر کیا ہو گا۔

ایک دفعہ دشمنوں سے ایک خونریز لڑائی کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

"کسی بھاگتے ہوئے آدمی کا پیچھا نہ کرو، کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ اور کسی شخص کا مال نہ چھینو۔"

اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ میدانِ جنگ میں آپ کی فوج نے کثیر مقدار میں سونا چاندی اور مال و متاع پایا لیکن کسی شخص نے سوائے دشمنوں کے ہتھیاروں اور سواریوں کے اور کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ جب آپ کے بعض ساتھیوں نے آپ سے کہا:

"امیر المومنین! یہ کیا بات ہے آپ نے ہمارے لیے ان سے لڑنا تو جائز قرار دیا، لیکن انہیں قید کرنا اور ان کے اموال لوٹنا ناجائز ٹھہرا دیا۔"

تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"ان لوگوں کا قید کرنا اور ان کے اموال لوٹنا ہرگز جائز نہیں جو ایک خدا کا اقرار کرتے ہیں۔ تمہارے لیے صرف ان کی سواریاں اور ہتھیار جائز ہیں۔ جس چیز کا تمہیں پتا نہیں اس کے تجسس میں نہ رہو، بلکہ جو حکم تمہیں دیا جائے اس کی پیروی کرو۔"

آپ کی نرمی اور رحم دلی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اہلِ شام نے آپ کو دریا پر اترنے اور اس کا پانی استعمال کرنے سے روک دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب آپ کو اسی قسم کا موقعہ ملا تو آپ نے انہیں دریا سے پانی لینے سے مطلقاً منع نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ نے اپنے ساتھیوں کو تاکید کر دی تھی کہ کوئی شخص معاویہؓ اور ان کے مددگاروں کو گالیاں نہ دے۔ آپ کو پتا چلا کہ حجر بن عدی اور عمرو بن الحمق حضرت معاویہؓ کو گالیاں دیتے اور اہلِ شام پر لعن طعن کرتے ہیں۔ آپ نے فوراً ان دونوں کو بلا بھیجا اور فرمایا:

"جب میں نے تمہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا تو تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

انہوں نے جواب میں کہا:

"امیر المومنین! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ تم گالیاں دینے والے اور لعن طعن کرنے والے بنو۔ ایسا کرنے کی بجائے ان کے لیے یہ دعا کرو:

"اے اللہ! تو انھیں اور ہمیں ایک دوسرے کا خون بہانے سے روک دے، ہمارے اور ان کے درمیان صلح کرا دے، انہیں ہدایت دے کہ وہ حق کو پہچان لیں اور بھٹکے ہوئے راستہ سے سیدھے راستہ پر آ جائیں۔"

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آپ اپنے نفس اور اپنے عمال کا شدید محاسبہ کرتے تھے۔ نفس کا محاسبہ تو اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کی وضاحت کی احتیاج نہیں۔ باقی رہا عمال کا محاسبہ، تو اس کا ثبوت مصقلہ بن ہبیرۃ الشیبانی اور یزید بن حجیۃ التیمی کے آپ سے کنارہ کشی کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچ جانے سے مل جاتا ہے۔ یزید بن حجیہ کو "رے" کا حاکم بنایا تھا اس نے وہاں کا خراج معمول سے تیس ہزار دینار کم بھیجا۔ حضرت علیؓ نے اسے خط لکھ کر اپنے حضور بلوایا اور فرمایا کہ غبن شدہ رقم حاضر کرو۔ اس نے کہا میں نے ایک درہم بھی نہیں لیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس کی بات کا یقین نہ کیا، اسے دُرّے لگوائے اور اپنے غلام سعد کو حکم دیا کہ اسے قید کر دو۔ یزید قید خانہ سے کسی طرح چھوٹ کر شام میں حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت معاویہؓ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ وہ

اس وقت تک شام ہی میں مقیم رہا جب تک سارا عرب حضرت معاویہؓ کے زیرِ نگین نہ ہو گیا جب حضرت معاویہؓ عراق آئے تو اسے بھی اپنے ساتھ لیتے آئے اور عراق کا والی بنا دیا۔

حضرت معاویہؓ کے اخلاق و عادات

حضرت علیؓ کے عادات و خصائل کو اختصار سے بیان کرنے کے بعد اب ہم حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد شام کی ولایت ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی۔ حضرت معاویہؓ نے وہاں اپنا غلبہ و اقتدار بڑھانا اور اپنی حکومت کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ شام کا تعلق دار الخلافہ سے برائے نام رہ گیا اور اگرچہ وہ اسلامی مملکت کا ایک صوبہ شمار ہوتا تھا۔ لیکن دُوسرے صوبوں سے اس کا ارتباط بہت ہی معمولی تھا۔ اس طرح حضرت معاویہؓ بلا شرکتِ غیرے شام کے مالک اور با اختیار حاکم بن بیٹھے۔

حضرت معاویہؓ انتہائی زیرک اور بلند نظر انسان سمجھے جاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب انہیں شام کی ولایت سے معزول کر دیا جائے گا اور ان کے تمام پچھلے کاموں کا محاسبہ کیا جائے گا۔ وہ بڑی احتیاط سے تمام حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور اپنی عقل و فکر کو کام میں لا کر ایسے ذرائع تلاش کرنے میں لگے رہتے تھے جن سے وُہ اپنے دشمنوں سے زیر اور انہیں اپنے ارادوں میں ناکام کر سکیں۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں تو ان کی حاکمیت کو کوئی خطرہ پیدا نہ ہوا اور وہ بڑی شان سے شام پر حکومت کرتے رہے۔ لیکن ان کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ خلیفہ بنے تو انہیں پہلی بار خطرہ کا احساس ہوا۔ وہ حضرت علیؓ کے خلیفہ بنتے ہی جان گئے کہ حضرت علیؓ انہیں کبھی شام پر قابض رہنے کی اجازت نہیں دیں گے بلکہ انہیں معزول کر کے کسی ایسے آدمی کو یہاں کا والی مقرر کریں گے جس پر انہیں پورا اعتماد و بھروسا ہو گا۔ اس خطرہ سے بچنے کے لیے انہوں نے ایک طرف بعض سر برآوردہ اشخاص کو حضرت علیؓ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ کے انتقام کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انہوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کو اپنے ساتھ ملا کر یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ حضرت علیؓ نے انتہائی نازک موقعہ پر حضرت عثمانؓ کا ساتھ چھوڑ دیا، جس کا نتیجہ باغیوں کے ہاتھوں ان کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ علیؓ قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص اور آپ کی اہلیہ حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر لٹکا دیں جس کا بڑا زبردست اثر ہوا۔ ہزاروں آدمی منبر کے اردگرد جمع ہو کر ان چیزوں کو دیکھتے، دھاڑیں مار مار کر روتے اور خدا کی قسم کھاتے کہ وہ حضرت عثمانؓ کا انتقام لے کر رہیں گے۔ اس طرح حضرت معاویہؓ نے اہلِ شام اور عامۃ العرب کی تائید حاصل کر کے اپنے لیے راستہ ہموار کر لیا۔

حضرت معاویہؓ نے نہ صرف قصاصِ عثمانؓ کا نعرہ بلند کر کے لوگوں کی تائید حاصل کی بلکہ مال و زر خرچ کر کے بھی عرب کے بہت سے قبائل کو مطیع و منقاد کر لیا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے بے دریغ دولت لٹائی۔

یہ بات کہ آیا حضرت معاویہؓ کی حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی حقیقی وجہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تھی اور آپ خلوصِ دل کے ساتھ قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام لینا چاہتے تھے، یا اس بغاوت کا سبب اپنے لیے ملک حاصل کرنا تھا۔ تو اس کا فیصلہ

کرنے کے لیے وہ گفتگو کافی ہے جو آپ کے اور حضرت عثمان رضؓ کی لڑکی عائشہ کے درمیان ہوئی۔

جب تمام عرب حضرت معاویہؓ کا مطیع ہو گیا اور آپ مدینہ تشریف لائے تو حضرت عثمانؓ کے گھر بھی پہنچے۔ وہاں حضرت عثمانؓ کی بیٹی عائشہؓ موجود تھیں وہ انہیں دیکھ کر بلند آواز سے "ہائے اباجان" کہہ کر رونے لگیں مطلب یہ تھا کہ ان کے والد کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ اس وقت حضرت معاویہؓ نے یہ الفاظ فرمائے:

"اے میری بھتیجی! لوگوں نے ہمیں اور ہم نے لوگوں کو امان دی۔ ہم نے ان سے نرمی کا سلوک کیا حالانکہ ہمارے دلوں میں ان کے خلاف آگ بھڑک رہی ہے۔ انہوں نے ہماری اطاعت کا اقرار کیا لیکن ان کے دلوں میں بدستور ہمارے لیے کینہ موجود ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنی تلوار موجود ہے اور وہ اپنے مددگاروں کی تلاش میں ہے۔ اگر ہم ان سے وہ عہد جو انہیں امان دینے کے متعلق ہم نے کیا تھا توڑ دیں، تو وہ بھی اپنے قول و قرار پس پشت ڈال دیں گے۔ پھر نہ معلوم کیا نتیجہ ہوگا۔ ہم غالب ہوں گے یا وہ!"

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے سارے عرب کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور تمام وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حصہ لیا تھا آپ کے قابو میں آگئے تو آپ نے اپنے دعووں کے علی الرغم ان سے قصاص نہ لیا اور انہیں بالکل چھوڑ دیا۔

حضرت معاویہؓ کی سیاست اور حکمتِ عملی کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کا یہ مقولہ کافی ہے:

"میں اس وقت تک کبھی تلوار نہ اٹھاؤں گا جب تک میرا کوڑا کام دیتا رہے گا۔ میں اس وقت تک اپنا کوڑا نہ اٹھاؤں گا جب تک میری زبان کام دیتی رہے گی۔ اگر میرے ہاتھ میں ایک دھاگہ ہو جس کا دوسرا سرا لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو یہ دھاگہ کبھی نہیں ٹوٹ سکے گا، کیونکہ جب دوسرے لوگ اسے کھینچیں گے تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا۔ اور جب دوسرے لوگ ڈھیلا چھوڑ دیں گے تو میں کھینچ لوں گا۔"

آپ کے اس قول سے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ آپ بڑے حلیم، زیرک سیاستدان اور مشکلات کے وقت اپنے اعصاب پر قابو پانے والے شخص تھے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنی سیاسی زندگی جس طریقے سے گزاری اس کو دیکھتے ہوئے آپ پر شعبی کا یہ قول بالکل صادق آتا ہے:

"آپ ایک ایسے اونٹ کی مانند ہیں کہ اگر اسے کچھ نہ کہا جائے تو چلتا رہتا ہے، لیکن جب اس پر سختی کی جائے تو ٹھہر جاتا ہے۔"

آپ بڑے مردم شناس تھے۔ ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کو پہچان لینے کا آپ میں بڑا ملکہ تھا۔ اپنی اس صلاحیت سے آپ نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ آپ اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے انہیں اس قسم کی مشکلات میں مبتلا کر دیتے تھے جن سے نکلنا ان کے لیے آسان نہ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ ان پر فتح پا لیتے۔ آپ کے حلم اور بردباری کی مثالیں زبان زد خلائق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بردباری میں بہت کم لوگ آپ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

سیاسی قابلیت آپ میں انتہائی درجہ کی تھی، اسی قابلیت سے کام لے کر آپ بسا اوقات بغیر لڑے بھڑے اپنے مقاصد کی تکمیل کر لیتے تھے۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد جب آپ کے لڑکے حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے انہیں ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا :

"خلافت کے حقدار آپ ہی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے بھی خلافت آپ ہی کا حق ہے۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ آپ خلافت کا کام بخوبی چلا سکیں گے اور اُمتِ محمدیہ کو ہر قسم کے خطرات سے نجات دلا سکیں گے تو میں ضرور آپ کی بیعت کر لیتا۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ امت کے مفاد کی خاطر خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ اس کے بدلے آپ جو چاہیں گے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

اس خط کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے ایک سفید کاغذ جس پر مہر کے علاوہ اور کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا، حضرت حسنؓ کی خدمت میں بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اس کاغذ پر آپ اپنے مطالبات لکھ دیجئے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ ان کی خواہش کے مطابق خلافت سے دستبردار ہو گئے اور جس قدر مال و اسباب اور جائداد کی ضرورت تھی اس کاغذ پر لکھ دی۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے وعدہ کے بموجب وہ تمام چیزیں حضرت حسنؓ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔

حضرت معاویہؓ مختلف علاقوں کے حاکم چننے میں بھی بہت عقلمندی اور ذکاوت سے کام لیتے تھے۔ جو حاکم آپ نے مقرر کیے تھے وہ خود بھی اپنی عقلمندی اور ذکاوت میں مشہور تھے۔ جیسے حضرت عمروؓ بن العاص، زیاد بن ابیہ اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہم۔ ان والیوں نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے استحکام میں بہت مدد دی۔ حضرت معاویہؓ کے خصائل اختیار کر کے انہوں نے بھی اپنے مخالفوں کو بآسانی زیر کر لیا۔

زیاد کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ اسے ایک مرتبہ پتا چلا کہ ابو الخیر نامی ایک شخص بہت بہادر اور جری ہے اور اس سے بوقت ضرورت مفید کام لیا جا سکتا ہے لیکن عقاید کے لحاظ سے وہ خارجی ہے اور معاویہؓ کا شدید مخالف۔ زیاد نے اسے بلا کر نیشا پور کی ولایت سپرد کر دی اور چار ہزار درہم تنخواہ مقرر کی۔ اس طرح اسے اپنا ممنونِ احسان بنا لیا اور وہ حضرت معاویہؓ کے لیے ایک بہت کار آمد وجود ثابت ہوا۔

اسی طرح مغیرہؓ بن شعبہ جمعہ کے دن منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے ایک شخص حجر بن عدی نے ان پر کنکر پھینکے۔ مغیرہؓ جلدی سے منبر پر سے اُتر کر محل میں چلے گئے اور وہاں سے حجر کو پانچ ہزار درہم بھجوا دیے۔ حجر بن عدی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ بعد میں کسی شخص نے مغیرہؓ سے پوچھا کہ :

"آپ نے اس سے ایسا سلوک کیوں کیا حالانکہ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ حجر آپ کا مخالف ہے۔"

مغیرہؓ نے جواب دیا :

"میں نے اسے درہم بھجوا کر قتل کرا دیا ہے، اب وہ میری مخالفت کرنے کی کبھی جرأت نہ کرے گا۔"

حضرت معاویہؓ کے جو خصائل اوپر بیان کیے گئے ہیں انہوں نے آپ کی حکومت کی تاسیس میں بے حد مدد دی۔ آہستہ آہستہ آپ کی حکومت تمام مملکتِ اسلامیہ پر محیط ہو گئی۔

آپ نے خود بھی حضرت علیؓ کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کی بعض وجوہ بتائی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے کہا:

"میں چار خصلتوں کے سبب علیؓ بن ابی طالب پر غالب ہوا، علیؓ اپنا بھید کسی سے نہیں چھپاتے، لیکن میں اپنے بھیدوں کی پوری طرح حفاظت کرتا ہوں۔ وہ مصائب سے بچنے کے لیے دوڑتے ہیں اور مصائب ان کو اچانک آلیتے ہیں، لیکن میں خندہ پیشانی سے مصائب کا سامنا کرتا ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر اثر نہیں کرتے۔ ان کے لشکر میں بُرے سے بُرے لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں اور وہ اتفاق و اتحاد کی نعمت سے بھی محروم ہے، لیکن مجھے ان کی نسبت قریش کی زیادہ تائید حاصل ہے اور میرے لشکر میں کسی قسم کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔ لیکن علیؓ اپنے حسبِ منشا اپنی خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔"

حضرت علیؓ بھی حضرت معاویہؓ کی بے مثل عقلمندی، ذکاوت اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے خداداد ملکہ کے قائل تھے اور کئی بار آپ نے اس کا اظہار بھی اپنی زبان اور خطوط کے ذریعہ کیا۔ چنانچہ آپ نے زیاد بن ابیہ کو، اس زمانہ میں جب کہ وہ آپ کا مطیع و فرمانبردار تھا اور آپ نے اسے ایک علاقہ کا والی مقرر کیا ہوا تھا، ایک دفعہ لکھا تھا:

"معاویہؓ کی شخصیت اتنی زبردست ہے کہ اُن کے آگے، اُن کے پیچھے، ان کے دائیں اور ان کے بائیں ہر چہار طرف سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔"

(۱۴)

حضرت عمروؓ بن العاص

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت حضرت عمروؓ بن العاص فلسطین میں تھے اور وہاں بنظرِ غائر تمام حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہیں انہیں حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ کی خلافت، جنگِ جمل اور حضرت معاویہؓ کی خود مختاری کی خبریں ملیں انہوں نے سوچا کہ حضرت علیؓ کے پاس جانے اور ان کی حمایت کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی سابقیت کے دعوے کی بنا پر امورِ سلطنت میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کریں گے، اگر فائدہ ہو سکتا ہے تو حضرت معاویہؓ کے پاس جانے اور ان کی حمایت کرنے سے۔ وہ اس بات سے مطمئن تھے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کی بیعت کبھی نہ کریں گے۔

ان کے ذہن میں ان تمام جھگڑوں کی یاد باقی تھی جو اسلام میں اور اسلام سے قبل بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ہوتے رہتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بنو ہاشم اور بنو امیہ میں قریش کی سرداری حاصل کرنے کے لیے زبردست مقابلہ رہتا تھا۔ اب جبکہ بنو امیہ کو شام میں

تسلط حاصل ہو چکا تھا اور وہ شام کے اطراف و جوانب پر قابض بھی ہو چکے تھے۔ یہ امر ناممکن تھا کہ وہ آسانی سے اس خطہ کو بنو ہاشم کے لیے خالی کر دیتے اور انہیں اس پر قابض ہونے کی اجازت دے دیتے۔

حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کو اپنے پاس بلایا یا عمروؓ بن العاص خود معاویہؓ کے پاس گئے۔ اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔ شیعہ مورخ یعقوبی اس بارے میں یہ بیان کرتا ہے:

"حضرت علیؓ بن ابی طالب نے جنگِ جمل کے بعد کوفہ کا رُخ کیا۔ کوفہ پہنچ کر انہوں نے جریر بن عبداللہ البجلی کو حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا کہ وہ ان کی بیعت لے کر آئیں۔ آپ نے ان کو معاویہؓ کے نام ایک خط بھی دیا جس میں لکھا کہ اکثر مہاجرین اور انصار ان کی بیعت پر متفق ہو گئے ہیں اس لیے انہیں بھی ان کی بیعت کر کے ان کی اطاعت میں داخل ہو جانا چاہیئے۔ حضرت معاویہؓ نے جریر بن عبداللہ کو کچھ دن کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا اور عمروؓ بن العاص کو یہ خط لکھا:

"حضرت علیؓ اور طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا۔ اب علیؓ نے جریر بن عبداللہ کے ہاتھ مجھے کہلا کر بھیجا ہے کہ میں ان کی بیعت کر لوں۔ میں اس امر کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں اسی لیے میں نے جریر کو ٹھہرا لیا ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے میرے پاس پہنچیے۔"[1]

حضرت معاویہؓ کا خط پہنچنے پر حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنے بیٹوں محمد اور عبداللہ سے مشورہ کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہی ٹھہرا کہ انہیں معاویہؓ کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ چنانچہ عمروؓ بن العاص دمشق پہنچے اور حضرت معاویہؓ سے تنہائی میں ملے۔ معاویہؓ نے انہیں تمام حالات سُنائے۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ وہ حضرت علیؓ سے برابر حضرت عثمانؓ کے انتقام کا مطالبہ کرتے رہیں اور اگر وہ یہ مطالبہ قبول نہ کریں تو شامی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر ان کا مقابلہ کریں۔"[1]

یعقوبی یہ بھی کہتا ہے کہ عمروؓ بن العاص نے معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کر کے ان کی بیعت بھی کر لی تھی۔ ایک دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے ان کو لوگوں سے بیعتِ خلافت لینے کا مشورہ دیا وہ ان کے مقرر کردہ عامل حمص شرجیل بن السمط تھے۔ اس سے پہلے حضرت معاویہؓ کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ لوگوں سے بیعتِ خلافت لیں۔ بلکہ انہوں نے صرف اس بات پر بیعت لی تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بعد میں جب حضرت علیؓ کا قاصد جریر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا اور شرجیل کو پتا چلا کہ حضرت علیؓ نے بیعت کے لیے جریر کو معاویہؓ کے پاس بھیجا ہے تو وہ جریر سے عداوت کی بناء پر

---

[1] الیعقوبی جلد اوّل ص ۳۱۵ [2] طبری

معاویہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہنے لگے :

"امیر المومنین حضرت عثمانؓ ہمارے خلیفہ تھے۔ اگر آپ ان کے خون کا بدلہ لینے پر قادر ہیں تب تو ہم آپ کو اپنا امیر ماننے کے لیے تیار ہیں ورنہ نہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ان کی بیعت کر لی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بیعت کی جس کا بعض مؤرخین نے ذکر کیا ہے، تصدیق ہونی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں جبکہ حضرت معاویہؓ کو پتا تھا کہ حضرت علیؓ کی بیعت اصحابِ شوریٰ اور مہاجرین وانصار نے کر لی ہے اور یہی لوگ ہیں جن پر کسی شخص کی بیعت کی بنیاد ہو سکتی ہے، تو معاویہؓ اپنے لیے شرجیل اور عمروؓ جیسے اشخاص کی بیعت پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے جنہیں نہ اسلام میں سابقیت کا شرف حاصل تھا اور نہ ان کا ان کے قبائل میں کوئی اثر تھا، جس کے سبب ان پر بھروسا کیا جا سکتا۔ ہمارا یہ یقین ہے کہ یہ معاملہ اس حد سے آگے نہیں بڑھا کہ حضرت معاویہؓ نے لوگوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کے لیے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

حضرت علیؓ کا قاصد واپس کوفہ آگیا اور حضرت علیؓ کو بتلا دیا کہ کس طرح لشکرِ شام ان سے مقابلہ اور حضرت عثمانؓ کے انتقام کا مطالبہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی عرض گزار کر دیا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق کے منبر پر لٹکا دی ہیں۔ اہلِ شام جوق در جوق مسجد میں آتے ہیں اور انھیں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کے روتے ہیں۔ انہوں نے قسم کھائی ہے کہ یا تو وہ حضرت عثمانؓ کا انتقام لیں گے ورنہ خود کو فنا کر دیں گے۔

جب حضرت علیؓ کو یقین ہو گیا کہ معاویہؓ تلوار کے سوا اور کسی طرح مطیع ہونے والے نہیں تو انہوں نے فوج کو شام جانے کے لیے تیاری کرنے کا حکم دے دیا۔

(۱۵)

پانی پر جنگ

حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ کے مقابلہ کے لیے نکلنا امیر المومنین حضرت علیؓ اپنی فوج کو لے کر کوفہ سے نکلے اور مقام نخیلہ میں قیام کیا۔ نخیلہ میں آپ نے لشکر کو مرتب کیا اور جزیرہ کے راستہ شام میں داخل ہوئے۔ جب حضرت معاویہؓ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے حضرت عمروؓ بن العاص سے مشورہ کیا۔ انہوں نے رائے دی کہ دمشق سے باہر نکل کر حضرت علیؓ کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ بھی فوج لے کر باہر نکلے۔

حضرت علیؓ نے رقہ پہنچ کر دریائے فرات کو عبور کیا اور آگے بڑھ کر صفین کے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ حضرت معاویہؓ کا لشکر وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔

صفین میں مسلمانوں کی اس قدر زبردست افواج جمع ہوئی تھیں جن کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ تاریخ اسلام پر نظر دوڑانے سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غزوہ حنین کے وقت پر جبکہ مسلمان اپنی کثرت تعداد پر نازاں تھے اسلامی فوج کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بعد جب مسلمان ایران کو فتح کرنے اور رومیوں سے مقابلہ کرنے نکلے تو ان کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی رہی۔ جنگ یرموک کے موقع پر مسلمان چھیالیس ہزار کی تعداد میں تھے اور قادسیہ اور نہاوند میں ان کی تعداد تیس ہزار تھی۔ لیکن جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا لشکر ستر ہزار اور حضرت معاویہؓ کا نوے ہزار سے کم نہ تھا۔

حضرت معاویہؓ اپنا لشکر لے کر صفین میں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے دریائے فرات کے متصل ایک وسیع و عریض میدان منتخب کر لیا تھا جہاں سے پانی لینا بہت آسان تھا۔ اس جگہ کے علاوہ جہاں حضرت معاویہؓ کی فوج نے قیام کیا تھا اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں سے پانی لینا ممکن ہوتا۔ کیونکہ وہ علاقہ پہاڑی تھا اور دریا کے دونوں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ دریا بھی اس جگہ بہت گہرا اور تیز تھا۔

حضرت معاویہؓ کی غرض اس جگہ کے منتخب کرنے سے یہ تھی کہ دونوں فوجوں میں باقاعدہ مقابلہ ہونے سے پہلے ہی حضرت علیؓ کی فوج کو پیاسا مار کر اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کا خیال تھا کہ اس طرح اول تو مقابلہ کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور اگر آئی بھی تو پیاس سے نڈھال ہونے والی فوج زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

لیکن حضرت معاویہؓ نے اپنی مخالف فوج کی قوت کا اندازہ غلط لگایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بآسانی حضرت علیؓ کی فوج کو پانی لینے سے روک سکیں گے۔ لیکن انہوں نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ ستر ہزار فوج پانی کو اپنے بالکل سامنے دیکھ کر کسی طرح صبر نہیں کر سکے گی اور اگر اسے پانی لینے کی اجازت نہ ملی تو وہ تلوار سے کام لے کر اپنے دشمن کو اپنے راستہ سے ہٹانے اور خود پانی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

جب حضرت علیؓ اپنے لشکر کو لے کر صفین کے میدان میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت معاویہؓ کے لشکر نے نہایت مناسب مقام پر پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور پانی پر اسی کا قبضہ ہے۔ جب آپ کے آدمیوں نے پانی لینے کے لیے دریا کی طرف بڑھنا چاہا تو دشمن کے سپاہی راستہ میں روک بن کر کھڑے ہو گئے اور انھیں دریا کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

حضرت علیؓ کی عادت تھی کہ آپ جس حد تک ممکن ہوتا تھا اپنے لشکر کو جنگ کرنے سے روکتے تھے چنانچہ یہاں بھی آپ نے صلح صفائی سے کام لینا چاہا۔ اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اس وقت تک کسی شخص سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں جب تک وہ پانی کے بارے میں معاویہؓ کو خط نہ لکھیں اور وہاں سے جواب موصول نہ ہو جائے۔ آپ کی فوج کو پیاس نے بحد تنگ کر رکھا تھا۔ اس نے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں سے پانی لینے میں آسانی ہو۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک خط لکھا جس میں اپنی فوج کے لیے دریا سے پانی لینے کی اجازت طلب کی لیکن حضرت معاویہؓ نے صاف انکار کر دیا۔

اب حضرت علیؓ کی فوج کے لیے لڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

جو خط حضرت علیؓ نے صعصعہ بن صوحان کے ہاتھ حضرت معاویہؓ کو بھیجا تھا اس کا مضمون یہ تھا:

"تم نے اپنے گھوڑے آگے بڑھائے اور قبل اس کے کہ ہم تم سے لڑتے، تم ہم سے لڑے۔ تم نے ہمارے ساتھ جنگ میں ابتدا کی۔ اب تم نے ہمیں پانی سے روک دیا ہے۔ یہ بات تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔ تم ہمیں پانی لینے دو ورنہ پھر ہم مجبور ہوں گے کہ تم سے لڑیں اور خود پانی پر قبضہ کر لیں۔"

صعصعہ یہ خط لے کر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ خط دکھا کر مشورہ طلب کیا۔ بعض لوگوں نے کہا:

"ان لوگوں کو پانی ہرگز نہیں لینے دینا چاہیے کیونکہ یہ لوگ پہلے خود حضرت عثمانؓ پر پانی بند کر چکے ہیں۔"

البتہ عمروؓ بن العاص نے یہ رائے دی کہ انہیں پانی سے روکنا نہیں چاہیے۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کی رائے کی پروا نہ کی اور حضرت علیؓ کی فوج کو بدستور پانی لینے سے روکے رکھا۔

اس پر حضرت علیؓ کی فوج میں سخت جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق حضرت معاویہؓ کی فوج سے لڑنے کا ارادہ کر لیا، تاہم حضرت علیؓ نے جہاں تک ممکن ہوا ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ رات کو آپ گشت کرتے کرتے مذحج قبیلہ کے خیموں کی طرف جا نکلے وہاں ایک آدمی شعر پڑھ رہا تھا:

"کیا یہ قوم ہمیں دریائے فرات کے پانی سے روک سکے گی! حالانکہ ہمارے پاس تلواریں اور نیزے ہیں اور ہمارے درمیان علیؓ ہیں جن کو مصائب و آفات آ کر ڈراتی ہیں تو وہ ڈرتے نہیں۔"

حضرت علیؓ آگے بڑھے اور کندہ کے خیموں میں پہنچے۔ وہاں اشعث بن قیس آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"کیا یہ لوگ ہمیں فرات کے پانی سے روک سکیں گے حالانکہ آپ ہمارے درمیان ہیں اور تلواریں ہمارے ہاتھوں میں ہیں!"

آخر حضرت علیؓ نے فوج کو حکم دے دیا کہ وہ تلواریں ہاتھ میں لے لے اور دشمن کو پانی کی جگہ سے بزور ہٹا دے۔ چنانچہ اشعث نے لوگوں میں جنگ کی منادی کرنی شروع کی۔ کندہ اور قحطان کے بارہ ہزار سپاہی تلواریں سونت سونت کر باہر نکل آئے۔ ان کی قیادت اشعث کر رہے تھے۔ یہ لوگ آگے بڑھے اور اہلِ شام سے جا کر بھڑ گئے۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ جانبین کو برابر اپنی اپنی طرف سے امداد پہنچ رہی تھی۔ حضرت علیؓ کے بارہ ہزار ساتھی گھوڑوں سے اتر پڑے اور اہلِ شام کی صفوں میں گھس کر انہیں تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ شامیوں کو شکست ہو گئی۔ حضرت معاویہؓ کی فوج کو مجبوراً دریا سے بہت دور جا کر پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ حضرت علیؓ کا لشکر آگے بڑھا اور اس وسیع و عریض میدان پر قابض ہو گیا جو چند گھنٹے پیشتر حضرت معاویہؓ کی فوج کے قبضہ میں تھا اور جس کے برابر دریائے فرات بہہ رہا تھا۔

اب حضرت معاویہؓ کے لشکر کی وہی حالت تھی جو اس سے پہلے حضرت علیؓ کے لشکر کی تھی۔ وہ پانی سے دور تھے اور پانی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا۔ لشکر کے ہر شخص کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ کے آدمی انہیں کبھی پانی نہیں لینے دیں گے لیکن

حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا :

"میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں پانی لینے سے ہرگز نہیں روکیں گے۔"

حضرت عمروؓ بن العاص کا یہ خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ کیونکہ جب حضرت معاویہؓ کے آدمی پانی لینے کے لیے دریا کی طرف بڑھے اور حضرت علیؓ کے آدمیوں نے انہیں روکنا چاہا تو حضرت علیؓ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ ہمارا دین اور ہمارا اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے دشمن سے ایسا ہی سلوک کریں جو اس نے ہم سے کیا تھا۔

جب آپ کے ساتھیوں نے آپ سے کہا :

"امیر المومنین ! جس طرح انہوں نے ہمیں پانی لینے سے روکا تھا ہم بھی انہیں کیوں نہ روکیں ؟"

تو حضرت علیؓ نے فرمایا :

"نہیں، انہیں پانی لینے کے لیے راستہ دے دو۔ میں جاہلوں کا سا کام نہیں کروں گا۔ ہم ان کے سامنے کتاب الٰہی پیش کریں گے اور انہیں ہدایت کی طرف بلائیں گے۔ اگر انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کر لیا تو خیر، ورنہ پھر ہمارے اور ان کے درمیان تلوار ہی معاملہ فیصلہ کرے گی۔"

چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں لوگوں نے یہ نظارہ دیکھا کہ اہلِ عراق اور اہلِ شام دونوں ایک گھاٹ سے پانی لے رہے ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے تعرض نہیں کر رہا۔

اس جگہ ہر شخص کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت علیؓ کی یہ کارروائی ٹھیک تھی ؟ کیا حضرت علیؓ کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ بھی اپنے دشمن سے اسی قسم کا سلوک کرتے جو وہ ان سے کر چکا تھا ؟

جنگی نقطۂ نظر سے خواہ حضرت علیؓ کا اپنے دشمنوں سے یہ برتاؤ ٹھیک ہو یا غلط، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا یہ کارنامہ آپ کی شرافت، بزرگی اور اخلاق کی بلندی کی ایک زندہ مثال ہے۔

(۱۶)

قائدینِ صلح

حضرت علیؓ کا پیغام حضرت معاویہ کے نام یہ واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ شام میں لڑنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ جب آپ کے لشکر نے اہلِ شام کو دریائے فرات سے ہٹا دیا تو آپ نے تین آدمیوں کو حضرت معاویہؓ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ عامۃ المسلمین کی طرح آپ کی بیعت کر لیں۔ یہ تین آدمی مندرجہ ذیل تھے :

بشیر بن عمرو الانصاری، سعید بن قیس الہمدانی اور شبث بن ربعی التمیمی۔
یہ لوگ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے اور بشیر بن عمرو نے حضرت معاویہؓ سے کہا :
"اے معاویہؓ! عنقریب تم اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں جانے والے ہو جہاں خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کا محاسبہ کرے گا اور جو کام تم نے اس دنیا میں کیے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ تم اُمت میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور مسلمانوں کے خون سے اپنا دامن بچاؤ۔"
معاویہؓ نے کہا :
"یہاں آنے سے پیشتر آپ نے علیؓ کو یہ نصیحتیں نہ کیں ؟"
انہوں نے جواب دیا :
"علیؓ تمہاری طرح نہیں ہیں۔ وہ اپنی فضیلت، دینی عظمت، اسلام میں سبقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی بنا پر بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ خلافت کے مستحق ہیں۔"
حضرت معاویہؓ نے پوچھا :
"پھر وہ کیا کہتے ہیں ؟"
انہوں نے جواب دیا :
"وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اپنی بیعت کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر تم نے ان کی دعوت قبول کر لی تو یہ تمہارے لیے دنیاوی لحاظ سے بھی مفید ثابت ہوگی اور تم آخرت میں خدا تعالیٰ کے سامنے سرخرو بھی ہو سکو گے۔"
حضرت معاویہؓ نے کہا :
"کیا ہم عثمانؓ کا خون چھوڑ دیں گے ؟ خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"
اس پر شبث بن ربعی کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے :
"اے معاویہ! جو کچھ تمہارا ارادہ اور مطلب ہے وہ ہم سمجھ گئے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی ایسا حربہ نہیں تھا جس سے تم لوگوں کو گمراہ کر سکتے اور انہیں اپنے ڈھب پر لا سکتے۔ اس پر تم نے ان کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ تمہارا امام مظلوم قتل کیا گیا ہے اور ہم اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس پر بیوقوف لوگ تمہارے پیچھے چل پڑے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم نے جان بوجھ کر حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے میں دیر کی اور دل سے یہ چاہا کہ انہیں شہید کر دیا جائے تاکہ تم وہ کچھ حاصل کر سکو جو تمہارا مدعا ہے۔ لیکن یاد رکھو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کام لے کر ایسے لوگوں کو نامراد کر دیتا ہے اور بعض دفعہ ان لوگوں کو ان کی خواہشات اور آرزوؤں سے بھی بڑھ کر دیتا ہے۔ لیکن تمہارے لیے ان میں سے کوئی چیز بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اگر تم اپنے مقصد میں ناکام رہے تب تو ظاہر ہے کہ تم سے زیادہ بدبخت عربوں میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کامیاب ہو گئے تب بھی جہنم کی آگ کی لپیٹ سے نہیں بچ سکتے۔ اس لیے اے معاویہ! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے موجودہ رویّہ کو ترک کر کے خلافت کے

حقدار سے جھگڑا مت کرو۔"

شبث کی یہ تیز گفتگو حضرت معاویہؓ کو بے حد ناگوار گزری۔ انہوں نے کہا:

"اے سخت مزاج گنوار! تو نے سراسر جھوٹ بولا ہے۔ جاؤ تمہارے اور ہمارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔"

چنانچہ یہ وفد ناکام لوٹ آیا اور حضرت علیؓ کی خدمت میں سب باتیں گوش گزار کر دیں۔

ہلکے پیمانہ پر لڑائی کی ابتدا

حضرت علیؓ نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر اپنی فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ سازوسامان سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں آ گئی۔ عراقیوں اور شامیوں کے تصادم سے ہر شخص ڈرتا تھا۔ کیونکہ سب کو یہ خطرہ تھا کہ اس طرح بڑے پیمانہ پر اتلافِ جان ہوگا۔ اس ناگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے ہر لشکر کا ایک ایک دستہ باری باری آگے آ کر لڑتا تھا۔ لڑائی کی یہ صورت ذی الحجہ ۳۶ھ تک جاری رہی۔ جب محرم کا چاند دکھائی دیا تو دونوں فوجوں میں لڑائی بند ہو گئی۔

صلح کی کوششیں

اب دونوں فریقوں نے چاہا کہ باہم صلح و مصالحت ہو جائے۔ اس غرض کے لیے دونوں طرف قاصدوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس جگہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عقلمند اور تجربہ کار انسان ایسے قاصدوں کو چنتا ہے جو فریقِ مخالف کے کیمپ میں جا کر اس کی ترجمانی نہایت اچھے طریق سے کریں۔ تمام معاملات سے پوری طرح واقف ہوں۔ اپنی ذکاوت سے بگڑی ہوئی بات کو بھی بنا لیں اور اپنی تقریر سے فریقِ مخالف پر اچھا اثر ڈالیں۔ لیکن اگر قاصدوں کے انتخاب میں بداحتیاطی سے کام لیا جائے اور ایسے قاصد چنے جائیں جنہیں نہ بات کرنے کا ڈھب آتا ہو نہ سفارتی آداب کا کوئی خیال ہو اور نہ صورتِ حال سے آشنا ہوں تو اس طرح بنی ہوئی بات بھی بگڑ جاتی ہے اور ان قاصدوں کے ہاتھوں جو نقصان اٹھانا پڑتا ہے وہ دشمن کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم حضرت علیؓ کے قاصدوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے قاصد اپنی گفتگو کو حدِ اعتدال میں رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صلح کی نہیں بلکہ جنگ کی بات چیت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ جب بات چیت شروع کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دشمنی کی آگ بھڑکانے اور سوئے ہوئے فتنے جگانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ حضرت علیؓ کی طرف سے صلح کی صرف ایک شرط پیش کی جاتی تھی اور وہ یہ کہ معاویہؓ غیر مشروط طور پر ان کی اطاعت قبول کر کے ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ حالانکہ ایسا کرنا خود ان کے لیے بے حد نقصان دہ تھا۔ اس طرح حضرت معاویہؓ پر بہت ناگوار اثر پڑتا تھا اور وہ کسی طرح حضرت علیؓ کی شرطیں ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔

حضرت علیؓ نے صلح کی بات چیت کے لیے عدی بن حاتم، یزید بن قیس الارحبی، زیاد بن حفصہ اور شبث بن ربعی کو بھیجا۔ شبث بن ربعی پہلی سفارت میں بھی شامل تھے اور ان کی خشونت بھی بات چیت کی ناکامی کا ایک سبب بنی۔

جب یہ لوگ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے تو عدی نے بات چیت شروع کی۔ انہوں نے کہا:

"اے معاویہؓ! ہم تمہارے پاس اتفاق اور اتحاد کی دعوت لے کر آئے ہیں۔ اگر تم نے اسے قبول کر لیا تو مسلمانوں کے درمیان صلح ہو جائے گی، ان کے آپس کے جھگڑے مٹ جائیں گے اور ان میں خون خرابہ نہ ہوگا۔ دیکھو! حضرت علیؓ تمہارے چچا زاد بھائی، مسلمانوں کے سردار، امت میں سب سے افضل اور سابقون الاولون میں ہیں۔ تمام لوگوں نے ان کی بیعت کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحیح راستہ دکھایا ہے۔ لیکن تم نے ان کی دعوت قبول نہیں کی اور انہیں خلیفہ تسلیم نہیں کیا۔ اے معاویہ! اپنی ہٹ سے باز آجاؤ، کہیں تمہارے ساتھ بھی وہی نہ ہو جو 'اہلِ جمل' کے ساتھ ہو چکا ہے۔"

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا:

"اے عدی! افسوس تم مجھے دھمکانے آئے ہو یا صلح کی بات چیت کرنے! خدا کی قسم! میں "ابنِ حرب" (زبردست جنگجو) ہوں۔ جنگ سے مطلقاً نہیں ڈرتا۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم بھی حضرت عثمانؓ کے قاتلین میں شامل ہو۔ تم سے بھی ان کا قصاص لیا جائے گا۔ اور تم بھی ان لوگوں کے زمرہ میں شامل کیے جاؤ گے جنہیں اللہ عزوجل قتل کرے گا۔"

گفتگو کا یہ رنگ دیکھ کر شبث اور زیاد نے کہا:

"ہم تمہارے پاس صلح کی بات چیت کرنے آئے تھے مگر تم نے اس بات کو چھوڑ کر دوسری باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ان باتوں کو چھوڑ دو جن سے کوئی فائدہ نہیں اور وہ بات کرو جس سے مصالحت کی صورت پیدا ہو، جو فریقین کے لیے سودمند ہو سکے۔"

یزید بن قیس کہنے لگے:

"ہم آپ کو وہ پیغام پہنچانے آئے ہیں جس کے لیے ہمیں بھیجا گیا ہے۔ جو کچھ آپ سے سنیں گے وہ اپنے خلیفہ کو پہنچا دیں گے البتہ ہم آپ کو نصیحت کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ اور وہ یہ کہ آپ حضرت علیؓ کی بیعت کر کے امت کی شیرازہ بندی میں مدد دیں۔ حضرت علیؓ کی فضیلت کو آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور امید ہے کہ آپ سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہوگا کہ اہلِ دین اور اہلِ فضیلت کبھی حضرت علیؓ کی اطاعت سے انحراف نہیں کر سکتے۔ اس لیے اے معاویہؓ! آپ اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور حضرت علیؓ کی مخالفت نہ کریں۔ خدا کی قسم! ہم نے کوئی شخص حضرت علیؓ سے زیادہ متقی، پرہیزگار اور صفاتِ حسنہ سے متصف نہیں دیکھا۔"

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا:

"تم نے مجھے علیؓ کی اطاعت اور جماعت میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ جس جماعت کی طرف تم مجھے بلاتے ہو آخر وہ کون سی جماعت ہے؟ باقی رہا علیؓ کی اطاعت، تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ انہوں نے ہمارے خلیفہ کو قتل کیا، جماعت میں تفرقہ پیدا کیا۔ عثمانؓ کے قاتلین کو پناہ دی۔ علیؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے عثمانؓ کو قتل نہیں کیا۔ ہم ان کی یہ بات مان لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ جن لوگوں نے ان کے قتل میں حصہ لیا وہ ان کی فوج میں شامل ہیں اور ان کے یار و مددگار بنے ہوئے ہیں۔ مصالحت کی صرف یہی صورت ہے کہ علیؓ قاتلینِ عثمانؓ کو ہمارے حوالہ کر دیں ہم انہیں قتل کریں گے، اس کے بعد علیؓ کی اطاعت اور ان کی خلافت کو تسلیم کر لیں گے۔"

اس پر شبث نے کہا: "معاویہ! کیا تمہیں اس بات سے خوشی ہوگی کہ تم عمار جیسی شخصیت کو پکڑ لو اور انہیں قتل کر دو۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا :

"کیوں عمار بن یاسر میں کیا خاص بات ہے جو انہیں قتل نہ کیا جائے ؟ خدا کی قسم ! اگر میں ابن سمیہ پر قابو پا لوں تو عثمانؓ کے قصاص میں تو انہیں قتل نہ کروں لیکن حضرت عثمانؓ کے غلام نائل کے قصاص میں ضرور قتل کر دوں ۔"

شبث نے کہا :

"خدا کی قسم ! یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ گردنیں جسموں سے جدا نہ ہو جائیں اور زمین کی پشت اور آسمان کا سینہ تمہارے لیے تنگ نہ ہو جائے ۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا :

"اگر ایسا ہونا ہی ہے تو پہلے تمہارے لیے ہوگا ۔"

اُس طرح یہ سفارت بھی ناکام ہوگئی ۔ حالانکہ اگر فریقین خلوص نیت سے صلح کی بات چیت کرتے اور ایک دوسرے کو کچھ مراعات دے دیتے تو اس امر کا کافی امکان تھا کہ مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ باہم اتفاق رائے سے ایسے فیصلے پر پہنچ جاتے جو تمام مسلمانوں کے لیے یکساں مفید ہوتا ۔ لیکن اس سفارت میں بھی منجملہ دوسری سفارتوں کے اسی شدت اور سختی کا مظاہرہ کیا گیا، جس سے دلوں میں اور بھی زیادہ بگاڑ پیدا ہو گیا اور دونوں گروہ ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ دُور ہو گئے ۔

حضرت معاویہؓ کی طرف سے سفارت کا سلسلہ اب تک حضرت علیؓ کی جانب سے سفیر آ رہے تھے اب معاویہؓ نے اپنی طرف سے حبیب بن مسلمۃ الفہری، شرحبیل بن السمط اور معن بن یزید بن الاخنس کو حضرت علیؓ سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا ۔ یہ تینوں حضرت علیؓ کے پاس پہنچے ۔ حبیب نے گفتگو شروع کی ۔ انہوں نے کہا :

"حضرت عثمانؓ بن عفان خلیفۂ برحق تھے ۔ کتاب اللہ عزّ وجل پر عمل کرتے تھے ۔ خدا تعالیٰ کے احکام کے پابند تھے ۔ تم نے ان کی زندگی کو پسند نہ کیا اور ان کو ظلم کے ساتھ شہید کر دیا ۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم حضرت عثمانؓ کے قتل سے بری ہو تو ان کے قاتلین کو ہمارے سپرد کر دو ۔ ہم انہیں حضرت عثمانؓ کے قصاص میں قتل کر دیں گے ۔ پھر مسلمان جمع ہو کر باہم اتفاق رائے سے جسے چاہیں گے اپنا خلیفہ منتخب کر لیں گے ۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"کیا خوب ! تم اور مجھے معزول کرو ۔ خاموش رہو ۔ تم اس معاملہ میں بولنے کے اہل نہیں ہو ۔"

حبیب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا :

"تم مجھے اس حالت میں دیکھو گے جو تمہیں پسند نہیں ہوگی ۔"

حضرت علیؓ نے کہا :

"تم میرا کر ہی کیا سکتے ؟ چاہے تم جتنی کوشش کر لو اپنے مقصد میں ناکام رہو گے ۔"

شرجبیل بن السمط بھی کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے :

"میں بھی وہی کچھ کہوں گا جو میرے ساتھی کہہ چکے ہیں۔ کیا اس کے سوا بھی آپ کے پاس کوئی اور جواب ہے؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"بے شک!"

اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اُمت کی ہدایت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ :

"پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کے بعد خلیفہ ہوئے اور نہایت اچھی طرح خلافت کا کام سرانجام دیا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے بھی خلافت کا کام بڑی خوبی سے نبھایا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے عہدِ خلافت کو بہت اچھی طرح گزارا اور امت میں عدل و انصاف قائم کیا۔ چونکہ ہم آلِ رسول ہیں اور خلافت کا حق سب سے زیادہ ہمارا تھا اس لیے اگرچہ ہمیں ان سے خلافت کے بارہ میں اپنی حق تلفی کی شکایت تھی لیکن ہم نے ان کو معاف کر دیا۔ ان دونوں کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے چند ایسے کام کیے جنہیں لوگوں نے ناپسند کیا۔ انہوں نے بغاوت کی اور حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد لوگ میرے پاس آئے۔ میں ان کے معاملات سے بالکل الگ تھا۔ انہوں نے مجھ سے بیعت لینے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے پھر بیعت لینے کے لیے کہا اور کہا کہ امتِ محمدیہ آپ کے سوا اور کسی شخص کی خلافت پر راضی نہیں ہو گی اور اگر آپ نے خلافت قبول نہ کی تو امت میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ تب میں نے ان کی بیعت لی۔ پہلے طلحہؓ اور زبیرؓ نے بیعت کرنے کے بعد میری مخالفت کی اور اب معاویہؓ میری مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں اسلام میں سابقیت کا شرف حاصل ہے اور نہ انہوں نے اسلام کی کوئی مخلصانہ خدمت سرانجام دی ہے۔ وہ اور ان کے والد ہمیشہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے دشمن رہے۔ وہ دونوں اسلام میں بھی داخل ہوئے تو مجبور ہو کر۔ اس لیے تعجب ہے کہ تم ان کا ساتھ دیتے ہو اور اہلِ بیت کی مخالفت کرتے ہو۔ تمہیں میری مخالفت کرنا اور میرے مقابلہ میں کسی اور کو لانا زیب نہیں دیتا۔ میں تمہیں کتاب اللہ اور سنتِ نبویؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں اور باطل کو مٹانے اور حق کو زندہ کرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔"

شرجبیل نے یہ سن کر کہا :

"آپ یہ گواہی تو دیجئے کہ حضرت عثمانؓ مظلوم شہید کئے گئے۔"

حضرت علیؓ نے کہا :

"میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم قتل کیے گئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم ہونے کی حالت میں قتل کیے گئے۔"

اس پر ان تینوں قاصدوں نے کہا :

"جو شخص حضرت عثمانؓ کی مظلوم شہادت کو تسلیم نہیں کرتا ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ تینوں واپس چلے گئے۔ حضرت علیؓ نے اس وقت یہ آیت پڑھی :

فانک لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعآء اذا ولوا مدبرین وما انت بھٰدی العمی عن ضلالتھم ان تسمع الا من یؤمن باٰیٰتنا فھم مسلمون۔

(تُو نہ مُردوں کو کچھ سنا سکتا ہے اور نہ بہروں کو جب وہ پیٹھ پھیر لیں۔ تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے نجات نہیں دلا سکتا۔ تُو اپنی باتیں انہی لوگوں کو سُنا سکتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں اور تابعداری اختیار کریں)

صلح کی بات چیت کی ناکامی ہم نے صلح کی بات چیت کو ذرا تفصیل سے یہ دکھانے کے لیے بیان کر دیا ہے کہ حضرت علیؓ صلح کے کس قدر خواہشمند تھے۔ حضرت علیؓ اپنا لشکر لے کر صفین کے میدان میں ذی الحجہ ۳۶ھ کے اواخر میں پہنچے تھے۔ جب محرم شروع ہوگیا تو دونوں فریق "اشہر الحرام" کے دوران میں صلح کرنے پر رضامند ہو گئے۔ امیر المومنینؓ کو امید تھی کہ اس عرصہ میں معاملات سُلجھ جائیں گے اور بغیر جنگ کے مسلمان آپس میں متحد ہو جائیں گے۔ انہیں حضرت معاویہؓ کی طرف سے کسی بھلائی کی امید نہ تھی اور انہیں معلوم تھا کہ تلوار کے علاوہ اور کسی طریق سے وہ شام کی حکومت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ البتہ انہیں اس امر کی توقع تھی کہ وہ پند و نصائح سے حضرت معاویہؓ کے بعض مددگاروں کو اپنی طرف مائل کر لیں گے۔ اسی لیے حضرت علیؓ کے قاصد حضرت معاویہؓ کے پاس آتے رہے لیکن انہوں نے اس ضمن میں کوئی اچھا کام سرانجام نہیں دیا۔ حضرت علیؓ کے قاصدوں نے حضرت معاویہؓ کے سامنے اور حضرت معاویہؓ کے قاصدوں نے حضرت علیؓ کے سامنے اس طرح گفتگو کی جس سے باہمی نفرت اور بھی زیادہ ہو گئی اور کامیابی کی اُمید جاتی رہی۔ ان قاصدین کی گفتگوؤں سے پتا چلتا ہے کہ انھیں سیاست کی کچھ شُد بُد نہ تھی۔ وہ صلح سے زیادہ جنگ کی طرف مائل تھے۔ اس طرح یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور صلح کی تمام بات چیت ناکام ہو گئی۔

(۱۷)

معرکۂ صفین

دونوں فریق اپنے اپنے کیمپوں میں ٹھہرے ہُوئے تھے۔ حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ اس عرصہ میں دلائل و براہین کے ساتھ مخالفین کو قائل کر لیا جائے گا اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئے گی۔ لیکن جب محرم گزر گیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ اب صلح کی مزید گفت و شنید بیکار ہو گی تو آپ نے ایک سالار کو حکم دیا کہ وہ فوج میں دوبارہ لڑائی شروع ہونے کی منادی کرا دے تاکہ تمام لوگ تیار ہو جائیں۔ تاہم آپ اس بات کے لیے تیار نہ ہُوئے کہ اپنے ارادہ کا فریقِ مخالف پر اظہار کرنے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر دیں۔ اس لئے آپ نے اپنے ایک آدمی کو اہلِ شام میں اس اعلان کے لیے بھیجا:

"امیر المومنینؓ تمہیں مطلع کرتے ہیں کہ انہوں نے تم کو حق کی طرف رجوع کرنے اور سرکشی سے باز آ جانے کے لیے کافی مہلت دی، تمہارے سامنے کتاب اللہ پیش کی اور تمہیں اس کی طرف بلایا۔ لیکن تم اپنی سرکشی سے

باز نہ آئے اور حق و صداقت کو قبول نہ کیا اب ہم تم سے دُو بدُو مقابلہ کریں گے۔"

جب حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کو حضرت علیؓ کے ارادہ کا پتا چلا تو انہوں نے بھی اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ لڑائی سے پہلے حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"جب تک فریقِ مخالف کی طرف سے حملہ شروع نہ ہو تم حملہ نہ کرنا۔ اگر وہ شکست کھا جائے تو کسی بھاگتے ہوئے کو قتل نہ کرنا، کسی زخمی کو نہ مارنا، کسی مُردہ کا مثلہ نہ کرنا۔ جب تم ان لوگوں کے خیموں کے پاس پہنچو تو کسی عورت کی بے پردگی نہ کرنا، گھروں میں داخل نہ ہونا، کسی کا مال نہ لُوٹنا، عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا خواہ وہ تمہاری بے عزتی کر رہی ہوں اور تمہارے امرا اور بزرگوں کو گالیاں دے رہی ہوں۔ کیونکہ وہ کمزور جانوں میں شمار ہوتی ہیں۔"

شروع میں جزوی مقابلے ہوتے رہے۔ طرفین کی جانب سے فوجوں کے چھوٹے چھوٹے دستے ایک دوسرے کے مقابلہ کے لیے میدانِ جنگ میں آ جاتے اور آپس میں مقابلہ شروع ہوتا۔ رات ہونے پر یہ دستے اپنے اپنے کیمپوں میں واپس چلے جاتے۔ ان مقابلوں میں قتل ہونے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ رات کو جب سپاہی ہتھیار اتارتے تو اکثر اوقات ایک دوسرے کے خیموں میں بھی چلے جاتے اور آپس میں بھائیوں کی طرح پیار محبت کی باتیں کرتے۔ دُوسرے دن پھر ایک دوسرے کے مقابلہ میں میدان میں نکل آتے۔ ایک ہفتہ تک لڑائی اسی ڈھنگ پر جاری رہی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر حضرت علیؓ نے پُورے لشکر کے ساتھ عام حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۸ صفر ۳۷ھ کی رات کو آپ نے اپنی فوج میں ایک پُرجوش خُطبہ دیا اور اسے جنگ میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

اگلے روز دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے جدید اصولوں کے مطابق اپنے اپنے لشکر کو مرتب کیا تھا۔ سب سے پہلے امیر المومنین حضرت علیؓ نے اپنے لشکر کے دائیں بازو کو آگے بڑھایا جس نے حضرت معاویہؓ کے لشکر کے بائیں بازو پر حملہ کر دیا۔ اس حصۂ لشکر کے سالار عرب کے مشہور بہادر عبداللہ بن بدیل تھے۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ حضرت معاویہؓ کے لشکر کے پاؤں ڈگمگانے لگے اور اسے قلب کے سپاہیوں سے مدد لینی پڑی۔ اب حضرت معاویہؓ کے میسرہ کا پلہ بھاری ہو گیا اور انہوں نے حضرت علیؓ کے میمنہ پر جوابی حملہ کر کے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ صرف میمنہ کا سالار اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ ثابت قدم رہا اور جی توڑ کر لڑتا رہا۔ جب حضرت علیؓ نے دیکھا کہ ان کا میمنہ غیر متوقع طور پر پیچھے ہٹ گیا ہے تو وہ قلب کو ساتھ لے کر حضرت معاویہؓ کے میسرہ کے عین مقابل آ گئے لیکن قلب بھی اس حملہ کو نہ روک سکا۔ جب میسرہ نے یہ حالت دیکھی تو اس کی غیرت جوش میں آئی اور اس نے آگے بڑھ کر حضرت معاویہؓ کے میسرہ کے حملہ کو روکنا شروع کیا۔ حضرت علیؓ بھی ان کے ساتھ تھے اور بنفسِ نفیس لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔

اس وقت حضرت علیؓ اشتر نخعی کے پاس سے گزرے اور فرمایا:

"اہلِ میمنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ تم موت سے بچ کر کہاں تک بھاگو گے؟"

اشتر نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ پیچھے ہٹنے والی فوج کے پاس پہنچا اور اپنی طلاقتِ لسانی کی وجہ سے ان کے دلوں میں نیا جوش

پیدا کر دیا، وہ لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ انہیں لے کر وہ میدانِ جنگ میں پہنچا اور بڑی شدت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی فوج پر حملہ کیا۔ معاویہؓ کے سپاہی اشتر کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ آہستہ آہستہ اشتر حضرت معاویہؓ کے خیمے کے قریب تک پہنچ گیا۔ معاویہؓ کے سپاہیوں نے جرأت سے کام لیا اور ایک مرتبہ پھر انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ اسی روز حضرت عمارؓ بن یاسر شہید ہوئے۔

رات آ چکی تھی اور دونوں لشکر میدان میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کوئی لشکر دوسرے لشکر پر قابو نہ پا سکا اور کسی کو کسی پر فتح حاصل نہ ہوئی۔ رات کو بھی یہ لڑائی بند نہ ہوئی۔ ہر فریق فتح و ظفر کی امید رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ لڑائی کو جاری رکھ کر وہ جلد از جلد فتح حاصل کرے۔ یہ رات اپنی شدت میں قادسیہ کی "لیلۃ الھریر" سے مشابہ تھی۔ اس رات طرفین کے کثیر آدمی قتل ہوئے۔

مورخین اس ہولناک رات اور اس کے بعد آنے والی صبح کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اس لڑائی میں دونوں فریقوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے آدمیوں کی حالت نہایت پتلی تھی۔ انہوں نے پہلے تیروں اور پتھروں سے کام لیا۔ جب وہ ختم ہو گئے تو نیزے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ جب وہ بھی ٹوٹ گئے تو تلواریں نکال لیں۔ اس وقت میدانِ جنگ میں سوائے تلواروں کی کھٹا کھٹ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ اشتر کبھی میمنہ والوں کے پاس جاتا اور کبھی میسرہ والوں کے پاس اور اپنی جوشیلی تقریروں سے ان کی ہمت بڑھاتا تھا۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی لیکن لڑائی اسی طرح جاری رہی۔ حضرت علیؓ کی فوج کے حوصلے خوب بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کی فوج کی صفوں کی صفیں تہ تیغ کر دیں۔ حضرت علیؓ بھی برابر میدان میں ڈٹے ہوئے تھے اور اپنے سپاہیوں کو جوش دلا رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس وقت معاویہؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص سے کہا:

"ابن العاصؓ! کوئی تدبیر بتاؤ ہم تو ہلاک ہو گئے۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا:

"تمہارے آدمی حضرت علیؓ کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ صرف ایک تدبیر سے ان کا حملہ رک سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم ان کو کتاب اللہ کی طرف بلاؤ کہ وہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے۔ اس طرح ردّ و قبول دونوں صورتوں میں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے گا۔"

مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ جنگِ صفین کے آخری دن حضرت علیؓ نے اپنی تلوار سے پانچسو آدمی قتل کیے۔ جب کبھی وہ دشمن پر حملہ کر کے واپس آتے تھے تو ان کی تلوار مڑی ہوتی تھی۔ وہ اسے اپنے آدمیوں کو دیتے جو اسے سیدھا کرتے اور پھر آپ وہ تلوار ان سے لے کر دشمن کی صفوں میں گھس جاتے۔

جب لڑائی نے انتہائی شدت اختیار کر لی اور حضرت معاویہؓ کی فوجوں کی صفیں تتر بتر ہو گئیں تو حضرت معاویہؓ نے اپنے آدمیوں کو فوج کے آگے بھیجا جو نیزوں کے سروں پر قرآن مجید اٹھائے ہوئے تھے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوجوں کے سامنے قرآن مجید پیش کرنے کا فیصلہ رات ہی کو ہو چکا تھا۔ کیونکہ جب صبح ہوئی تو حضرت معاویہؓ کے آدمی قرآن مجید اٹھائے ہوئے تھے اور پکار رہے تھے:

"اے اہلِ عراق! اگر تم ہمیں قتل کر دو گے تو ہمارے بال بچوں کا کیا بنے گا اور اگر ہم تمہیں قتل کر دیں گے تو تمہارے بال بچوں کا کیا بنے گا؟ اس لیے لڑائی سے باز آ جاؤ۔"

دمشق کے مصحفِ اعظم کو دس آدمی نیزوں پر اٹھائے ہوئے تھے اور وہ پکار رہے تھے:

"کتاب اللہ کے فیصلہ کو اپنے اور ہمارے درمیان قبول کرو۔"

ابو الاعور السلمی ایک سفید خچر پر سوار تھا اور اپنے سر پر قرآن مجید اٹھائے ہوئے پکار پکار کر کہہ رہا تھا:

"اے اہلِ عراق! یہ خدائے عز و جل کی کتاب ہے۔ اپنے اور ہمارے درمیان اس کے فیصلہ کو منظور کرو۔ اگر اہلِ شام نہ رہے تو مغربی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا اور اگر اہلِ عراق نہ رہے تو مشرقی سرحدوں کی حفاظت کس طرح ممکن ہو گی؟"

حضرت علیؓ نے جنگ بند کرنے میں توقف کیا۔ آپ کو پتا تھا کہ یہ چال ہے جو دشمن نے اپنی شکست کو قریب آتے دیکھ کر ہمیں دھوکہ دینے کے لیے چلی ہے۔ لیکن اس سوال پر حضرت علیؓ کی فوج میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض لوگ جن میں اشتر بھی شامل تھا یہ کہتے تھے کہ ہمیں مقابلہ جاری رکھنا چاہیے اور جب تک ہم دشمن پر فتح نہ پا لیں میدان چھوڑنا نہیں چاہیے۔ لیکن اشعث بن قیس تحکیم قبول کرنے کے حق میں تھا، جس نے دریائے فرات کے پانی پر قبضہ کرنے کے لیے فوج کے ایک دستہ کی قیادت کی تھی اور فتح پائی تھی، وہ کہنے لگا:

"امیر المومنینؓ! آج ہم آپ سے وہ بات کہتے ہیں جو کل معاویہؓ سے کہتے تھے۔ اہلِ شام آپ کو کتاب اللہ کے فیصلہ کی طرف بلاتے ہیں۔ آپ ان کی اس بات کو قبول کریں۔ اب لوگ لڑائی سے اکتا چکے ہیں اور مزید لڑائی جاری نہیں رکھ سکتے۔"

حضرت علیؓ نے کہا:

"اس معاملہ میں خوب غور و فکر کی ضرورت ہے۔"

لیکن ہر طرف سے تحکیم قبول کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"میں قرآن مجید کا فیصلہ سب سے پہلے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن معاویہؓ، عمروؓ بن العاص، ابن ابی [illegible] ابن ابی سرح نہ دین کا علم رکھتے ہیں نہ قرآن کا۔ میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ لڑکوں میں یہ سب سے برے [illegible] اور جوانوں میں بدترین جوان۔ یہ لوگ جو بات کہتے ہیں وہ تو سچ ہے۔ لیکن اس سے ان کی مراد جھوٹ ہے۔ جو کچھ یہ کر [illegible] دھوکا اور مکر و فریب ہے۔ تم تھوڑی دیر اور میدانِ جنگ میں ٹھہرو۔ فتح بہت قریب ہے اور ظالموں کی جڑ کٹنے میں [illegible] رہ گئی ہے۔

اس پر آپ کی فوج کے بیس ہزار آدمی زرہ بکتر پہنے اور تلواریں لٹکائے آپ کے پاس آئے ان کی پیشانیاں سجدوں کی وجہ سے سیاہ ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں میں پیش پیش مسعر بن فدکی اور زید بن حصین تھے جو بعد میں خارجی ہو گئے تھے۔ انہوں نے آپ کو امیرالمومنین کہنے کے بجائے آپ کے نام سے پکارا اور کہا:

"اے علیؓ! آپ کتاب اللہ کے فیصلہ کی طرف آئیے جبکہ آپ کو اس کی طرف بلایا جا رہا ہے اور لڑائی بند کرنے کا حکم دیجئے ورنہ ہم آپ کو بھی اسی طرح قتل کر دیں گے جس طرح ہم نے عثمانؓ بن عفان کو قتل کیا تھا۔"

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ اشتر کو، جو حضرت معاویہؓ کی فوجوں سے لڑ رہا تھا اور اہلِ شام پر تقریباً غالب آ چکا تھا واپس بلا لیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک آدمی اشتر کو بلانے بھیجا۔ اشتر نے اس سے کہا:

"اس وقت مجھے یہاں سے ہٹانا مناسب نہیں ہے۔ امید ہے کہ میں تھوڑی دیر میں فتح حاصل کر لوں گا۔ اس لئے جلدی نہ کرو۔"

اس آدمی نے واپس آکر حضرت علیؓ کو اشتر کا یہ پیغام سنا دیا۔ اس پر زبردست شور و غل برپا ہوا اور لوگ حضرت علیؓ سے کہنے لگے:

"یا تو اشتر کو واپس بلا لیجیے ورنہ ہم آپ کو معزول کر دیں گے۔"

حضرت علیؓ نے اسی آدمی سے کہا:

"اشتر سے کہو کہ فوراً آ جائے کیونکہ خود اپنی جماعت میں فتنہ پھوٹ پڑا ہے۔"

چنانچہ اشتر با دلِ ناخواستہ واپس آ گیا۔

حضرت علیؓ نے اشعث بن قیس کو حضرت معاویہؓ کے پاس یہ معلوم کرنے بھیجا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ جب اشعث ان کے پاس پہنچا تو معاویہؓ نے اس سے کہا:

"آؤ ہم اور تم اس فیصلہ کی طرف رجوع کریں جس کا قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے۔ ایک آدمی تم اپنی طرف سے مقرر کرو اور ایک آدمی ہم اپنی طرف سے مقرر کرتے ہیں اور پھر ان سے عہد لیں کہ وہ کتاب اللہ سے باہر نہ جائیں گے۔ پھر قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق یہ دونوں ہمارے نزاع کا فیصلہ جس صورت سے کریں اسے ہم قبول کر لیں۔"

اشعث نے اس تجویز پر صاد کر دیا اور حضرت علیؓ کے پاس واپس آکر معاویہؓ کی تجویز سے آپ کو مطلع کر دیا۔ لوگوں نے کہا:

"ہمیں یہ تجویز منظور ہے۔"

حضرت معاویہؓ نے اپنی طرف سے عمروؓ بن العاص کو حَکَم تجویز کیا۔ اشعث اور اس کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ہماری طرف سے ابو موسیٰؓ اشعری حَکَم ہونے چاہئیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"تم نے میری پہلی بات بھی نہیں مانی۔ اس امر میں میری رائے کے خلاف نہ چلو۔ مجھے ابو موسیٰ اشعریؓ پر اعتماد نہیں ہے۔"
لیکن لوگوں نے ابو موسیٰؓ ہی کو حکم بنانے پر اصرار کیا جس پر مجبوراً حضرت علیؓ کو ان کی بات ماننی پڑی [1]

(۱۸)

صفین کے اسرار

تحکیم پر راضی ہونے کے بعد دونوں فریق اپنے اپنے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ اہلِ شام کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک زبردست شکست سے بال بال بچے تھے۔ اِدھر اہلِ عراق انتہائی پژمردہ تھے۔ انہیں ایک عظیم فتح حاصل ہونیوالی تھی لیکن یکایک پانسہ پلٹ گیا اور اہلِ شام کی چالاکی سے انہیں مات کھانی پڑی۔ ان میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور ان میں سے ہر ایک دُوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا اور اسے موردِ الزام قرار دے رہا تھا۔

زمانۂ حاضر کا مورخ یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت علیؓ کی فوج کو اتنا زبردست صدمہ اٹھانا پڑا۔ اسے ان ظاہری اسباب سے اطمینان نہیں ہو سکتا جو قدیم مورخین نے اپنی تالیفات میں اس اختلاف کے سلسلہ میں بیان کئے ہیں۔

ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس فتنہ کا کیا سبب تھا جو بغیر کسی سان گمان کے دفعتہً پھوٹ پڑا۔ جس نے حضرت علیؓ کے تمام لشکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جس کے پھیلانے والے حضرت علیؓ کو دھمکیاں دینے لگے کہ اگر انہوں نے دشمن کا کہا مان کر جنگ بند نہ کی اور اللہ تعالیٰ اور اس کی نازل کردہ کتاب کا فیصلہ قبول نہ کیا تو وہ ان سے ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا وہ قبل ازیں حضرت عثمانؓ سے کر چکے ہیں۔

ان واقعات کی چھان بین کرنے سے جو جنگِ صفین کے درمیان پیش آئے، پتا چلتا ہے کہ یہ فتنہ خود بخود نہیں پھوٹ پڑا بلکہ اس کے لیے پہلے سے زمین ہموار کی گئی اور اس کے تار ہلانے والے پس پردہ موجود تھے۔ ہمارا یقین ہے کہ حضرت معاویہؓ نے کامیابی حاصل کرنے اور اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے اثناءِ جنگ میں کئی حیلوں سے کام لیا اور جو چاہتے تھے وہ حاصل کر لیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج میں کئی لوگ ایسے تھے جو حضرت معاویہ کی طرف سے کام کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بلند کر کے لڑائی بند کرانے کی تدبیر کامیاب ہو گئی۔ یہ محض خیال نہیں بلکہ امرِ واقعہ ہے۔ کیونکہ لڑائی کے اثنا میں بار بار ایسی آوازیں آئی تھیں لیکن چونکہ ابھی تک پوری طرح سازش بروئے کار نہیں لائی گئی تھی اس لیے ان ابتدائی تدبیروں کا پوری طرح اثر نہیں ہوا۔

---

[1] صفین کا معرکہ دس دن تک جاری رہا۔ لیکن شدت کی لڑائی آخری تین روز یعنی ۱۱، ۱۲، ۱۳ صفر ۳۷ھ کو ہوئی جبکہ دونوں لشکر کامل تین روز تک برابر لڑتے رہے۔

لڑائی کے دوران میں ازد کا ایک بوڑھا شخص اپنے قبیلہ اور ان لوگوں کا، جو حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے ماتم کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا:

"خدا کی قسم! ہم اپنے ہاتھوں کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہے ہیں اور اپنے بازوؤں کو خود اپنی تلواروں سے قطع کر رہے ہیں۔"

لیکن یہ آواز کمزور اور دھیمی تھی اس لیے زیادہ لوگوں نے اُسے نہ سُنا اور یہ دلوں پر زیادہ اثر نہ ڈال سکی۔

ربیعہ کا سردار بھی حضرت معاویہؓ سے ملا ہوا تھا۔ جنگ کے دوران میں ربیعہ کے لوگوں نے بزدلی دکھائی اور ان کا سردار بھی ان کے ساتھ پسپا ہو کر بھاگ نکلا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ حضرت علیؓ کے دُوسرے ساتھی جوش و خروش سے لڑ رہے ہیں اور دشمن کے مقابلہ پہ ڈٹے ہوئے ہیں تو واپس ہوا اور بھاگنے کی توجیہ یہ بیان کی کہ میں تو پسپا شدہ فوج کو واپس لانے کے لیے گیا تھا۔

ان حالات میں ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوج کا ایک حصہ ایسا تھا جو لڑنا نہیں چاہتا تھا اور جسے فتح کی بالکل پروا نہ تھی۔ حضرت معاویہؓ کو یہ حال معلوم تھا اور آپ ان کی پشت پناہی کر رہے تھے اور کوئی عجب نہیں کہ حضرت علیؓ سے ان کو برگشتہ کرنے کے لیے آپ اپنے آدمیوں کو ان کے پاس بھیج کر مال و زر کی طمع بھی دلاتے ہوں۔

چونکہ حضرت علیؓ کی شخصیت ایسے حیلے بہانوں سے بالا تر تھی اور آپ کو اپنے حق و صداقت پر ہونے کا پُورا یقین تھا اس لئے آپ نے اپنے لشکر میں پیدا شدہ اس اختلاف کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ آپ کے لشکر کے بعض سرداروں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ لیکن آپ نے اس طرف بھی اپنی توجہ مبذول نہ کی اور ان کے جھگڑوں کو طے کرنے کی کوئی کوشش نہ فرمائی۔

لشکر کے دُو قائدین کی آپس میں مخالفت اور مناقشت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ صفین میں حضرت علیؓ کے لشکر کی فتح عین آخری وقت شکست سے بدل گئی، جس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ کے مؤقف کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ دُو قائد اشعث بن قیس اور اشتر نخعی تھے۔

اشعث بن قیس حضرت عثمانؓ کے عہد میں آذربائیجان کا عامل تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے اسے اسی جگہ پر قائم رکھا اور دیگر عمّال کی طرح اسے برطرف نہیں کیا۔ اشتر جو عراق کا مشہور اور با اثر رئیس تھا، عراق میں حضرت عثمانؓ کے مقرر کیے ہوئے عمّال کے سخت خلاف تھا۔ اس نے ان کے خلاف ایک زبردست بغاوت کے بیج بوئے جس سے ان عاملوں کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا۔ جن لوگوں نے مدینہ آ کر حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی تھی اور آپ کا محاصرہ کیا تھا، اشتر ان کے سرغنوں میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اشتر کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اسی نے حضرت علیؓ کو خلافت قبول کرنے پر تیار کیا۔ خلافت کے بعد جب جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے حضرت علیؓ کی فوج میں شامل ہو کر بڑے کارہائے نمایاں سر انجام دیئے۔ وہ فوج کے بڑے بڑے سالاروں میں سے ایک تھا اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جب حضرت علیؓ نے اشعث بن قیس کو اپنی فوج کا ایک سالار مقرر کیا تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ حضرت عثمانؓ کا ایک عامل ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اس کی طرف سے بغض بھرا ہوا تھا۔

جب حضرت علیؓ عراق سے آ کر صفین کے میدان میں مقیم ہوئے تو یہ اشعث ہی تھا جس نے شامیوں کو دریائے فرات سے ہٹا کر ان کے منصوبوں کو، جن کے ذریعہ وہ حضرت علیؓ کی فوج کو پیاسا مار دینا چاہتے تھے، خاک میں ملا دیا تھا۔ "یوم النہر" کی

لڑائی میں فتح کا فخر صرف اشعث کے حصہ میں آتا ہے۔ اس کے بعد ہر شخص یہ امید کرنے میں حق بجانب تھا کہ جنگِ صفین کے دوران میں بھی اشعث اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتا اور سب سے پہلی صف میں شامل ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دس روز تک لڑائی رہی لیکن اشعث نے اس دوران میں ایک بھی قابلِ فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ البتہ اشتر اپنی بہادری کے جوہر نمایاں طور پر دکھاتا رہا اور فتح و نصرت بھی ہر جگہ اس کے قدم چومتی رہی۔

آخر اشعث بن قیس ان دس ایام میں کہاں تھا؟ آخر کیوں اس نے اس دوران میں وہ بہادری، جرأت اور ہمت نہیں دکھائی جو "یوم النہر" کے موقع پر دکھائی تھی؟ یہ سوالات ہیں جو ہر شخص کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

اس سوال کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ اشعث نے اشتر سے ناراضگی، بغض و عداوت اور حسد کی وجہ سے جنگ میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔

دوسرے یہ کہ وہ درپردہ معاویہؓ سے مل گیا اور معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی مدد ترک کرنے کے بدلہ میں اسے مال و منال اور سیم و جواہر سے نوازنے کا وعدہ کر لیا۔

شعبی معصعہ سے روایت کرتا ہے[1] کہ جس رات حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی فوجوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا اور "لیلۃ الہریر" کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس رات اشعث کے منہ سے چند الفاظ ایسے نکلے جو حضرت معاویہؓ تک بھی پہنچ گئے۔ معاویہؓ نے ایسے وقت میں ان الفاظ کو بہت غنیمت جانا اور فوراً ان کے ذہن نے ان کو ایک تجویز سُجھا دی۔ وہ الفاظ کیا تھے؟ اشعث اس رات قبیلہ کندہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد یہ تقریر کی:

"اے مسلمانو! تم نے دیکھا آج کے دن تم پر کیا گزری اور عربوں کی کس قدر کثیر تعداد میدانِ جنگ میں ماری گئی۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر خدا کی قسم میں نے جس قدر ہولناک نظارہ آج کے دن دیکھا ہے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھو جو شخص میری بات سُن رہا ہے وہ دوسرے شخص کو پہنچا دے کہ ہمیں یہ تہیہ کر لینا چاہیے کہ ہم کل نہیں لڑیں گے کیونکہ عرب کثرت سے مارے جا رہے ہیں اور ناحق مسلمانوں کا خون ہو رہا ہے۔ خدا کی قسم! میں یہ باتیں جنگ سے ڈر کر یا بزدلی سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مجھے مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر ترس آ رہا ہے۔ اگر کل ہم مارے گئے تو ان غریبوں کا کیا حال ہوگا؟"

حضرت معاویہؓ کے جاسوسوں نے اشعث کی یہ تقریر انہیں پہنچا دی۔ انہوں نے کہا:

"اشعث نے ٹھیک کہا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے مصاحف کو نیزوں سے باندھنے کا حکم دیا اور اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا کہ کل جب لڑائی شروع ہو تو نیزوں سے لٹکے ہوئے یہ مصحف حضرت علیؓ کی فوج کو دکھانا اور ان سے کہنا کہ:

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۱۸۵

" اگر ہم میدانِ جنگ میں مارے گئے تو رومی شام پر چڑھ آئیں گے اور ہماری عورتوں کی عزتیں برباد کر دیں گے اور اگر تم مارے گئے تو ایرانی عراق پر چڑھ آئیں گے اور تمہاری عورتوں کی ناموس لوٹ لیں گے۔ اس لیے غور و فکر سے کام لو اور لڑائی بند کر دو۔"

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اشعث ان لوگوں میں پیش پیش تھا جو جنگ بند کرانا اور تحکیم قبول کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اسے اچھی طرح پتا تھا کہ اشتر نے اہلِ شام کی صفوں کی صفیں اُلٹ دی ہیں اور شامیوں کی شکست اب چند لمحوں کی بات ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونے کے باوجود اس نے حضرت علیؓ پر دباؤ ڈالا کہ اشتر کو فوراً واپس بلایا جائے جس پر حضرت علیؓ کو مجبوراً اشتر کو جنگ بند کر کے واپس آنے کا حکم دینا پڑا اور اشتر کو بھی بادلِ ناخواستہ اپنی طبیعت پر سخت جبر کر کے واپس آنا پڑا۔ واپس آ کر جب اسے اشعث کی کارستانی کا پتا چلا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر اب کر کیا سکتا تھا؟

صرف یہی نہیں بلکہ جب حکم بنانے کا سوال پیش ہوا تو اشعث نے اہلِ عراق کی طرف سے ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام پیش کر دیا۔ حضرت علیؓ نے چاہا کہ عبداللہؓ بن عباسؓ کو حکم مقرر کیا جائے لیکن اشعث اور اس کی جماعت نے حضرت علیؓ کی ایک نہ سُنی اور کہا،

" ہم ابو موسیٰ کے سوا اور کسی شخص پر راضی نہیں ہوں گے۔"

حضرت علیؓ کی دلیل یہ تھی کہ ابو موسیٰؓ قابلِ اعتماد شخص نہیں ہیں اور وہ ہماری طرف سے جنگ میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ لیکن اشعث برابر اپنے انکار پر قائم رہا۔ آخر حضرت علیؓ نے کہا،

" اگر تم ابنِ عباسؓ کو حکم بنانا نہیں چاہتے تو اشتر کو بنا لو۔"

اس پر اشعث کو بہت جوش آیا اور کہنے لگا:

" یہ ساری آگ تو اشتر ہی کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ ہم تو اشتر کے حکم کے نیچے ہی دبے ہوئے ہیں۔"

حضرت علیؓ نے کہا:

" اشتر کا کیا حکم ہے؟"

اشعث نے کہا،

" یہی کہ ہم ایک دوسرے کی گردن ماریں اور ہو وہی جو آپ چاہیں اور وہ چاہے۔"

ظاہر ہے کہ جنگ کے پہلے دن اشعث کی یہ حالت نہ تھی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے اسے دس دن کے اندر اندر بالکل ملا دیا اور وہ حضرت علیؓ اور اشتر کا زبردست مخالف بن گیا؟ حضرت علیؓ کی اس نے ایک نہ سُنی اور اپنی من مانی کی اور اشتر کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جیسے وہ اس کا زبردست دشمن ہو۔

بہت ممکن ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس دوران میں ترغیب و تحریص سے اپنی طرف ملا لیا ہو اور حضرت معاویہؓ کی

عقلمندی اور حضرت عمروؓ بن العاص کے تدبر سے یہ بات کوئی بعید نہیں۔ کیونکہ متقدمین و متاخرین مورخ متفق ہیں کہ تمام عرب میں کوئی شخص سیاست، عقلمندی، بعدِ نظر، حسنِ بصیرت اور ذکاوت میں ان دونوں سے بڑھ کر نہیں تھا۔
اس طرح اشعث اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور یہ کامیابی اہلِ شام کی فتح اور اہلِ عراق کی شکست تھی۔

(۱۹)
عہد نامہ تحکیم کی تکمیل

حضرت علیؓ نے تحکیم قبول اور لڑائی بند کر کے بہت زبردست غلطی کی۔ اس سلسلہ میں آپ کا عذر یہ تھا کہ آپ نے انتہائی لاچاری اور مجبوری کی حالت میں ایسا کیا۔ کیونکہ آپ کے اکثر مددگاروں نے لڑائی سے ہاتھ اٹھا لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر تحکیم قبول نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ مضبوطی سے اپنے فیصلہ پر قائم رہتے اور لڑائی جاری رکھتے تو اشعث بن قیس اور اس کی جماعت کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ باغیانہ روش اختیار کر کے آپ کے احکام سے سرتابی کر سکتے۔

تاہم آپ کا یہ عذر کسی حد تک تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے لیکن یہ عذر قطعاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ جب عہد نامۂ تحکیم لکھا جانے لگا تو آپ نے اس میں سے امیر المومنینؓ کا لقب حذف کرنا منظور کر لیا۔ آپ کی بیعت شرعی لحاظ سے بالکل ٹھیک تھی۔ اس کے ٹھیک ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ تھا۔ اس حالت میں عہد نامہ سے امیر المومنینؓ کا لفظ حذف کر دینا ایک زبردست سیاسی غلطی تھی جس کا اثر بہت دُور دُور تک پہنچا۔[۱]

جب عہد نامۂ تحکیم لکھا جانے لگا تو حضرت عمروؓ بن العاص نے اس بات پر اصرار کیا کہ عہد نامہ میں حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ امیر المومنین کا لقب نہ لکھا جائے۔ حضرت علیؓ نے اس پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ احنف نے یہ مشورہ دیا کہ وہ امیر المومنین کا لقب ہرگز حذف نہ کریں کیونکہ آگے چل کر اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ لیکن اشعث بن قیس نے اصرار کیا کہ

---

[۱] مؤلف کتاب ہذا کا یہ خیال ٹھیک نہیں۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مسلمانوں اور کفار کے مابین معاہدہ لکھا جانے لگا اور کاتب نے جو اتفاقاً حضرت علیؓ ہی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک محمد کے ساتھ رسول اللہ لکھا تو کفار نے رسول اللہ کا لفظ حذف کرنے پر اصرار کیا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہم آپ کو رسول اللہ مانتے تو لڑائیاں کیوں ہوتیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات مان لی اور خود اپنے دستِ مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کر سکتے تھے تو حضرت علیؓ کے لیے ایسا کرنے میں کیا روک تھی؛ آپ کا مدِمقابل فریق بھی یہی کہتا تھا کہ اگر ہم حضرت علیؓ کو امیر المومنین مانتے تو یہ لڑائیاں ہی کیوں ہوتیں۔ حضرت علیؓ نے بھی اس کی بات مانتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں اپنے نام سے امیر المومنین کا لفظ حذف کرنا منظور کر لیا اور آپ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ (مترجم)

امیرالمومنین کا لقب ضرور حذف کیا جائے۔ آخر بڑے تردد کے بعد حضرت علیؓ نے اس کی بات مان لی اور صلح نامہ لکھا گیا جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

عہد نامہ تحکیم

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر علیؓ بن ابی طالب نے اہلِ کوفہ اور ان کے ساتھیوں اور معاویہؓ بن ابی سفیان نے اہلِ شام اور ان کے حامیوں کی طرف سے اتفاق کیا ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ ہم دونوں حکمِ خدا اور اس کے کلام کے فیصلہ کو منظور کریں گے۔ کتاب اللہ شروع سے آخر تک ہمارے درمیان فیصلہ کن ہوگی۔ وہ جس بات کا حکم دے گی ہم اس کی تعمیل کریں گے اور جس بات سے منع کرے گی اس سے رک جائیں گے۔ ابوموسیٰ اشعریؓ، عبداللہ بن قیس اور عمروؓ بن العاص حَکَم مقرر کیے گئے ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے اگر کوئی بات کتاب اللہ میں نہ پائیں گے تو سنتِ عادلہ، جامعہ کی طرف جس میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوگا رجوع کریں گے۔

علیؓ اور معاویہؓ کی طرف سے دونوں حَکموں کو ان کی جان و مال کی حفاظت کا پورا اطمینان دلایا جاتا ہے اور وعدہ کیا جاتا ہے کہ ان کے فیصلہ کو نافذ کرنے میں اُمت ان کی مدد کرے گی۔ انہیں فیصلہ کرنے کے لیے رمضان تک مہلت دی جاتی ہے وہ اپنے فیصلہ کا اعلان کسی ایسے مقام پر کریں گے جو عراق اور شام کے وسط میں ہو۔ تا فیصلہ جنگ بند رہے گی۔ فریقین آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں گے آئیں جائیں گے۔ اگر مزید مدت کی ضرورت ہو تو حَکم باہمی فیصلہ سے تاخیر بھی کر سکتے ہیں ان کو جس کسی کی شہادت کی ضرورت ہوگی وہ ان کے طلب کرنے پر حاضر کر دیا جائے گا اور شہادتیں قلمبند کی جائیں گی۔ جو متفقہ فیصلہ ہوگا اس پر فریقین کو عمل کرنا ہوگا۔ اگر حکم یہ چاہیں گے کہ ان کے فیصلہ کے وقت مجمع عام نہ ہو تو وہ صرف خاص اشخاص کو اس موقع کے لیے طلب کریں گے۔ اگر فیصلہ سے قبل کسی حَکم کی وفات ہو جائے تو اس کی بجائے اس کا فریق دوسرے شخص کو منتخب کر کے بھیج دے گا۔"

یہ عہد نامہ ۱۵ صفر ۳۷ھ کو اور طبری کے بیان کے مطابق ۱۴ صفر کو لکھا گیا اور اس پر فریقین کے دستخط ثبت کیے گئے۔

یہ عہد نامہ مکمل نہ تھا کیونکہ نہ اس میں فیصلہ کی مقررہ حدود بیان کی گئی تھیں اور نہ کھلے الفاظ میں کوئی ایسا طریقہ کار بتایا گیا تھا جس سے حَکمین کو فیصلہ کرنے میں مدد ملتی۔ عہد نامہ میں اس امر کی صراحت بھی نہیں تھی کہ اگر دونوں حَکم یا ایک حَکم کتاب اللہ اور سنّتِ نبوی کے فیصلوں کو ترک کر دے یا ان دونوں کے درمیان باہمی اختلاف رونما ہو جائے تو کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ مزید برآں جس امر پر کتاب اللہ کا فیصلہ معلوم کرنا مطلوب تھا اسے بھی عہد نامہ میں نہایت مبہم طور پر بیان کیا گیا تھا اور اس کی تشریح نہیں کی گئی تھی۔

فریقین میں مصالحت کی ناکامی کے اسباب

اس صلح نامہ پر صفین کا واقعۂ ہائلہ اختتام پذیر ہوا جس میں نوّے ہزار مسلمانوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مقتولین کی یہ تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر اس وقت تک کی تمام لڑائیوں کے شہداء کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔ اگر خدانخواستہ لڑائی اور طول کھینچتی تو مسلمانوں کی طاقت بالکل ہی ختم ہو جاتی اور تمام مفتوحہ ممالک ان کے ہاتھ سے نکل جاتے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ جنگ کسی دینی مقصد کے پیشِ نظر نہیں لڑی گئی تھی بلکہ اس کا مدعا ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر فتح پانا اور اسے زیر کرنا تھا۔ حضرت علیؓ کے مددگار آپ کی حمایت اس لیے کرتے تھے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تھے اور حضرت معاویہؓ کے مددگار ان کی اس لیے مدد کرتے تھے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار اور آپ کا انتقام لینے کے مطالبہ کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو تنازعات پیدا ہوئے ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے خیالات میں کُلّی تباین تھا۔ حضرت علیؓ اپنی ذاتی فضیلت، اسلام میں سبقت قرابتِ رسول کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے ———— حضرت معاویہؓ کو وہ بہت ہی حقیر اور طلیق[1] بن طلیق سمجھتے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بار بار آپ کے مقابلہ کے لیے آئے۔ فتح مکہ کے بعد جب کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھا تو مجبوراً دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس حالت میں یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے مطالبہ کی بنا پر خلافت سے دستبردار ہو جاتے۔

جب آپ حضرت معاویہؓ کے متعلق کوئی بات بیان کرتے یا ان کو کوئی مراسلہ لکھتے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کے دل میں معاویہؓ کی حقارت اور اپنی بزرگی کا احساس ہے۔ جب معاویہؓ کے قاصدوں سے ملاقات کرتے تو بہت سخت الفاظ میں خطاب کرتے۔ یہی حال آپ کے قاصدوں کا تھا جو معاویہؓ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ آپ نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ معاویہؓ نے امتِ اسلامیہ کے نصف دلوں کو اپنا گرویدہ کر رکھا تھا۔ دنیا کی ساری نعمتیں انہیں میسر تھیں۔ ہر قسم کا اقتدار ان کے پاس تھا پھر جاہلیت میں بھی وہ سیاست، عزّت اور شرف کے مالک تھے جو اسلام میں بھی اسی طرح باقی رہے۔

حضرت علیؓ کے بالمقابل معاویہؓ اپنے آپ کو عظمائے قریش میں سے سمجھتے تھے کیونکہ وہ قریش کے سب سے بڑے اور معزز رئیس ابوسفیان کے بیٹے تھے۔ پھر ذاتی شرافت اور حسب و نسب کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے ثلاثہ کو آپ پر بے حد اعتماد تھا اور انہوں نے شام کا پورا علاقہ جو عراق کے بعد اسلامی حکومت کا سب سے بڑا صوبہ شمار ہوتا تھا ان کے حوالے کر دیا تھا۔ رومیوں کے حملوں کی روک تھام کرنے کی وجہ سے آپ کا عز و وقار بھی لوگوں کے دلوں میں بہت بڑھ گیا تھا۔

---

[1] طلیق آزاد کردہ غلام کو کہا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کے تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی حضرت معاویہؓ کو معلوم ہو گیا کہ علیؓ ان سے وہ سلوک نہیں کریں گے جو پہلے خلفاء نے ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ کیونکہ سب سے پہلا کام جو حضرت علیؓ نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کو شام کی امارت سے معزول کر دیا تھا۔ اس لیے ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ حضرت علیؓ کی خلافت قبول کر لیں اور ان کی اطاعت کا جوا اپنے گلے میں ڈال لیں تو حضرت علیؓ ان کو اس بلند مرتبے سے ہٹا دیں گے اور نہ معلوم ان کی اس اہانت کے بعد ان کا کیا حال ہو۔ اس خدشہ کے پیشِ نظر انہوں نے حضرت علیؓ کی مخالفت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ایسی پیدا ہو گئیں جنہوں نے اس مخالفت کو وسیع کر دیا۔ وہ باتیں یہ تھیں،

۱۔ حضرت علیؓ نے اپنی بیعت کے متعلق ان سے مشورہ نہیں کیا حالانکہ وہ معززینِ قریش میں سے تھے اور مملکت کے ایک بہت بڑے صوبہ کے والی، جس کے تحت مسلمانوں کی دو لاکھ فوج کام کر رہی تھی۔

۲۔ کئی صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی اور اگر کی تو پھر اسے فسخ کر دیا۔

۳۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے آپ کی بیعت کی، جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش و بغاوت اور انھیں شہید کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

۴۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کرنے والوں اور آپ کے قاتلوں کو جن سے قصاص لینا فرض تھا اپنے لشکر میں نہ صرف پناہ دے رکھی تھی بلکہ بڑے بڑے عہدے بھی دے رکھے تھے۔

ظاہر ہے کہ جو دو اشخاص ایک دوسرے کو اس نظر سے دیکھتے ہوں وہ مسلمانوں کے سروں سے اس وبال کو دور کرنے کے لئے، جو فتنۂ ہائلہ سے کسی طرح کم نہ تھا، کیسے آپس میں صلح کر سکتے تھے اور کسی فیصلہ پر باہم متفق کس طرح ہو سکتے تھے۔ مزید برآں دونوں طرف سے جو سفیر آتے تھے ان کی بات چیت فریقین کی باہمی صلح و صفائی کے جذبہ پر مبنی نہ ہوتی تھی حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ سے بیعت کا مطالبہ کرتے تھے اور اس سے کم کسی صورت میں راضی نہ ہوتے تھے۔ جو قاصد حضرت معاویہؓ کے پاس جاتے تھے وہ آپ سے حقارت آمیز لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے بالمقابل حضرت معاویہؓ یہ مطالبہ پیش کرتے تھے کہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے قاتلین کو ان کے حوالہ کیا جائے۔ اس کے بعد شوریٰ کے ذریعہ خلافت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ان دونوں صورتوں کو حضرت علیؓ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ قاتلینِ عثمانؓ کو وہ اس لیے معاویہؓ کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے حامی حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کر دیتے اور لشکر دو حصوں میں منقسم ہو جاتا اسی طرح وہ خلافت کو چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ آپ اپنے تئیں جائز خلیفہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ قوم نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ آپ کسی شخص کو خواہ دنیوی لحاظ سے اس کی حیثیت کتنی ہی بڑی اور دینی اعتبار سے اس کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اس بات کا مستحق نہیں سمجھتے تھے کہ وہ آپ کی خلافت پر اعتراض کرے۔ اس صورت میں وہ معاویہؓ کو کیوں خاطر میں لاتے!

صورتِ حال کو نازک تر بنانے میں بڑا ہاتھ ان فتنہ پردازوں کا تھا جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں

حصہ لیا تھا اور جو حضرت علیؓ کے لشکر میں کثرت سے موجود تھے۔ ان کی مصلحت اسی میں تھی کہ طرفین میں صلح نہ ہونے پائے، اس لیے وہ ہمیشہ فتنہ کی آگ بھڑکائے رکھتے تھے۔

(۲۰)

فتنۂ خوارج

امیر المومنینؓ جب کوفہ میں داخل ہوئے تو ہر گھر سے آہ و بکا اور شور و شیون کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کوفہ کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس جنگ میں کام نہ آگیا ہو۔ عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل نکل کے اپنے عزیزوں کا ماتم کر رہی تھیں۔ کسی کا خاوند کام آگیا تھا کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی مارا گیا تھا، کسی کا عزیز۔

اگر اس معرکہ میں حضرت علیؓ کو فتح حاصل ہو جاتی تو اس رنج والم میں بہت حد تک کمی ہو جاتی لیکن لشکر ناکام واپس ہوا تھا اور ہر شخص یہ خیال کر رہا تھا کہ اسے دوبارہ جنگ کے لیے جانا پڑے گا۔

مستشرقین اس معرکہ کو حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی واضح فتح خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید کا واسطہ دے کر لڑائی بند کرنے کی تدبیر جو ان دونوں نے اختیار کی تھی، پوری طرح کامیاب ہو چکی تھی اور حضرت علیؓ کا لشکر اس حالت میں واپس ہوا تھا کہ اس میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا اور مختلف گروہ قائم ہو چکے تھے۔ حضرت معاویہؓ کا لشکر گو مکمل شکست کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا لیکن اس کی صفوں میں مطلق انتشار نہ تھا۔ جب وہ واپس ہوا تو اس میں کوئی جھگڑا، کسی قسم کا اختلاف نہ تھا۔

حضرت علیؓ کی فوج میں اختلاف

حضرت معاویہؓ تو اطمینان سے دمشق کی طرف روانہ ہو گئے لیکن حضرت علیؓ کی فوج میں تفرقہ پڑ چکا تھا۔ بعض لوگوں کو خیال تھا کہ جو کچھ ہو گیا ٹھیک ہو گیا۔ لیکن ایک جماعت نے جس کے اکثر لوگ بنی تمیم میں سے تھے اس فیصلہ کی سخت مخالفت کرنی شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی شخص کو کتاب اللہ کے بارہ میں حَکَم نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے تحکیم کا فیصلہ سراسر غلط ہے۔ امارت کے بارہ میں خدا تعالیٰ کا واضح حکم قرآن شریف میں موجود ہے۔ لیکن اگر تحکیم قبول کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ محاربین کے ہر فریق کو اس امر میں شک ہے کہ آیا وہ حق پر ہے یا نہیں۔ لیکن حضرت علیؓ کے آدمیوں کے لیے یہ شک کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ یقیناً حق و صداقت پر ہیں اور ان کا دشمن یقیناً گمراہی کے راستہ پر چل رہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنا ایک نعرہ بھی ایجاد کر لیا، جو لا حکم الا للہ تھا۔

صلح کی شرائط لکھے جانے کے بعد اشعث بن قیس مختلف قبیلوں میں اسے سنانے کے لیے مقرر کیے گئے۔ جب وہ

سناتے سناتے قبیلہ بنی تمیم کے پاس پہنچے تو اس کے ایک سردار عروہ بن ادیہ نے کھڑے ہو کر کہا :

" قرآن کے فیصلہ میں تم نے آدمیوں کو کیوں ثالث مانا ! ہم سوائے اللہ کے اور کسی کا حکم نہیں مانیں گے ۔"

اس کے بعد اس نے اشعث پر تلوار کا وار کیا جس سے اشعث کے گھوڑے کی پیٹھ پر معمولی زخم آیا ۔ یہ دیکھ کر اشعث کے قبیلہ والوں کو، جو یمن سے تعلق رکھتے تھے جوش آ گیا اور وہ اشعث کی حمایت میں کھڑے ہو گئے ۔ بنی تمیم نے یہ دیکھ کر کہ جھگڑا بڑھ جائے گا اشعث سے معافی مانگ لی ۔ اس طرح یہ جھگڑا رفع دفع ہو گیا ۔ اس کے بعد لشکر نے کوفہ کا رُخ کیا ۔

حضرت علیؓ جس وقت اہلِ عراق کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہوئے تھے، فوج کے سارے آدمی متحد اور متفق تھے لیکن جب واپس ہوئے تو ایک دُوسرے کے مخالف اور دشمن بنے ہوئے تھے ۔ انہوں نے راستہ بھی آرام سے طے نہ کیا بلکہ چھیڑ چھاڑ جاری رہی ۔ اکثر لڑائی اور بد زبانی ہو جاتی تھی ۔ کبھی کبھی کوڑوں سے مارپیٹ تک نوبت پہنچ جاتی تھی ۔

خوارج، جو تحکیم کے سخت خلاف تھے، یہ کہتے تھے :

" اے اللہ کے دشمنو ! تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں مداہنت کی اور انسانوں کو اپنا حَکَم بنا لیا ۔"

اس کے جواب میں حضرت علیؓ کے حامی، جنہوں نے تحکیم قبول کر لی تھی، کہتے تھے :

" تم نے ہمارے امام کو چھوڑ دیا اور ہماری جماعت میں تفریق پیدا کی ۔"

جب حضرت علیؓ کوفہ کے قریب پہنچے اور "حروراء" کے مقام پر آئے تو بارہ ہزار خوارج نے آگے جانے سے انکار کر دیا اور وہیں ٹھہر گئے ۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا امیرِ لشکر شبث بن ربعی التمیمی ہو گا (یہ وہی شخص تھا جو حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بطور سفیر بھیجا گیا تھا، وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ درشت کلامی سے پیش آیا تھا اور اس نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی بیعت کیوں نہیں کی ۔ حالانکہ آپ مسلمانوں کے سردار اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں) اور امیرِ صلوٰۃ عبداللہ بن الکوا الیشکری ۔ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا مانا جا سکتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارا فرض ہے ۔

ابنِ عباسؓ کی خوارج سے بحث

حضرت علیؓ نے عبداللہؓ بن عباسؓ کو ان کے پاس بھیجا اور انہیں نصیحت کی کہ جب تک میں نہ پہنچ جاؤں ان کو جواب دینے اور بحث مباحثہ کرنے میں جلدی نہ کرنا لیکن جب ابنِ عباسؓ ان کے پاس پہنچے تو ان لوگوں نے ان سے بحث شروع کر دی جس پر ابنِ عباسؓ خاموش نہ رہ سکے اور کہنے لگے :

" آخر دو آدمیوں کو حَکَم مقرر کرنے میں تمہیں اعتراض کیوں ہے ؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها ان يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما ۔

(اگر تمہیں میاں بیوی میں تفرقہ کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم شوہر کے کنبہ میں سے اور ایک حَکَم بیوی کے کنبہ میں سے مقرر کرو ۔ اگر دونوں حَکَم چاہیں گے کہ صلح صفائی کرا دیں تو اللہ تعالیٰ ضرور میاں بیوی میں موافقت پیدا کر دے گا)

جب میاں بیوی کے جھگڑے کو دُور کرنے کے لیے حَکم مقرر کیے جا سکتے ہیں تو اُمتِ محمدیہ کے جھگڑوں کو دور کرنے کے لیے کیوں نہیں مقرر کیے جا سکتے ؟"

خوارج نے کہا :

"جس جگہ خدا تعالیٰ نے انسانوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا ہے وہاں انہیں خود فیصلہ کرنا چاہیے لیکن جہاں اس نے حکمِ قطعی بیان کر دیا ہے وہاں بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس حکمِ قطعی کے بارہ میں غور و فکر کریں۔"

ابنِ عباسؓ نے جواب دیا، خدا تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے،

یحکو بہ ذوا عدل منکو۔

(احرام کی حالت میں جو شخص شکار کرے اس کا فیصلہ دو عادل آدمی کریں)

خوارج کہنے لگے،

"صید و شکار اور میاں بیوی کے جھگڑوں پر باغیوں کے معاملہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ نے باغیوں کے متعلق قطعی حکم دیا ہے مسلمانوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں رکھا۔ معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کی جماعت سے علٰحدہ ہو کر بغاوت اختیار کی۔ ان کے متعلق خدا تعالیٰ کا ایک ہی حکم ہے کہ یا وہ توبہ کریں یا انہیں قتل کیا جائے۔ ہم نے ان کو کتاب اللہ کی طرف بلایا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد تم نے معاہدہ کر لیا اور تم دونوں میں صلح ہو گئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور اہلِ حرب کے درمیان اس وقت سے کہ آیت "براءۃ" نازل ہوئی ہے معاہدہ اور صلح کو ناجائز قرار دیا ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ جزیہ کا اقرار کریں۔"

حضرت علیؓ کا خوارج سے خطاب

یہ بحث و مباحثہ جاری ہی تھا کہ حضرت علیؓ پہنچ گئے۔ آپ نے ابنِ عباسؓ سے فرمایا :

"خاموش ہو جاؤ، کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا کہ بحث و مباحثہ نہ کرنا ؟"

اس کے بعد آپ نے ان لوگوں سے پوچھا :

"تم لوگ میرے خلاف کیوں ہو گئے ؟"

انہوں نے کہا :

"اس لیے کہ آپ نے یومِ صفین کے موقع پر اللہ کے حکم کو چھوڑ کر انسانوں کو حَکم مانا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا میں نے تحکیم قبول کرنے سے تمہیں نہیں روکا تھا لیکن تم نے میری رائے نہ مانی اور مجھے تحکیم قبول کرنے پر مجبور کیا۔ تاہم ہم نے دونوں ثالثوں سے یہ عہد لے لیا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اگر انہوں نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا تو ہم اسے قبول کر لیں گے ورنہ نہیں۔"

خوارج نے کہا :

"ہمیں بتائیے کیا آپ خون کے بارے میں انسانوں کا فیصلہ قبول کریں گے ؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"ہم نے انسانوں کے فیصلہ کو قبول نہیں کیا، قرآنِ کریم کے فیصلہ کو قبول کیا ہے۔ البتہ قرآن کے فیصلہ کا اعلان دو حَکَم کریں گے۔ قرآنِ کریم ایک کتاب ہے، وہ کتاب خود نہیں بول سکتی۔"

انہوں نے کہا :

"پھر اس فیصلہ کے لیے مدت مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"تاکہ عالم اور جاہل سب قرآنِ کریم کے حکم کو سمجھ لیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس صلح کو مسلمانوں کے حق میں بہتر بنائے اور لوگ صحیح راستہ پر آجائیں، اس لیے تم میری مخالفت چھوڑ دو اور ہمارے ساتھ کوفہ چلو۔"

خوارج نے کہا :

"ہم نے تحکیم قبول کر کے کفر کا ارتکاب کیا، ہم اس کے لیے خدا تعالیٰ سے توبہ کرتے ہیں۔ آپ بھی ہماری طرح توبہ کیجئے۔ تو ہم آپ کا حکم ماننے کو تیار ہیں ورنہ ہم آپ کے مخالف ہیں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا :

"صرف چھ ماہ کی بات ہے شہر میں چلو۔ اس دوران میں خراج کی وصولی بھی ہو جائے گی اور گھوڑے وغیرہ بھی موٹے تازے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم دشمن کے مقابلہ کے لیے نکلیں گے۔"

چنانچہ آپ انہیں سمجھا بجھا کر کوفہ لے آئے۔

تحکیم کے متعلق خوارج کا نظریہ خوارج کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ امام برحق تھے۔ ان کی بیعت بالکل صحیح طریقہ پر کی گئی تھی اور جس نے آپ کی بیعت سے انکار کیا وہ سرکشی اور بغاوت کا مرتکب ہوا۔ ساتھ ہی ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر وہ یہ کہتے تھے کہ معاویہؓ نے امامِ عادل کے خلاف بغاوت کر کے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے جنگ کریں، قرآنِ کریم میں خاص سزا مقرر کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں جو حدود اور سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں تحکیم کے کوئی معنی ہی نہیں۔ چونکہ ان کی نظروں میں معاویہؓ اور ان کے ساتھی خدا کی مقرر کردہ سزا کے مستحق تھے اس لیے ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا اور احکامِ خداوندی کے بارے میں انسانوں کو حَکَم بنانا خدا تعالیٰ کے دین کی تحقیر کرنے کے مترادف تھا۔ ایسا کرنا ان کی نظروں میں جرم تھا اور ایسا کرنے والا گمراہ۔ گمراہ کو چونکہ مسلمانوں کی خلافت نہیں سونپی جا سکتی، اس لیے وہ کہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی خلافت برقرار نہ رہی اور ان سے لڑنا واجب ہو گیا۔ اس طرح ان کی نظروں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں برابر ہو گئے۔

خوارج کے نظریہ کا بطلان لیکن منطقی لحاظ سے خوارج نے غلط مقدمات کو ترتیب دے کر اس سے غلط نتیجہ نکالا تھا۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ سرکشی، بغاوت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کی سزا قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ لیکن یہ امر کہ معاویہؓ اور ان کے ساتھی واقعۃً باغی تھے محتاجِ ثبوت ہے۔ یہ لوگ خود حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق ہی شک میں تھے کہ آیا اس کا صحیح طور پر انعقاد ہوا ہے یا نہیں۔ اس صورت میں لوگوں کو ثالث بنا ناجائز تھا۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کے دین میں غلط اندازی کرنے کا الزام نہیں آتا اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ اشخاص کو اللہ تعالیٰ کے احکام میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا گیا کیونکہ حَکَم بنانے کا منشا صرف اس قدر تھا کہ حکمین یہ متعین کر دیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ان پر صادق آتا ہے یا نہیں۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اس جج سے جس کے پاس کسی چوری کا مقدمہ آتا ہے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ مبینہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا نہیں۔ بلکہ مقدمہ یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ چور نے چوری کی ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو جج کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کو قانون کے مطابق سزا دے۔

خوارج کا یہ اعتراض بھی غلط ہے کہ تحکیم قبول کر لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو خود اپنی امامت میں شک تھا اور ایسے مشکوک امر کو منوانے کے لیے انہوں نے ناحق مسلمانوں کی کثیر جانیں میدانِ جنگ میں ضائع کرائیں۔ کیونکہ صاحبِ حق اپنے آپ کو بہرحال حق پر سمجھتا ہے لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اس کے حق پر ہونے سے انکار کرے تو اپنا حق ثابت کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ اس کے پاس نہیں رہتا کہ اپنے مقدمہ کو عدالت میں لے جائے یا اس معاملہ کو دو ثالثوں کے سپرد کر دے۔

اس طرح اس نئے گروہ نے اپنے دعوے کی بنیاد غلط مقدمات پر رکھ کر امت کے لیے ایک اور فتنہ کا سامان مہیا کر دیا۔ جہاں پہلے مسلمانوں کے دو گروہ تھے، اب تین ہو گئے، جن میں سے ہر گروہ دوسرے کا خون بہانا جائز سمجھتا تھا۔ حضرت علیؓ کو اب دوہری مشکل ہو گئی۔ پہلے آپ کو صرف اہلِ شام کا مقابلہ درپیش تھا۔ اب خوارج سے نبٹنا بھی ضروری ہو گیا۔ حالانکہ یہ لوگ کل تک آپ کے ساتھی تھے اور آپ کو سید المسلمین اور باعتبارِ علم و فقہ سب لوگوں سے بدتر سمجھتے تھے۔ لیکن آج یہ آپ کو برا بھلا کہنے اور آپ سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھے۔

خوارج کے عجیب و غریب نظریات خوارج حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے کیونکہ ان کا انتخاب صحیح طریقہ پر ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت بھی، جہاں تک اس خلافت کے ابتدائی سالوں کا تعلق تھا، ان کے نزدیک صحیح تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ جب انہوں نے اپنی پہلی سیرت بدل دی اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلنا چھوڑ دیا تو ان کا معزول کرنا واجب ہو گیا۔ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کے بھی منکر نہ تھے۔ لیکن یہ کہتے تھے کہ انہوں نے تحکیم قبول کر کے سخت غلطی کی جس نے ان کو (نعوذ باللہ) کفر کے درجہ تک پہنچا دیا۔ وہ اصحابِ جمل یعنی حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کو بھی برا بھلا کہتے تھے اور ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمروؓ بن العاص پر انہوں نے کفر کا فتویٰ لگا رکھا تھا۔

مختصر یہ کہ ان کی باتیں خلفاؓ اور ان کے ساتھیوں کے اعمال کی تشریح تک ہی محدود ہوتی تھیں اور ان کی بحث و تمحیص کا موضوع یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ بننے کا مستحق کون ہے؟ کسے مومن سمجھا جائے اور کسے نہ سمجھا جائے!

خلافت کے بارہ میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کے انتخاب سے بننا چاہیے۔ جس شخص کی خلافت پر عامۃ المسلمین متفق ہو جائیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی صورت میں بھی تحکیم قبول نہ کرے۔ ان کے نزدیک خلیفہ کا قریش میں سے ہونا ضروری نہیں۔ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں سے بھی خلیفہ ہو سکتا ہے خواہ وہ کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ جب کوئی شخص خلیفہ منتخب ہو جائے تو تمام مسلمانوں پر اس وقت تک اس کی پوری پوری اطاعت کرنی واجب ہے جب تک وہ خدا تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں مشغول رہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کے جرم کا مرتکب ہو تو مسلمانوں پر اسے معزول کر دینا فرض ہو جاتا ہے۔

خوارج کے متعلق حضرت علیؓ کی نصیحت اکثر خوارج بدوعرب تھے اور وہ اپنے عقیدہ پر نہایت خلوص سے قائم تھے اپنے عقیدہ کی حفاظت کے لیے انہوں نے لڑائی سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کے عقیدہ کا خلوص ہی تھا جس کی بنا پر بہت سے لوگوں نے ان سے نرمی اور محبت کا سلوک کیا۔ حضرت علیؓ اگرچہ اپنے عہد میں ان سے لڑے اور ان کی طاقت کو پاش پاش کر دیا تاہم آخری عمر میں آپ نے ان کے متعلق فرمایا:

"میرے بعد خوارج سے نہ لڑنا کیونکہ وہ شخص جو حق و صداقت کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے لیکن اسے نہیں پا سکتا، اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جو باطل کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے اور اسے پا لیتا ہے۔"

آپ کا یہ مطلب تھا کہ خوارج نے حصولِ حق کے لیے کوشش کی اور اپنے عقیدہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ہم سے لڑے گو وہ اپنے اس طریقِ کار میں غلطی پر تھے۔ لیکن معاویہؓ نے کبھی حق کو طلب کرنے کی خواہش نہیں کی بلکہ ان کا مقصود باطل کو طلب کرنا تھا۔ وہ باطل کی حمایت میں لڑے اور انہیں وہ سب کچھ مل گیا جو وہ چاہتے تھے۔

(۲۱)
اذرح کی مجلسِ مشاورت

دومۃ الجندل کی بجائے اذرح میں حکمین کا اجتماع مورخین کا حکمین کے مقامِ اجتماع کے بارہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ اجتماع دومۃ الجندل میں ہوا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اذرح میں ہوا تھا۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ اذرح میں ہوا تھا[۱]۔ اذرح، تبوک اور معان کے درمیان واقع ہے۔ قریش کے تجارتی قافلے شام جاتے ہوئے یہاں اُترا کرتے تھے۔ پہلے یہی فیصلہ ہوا تھا کہ حکمین دومۃ الجندل کے مقام ہی پر جمع ہوں لیکن بعد میں یہ اجتماع دومۃ الجندل کی بجائے اذرح میں اس لیے ہوا کہ اس جھگڑے کی وجہ سے جو حضرت علیؓ اور خوارج کے درمیان پیدا

---

[۱] طبری، ابنِ اثیر، طبقات ابنِ سعد

ہو گیا تھا۔ وقتِ مقررہ پر حکمین کا اجتماع نہ ہو سکا۔ کوفہ اور شام کے درمیان خط و کتابت ہوئی اور دونوں فریق دوسرے وقت کی تعیین پر رضامند ہو گئے۔ ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اجتماع دومۃ الجندل کی بجائے اذرح میں ہو۔

وقتِ مقررہ پر حضرت علیؓ نے چار سو آدمی روانہ کیے جن کا امیر شریح ابن ہانی الحارثی کو بنایا اور امام الصلوٰۃ ابنِ عباسؓ کو۔ ابو موسیٰ اشعریؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت معاویہؓ نے بھی چار سو آدمیوں کے ساتھ عمروؓ بن العاص کو بھیجا۔ دونوں حَکَم اذرح میں جمع ہوئے۔

اہلِ عراق کی بے تدبیری

حضرت معاویہؓ کے خطوط حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس برابر آیا کرتے تھے۔ لیکن خط لانے والے قاصد تک کو ان خطوط کے مضمون کا پتا نہ ہوتا تھا۔ نہ اہلِ شام ہی کو اس بات کی جستجو ہوتی تھی کہ ان خطوط میں کیا لکھا ہے۔ لیکن جب حضرت علیؓ کا کوئی خط حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس پہنچتا تھا تو اہلِ عراق آپ کے پاس جمع ہو جاتے اور پوچھتے کہ امیرالمومنینؓ نے کیا لکھا ہے۔ اگر ابنِ عباسؓ چھپانا چاہتے تو مختلف قسم کے قیاس اپنے دلوں میں قایم کر لیتے اور کہتے ہمارا تو یہ خیال ہے کہ امیرالمومنینؓ نے یہ لکھا ہوگا۔

آخر حضرت ابنِ عباسؓ نے ان سے کہا:

"آخر تمہاری عقلوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں کہ معاویہؓ کا قاصد آتا ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کس مضمون کا خط لایا ہے وہ واپس جاتا ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا خط لے کر گیا ہے۔ نہ وہاں شور ہوتا ہے نہ شغب۔ ایک تم ہو کہ مجھے چین نہیں لینے دیتے۔"

اس موقع پر مندرجہ ذیل مشہور صحابہؓ بھی موجود تھے:

حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن الحارث بن ہشام مخزومی، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔

حکمین کی گفتگو

جب دونوں ثالث پہلی مرتبہ ملے تو ان کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

عمروؓ بن العاص: کیا آپ کو یقین ہے کہ حضرت عثمانؓ مظلوم قتل کیے گئے؟

ابو موسیٰؓ: بے شک مجھے یقین ہے کہ آپ مظلوم شہید کیے گئے۔

عمروؓ بن العاص: کیا آپ جانتے ہیں کہ معاویہؓ اور آلِ معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کے ولی ہیں؟

ابو موسیٰؓ: بے شک!

عمروؓ بن العاص: اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

و من قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل انہ کان منصورا۔

(جو شخص مظلوم قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو صاحبِ اختیار کیا ہے۔ وہ بدلہ لینے میں زیادتی نہ کرے۔ اگر وہ ہمارے حکم پر چلے گا تو ضرور فتح یاب ہوگا)

پھر حضرت معاویہؓ کو امیر بنانے میں آپ کے لیے کیا امر مانع ہے؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ حضرت عثمانؓ کے ولی اور قریش کے ایک معزز گھرانے سے ہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ معاویہؓ کو خلیفہ بنا دینے میں لوگوں کو یہ اعتراض ہوگا کہ انہیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل نہیں اس لیے وہ خلیفہ نہیں بنائے جا سکتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مظلوم و شہید خلیفہ حضرت عثمانؓ کے ولی ہیں اور حسنِ سیاست اور حسنِ تدبیر میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام حبیبہؓ کے بھائی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی رہے ہیں۔ یاد رکھئے اگر وہ خلیفہ ہو گئے تو آپ کی انتہائی تعظیم کریں گے اور آپ کے ساتھ اتنا بہتر سلوک کریں گے کہ آج تک کسی خلیفہ نے نہ کیا ہوگا۔

ابو موسیٰؓ: عمروؓ! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ معاویہؓ اپنی ذاتی اور خاندانی شرافت کی وجہ سے اس بات کے حقدار نہیں بن جاتے کہ انہیں خلافت سپرد کر دی جائے۔ خلافت کے لیے دین اور تقویٰ کی فضیلت چاہیے۔ اگر محض خاندانی شرافت ہی خلافت کے لیے کافی ہو تو اس صورت میں بھی حضرت علیؓ ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ کیونکہ وہ قریش میں سب سے زیادہ معزز ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کے ولی ہیں۔ لیکن یہ چیز ان کو خلافت کا مستحق نہیں بنا دیتی۔ میرے تو ذہن میں بھی مہاجرین اولین کو چھوڑ کر معاویہؓ کو خلیفہ بنانے کا خیال نہیں آ سکتا۔ باقی تم نے مجھے تعظیم اور مال و منال کا جو لالچ دیا ہے تو خدا کی قسم! اگر میرے ہاتھ سے وہ کچھ بھی نکل جائے جو میرے قبضہ میں ہے تو بھی میں معاویہؓ کو خلیفہ نہ بناؤں۔ میں رشوت کبھی نہیں لوں گا۔ البتہ اگر تم چاہو تو ہم حضرت عمرؓ بن خطاب کے نام کو زندہ کریں (اور ان کے لڑکے عبداللہؓ بن عمرؓ کو خلیفہ بنا لیں)

عمروؓ بن العاص: اگر آپ ابن عمرؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تو میرے بیٹے کی بیعت کرنے سے آپ کو کیا امر مانع ہے، حالانکہ آپ اس کی فضیلت اور صلاحیت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

ابو موسیٰ اشعریؓ: تمہارے بیٹے کی صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس نے فتنہ میں پڑ کر اپنے آپ کو آلودہ کر لیا ہے۔"

اس مناقشہ اور گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکمین اس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں میں سے کوئی شخص بھی خلیفہ نہ ہو۔ البتہ دونوں کا اختلاف اس امر میں تھا کہ ان کی جگہ اور کون شخص خلیفہ ہو اور کسے مسلمانوں پر حکومت کے سارے اختیارات تفویض کیے جائیں۔ لیکن کوئی شخص بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان دونوں نے خدا تعالیٰ کی کتاب کے کس حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کس ارشاد کے ماتحت یہ رضامندی ظاہر کی تھی۔ ان کا فرض یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح احکام کے مطابق ان دونوں میں فیصلہ کرتے اور اس بارہ میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے:

وان طآئفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ آلی امراللہ۔

(اگر مومنوں کی کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے جھگڑ پڑے تو ان دونوں جماعتوں کے درمیان صلح کرادو۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی جماعت اپنے عہد کو توڑ کر دوسرے سے لڑائی شروع کر دے تو تمام مسلمان مل کر اس لڑائی شروع کرنے والی جماعت سے لڑیں یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف رجوع کرے)

عمروؓ بن العاص نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے پوچھا:

"آخر آپ کی کیا رائے ہے؟"

ابوموسیٰؓ نے کہا:

"میری رائے یہ ہے کہ ہم ان دونوں شخصوں کو معزول کر دیں۔ اس کے بعد مسلمان آپس میں مشورہ کر کے جس کو چاہیں خلیفہ بنالیں۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا:

"میری بھی یہی رائے ہے۔"

اس بات چیت میں عمروؓ بن العاص کا یہ طریقہ تھا کہ وہ پہلے ابوموسیٰ اشعریؓ کو بولنے کا موقع دیتے تھے اور ہر بات میں ان کو مقدم رکھتے تھے۔ آپ ان سے کہتے تھے:

"آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، مجھ سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں۔ اس لیے پہلے آپ بولئے اس کے بعد میں کچھ عرض کروں گا۔"

حکمین کے فیصلہ کا مجمع عام میں اعلان

ایسا کرنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو پہلے کلام کرنے کا موقع دے کر ان کی زبان سے حضرت علیؓ کو معزول کرنے کا لفظ نکلوا لیا جائے۔ چنانچہ ان کی یہ غرض پوری ہوگئی، صرف لوگوں میں اس بات کا اعلان کرنا باقی رہ گیا تھا جو ان دونوں میں طے پا چکی تھی، چنانچہ عمروؓ بن العاص نے حسب معمول پہلے ابوموسیٰ اشعریؓ کو کھڑا کیا۔ وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے:

"اے لوگو! ہم نے اس معاملہ میں خوب غور و خوض کیا۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ امت کی فلاح و بہبود کے لیے اس سے زیادہ آسان راہ اور کوئی نہیں کہ ہم علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیں اور یہ معاملہ امت پر چھوڑ دیں کہ وہ جس کو چاہے خلیفہ منتخب کرے سو میں نے علیؓ اور معاویہؓ کو معزول کر دیا ہے۔ اب معاملہ تمام مسلمانوں کے سپرد ہے کہ وہ جس کو خلافت کا اہل سمجھیں خلیفہ مقرر کریں۔"

جب ابوموسیٰؓ اپنی تقریر ختم کر چکے تو عمروؓ بن العاص کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے:

"ابوموسیٰؓ نے جو کچھ کہا وہ آپ سب لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے صاحب (علیؓ) کو معزول کر دیا

میں بھی ان کو معزول کرتا ہوں لیکن اپنے صاحب (معاویہؓ) کو قایم رکھتا ہوں، کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کے ولی اور ان کے اچھے جانشین ہیں۔"

اس پر دونوں کے مابین کچھ تلخ کلامی ہوئی۔ دونوں فریقوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور آپس میں الجھ پڑے۔ شام کے لوگوں نے چاہا کہ ابو موسیٰؓ کو پکڑ لیں لیکن انہوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا رُخ کیا اور شامیوں کے ہاتھ نہ آئے۔

روایات میں تضاد "طبری" نے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب ابو موسیٰؓ حکمین کے باہمی فیصلہ کا اعلان کرنے کے لیے مجمع عام میں جانے لگے تو انہوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ ہم دونوں خلافت کے امر پر متفق ہو گئے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اس فیصلہ سے اُمت کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ عمروؓ بن العاص نے مجھے اس فیصلہ کا اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے۔

اس پر ابن عباسؓ کہنے لگے:

"عمروؓ بن العاص کی بات کا اعتبار نہیں، بیشک انہوں نے آپ کو تو متفقہ طور پر طے کیے ہوئے فیصلہ کی منظوری دے دی ہے، لیکن جب آپ لوگوں میں کھڑے ہوں گے تو وہ آپ کی مخالفت کریں گے۔"

ابو موسیٰؓ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے کہنے لگے،

"اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی جب ہم دونوں ایک فیصلہ پر رضامند ہو گئے ہیں تو پھر مخالفت کے کیا معنی!"

لیکن ان روایتوں کے برعکس مسعودی نے لکھا ہے کہ ابو موسیٰؓ نے کوئی خطبہ وغیرہ نہیں دیا تھا بلکہ باقاعدہ ایک تحریر لکھی تھی جس میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے اور مسلمانوں کے باہمی فیصلہ سے کسی شخص کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ درج کیا گیا تھا۔

مسعودی کے بیان کے مطابق حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص سے کہا تھا:

"مسلمانوں کے افتراق نے بہت نازک شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ہمیں کوئی ایسا فیصلہ کرنا چاہیے جس سے مسلمانوں میں پھر باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائے اور وہ آپس میں صلح و صفائی سے رہ سکیں۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے ان کی اس رائے سے اتفاق کیا اور کہا:

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے درمیان طے ہوتا جائے اسے کاتب لکھتا جائے تاکہ بعد میں کوئی بھول چوک نہ ہو سکے۔"

ابو موسیٰؓ نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

چنانچہ حضرت عمروؓ بن العاص نے ایک کاتب بلا لیا، جو ان کا ایک غلام تھا اور اسے ہدایت کی کہ جس بات پر ہم دونوں حَکم متفق ہو جائیں وہی لکھے۔ چنانچہ ان دونوں نے لکھوانا شروع کیا۔

حکمین کا باہمی معاہدہ

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ فیصلہ ہے جس پر عبداللہ بن قیس (ابوموسیٰ اشعریؓ) اور عمروؓ بن العاص متفق ہوگئے ہیں۔ ہم دونوں گواہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ خدا تعالیٰ کے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیں خواہ مشرکین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔"

اس کے بعد عمروؓ بن العاص نے کہا :

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے جب تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُٹھا نہیں لیا آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل کرتے رہے اور اپنے اس حق کو جو آپ کے ذمہ تھا پوری طرح ادا کرتے رہے۔"

حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا :

"ٹھیک ہے لکھو۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے یہی باتیں حضرت عمرؓ کے متعلق بھی کہیں اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد عمروؓ بن العاص نے کاتب سے کہا : لکھو،

"حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ مسلمانوں کے اجماع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے مشورہ کے بعد خلیفہ ہوئے اور وہ مومن تھے۔"

حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا :

"ہم اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا :

"خدا کی قسم ! یا تو وہ مومن ہوں گے یا کافر۔"

حضرت ابوموسیٰ نے کہا :

"اچھا لکھو۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا :

"کیا وہ ظالم قتل کیے گئے یا مظلوم ؟"

ابوموسیٰؓ نے کہا : "وہ مظلوم قتل کیے گئے۔"

عمروؓ بن العاص نے کہا:
"کیا خدا تعالیٰ نے مظلوم شخص کے ولی کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اس کے قصاص کا مطالبہ کرے؟"
ابو موسیٰؓ نے کہا:
"بے شک!"
عمروؓ بن العاص نے کہا:
"تو کیا معاویہؓ کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا، خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں مطالبہ کریں؟"
ابو موسیٰؓ نے کہا:
"بے شک!"
عمروؓ بن العاص نے کاتب سے کہا، یہ لکھ لو۔
ابو موسیٰؓ نے بھی تائید کی۔ چنانچہ اس نے یہ لکھ لیا۔
اب ابو موسیٰؓ نے عمروؓ بن العاص سے کہا:
"ان اختلافات کی وجہ سے اُمتِ محمدیہ بہت مشکلات میں گرفتار ہو چکی ہے۔ ہم یہاں اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر جمع ہوئے ہیں اس لیے آؤ ہم دونوں مل کر کوئی ایسی صورت نکالیں جس میں اُمت کی بہبودی مضمر ہو۔"
عمروؓ بن العاص نے پوچھا:
"وہ صورت کیا ہو سکتی ہے؟"
ابو موسیٰؓ نے کہا:
"تمہیں پتا ہے کہ اہلِ عراق کبھی معاویہؓ کو خلیفہ بنانا پسند نہیں کریں گے اسی طرح اہلِ شام کبھی علیؓ کی خلافت پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے ہم ان دونوں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیں اور عبداللہؓ بن عمرؓ کو خلیفہ بنا لیں۔"
عمروؓ بن العاص نے اس امر میں تو ابو موسیٰؓ سے اتفاق کیا کہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا جائے لیکن عبداللہؓ بن عمرؓ کے خلیفہ بنائے جانے سے اختلاف کیا۔ انہوں نے عبداللہؓ بن عمرؓ کی جگہ کئی اور صحابہؓ کے نام خلافت کے لیے تجویز کیے لیکن ابو موسیٰؓ کا اصرار حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ ہی پر رہا۔ اس طرح کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔
آخر عمروؓ بن العاص نے کاغذ لپیٹا اور حکمین کی گفتگو ختم ہو گئی۔

محاکمہ اگرچہ اکثر مؤرخین نے پہلی روایت بیان کی ہے، لیکن مؤخر الذکر روایت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر عمروؓ بن العاص چالاکی سے بھی کام لیتے اور ابو موسیٰؓ کے کہنے کے بموجب حضرت علیؓ کو معزول قرار دیتے، اور معاویہؓ کو باقی رکھتے تو ان کی یہ چالاکی حضرت معاویہؓ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ لیکن جس بات پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہوا تھا وہ یہ تھی کہ قرآن کریم کے مقتضیٰ کے ماتحت دونوں حکم جس بات پر متفق ہوں گے، فریقین کو اسے قبول کرنا ہوگا۔ یہ شرط نہ تھی کہ اگر کوئی ایک

حَکَم کسی بات پر راضی ہو جائے تو اس بات کو واجب العمل قرار دیا جائے۔ یہ بات کسی تاریخ میں نہیں ملتی کہ ابو موسیٰؓ کسی وقت بھی حضرت معاویہؓ کی خلافت پر رضامند ہو گئے تھے۔

معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص کی فتح یابی حکمین کی گفتگو اور فیصلہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عمروؓ بن العاص اس معرکہ میں فتح یاب ہو گئے تھے اور اسی فتح یابی کا نتیجہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کے قدم شام اور شام کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی اچھی طرح جم گئے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب انہیں آسانی سے خلافت حاصل ہو جائے گی حالانکہ اس سے پہلے انہیں خلافت کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

مزید برآں اس فیصلہ کی وجہ سے عمروؓ بن العاص نے معاویہؓ کے لیے کافی وقت فراہم کر دیا جس میں وہ اپنے لشکر کی تنظیم کر سکتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے لشکر کو خوب منظم اور اچھی طرح مسلح کر لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت علیؓ نے دوبارہ شام پر حملہ کیا تو حضرت علیؓ کی فوج کی حضرت معاویہؓ کے سامنے کچھ پیش نہ جا سکی۔

معاویہؓ اس مقصد میں بھی کامیاب ہو گئے کہ حضرت علیؓ کو خلافت سے خواہ برائے نام ہی سہی ہٹا دیا جائے اور مسلمان دوبارہ مشورہ سے نئے خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اس طرح حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک سطح پر آ گئے اور حضرت علیؓ کے لیے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت اور اسلام میں سبقت کے شرف کے اور کوئی وجہِ فضیلت نہ رہی۔

جہاں تک ابو موسیٰؓ کا تعلق ہے ان کی سادہ لوحی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی مشقت اور دین کی حفاظت کرنے والے شخص تھے۔ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے میں بہت شدید تھے۔ فتنوں سے طبعاً کراہت کرتے تھے اور امت کی بھلائی کی فکر میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن چونکہ انہیں سیاسی امور سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے حضرت عمروؓ بن العاص نے ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر ان سے بعض ایسی باتیں منوا لیں جنہیں کوئی ہوشیار سیاستدان ہرگز قبول نہ کرتا۔

(۲۲)

یومِ نہروان

حضرت ابنِ عباسؓ اور شریح حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور اذرح کے تمام واقعات انھیں سنا دیے۔ حضرت علیؓ کو احساس ہوا کہ اب معاملہ حد سے گزر چکا ہے اور ان کی بجائے معاویہؓ کا پلّہ بھاری ہو گیا ہے۔ انہوں نے سوچا اس سے پہلے کہ معاویہؓ ان کے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں، وہ خود پہل کر کے معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے مقابلہ کے لیے نکلیں اور فتنہ کو بڑھنے سے روکیں۔ لیکن خوارج کی بغاوت ان کی راہ میں مزاحم ہو گئی اور حضرت علیؓ کو معاویہؓ سے لڑنے کی بجائے خوارج کا قلع قمع کرنا پڑا۔

تحکیم سے قبل خوارج کا حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ تحکیم قبول کرنے کی بنا پر اپنی غلطی بلکہ اپنے کفر کا اعلان کریں اور

معاویہؓ کے ساتھ جو شرائط انہوں نے طے کی ہیں ان پر عمل نہ کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت علیؓ نے ان کی بات مان لی تو وہ دوبارہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور ان سے مل کر لڑیں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور درحقیقت آپ کا انکار کرنا بالکل درست تھا۔ آپ اس معاہدہ سے جسے دونوں فریقوں نے منظور کر لیا تھا کس طرح پھر سکتے تھے جبکہ اسلام وفائے عہد کا حکم دیتا ہے۔ اگر آپ بفرضِ محال اپنے معاہدہ سے پھر جاتے تو آپ کے اکثر ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ پھر آپ اپنے کفر کا کس طرح اقرار کر سکتے تھے جبکہ آپ نے اپنی تمام عمر میں کبھی شرک نہیں کیا تھا۔

لاحکم الا اللہ کا نعرہ خوارج نے "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ ایجاد کیا تھا۔ انہوں نے اسے جا بجا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب حضرت علیؓ مسجد میں خطبہ دے رہے ہوتے تو خطبہ کے دوران ہی میں حضرت علیؓ کی بات کاٹ کر کوئی شخص "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ لگاتا اور پھر ساری مسجد اس نعرے سے گونجنے لگتی۔

خوارج کی غلط فہمی جب حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر کوفہ لائے تھے تو ان لوگوں کا خیال تھا کہ امیر المومنینؓ بھی اب ان کی طرح فیصلۂ تحکیم کو ناپسند کرنے لگے ہیں اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کا ایک آدمی حضرت علیؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"لوگ آپ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے کفر سے توبہ کر لی ہے۔"

یہ خبر حضرت علیؓ کی جماعت میں بھی پھیل گئی اور لوگ آپ کے متعلق مختلف افواہیں گرم کرنے لگے۔ آخر حضرت علیؓ نے چاہا کہ لوگوں پر اپنا موقف واضح کر دیں تاکہ کسی غلط فہمی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ چنانچہ ظہر کی نماز کے وقت آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں خوارج اور ان کی ریشہ دوانیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس پر خوارج بھڑک اُٹھے اور مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر چلانے لگے، "لاحکم الا اللہ"

حضرت علیؓ نے یہ سُن کر فرمایا:

"اللہ اکبر! بات تو ان کی سچی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس سے جو مطلب نکال رہے ہیں وہ غلط ہے۔ دیکھو جب تک تم ہمارے ساتھ ہو ہم پر تمہارے تین حق ہیں:

ہم تمہیں اپنی مساجد میں نماز پڑھنے سے نہیں روکیں گے تاوقتیکہ تم ان میں خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو۔
ہم تمہیں مالِ غنیمت حاصل کرنے سے منع نہیں کریں گے تاوقتیکہ تم ہمارے ساتھ مل کر لڑتے رہو۔
ہم تم سے اس وقت تک نہیں لڑیں گے جب تک تم ہم سے لڑائی شروع نہ کر دو۔"

خوارج کا نہروان پر اجتماع جب خوارج حضرت علیؓ کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ امیر المومنینؓ ان کی رائے کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو وہ عبد اللہ بن وہب الراسبی کے مکان میں جمع ہوئے۔ عبد اللہ نے اس موقع پر ایک تقریر کی جس میں انہیں کوفہ سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا۔ اس نے اپنی تقریر

میں کہا :

"خدا کی قسم! ایسی قوم کے لیے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتی ہو اور قرآن کے احکام پر عمل کرتی ہو، یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور قولِ حق کو چھوڑ کر دنیا کو ترجیح دے۔ اس لیے اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، کسی پہاڑ یا کسی دُوسرے شہر کی طرف نکل چلو اور اس بدعت و ضلالت کے خلاف کمرِ ہمت کس لو۔"

تمام حاضرین نے اسی وقت عبداللہ بن وہب کو اپنا امیر چُن لیا اور فیصلہ کیا کہ شہر سے اکٹھے نکلنے کی بجائے وہ ایک ایک کر کے نکلیں تاکہ کسی کو پتا نہ چلے۔ منزلِ مقصود "نہروان" کا پُل قرار پایا۔ عبداللہ بن وہب نے بصرہ میں اپنے ساتھیوں کو سارا حال لکھ بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ بھی نہروان کے پُل پر آ ملیں۔ چنانچہ بصرہ کے خارجی بھی نہروان پہنچ گئے۔

حضرت علیؓ کا شام کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ

امیر المومنینؓ کا اولاً ارادہ یہ ہوا کہ اپنے ساتھیوں کو شام چلنے کی ترغیب دیں۔ چنانچہ آپ نے کوفہ میں ایک خطبہ پڑھا جس میں فرمایا :

"امام کی نافرمانی کا نتیجہ حسرت اور ندامت ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں آگاہ کیا تھا کہ شامیوں کے دھوکے میں نہ آؤ اور تحکیم قبول نہ کرو لیکن تم لوگوں نے اپنی خود سری کے آگے میری ایک نہ سُنی اور مجھے مجبوراً تحکیم قبول کرنی پڑی۔ لیکن ان دو آدمیوں نے جنہیں تم نے حَکَم مقرر کیا تھا قرآنِ کریم کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس چیز کو زندہ کیا جسے قرآن مار چکا تھا۔ ہر شخص نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے برعکس اپنی رائے اور خواہش پر عمل کیا ان دونوں نے بغیر کسی حجتِ مبینہ کے اپنا فیصلہ دیا۔ پھر اصل فیصلہ میں بھی دونوں متفق نہیں ہوئے ایک کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ان لوگوں کے فیصلہ سے بری ہے۔ سو تم شام چلنے کی تیاری کرو۔"

ساتھ ہی آپ نے خوارج کو بھی شام چلنے کی دعوت دی۔ آپ کو یہ امید تھی کہ یہ لوگ چونکہ تحکیم کے سخت خلاف تھے اس لیے اب وہ خوشی خوشی آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن ان لوگوں نے آپ کی دعوت کا جواب یہ دیا :

"آپ نے اپنے رب کی خاطر حکمین سے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے نفس کی خاطر کیا ہے۔ آپ نے اپنے کفر پر شہادت دے دی ہے۔ اگر آپ توبہ کریں تو ہم اپنے اور آپ کے تعلقات پر دوبارہ غور کریں گے ورنہ ہمیں آپ کی کوئی پروا نہ ہوگی۔ خدا تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔"

حضرت علیؓ نے جب یہ خط پڑھا تو آپ کو خوارج کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی اور آپ نے انھیں ان کے حال پر چھوڑتے ہُوئے شام جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ آپ لشکر لے کر کوفہ سے نکلے اور مقام "نخیلہ" میں پڑاؤ ڈالا۔ "نخیلہ" سے آپ نے حضرت ابنِ عباسؓ کو بصرہ خط لکھا کہ جس قدر لشکر مہیا ہو سکے اسے لے کر "نخیلہ" پہنچ جائیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے مسجد میں کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کی تلقین کی لیکن آپ کی آواز پر صرف پندرہ سو آدمیوں نے لبیک کہی جب حضرت ابن عباسؓ

نے یہ حالت دیکھی تو اور زیادہ سختی سے لوگوں کو اپنی طرف بلایا۔ اب کے سترہ سو آدمیوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اُس وقت بصرہ کے جنگی رجسٹر میں ساٹھ ہزار ایسے اشخاص کا اندراج تھا جو لڑنے کے قابل تھے۔ ان کے بیٹے اور غلام ان کے علاوہ تھے۔ لیکن ابن عباسؓ کے ساتھ صرف تین ہزار دو سو آدمی تھے۔ وہ انہیں لے کر نخیلہ پہنچے۔

جب حضرت علیؓ نے یہ حال دیکھا تو کوفہ کے رؤسا کو بلا کر انہیں اہلِ بصرہ کی افسوسناک روش سے آگاہ کیا اور فرمایا اب صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ ایسے لوگوں کو جو لڑائی میں شامل ہو سکتے ہیں، ایسے بچوں کو جو بلاغت کے قریب پہنچ گئے ہوں اور انہیں لڑائی کے فنون سے کچھ واقفیت حاصل ہو اور غلاموں کو کوفہ سے بلا لیا جائے تاکہ اس طرح لشکر میں تقویت کا کچھ سامان بہم ہو سکے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی دعوت پر چالیس ہزار جنگ کے قابل افراد، سترہ ہزار قریب البلوغت لڑکے اور آٹھ ہزار غلام کوفہ سے آ گئے۔

جب بصرہ، کوفہ اور مدائن سے لشکر جمع ہو گیا تو حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ لشکر کے بعض افراد یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں پہلے حروریوں (خوارج) سے نبٹنا چاہیے اور انہیں شکست دے کر ان کا کس بل نکالنا چاہیے۔ ان سے فارغ ہو کر ہم اطمینان سے شام کی جانب کوچ کر سکیں گے۔ حضرت علیؓ نے یہ سُن کر ایک خطبہ دیا جس میں آپ نے فرمایا کہ موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے شام چلنا اور معاویہؓ سے لڑنا زیادہ اہم ہے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے حضرت علیؓ کے احکام کی خلاف ورزی کا کتنا تباہ کن نتیجہ نکل چکا ہے، اس لیے وہ کہنے لگے:

"امیر المومنینؓ! آپ جہاں چاہیں ہمیں لے چلیں۔ ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔"

عبداللہ بن خباب کا قتل

اسی دوران میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ ایک بزرگ عبداللہ بن خباب اپنی حاملہ بیوی کو ساتھ لیے چلے جا رہے تھے کہ خوارج سے ان کا سامنا ہو گیا۔ ان لوگوں نے انہیں پکڑ لیا اور کہا کہ یہ قرآن جو آپ کے گلے میں لٹکا ہوا ہے آپ کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ عبداللہ بن خباب نے کہا میں تو مسلمان ہوں اور میرا نام عبداللہ بن خباب ہے۔ خوارج نے کہا ہمیں کوئی ایسی حدیث سنائیے جو آپ کے والد کی سند سے آپ تک پہنچی ہو۔ آپ نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب ایک فتنہ نمودار ہوگا جس میں آدمی کا دل اس طرح مر جائے گا جس طرح اُس کا بدن مر جاتا ہے۔ وہ رات کو مومن سوئے گا اور صبح کو کافر اُٹھے گا اور صبح کو کافر ہوگا تو شام کو مومن۔"

انہوں نے پُوچھا:

"آپ کا حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

انہوں نے آپ کی بڑی تعریف کی۔ پھر حضرت عمرؓ کے بارہ میں دریافت کیا۔ انہوں نے ان کے متعلق بھی توصیفی کلمات کہے۔ اس کے بعد پُوچھا کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی اور آخری عہد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

"وہ اپنے ابتدائی اور آخری زمانوں میں حق و صداقت پر قائم تھے۔"

آخر میں انہوں نے پوچھا کہ :

"حضرت علیؓ کے متعلق تحکیم سے قبل و بعد آپ کی کیا رائے ہے ؟"

عبداللہ نے جواب دیا :

"علیؓ تمہارے مقابلہ میں کتاب اللہ کو زیادہ سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہیں۔"

خوارج نے کہا :

"خدا کی قسم تم اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرکے یہ شہادت دے رہے ہو اور لوگوں کو ان کے کاموں کی بجائے ان کے ناموں کی وجہ سے فضیلت دیتے ہو، اس لیے ہم تمہیں قتل کریں گے اور اس طرح قتل کریں گے کہ آج تک کسی اور کو قتل نہ کیا ہو گا۔"

چنانچہ وہ آپ کو نہر کے کنارے لے گئے اور ذبح کر دیا۔ اسی طرح آپ کی بیوی کا پیٹ چاک کرکے اسے بھی قتل کر ڈالا۔ قبیلہ طئی کی تین عورتوں اور ام سنان صیداویہ کو بھی ان ظالموں نے پکڑ کر مار ڈالا۔

ان کی باطنی شقاوت کا تو یہ حال تھا لیکن ظاہری پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ انہی عبداللہ بن خباب نے ایک خارجی کو دیکھا کہ نخلستان میں ایک کھجور درخت سے گر پڑی، اس نے اسے اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ دوسرے خارجیوں نے یہ دیکھ کر اسے لعنت ملامت کرنی شروع کی کہ اس نے بغیر مالک کی اجازت کے اور بغیر قیمت دئے یہ کھجور اپنے منہ میں کیوں ڈال لی۔ اسی طرح ان کے ایک شخص نے ایک سور مار ڈالا اور وہ اسے برا بھلا کہنے لگے کہ ذمیوں کے مال کا اتلاف کیوں کرتا ہے۔

جنگِ نہروان

جب حضرت علیؓ کو عبداللہ بن خباب اور طئی کی تین عورتوں کے قتل کی خبر ملی تو آپ نے اپنے ایک قاصد کو صحیح خبر لانے کے لیے بھیجا۔ لیکن انہوں نے اس قاصد کو بھی قتل کر ڈالا۔ جب قاصد کے قتل کی خبر لشکر میں پہنچی تو حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے آپ سے کہا :

"امیر المومنینؓ! اگر ہم نے ان خارجیوں کو چھوڑ دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے پیچھے ہمارے اہل و عیال پر حملہ کرکے انہیں قتل کر دیں اور ہمارے مال و اسباب لوٹ لیں۔ اس لیے ہمیں پہلے ان کا سر کچلنا چاہیے۔ جب ہم ان سے فارغ ہو جائیں گے تب شام چلیں گے۔"

حضرت علیؓ کے لیے بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ پہلے خوارج کا قلع قمع کریں۔ چنانچہ آپ لشکر لے کر نہروان کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب پہنچ کر آپ نے انھیں پیغام بھیجا کہ ہمارے بھائیوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم ان کو قصاص میں قتل کریں گے اور تمہیں چھوڑ کر اہلِ شام سے مقابلہ کے لیے چلے جائیں گے۔ شاید اس عرصہ میں خدا تعالیٰ تمہارے دلوں کو پھیر دے اور تمہیں پھر انہی نیکیوں کی توفیق مل جائے جو تم پہلے بجا لاتے تھے۔

انہوں نے حضرت علیؓ کے اس پیغام کے جواب میں کہلا بھیجا :

"ہم سب نے انھیں قتل کیا ہے اور ہم سب ان کا اور تمہارا خون بہانا حلال سمجھتے ہیں۔"

تاہم حضرت علیؓ نے پند و موعظت کے ذریعہ انھیں سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن جب حضرت علیؓ ان سے خطاب کرتے وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے اور بڑے تکبر اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے۔ آخر ایک دن حضرت علیؓ نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو ایک سفید جھنڈا دے کر بھیجا اور اعلان کرا دیا:

"تم میں سے جس نے عبد اللہ بن خباب اور دوسرے مسلمانوں کے قتل میں حصہ نہیں لیا اگر اس جھنڈے کے نیچے آجائے تو وہ امن میں ہے۔ جو شخص کوفہ یا مدائن چلا جائے اور اس جماعت کو چھوڑ دے وہ بھی مامون ہے۔ میں یہ اعلان اس لیے کر رہا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو قتل کرنا اور ان کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔"

حضرت علیؓ کا یہ اعلان سن کر ایک جماعت خوارج کو چھوڑ کر چلی گئی اور ایک جماعت حضرت علیؓ کے جھنڈے تلے آگئی۔ اب ابن وہب کے پاس چار ہزار میں سے دو ہزار آٹھ سو کے قریب آدمی رہ گئے۔ آخر کار جنگ شروع ہوئی اور تمام دن جاری رہی۔ اس جنگ میں ابن وہب اور اس کے اکثر ساتھی مارے گئے۔ خوارج کے زخمیوں کی تعداد چار سو تھی۔ حضرت علیؓ نے انہیں علاج کے لیے ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا اور فرمایا:

"انھیں لے جاؤ اور جب یہ ٹھیک ہو جائیں تو اپنے ساتھ کوفہ لے کر چلو۔"

ابن اثیر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"خوارج اتنے تھوڑے وقت میں قتل کیے گئے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان سے کہا مر جاؤ، اور وہ مر گئے۔"

حضرت علیؓ کے ساتھیوں کا شام کی طرف جانے سے انکار

جب حضرت علیؓ نے دیکھا کہ خوارج کا فتنہ کلیۃً ختم ہو چکا اور لوگ ان کے شور و شر سے بالکل محفوظ ہو چکے ہیں تو آپ نے شام جانے کا قصد کیا لیکن آپ کے ساتھی شام جانے کے لیے تیار نہ تھے وہ کہنے لگے:

"امیر المومنینؓ! ہمارے تیر ختم ہو گئے ہیں۔ ہماری تلواریں کند پڑ گئی ہیں۔ ہمارے نیزوں کے پھل ٹوٹ چکے ہیں اس لیے فی الحال تو ہمیں واپس ہی لے چلیے تاکہ پہلے سے بھی زیادہ تیاری کر کے ہم اہلِ شام کے مقابلہ کے لیے نکل سکیں اور تازہ دم ساتھیوں کی مدد حاصل کر سکیں۔"

ان لوگوں میں جو واپس جانے کے لیے بیتاب تھے اشعث بن قیس پیش پیش تھا۔ جنگِ صفین کے واقعات میں ہم اس کا تذکرہ تفصیل سے کر چکے ہیں، کچھ بعید نہیں کہ یہ شخص حضرت معاویہؓ کے مؤیدین اور ساتھیوں میں سے ہو اور حضرت علیؓ کے ساتھ رہنے سے اس کا مقصد محض آپ کو نقصان پہنچانا ہو۔ کیونکہ اگر یہ واقعۃً لڑائی کا خواہشمند نہ تھا تو حضرت علیؓ کے ساتھ نکلنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے!

جب حضرت علیؓ نے لشکر کی یہ حالت دیکھی تو مصلحت اسی میں سمجھی کہ فوج کو شام لے جانے پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ بعد میں جب اس کے حوصلے بڑھ جائیں لشکر کشی کی جائے۔ چنانچہ آپ لشکر لے کر "نخیلہ" آگئے اور وہاں قیام فرمایا۔ آپ نے حکم دے دیا کہ کوئی شخص لشکر سے باہر نہ نکلے اور اپنی بیویوں اور بیٹوں سے بہت کم ملے۔ کچھ دنوں تک فوج نے آپ کے حکم پر

عمل کیا لیکن آہستہ آہستہ لوگ کھسکنے اور کوفہ میں داخل ہونے لگے۔ آخر صرف لشکر کے سردار اور امیر ہی باقی رہ گئے باقی سارا لشکر خالی ہوگیا۔ جب حضرت علیؓ نے یہ دیکھا تو آپ بھی کوفہ تشریف لے آئے۔ کچھ روز تک تو آپ خاموش رہے، آخر ایک دن لشکر کے رؤسا اور امراء کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ شام پر لشکر کشی کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے ؟

اس کے جواب میں آپ کو کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ ہر شخص لڑائی سے گریز کرنا چاہتا تھا اور کسی شخص میں بھی جوش و خروش کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے یہ حالت دیکھی تو آپ نے فرمایا :

"اللہ کے بندو ! تمہیں کیا ہوگیا ہے ؟ جب میں تمہیں کوچ کرنے کا حکم دیتا ہوں تو تمہارے پاؤں ن من بھر کے ہوجاتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آخرت کی زندگی کے بدلے ذلت اور بزدلی کی زندگی پر رضامند ہوگئے ہو ؟ جب کبھی میں تمہیں جہاد کے لیے بلاتا ہوں تمہاری آنکھیں اس سے پتھرا جاتی ہیں جیسے تم پر موت کی حالت طاری ہو اور تمہاری کیفیت بالکل کوڑیوں کی سی ہوجاتی ہے۔ مصیبت کی گھٹائیں تم پر چھا رہی ہیں لیکن تم خوابِ غفلت میں مدہوش پڑے سو رہے ہو۔"

حضرت علیؓ نے انتہائی کوشش کی کہ ان کی بہادری اور شجاعت کے جذبات کو ابھارا اور ان کی حمیت کو بھڑکایا جائے لیکن آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی جتنا زیادہ آپ ان کو جنگ کے لیے ابھارتے اتنا ہی وہ اس سے گریز کرتے۔ آخر مایوس ہو کر حضرت علیؓ نے شام جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

(۲۳)

مصر کی نازک حالت

مصر کی ولایت پر قیس بن سعد کا تقرر حضرت علیؓ نے خلافت سنبھالتے ہی صوبوں کے عاملوں کو برطرف کر کے ان کی جگہ نئے عامل مقرر کیے تھے۔ مصر کا عامل آپ نے قیس بن سعد کو مقرر کیا تھا۔ تقرری کے وقت آپ نے اسے بلایا اور فرمایا :

"میں نے تمہیں مصر کا عامل بنایا ہے تم فوراً روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ چند قابلِ اعتماد آدمیوں اور فوج کے ایک دستہ کو لے جاؤ تاکہ تمہارے مخالفین پر تمہارا رعب قائم ہو اور وہ تمہارے خلاف کوئی منصوبہ بندی اور شرارت نہ کرسکیں۔ جب تم مصر پہنچ جاؤ تو وہاں کے عوام و خواص سے نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آؤ۔ البتہ جو لوگ سرکشی دکھائیں ان پر سختی کرو اور ضرورت پیش آنے پر طاقت استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرو۔"

قیس نے اس کے جواب میں کہا :

"امیرالمومنینؓ ! خدا آپ پر رحم فرمائے، جو کچھ آپ نے فرمایا وہ میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ لیکن آپ نے فوج کا دستہ

ساتھ لے جانے کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ فوج لے کر نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت آپ کو ایک ایک سپاہی کی ضرورت ہے۔ اگر میں فوج کو اپنے ساتھ لے گیا تو آپ کی طاقت و قوت میں فرق آ جائے گا۔ اس لیے میں صرف اپنے اہل و عیال سمیت مصر جاؤں گا۔ باقی آپ نے وہاں کے باشندوں سے نرمی، محبت اور احسان کا سلوک کرنے کی جو ہدایات فرمائی ہیں ان پر میں ان شاء اللہ حتی المقدور عمل کروں گا۔"

چنانچہ قیس بن سعد اپنے ساتھ صرف سات آدمیوں کو لے کر مصر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر آپ منبر پر چڑھے اور سب سے پہلے ایک آدمی سے کہا کہ اہلِ مصر کو حضرت علیؓ کا وہ خط سنا دے جو امیر المومنینؓ نے ان کے نام لکھا تھا، خط یہ تھا:

اہلِ مصر کے نام حضرت علیؓ کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کی طرف سے ہر اس مومن کے نام ہے جس تک اس کی عبارت پہنچے۔ تم سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے حُسنِ تقدیر و تدبیر سے کام لے کر دینِ اسلام ہی کو اپنے لیے اور اپنے ملائکہ اور اپنے رسولوں کے لیے اختیار کر لیا۔ اسی دین کی اشاعت کی خاطر اس نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ اس امت کو اعزاز و اکرام دینے اور اسے فضیلت سے مختص کرنے کے لیے اس پاک پروردگار نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے تشریف لا کر لوگوں کو کتاب، حکمت، فرائض اور سنّت کا درس دیا تاکہ وہ ہدایت حاصل کریں۔ آپ نے انھیں ایک جگہ جمع کیا تاکہ وہ متفرق نہ ہو جائیں۔ آپ نے انہیں پاکیزگی کا درس دیا تاکہ وہ ہر قسم کی کدورتوں کو اپنے دل سے نکال پھینکیں۔ آپ نے انہیں نیکی اور تقوٰی کی نصیحت فرمائی تاکہ وہ بدی کے راستوں سے ہٹ کر نیکی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ جب آپ اپنا فرض بجا لا چکے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے دو پاکباز انسانوں کو یکے بعد دیگرے اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ ان دونوں نے کتاب و سنّت پر پورا پورا عمل کیا اور لوگوں کے سامنے اپنا نیک نمونہ دکھا کر ایک مثال قائم کر دی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اٹھا لیا تو ایک اور شخص خلیفہ منتخب ہوئے۔ بعض لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کر کے انہیں شہید کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد لوگ میرے پاس آئے اور میری بیعت کر لی۔ میں خدا تعالیٰ سے ہدایت پر چلنے اور حصولِ تقوٰی کی دعا مانگتا ہوں۔ سب لوگ اس امر سے آگاہ رہیں کہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت پر عمل کریں۔ خدا تعالیٰ کے احکام بجا لائیں۔ اس کے رسول کی سنّت کا تم پر نفاذ کریں اور ہمیشہ تمہاری خیر خواہی میں لگے رہیں۔ میں نے قیس بن سعد بن عبادہ کو تمہارا امیر بنا کر بھیجا ہے۔ تم ان کی مدد کرو۔ ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤ اور ان کے حکم کی تعمیل کرو۔ میں نے انھیں حکم دیا ہے کہ وہ احسان

کرنے والوں کے ساتھ احسان اور سرکشی دکھانے والوں کے ساتھ سختی کریں۔ عوام و خواص کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آئیں۔ میں خدا تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ ہمیں اور تمہیں نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی رحمت سے حصہ وافر عطا کرے۔ آمین! اس خط کو عبیداللہ بن ابی رافع نے صفر ۳۶ھ میں لکھا۔"

جب حضرت علیؓ کا یہ خط اہلِ مصر کو سنایا جا چکا تو قیس بن سعد منبر پر کھڑے ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد کہا:

"اے لوگو! ہم نے اس شخص کی بیعت کی ہے جو اس وقت سب سے افضل انسان ہے۔ اس لیے تم بھی میرے ہاتھ پر اس شخص کی بیعت کرو۔ البتہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل نہ کریں تو پھر یہ بیعت قایم نہ رہے گی۔"

اہلِ خربتا کے سوا باقی اہلِ مصر کی اطاعت

چنانچہ لوگوں نے قیس کے ہاتھ پر حضرت علیؓ کی بیعت کی۔ قیس نے مصر کے تمام حصوں میں نظم و نسق درست کرنے کے لیے حکام بھیجنے شروع کیے۔

چند ہی روز میں تمام مصر قیس کی زیرِ نگرانی آ گیا اور اہلِ مصر نے اپنے نئے حاکم کی اطاعت قبول کر لی۔ صرف "خربتا" میں ایک جماعت ایسی تھی جس نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کو بہت بُری طرح محسوس کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد وہ منتظر تھے کہ آئندہ کیا ظہور میں آتا ہے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی اطاعت تو نہیں کی لیکن ان کی مخالفت پر بھی کمربستہ نہیں ہوئے اور قیس کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کی مخالفت کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن فی الحال ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ہم پیش آمدہ حالات کی بنا پر اپنے لیے کوئی راہ معین کر سکیں۔ اسی طرح مسلمہ بن مخلد نے بھی حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی۔ انہوں نے قیس سے وعدہ کر لیا کہ جب تک وہ مصر کے والی رہیں گے وہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں کریں گے۔ مسلمہ بن مخلد جنگ جمل کے اختتام تک مصر ہی میں رہے اور انہوں نے اپنے وعدہ کے مطابق قیس کی کسی قسم کی مخالفت نہیں کی۔ اس طرح تمام مصر میں قیس کی حکومت اچھی طرح قائم ہو گئی۔

قیس کی حکومت سے حضرت معاویہؓ کو خطرہ

حضرت معاویہؓ کے دل میں یہ بات بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے حضرت علیؓ کی جانب پیشقدمی کی تو پیچھے سے کہیں اہلِ مصر شام پر چڑھائی نہ کر دیں۔ اس خطرہ سے بچنے کے لیے انہوں نے قیس کو اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں حضرت عثمانؓ کا واقعۂ شہادت بیان کیا اور حضرت علیؓ کو اس میں ملوث قرار دیتے ہوئے قیس کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ حضرت علیؓ سے علٰحدگی اختیار کر لیں۔ اس کے بدلہ میں حضرت معاویہؓ نے ان سے وعدہ کیا کہ عراق کی فتح کے بعد وہ انہیں وہاں کا والی بنا دیں گے اور ان کے خاندان کے کسی شخص کو حجاز کی ولایت سپرد کر دیں گے۔ اس کے علاوہ وہ جس قدر مال و متاع چاہیں گے انھیں دے دیا جائے گا۔

معاویہؓ کے مقابلہ میں قیس کی دُور اندیشی

جب قیس کے پاس حضرت معاویہؓ کا یہ خط پہنچا تو انہوں نے بہت غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ معاویہؓ سے بگاڑ پیدا نہیں کرنا چاہئے

انہوں نے جواب میں لکھا :

"حضرت علیؓ کے متعلق آپ نے جو باتیں لکھی ہیں میں خیال نہیں کرتا کہ انہوں نے کی ہوں گی اور نہ مجھے کسی ایسی بات ہی کا پتا چلا ہے۔ آپ نے مجھے حضرت علیؓ کی اطاعت ترک کرنے اور اپنی اطاعت اختیار کرنے کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے میں اس پر غور کروں گا لیکن یہ کوئی اتنا اہم معاملہ نہیں ہے جسے فوری طور پر طے کرنا ضروری ہو۔ البتہ آپ میری طرف سے بے فکر رہیے۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو آپ کو ناگوار گزرے اور جس سے آپ کے لیے کسی قسم کی پریشانی پیدا ہو۔"

اس سے قیس کی غرض یہ تھی کہ وہ معاویہؓ کو اپنی طرف سے اطمینان دلا دیں تاکہ وہ ان کی طرف سے بے فکر ہو جائیں اور اس دوران میں در پردہ تیاری کرتے رہیں اور جب موقع آئے تو معاویہؓ پر حملہ کر دیں۔ اگر قیس جنگِ صفین تک مصر ہی میں رہتے تو حضرت علیؓ کی زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے۔ اس وقت حضرت معاویہؓ دو چکیوں کے پاٹ میں ہوتے۔ ان کی طاقت بالکل ختم ہو جاتی اور شام بھی حضرت علیؓ کے قبضہ میں آجاتا۔

جب حضرت معاویہؓ کے پاس قیس کا خط پہنچا تو وہ فوراً بھانپ گئے کہ اس سے قیس کی غرض کیا ہے۔ انہوں نے قیس کو لکھا :

"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ یاد رکھو مجھ جیسے شخص کو کوئی انسان دھوکا نہیں دے سکتا بلکہ دھوکا دینے والے کا مکر و فریب خود اسی پر اُلٹ کر پڑتا ہے۔"

اب قیس جان گئے کہ ٹال مٹول کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جو کچھ ان کے دل میں تھا انہوں نے ظاہر کر دیا اور معاویہؓ کو نہایت سخت الفاظ میں ایک خط لکھا جس کو پڑھ کر حضرت معاویہؓ کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ تاہم وہ ہار ماننے والے نہیں تھے انہوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی۔

قیس کو زک دینے کے لیے معاویہؓ کی تدبیر

انہوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ قیس بھی ان کے تابعداروں اور مددگاروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے اور قیس کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خون کے مطالبہ کو جائز اور برحق ٹھہرایا ہے۔ حضرت علیؓ کو یہ باتیں محمد بن ابی بکرؓ، محمد بن جعفر اور شام میں آپ کے جاسوسوں نے پہنچائیں۔ آپ کو یہ خبریں سُن کر بہت فکر ہوا اور آپ نے اس کے متعلق اپنے دونوں بیٹوں اور عبداللہ بن جعفر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے قیس کو معزول کرنے کی رائے دی۔ لیکن حضرت علیؓ فوری طور پر یہ قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

اسی دوران میں قیس بن سعد کا خط آیا جس میں "خربتا" کے لوگوں کا مفصل حال تھا۔ آپ نے لکھا تھا کہ اگرچہ انہوں نے بیعت تو نہیں کی لیکن وہ آپ کی مخالفت کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ حضرت علیؓ کے مشیروں نے یہ سمجھا کہ یہ در اصل قیس کی علٰحدگی کی تمہید ہے۔ انہوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ انہیں اہلِ خربتا سے لڑنے کا حکم دیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے انہیں لکھا کہ اہلِ خربتا سے بزور بیعت لی جائے۔ لیکن قیس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے حضرت علیؓ

کو لکھا :

"اگرچہ اہلِ خربتا اس وقت غیر جانبدار ہیں لیکن وقت پڑنے پر وہ آپ ہی کی مدد کریں گے ۔ اس لیے ان سے تعرض نہ کرنا چاہیے ۔"

قیس کی معزولی اس خط سے حضرت علیؓ کے قریبی ساتھیوں کے شک کو اور تقویت پہنچی اور انہوں نے بڑے زور سے قیس کو معزول کرنے کا مشورہ دیا ۔ آخر حضرت علیؓ کو ان کا مشورہ ماننا پڑا اور قیس کو معزول کر کے ان کی جگہ محمد بن ابی بکرؓ کو مصر کا والی بنا کر بھیج دیا ۔ قیس کو بہت غصہ آیا ۔ وہ مصر سے حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور تمام حالات انہیں سنائے ۔ حضرت علیؓ نے ان کا بیان سن کر ان کے عذرات قبول کر لیے ۔

حضرت معاویہؓ کی کامیابی اس طرح معاویہؓ کی حُسنِ تدبیر سے ان کی راہ کا ایک کانٹا نکل گیا ۔ وہ مصر کی طرف سے مطمئن ہو کر جنگِ صفین کے لیے تیاری کرنے لگے ۔ اگر قیس مصر میں رہتے تو جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ۔ اس وقت معاویہؓ اپنی پوری فوج کو صفین نہ بھیج سکتے بلکہ فوج کا ایک حصہ انہیں مصر کی جانب بھی رکھنا پڑتا ۔ اس صورت میں حضرت علیؓ کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ اس سے پہلے کہ کسی شخص کے ذہن میں مصحف بلند کرنے اور تحکیم کا خیال آتا شام کے لشکر کو شکستِ فاش دے سکتے ۔

قیس کی جگہ محمد بن ابی بکرؓ کا تقرر اپنے مشیروں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے قیس بن سعد کو مصر کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو وہاں کا والی بنا دیا تھا محمد بن ابی بکرؓ کو مصر آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے "خربتا" کے غیر جانبدار لوگوں کو لکھا کہ یا تو وہ اس کی اطاعت قبول کر لیں ورنہ مصر سے نکل جائیں ۔

انہوں نے جواب دیا :

"ہم اس وقت تک تمہاری اطاعت قبول نہیں کریں گے جب تک حالات کا پورے طور پر مشاہدہ نہ کر لیں گے ۔ تم ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو اور ہم سے جنگ کرنے میں جلدی نہ کرو ۔"

لیکن محمد بن ابی بکر نے ان کا عذر قبول نہ کیا اور چڑھائی کر دی ۔

قیس بن سعد یہ معلوم ہونے پر کہ ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم بنایا گیا ہے اس سے جا کر ملے تھے اور مصر کے تمام حالات سے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا :

"میری معزولی مجھے تمہیں نصیحت کرنے سے نہیں روکتی ۔ مجھے مصر کے حالات سے پوری طرح آگاہی ہے اور میں ان لوگوں کی سرشت سے خوب اچھی طرح واقف ہوں ۔ جب تک میں وہاں رہا معاویہؓ عمروؓ بن العاص اور اہلِ خربتا سے کھلا مقابلہ کرنے کی بجائے مختلف تدابیر اختیار کر کے انہیں اپنا مخالف بنانے سے روکتا رہا ۔ میں تمہیں بھی یہ نصیحت کرتا ہوں کہ میرے طریق پر چل کر ان سے کھلا مقابلہ نہ کرنا بلکہ دوسرے طریقوں سے ان کو زک دینا ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو سخت نقصان

اٹھاؤ گے۔"

محمد بن ابی بکرؓ کی بے تدبیری

لیکن محمد بن ابی بکر نے ان نصیحتوں پر مطلق کان نہ دھرا اس نے یہ سمجھا کہ چونکہ قیس کو معزول کر دیا گیا ہے اس لیے وہ نصیحت کے پردے میں مجھے زک پہنچانا اور انتقام لینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے ہر بات میں قیس کے خلاف کیا اور اہل خربتا سے جنگ چھیڑ دی۔ وہ بھی جان توڑ کر لڑے اور اسے شکست دے دی۔

جب حضرت معاویہؓ کو اہلِ خربتا کے ہاتھوں محمد بن ابی بکر کی شکست کا پتا چلا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسی اثنا میں مصر میں بھی ایک شخص معاویہ بن خدیج السکونی کھڑا ہو گیا جس نے حضرت عثمانؓ کا انتقام لینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمیوں کو اپنے ساتھ کر لیا۔ اس طرح محمد بن ابی بکر کے ہاتھوں مصر کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ جب حضرت علیؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ کو بڑی تشویش لاحق ہوئی اور آپ نے فرمایا:

"مصر کی حالت صرف دو آدمیوں کے ذریعہ درست ہو سکتی ہے یا قیس کے ہاتھوں یا اشتر کے ہاتھوں۔"

محمد بن ابی بکرؓ کی جگہ اشتر کا تقرر

اشتر اس زمانہ میں جزیرہ میں حضرت علیؓ کا عامل تھا۔ آپ نے اسے کہلا کر بھیجا کہ مصر محمد بن ابی بکر کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ وہ ناتجربہ کار نوجوان ہے اور اس کے ذریعہ مصر کی حالت درست ہونی بہت مشکل ہے اس لیے کسی قابلِ اعتبار اور موزوں آدمی کو اپنی جگہ چھوڑ دو اور میرے پاس پہنچو۔

حکم کی تعمیل میں اشتر حضرت علیؓ کے پاس پہنچا۔ آپ نے اسے مصر کی ولایت کا پروانہ لکھ دیا اور فرمایا:

"اگر میں تمہیں نصیحت بھی کروں تو مجھے امید ہے کہ تم وہاں جا کر خود ہی مناسب تدابیر اختیار کرو گے تاہم اس بات کا خیال رکھنا کہ ہر مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہنا۔ وہاں کے باشندوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا سلوک کرنا۔ سختی صرف اس وقت کرنا جب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔"

حضرت معاویہؓ کی تدابیر سے اشتر کی ہلاکت

چنانچہ اشتر مصر کی جانب روانہ ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ یہ خبر مل گئی۔ آپ نے سوچا کہ اشتر مصر پر قابض ہو گیا تو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے ایک شخص "جایستار" کو بلایا جو اہلِ خراج میں سے تھا اور اس سے کہا:

"اشتر کو مصر کا والی بنایا گیا ہے۔ اگر تم کسی طرح اسے مصر میں داخل ہونے سے روک دو تو میں تمہارا بقیہ خراج معاف کر دوں گا۔"

"جایستار" نے حامی بھر لی اور جب اشتر مصر کی حدود میں داخل ہونے لگا تو وہ اس سے ملا اور کہنے لگا:

"میں ایک خراجی ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں تشریف رکھیے اور ماحضر تناول فرمائیے۔"

اشتر جابستار کے کہنے میں آگیا اور اس کے گھر اُتر پڑا۔ وہ شہد کا ایک پیالہ لایا جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ اشتر نے اسے پیا اور زہر کے اثر سے ہلاک ہوگیا۔

جابستار حضرت معاویہؓ کے پاس آیا اور انہیں اشتر کی موت کی خبر دی۔ انہوں نے کہا:

”علیؓ بن ابی طالب کے دو بازو تھے۔ ایک بازو (عمارؓ) تو جنگِ صفین کے دن کٹ گیا اور دوسرا (اشتر) آج قطع ہوگیا۔“

محمد بن ابی بکرؓ کی بحالی محمد بن ابی بکر کو مصر کی ولایت سے معزولی بہت ناگوار گزری تھی۔ جب حضرت علیؓ کو اشتر کی ہلاکت اور محمد بن ابی بکر کی ناراضگی کا پتا لگا تو آپ نے اسے لکھا:

”میں نے تمہیں کسی ناراضگی یا قصور کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں اشتر کو صرف اس لیے مصر کا حاکم بنانا چاہتا تھا کہ وہ بہت زیادہ تجربہ کار تھا اور مصر کے بگڑے ہوئے حالات کو قابو میں لا سکتا تھا۔ اب جبکہ وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر کے خدا کے دربار میں حاضر ہو چکا ہے، میں تمہیں بدستور مصر کا حاکم باقی رکھتا ہوں۔ تم دشمن کا مقابلہ اچھی طرح کرو۔ لڑائی سے کبھی پہلو تہی نہ کرو۔ لوگوں کو نصیحت بہت اچھے پیرائے میں کرو۔ خدا تعالیٰ کے ذکر میں اپنا اکثر وقت گزارو۔ اسی سے مدد طلب کرو اور اسی سے ڈرو۔ اگر تم نے ان باتوں پر عمل کیا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ بڑے بڑے مشکل کام آسان ہو جائیں گے اور ہر وقت خدا تعالیٰ کی نصرت تمہارے شاملِ حال رہے گی۔“

محمد بن ابی بکر کی ناراضگی حضرت علیؓ کا یہ خط پڑھ کر دور ہوگئی اور اس نے جواب میں آپ کو یہ خط لکھا:

”امیر المومنینؓ کا خط پہنچا۔ جو کچھ آپ نے اس میں لکھا تھا وہ میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ امیر المومنینؓ سے زیادہ اور کوئی شخص مجھے عزیز نہیں ہے اور آپ کی رائے کا پاس مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہے۔ آپ کی بیعت کے لیے میں نے اہلِ خربتا کو بہت سمجھایا لیکن انہوں نے پیہم انکار کیا۔ آخر میں نے ان کے خلاف لشکر کشی کی۔ اس کے باوجود میں نے ہر شخص کو امان دے دی تھی۔ صرف اسی شخص سے لڑائی کی تھی جس نے خود مجھ سے لڑنا چاہا۔ بہرحال میں امیر المومنینؓ کا تابعدار ہوں اور ان کا ہر حکم بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار“

(۲۴)

سرزمینِ مصر پر حضرت معاویہؓ کا قبضہ

محمد بن ابوبکرؓ کے مقابلہ کے لیے حضرت معاویہؓ کی اہلِ خربتا سے استمداد

اہلِ شام صفین سے واپس آ کر حکمین کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اذرح میں حکمین کے اجتماع کے بعد اہلِ شام نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لی۔ جس سے حضرت معاویہؓ ک

قوت و طاقت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ دُوسری جانب اہلِ عراق کے دُو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک فریق حضرت علیؓ کے حق میں تھا اور ایک ان کے خلاف۔ اس طرح نہ صرف عراق میں خلفشار برپا ہوگیا بلکہ حضرت علیؓ کی قوت میں بھی بہت کمی آگئی۔ حضرت معاویہؓ کو صرف مصر کی طرف سے فکر تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہیں مصر پر حضرت علیؓ کا مکمل تسلط نہ ہوجائے اور آپ مصریوں کی مدد سے شام پر حملہ نہ کر دیں۔

اگرچہ مصریوں کا حضرت عثمانؓ کی شہادت میں بہت بڑا حصہ تھا تاہم وہاں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو حضرت علیؓ کی مخالف تھی۔ حضرت معاویہؓ نے چاہا کہ حضرت علیؓ کے مخالفین کی مدد حاصل کی جائے اور ان کے ذریعہ مصر پر اپنا تسلط جمایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اہلِ خربتا کے دُو سرداروں مسلمہ بن مخلد انصاری اور معاویہؓ بن خدیج کندی کو لکھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک عظیم الشان کام کے لیے انتخاب کیا ہے اور وہ عظیم الشان کام یہ ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرو جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ذمہ دار ہیں۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو میں تمہاری مدد کے لیے فوج بھیج سکتا ہوں۔

اہلِ خربتا محمد بن ابی بکر کے ہاتھوں پہلے ہی تنگ تھے۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی پیشکش کو بڑی خوشی سے قبول کرلیا اور انہیں لکھ بھیجا کہ ہم جنگ کے لیے بالکل تیار ہیں، لیکن آپ کو جو مدد بھیجنی ہے وہ جلدی بھیجئے کیونکہ یہاں کا حاکم پہلے ہی ہم سے برسرپیکار ہے اور ہماری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اب تک تو ہم اس کے حملوں کو روک رہے ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ مبادا ہم بالکل مغلوب ہوجائیں۔ البتہ اگر آپ کی طرف سے مدد پہنچ گئی تو ان شاء اللہ ہم ضرور فتح یاب ہوں گے۔

اہلِ خربتا کی مدد کے لیے عمروؓ بن العاص کا پہنچنا

جب یہ خط حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا تو انہوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کو چھ ہزار کی جمعیت دے کر مصر روانہ کیا اور انہیں نصیحت کی کہ اپنے مخالفین سے بہت نرمی سے پیش آئیں۔ پہلے انھیں صلح و اتحاد کی دعوت دیں اور اگر وہ یہ دعوت قبول نہ کریں تو صرف انہی سے لڑیں جو ان کے مقابلے کے لیے آئیں۔ لیکن جو لڑائی سے گریز کریں ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ کریں۔

جب حضرت عمروؓ ابن العاص مصر پہنچے تو اہلِ خربتا ان سے آملے۔ آپ نے محمد بن ابوبکر کو یہ خط لکھا:

"اے ابنِ ابوبکرؓ! تم اپنے خون کو مجھ سے بچاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں میرے ہاتھوں شکست کھانی پڑے۔ اہلِ مصر تمہاری پیروی کرنے سے نادم ہیں اور وہ تمہارے خلاف ہوچکے ہیں اس لیے یہی بہتر ہے کہ تم مصر سے نکل جاؤ۔ یاد رکھو میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔"

حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنے خط کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا ایک خط بھی روانہ کیا۔ اس خط میں حضرت معاویہؓ نے محمد بن ابوبکرؓ کو لکھا تھا:

"بغاوت اور ظلم کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے اور ناحق خُون بہانے والا دنیا ہی میں اپنی سزا کو پہنچ جاتا ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی وہ اس کے علاوہ ہوگی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم حضرت عثمانؓ کے شدید مخالفین میں سے تھے۔ تم نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا خون بہانے والوں

"ہن بھی تم پیش پیش تھے۔ تم نے یہ خیال کر لیا کہ میں تم سے غافل ہوں اور تمہارے سارے کرتوت میری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اسی لیے تم نے خوشی خوشی مصر کی ولایت قبول کر لی لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مصر والے میرے ساتھ ہیں اور میری بات مانتے ہیں۔ وہ تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تمہارا خون بہا کر اور تم سے جہاد کر کے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ وہ تمہیں قتل کر کے تمہارا مثلہ کریں گے۔ اگر انھوں نے تمہارے قتل کا ارادہ نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں نہ ڈراتا۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں کہ وہ تمہارے ظلم، سرکشی اور حضرت عثمانؓ کے قتل میں حصہ لینے کی وجہ سے تمہیں قتل کریں البتہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ قریش کے کسی شخص کا مثلہ کیا جائے۔ یاد رکھو! تم کہیں بھی چلے جاؤ خدا تعالیٰ تم سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔"

محمد بن ابی بکرؓ کی حضرت علیؓ سے مدد کی درخواست

جب محمد بن ابی بکر کو یہ دونوں خط ملے تو اس نے انہیں ایک خط کے ساتھ حضرت علیؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس خط میں اس نے لکھا:

"عمروؓ بن العاص مصر کے زیریں حصہ میں پہنچ گئے ہیں اور اس علاقہ کے جتنے لوگ معاویہؓ کے حامی تھے وہ ان سے مل گئے ہیں۔ عمروؓ بن العاص کے ساتھ بھاری لشکر ہے لیکن میرے بعض ساتھیوں میں بزدلی پائی جاتی ہے۔ اگر آپ کو سرزمینِ مصر کا کچھ بھی فکر ہے تو فوراً میری مدد کے لیے فوج روانہ کیجئے۔"

حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں محمد بن ابوبکر کو ایک تسلی آمیز خط بھیجا جس میں عمروؓ بن العاص کی چڑھائی کو معمولی بات قرار دیا اور لکھا کہ یہ چڑھائی خود اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہو گی۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی بزدلی نہ دکھائے اور پوری طاقت سے ہر شہر اور ہر بستی کی حفاظت کرے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ وہ جلدی ہی اس کی امداد کے لیے ایک فوج روانہ کریں گے۔

حضرت علیؓ کا جواب پہنچنے پر محمد بن ابوبکر کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے حضرت معاویہؓ کو ان کے خط کے جواب میں لکھا:

"آپ کا خط مجھے ملا جس میں آپ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ذیل میں میرا تذکرہ بھی کیا ہے اور مجھے ان کے قتل میں شریک ٹھہرایا ہے۔ میں اس کے متعلق کسی قسم کا عذر پیش کرنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں مصر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، گویا آپ میرے بڑے ناصح ہیں۔ آپ مجھے مثلہ سے ڈراتے ہیں، گویا آپ میرے بڑے مشفق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جنگ میں آپ کو شکستِ فاش نصیب ہو گی اور آپ کی فوجوں کا تہس نہس ہو جائے گا۔"

ایک خط حضرت عمروؓ بن العاص کو بھی اسی مضمون کا لکھا:

"تم اپنے خیال میں اس بات کو ناپسند کرتے ہو کہ مجھے تمہارے مقابلہ میں شکست ہو۔ میں خدا تعالیٰ کی قسم

کہتا ہوں کہ تم اپنے اس خیال میں سراسر غلطی پر ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ تم میرے ناصح مشفق ہو۔ حالانکہ تم سے زیادہ مجھے نقصان پہنچانے والا آدمی اور کوئی نہیں۔ تمہیں گمان ہے کہ اہلِ مصر نے میرا ساتھ چھوڑ کر تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے اور وہ میرا ساتھ دینے پر نادم ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو وہ لوگ تمہیں اور شیطان کو مبارک ہوں:

لڑائی کا آغاز اور محمد بن ابوبکر کا قتل یہ دونوں خط بھیجنے کے بعد محمد بن ابوبکر لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ اس نے لوگوں کو لڑائی کے لیے ابھارنا شروع کیا۔ آخر کنانہ بن بشر کی سرکردگی میں اس نے دو ہزار فوج عمروؓ بن العاص کے مقابلہ کے لیے بھیجی۔ اُدھر سے عمروؓ بن العاص بھی پہنچ گئے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو کنانہ نے بڑے زور شور سے عمروؓ بن العاص کی فوج پر حملہ کیا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب عمروؓ بن العاص نے یہ صورتِ حال دیکھی تو معاویہ بن خدیج السکونی سے مشورہ کیا۔ معاویہ بن خدیج فوراً اہلِ خربتا کو میدان میں لے آئے اور کنانہ بن بشر کی فوج کو گھیر لیا۔ اب شامیوں نے زبردست حملہ کیا اور کنانہ کی فوج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کنانہ بھی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ جب محمد بن ابوبکر کے ساتھیوں کو کنانہ کی فوج کی شکست کا پتا چلا تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے اور محمد اکیلا رہ گیا۔ آخر مایوس ہو کر وہ شہر سے باہر نکلا اور ایک کھنڈر میں پناہ لی۔ معاویہ بن خدیج محمد کی تلاش میں تھا۔ بعض قبطیوں نے اسے محمد کا پتا بتا دیا۔ معاویہ بن خدیج کھنڈرات میں پہنچا اور محمد کو باہر نکال کر قتل کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر محمد کے بھائی عبدالرحمن بن ابوبکرؓ جو عمروؓ بن العاص کے لشکر میں تھے، برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے عمروؓ بن العاص سے کہا:

"کیا تم میرے بھائی کو قتل کر ڈالو گے؟"

عمروؓ بن العاص نے معاویہ بن خدیج کو کہلا بھیجا کہ وہ محمد کو زندہ پکڑ کر ان کے پاس لے آئیں۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ محمد پیاس سے مرا جا رہا تھا اس نے التجا کی کہ مجھے پانی کا ایک پیالہ پلا دو پھر بے شک قتل کر ڈالنا۔ لیکن معاویہ نے کہا:

"خدا تعالیٰ مجھے پانی کا ایک گھونٹ نہ پلائے اگر میں تمہیں پانی پلاؤں۔ تم نے حضرت عثمانؓ کو پانی سے قطعاً محروم کر دیا تھا اور وہ شدتِ پیاس کی حالت میں شہید کیے گئے۔ اے ابنِ ابوبکرؓ! میں تمہیں ضرور قتل کروں گا آخرت میں خدا تعالیٰ تمہیں گرم پانی پلائے گا۔"

چنانچہ معاویہ نے محمد کو قتل کر کے اس کی لاش کو جلا دیا۔

جب حضرت عائشہؓ کو یہ حال معلوم ہوا تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ آپ نے معاویہ اور عمروؓ بن العاص کے حق میں بد دعا کی اور محمد کے اہل و عیال کو اپنے پاس بلا لیا۔

حضرت علیؓ نے بہت مشکل سے دو ہزار کی جمعیت محمد بن ابوبکرؓ کی مدد کے لیے فراہم کی تھی۔ اس لشکر نے ابھی تھوڑی مسافت ہی طے کی تھی کہ محمد کے قتل اور مصر پر حضرت معاویہؓ کے قبضہ کی خبر آ گئی۔ اس پر یہ لشکر راستہ ہی سے واپس ہو گیا۔

جب حضرت علیؓ کو محمد کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ البتہ معاویہؓ اور اہلِ شام کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

مصر کی ولایت دوبارہ عمروؓ بن العاص کے ہاتھوں میں عمروؓ بن العاص نے فتح کے بعد فسطاط جاکر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ صفر ۳۸ھ کا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے عمروؓ بن العاص کو مصر کی ولایت سونپ دی اور اس طرح عمروؓ بن العاص دوبارہ مصر کے والی ہو گئے۔

حضرت عمروؓ بن العاص کو اگرچہ مصر کی ولایت مل گئی تھی لیکن وہ اکثر شام آتے رہتے تھے۔ معاویہؓ بھی ان کے مشورہ اور رائے کے بغیر کوئی اہم کام سر انجام نہیں دیتے تھے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ جس روز حضرت امام حسنؓ نے خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد کی ہے اس دن عمروؓ بن العاص بھی معاویہؓ کے پاس موجود تھے۔ البتہ اس دوران میں ان کا کوئی بڑا کارنامہ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی ولایت کے دوران میں حضرت عمروؓ بن العاص وہاں کی سیاسی حالت سدھارنے اور عام نظم و نسق درست کرنے میں مصروف رہے۔ انہیں جنگوں میں حصہ لینے کی فرصت نہ مل سکی۔ مصر پر حکومت کرتے ہوئے انہیں ابھی چار سال ہی ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ پہنچا اور ۴۲ھ میں یہ عظیم الشان سیاستدان دنیا سے اُٹھ گیا۔

(۲۵)

حضرت علیؓ کی خلافت کے آخری ایّام

۳۸ھ سے ۴۰ھ تک

پریشانی کے ایّام حضرت علیؓ کی خلافت کے آخری ایّام ان کے لیے نہایت پریشانی کے تھے۔ آپ کے بیشتر ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بڑے بڑے مددگار اور حامی جو ہمیشہ آڑے وقت میں آپ کے کام آتے تھے مثلاً اشتر، عمار اور محمد بن ابی بکرؓ آپ کے سامنے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ آپ کے ارد گرد جو لوگ باقی رہ گئے تھے نہ ان میں بہادری تھی اور نہ آپ کی مدد اور حمایت کا جوش۔ جب آپ ان لوگوں کو مدد کے لیے بلاتے تھے وہ پس و پیش کرنے لگتے تھے اور آپ کی آواز پر مطلق کان نہ دھرتے تھے۔ اس کے بالمقابل حضرت معاویہؓ کے ساتھی ان کی ایک آواز پر اپنا فرض بجا لانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور کسی خطرہ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

جب حضرت علیؓ نے یہ حالات دیکھے اور اپنے اور حضرت معاویہؓ کے ساتھیوں کا موازنہ کیا تو آپ کو یقین ہو گیا کہ معاویہؓ نے تمام عالمِ اسلام پر حکومت کرنے کا جو خواب دیکھا ہے وہ بالآخر پورا ہو جائے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کی غدّاری، کم ہمتی اور بزدلی کی وجہ سے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس صورتِ حال کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا اور ان پر انتہائی پژمردگی چھا گئی۔ آپ نے باہر نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم کر دیا۔ جب عاملِ بصرہ حضرت ابنِ عباسؓ کو حضرتِ علیؓ کی اس حالت کا پتا چلا تو وہ آپ کی ہمت بڑھانے اور معاویہؓ کے مقابلہ میں کوئی کارگر حربہ اختیار کرنے کے لیے کوفہ روانہ ہوئے۔

عبداللہ بن حضرمی کا بصرہ پر تسلط

جب حضرت معاویہؓ کو یہ معلوم ہوا کہ ابن عباسؓ بصرہ چھوڑ کر کوفہ گئے ہیں تو انہوں نے موقعہ کو غنیمت جانا اور عبداللہ بن حضرمی کو اپنے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے لیے بصرہ بھیجا اور اس سے کہا کہ بصرہ کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد حضرت علیؓ کی مخالف ہے تم جا کر انہیں اپنے ساتھ ملاؤ۔ چنانچہ ابن حضرمی بصرہ پہنچا۔ وہاں جا کر اس نے بنو تمیم اور مضر کو اپنے ساتھ ملا کر انہیں انتقامِ عثمانؓ کے مقابلہ کے لیے کھڑا کر دیا۔

ابن عباسؓ زیاد بن ابیہ کو اپنا قائم مقام بنا کر گئے تھے۔ انہوں نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو حضرت علیؓ کے حامی قبیلہ ربیعہ سے پناہ طلب کی اور بصرہ کا سارا خزانہ بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں سے انہوں نے حضرت علیؓ کو تمام واقعات کی اطلاع دی اور ان سے مدد طلب کی۔ حضرت علیؓ نے جاریہ بن قدامہ کو ایک لشکر دے کر بھیجا۔ انہوں نے بصرہ جا کر ابن حضرمی کا مقابلہ کیا۔ وہ اپنے ستر ساتھیوں کے ساتھ بصرہ کے ایک مکان میں پناہ گزین ہو گیا۔ لیکن جاریہ نے اس مکان کو جلا ڈالا اور ابن حضرمی اور اس کے ستر ساتھی آگ میں جل کر ہلاک ہو گئے۔

خریت بن راشد کا فتنہ

معرکۂ نہروان کے بعد اگرچہ خوارج کا فتنہ دب گیا تھا لیکن اس کا پورے طور پر استیصال نہ ہو سکا تھا اور کبھی کبھی موقعہ پا کر یہ فتنہ سر اٹھا لیتا تھا۔ خریت بن راشد ایک خارجی نے اہواز، فارس اور کرد کے علاقوں میں حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور حضرت علیؓ کے عمال کو ان علاقوں سے باہر نکال دیا۔ حضرت علیؓ نے اس کے مقابلہ کے لیے بصرہ سے ایک لشکر روانہ کیا جس نے جا کر خریت کے زور کو توڑا اور اس کی جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس علاقہ میں پورے طور پر امن قائم کرنے اور خریت کے فتنہ کے آثار مٹانے کے لیے حضرت علیؓ نے زیاد بن ابیہ کو وہاں کا حاکم بنا کر بھیجا۔ زیاد نے فارس پہنچ کر تمام حالات کا جائزہ لیا۔ نہایت ہوشمندی سے کام لے کر وہاں امن قائم کیا اور قبائلی سرداروں کو بیش قیمت عطایا اور مال و منال کا لالچ دے کر اپنی اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا اس طرح فارس کے تمام علاقے میں زیاد کی حکومت اچھی طرح مستحکم ہو گئی۔

حضرت معاویہؓ کے جارحانہ حملے

جب حضرت معاویہؓ کو خوارج کے اس فتنہ کا علم ہوا تو انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر مختلف اطراف میں اپنے لشکر بھیجنے شروع کر دیے۔ نعمان بن بشیر کو عین التمر کی طرف بھیجا۔ وہاں حضرت علیؓ کی طرف سے مالک بن عوف حاکم تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو امداد کے لیے لکھا۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے عین التمر جانے کے لیے ارشاد فرمایا لیکن اہلِ کوفہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ کو شدید غصہ آیا اور آپ نے فرمایا:

> "تمہیں کیا ہوا؟ کیا تمہاری آنکھوں پر بجلی گر پڑی ہے کہ وہ اندھی ہو گئی ہیں یا زبانوں پر فالج کا اثر ہو گیا ہے کہ ان میں نام کو حرکت باقی نہیں رہی یا کانوں نے جواب دے دیا ہے اور وہ بہرے ہو گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

لیکن اہلِ کوفہ خاموش بیٹھے رہے اور دربارِ خلافت سے مالک کو کوئی امداد نہ پہنچ سکی۔ آخر مالک نے خود ہی نعمان کا مقابلہ کیا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت معاویہؓ نے چھ ہزار کا ایک اور لشکر سفیان بن عوف کی سرکردگی میں ہیت، انبار اور مدائن پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ سفیان پہلے ہیت پہنچا۔ لیکن یہاں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی فوج موجود نہ تھی۔ وہاں سے وہ انبار آیا یہاں ایک فوج مقابلہ کے لیے موجود تھی۔ سفیان نے لڑائی شروع کر دی اور فتح یاب ہو گیا۔ اسے یہاں سے جس قدر مال و اسباب مل سکا وہ لے کر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچ گیا۔

عبداللہ بن مسعدہ کو تیماء کی طرف بھیجا۔ اسے حکم دیا کہ وہ بدویوں سے بہ جبر صدقہ وصول کرے اور جو شخص مزاحمت کرے اسے قتل کر دے اس کے بعد مکہ اور مدینہ کا رُخ کرے۔ حضرت علیؓ نے عبداللہ کے مقابلہ کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ دونوں فوجوں میں شدید لڑائی ہوئی جس کے نتیجہ میں عبداللہ آگے نہ بڑھ سکا اور شام کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

ضحاک بن قیس کو اطرافِ بصرہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جس نے وہاں پہنچ کر قتل و غارت کا بازار خوب گرم کیا۔

بسر بن ابی ارطاۃ کو تین ہزار کی جمعیت دے کر حجاز اور یمن کی طرف روانہ کیا۔ بسر سب سے پہلے مدینہ آیا اور شہر پر قبضہ کر کے اہلِ مدینہ سے حضرت معاویہؓ کی بیعت لی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ مکہ پہنچا اور وہاں کے لوگوں سے بھی حضرت معاویہؓ کی بیعت لی۔ مکہ سے وہ یمن پہنچا۔ یمن میں اس وقت حضرت علیؓ کی جانب سے عبیداللہ بن عباس والی تھے۔ انہوں نے جب بسر کے آنے کی خبر سُنی تو کوفہ چلے گئے۔ بسر نے آ کر یمن پر قبضہ کر لیا اور عبیداللہ بن عباس کے دو کم سن بچوں کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔

بسر نے حضرت علیؓ کے حامیوں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کر دیا۔ مکہ اور مدینہ کے بہت سے گھروں کو مسمار کرا دیا۔ جب حضرت علیؓ کو بسر کے ظلم و ستم سے آگاہی ہوئی تو آپ نے اس کے مقابلے کے لیے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن سعود کو دو ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا۔ جب بسر کو ان دونوں کے آنے کی اطلاع ملی تو ڈر کر شام بھاگ گیا۔ اسی اثناء میں حضرت علیؓ کی شہادت واقع ہو گئی۔ اس خبر کو سُن کر جاریہ نے اہلِ یمن سے حضرت علیؓ کے بیٹے حضرت امام حسنؓ کی بیعت لی۔ یمن سے وہ مکہ آئے اور مکہ سے مدینہ پہنچے اور علی الترتیب ان دونوں شہروں سے بھی حضرت امام حسنؓ کے لیے بیعت لی۔

حضرت علیؓ کے آخری دورِ خلافت کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دن حضرت علیؓ کے لیے انتہائی پریشانی کے تھے۔ حکومت کا تمام نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور سلطنت کے ہر حصہ میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کی طاقت و قوت بڑھ رہی تھی اور ان کی سلطنت کو استحکام حاصل ہو رہا تھا۔

(۲۶)

امیرالمومنینؓ کی شہادت

سنہ ۴۰ھ کا ذکر ہے کہ عبدالرحمٰن بن ملجم المرادی، برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر التمیمی، تین مشہور خارجی ایک روز سرے

سے ملے اور عالمِ اسلام کی ناگفتہ بہ حالت کا تذکرہ کرنے لگے۔ بات چیت کے دوران میں جنگِ نہروان کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ یہ تینوں درد انگیز الفاظ میں اپنے مقتولین کا ذکر کرنے اور کہنے لگے کہ اپنے بھائیوں کے قتل کے بعد زندگی کا کوئی مزا نہیں رہا۔ اب ہمارے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو جنہوں نے تمام عالمِ اسلام میں ایک فساد برپا کر رکھا ہے، قتل کر دیں اس طرح جہاں ہم مسلمانوں کو ایک عظیم فتنہ سے نجات دلا دیں گے وہاں اپنے بھائیوں کا انتقام بھی لے لیں گے۔

ابنِ ملجم نے، جو اہلِ مصر میں سے تھا، کہا کہ میں علیؓ کو قتل کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔ برک بن عبداللہ نے معاویہؓ کو قتل کرنے کی ذمہ داری لی اور عمرو بن بکر نے عمروؓ بن العاص کو قتل کرنے کی ہامی بھری۔

ان تینوں نے باہم عہد و پیمان کیے اور قسمیں کھائیں کہ اپنے اپنے مفوضہ کام سے کسی طرح پیچھے نہیں ہٹیں گے اور یا تو ان تینوں کو قتل کر دیں گے یا خود مارے جائیں گے۔ اس کام کے لیے رمضان کی سترہؔ تاریخ مقرر ہوئی۔ قول و قرار کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں زہر میں بجھائیں اور تینوں اپنا اپنا کام سرانجام دینے کے لیے کوفہ، دمشق اور مصر روانہ ہو گئے۔

ابنِ ملجم کوفہ آیا اور بنو کندہ میں ٹھہرا جو در پردہ خوارج کے حامی تھے۔ لیکن اس نے اس ڈر سے اپنے ارادہ کا کسی شخص پر اظہار نہ کیا کہ کہیں بات نکل نہ جائے۔ ایک دن اس نے قبیلہ بنی تیم رباب کے چند لوگوں کو دیکھا۔ حضرت علیؓ نے تیم رباب کے دس آدمیوں کو جنگِ نہروان میں قتل کیا تھا۔ یہ ان سے ملا اور ان کے مقتولوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسی خاندان کی ایک انتہائی حسین و جمیل عورت "قطام" تھی۔ اس کے باپ اور بھائی کو بھی حضرت علیؓ نے جنگِ نہروان میں قتل کیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے دل میں حضرت علیؓ کی طرف سے شدید عداوت بھری ہوئی تھی۔ قطام کو دیکھ کر ابنِ ملجم اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا اور اس نے اسے نکاح کا پیغام دے دیا۔ قطام نے کہا:

"مجھے تم سے نکاح کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن مہر وہ ہوگا جو میں مقرر کروں گی۔"

ابنِ ملجم نے کہا: "وہ کیا ہوگا؟"

قطام نے کہا:

"تین ہزار درہم، ایک غلام، ایک لونڈی اور علیؓ بن ابی طالب کا قتل۔"

ابنِ ملجم نے کہا:

"تمہارا مہر مجھے منظور ہے میں تو خود ہی علیؓ کو قتل کرنے کو فہ آیا ہوں۔"

قطام نے ابنِ ملجم کو نصیحت کی کہ وہ حضرت علیؓ پر اچانک حملہ کرے، اگر وہ بچ گیا تو دونوں آرام کی زندگی بسر کریں گے ورنہ آخرت کا عیش و آرام اس کے لیے اس دنیا کے عیش و آرام سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ اپنے قبیلہ کے ایک شخص وردان کو بھی اس نے ابنِ ملجم کے ساتھ کر دیا۔

ابنِ ملجم قطام کے پاس سے اٹھ کر قبیلہ اشجع کے ایک شخص شبیب بن بجرہ کے پاس آیا اور اس سے پوچھا:

"کیا تم دنیا اور آخرت کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

اس نے پوچھا :

"وہ کس طرح ؟"

ابنِ ملجم نے کہا :

"علیؓ بن ابی طالب کو قتل کر کے ۔"

شبیب نے یہ سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرا اور کہنے لگا :

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

ابنِ ملجم نے کہا :

"میں مسجد میں چھپ کر بیٹھ رہوں گا۔ جب علیؓ فجر کی نماز پڑھانے مسجد میں آئیں گے تو ہم دونوں اچانک ان پر حملہ کر کے انھیں قتل کر دیں گے ۔ اگر ہم بچ نکلے تو اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو جائیں گے اور اپنے مقتولین کا انتقام لے لیں گے ، لیکن اگر بچ نکلنا ہمیں نصیب نہ ہوا تو آخرت کا اجر تو بے حساب ہمیں ملے گا ہی ۔"

شبیب نے کہا :

"علیؓ نے اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں ۔ اسلام لانے میں ان کو سابقیت کا شرف حاصل ہے ۔ میں تو اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا ۔"

ابنِ ملجم نے کہا :

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ علیؓ نے جنگِ نہروان میں خدا تعالیٰ کے سینکڑوں نیک اور پاکباز بندوں کو قتل کیا تھا ؟"

شبیب نے اثبات میں جواب دیا ۔

ابنِ ملجم نے کہا :

"تب علیؓ کو اپنے بھائیوں کے بدلے میں کیوں نہ قتل کریں !"

اس طرح اس نے بہلا پھسلا کر شبیب کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ تینوں حسبِ قرار داد ۱۷ رمضان کو فجر کی نماز کے وقت مسجد میں جا کر اس دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے جہاں سے حضرت علیؓ نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوا کرتے تھے ۔ جب حضرت علیؓ نماز کے لیے تشریف لائے تو سب سے پہلے شبیب نے اپنی تلوار سے آپ پر حملہ کیا لیکن اس کی تلوار دروازہ پر جا کر لگی ۔ اس کے بعد ابنِ ملجم نے وار کیا ۔ اس کی تلوار آپ کے سر پر لگی ۔ وردان وار نہ کر سکا اور بھاگ گیا ۔

وردان نے اپنے گھر آ کر یہ واقعہ ایک شخص کو سنایا جس پر اس نے اسے قتل کر ڈالا ۔ شبیب موقع پا کر ہجوم میں گھس گیا اور بچ گیا ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ان کے قاتل کو پکڑا جائے ۔ لوگوں نے ابنِ ملجم کو پکڑ لیا اور اس کی مشکیں کس کر حضرت علیؓ کے سامنے حاضر کیا ۔

حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا:

"اے اللہ کے دشمن! کیا میں نے تجھ پر احسان نہیں کیا تھا؟"

اس نے جواب دیا:

"بے شک!"

آپ نے فرمایا:

"پھر کس بات نے تجھے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے مجبور کیا؟"

ابن ملجم نے اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا، البتہ یہ کہا:

"میں نے اپنی اس تلوار کو چالیس روز تک تیز کیا ہے، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ اس کے ذریعہ بدترین مخلوق کو قتل کروں گا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اس تلوار سے تجھی کو قتل کیا جائے گا اور دُنیا میں تُو ہی بدترین مخلوق ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:

"اگر میں فوت ہوگیا تو اس شخص کو قتل کر دینا اور اگر میں زندہ رہا تو اس سے خود ہی سمجھ لُوں گا۔"

حضرت علیؓ کی بیٹی اُمِ کلثوم نے، جو اپنے والد کی حالت دیکھ کر رو رہی تھیں، ابن ملجم سے کہا:

"اے اللہ کے دشمن! میرے باپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا اور تُو اپنے مقصد میں ناکام ہوگا۔"

ابنِ ملجم نے کہا:

"اگر تمہارے باپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا تو پھر تم رو کیوں رہی ہو؟ میں نے اپنی تلوار ایک ہزار درہم میں خریدی تھی اور ایک درہم خرچ کر کے میں نے اسے زہر میں بجھایا تھا۔ اگر اس کی ضرب تمام اہلِ شہر پر بھی پڑے تو بھی کوئی شخص زندہ نہ بچے۔"

آخری وقت جندب بن عبداللہ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور آپ سے دریافت کیا:

"کیا ہم آپ کے بعد آپ کے بیٹے حسنؓ کو خلیفہ بنالیں؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"نہ میں تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں، جو تم مناسب سمجھو، کرو۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے دونوں بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ کو بلایا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں تمہیں چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا، دنیا سے کبھی دل نہ لگانا، کسی ایسی چیز کی خواہش نہ کرنا جو تمہاری دسترس سے باہر ہو، ہمیشہ سچ بولنا، یتیم پہ رحم کرنا، بیکس کی مدد کرنا، اپنی آخرت

سنوارنے کی کوشش کرنا، ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا، مظلوم کی مدد کرنا، قرآن کریم کے احکام پر عمل کرنا، اللہ تعالیٰ کی تعمیلِ احکام کے سلسلہ میں لومۃ لائم کی پروا نہ کرنا۔"

حسنؓ اور حسینؓ کو یہ نصیحت کرنے کے بعد آپ اپنے تیسرے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"میں نے تمہارے بھائیوں کو جو نصیحتیں کی ہیں تم نے اچھی طرح انھیں گوش گزار کر لیا ہے؟"

انہوں نے کہا:

"جی ہاں!"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"تم بھی انہی نصیحتوں پر عمل کرنا۔ ساتھ ہی میں تمہیں یہ نصیحت بھی کرتا ہوں کہ تم اپنے بڑے بھائیوں کی توقیر اور تعظیم کرنا۔ کیونکہ ان کا تم پر بہت بڑا حق ہے۔ جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرنا اور ان کے کسی حکم کی بجا آوری میں دیر نہ کرنا۔"

آپ نے اپنے پسماندگان سے فرمایا:

"اے بنی عبد المطلب! خبردار، تم میرے بعد مسلمانوں کا خون بہانے کے درپے نہ ہو جانا اور میرے قاتل کے سوا کسی کو قتل نہ کرنا۔"

خاص طور پر حضرت حسنؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"حسنؓ! اگر میں مر جاؤں تو میرے قاتل کا تلوار سے ایک دفعہ ہی خاتمہ کر دینا۔ اس کا مثلہ نہ کرنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے،

"مثلہ سے بچو خواہ باؤلا کتا ہی کیوں نہ ہو۔" زخم لگنے کے دو روز بعد حضرت علیؓ نے وفات پائی۔

آپ کی وفات کے بعد حضرت حسنؓ کے سامنے ابن ملجم کو حاضر کیا گیا۔ ابن ملجم نے ان سے عرض کیا:

"میں نے خدا تعالیٰ سے خانۂ کعبہ میں عہد کیا تھا کہ میں یا تو علیؓ اور معاویہؓ کو قتل کر دوں گا یا خود مر جاؤں گا۔ عہد کا ایک حصہ تو پورا ہو گیا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں، میں معاویہ کو جا کر قتل کر آؤں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر بچ کر نکل آیا تو خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

حضرت حسنؓ نے ابن ملجم کی یہ درخواست رد کر دی اور اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ قتل کے بعد اسے آگ میں جلا دیا گیا۔

برک بن عبد اللہ بھی حسب قرارداد، اسی رات کو جس رات حضرت علیؓ پر حملہ کیا گیا۔ حضرت معاویہؓ کی گھات میں بیٹھ گیا۔ جب وہ صبح کی نماز کے لیے نکلے تو تلوار سے آپ پر حملہ کیا۔ تلوار ان کی ران میں لگی اور وہ انہیں قتل نہ کر سکا۔ برک کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں عرض کیا:

"میں آپ کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا:

"وہ کیا؟"

اس نے کہا:

"میرے ایک بھائی نے اسی رات علیؓ کو قتل کر دیا ہے۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا:

"شاید وُہ بھی تمہاری طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا ہو گا۔"

اس نے کہا:

"نہیں وہ ضرور کامیاب ہو گیا ہو گا کیونکہ علیؓ کے ساتھ پہرہ دار نہیں ہوتے۔"

برک کو تو حضرت معاویہؓ نے قتل کرا دیا اور ساعدی نامی ایک طبیب کو بلایا۔ طبیب نے زخموں کا اچھی طرح معاینہ کیا

اور کہا:

"آپ پر زہر کی بجھی ہُوئی تلوار سے حملہ کیا گیا ہے۔ میں اس کے دو ہی علاج کر سکتا ہوں، ایک تو لوہا گرم کر کے زخم کی جگہ لگاؤں یا ایک دوائی آپ کو پلاؤں۔ لیکن اس دوائی کا اثر یہ ہو گا کہ آپ کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا:

"گرم لوہے کے لگوانے کی تو مجھ میں تاب نہیں۔ باقی رہا اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جانے کا سوال تو میرے لیے یزید اور عبداللہ ہی کافی ہیں۔"

چنانچہ طبیب نے انہیں دوائی پلائی اور وہ اچھے ہو گئے۔ بعد ازاں ان کے کوئی اولاد نہیں ہُوئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت معاویہؓ نے مسجد میں مقصورہ بنانے کا حکم دیا اور پہرہ دار مقرر کیے، جو نماز پڑھاتے وقت مقتدیوں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

عمرو بن بکر بھی اسی رات حضرت عمروؓ بن العاص کی گھات میں بیٹھ گیا۔ عمروؓ بن العاص بیمار تھے اس لیے نماز کے لیے نہ آ سکے اور اپنی جگہ خارجہ بن حذافہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ چونکہ اس وقت تک روشنی نمودار نہ ہوئی تھی اس لیے عمرو بن بکر کو پتا نہ چل سکا کہ عمروؓ بن العاص کی جگہ خارجہ بن حذافہ نماز پڑھانے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے عمروؓ بن العاص کے دھوکے میں خارجہ بن حذافہ پر حملہ کر کے انھیں قتل کر ڈالا۔ لوگوں نے جھٹ اسے پکڑ لیا اور اسے حضرت عمروؓ بن العاص کی خدمت میں لے گئے

عمرو بن بکر نے لوگوں سے پوچھا:

"یہ کون ہیں؟"

لوگوں نے جواب دیا:

"عمروؓ بن العاص!"

اس نے کہا:

"میں نے کسے قتل کر ڈالا؟"

لوگوں نے کہا :

"خارجہ بن حذافہ کو۔"

اس پر وہ حضرت عمروؓ بن العاص سے کہنے لگا :

"میں نے تو اپنے خیال میں تم پر حملہ کیا تھا۔"

عمروؓ بن العاص کہنے لگے :

"تُو نے میرے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ میری جگہ خارجہ مارے جائیں۔ اچھا اب اپنے کیے کی سزا بھگت!"

انہوں نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا اور اسے فوراً قتل کر دیا گیا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ اسلام کی تاریخ کے ایک درخشندہ باب کا خاتمہ ہو گیا۔ دینی خدمات، اعلائے کلمۃ الحق، زہد و قناعت اور دنیوی عیش و آرام سے نفرت کے لحاظ سے حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر تھے۔ تفقہ فی الدین اور شریعت کی اصل روح کے علم میں آپ شیخین سے بڑھے ہوئے تھے۔ البتہ جہاں تک تدبیرِ مملکت، سیاست کی باریکیوں کو سمجھنے، قوم کے تمام حالات کا علم رکھنے، فتنہ و فساد کی تمام راہوں کو بند کرنے اور فرماں روائی کا تعلق ہے حضرت علیؓ کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو شیخین کو تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت علیؓ سے سیاست اور حکومت کے بارہ میں ایسے اقوال مروی ہیں جن پر عمل کرنے سے مملکت میں کوئی ابتری پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اصل چیز یہ ہوتی ہے کہ اقوال کو عملی جامہ پہنایا جائے اور یہ چیز حضرت علیؓ کو میسر نہ ہو سکی۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر زمانہ حضرت علیؓ کا ساتھ دیتا اور اُمت میں تفرقہ پیدا نہ ہو جاتا تو آپ اپنے عہد میں عالمِ اسلام میں عدل و انصاف کا وہ نمونہ قایم کرتے اور فتوحاتِ اسلامی کو اتنی وسعت دیتے کہ عہدِ صدیقیؓ و فاروقیؓ کا سماں لوگوں کی نظروں میں چھا جاتا۔ حضرت علیؓ کے تقویٰ اور پرہیز گاری، سادہ زندگی اور دنیوی مال و منال سے نفرت کرنے کا یہ عالم تھا کہ آپ کے انتقال کے وقت آپ کے پاس سوائے سات درہم کے اور کچھ نہ تھا۔ حالانکہ آپ کے زمانہ میں آپ کی رعایا میں ہزاروں لوگ ایسے تھے جن کے پاس ہزاروں لاکھوں درہم موجود تھے خود آپ کے مدِمقابل معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص نہایت عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن حضرت علیؓ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ آپ کا لباس اور کھانا پینا نہایت معمولی ہوتا تھا۔ دنیوی شان و شوکت کے آپ کبھی پاس بھی نہ پھٹکتے تھے۔

آپ نے سب سے پہلی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے کی۔ ان کی زندگی میں آپ نے اور کوئی شادی نہیں کی۔ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو لڑکے حسنؓ اور حسینؓ اور دو لڑکیاں زینبؓ اور اُمِ کلثوم پیدا ہوئیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد آپ نے کئی شادیاں کیں۔ آپ کے جن پانچ صاحبزادوں سے نسل کا سلسلہ جاری رہا، ان کے نام

یہ ہیں:

حسنؓ، حسینؓ، محمد بن الحنفیہؒ، عباسؓ، عمرؓ۔

(۲۷)

حضرت علیؓ کی مشکلات کے اسباب

ایک مورخ بڑی حیرت سے یہ پوچھتا ہے کہ قریش نے شیخین کی اطاعت کس طرح قبول کر لی پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ قبیلہ بنی تیم بن کعب سے تھے اور دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ بنی عدی سے۔ لیکن قریش نے نہ صرف یہ کہ ان کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان کی کامل فرمانبرداری بھی اختیار کی۔ ان کے عہد میں ساری قوم نے پوری یک جہتی کا ثبوت دیا اور کسی طرف سے بھی مخالفت کی کوئی آواز نہ اُٹھی۔ لیکن جب خلافت بنی عبد مناف کے ہاتھ آئی اور آخری دو خلیفہ قریش کے اس معزز ترین خاندان میں سے ہوئے تو پہلے خلیفہ کو اس کی زندگی کے آخری دور میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا اور قریش کی نظروں کے سامنے اس نے جامِ شہادت نوش کیا اور دوسرے خلیفہ کی ابتدا ہی سے مخالفت شروع کر دی گئی اور ساری عمر اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قریبی عزیزوں میں سے ہیں۔ ان کا خاندان جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں قریش کا سب سے برتر خاندان رہا ہے اور یہ وہ خصوصیت تھی جو پہلے دو خلفا کو حاصل نہ تھی۔ خاندانی بزرگی کے علاوہ خود حضرت علیؓ کی اپنی ذاتی شخصیت انتہائی ارفع و اعلیٰ تھی۔ علم و فضل میں آپ کا کوئی ہم پایہ نہ تھا۔ پھر یہ کیا ہوا کہ آپ کی ساری زندگی تلخیوں کا مرقع بنی رہی اور زمانہ آپ کی مخالفت پر کمر بستہ رہا!

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت علیؓ انتہائی شجاع اور بہادر انسان تھے۔ کسی خطرہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں بے دھڑک گھس جانا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ موت کی پروا آپ کو بالکل نہ تھی۔ شجاعت کا سب سے پہلا نمونہ آپ نے اس رات کو دکھایا جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی۔ آپ بالکل بے خوف ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے، حالانکہ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کی رات حضورؐ کے بستر پر لیٹنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لیکن آپ نے کوئی پروا نہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بلا چون و چرا بجا لائے۔ اس کے بعد جب جنگوں کا زمانہ شروع ہوا تو آپ نے اپنی بہادری کے ایسے حیرت انگیز نمونے دکھائے، جن کی مثال

لانے سے زمانہ قاصر ہے۔ دشمن کی جس صف کے مقابل ڈٹ جاتے تھے وہ آپ کے سامنے کھڑی نہ رہ سکتی تھی اور آپ کے حملہ کی تاب نہ لا کر تتر بتر ہونے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ فتح و کامرانی ہر دم آپ کے قدم چومتی رہتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چوبیس سال تک آپ نے اپنی تلوار کو میان میں رکھا۔ لیکن جب آپ کی خلافت کا دور آیا تو دنیا نے ایک مرتبہ پھر آپ کی تلوار کے جوہر دیکھے اور آپ کے دشمنوں پر آپ کا رعب اور آپ کی ہیبت چھا گئی۔

آپ کے علم و فضل اور تفقہ فی الدین سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ابتدا سے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور آپ سے علم قرآن حاصل کیا۔ دینی احکام کے استنباط میں آپ کو جو کمال حاصل تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اکثر اوقات آپ سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔ اگر کسی معاملہ میں حضرت علیؓ کو ان بزرگوں سے اختلاف ہوتا تھا تو بالآخر حضرت علیؓ کی رائے پر ہی فیصلہ کیا جاتا تھا۔

فصاحت و بلاغت آپ کے گھر کی لونڈی تھی اور اس میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ان صفاتِ عالیہ کے ساتھ ساتھ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت اور دامادی کا شرف بھی حاصل تھا۔ خدا تعالیٰ نے جن صفات اور جن فضائل سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا وہ ناقابلِ انکار ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے خواہ دوسرے لوگ موافقت کریں یا مخالفت۔ اسی وجہ سے وہ کسی شخص سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے اور صرف اپنی رائے پر عمل کرتے تھے۔ یہ ایسی چیز تھی جس کو قریش کے بڑے بڑے آدمی، جو اسلام میں بھی ایک خاص پوزیشن کے مالک تھے، برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

آپ کی بیعتِ خلافت کے بعد حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے یہی شکایت حضرت علیؓ سے کی اور کہا کہ وہ ان سے کوئی مشورہ لیتے ہیں اور نہ اپنے معاملات میں ان کو شریک کرنے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے روادار ہیں۔ اس شکایت کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا:

"تم نے جس بات پر اظہارِ ناراضگی کیا ہے وہ بہت معمولی ہے۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی، تمہارا کون سا حق تھا جسے میں نے تمہیں دینے سے انکار کر دیا ہو؟ یا کسی اور مسلمان کا ایسا کون سا حق تھا جو میں اسے دینے سے قاصر یا بے خبر رہا ہوں، یا میں نے اس کے ادا کرنے میں غلطی سے کام لیا ہو؟ خدا کی قسم! مجھے خلافت اور حکومت کی مطلق خواہش نہیں تھی، لیکن تم لوگوں نے مجھے خود ہی اس کی دعوت دی اور مجھے خلافت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب جبکہ میں یہ ذمہ داری قبول کر چکا ہوں تو ہر امر کے متعلق کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام تلاش کروں گا اور انہی کے مطابق عمل کروں گا۔ مجھے تمہاری یا کسی اور کی رائے کی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے کسی ایسے مسئلہ ہی کا سامنا کرنا پڑا جس کی صحیح حقیقت سمجھنے سے میں قاصر رہا اور مجھے تمہاری یا دوسرے مسلمانوں

کے مشورہ کی ضرورت پڑی۔"

جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور ہرمزان کے قتل کے سلسلہ میں عبیداللہ بن عمرؓ کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی رائے کے خلاف فیصلہ دیا اور حکم فرمایا کہ اس کی دیت ادا کی جائے۔ یہ دیت بھی آپ نے اپنے مال سے ادا کی۔ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط، بہرحال ایک خلیفہ کا فیصلہ تھا اور اس کا احترام کرنا ضروری تھا۔ لیکن جب خلافت حضرت علیؓ کے پاس آئی تو آپ نے عبیداللہ کو قتل کرنا چاہا، حالانکہ اس قضیہ کو طویل مدت گزر چکی تھی۔ عبیداللہ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بھاگ کر معاویہؓ سے مل جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جنگِ صفین کے موقعہ پر وہ حضرت علیؓ کے مقابلہ پر حضرت معاویہؓ کے بڑے بڑے سالاروں میں سے تھے۔

حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے دوران میں کئی لوگوں کو زمین کے قطعات مرحمت فرمائے تھے حضرت علیؓ نے سب واپس لے لیے۔ اس سے لوگوں میں ناراضگی کا مزید جذبہ پیدا ہوگیا گو کہ ٹھیٹھ اسلامی اصولوں کے تحت ان کا یہ اقدام غیر مناسب نہیں تھا۔

جس وقت آپ نے خلافت سنبھالی، مملکت کے مختلف حصوں کے والی قریش کے سربرآوردہ اشخاص تھے جن کی فطانت، ذکاوت اور عقلمندی میں کسی شخص کو کلام نہیں تھا۔ آپ کے خیرخواہ مشیروں نے آپ کو یہ رائے دی کہ آپ ان والیوں کو اس وقت تک معزول نہ کریں جب تک آپ کی حکومت اچھی طرح مستحکم نہ ہو جائے۔ لیکن آپ نے کسی کی ایک نہ سُنی، بلکہ سب والیوں کے نام معزولی کے احکام بھیج دئے۔ اس پر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ حضرت علیؓ کی خلافت ان کے لیے مصیبت کا پیغام لے کر آئی ہے۔ چنانچہ وہ سب آپ کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے۔

اہلِ عراق پر زبردست دباؤ کی ضرورت تھی، لیکن حضرت علیؓ نے ایسا نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر کے وہ دلیر تو ہو ہی چکے تھے اب شیر ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ کی خلافت محض انہی کی رہینِ منت ہے۔ اگر وہ ان کی مدد نہ کرتے تو حضرت علیؓ کبھی خلافت حاصل نہ کر سکتے۔ اس بنا پر وہ حضرت علیؓ کے احکام کو نظرانداز کرنے اور آپ سے اپنی مرضی منوانے لگے۔ چنانچہ جنگِ صفین کے موقعہ پر انہوں نے آپ سے کہا کہ یا تو آپ تحکیم قبول کریں، ورنہ ہم آپ کے ساتھ بھی وہی کریں گے جو پہلے حضرت عثمانؓ کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس طرح خلافت کی ہیبت اور جلال لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔

معاملہ صرف اسی حد تک نہیں رہا بلکہ آپ کے کاموں پر نکتہ چینیوں تک پہنچ گیا۔ جب آپ نے حضرت ابنِ عباسؓ کو بصرہ کا والی بنایا تو وہاں کے لوگ کہنے لگے:

"قثم بن عباس کو حجاز کا والی بنا دیا گیا۔ عبیداللہ بن عباس کو یمن کی ولایت سونپ دی گئی اور عبداللہ بن عباسؓ کو بصرہ کی حکومت دے دی گئی۔ اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم نے حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا؟"

حضرت علیؓ کی ان سے اور ان کی حضرت علیؓ سے بیزاری بڑھتی ہی چلی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلافت کی عزت اور حکومت کا ڈر ان لوگوں کے دلوں میں بالکل باقی نہ رہا۔ حضرت علیؓ انہیں اپنی مدد کے لیے بُلاتے تھے لیکن وہ چپ سادھے بیٹھے رہتے تھے اور کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ آپ انہیں پکارتے تھے اور وہ سُنی اَن سُنی کر دیتے تھے۔

آپ کے مقابل جو لشکر آتے تھے ان کی قیادت قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ وہ لشکر اپنے سالاروں
کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے تھے، لیکن حضرت علیؓ کی فوج اس صفت سے کُلی طور پر محروم تھی۔ اس طرح طرفین کے درمیان
توازن برقرار نہ رہا تھا اور حضرت علیؓ کی حالت بے بسی والی تھی۔

حضرت معاویہؓ فوج کے سالاروں اور قبائل کے سرداروں کی غلطیوں پر چشم پوشی اور عفو و درگزر سے کام لیتے تھے مزید برآں
ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کی گردنیں حضرت معاویہؓ کے سامنے جھکی رہتی تھیں۔ لیکن حضرت علیؓ
کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ والیوں اور فوج کے سالاروں سے رتی رتی کا حساب لیتے تھے، جس سے ان کے دلوں
میں ناراضگی پیدا ہوتی تھی۔ اوروں کا تو کیا ذکر ہے ان کے خاص معتمد علیہ ابن عباسؓ اسی بات پر حضرت علیؓ سے ناراض ہو گئے
اور ان کا ساتھ چھوڑ کر بصرہ سے مکہ آ گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت عمرؓ بھی اپنے عمال سے سخت محاسبہ کیا کرتے تھے۔ لیکن
حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے حالات میں بہت بڑا فرق ہے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساری اُمت تھی اور تمام عمال پر آپ کا
رعب قایم تھا لیکن حضرت علیؓ کے ساتھ ساری امت نہیں تھی بلکہ ایک اچھا خاصا حصہ آپ کے خلاف ہی تھا۔ اس وجہ سے آپ کا
رعب بھی لوگوں کے دلوں سے اُٹھ گیا تھا۔

مختصر یہ کہ حضرت علیؓ کی ناکامیوں کے بڑے بڑے اسباب یہ تھے :

۱۔ آپ کا اپنے متعلق یہ عقیدہ کہ آپ اُمت میں سب سے افضل اور خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔
۲۔ قریش کے سرداروں اور بڑے بڑے لوگوں کی رایوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنا۔
۳۔ امراء لشکر اور والیوں سے سختی سے پیش آنا اور انہیں انعام و اکرام سے محروم رکھنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ اپنی پرہیزگاری اور عفت کی وجہ سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ان حیلوں، دھوکوں اور
دوسرے ناواجب طریقوں سے کام نہیں لے سکتے تھے جن سے آپ کے دشمن آپ کے مقابلہ میں کام لے رہے تھے لیکن اس وقت
کی سیاسی حالت اتنی اضطراب انگیز ہو گئی تھی کہ جن طریقوں کو حضرت علیؓ استعمال کرنا چاہتے تھے اور کر رہے تھے ان سے کسی قسم
کے فائدہ کی امید نہ ہو سکتی تھی۔

سلطنت کے انتظام کے لیے حضرت علیؓ کی اپنے عمال کو ہدایات

سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے
حضرت علیؓ نے اپنے عمال کو جو
ہدایات دیں وہ تقریباً وہی تھیں جو آپ سے پہلے خلفاً خصوصاً حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ اپنے عمال کو دے چکے تھے۔ جب
آپ کسی شخص کو عامل بناتے تھے تو اسے نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور رعایا کے ساتھ نرمی برتنے کا حکم دیتے تھے۔
جب آپ نے اشتر نخعی کو مصر کا حاکم بنایا تو اسے مندرجہ ذیل ہدایات دیں، یہ اور بات ہے کہ وہ ان ہدایات کو عملی جامہ
نہ پہنا سکا اور مصر پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

"خراج کا اس طور پر انتظام کرنا جو صوبہ کے باشندوں کے لیے آسانی اور راحت کا موجب ہو۔ تمہاری

کوشش یہ ہونی چاہیے کہ زمینیں آباد رہیں۔ محض خراج وصول کرنا تمہارا مطمحِ نظر نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ خراج تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب زمینیں آباد رہیں۔ جو شخص باشندوں سے خراج تو وصول کرے گا لیکن زمین کی آبادی کی طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ وہ ملک میں تباہی و بربادی لانے اور باشندوں کو شدید مصیبت میں ڈالنے کا سبب ہوگا اور اس کی حکومت زیادہ دیر تک نہ چل سکے گی۔"

"تم اپنے افسروں کے کاموں پر کڑی نظر رکھو۔ جن لوگوں کو کوئی عہدہ سپرد کرو اچھی طرح جانچ پڑتال اور تجربہ کے بعد سپرد کرو۔ تمام افسروں کو اپنے کام کا تجربہ ہونا چاہیے، وہ نیک گھرانوں کے افراد ہونے چاہئیں اور اسلام میں ان کو سبقت حاصل ہونی چاہیے۔ کیونکہ ایسے لوگ ہی بااخلاق ہوتے ہیں۔ حرص کا مادہ ان میں بہت کم ہوتا ہے۔ سلطنت کے کاموں پر ان کی نظر بہت وسیع ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی تنخواہیں کافی مقرر کرو، کیونکہ کافی تنخواہیں مقرر ہونے سے وہ اپنی ظاہری حالت کو بہتر بنا سکیں گے اور رشوت وغیرہ لینے سے باز رہ سکیں گے۔ ان کے کاموں کی جانچ پڑتال اور چھان بین کے لیے قابلِ اعتبار اشخاص کو مقرر کرو جو خفیہ طور پر ان حاکموں کے کاموں کی رپورٹیں تمہیں بھجوائیں، اگر کسی حاکم کی بدعنوانیوں کا ان جاسوسوں کے ذریعہ پتا چل جائے اور وہ بدعنوانیاں پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ جائیں تو اسے بلا تامّل سزا دو۔"

جن لوگوں کو آپ صدقات و زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر کرتے تھے ان کو مندرجہ ذیل ہدایات دیتے تھے:

"جب تم اپنے کام کی انجام دہی کے لیے نکلو تو تقویٰ سے کام لو۔ کسی مسلمان کو ناحق پریشان نہ کرو اور ان کو یہ احساس نہ ہونے دو کہ تمہارے جانے سے ان پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ ان کے اموال میں سے خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ حصہ کے سوا اور کچھ وصول نہ کرو، جس قبیلہ میں جاؤ، انتہائی سکینت اور وقار سے جاؤ اور ان سے کہو:

"اے اللہ کے بندو! خدا تعالیٰ کے خلیفہ نے مجھے تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہارے اموال میں سے خدا تعالیٰ کا حق وصول کروں۔ بتلاؤ تم میں سے کون کون ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے۔"

"اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھ پر زکوٰۃ واجب نہیں تو اس کی بات کا یقین کر لو کسی شخص کو ڈرانے دھمکانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو شخص زکوٰۃ دینے پر آمادگی ظاہر کرے تو سونے چاندی کی جتنی مقدار وہ دے دے لے لو اور اس سے تکرار مت کرو۔ اگر کسی شخص کے پاس اونٹ یا بھیڑ بکریاں ہوں جن کی زکوٰۃ واجب ہو تو مالک کی اجازت کے بغیر ان جانوروں کے پاس مت جاؤ۔ کیونکہ ایک قلیل حصہ کے سوا باقی تمام مال اسی کا ہے۔ زکوٰۃ کے لیے جانور منتخب کرنے کا حق مالک کو دو۔ جو جانور وہ منتخب کرے ان پر اعتراض نہ کرو البتہ ایسے جانور نہ لو جو بہت بوڑھے ہوں، ان کا کوئی عضو ناکارہ ہو، بیمار ہوں یا ان میں کسی اور قسم کا عیب موجود ہو۔"

جہاں آپ اپنے عمال کو رعایا سے نرمی اور محبت کا سلوک کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے وہاں مجرموں کے لیے آپ کے دل میں رحم کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ آپ اس بات کو برداشت نہ کر سکتے تھے کہ سلطنت میں قانون شکنی پھیلے اور سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں رعایا کے جان و مال کو خطرہ پیدا ہو۔

آپ کی اسی خصلت کو بیان کرتے ہوئے یعقوبی لکھتا ہے:

"حضرت علیؓ نے بعض دفعہ بڑے عجیب احکام دیئے۔ زندیقوں کی ایک جماعت کو آپ نے زندہ آگ میں جلوا دیا۔ بعض دفعہ چوروں کے ہاتھوں کی انگلیوں کو کٹوا دیا۔ ایک مرتبہ دو آدمیوں کو فسق و فجور کی بنا پر ایک دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اس دیوار کو ان پر گرا دیا اور وہ دب کر مر گئے۔"

آپ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ مجرموں کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی گنجایش نہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے لوگوں کو اہلِ قبلہ سے لڑنا سکھایا۔

حضرت علیؓ کے فرمودہ احکام سے، جو اوپر بیان ہو چکے ہیں، پتا چلتا ہے کہ آپ کے پیشِ نظر وہی راستہ تھا جس پر آپ کے تینوں پیشرو گامزن تھے۔ لیکن حوادثِ زمانہ اور آئے دن کے فتنے حضرت علیؓ کے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے راستہ میں روک بن کر کھڑے ہو گئے اور مملکت کا امن باغیوں کے ہاتھوں بالکل غارت ہو گیا۔

(۲۸)

خلافت راشدہ کے عہد میں سلطنت کا نظم و نسق

حضرت صدیقِ اکبرؓ، حضرت فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کی سوانح حیات میں ہم عہدِ خلفائے راشدین کے تہذیب و تمدن، سیاستِ ملکی اور طریقِ حکومت پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس نظام کی تھوڑی سی جھلک دکھانا چاہتے ہیں جو خلفائے راشدین نے اپنے اجتماعی امور میں رائج کیا خواہ وہ اندرونی اصلاحات سے تعلق رکھتے ہیں یا بیرونی محاربات سے۔

اسلامی مدنیت کا پہلا مظہر اس سیاسی نظام کا قیام تھا جس پر امت کا کاربند ہونا ضروری تھا۔ اس غرض کے لیے خلافت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ خلافت جہاں ایک دینی ریاست تھی وہاں دنیوی ریاست بھی تھی، اس کی بنیاد دینِ اسلام پر رکھی گئی تھی اور اس کی غرض یہ تھی کہ نصوصِ قرآنیہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہر قسم کی صلاح و فلاح کی طرف اُمتِ محمدیہ کی عملی رہنمائی کرے۔

خلافتِ راشدہ میں تشریع کی بنیاد قرآنِ کریم اور سنتِ معروفہ پر تھی۔ اگر خلفاءؓ کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا جس کے بارہ میں قرآنِ کریم اور سنت میں کوئی حکم نہ ملتا تو وہ اشباہ و نظائر اور امثال پر قیاس کر کے اس مسئلہ کا حکم نکالتے تھے۔

اُمت پر خلیفہ کے احکام کی اطاعت لازم تھی۔ البتہ اس امکان کی صورت میں کہ وہ کوئی ایسا حکم دے دے جو خلافِ قرآن و

سنت ہو، اس کے احکام کی اطاعت واجب نہیں تھی۔ خلیفہ استنباط مسائل اور اجتہاد میں دُوسرے مجتہدین سے کوئی خاص امتیاز نہ رکھتا تھا۔ اکثر اوقات وہ خود اپنے اجتہاد میں دوسرے صحابہؓ سے مدد لیتا تھا اور ان کے بتائے ہوئے مسئلہ پر عمل کرتا تھا۔

خلیفہ کا انتخاب مشورہ سے کیا جاتا تھا۔ جمہوریت کی بنیاد در اصل اسی وقت سے پڑی۔

خلفائے راشدین میں شاہانہ تمکنت اور امارت کا غرور مطلق نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام آدمیوں کی طرح سمجھتے تھے اور سوائے خلافت کے ان میں اور دوسرے لوگوں میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ حضرت عمرؓ اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ آپ کے عمال اور رعایا کے درمیان کوئی روک ہو، جس سے رعایا اپنا حال احوال آسانی سے عامل تک نہ پہنچا سکے۔ خلیفہ اور رعایا کے درمیان اصل حجاب خلفائے بنی امیہ کے عہد میں پیدا ہوا۔

صیغۂ قضا

قضاء کا کام خلیفہ کے فرائض میں سے سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے خلفاء اس کام کے لیے خود اپنی طرف سے نائب مقرر کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ہر شہر کا عامل ہی قضا کا کام بھی کرتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے لیے ایک جداگانہ محکمہ قائم کر دیا اور مختلف شہروں میں قاضی مقرر کیے۔ قاضی اپنی رائے اور حکم دینے میں آزاد ہوتے تھے۔ انہیں یہ ہدایت تھی کہ جو حکم بھی وہ دیں، قرآن و سنت کے احکام کے مطابق دیں۔ علاقہ کے حاکم کا قاضی پر کوئی دباؤ یا اثر نہ ہوتا تھا۔ قاضی کی تعیین خلیفہ خود کرتا تھا۔ کبھی خلیفہ کسی شہر کے حاکم کو بھی قاضی مقرر کرنے کا اختیار دے دیتا تھا۔ قاضیوں کو بیت المال سے بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ رشوت کی طرف مائل نہ ہو سکیں۔

ذیل میں حضرت علیؓ کا ایک خط درج کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قضاۃ کے تقرر میں کتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے:

"لوگوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لیے ایسے معزز لوگوں کو مقرر کرو جن کے فیصلہ کو لوگ بلا چُون و چرا مان لیں اور کسی میں ان پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہو۔ وہ طمع سے پاک اور کسی شخص کی حیثیت سے مرعوب ہونے والے نہ ہوں۔ ہر قسم کے معاملات پر ان کی نظر گہری ہو۔ شُبہ کے موقعوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوں فریقین کے دلائل سے گھبرائیں نہیں۔ معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے انتہائی احتیاط اور غور و فکر سے کام لیں اور جب کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں تو اسے مضبوطی سے عملی جامہ پہنانے اور نافذ کرنے والے ہوں۔ کسی قسم کی سفارش اور کسی قسم کے عہدے اور مرتبہ کو اپنے فیصلوں کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں۔ اگرچہ ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ لیکن قاضی کو انہی صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ جب تم کسی شخص کو قضا کا عہدہ تفویض کرو تو اس کی تنخواہ بیش قرار مقرر کرو تاکہ اس کے اخراجاتِ زندگی اسے رشوت لینے پر مجبور نہ کر دیں۔ اس کی قدر و منزلت تمہارے دل اور تمہاری مجالس میں اتنی ہونی چاہیے کہ کوئی شخص اس کے خلاف تمہارے کان بھرنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

قاضیوں کے علاوہ ہر شہر میں ایک ایسی جماعت بھی موجود رہتی تھی، جس نے احکامِ فقہی کے استخراج اور استنباطِ احکام میں خوب ملکہ پیدا کر لیا تھا۔ جب قاضیوں کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ ان لوگوں سے مدد لیا کرتے تھے۔

اس وقت سب سے مشکل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث باقاعدہ کسی کتاب میں مدوّن نہیں ہوئی تھیں بلکہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ کسی کو کوئی حدیث یاد تھی اور کسی کو کوئی۔ ساری احادیث کسی شخص کو بھی یاد نہیں تھیں۔ جب قاضیوں کے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور انھیں اس بارہ میں حدیث کی ضرورت پیش آتی تو وہ مختلف لوگوں سے پوچھتے تھے کہ آیا انہیں اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا پتا ہے یا نہیں۔ کسی کو کوئی حدیث مل جاتی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا۔ لیکن اگر کسی کو اس قسم کی حدیث نہ مل سکتی تو وہ اجتہاد سے کام لے کر کسی دوسرے نتیجہ پر پہنچتا تھا۔ اس وجہ سے اکثر اوقات ایک ہی معاملہ کے متعلق قاضیوں کے فیصلے باہم مختلف ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ میں قاضیوں نے جو فیصلے کیے تھے ان کو بھی ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اس طرح بعد میں آنے والے قاضی اپنے پیشرووں کے فیصلوں کے علم سے محروم رہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں قضا کا سارا دارومدار محض اجتہاد پر تھا، کوئی معین قانون موجود نہیں تھا۔ لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اجتہاد صرف قانونِ شرعی کے معلوم کرنے اور اسے زمانہ کے مخصوص حالات و واقعات پر منطبق کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قانون میں تفصیل موجود نہیں ہوتی بلکہ اصولی قواعد درج ہوتے ہیں۔ وہ قوانین جو ایک مختصر عرصہ کے لیے نہیں بلکہ مدتِ دراز تک کے لیے ہوں یقیناً ایسے ہی ہونے چاہئیں تاکہ انہیں ہر زمانہ میں اور ہر جگہ استعمال کیا جا سکے۔

قضاۃ کے تقرر کے باوجود خلفاً اس امر کے پابند نہیں تھے کہ وہ خود بھی رعایا کے باہمی جھگڑوں پر غور و فکر کر کے ان کا فیصلہ نہ کر سکیں۔ بسا اوقات خلفاً جھگڑوں کا فیصلہ خود ہی کر دیا کرتے تھے۔ قاضی صرف نائبین کا کام سرانجام دیتے تھے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے، قاضیوں کے پاس فیصلوں کے اندراج کے لیے کسی قسم کا رجسٹر موجود نہیں ہوتا تھا، اور نہ فیصلوں کی نقلیں ہی فریقین کو دی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تنفیذ کا سارا کام بھی قاضی ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہی فیصلہ سناتا تھا اور وہی فیصلہ کا نفاذ کرتا تھا۔ اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ قاضیوں کو فیصلہ کی تنفیذ میں کوئی دقت پیش آئی ہو۔ کیونکہ جونہی وہ حکم سناتا تھا محکوم علیہ فوراً اس کے فیصلہ کی تعمیل کر دیتا تھا۔ اس طرح فریقین کی حیثیت محض مستفسر کی ہوتی تھی۔ جب ان کو اپنے معاملہ میں ماضی سے کسی شرعی حکم کا پتا چل جاتا تھا وہ بلا چون و چرا اس حکم کی تعمیل کر دیتے تھے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں قاضیوں کا کام صرف باہمی جھگڑوں کو طے کرانا اور ان کے متعلق فیصلے صادر کرنا تھا۔ قصاص اور حد کا اجرا صرف خلیفہ یا صوبہ کے امرا کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کسی قاضی کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نے کسی شخص کو قتل کے الزام میں سزا دی ہو یا چوری کرنے اور شراب پینے کی وجہ سے حد لگائی ہو۔ تمام تادیبی سزائیں، جن میں قید کرنا بھی شامل تھا، صرف خلیفہ یا اس کے نائب صوبہ کے امیر کے حکم سے دی جا سکتی تھیں۔ اس طرح قضا کا دائرہ

بہت تنگ تھا۔

یہ امر بھی ثابت نہیں ہے کہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں قاضی مقرر کیے گئے ہوں۔ قاضی صرف بڑے بڑے شہروں میں مقرر کئے جاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں باہمی تنازعات بہت کم ہوتے تھے۔

صیغہ دفاع لشکروں کی اصل قیادت خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور خود فوجوں کی قیادت فرمایا کرتے تھے، لیکن جب سلطنت کے کاموں نے وسعت اختیار کی تو خلفا اپنی جگہ ایسے لوگوں کو جو بہادری میں یکتا اور شجاعت میں طاق ہوتے تھے، سپہ سالار مقرر کرنے لگے۔ ان کی اطاعت اسی طرح واجب تھی جس طرح خلیفہ کی اطاعت واجب تھی۔ فتح کے بعد جب حالات پُرسکون ہو جاتے تھے تو ان سپہ سالاروں کی ذمہ داری فوج کے امور کی نگہداشت اور آیندہ کے لیے انہیں جنگ کی ٹریننگ دینے تک محدود ہو جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ساری فوج رضا کارانہ تھی۔ اس کے نام کسی رجسٹر میں درج نہیں تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وقت میں سب سے پہلے سپاہیوں کے نام درج رجسٹر کیے گئے۔ اس طرح باقاعدہ فوج کی صورت پیدا ہوئی۔ فوجیوں کے نام درج رجسٹر کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اگر کوئی سپاہی فوج سے بھاگ جاتا تھا یا پیچھے رہ جاتا تھا تو فوراً اس کے نام کا پتا چل جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے حضرت عمرؓ نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ اسے اس کے قبیلہ کی مسجد میں کھڑا کر کے یہ اعلان کر دیا جاتا تھا کہ یہ شخص فوج سے بھاگا ہوا ہے یا اس نے جہاد سے جان چرائی ہے۔ یہ توبیخ اعراب کی نظروں میں گردن اُڑا دینے سے بھی زیادہ سخت تھی۔ کیونکہ انہوں نے اقوامِ عالم میں اپنی بے نظیر شجاعت اور حیرت انگیز دلیری کی وجہ سے جو نام پیدا کیا ہوا تھا، اس کے پیشِ نظر کسی شخص پر بزدلی کا الزام لگنا اور وہ بھی اس طرح علانیہ، اس کے لیے موت سے بھی زیادہ سخت تھا۔ یہ الزام لگنے کے بعد اس شخص کو کسی محفل میں مُنہ دکھانے کی جگہ نہ رہتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام فوجیوں کی بیت المال سے تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔ اس سے پہلے ان کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں بلکہ مالِ غنیمت میں جو کچھ آتا تھا وہ ان میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں تمام فوجیوں کی تنخواہیں یکساں نہ تھیں بلکہ اسلامی فضیلت کے لحاظ سے ان کی تنخواہیں مختلف رکھی گئی تھیں۔ البتہ حضرت علیؓ نے اپنے عہد میں تنخواہوں کے فرق کو مٹا کر تمام فوجیوں کی یکساں تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔

ہر لشکر میں ہر دس آدمیوں پر ایک "عریف" مقرر ہوتا تھا۔ تمام لشکر کی تنخواہیں "عریفوں" کے سپرد کر دی جاتی تھیں وہ انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

لشکروں کی تنظیم میں خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں بہت ترقی ہوئی۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ دشمن کے سامنے کبھی بے ترتیب اور کبھی صف بند ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے دونوں طرف سے ایک ایک دو دو بہادر نکل کر لڑتے تھے، پھر عام حملہ کرتے تھے، پھر بھاگتے تھے۔ پھر پلٹ کر بغیر کسی نظام اور ترتیب کے دشمن پر حملہ کرتے تھے۔

جب مسلمانوں کو ایران اور شام کی منظم افواج کا مقابلہ کرنا پڑا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ پُرانا فوجی نظام اُن منظم قوموں کے مقابلہ میں کام نہیں دے گا۔ اس لیے انھوں نے نئے سرے سے اپنی فوجوں کو ترتیب دیا۔ باقاعدہ صفیں منظم کی جاتیں کوئی شخص صفوں سے آگے پیچھے نہ ہو سکتا تھا۔ لشکر کو پانچ دستوں میں منقسم کیا جاتا۔ وُہ دستہ جو سب سے آگے ہوتا تھا اسے "مقدمہ" کہا جاتا تھا۔ یہ دستہ سب سے پہلے لڑائی شروع کرتا تھا۔ درمیانی دستہ کو "قلب" کہا جاتا تھا۔ امیر لشکر اسی دستہ میں ہوتا تھا۔ دائیں دستہ کا نام "میمنہ" اور بائیں دستہ کا نام "میسرہ" تھا۔ پچھلے دستہ کو "ساقہ" کہا جاتا تھا۔

جب لشکر ان پانچوں دستوں پر مشتمل ہوتا تھا تو اسے "خمیس" کہا جاتا تھا۔ پانچوں دستوں کے علٰحدہ علٰحدہ امیر بھی ہوتے تھے، جو سالارِ لشکر کے احکام کے مطابق اپنے دستہ کو حرکت میں لاتے تھے۔ سواروں کا خاص طور پر ایک علٰحدہ امیر ہوتا تھا۔ خطِ رجعت کی حفاظت کے لیے بھی مسلمان خاص اقدام کرتے تھے تاکہ دشمن موقعہ پا کر پیچھے سے ان پر نہ ٹوٹ پڑے رات کو بھی لشکر کی حفاظت اور دشمن کے شبخون سے بچنے کے لیے خاص طور پر انتظامات کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں کا جاسوسی نظام بھی بہت اعلیٰ تھا اور دشمن کے بیشتر ارادوں کا انہیں پہلے سے علم ہو جایا کرتا تھا۔

محاصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد سے خراج کی وصولی کے لیے مستقل اور جداگانہ عامل مقرر کیے جاتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ صوبوں کے امرا کو خراج کا انتظام سپرد کیا گیا ہو۔ جو خراج وصول ہوتا تھا اسے خلیفہ کے احکام کے تحت فوج کی تنخواہ اور مصالح عامہ کے دوسرے کاموں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ جو رقم بچ جاتی تھی اسے دارالخلافہ بھیج دیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں محصول کی دو قسمیں تھیں:

۱۔ مستقل

۲۔ غیر مستقل

مستقل محصول خراج، زکوٰۃ، عشر اور جزیہ تھے اور غیر مستقل مالِ غنیمت۔

خراج: جن زمینوں پر مسلمان جنگ کے بعد قابض ہو گئے تھے وہاں کی تمام زمینیں ان کے مالکوں ہی کے ہاتھوں میں رہنے دی گئی تھیں۔ البتہ پیداوار کے لحاظ سے ان پر کچھ مالگزاری مقرر کر دی گئی تھی۔ اس مالگزاری کو خراج کہتے تھے۔ اور یہ زمین کے کرایہ کے طور پر لیا جاتا تھا۔ اس کی دو صورتیں تھیں، یا تو رقم معین کر دی جاتی تھی، جیسا حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق میں کیا تھا، یا پیداوار کا کوئی حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔

عشر: جن زمینوں کے مالکوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یا جس سرزمین پر مسلمان قابض ہو گئے تھے لیکن وہاں کے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا (مثلاً عرب کے بُت پرست) ایسی زمینیں عشری کہلاتی تھیں اور ان کی پیداوار کا دسواں حصہ حکومت وصول کر لیا کرتی تھی۔ عشری زمینوں میں وہ زمینیں بھی شامل تھیں جن پر مسلمان بزور قابض ہو گئے تھے اور انہیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس طرح وُہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی تھیں۔

جب حضرت عمرؓ کے عہد میں سوادِ عراق اور شام فتح ہوا تو آپ نے مفتوحہ زمینوں کے متعلق اپنے مشیروں سے رائے دریافت فرمائی۔ اکثر نے یہی رائے دی کہ ان زمینوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"اس صورت میں آئندہ آنے والی نسلوں کی حق تلفی ہوگی۔ کیونکہ اگر اس وقت زمینیں تقسیم کر دی گئیں تو ان کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

اس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بولے :

"زمین اور لونڈی غلام انہی لوگوں کو مل سکتے ہیں جن کی قوتِ بازو سے شہر فتح ہوئے۔ دوسرے لوگ منفعت کس طرح پا سکتے ہیں ؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا :

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یاد رکھو میرے بعد کبھی اس قدر فتوحات نہیں ہوں گی جن میں مسلمانوں کو اس قدر مال و دولت اور زمین ہاتھ آئے جس قدر اب آ رہی ہے۔ اکثر فتوحات بجائے فائدہ کے مسلمانوں پر بوجھ ہوں گی۔ اگر عراق اور شام کی زمینوں کو ان کے مالکوں کے ہاتھوں سے چھین کر اور مفتوحین کو غلام بنا کر مسلمان فاتحین میں تقسیم کر دیا جائے تو سرحدوں کی حفاظت کس طرح کی جا سکے گی۔ کیونکہ مسلمان تو کاشتکاری میں مشغول ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ یتیموں اور بیواؤں کی نگہداشت بھی نہیں ہو سکے گی۔"

حضرت عمرؓ کی اس تصریح کے باوجود لوگوں نے یہی کہنا شروع کیا کہ دوسرے لوگوں کو، جو ان جنگوں میں حاضر نہیں ہوئے اور ان کی اولادوں کو، ان زمینوں سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے۔ حق صرف ہمارا ہے جنہوں نے اپنی تلواروں سے ان ملکوں کو فتح کیا ہے۔

آخر حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ کے متعلق مہاجرینؓ اور انصارؓ سے باقاعدہ مشورہ لینا چاہا۔ سب سے پہلے آپ نے مہاجرین اولینؓ سے اس بارہ میں رائے دریافت کی۔ مہاجرینؓ کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تو برابر مُصِر تھے کہ یہ زمینیں فاتح مسلمانوں کا حق ہیں اور انہی میں تقسیم کر دینی چاہئیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ حضرت عمرؓ کی رائے کے حامی تھے۔

مہاجرین سے مشورہ لینے کے بعد حضرت عمرؓ نے دس جلیل القدر انصاری صحابہؓ کو بلا بھیجا ان میں سے پانچ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور پانچ قبیلہ خزرج سے۔ جب یہ بزرگ جمع ہو گئے تو آپ کھڑے ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

"میں نے آپ لوگوں کو ایک اہم معاملہ پر غور و خوض کرنے کے لیے تکلیف دی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ لوگ ضرور میری رائے پر ہی صاد کریں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ موجود ہے جس کی مدد سے آپ خود صحیح رائے پر پہنچ سکتے ہیں۔"

انہوں نے کہا :

"فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"آپ لوگوں نے ان لوگوں کی باتیں سُن لی ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے ان کے حقوق پر چھاپہ مارا ہے۔ لیکن میں اس امر سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی چیز، جس پر عام مسلمانوں کا حق ہو، ان سے چھین کر دوسرے لوگوں کو دے دوں جن کا اس پر حق نہیں ہے، تو واقعی میں بہت بڑا ظالم ہوں لیکن یہاں یہ بات نہیں۔ مجھے یہ بات دکھائی دے رہی ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کی فتح کے بعد ایسی عظیم الشان فتح اب مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوگی۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں ان لوگوں کے اموال اور زمینیں عطا کی ہیں ہم ان لوگوں سے جس قسم کا چاہیں سلوک کر سکتے ہیں۔ میں نے خمس نکال کر باقی مالِ غنیمت تو فاتح مسلمانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ زمین کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ میں اسے ملک کے باشندوں کے پاس ہی رہنے دوں اور اس کے بدلہ ان پر خراج عائد کر دوں۔ اس طرح جو کچھ خراج وصول ہوگا وہ درحقیقت مسلمانوں کی فوجوں، ان کی اولادوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بطور غنیمت کے ہوگا۔ کیا آپ لوگوں کی نظریں ان وسیع سرحدوں کی طرف نہیں جاتیں؟ ضروری ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو ان کی حفاظت کریں۔ ان علاقوں کی حفاظت کے لیے یہاں فوجیں متعین رہنی ضروری ہیں اور فوجوں کا خرچ بھی لازمی ہے۔ اگر یہ زمینیں تقسیم کر دی گئیں تو مسلمان کھیتی باڑی میں مشغول ہو جائیں گے۔ پھر ان علاقوں کی حفاظت کے لئے فوجوں کا انتظام کیسے ہوگا؟ اور اگر ہو گیا تو ان کے لئے خرچ کہاں سے آئے گا؟"

حضرت عمرؓ کی یہ تقریر سُن کر سب لوگوں نے متفقہ طور پر کہا :

"واقعی آپ کی رائے بالکل ٹھیک ہے۔ اگر یہ سرحدیں اور یہ شہر فوجوں سے خالی ہو گئے تو ان علاقوں کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہو سکے گا اور کافر دوبارہ ان شہروں پر مسلط ہو جائیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا :

"یہ معاملہ تو صاف ہو گیا۔ اب مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو سارے عراق کی پیمائش کر سکے تاکہ خراج کا تعین ہو سکے۔

لوگوں نے اس کام کے لیے عثمان بن حنیف کا نام لیا۔ چنانچہ آپ نے انہیں عراق کی پیمائش کا کام سپرد کیا۔ عثمان بن حنیف نے یہ کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا۔ پیمائش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک سال قبل سوادِ کوفہ کا خراج ایک [illegible] درہم تک پہنچ گیا۔

جب شام فتح ہوا تب بھی لوگوں نے حضرت عمرؓ سے یہی مطالبہ کیا کہ اس کی زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جا[illegible]۔ مطالبہ کرنے میں سب سے پیش پیش حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت بلالؓ بن ابی رباح تھے۔ اس وقت بھی حضرت [illegible] یہی جواب دیا :

"اگر ایسا کر دیا گیا تو بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا۔"

چنانچہ آپ نے عراق کی طرح شام کی زمینیں بھی وہاں کے باشندوں کے پاس ہی رہنے دیں اور اس کے [illegible] خراج وصول کیا جانے لگا۔

حضرت عمرؓ کی یہ رائے کہ مفتوحہ علاقہ کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہ کی جائیں بلکہ انہیں ملک کے باشندوں کے پاس ہی رہنے دیا جائے کہ وہ ان میں کاشت کریں اور ان کا خراج ادا کریں، نہایت دُور اندیشی پر مبنی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمان اپنے اصلی فرض کو بھول کر کھیتی باڑی میں مشغول ہو جاتے۔ سپہ گری کا فن ان کے ہاتھوں سے جاتا رہتا۔ دوسری بڑی خرابی یہ ہوتی کہ اس علاقے کی حفاظت کرنے والی اور دوسرے ملکوں میں لڑنے والی اسلامی فوجوں کے اخراجات کا کہیں سے انتظام نہ ہو سکتا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ایرانی اور رومی سردار جو ان علاقوں پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد دوسرے علاقوں میں بھاگ گئے تھے، دوبارہ اپنے علاقوں پر قابض ہو جاتے اور مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔

جزیہ: جزیہ وہ رقم تھی جو ذمیوں سے ان کی حفاظت کے بدلہ اور ان کو دشمنوں سے بچانے کے معاوضہ میں وصول کی جاتی تھی۔ یہ رقم صرف بالغ اور تندرست مردوں سے وصول کی جاتی تھی۔ عورتیں، بچے، مفلس اور اپاہج اس سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت عمرؓ نے تو بعض مفلس ذمیوں کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر کر دیا تھا۔ جزیہ مردکی مالی حالت کے مطابق لگایا جاتا تھا۔ اس کی مقدار ۱۲ درہم سے کم اور ۴۸ درہم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ذمیوں سے نیکی کرنے، ان سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے، ان کی حفاظت کے لیے لڑنے اور انہیں ان کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہ دینے کی وصیت بھی کر دی تھی۔

زکوٰۃ: مسلمانوں کے ہر قسم کے اموال چرنے والے مویشیوں، نقدیوں اور زمین کی پیداوار پر قرآن مجید کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے مطابق زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔

عشور: مسلمان تاجر جب اپنا مال لے کر روم کے شہروں میں جایا کرتے تھے تو ان سے مال کا دسواں حصہ بطور محصول وصول کیا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا پتا چلا تو آپ نے حکم دیا کہ جو رومی تاجر ہمارے ملک میں مال لے کر آئیں ان سے بھی اسی قدر محصول وصول کیا جائے جتنا وہ ہمارے تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذمی تاجروں سے نصف عشر اور مسلمان تاجروں سے مال و اسباب کا چالیسواں حصہ وصول کیا جائے گا۔ البتہ اگر دو سو درہم سے کم قیمت کا مال ہو تو اس میں سے کچھ وصول نہ کیا جائے۔

زیاد بن حدیر عشور کے نگران مقرر کیے گئے تھے۔ ایک مرتبہ بنی تغلب کا ایک عیسائی تاجر ایک گھوڑا لے کر آیا۔ انہوں نے گھوڑے کی قیمت بیس ہزار درہم لگائی اور اس سے ایک ہزار درہم وصول کر لیے۔ سال کے اندر ہی وہ تاجر وہی گھوڑا لے کر پھر گزرا انہوں نے پھر اس سے ایک ہزار درہم کا مطالبہ کیا۔ تاجر نے کہا:

"ایک بار آپ مجھ سے ایک ہزار درہم لے چکے ہیں۔ کیا جس بار بھی میں گزروں گا آپ مجھ سے ایک ہزار درہم وصول کریں گے؟"

زیاد نے کہا:

"بے شک!"

وہ تغلبی تاجر حج کے موقع پر حضرت عمرؓ سے مکہ میں ملا اور ان کو سارا قصہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے صرف اتنا فرمایا:

میں اس کا بندوبست کروں گا۔
اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہا۔ وہ یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ نے سرسری بات کہہ دی ہے۔ اب پھر ایک ہزار درہم دینے ہوں گے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے جب وہ واپس سرحد پر پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ کا حکم عامل کو پہنچ چکا تھا جس میں لکھا تھا کہ جس چیز پر ایک بار عشور وصول کر لیا جائے اگلے سال کی اسی تاریخ تک دوبارہ اس پر کچھ نہ لیا جائے سوائے اس کے کہ اس چیز کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔

اس پر اس نصرانی نے زیاد سے کہا کہ میں ارادہ کر کے آیا تھا کہ ایک ہزار درہم ادا کروں گا اب میں اقرار کرتا ہوں کہ میں اس شخص کے دین پر ہوں جس نے تجھے یہ حکم بھیجا ہے۔

بعد میں بھی مسلمانوں نے تعشیر کا وہی طریقہ رائج رکھا جو حضرت عمرؓ نے مقرر کیا تھا۔

سکہ عرب میں اسلام سے قبل سونے اور چاندی کے ایرانی اور رومی سکے رائج تھے۔ ان کا اپنا سکہ کوئی نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی یہی سکے چلتے رہے۔ ایران کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے چاہا کہ درہم کا وزن مقرر کیا جائے۔ کیونکہ ایرانی سکے مختلف وزن کے ہوتے تھے۔ بعض درہم بیس قیراط کے، بعض بارہ قیراط کے اور بعض دس قیراط کے۔ حضرت عمرؓ نے ان تینوں اوزان کا مجموعہ لے کر اس کا ثلث یعنی ۱۴ قیراط درہم کا وزن قرار دیا۔ اس طرح دس درہم کا وزن سات مثقال ہو گیا۔

مقریزی کہتا ہے کہ ۱۸ھ میں کسروی دراہم کے نمونے پر درہم ڈھالے گئے۔ بعض کا نقش الحمد للہ، بعض کا نقش محمد رسول اللہ اور بعض کا نقش لا الہ الا اللہ قرار دیا گیا۔ بعض پر عمر لکھ دیا گیا۔ ہر دس دراہم کا وزن سات مثقال قرار دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب دراہم ڈھالے گئے تو ان پر صرف اللہ اکبر کے الفاظ ہی کندہ کیے گئے۔

بعض مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض امراء نے رومی دیناروں کی طرز پر بھی سکے ڈھالے اور اپنے نام ان پر کندہ کرائے۔

قرآنِ کریم اس فصل کا اختتام ہم قرآنِ کریم کے ذکر پر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزول سے پہلے عرب جاہل محض تھے لیکن قرآنِ کریم کے نزول کے بعد اس کی ترویج اتنی زبردست ہوئی کہ قرآنِ کریم کی آیات ہر شخص کی زبان پر رہنے لگیں۔ ہر گھر میں اس کی تلاوت کی جانے لگی۔ خلفاءِ راشدین کے عہد میں سوائے قرآنِ کریم کے اور کوئی علم مدوّن نہیں ہوا، حتیٰ کہ احادیث کی تدوین بھی نہیں کی گئی۔

(۲۹)

حضرت علیؓ کی ادبی شخصیت

حضرت علیؓ کی شخصیت پر تاریخ نے بڑے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں، جس سے آپ کے صحیح خدوخال متعین کرنا بہت

مشکل ہوگیا ہے۔ جہاں دشمنوں نے آپ کی سیرت کو مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہاں معتقدین نے بھی آپ کی مبالغہ آمیز مدح و توصیف میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

البتہ آپ کے اقوال، آپ کے خطبات اور آپ کے احکام پر نظر ڈالنے سے آپ کی حقیقی شخصیت معلوم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حیرت انگیز دماغ ودیعت ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہونے اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کا پُرمعارف کلام سُنتے رہنے کی وجہ سے فصاحت و بلاغت آپ کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ آپ کی زبان مبارک سے ہر وقت فصاحت و بلاغت کے چشمے پھوٹتے رہتے تھے۔ حکمت آپ کے گھر کی لونڈی تھی اور خطابت میں کوئی شخص آپ کا ہم پلہ نہ تھا۔ کوئی بھی موضوع کیوں نہ ہو آپ بے تکان اس پر گھنٹوں لیکچر دے سکتے تھے۔ لوگوں کو جہاد پر ابھارنے کے لیے آپ کے خطبے، حضرت معاویہؓ کے نام آپ کے خطوط، امرا اور عمال کے متعلق آپ کے احکام عربی ادب کے معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نہج البلاغہ

حضرت علیؓ کی بہترین ادبی یادگار "نہج البلاغہ" ہے۔ نہج البلاغہ ان خطبوں، خطوط اور مواعظ کا مجموعہ ہے جو حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں وقتاً فوقتاً دیے۔ ان خطبوں، خطوط اور مواعظ کو شریف رضی نے مرتب کر کے کتابی صورت دی تھی اور اس مجموعہ کا نام "نہج البلاغہ" رکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ سب کا سب حضرت علیؓ کا فرمودہ نہیں ہے۔ ایسے لوگوں میں سب سے پیش پیش ابن خلکان ہے۔ ابن خلکان کی تقلید میں بعض دوسرے لوگوں نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ نہج البلاغہ کا اکثر حصہ حضرت علیؓ ہی کے فرمودات اور ارشادات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب آپ کی زندگی، آپ کے عہدِ خلافت، آپ کی جنگوں اور غزوات اور آپ کی دنیا سے بے رغبتی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض خطب و رسائل غلط طور پر حضرت علیؓ سے منسوب ہیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "نہج البلاغہ" میں آپ کے جو خطبات اور رسائل درج کیے گئے ہیں ان سے حضرت علیؓ کی رفیع الشان شخصیت، جو ایمان و یقین سے بھرپور اور حق و صداقت کے سلسلہ میں انتہائی مضبوط تھی، ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مسعودی "نہج البلاغہ" کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں تقریباً پانچ سو خطبات دیے تھے لوگ ان خطبات کو زبانی یاد کر لیتے تھے۔ یاد کرنے کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ کئی سو سال تک چلتا رہا۔ آخر شریف رضی نے آپ کے تمام خطبوں، مواعظ اور رسائل کو کتابی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام "نہج البلاغہ" رکھا۔ شریف رضی اس کتاب کی تالیف سے ۴۰۰ھ میں فارغ ہوا۔ اس نے ہر باب کے آخر میں کچھ خالی صفحات اس غرض سے چھوڑ دیے تھے کہ اگر بعد میں کچھ معلوم ہو تو اسے اپنے موقعہ اور محل پر درج کر دیا جائے۔ شریف رضی حضرت علیؓ کی نسل ہی میں سے تھا وہ ۳۵۹ھ/۹۶۹ء میں پیدا ہوا اور ۴۰۶ھ میں وفات پائی، اسے مرتضیٰ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس کا شمار اس زمانے کے مشہور ادیبوں میں تھا۔ نہج البلاغہ کے علاوہ اس نے اشعار کا ایک دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

نہج البلاغہ کی تالیف کے بعد علماء، فقہاء اور ادباء کی ایک جماعت نے اس کتاب کی شرحیں لکھنے کی طرف اپنی توجہات

مبذول کیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک اس کی چھبیس شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ قدیم شارحین میں سے سب سے مشہور شخص عبدالحمید بن ابی الحدید معتزلی ہیں۔ وہ سنہ ۱۱۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۵۸ء میں وفات پائی۔ ان کی شرح بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ متاخرین میں سب سے مشہور شارح مصر کے علامہ مفتی محمد عبدہٗ ہیں، آپ نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔

شریف رضی کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"حضرت علی علیہ السلام کا تمام کلام تین اصناف پر مشتمل ہے:

۱۔ خطبات و اوامر

۲۔ خطوط و رسائل

۳۔ حکم و مواعظ

میں نے بھی اسی ترتیب سے اپنی کتاب میں سب سے پہلے آپ کے خطبات کو درج کیا ہے، ان کے بعد آپ کے خطوط کو اور آخر میں آپ کے حکیمانہ اقوال کو۔"

علامہ مفتی محمد عبدہٗ نہج البلاغہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک خطیب اور ایک ادیب کے کلام میں جتنی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس میں ادبی پیرایہ میں مدح بھی ہے اور ذم بھی۔ نیک باتوں کی ترغیب بھی ہے اور بری باتوں سے نفرت کا اظہار بھی۔ سیاسی چپقلش کے نمونے بھی ہیں اور جنگ و جدل کا حال بھی۔ رعایا پر حاکم کے حقوق کی تفصیل بھی ہے اور حاکم پر رعایا کے حقوق کا بیان بھی۔ شہریت کے اصول بھی درج ہیں اور عدالت کے قواعد بھی۔ شخصی نصائح بھی ہیں اور عمومی مواعظ بھی۔ مختصر الفاظ میں اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے کلام سے کمتر اور بندوں کے کلام سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

حضرت علیؓ کی جانب ایک دیوان بھی منسوب کیا جاتا ہے جو پندرہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن اکثر مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے دو اشعار کے سوا اور کوئی شعر نہیں کہا۔

نہج البلاغہ میں درج کیے جانے والے خطوط اور حکیمانہ اقوال کے علاوہ بعض اور خطوط اور حکیمانہ اقوال بھی آپ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں لیکن ان کے بارہ میں مؤرخین کو شک ہے کہ آیا وہ واقعی حضرت علیؓ ہی کے ہیں یا دوسروں کے اقوال آپ کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔

ہم نے اس فصل میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے قارئین کو اس وقت تک حضرت علیؓ کی ادبی شخصیت کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک آپ کے خطبوں، خطوط و رسائل اور حکیمانہ اقوال کے کچھ نمونے ان کے سامنے پیش نہ کیے جائیں۔ اس غرض سے صفحاتِ آئندہ میں آپ کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، اسے پڑھ کر حضرت علیؓ کی ادبی، مذہبی اور سیاسی شخصیت کا کافی حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

(۳۰)

حضرت علیؓ کے خطبات

حضرت معاویہؓ کے حکم سے سفیان بن عوف الغامدی نے انبار پر چڑھائی کی تھی، اس موقع پر حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کے سامنے مندرجہ ذیل خطبہ پڑھا تھا اور انھیں دشمن کا مقابلہ کرنے کی غیرت دلائی تھی۔ آپ نے فرمایا :

"یاد رکھو جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جس شخص نے جان بوجھ کر اس سے روگردانی کی اللہ تعالیٰ اسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔ مصائب کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑے گا۔ خواری کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا اور اسے اپنے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ میں تمہیں شامیوں سے لڑنے کے لیے شب و روز بلاتا رہا، میں تم سے بار بار کہتا رہا کہ قبل اس کے کہ یہ لوگ تم پر حملہ کریں تم ان پر چڑھائی کر دو۔ کیونکہ جس قوم پر حملہ کیا جاتا ہے اور جس کے علاقہ میں اس کے دشمنوں کے پاؤں پہنچ جاتے ہیں وہ ذلیل اور رسوا ہوئے بغیر نہیں رہتی لیکن تم نے میری بات پر مطلق کان نہ دھرا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ میری نصیحتیں تمہیں گراں گزرتی تھیں اور میری باتوں کو تم ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ اس لاپروائی کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ اب تمہارے سامنے ہے۔ تمہارے علاقہ پر دشمن نے چڑھائی کر دی۔ سفیان بن عوف غامدی کے گھوڑے انبار تک پہنچ گئے اور تمہیں اپنے گھوڑوں کو پیچھے ہٹاتے ہی بن پڑی۔ تمہارے کئی بہادر جان سے مارے گئے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ان لوگوں نے مسلمان اور ذمی عورتوں کے کنگن، پازیب اور بالیاں تک اتار لیں۔ انہوں نے قتل و غارت گری کا بازار خوب گرم کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس گئے لیکن ان کے کسی آدمی کو خراش تک نہ آئی۔ اس کے بعد اگر کوئی مسلمان افسوس اور رنج کے مارے اپنی جان گنوا دیتا ہے تو میرے نزدیک وہ ملامت کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی موت کا قرار واقعی مستحق ہے۔ کیا ہی تعجب ہے کہ ایک قوم باطل پر ہونے کے باوجود، اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے پوری جدوجہد کرتی ہے اور تم حق پر ہونے کے باوجود بزدلی دکھاتے ہو۔ افسوس تم دشمنوں کا نشانہ بن گئے، جس پر وہ جی بھر کر تیر چلاتا ہے۔ تم مالِ غنیمت بن گئے جس کو وہ جی بھر کر لوٹتا ہے لیکن تمہاری غیرت کی حس بالکل مردہ ہو چکی ہے۔ تمہارے علاقہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ لیکن تم خاموش بیٹھے رہتے ہو۔ تم پر چڑھائی کی جاتی ہے لیکن تم میں دشمن کا مقابلہ کرنے کا ولولہ بالکل پیدا نہیں ہوتا۔ علی الاعلان اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے لیکن تمہارے دلوں میں قطعاً درد پیدا نہیں ہوتا۔ جب میں تمہیں گرمی میں شام کی طرف کوچ کرنے کو کہتا ہوں تو تم یہ عذر کر دیتے ہو کہ اب سخت گرمی ہے۔ ہمیں کچھ مہلت دیجئے۔ جب گرمی گزر جائے گی تب ہم چلیں گے۔ لیکن

جب سردی آتی ہے تو تم سخت سردی کا عذر کر کے کہہ دیتے ہو کہ ہمیں مہلت دیجئے، جب سردی گزر جائے گی تب ہم چلیں گے۔ نہ تم گرمی کی تاب لا سکتے ہو نہ سردی کی۔ جب تمہاری یہ حالت ہے کہ تم گرمی اور سردی تک سے بھاگتے ہو تو خدا کی قسم تلوار سے تو ضرور ہی بھاگو گے۔ اے وہ لوگو! جو مردوں کے مشابہ ہو لیکن مرد نہیں ہو، میری خواہش ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے تمہارے درمیان سے اٹھا لے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری صورتیں بھی مجھے دکھائی نہ دیں اور مجھے تم سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو۔ خدا کی قسم میں ندامت سے حیران ہوں۔ تم نے میرے دل کو غیظ و غضب سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے موت کے گھونٹ پلانے چاہے ہیں۔ تم نے مجھ سے سرکشی کر کے، میرے احکام کی سرتابی کر کے اور مجھے چھوڑ کر میری تمام تدابیر کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اسی وجہ سے قریش یہ کہنے لگے کہ ابن ابی طالب شجاع تو ہے لیکن اسے جنگ کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ جنگ کا ماہر اور تجربہ کار نہیں ہے جتنا لمبا تجربہ جنگ کا مجھے حاصل ہے اور کسی شخص کو حاصل نہیں۔ میں ابھی بیس برس کی عمر کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ مجھے جنگ کی پوری مہارت حاصل ہو گئی تھی اب میں ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں، لیکن جب تک کسی رائے اور تجربہ پر عمل نہ کیا جائے محض رائے اور تجربہ کا کوئی فائدہ نہیں۔"

ایک خطبہ میں اپنے دشمنوں کا بایں الفاظ ذکر کرتے ہیں:

"انہوں نے اپنے کاموں میں شیطان کو شریک بنا لیا ہے۔ شیطان نے ان کے سینوں میں انڈے بچے دئے ہیں اور وہ ان کی عقلوں پر پوری طرح قابض ہو گیا ہے۔ اب ان کی آنکھوں سے شیطان دیکھتا ہے اور ان کی زبانوں سے شیطان بولتا ہے وہی ان سے گناہوں کا ارتکاب کرا رہا ہے اور بری باتوں کو خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔"

اہلِ بصرہ کی مذمت میں خطبہ ارشاد فرماتے ہیں:

"تم ایک خاتون[1] کا لشکر ہو اور ایک حیوان[2] کی پیروی کرنے والے۔ جب وہ جانور آواز نکالتا ہے تو تم اس کو جواب دیتے ہو لیکن جب اس کی کونچیں کاٹ ڈالی جاتی ہیں تو بھاگ جاتے ہو۔ تمہارے اخلاق نہایت گرے ہوئے ہیں، تمہارے وعدے جھوٹے ہیں، تمہارا دین نفاق پر مبنی ہے۔ میں تمہاری مسجد میں اس کشتی کی مانند ہوں جو قیامت خیز طوفان میں بہہ رہی ہو۔ جو شخص اس کشتی میں سوار ہو گیا وہ بچ گیا اور جو شخص سوار نہ ہوا وہ غرق ہو گیا۔"

ایک خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ [2] اونٹ۔ حضرت علیؓ اس خطبہ میں جنگِ جمل کا ذکر فرما رہے ہیں۔

"ہر قسم کی تعریف ہے اُس اللہ کے لیے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی، جو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اس کے علاوہ ہر عزیز ذلیل ہے، ہر قوی ضعیف ہے، ہر مالک مملوک ہے۔ ہر عالم متعلم ہے، ہر قادر عاجز ہے، ہر سمیع بہرہ ہے کیونکہ وہ لطیف آوازوں کو نہیں سُن سکتا۔ ہر بصیر اعمٰی ہے کیونکہ وہ مخفی رنگوں اور لطیف اجسام کو نہیں دیکھ سکتا ہر ظاہر باطن ہے اور ہر باطن ظاہر۔ جو چیز اس نے پیدا کی ہے اسے پیدا کرنے کی اور کسی میں قدرت نہیں۔ اسے زمانہ کے عواقب خوف زدہ نہیں کر سکتے، اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ تمام مخلوق اسی کی پروردہ ہے۔ تمام بندے اسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ وہ کسی چیز میں حلول نہیں ہے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ فلاں چیز میں پایا جاتا ہے۔ وہ کسی چیز سے منفصل نہیں ہے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ فلاں چیز سے علٰحدہ ہے۔ اسے کسی چیز کے پیدا کرنے میں مشقت تکلیف اور عجز کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ جو کچھ گزر گیا اور جو کچھ آئندہ پیش آنے والا ہے اس میں اس کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ اس کی قضا یقینی، اس کا علم محکم اور اس کا حکم مبرم ہے جو کسی صورت میں ٹلنے والا نہیں۔"

استسقاء کی دُعا:

"اے اللہ! ہمارے پہاڑ خشک ہو گئے ہیں، ہماری زمین پر خاک اڑنے لگی ہے، ہمارے جانوروں کے حلق پیاس کی وجہ سے خشک ہو چکے ہیں۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنے احاطوں میں کھڑے، نہایت دردناک آوازوں سے چیخ رہے ہیں۔ وہ بار بار چارے اور پانی کی تلاش میں چراگاہوں میں پھرتے ہیں اور گھاٹ پر جاتے ہیں لیکن ناکام واپس آتے ہیں۔

اے اللہ! گڑگڑانے والوں کی گڑگڑاہٹ پر رحم فرما۔ اے اللہ! ان جانوروں پر رحم فرما جو چراگاہوں میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں اور اپنے باڑوں میں دردناک آوازوں سے چیخ رہے ہیں۔

اے اللہ! ہم تیرے حضور اس وقت حاضر ہوئے ہیں جب کہ قحط سالی کی انتہا ہو چکی ہے۔ آسمان پر بارش برسانے والے بادلوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ ایسے وقت میں تو ہی مایوس لوگوں کی امید اور عاجزی سے دُعا مانگنے والوں کی دعا قبول کرنے والا ہے۔ ہم تجھے اس وقت پکار رہے ہیں جب تیری مخلوق بارش سے ناامید ہو چکی ہے۔ بادلوں کا کہیں وجود نہیں ہے۔ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں۔

اے اللہ! تو ہمارے اعمال کی پاداش میں ہمیں نہ پکڑ، تو ہمارے گناہوں کے بدلے ہمیں سزا نہ دے، تو ہم پر اپنی رحمت کا سایہ نازل فرما، تو ہمارے لیے پانی سے بھرپور بادل بھیج، جو آ کر کثرت سے بارش برسائیں اور مری ہوئی زمین کو دوبارہ زندہ کر دیں۔

اے اللہ! تو ایسی بارش برسا جو بابرکت ہو۔ روئیدگی اور سبزہ پیدا کرنے والی ہو۔ جس سے تیرے ضعیف اور کمزور بندے فرحت اور توانائی حاصل کریں۔ جس سے مُردہ علاقے پھر تر و تازہ اور سرسبز ہو جائیں اور ہمارے مویشی بافراغت چارہ حاصل کر سکیں۔

اے اللہ! اپنی غریب اور کمزور مخلوق اور بے زبان جانوروں کو اپنے کرم سے نواز اور ان پر اپنی بے پایاں برکات نازل فرما۔ تو اپنی رحمت سے ہمارے لیے ایسا بادل بھیج جو پانی سے بھرا ہوا ہو اور جو آ کر موسلا دھار بارش برسائے۔
ایسا بادل نہ بھیج جس کی کڑک، گرج اور چمک ہمیں دھوکا دے اور جو پانی سے بالکل خالی ہو۔
اے اللہ! خشک زمین کو سیراب کر اور قحط زدہ لوگوں کو آرام اور چین مرحمت فرما۔"

(۳۱)

حکیمانہ اقوال

۱ - جب دنیا کسی پر مہربان ہوتی ہے تو دوسرے شخص کے محاسن بھی اسی کو دے دیتی ہے اور جب اس سے منہ موڑتی ہے تو اس کی اپنی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔

۲ - لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھو تاکہ جب تم مر جاؤ تو وہ تم پر روئیں اور جب تک تم زندہ رہو وہ تم سے محبت کا برتاؤ کرتے رہیں۔

۳ - اگر تم اپنے دشمن پر قابو پا لو تو قابو پانے کے شکریہ میں اسے معاف کر دو۔

۴ - وہ شخص ناکام ہے جو اپنے بھائیوں کی دوستی حاصل نہ کر سکے، لیکن سب سے زیادہ ناکام وہ شخص ہے جو اپنے بھائیوں کی دوستی حاصل کرنے کے بعد پھر اسے کھو دے۔

۵ - اگر تم منعم کا شروع ہی میں شکریہ ادا نہ کرو گے تو آئندہ حاصل ہونے والی نعمت کو ہاتھ سے کھو دو گے۔

۶ - تم صاحبِ مروّت لوگوں کی لغزشوں کو نظر انداز کر دیا کرو۔ کیونکہ ان میں جو شخص لغزش کھاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاتھ سے اٹھاتا ہے۔

۷ - بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ یہ ہے کہ مظلوموں کی داد رسی کی جائے اور مصیبت زدوں کی تکالیف دُور کی جائیں۔

۸ - کوئی شخص کسی بات کو خواہ کتنا ہی کیوں نہ چھپائے لیکن کبھی نہ کبھی وہ بلا ارادہ بلا سوچے سمجھے اس کی زبان یا اس کے چہرے سے ظاہر ہو ہی جائے گی۔

۹ - جب تک بیماری کی حالت میں کام ہو سکتا ہے کام کیے جاؤ۔

۱۰ - بہترین زہد یہ ہے کہ اپنے زہد کو چھپایا جائے۔

۱۱ - سخی بنو لیکن فضول خرچ نہ بنو۔ میانہ روی اختیار کرو لیکن کنجوس نہ بنو۔

۱۲ - عاقل کی زبان اس کے دل کی تابع ہوتی ہے اور احمق کا دل اس کی زبان کے تابع ہوتا ہے[۱]

---

[۱] اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ عاقل جو کچھ کہتا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ بے احتیاطی سے کوئی لفظ نہیں نکالتا۔ لیکن احمق بے سوچے سمجھے جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔ حضرت علیؓ سے اسی قسم کا ایک اور فقرہ بھی مروی ہے جو یہ ہے "احمق کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے اور عاقل کی زبان اس کے دل میں"۔

۱۳ - اگر کسی غلطی سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ غلطی اس نیکی سے اچھی ہے جس سے تم مغرور ہو جاؤ۔
۱۴ - نیک دل انسان کے حملہ سے ڈرو جب وہ بھوکا ہو، اور کمینے شخص کے حملہ سے ڈرو جب وہ سیر ہو۔
۱۵ - جب تک تیرا بخت یاور ہے تیرا عیب بھی چھپا ہوا ہے۔
۱۶ - عفو و درگزر کرنے کے لائق سب سے زیادہ وہ شخص ہے جسے سزا دینے میں کوئی روک نہ ہو۔
۱۷ - سخاوت وہ ہے جو بلا مانگے کی جائے۔ مانگنے پر سخاوت 'سخاوت' نہیں ہوتی بلکہ حیا اور تذمّم[1] ہوتی ہے۔
۱۸ - عقل سے بڑھ کر اور کوئی دولت نہیں، جہالت سے بڑھ کر اور کوئی فقر نہیں۔ ادب سے بڑھ کر اور کوئی میراث نہیں، مشورہ سے بڑھ کر اور کوئی مددگار نہیں۔
۱۹ - صبر دو قسم کا ہوتا ہے:
ایک صبر اس چیز پر جسے تو ناپسند کرتا ہے اور ایک صبر اس چیز پر جسے تو پسند کرتا ہے۔
۲۰ - قناعت وہ مال ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔
۲۱ - مال شہوات کا مادہ و مبتدا ہے۔
۲۲ - جس شخص نے تجھے ڈرایا وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے تجھے خوشخبری دی۔
۲۳ - کسی حاجت مند کو تھوڑی چیز دینے سے نہ شرماؤ کیونکہ بالکل ہی نہ دینا اس سے بدتر ہے۔
۲۴ - ناشکری فقر کا زینہ ہے اور شکر دولتمندی کا زینہ۔
۲۵ - جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو کلام گھٹ جاتا ہے (یعنی عاقل لوگ بہت کم کلام کرتے ہیں)
۲۶ - جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے امام کے طور پیش کرے اسے چاہیے کہ دوسرے لوگوں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے۔ لوگوں کو اپنی زبان کے ذریعہ ادب سکھانے سے پہلے اپنی سیرت اور نمونہ کے ذریعہ ادب سکھائے۔ اپنے نفس کا معلّم اور مؤدب لوگوں کے معلّم اور مؤدب سے زیادہ عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔
۲۷ - حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے، اس لیے اگر حکمت منافقوں کے پاس بھی ملے تو وہاں سے بھی حاصل کرو۔
۲۸ - کسی شخص کی قیمت وہی ہوتی ہے جو وہ خود اپنے لیے مقرر کرتا ہے۔
۲۹ - جس شخص نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے مابین معاملہ درست رکھا اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان بھی معاملہ درست ہی رکھے گا۔ جس شخص نے اپنی آخرت سدھار لی اللہ تعالیٰ اس کی دنیا بھی سدھار دے گا۔ جس شخص کا نفس اسے نصیحت کرنے والا ہو اللہ تعالیٰ اس پر اپنا نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔
۳۰ - دل اسی طرح اُکتا جاتے ہیں جس طرح جسم تھک جاتے ہیں۔ تم ان کی اُکتاہٹ اور تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے حکیمانہ اور

---

[1] تذمّم کے لغوی معنے مذمت سے بچنے کے ہیں۔

پُرلطف باتیں بیان کیا کرو۔

۳۱۔ اپنے جسموں کی آغازِ سرما میں خوب نگہداشت کرو۔ کیونکہ سردی جسموں پر وہی عمل کرتی ہے جو درختوں پر کرتی ہے۔ شروع میں انھیں جلا دیتی ہے اور آخر میں انہیں سرسبز کر دیتی ہے۔

۳۲۔ کوئی دوست اُس وقت تک دوست نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تین موقعوں پر اپنے بھائی کی بُرائی کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اس کی نکبت اور افلاس کے وقت، اس کی غیر حاضری میں اور اس کے مرنے کے بعد۔

۳۳۔ تفکرات آدھا بڑھاپا ہوتے ہیں۔

۳۴۔ اپنے بھائی پر احسان کر کے اُس پر ناراض ہو اور اس پر انعام واکرام کر کے اس کے شر کو لوٹا دو۔

۳۵۔ انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہوتا ہے۔

۳۶۔ جہاں خالق کی نافرمانی ہوتی ہے وہاں مخلوق کی اطاعت واجب نہیں۔

۳۷۔ اکثر اوقات ایک لقمہ کئی لقموں کو روک دیتا ہے۔

۳۸۔ جب تُو اپنے دل سے بدی کو مٹا دے گا تو دُوسرے شخص کے دل سے بھی بدی کا قلع قمع کر دے گا۔

۳۹۔ جس طرح جہالت کی بات کہنے میں کسی قسم کی بھلائی نہیں ہے اسی طرح حکمت کی بات پر خاموش رہنے میں بھی بھلائی نہیں ہے۔

۴۰۔ اے ابنِ آدم! تو اپنی مقررہ روزی سے زیادہ جو کچھ کمائے اُس میں تیرے بھائی تیرے شریک ہیں اور تو اُس مال پر صرف نگہبان کی حیثیت رکھتا ہے۔

۴۱۔ ہر برتن ان چیزوں سے بالآخر بھر جاتا ہے جو اس میں ڈالی جاتی ہیں۔ لیکن علم کا برتن نہیں بھرتا، جتنا جتنا علم اس میں ڈالا جاتا ہے اُتنا اُتنا وہ بڑھتا جاتا ہے۔

۴۲۔ تکلیف کو برداشت کر، کیونکہ جو شخص تکلیف برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ ساری عمر ملول ہی رہتا ہے۔

۴۳۔ اکثر انسانوں کی عقلیں سیم و جواہر کی چمک دیکھ کر جاتی رہتی ہیں۔

۴۴۔ نیک دل انسان کا بہترین کام یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے ان عیوب سے چشم پوشی کرے جو اس کے علم میں آئیں۔

۴۵۔ وُہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اپنی کسی غرض کو مدِنظر رکھ کے کرتے ہیں وہ تاجروں کی سی عبادت کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اُس کی عبادت کرتے ہیں وہ غلاموں کی سی عبادت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکریہ میں اس کی عبادت کرتے ہیں وہ آزاد بندوں کی سی عبادت کرتے ہیں۔

۴۶۔ جو چھوٹے ہاتھ سے سخاوت کرتا ہے اسے لمبے ہاتھ سے دیا جاتا ہے[1]

---

[1] اس فقرہ کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص نیکی کے راستہ میں اپنا مال خواہ وہ کتنا تھوڑا ہی کیوں نہ ہو خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے (باقی بر صفحہ آئندہ)

۴۷۔ دنیا کی تلخی آخرت کی شیرینی ہوتی ہے اور دنیا کی شیرینی آخرت کی تلخی۔
۴۸۔ جب تم غریب ہو جاؤ تو صدقہ کے بدلے اللہ تعالیٰ سے تجارت کا سودا کرو۔
۴۹۔ تھوڑا کام جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے اس بڑے کام سے بہتر ہے جو انسان کو تھکا دے اور آخر اسے چھوڑنا پڑے۔
۵۰۔ احمق کے کبھی ساتھی نہ بنو۔ کیونکہ وہ اپنے کام کو تمہاری نظروں میں اچھا دکھانے کی کوشش کرے گا اور یہ بھی چاہے گا کہ تم بھی اسی جیسے بن جاؤ۔
۵۱۔ تیرے دوست تین ہیں اور تیرے دشمن بھی تین۔ تیرے دوست یہ لوگ ہیں،

۱۔ تیرا دوست

۲۔ تیرے دوست کا دوست

۳۔ تیرے دشمن کا دشمن

اسی طرح تیرے دشمن یہ لوگ ہیں، (۱) تیرا دشمن (۲) تیرے دوست کا دشمن (۳) تیرے دشمن کا دوست۔
۵۲۔ انسان ابناء دنیا ہیں اور وہ اپنی ماں سے محبت کرنے کی بنا پر ملامت کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔
۵۳۔ انسان اپنے بیٹے کے کھوئے جانے پر تو سو سکتا ہے لیکن اپنا مال ضائع ہونے پر نہیں سو سکتا۔[1]
۵۴۔ پتھر کو جہاں سے وہ آیا ہے وہیں لوٹا دو۔ کیونکہ برائی برائی سے ہی دور کی جا سکتی ہے۔
۵۵۔ تیری آنکھ کا پانی (شرم) اس وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک تو سوال نہ کرے۔ جونہی تو سوال کرے گا یہ پانی ڈھل جائے گا۔
۵۶۔ جو شخص بغاوت کی تلوار سونتتا ہے وہ اسی تلوار سے قتل کیا جاتا ہے۔ جو شخص سخت محنت کرتا ہے بالآخر ہلاک ہو جاتا ہے۔ جو شخص گہرے پانی میں گھستا ہے غرق ہو جاتا ہے۔ جو شخص برائیوں کے اڈوں میں جاتا ہے وہ بھی بدی سے متہم ہو جاتا ہے۔
۵۷۔ جو شخص دوسرے لوگوں کے عیب دیکھ کر انہیں برا جانتا ہے لیکن پھر خود وہی عیب اختیار کر لیتا ہے اس سے بڑھ کر احمق اور کوئی نہیں۔
۵۸۔ جو شخص باتونی ہو گا زیادہ غلطیاں کرے گا۔ جو زیادہ غلطیاں کرے گا اس کی شرم کم ہو جائے گی۔ جس کی شرم کم ہو جائے گی اس کی پرہیزگاری میں فرق آ جائے گا۔ جس کی پرہیزگاری میں فرق آ جائے گا اس کا دل مر جائے گا اور جس کا دل مر جائے گا وہ دوزخ میں داخل ہو گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بہت بڑھ چڑھ کر دیتا ہے۔ اس جگہ ہاتھوں سے مراد نعمتیں ہیں۔ حضرت علیؓ نے اس فقرہ میں بندہ کی نعمت اور خدا تعالیٰ کی نعمت کا مقابلہ کیا ہے اور بندے کی دی ہوئی نعمت کو چھوٹی نعمت اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو بڑی نعمت بتایا ہے۔

[1] مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی اولاد کی موت پر تو صبر کر سکتا ہے لیکن مال کے چھن جانے پر صبر نہیں کر سکتا۔

۵۹ - جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے متعلق کوئی لفظ زبان سے نہ نکال - نہ صرف یہ بلکہ ہر اس چیز کے متعلق بھی جس کا تجھے پتا ہے زبان نہ کھول -

۶۰ - جس نے حق کا مقابلہ کیا وہ شکست کھائے گا -

۶۱ - عہدے اور منصب لوگوں کے مضامیر[1] ہیں -

۶۲ - دو شخص کبھی سیر نہیں ہوتے - علم کا طالب اور مال کا طالب -

۶۳ - جو شخص یہ باتیں کرے گا چار چیزوں سے کبھی محروم نہیں رہے گا - دعا کرنے والا استجابت سے ، توبہ کرنے والا قبولیت سے استغفار کرنے والا مغفرت سے اور شکر کرنے والا زیادتی سے -

۶۴ - تین چیزیں جنت کے خزانوں میں سے ہیں :

(۱) بیماری کا چھپانا (۲) صدقہ و خیرات کا چھپانا (۳) مصیبت کا چھپانا

۶۵ - اے ابن آدم ! جب تو یہ دیکھے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ تجھے برابر اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے اور تو اس کی نافرمانی کر تو خدا تعالیٰ سے ڈر -

۶۶ - امیری میں سفر بھی وطن ہے اور غریبی میں وطن بھی سفر -

۶۷ - کتنی عقلیں ہیں جو حاکموں کی خواہشات کے نیچے دبی ہوتی ہیں -

(۳۲)

امیر المومنینؓ کی رائیں اور مزاح

ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ کیا ہمارا شام چلنا قضائے الٰہی کے تحت ہے ؟

جواب میں آپ نے فرمایا :

" شاید تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہر چیز قضا و قدر سے وابستہ ہے اور خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ [illegible] تو ثواب و عذاب کی کوئی ضرورت نہ تھی - نیک عمل کرنے والوں کو جنت کے وعدے اور بدی [illegible] کو جہنم کے ڈراوے نہ دیے جاتے - اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اچھے برے کام کرنے کا اختیار [illegible] کاموں پر ہی جزا و سزا کا دارو مدار ہے - اللہ تعالیٰ نے دین میں بہت آسانی رکھی ہے اور [illegible] باتوں کا مکلف کیا ہے جو وہ آسانی سے کر سکتے ہیں - اس نے تھوڑے عمل کے بدلے بہت

---

[1] مضامیر ان جگہوں کو کہتے ہیں جہاں گھوڑوں کو گھوڑ دوڑ کے لیے تیار کیا جاتا ہے - حضرت علیؓ کے اس مقولہ کو [illegible] عہدے اور منصب مل جاتے ہیں دوسرے لوگوں سے ان کی سابقیت اور فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے

وعدہ کیا ہے۔ اس نے انبیاء کو تفریحاً نہیں بھیجا۔ قرآن کریم کو بندوں کے لیے بیکار نازل نہیں کیا۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اسے یوں ہی پیدا نہیں کیا۔ یہ خیال صرف کافروں کا ہے اور کافروں کے لیے آگ ہی ٹھکانا ہے۔"

ایک شخص نے آپ سے ایمان کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا :

"ایمان چار ستونوں پر قائم ہے، صبر، یقین، عدل اور جہاد۔ صبر کی بنیاد بھی چار چیزوں ——— شوق، خوف، زہد اور انتظار ——— پر ہے۔ جو کوئی جنت کا خواہشمند ہے وہ شہوات سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔ جس کو دوزخ کا خوف ہے وہ محرمات سے بچے گا۔ جو دنیا سے بے رغبتی اختیار کرے گا اسے مصائب کی کوئی پرواہ نہ ہوگی اور جو شخص موت کا انتظار کرتا رہے گا وہ نیک کاموں میں عجلت سے کام لے گا۔

یقین کی بنیاد بھی چار باتوں ——— زیرکی، دقت رسی، عبرت اندوزی اور سنت الاولین ——— پر ہے۔ جو شخص زیرکی اختیار کرے گا اسے حکمت کی دقیق ترین باتوں کا علم ہو جائے گا اور جسے حکمت کی دقیق ترین باتوں کا علم ہو جائے گا وہ دوسرے لوگوں سے ضرور عبرت حاصل کرے گا اور اس طرح وہ گویا پہلے لوگوں ہی کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔

عدل کی بنیاد بھی چار باتوں پر ہے۔ اچھی طرح سمجھنے پر، کسی چیز کے ظاہر و باطن کو باریک نظر سے دیکھنے پر، حکمت اور حلم پر۔ جو شخص علم کو اچھی طرح سمجھ لے گا وہ اس کے ظاہر و باطن کو لازماً باریک نظر ہی سے دیکھے گا، اور جو شخص علوم ظاہری و باطنی کو باریک نظر سے دیکھے گا وہ حکیمانہ باتیں ہی کرے گا۔ جو شخص علم اور بردباری اختیار کرے گا وہ کبھی زیادتی سے کام نہ لے گا اور لوگوں کے درمیان نہایت اچھے طریقہ سے زندگی بسر کرے گا۔

جہاد کی بنیاد بھی چار باتوں پر ہے۔ امر بالمعروف پر، نہی عن المنکر پر، لڑائی کے موقعہ پر ثابت قدم رہنے پر اور فاسقوں سے دشمنی رکھنے پر۔ جو شخص لوگوں کو نیک کاموں کی تلقین کرے گا وہ مومنوں کی قوت کو مضبوط کرے گا۔ جو شخص لوگوں کو بدی کے کاموں سے روکے گا وہ کافروں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دے گا۔ جو شخص لڑائی کے موقعہ پر ثابت قدم رہے گا وہ فتح یاب ہوگا۔ جو شخص فاسقوں سے دشمنی رکھے گا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر ہی ان سے ناراض ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی خاطر اس کے دشمنوں سے ناراض ہوگا اور قیامت کے دن اسے اپنی رضا کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور کرے گا۔"

"ایمان دل کے یقین، زبان کے اقرار اور ارکانِ اسلام پر عمل کرنے کا نام ہے۔"

"کفر بھی چار ستونوں پر قائم ہے :

۱ - اوہام کے اتباع پر

۲ - لڑنے جھگڑنے پر

۳ - کجی پر

۴ - مخالفت اور دشمنی پر

جو شخص اوہام کی پیروی اختیار کرے گا اسے حق کی جانب رجوع کرنے کی توفیق نہ ہوگی۔ جو شخص کثرت سے لڑائی جھگڑا کرتا رہے گا حق و صداقت کی جانب سے ہمیشہ اس کی نظر اندھی رہے گی۔ جو شخص کجی اختیار کرے گا وہ نیکی کو برائی [illegible]

ضلالت اور گمراہی کے نشے میں مدہوش ہو جائے گا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کی مخالفت اور دشمنی پر کمربستہ رہے گا وہ دائماً اپنے مخالف کے رستے کے اُلٹ راستہ اختیار کرے گا۔ اس لیے ہمیشہ گمراہی میں پھنسا رہے گا اور اس سے نکلنا اس کے لیے انتہائی دشوار ہوگا۔"

"شک کی بنیاد چار باتوں پر ہے :

۱۔ ناحق جھگڑنے پر

۲۔ دہشت پر

۳۔ تردّد پر

۴۔ تابعداری پر

جس نے ناحق جھگڑنے کی عادت کو اپنا لیا وہ شک کے اندھیرے سے کبھی یقین کی روشنی تک راہ نہ پا سکے گا۔ جو شخص اپنے سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر دہشت زدہ رہے گا وہ بالآخر اُلٹے پاؤں واپس ہو جائے گا۔ جو شخص متردّد رہے گا، شیطان اس پر قابو پالیں گے۔ جو شخص اپنی دنیا اور آخرت کی تباہی پر راضی ہو جائے گا وہ دنیا میں بھی ہلاک ہوگا اور آخرت میں بھی۔"

ایک شخص نے آپ کے سامنے کہا : "استغفراللہ" (میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں)۔ آپ نے اس سے فرمایا :

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ استغفار کیا ہوتا ہے ؟ استغفار کا حق علیین کو ہے۔ چھ باتیں کرنے کے بعد پھر استغفار کرنے کا درجہ آتا ہے :

اوّل : جو گناہ تم سے سرزد ہوا اس پر ندامت کا اظہار کرو۔

دوم : برائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا عزم کرو۔

سوم : مخلوق کو ان کے حقوق آخر وقت تک ادا کرو اور خدا تعالیٰ کے حضور بالکل پاک صاف ہو کر حاضر ہو۔

چہارم : یہ کہ ہر اس فریضہ کی طرف متوجہ ہو جو تم سے چھوٹ گیا تھا اور اسے ادا کرو۔

پنجم : یہ کہ اس گوشت کی طرف توجہ کرو جو حرام کی کمائی کی وجہ سے تم پر چڑھ گیا ہو اور رنج و غم کی گرمی سے اس کو یہاں تک پگھلاؤ کہ گوشت کا نام و نشان باقی نہ رہے کھال ہڈیوں سے چمٹ جائے اور ہڈیوں اور کھال کے درمیان نیا گوشت پیدا ہو جائے۔

ششم : یہ کہ تم اپنے جسم کو اطاعت کا اتنا مزا چکھاؤ جتنا تم نے اسے معصیت کا مزا چکھایا تھا۔ اس وقت تم کہہ سکتے ہو "استغفراللہ۔"

مزاح

"عورت ساری کی ساری بُری ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وُہ بھی بُرا ہوتا ہے۔"

"عورت بچھو ہے جس نے شیرینی کا لباس پہن رکھا ہے۔"

"عورتوں کی تین اچھی خصلتیں مردوں کی بُری خصلتیں ہوتی ہیں یعنی تکبّر، بُزدلی اور بُخل۔ اگر عورت مغرور ہوتی ہے تو طبعی طور پر ہوتی ہے جان بُوجھ کر نہیں ہوتی۔ اگر وہ بخیل ہوتی ہے تو اپنے مال کی حفاظت بھی کرتی ہے اور اپنے شوہر کے مال کی

حفاظت بھی، اور اگر بزدل ہوتی ہے تو ہر اس چیز سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہے جو اس کے سامنے آتی ہے۔"

جنگِ جمل کے بعد آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:

" اے لوگو! عورتیں ناقص الایمان اور ناقص العقل ہوتی ہیں۔ بُری عورتوں سے تو لازماً بچو ہی۔ نیک عورتوں سے بھی پرے پرے ہی رہو۔ اچھی بات میں بھی ان کی اطاعت نہ کرو تاکہ وہ بُرائی کے کاموں کی طرف تمہیں متوجہ کرنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکیں۔"

ایک مرتبہ آپ نے جابر بن عبد اللہ انصاری سے فرمایا:

" اے جابر! دنیا چار قسم کے لوگوں کے سہارے قائم ہے:

۱۔ عالم، جو اپنے علم کو برابر استعمال میں لاتا رہتا ہے۔

۲۔ جاہل، جو علم سیکھنے کو بُرا نہیں سمجھتا۔

۳۔ امیر، جو کبھی بخل نہیں کرتا۔

۴۔ فقیر، جو اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے بدلے بیچ نہیں ڈالتا۔

اگر عالم اپنے علم کو ضائع کر دے گا تو جاہل علم سیکھنے کو بُرا سمجھنے لگے گا اور اگر امیر بخل کرے گا تو فقیر اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے بدلے بیچ دے گا۔

اے جابر! جس شخص کے پاس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بہتات ہو جاتی ہے حاجتمند لوگ بھی اس کے پاس کثرت سے جانے لگتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان نعمتوں کا استعمال اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو دوام اور بقا عطا کر دیتا ہے۔ لیکن جو شخص انہیں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال نہیں کرتا اور اپنے واجبات کو فراموش کر دیتا ہے تو وہ نعمتیں کم ہوتے ہوتے آخر بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔"

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے کوئی مشکل مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

"جو کچھ پوچھنا ہے وہ تفقہ اور مزید علم حاصل کرنے کے لیے پوچھو، محض تنگ کرنے اور اعتراض کے لیے نہ پوچھو۔"

آپ سے دریافت کیا گیا کہ عاقل کی صفت بیان فرمائیے۔ آپ نے فرمایا:

"عاقل وہ ہے جو چیز کو اس کے موقع اور محل پر رکھتا ہے۔"

پھر کہا گیا کہ جاہل کی صفت بھی بیان فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا:

" اس کی صفت میں نے بیان کر دی ہے۔"

اوباش لوگوں کی تعریف آپ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی:

"اوباش وہ لوگ ہیں کہ جمع ہوں تو نقصان پہنچائیں اور منتشر ہو جائیں تو فائدہ۔"

لوگوں نے کہا کہ ہمیں ان کے اجتماع کی مضرت کا تو پتا چل گیا لیکن ان کے منتشر ہونے کی وجہ سے فائدہ حاصل ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

آپ نے فرمایا :

"جب وہ لوگ منتشر ہوجائیں گے تو مزدور اپنے اپنے کاموں میں لگ جائیں گے۔ معمار عمارتیں بنانے میں، جولاہے کپڑا بُننے میں اور نانبائی روٹیاں پکانے میں مشغول ہوجائیں گے۔ اس طرح لوگوں کو اوباشوں کے منتشر ہونے سے فائدہ حاصل ہوجائے گا۔"

آپ نے ایک دفعہ پُرانی اور پھٹی ہوئی قمیص پہن رکھی تھی۔ جب لوگوں نے آپ سے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا :

"اس طرح دل خشوع و خضوع کی طرف مائل ہوتا ہے، نفس تذلل اختیار کرتا ہے اور مومن اس کی پیروی کرتے ہیں۔"

آپ نے ایک خارجی کو تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا :

"یقین کی نیند شک کی نماز سے بہتر ہے۔"

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا تو آپ نے فرمایا :

"جو کچھ تم میرے متعلق کہتے ہو میں اس سے کم تر ہوں لیکن جو کچھ تمہارے دل میں میرے متعلق ہے اس سے برتر ہوں۔"

(۳۴)

خطوط اور وصایا

واقعہ جمل کے بعد آپ کا خط حضرت معاویہؓ کے نام

"سلام علیک۔ واضح ہو کہ مدینہ میں میری بیعت ہوجانے سے تمہارے لئے شام میں میری بیعت کرنی ضروری ہوگئی ہے کیونکہ میری بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی اور اسی بات پر کی ہے جس بات پر میرے سے پہلے خلفاؓ کی کی تھی۔ بیعت کے بعد کسی ایسے شخص کے لئے، جو اس موقعہ پر حاضر تھا، یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میری بجائے کسی اور کا نام خلافت کے لیے تجویز کرے اور نہ کسی ایسے شخص کے لیے، جو اس موقعہ پر حاضر نہیں تھا، یہ جائز ہے کہ وہ اس بیعت کو رد کر دے۔ شوریٰ کا حق صرف مہاجرینؓ اور انصارؓ کا ہے۔ جب وہ کسی شخص پر متفق ہو کر اس کا نام امامت کے لیے تجویز کر دیں تو اس مشورہ کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر اس فیصلہ سے کوئی شخص انحراف کرتا ہے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ بزور اسے خلیفہ کے حلقۂ اطاعت میں داخل کریں۔ اگر وہ برابر انکار ہی کرتا چلا جائے تو اس سے لڑیں۔ طلحہؓ اور زبیرؓ نے پہلے میری بیعت کی اور بعد کو پھر گئے۔ ان کا بیعت توڑ دینا بیعت سے انکار کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے ان پر حجت تمام کر کے ان سے جہاد کیا۔ یہاں تک کہ حق ظاہر ہوگیا اور خدا تعالیٰ کی مشیت ان کی ناراضگی کے باوجود پوری ہوئی۔ میں تمہیں بھی اسی بات کی طرف بلاتا ہوں جسے دوسرے مسلمانوں نے قبول کر لیا ہے اور وہ

یہ ہے کہ تم میری بیعت میں داخل ہو جاؤ۔ تم قاتلینِ عثمانؓ سے انتقام لینے کے متعلق بہت شور مچا رہے ہو۔ اگر تم میری بیعت میں داخل ہو جاؤ اور پوری طرح میری اطاعت کرو تو میں تم سے بھی اور ان لوگوں سے بھی کتاب کے مطابق سلوک کروں گا۔ تم اپنے لیے ولایت چاہتے ہو لیکن یہ محض دھوکا ہے۔ تم اگر اپنی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر اپنی عقل کو کام میں لاؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں تمام قریش میں سب سے زیادہ حضرت عثمانؓ کے خون سے بری الذمہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آزاد کردہ قیدیوں میں سے ہو[1] جن کے لیے خلافت جائز ہوتی ہے اور نہ انہیں شوریٰ میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ میں جریر بن عبداللہ کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں جو اہلِ ایمان اور مہاجرین میں سے ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم ان کی بیعت کرلو۔ ولا قوۃ الا باللہ۔

حضرت معاویہؓ کے نام ایک اور خط

"تمہارا خط پہنچا۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط کسی ایسے شخص کا ہے جس کی نظر نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور اب وہ سیدھے راستے پر چل ہی نہیں سکتا۔ نہ اس کے پاس کوئی ایسا شخص ہے جو اسے سیدھے راستے پر چلائے۔ نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر ہی اس نے یہ جواب دیا ہے اور نفسانی خواہشات ہی اس کی راہبر ہیں اور وہ بلا سوچے انہی کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ عہد شکنی کی اور انہیں شہید کروا دیا۔ خدا کی قسم میں تو عام مہاجرین میں سے ایک فرد ہوں۔ جس طرح دوسرے مہاجرین نے کیا میں نے بھی کیا۔ خدا تعالیٰ انہیں ضلالت اور گمراہی پر اکٹھا نہیں کر سکتا اور نہ ان کی آنکھوں ہی کو اندھا کر سکتا ہے۔"[2]

---

[1] یہ کہنے سے حضرت علیؓ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے والد ابوسفیان فتحِ مکہ کے دن دراصل قیدی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر احسان کر کے انہیں آزاد کر دیا۔

[2] حضرت معاویہؓ نے اس خط کا یہ جواب دیا:

"سلام علیک۔ اگر آپ کی بیعت ان لوگوں نے کر لی ہے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے اور آپ حضرت عثمانؓ کے خون سے بھی بری ہیں تو آپ کا مرتبہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے برابر ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ آپ نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل پر اکسایا اور انصار کو چھوڑ دیا۔ آپ کی اطاعت جاہلوں نے کی ہے اور جو لوگ کمزور تھے وہ آپ کی بدولت قوی بن گئے ہیں۔ اہلِ شام اس وقت تک آپ سے جنگ کرتے رہنے کا ارادہ کر چکے ہیں، جب تک آپ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو ان کے حوالے نہیں کر دیتے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو پھر خلافت کا معاملہ مسلمانوں کے باہم مشورے سے طے کیا جائے گا۔ اہلِ حجاز ہی لوگوں کے حاکم ہیں۔ حق بھی انہی میں ہے۔ اگر وہ شوریٰ سے علیحدہ ہو جائیں تب اہلِ شام لوگوں کے حاکم ہیں۔ اہلِ بصرہ کی طرح اہلِ شام آپ کے مطیع نہیں ہیں اور آپ ان پر کسی قسم کی حجت قائم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح طلحہؓ اور زبیرؓ کی طرح میں آپ کا تابع نہیں ہوں۔ ان دونوں نے آپ کی بیعت کی تھی اس لیے ان پر تو آپ حجت قائم کر سکتے ہیں لیکن مجھ پر آپ حجت قائم نہیں کر سکتے۔ رہی اسلام میں آپ کی فضیلت اور آپ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت، تو اس سے میں انکار نہیں کرتا۔"

میرے سپرد کوئی عہدہ نہیں تھا جس کی وجہ سے مجھ پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد ہو سکتی۔ نہ میں نے ان کو شہید ہی کیا تھا جس کی بنا پر مجھے قصاص کا خطرہ ہو۔ تمہارا یہ قول کہ اہلِ شام اہلِ حجاز کے حاکم ہیں تو شامی قریشیوں میں سے کوئی ایک شخص ایسا پیش کرو جسے مجلسِ شوریٰ میں قبول کر لیا جائے یا اس کے لیے خلافت جائز ہو۔ اگر تم کسی ایسے شخص کا نام پیش کرو بھی دو گے تو مہاجرینؓ اور انصارؓ بالاتفاق تمہیں جھٹلائیں گے۔ ہاں ہم حجازی قریشیوں میں سے ایسے نام پیش کر سکتے ہیں جو مندرجہ بالا معیار پر پورے اُتریں۔ تم نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو میرے حوالے کر دو تو تم اس معاملہ میں بولنے والے کون ہوتے ہو! یہاں حضرت عثمانؓ کے بیٹے موجود ہیں وہ اس بات کے حقدار ہیں کہ یہ مطالبہ کریں۔ تم نے اہلِ شام اور اہلِ بصرہ اور اپنے اور طلحہؓ و زبیر کے درمیان تمیز کی ہے۔ لیکن اس کا کوئی سوال نہیں ہے اگر کسی شخص یا فریق نے میری بیعت نہیں کی تو اس وجہ سے وہ بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔ جب عام بیعت ہو گئی تو پھر کسی اور شخص کو بولنے کا اختیار نہیں رہتا۔ میری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت اور اسلام میں سبقت کے فخر کو اگر تم مٹا سکتے ہو تو مٹا دو۔"

حضرت معاویہؓ کے نام ایک اور خط

"تم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا فضیلت میں تیسرا درجہ ہے (یعنی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد) اگر وہ محسن ہوں گے تو قیامت کے دن ربِ شکور کے حضور حاضر ہوں گے جو نیکیوں کا بدلہ بہت بڑھا چڑھا کے دینے والا ہے۔ وہ انہیں بیش قرار انعامات سے نوازے گا۔ اگر ان میں کچھ برائیاں ہوں گی تو قیامت کے دن وہ ربِ غفور کے سامنے حاضر ہوں گے جو اپنی رحمت سے ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام میں سب سے بڑا حصہ ہمارا یعنی اہلِ بیت کا ہے تم نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے خلفاء کی بیعت کرنے میں دیر کی۔ میں نے ان سے حسد کیا اور ان کے خلاف بغاوت کی۔ حالانکہ بغاوت سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ تم نے میرے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے سرکشی اختیار کی اور ان سے قطع رحم کیا۔ حضرت عثمانؓ نے جو کچھ کیا وہ بھی تمہیں معلوم ہے اور لوگوں نے ان سے جو سلوک کیا اس کا بھی تمہیں پتا ہے۔ تمہیں یہ بھی علم ہے کہ میں اس سارے قضیہ سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اگر اس پر بھی تم مجھ پر اتہام لگاتے ہو تو تمہیں اختیار ہے، جو چاہو کہو اور جو چاہو کرو۔ تم نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا ذکر کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ انہیں تمہارے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے اس معاملہ میں بہت غور کیا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں انہیں نہ تمہارے حوالے کر سکتا ہوں اور نہ کسی اور کے۔

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو تمہارے والد ابوسفیان میرے پاس آئے اور کہا "اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ ہی خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔" لیکن میں نے مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جانے کے اندیشہ کی بنا پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تمہارے والد تم سے زیادہ میرے مرتبہ اور میرے حق سے واقف تھے۔ اگر تم بھی اپنے والد کی طرح میرے مرتبہ اور میرے حق کو

پہچان لو تو یقیناً راہِ راست پر آجاؤ۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو ہم تمہارے بارہ میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ نے ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ آپ شام کی حکومت ان کے قبضہ ہی میں رہنے دیں اور عرب کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچائیں۔ اس خط میں انہوں نے لکھا کہ فریقین کی قوت برابر کی ہے اور کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ ہونا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی فخر کا اظہار کیا کہ وُہ بنی امیہ میں سے ہیں اور بنو امیہ اور بنو ہاشم کا سلسلۂ نسب ایک ہی ہے۔ حضرت علیؓ نے ان کے خط کا جواب ان الفاظ میں دیا:

"تم نے اپنے لیے شام کا مطالبہ کیا ہے لیکن جس چیز کو میں نے کل دینے سے انکار کر دیا، آج اسے کس طرح دے سکتا ہوں۔ تم نے لکھا ہے کہ جنگ نے عرب کو کھا لیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کو حق نے کھا لیا ہے وہ جنت میں جائے گا۔ تم نے جنگ میں فریقین کی برابری کا ذکر کیا ہے۔ تم اپنے متعلق شک میں ہو اس لئے ضرور ہار و گے۔ چونکہ میں اپنے متعلق یقین پر ہوں اس لیے میں ضرور جیتوں گا۔ اہلِ شام دنیا کے اتنے حریص نہیں ہیں جتنے اہلِ عراق آخرت کے حریص ہیں۔ رہا تمہارا یہ قول کہ "ہم بنو عبد مناف ہیں" تو تمہاری طرح ہم بھی بنو عبد مناف ہیں، لیکن امیہ کا مقابلہ ہاشم سے، حرب کا مقابلہ عبد المطلب سے، ابو سفیان کا مقابلہ ابو طالب سے، مہاجر کا مقابلہ آزاد کردہ قیدی سے، صحیح النسب کا مقابلہ اس شخص سے جو اپنے نسب کو کسی دوسری قوم کے نسب سے ملاتا ہو، حق پر قائم رہنے والے کا مقابلہ باطل پر ہو لے والے شخص سے اور مومن کا مقابلہ مفسد سے نہیں کیا جا سکتا۔"

حضرت معاویہؓ کے نام ایک اور خط

"سبحان اللہ! تم اپنی باطل خواہشات پر کس مضبوطی سے قائم ہو، حالانکہ واقعات و حقائق سراسر تمہارے برخلاف ہیں۔ تم حضرت عثمانؓ کے انتقام کے متعلق بڑا واویلا کر رہے ہو۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تم نے حضرت عثمانؓ کی مدد اس وقت کی جب ان کی مدد تمہارے لیے فائدہ مند تھی۔ لیکن جس وقت انہیں تمہاری مدد کی ضرورت تھی اس وقت تم نے ان کی مدد سے کنارہ کشی اختیار کی۔[1]"

منذر بن جارود عبدی کو آپ نے ایک علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے بیت المال کے اموال میں کچھ خیانت کی۔ جب آپ کو اس کا پتا چلا تو آپ نے اسے مندرجہ ذیل خط لکھا:

"تمہارے باپ کی نیکی نے مجھے تمہارے متعلق دھوکے میں رکھا۔ میرا خیال تھا کہ تم اپنے باپ کی تقلید کرو گے

---

[1] حضرت علیؓ کا یہ لکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اب جبکہ تم ان کے انتقام کا نعرہ لگا کر سیاسی فائدہ حاصل کر سکتے ہو تمہیں ان کا انتقام لینے کا بہت جوش ہے لیکن ان کی زندگی میں جب انہیں تمہاری حقیقی مدد کی ضرورت تھی تم نے ان کی کسی قسم کی مدد نہ کی۔

اور اسی کے راستہ پر چلو گے۔ لیکن مجھے تمہارے متعلق جو خبریں ملی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ تم نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل اور دنیا میں عیش و آرام حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو تباہ کر لیا اور اس کے لیے کسی قسم کا زادِ راہ تیار نہ کیا۔ مجھے تمہارے متعلق جو خبریں ملی ہیں اگر وہ سچ ہیں تو تمہارے گھر کے اونٹ اور تمہاری جوتی کے تسمے تم سے بہتر ہیں۔ تم جیسا کوئی شخص ہرگز اس بات کا اہل نہیں ہے کہ اسے سرحدوں کی حفاظت کے لیے چھوڑا جائے۔ اسے کوئی مرتبہ دیا جائے، اس کی عزت اور قدر و منزلت کی جائے۔ اسے امانت میں شریک کیا جائے یا اسے قابلِ اعتماد سمجھا جائے۔ جونہی میرا یہ خط تمہیں پہنچے اسی وقت مجھ سے ملنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔"

عثمان بن حنیف انصاری عاملِ بصرہ کے متعلق آپ کو یہ خبر ملی کہ انھیں ولیمہ کی ایک دعوت میں بلایا گیا اور وہ چلے گئے۔ اس پر آپ نے انھیں مندرجہ ذیل خط لکھا:

"اے ابنِ حنیف! مجھے پتا چلا ہے کہ اہلِ بصرہ میں سے ایک شخص نے تمہیں دعوت میں بلایا اور تم وہاں چلے گئے۔ اس وقت تمہیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ جس دعوت میں تمہیں مدعو کیا گیا ہے اس میں امیروں کو تو بلایا گیا ہے لیکن غریبوں کو نہیں بلایا گیا۔ آئندہ اس بات کا سختی سے خیال رکھو کہ جو دعوت تمہارے نزدیک مشکوک ہو اس میں مت جاؤ۔ البتہ جس دعوت کے متعلق تمہیں یہ یقین ہو جائے کہ وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی مخالفت کر کے منعقد نہیں کی گئی، اس میں شریک ہو سکتے ہو۔"

زیاد بن ابیہ کے نام ایک خط

"اسراف کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرو۔ کل کا دھیان آج ہی کرو اور بقدرِ ضرورت اپنا مال بچاؤ۔ خرچ کرنے کے بعد جو مال بچ جائے اسے آئندہ کی ضروریات کے لیے رکھ چھوڑو۔

کیا تمہیں یہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں منکسر المزاج لوگوں کے زمرہ میں شامل کرے گا، اگرچہ اس کے نزدیک تمہارا شمار مغرور لوگوں میں ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں اسی ثواب سے متمتع کیا جائے گا، جو صدقات دینے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ اگرچہ دولت کی افراط کے باوجود تم اسے کمزوروں اور یتیموں اور بیواؤں پر خرچ نہ کرو۔ یاد رکھو ہر انسان کو آخرت میں اسی کام کا اجر دیا جائے گا جو اس نے اس دنیا میں کیا ہو گا۔ لسے وہاں وہی کچھ ملے گا جو وہ اس دنیا میں چھوڑ گیا ہو گا۔"

ایک عامل کے نام خط

"تمہارے علاقہ کے غیر مسلم زمینداروں نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم ان سے سختی کرتے ہو اور نفرت و حقارت سے پیش آتے ہو۔ ان کے شرک کی وجہ سے میں انھیں اس بات کا اہل تو نہیں سمجھتا کہ تم انھیں مسلمانوں کی طرح اپنے قریب کر لو۔ لیکن چونکہ وہ معاہد ہیں اس لئے ان سے زیادہ دوری بھی اچھی نہیں۔ نہ تم ان سے حد سے زیادہ نرمی سے پیش آؤ اور نہ حد سے زیادہ سختی سے، بلکہ نرمی اور سختی، قرب اور دوری کے مابین ان سے معاملہ کرو۔"

اپنے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ کو نصیحتیں فرماتے ہیں

اپنے پیچھے دنیا کی کوئی چیز باقی نہ رہنے دینا، کیونکہ وُہ چیز لازماً دو آدمیوں میں سے ایک کے پاس جائے گی۔ یا تو اس کے پاس جو اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستہ میں خرچ کرے گا اور اس طرح اس چیز سے فائدہ حاصل کرے گا جو تمہارے کام نہ آئی۔ یا پھر اس آدمی کے پاس جو اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرے گا اور اس طرح تم اس کی نافرمانی میں اس کے مددگار ہو گے۔ یہ دونوں آدمی اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ تم ان کو اپنے آپ پر ترجیح دو۔

بیٹا! چار باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو:

۱۔ اصل دولت مندی عقل کی دولتمندی ہے۔

۲۔ سب سے بڑا فقر حماقت ہے۔

۳۔ سب سے زیادہ وحشت تکبّر اور خود پسندی ہے۔

۴۔ سب سے معزّز حسب نیک خلقی ہے۔

میرے بیٹے! احمق کی دوستی سے بچنا کیونکہ وہ اپنے خیال میں تو تمہیں فائدہ پہنچائے گا لیکن در اصل نقصان پہنچانے کا موجب بنے گا۔ بخیل کی دوستی سے بچنا، کیونکہ جن چیزوں کی تمہیں اشد ضرورت ہوگی وہ ان کو تم سے دُور کر دے گا۔ فاجر کی دوستی سے بچنا، کیونکہ وہ ایک معمولی چیز کے بدلے تمہیں بیچ دے گا۔ جھوٹے کی دوستی سے بچنا، کیونکہ وُہ سراب کی طرح ہے۔ دُور کو نزدیک دکھائے گا اور نزدیک کو دُور۔"

کمیل بن زیاد نخعی کہتے ہیں کہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب نے میرا ہاتھ پکڑا اور صحرا میں ایک قبرستان کی طرف تشریف لے گئے بہت دُور نکل جانے کے بعد آپ نے ایک لمبا سانس لیا اور فرمایا:

"اے کمیل! یہ دل در اصل برتن ہیں تم ان میں پاک چیزیں ڈالو اور جو کچھ میں کہتا ہوں غور سے سنو۔ انسان تین قسم کے ہیں:

۱۔ ربّانی عالم

۲۔ نجات حاصل کرنے کے لیے علم سیکھنے والے۔

۳۔ احمق، جوان چرواہوں کی طرح ہیں کہ ہر چیخ کی آواز پر اس کی طرف بھاگتے ہیں۔ جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اسی طرف چلے جاتے ہیں۔ نہ وہ علم کے نور سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور نہ کسی مضبوط چیز کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

اے کمیل! علم مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تُو مال کی حفاظت کرتا ہے۔ مال خرچ کرنے سے کم ہو جاتا ہے لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ جو شخص مال کے بل بوتے پر عزّت حاصل کرتا ہے اس کی عزّت مال کے ختم ہونے تک باقی رہتی ہے، جونہی مال ختم ہوا اس کی عزّت بھی ختم ہوگئی۔ لیکن جو شخص علم کے

بل بوتے پر عزت حاصل کرتا ہے اس کی عزت ہمیشہ رہتی ہے۔

اے کمیل! علم کے ذریعہ انسان زندگی میں بھی ناموری حاصل کر لیتا ہے اور اس کی وفات کے بعد بھی اس کا ذکر باقی رہتا ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم۔

"میں تمہیں پانچ نصیحتیں کرتا ہوں:

۱۔ سوائے خدا کے اور کسی سے امید نہ رکھو۔

۲۔ سوائے اپنے گناہ کے اور کسی سے نہ ڈرو۔

۳۔ اگر تم سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا تمہیں علم نہ ہو تو یہ کہتے ہوئے نہ شرماؤ کہ "میں نہیں جانتا"۔

۴۔ اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اسے معلوم کرنے میں تکلف نہ کرو۔

۵۔ صبر اختیار کرو، کیونکہ صبر کا تعلق ایمان سے ایسا ہی ہے جیسا سر کا تعلق بقیہ جسم سے۔ اس جسم کا کوئی فائدہ نہیں جس کا سر نہ ہو۔

اسی طرح اس ایمان سے کوئی فائدہ نہیں جس کے ساتھ صبر نہ ہو۔"

عربی ماخذ

نام کتاب	نام مصنف	نام کتاب	نام مصنف
فتوح الشام	واقدی	الکامل	مبرد
السیرۃ النبویہ	ابنِ ہشام	المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداؔ
الطبقات الکبریٰ	ابنِ سعد	الاصابہ فی تمییز الصحابہ	ابنِ حجر عسقلانی
الامامۃ والسیاسۃ	ابنِ قتیبہ	صحیح البخاری	امام بخاری
المعارف	ابنِ قتیبہ	تاریخ الخمیس	دیار بکری
فتوح البلدان	بلاذری	شرح نہج البلاغہ	ابن ابی الحدید
انساب الاشراف	بلاذری	عمروؓ بن العاص	حسن ابراہیم حسن
تاریخ الیعقوبی	احمد بن یعقوب	فتوح مصر واعمالہا	ابن اسحاق
تاریخ الامم والملوک	طبری	وفیات الاعیان	ابنِ خلکان
العقد الفرید للملک السعید	قرطبی	الفخری	ابنِ طبا طبا
الاغانی	اصفہانی	فتوح مصر	ابن عبدالحکم
مقاتل الطالبیین	اصفہانی	العقد الفرید	ابن عبد ربہ
تاریخ ابنِ خلدون	ابنِ خلدون	مختصر تاریخ الدول	ابن العبری
انساب القرشیین	مقدسی	المواعظ والاعتبار	مقریزی
الاستیعاب	ابنِ عبدالبر	مروج الذہب	مسعودی
تاریخِ دمشق	ابنِ عساکر	الخلفاء الراشدون	عبدالوہاب نجار
معجم البلدان	یاقوت حموی	تاریخ الامم الاسلامیہ	محمد خضری
مختصر الدول	ابن العبری	التمدن الاسلامی	جرجی زیدان
وقعۃ صفین	نصر بن مزاحم	الاموال	ابن سلام
الکامل	ابنِ اثیر	کتاب الخراج	امام ابویوسف
اسد الغابہ	ابنِ اثیر	کتاب الخراج	یحییٰ بن آدم

الاخبار الطوال	دینوری	الفصل فی الملل والنحل	ابن حزم
تاریخ التشریع الاسلامی	خضری	الفرق بین الفرق	بغدادی
فجر الاسلام	احمد امین	رسائل اخوان الصفا	
حاضر العالم الاسلامی (حواشی)	امیر شکیب ارسلان	الانتصار	خیاط المعتزلی
خطط الشام	محمد کرد علی	عیون الاخبار	ابن قتیبہ
الادارۃ الاسلامیہ فی عز العرب	محمد کرد علی	الحیوان	جاحظ
البیان والتبیین	جاحظ	منہاج السنہ	ابن تیمیہ
عصر المامون	رفاعی	المجمل فی تاریخ الادب العربی	
مسند حنبل	امام احمد بن حنبل	تاریخ الادب العربی	زیات
المؤطا	امام انس بن مالک	الوسیلۃ الادبیہ	مرصفی
الملل والنحل	شہرستانی	علی بن ابی طالب	

فرانسیسی ماخذ

الثلاثۃ	لامنس	رسائل اور مضامین مختلفہ	نولڈیکے
تاریخ شام	لامنس	رسائل اور مضامین مختلفہ	مارٹین
معاویہ	لامنس	رسائل اور مضامین مختلفہ	فان کریمر
یزید	لامنس	رسائل اور مضامین مختلفہ	سپرنگر
تاریخ عرب	ہوار	رسائل اور مضامین مختلفہ	سترک ہرونیہ
اسلام	ماسیہ	رسائل اور مضامین مختلفہ	غروسہ
اسلام	مونتہ	رسائل اور مضامین مختلفہ	ڈوزی
تمدن عرب	گستاف لیبان	رسائل اور مضامین مختلفہ	دینہ
اسلامی عقائد اور شریعت اسلام	گولڈ سیر	دائرۃ المعارف الاسلامیہ	
اسلامی اولیات	پرنس کیتانی	دائرۃ المعارف الافرنسیہ	

انگریزی ماخذ

مختصر تاریخ العرب	سید امیر علی	تاریخ التواریخ مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی	
فتح العرب لمصر	الفرڈ بٹلر	وجہۃ الاسلام	
تاریخ فارس	بنجمن	تاریخ زوال روما	گبن
تاریخ شہنشاہیت بیزنطینیہ	اومان	تاریخ العالم	ولز
تاریخ عرب	جیلیان	المحمدیہ	مارگولیس
خلافت، اس کا عروج و زوال	سر ولیم میور	مختلف مقالات	گیب
تذکرۃ دی غوبی	دی غوبی	انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا	

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح : ۲۵)

اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلے میں (اور) مہربان ہیں آپس میں۔



خلافتِ راشدہ میں عدلیہ اور انتظامیہ

خلفاءِ محمدؐ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد میں عدلیہ اور انتظامیہ

مصنف

ڈاکٹر محمد یُوسف گورایہ

مترجم

محمود عالم قریشی

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں نظامِ عدالت

دستور

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دینی اور سیاسی طور پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیئے ہوئے دستور کے پابند تھے :-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ؕ

اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کی بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم تنازعہ کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے ۔

مندرجہ بالا دستوری دفعہ کے ضوابط" اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)" فردوہ الی اللہ والرسول" (تو اس امر کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو) سب سے پرزور انداز میں مومنوں سے اُن کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں قرآن اور سنت کی پابندی کا تقاضا کرتے ہیں ۔حضرت ابو بکرؓ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پہلے فرد تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر سیاسی اقتدار حاصل کرتے ہی ان دستوری دفعات پر عمل کیا۔ قرآنی دستور کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر حضرت ابو بکرؓ نے اس کی پابندی کا اعلان عوام کے سامنے اپنے پہلے خطبہ میں حکومت کی بنیادی حکمت عملی کے طور پر کیا :-

اے لوگو! مجھے تم پر اختیار دیا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سے بہترین انسان نہیں ہوں ۔ اگر میں حق پر رہوں تو میری حمایت کرنا اور اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے حق کی راہ پر لگانا ۔ حق وفاداری ہے اور جھوٹ ، بغاوت اور غداری ہے۔ تم میں سے جو کمزور ہیں وہ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور رہوں گے جب تک میں ان کا حق انھیں دلاؤں اور طاقتور میرے نزدیک کمزور رہوں گے جب تک میں ان سے اس کا حق نہ چھین لوں ۔ اگر کوئی قوم راہ خدا میں جہاد چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ انھیں ذلت میں مبتلا کرے گا۔ کسی قوم میں وسیع پیمانہ پر برائی پھیلنے پر اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل فرماتا ہے میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں اللہ یا اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر کوئی اطاعت واجب نہیں ۔ نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ ۔ اللہ تعالیٰ تم پر

رحم کرے۔"

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے دستور کی پابندی کا واشگاف اعلان ہے۔ دستور کی یہ شق "اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ۔ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعت لی علیکم" میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں) قرآن کی آیت سے مطابقت رکھتی ہے:

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)

حضرت ابوبکرؓ کا یہ خطبہ کئی دستوری دفعات کا حامل ہے۔ سب سے پہلی دفعہ میں آپ نے ثابت کیا کہ اسلام میں انتقال اقتدار کا طریقہ یہ ہے کہ امت مسلمہ اختیار حکمرانی اپنے آزادانہ انتخاب کے ذریعے اپنے میں سے اہل ترین شخص کے سپرد کرے۔ کیونکہ اختیار حکمرانی اللہ نے پوری امت مسلمہ کو تفویض کیا اگر کوئی شخص امت کی رضا حاصل کئے بغیر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ غاصب ہے۔ اختیار حکمرانی پوری امت کی امانت ہے جسے وہ خود سپرد کرے وہ آئینی طور پر جائز حکمران ہے غاصبانہ قبضہ کرنے والا غاصب اور امانت میں خیانت کرنے والا ہے حضرت ابوبکرؓ نے دوسری دفعہ میں بتایا کہ اختیار حکمرانی حکمران کے پاس امانت ہے یہ امانت اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کے ساتھ مشروط ہے اگر حکمران اس اطاعت سے انحراف کرے تو امت جو اختیار حکمرانی کی مالک ہے اُسے اختیار ہے کہ حکمران کو سیدھا کرے۔ حکمران کو سیدھا کرنے کی دفعہ کے تحت مسلمانوں کو اختیار حاصل ہوا کہ وہ قانون سازی کریں جو حکمران کو آئین کا پابند رکھے اور اگر وہ انحراف کرے تو آئینی اور قانونی نظام کے تحت اس کے خلاف کارروائی کی جا سکے۔ حکمران سے وفاداری کا عہد اس وقت تک قابل عمل ہے جب تک حکمران آئین کے تابع ہے اگر وہ آئین سے غداری کرے تو اس کے ساتھ اطاعت کا عہد خود بخود ختم ہو گیا۔ غدار حکمران کی اطاعت اور حمایت بذات خود غداری ہے۔ قوی ظالم کی سرکوبی اور ضعیف مظلوم کی حمایت اسلامی مدینہ کا نمایاں ترین پہلو ہے جس پر اسے بجا طور پر فخر ہے ضعیف مظلوم کی حمایت جلد سستے اور صحیح انصاف سے ہی ممکن ہے خلافت راشدہ کا نظام عدالت انہیں اصولوں پر قائم تھا۔

نفاذ دستور

دو سال سے کچھ زائد کی مدت جو حضرت ابوبکرؓ کو بطور خلیفہ میسر آئی زبردست شہادت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ خلیفہ نے ان اصولوں کے مطابق حکومت کی اور انہوں نے دستور کے الفاظ اور اُن کی روح کی سختی سے پابندی کی:

"ایک جلیل القدر تابعی حضرت محمدؒ بن سیرینؒ حضرت ابوبکرؓ کے حکمت عملی کے خطبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد سے اب تک ابوبکرؓ سے زیادہ بارعب کوئی دوسرا شخص نہیں پایا گیا اور ان کے بعد حضرت عمرؓ سے زیادہ رعب والا کوئی نہیں پایا گیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس کا حل انہیں قرآن میں نہ ملتا یا سنت رسول میں بھی نہ ملتا تو وہ فرماتے" میں اپنے اجتہاد پر عمل کروں گا اگر یہ درست ہو تو اس کو من جانب اللہ سمجھا جائے گا۔ اگر یہ غلط ہو تو یہ میری طرف سے قصور ہوگا۔ اور میں اللہ سے معافی مانگتا ہوں[۳۱]۔"

دستور میں ترمیم کا ایک مقدمہ

اسلامی ریاست کا اولین فرض قرآن میں دیئے گئے مندرجہ ذیل دستوری ضابطہ کا نفاذ ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ؕ [۴]

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں، نیک کاموں کو کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

مندرجہ بالا ضابطہ میں زکوٰۃ کا نظام (اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ) اسلامی ریاست کی بنیادی حکمتِ عملی کے طور پر بیان ہُوا۔ حضرت ابوبکرؓ کے حکومت سنبھالنے کے بعد ایک مقدمہ قرآن کے دستوری ضابطہ زکوٰۃ کی ترمیم کا آپ کے سامنے پیش ہُوا۔ مقدمہ کی کارروائی مندرجہ ذیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر تقریباً تمام عرب قبائل سوائے قریش مکہ اور طائف میں ثقیف کے حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ عبس، ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور بنو فزارہ کے قبائل جو مدینہ کے نزدیک آباد تھے، نے دستور قرآن میں ایک ترمیم چاہی، ان کا کہنا تھا

وہ نماز جاری رکھیں گے مگر زکوٰۃ ادا نہ کریں گے (یقیمون الصلوٰۃ ویمتنعون من اداء الزکوٰۃ[۵])۔ ان میں سے کچھ لوگ اصولاً زکوٰۃ کی ادائیگی تسلیم کرتے تھے مگر وہ حضرت ابوبکرؓ کو ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(امتنع من دفعھا الی الصدیق[۶])

اپنی اس بات کی حمایت میں انہوں نے قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کا حوالہ دیا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَ تُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ ؕ [۷]

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک وصاف کر دیں گے۔ اور ان کے لیے دعا کیجئے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان (قلب) ہے۔

جو لوگ زکوٰۃ کو اسلام کا جزو لاینفک تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ دلیل دیتے تھے کہ اس آیت "خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً" (آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے) کا حکم خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتا ہے۔ اور آپ کے انتقال کے بعد یہ قابلِ عمل نہیں رہا۔ اور ان کے بعد کسی کو زکوٰۃ اکٹھا کرنے کا حق نہیں۔ بعض لوگ اس حکم کو قرآنی دستور کا مستقل ضابطہ تو تسلیم کرتے تھے مگر وہ حضرت ابوبکرؓ (مرکزی حکومت) کو ادا کرنے کے قائل نہ تھے وہ اپنی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل حکم سے دیتے تھے:

زکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لی جائے اور ان کے غرباء میں بانٹ دی جائے[۸]۔

اس حکم سے یہ دلیل لیتے تھے کہ مدینہ کی مرکزی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنا ضروری نہیں۔ ترمیم منظور کرانے کے لئے انہوں نے درج ذیل دباؤ کا حربہ استعمال کیا: انہوں نے اپنے قبائل سے وفود مرتب کئے اور انھیں مدینہ بھیجا تاکہ وہ رائے عامہ ان کے حق میں ہموار کریں۔ وہ معززین مدینہ کے پاس ٹھہرے (وجوہ الناس) سوائے حضرت عباسؓ کے (جنہوں نے ان میں سے کسی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا) وہ اپنے میزبانوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئے اور خلیفہ کے سامنے اپنے مقدمہ کی وکالت کے لیے بھی انھیں تیار کر لیا۔ بہت بڑے سیاسی بحران اور انتہائی نامساعد حالات میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو درپیش تھے۔ منکرین زکوٰۃ کے میزبان معززین مدینہ نے ان کے وکیل کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ الطبری کے بیان کے مطابق "مسلم معززین (وجوہ المسلمین) نے اس غرض کے لیے منعقد کی گئی ایک غیر رسمی مجلس (اجتمع ملاء من انزلهم علی قبول ذلک[9]) میں ایک قرارداد منظور کی۔ وہ خلیفہ کے حضور پیش ہوئے اور ترمیم کے حق میں بحث کی۔ انہوں نے یہ عذر بھی پیش کیا کہ منکرین کا یہ مطالبہ اسلام کے لیے ان کے دل جیتنے کی خاطر مان لیا جائے تاوقتیکہ دین کی جڑیں ان کے دلوں میں قائم ہوں (ثنا لفهم حتی یتمکن الایمان فی قلوبهم[10])

یہ عذر قرآن کے ایک ضابطے کے حوالے سے تھا۔[11] بحران جس کے تحت ترمیم پیش کی گئی اس کی شدت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے مرتبے کے شخص نے بھی منکرین کے مقدمہ کی حمایت کی اور خلیفہ کو یوں مخاطب کیا:

> "کیا آپ ان لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں حتیٰ کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اسے قبول کرلیں تو میری طرف سے ان کی جانوں اور مالوں کو امن ہے سوائے اس کے جو اس میں سے قابل ادائیگی ہے۔[12]"

فیصلہ

حضرت ابوبکرؓ نے ریاست مدینہ کے سربراہ عدلیہ کی حیثیت سے مقدمہ کی سماعت اور دلائل سننے کے بعد فیصلہ سنایا۔ انہوں نے جو دلائل پیش کئے تھے ان میں سے ہر ایک کا جواب دیا اور اسے رد کیا۔

منکرین زکوٰۃ کا آیت "خذ من اموالهم صدقة" پر اعتماد اور ان کی توضیح کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی زکوٰۃ وصول کرنے کے مجاز تھے کیونکہ حکم الٰہی کا خطاب انھیں سے تھا اور ان کے انتقال کے بعد حکم ساقط اور ناقابل عمل ہوگیا ہے، احمقانہ بات تھی۔ پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اور امت میں سے کوئی بھی اس وحی میں شریک نہ تھا البتہ تمام مسلمانوں پر پورے قرآن کی پابندی لازم تھی۔ یہی جواب اس حدیث کا تھا جس کا حوالہ انہوں نے دیا تھا۔ دونوں احکام الفاظ "خذ" اور "تو خذ" بے شک ابتداءً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے کہے گئے لیکن قرآن کے دیگر قوانین کی طرح ان سے مراد اسلامی ریاست کی مرکزی حکومت کے سربراہ سے ہے۔

مسلم وکلاء کا عذر کہ منکرین زکوٰۃ کو ان کے دل جیت لینے (مؤلفۃ قلوبہم) والی قرآنی آیت کی رعایت دی جائے
اس مقدمہ میں برمحل نہ تھی۔ مذکورہ رعایت نومسلموں کو قبول اسلام کے وقت دی گئی تھی
اور غالباً فتح مکہ کے وقت ان کا قبول اسلام اور مسلم افواج کی حنین کے مالدار عربوں کی طرف پیش قدمی ایک جزو تھا۔
زیر بحث مقدمہ میں منکرین زکوٰۃ باغی تھے۔ ان کو علیحدہ ایک گروہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا وہ مرتدین کی عام بغاوت کا ایک حصہ تھے۔
بغاوت فرو کرنا ضروری تھا اور ایک آہنی ہاتھ سے باغیوں کی سرکوبی لازمی تھی۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کی دلیل کا تعلق ہے کہ جو خدا کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم تسلیم کیا تھا اور ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی تھی حضرت ابوبکرؓ نے ان کی یہ دلیل بھی مسترد کر دی۔ یہ مراعات ایسے لوگوں کو دی جا سکتی تھیں جو پہلے دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے اور حال ہی میں اسے قبول کیا تھا منکرین زکوٰۃ کی صورت حال اس سے مختلف تھی۔ وہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور اس وقت سے ریاست کے واجبات ادا کرتے رہتے تھے۔ پہلے اسے ریاست کا استحقاق قبول کر لینے کے بعد حکومت کے واجبات روک لینے سے وہ قانون سے منحرف ہوئے تھے اور کسی ہمدردی کے مستحق نہ تھے۔ وہ ترمیم اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ انہوں نے اسلام کو سمجھا نہ تھا یا ان کی مالی حالت کمزور تھی۔ ان کی طرف سے یہ کھلی شرارت تھی انہوں نے دستور میں تبدیلی کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا تھا کہ ان کے اندازہ کے مطابق سارے جزیرہ نما میں بغاوت اور مدینہ کے بیشتر مسلمانوں کے اسامہ بن زید کی فوج میں جو شام کی سرحد پر بھیجی گئی تھی شرکت اور روانگی کے باعث ریاست کی حالت مخدوش تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے مزید کہا کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ ایک دوسرے کے تکمیلی جزو ہیں۔ اس لیے ان میں کسی رعایت اور ترمیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا دلائل سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا:

> خدا کی قسم! اگر وہ اونٹ کی ایک رسی بھی دینے سے انکار کریں گے[13] جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اسے روک لینے پر ان کے خلاف اعلان جنگ کر دوں گا۔ زکوٰۃ مال میں ایک حق ہے۔ خدا کی قسم میں ان کے خلاف اعلان جنگ کر دوں گا جو صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں تفریق کریں گے۔[14]

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ میں دیئے گئے دلائل سننے کے بعد حضرت عمرؓ مطمئن ہو گئے تھے۔ انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ درست تھا اور اللہ نے انہیں اس کی صداقت مان لینے کی توفیق دی تھی (فما هو الا ان رأيت الله قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق۔)[15]

اعلیٰ عدالت کے فیصلہ پر ادنیٰ عدالت کی نظر ثانی کا مسئلہ

حضرت ابوبکرؓ کے عدالتی نظام کی بنیاد ان کے ابتدائی خطبہ کی اس شق پر تھی: "والضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذ له حقه والقوی ضعیف عندی حتی اخذ منه الحق۔"[16] (تم میں سے جو کمزور ہیں وہ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہوں گے جب تک میں ان کا حق انہیں دلا دوں اور طاقتور میرے نزدیک کمزور رہیں گے جب تک میں ان سے ان کا حق نہ چھین لوں)۔ یہ رہنما اصول

ان کے قانونی اور سیاسی فیصلوں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ کبھی طاقتور کے آگے نہیں جھکتے تھے جب انہیں اس سے کسی کا حق ہیٹا ہوا اور فریادی کی شکایت دور کرنا ہوتی۔ وہ اس بات میں بہت حساس تھے کہ کسی اعلیٰ عدالت کے فیصلہ پر نظرثانی کی جائے۔ پہلا اہم ترین معاملہ جو فیصلہ کے لیے ان کے سامنے پیش ہوا وہ حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کی کمان میں فوجوں کی روانگی تھی۔ اس مقدمہ کی تفصیل یوں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ذرا پہلے ایک فوج تیار کی تاکہ زیدؓ بن حارثہ، جعفرؓ بن رواحہ اور دوسرے جو رومی اتحادیوں کے ہاتھوں مؤتہ کی جنگ میں شام کی سرحد پر شہید ہوئے تھے ان کی شہادت کا بدلہ لیں۔ اور آپ نے اس فوج کو حضرت اسامہؓ بن زید کی کمان میں دیا۔ فوج کی روانگی سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے۔ اس کے بعد بعض صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں اس مہم پر عمل کرنا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منصوبہ بنایا تھا عقلمندی نہیں۔ یہ معاملہ فیصلہ کے لئے خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو فوج کی روانگی کے خلاف تھے انہوں نے دلائل دیئے:

عرب عوام اور عرب قبائل کے معززین مرتد ہو گئے ہیں۔ ریاکاری ابھر آئی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے سر اٹھایا ہے اور گردن بڑھالی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان ایک برسات کی رات کی بھیڑوں کی طرح ہیں کیوں کہ وہ تعداد میں کم ہیں اور دشمن کی تعداد زیادہ ہے۔ لوگوں نے آپؓ سے سوال کیا کہ فوج مسلمانوں کی اکثریت ہے اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ عرب کس بات پہ تلے ہوئے ہیں انہوں نے آپ کی اطاعت کی قسم توڑ دی ہے لہٰذا آپؓ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ مسلمانوں کی کثیر جماعت سے خود کو دور کر لیں۔[۱۸]

فوجوں کے کماندار حضرت اسامہؓ بن زیدؓ جیسے شخص نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے جو ان کی فوج میں سپاہی تھے کہا وہ شام کی طرف کوچ کرنے کے بجائے مدینہ میں قیام کریں۔ حضرت اسامہؓ نے حضرت عمرؓ کو کہا کہ لوگوں میں سے اہم اور معزز آدمی ان کے ساتھ جا رہے ہیں اور انھیں خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا اطمینان نہیں۔[۱۸]

انصار نے ایک اور نکتہ اٹھایا جو وہ خلیفہ سے اس صورت میں طے کرانا چاہتے تھے کہ وہ فوج کی روانگی پر اصرار کریں۔ انہوں نے بھی حضرت عمرؓ کو خلیفہ کے روبرو اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے تیار کیا۔ انہوں نے دلیل دی کہ اگر خلیفہ اسامہ کی درخواست مسترد کر دیں اور ہمیں روانگی پر مجبور کریں تو ان سے التجا کی جائے کہ کسی اور کو جو اسامہؓ سے زیادہ معمر ہو ان کا کماندار مقرر کر دیں۔[۱۹]

حضرت عمرؓ، حضرت اسامہؓ اور متذکرہ بالا دوسرے گروہوں کے وکیل کی حیثیت سے دارالخلافہ روانہ ہوئے اور خلیفہ کے روبرو پیش ہوئے۔ آپ نے ان کے مقدمہ کی پیروی کی اور ان کو حضرت اسامہؓ کا پیغام پہنچا دیا۔ دلائل سننے کے بعد خلیفہ نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنا دیا:

"اگر کتے اور بھیڑیئے مجھے گھسیٹ لے جائیں تو بھی میں وہ فیصلہ واپس نہیں لوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا (لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم ارد قضاءً قضابه رسول اللہ)"[۲۰]

جب حضرت عمرؓ نے آپ کو انصار کی التجا پیش کی کہ حضرت اسامہؓ کی جگہ کسی اور کو فوج کا کماندار بنا دیں تو خلیفہ نے درج ذیل فیصلہ سنایا:

حضرت ابوبکرؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ کر بولے :

"تمہاری ماں تمہیں کھو دے اے ابن الخطاب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (اسامہ کو) مقرر کیا تھا اور تم مجھ سے چاہتے ہو کہ اسے معزول کر دوں (استعملہ رسول اللہ وتأمرونی ان انزعہ)[21]

مقدمہ کی مندرجہ بالا کارروائی عدل کے درج ذیل بنیادی اصول ظاہر کرتی ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے مقرر کئے :

۱۔ آپ نے یہ سب سے بنیادی اصول قائم کیا کہ جس مقدمہ کا فیصلہ کوئی اعلیٰ عدالت کر دے اس پر چھوٹی عدالت کو نظر ثانی کا اختیار نہیں۔

۲۔ عدالت کے فیصلہ کے بعد انتظامیہ کے پاس کوئی اختیار باقی نہیں رہتا بجز اس کے کہ وہ ہر قیمت پر اسے نافذ کرے خواہ حکومت کو اس کے نفاذ کے وقت کتنے ہی مخالف حالات کا سامنا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا مقدمہ

حضرت ابوبکرؓ کی عدلیہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مختلف قانونی، سماجی اور سیاسی تنازعوں میں بے رو رعایت فیصلے کئے گئے۔ سب سے نازک اور حساس قانونی مسئلہ جو تصفیہ کے لئے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کیا گیا وہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا دعویٰ تھا۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ دونوں حضرت ابوبکرؓ کی عدالت میں گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی وارث ہونے کا دعویٰ کیا اور آپؐ کے ورثہ میں سے اپنا اپنا حصہ مانگا۔ دونوں نے خصوصاً آپؐ کی زرعی زمین جو فدک اور خیبر میں تھی اس پر حق جتایا۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ کا دعویٰ اور ان کے دلائل پوری ہمدردی اور پورے صبر و تحمل کے ساتھ سنے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مقدمہ کی نزاکت اور حساسیت کو محسوس کیا انہوں نے قانون کو ایک طرف پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے لیے اپنے جذبات کو دوسری طرف دیکھا۔ تاہم ایک جج کی حیثیت سے ان کا غیر متعصب، غیر جانبدار اور آزاد رائے ہونا ضروری تھا۔ انہوں نے آئین و قانون اسلام کے مطابق اپنے فیصلہ کا اعلان دعوے داروں کے دعویٰ کے خلاف کیا اور بے رو رعایت انصاف کے اصول قائم رکھے۔ اپنے فیصلہ میں انہوں نے لکھا کہ آپؐ نے مقدمہ زیر غور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سنا ہے اور اسی کو قائم رکھیں گے۔ پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا۔

ہم (انبیاء) کی وراثت نہیں ہوتی۔ ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے (لا نورث ما ترکنا فهو صدقة)[22]۔ البخاری نے ایک اور بیان تحریر کیا ہے۔ میرے ورثا دینار تقسیم نہیں کریں گے۔ میں اپنی بیویوں کے نفقات اور اپنے منتظم کی کفالت سے فالتو جو ترکہ چھوڑوں گا وہ صدقہ ہوگا (لا یقتسم ورثتی دینارا ما ترکت بعد نفقة نسائی و معونة عاملی فهو صدقة)[23]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ بالا حکم بیان کرنے کے بعد انہوں نے طے کیا :

خدا کی قسم! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے انحراف نہ کروں گا جس کا میں گواہ ہوں۔ میں اسے نافذ کروں گا

(واللہ لا ادع امراً رایت رسول اللہ یصنعہ الا صنعتہ)[۲۴]

الطبری کے مطابق حضرت ابوبکرؓ دعویداروں کے احتجاج کے باوجود اس فیصلے پر قائم رہے۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے چاہا کہ خلیفہ سے ان کے تعلقات بہتر ہو جائیں۔ بنو ہاشم کے ایک اجتماع میں جو مصالحت کے لئے بلایا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار پھر انہیں یاد دلایا کہ جائیداد کے دعوے سے متعلق ان کا فیصلہ محض نیک نیتی (الخیر) پر مبنی تھا کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا تھا:

ہماری وراثت نہیں ہوتی۔ جو ترکہ ہم چھوڑتے ہیں ایک صدقہ ہوتا ہے۔ ما اللہ کی پناہ! اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر عمل نہ کروں۔[۲۵]

مدینہ کی عدالت عالیہ کا چیف جسٹس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بہت ہی منظم و مربوط عدالتی نظام چھوڑا تھا۔ آپؐ مدینہ کی عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس تھے۔ آپ نے ان صوبوں میں جو مدینہ کی مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آ گئے تھے صوبائی اور ضلعی جج مقرر فرمائے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے جانشین کی حیثیت سے منتخب ہوئے اور انہوں نے حکومت اسی طرح چلائی جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت پائی تھی۔

جو فیصلے اوپر بیان ہوئے ہیں: آئین اسلام میں ترمیم کرنے کا مسئلہ، ایک اعلیٰ عدالت کے فیصلہ پر ادنیٰ عدالت کی نظرثانی کا مقدمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا مقدمہ ظاہر کرتے ہیں کہ کس نوعیت کے مقدمات حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ عام طور پر ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو پیش آنے والے دستوری مسائل سے تھا۔ ان کا تعلق قرآن کے ساتھ ساتھ دوسرے منبع قانون کی حیثیت سے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعین تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے بحیثیت خلیفہ وہ پیچیدہ نوعیت کے مقدمے بھی سنے جو فوجی کمانداروں، صوبائی اور ضلعی ججوں کے دائرہ اختیار سے باہر تھے۔ بعض ایسے اہم مقدمات پر ذیل میں بحث کی جاتی ہے جن کا فیصلہ حضرت ابوبکرؓ نے کیا۔

سپہ سالار اعظم کے خلاف ایک مقدمہ

حضرت ابوبکرؓ کے تحت عدلیہ معاشرہ کے ہر طبقہ کو سستا انصاف مہیا کرتی تھی۔ تمام نسلوں، علاقوں اور مذاہب کے لوگ خلافت کے کسی بھی رکن کے خلاف اس کی معاشرتی اور سرکاری حیثیت سے قطع نظر اپنی شکایات کا ازالہ حاصل کر سکتے تھے۔ ایک عام سپاہی مسلم افواج کے سپہ سالار اعظم کے خلاف شکایات یا دعویٰ دائر کر سکتا تھا۔ مندرجہ بالا بیان کی تصدیق میں درج ذیل مقدمہ بیان کیا جاتا ہے:

خالدؓ بن ولید کی فوج کے ایک سپاہی ابوقتادہ نے ان پر مالک بن نویرہ کے قتل کا الزام لگایا۔ دونوں نے دلائل دیئے مگر ایک دوسرے کو مطمئن نہ کر سکے۔ اس کے بعد ابوقتادہ نے مقتول کے ایک بھائی متمم بن نویرہ کے ساتھ مل کر مدینہ کی عدالت میں خالدؓ بن ولید

کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے قتل کا مقدمہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کیا۔ دارالخلافہ میں قیام کے دوران انہوں نے حضرت عمرؓ سے بھی بات کی۔ جنہوں نے فریقین مقدمہ کو نہیں سنا تھا کیونکہ خالد کو ابھی عدالت نے طلب نہیں کیا تھا اس لیے ان کی یہ رائے کہ خالد کو معزول کر دیں کیونکہ ان کی تلوار ظلم و تشدد کے لیے بے نیام ہو گئی ہے ا ان یعزلہ ان فی سیفہ رھقا[۲۹] عدالت سے باہر غیر سرکاری ذاتی رائے تھی حضرت ابوبکر مدعیوں کے ظاہری بیان سے مطمئن نہ تھے۔

ملزم کی طلبی

حضرت ابوبکرؓ کبھی بھی مدعی اور مدعا علیہ کو اپنا اپنا موقف تفصیلاً پیش کرنے کا موقع دیئے بغیر فیصلہ نہ کرتے تھے۔ پس آپؓ نے خالدؓ بن ولید کو بذات خود آپ کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے طلب فرمایا (کتب ابوبکر الی خالد ان یقدم علیہ[۲۷]) اور اپنے خلاف قتل کے الزام میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کہا۔ طلبی کے جواب میں سپہ سالارِ اعظم خود عدالت میں پیش ہونے کے لیے خود مدینہ حاضر ہوئے یہ بات اس اہم عدالتی اصول کا واضح ثبوت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے نظام عدالت میں اتنا استحکام اور پختگی موجود تھی کہ شکایت اور الزام کی صورت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی عدالت میں موجودگی اور حاضری لازمی تھی مدعی اپنا دعویٰ مدعا علیہ کی موجودگی میں پیش کرے اور مدعا علیہ خود جرم خود سنے پھر مدعا علیہ اپنے خلاف فرد جرم کا جواب خود دے۔ اسی قاعدہ اور اصول کو آج کل نیچرل جسٹس کا نام دیا گیا ہے تحقیق کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کوئی نظریہ، اصول قاعدہ ضابطہ یا قانون کب بنا یہ وقت اس اصول و قانون کی اولیت کا ثبوت ہوتا ہے۔ عہدِ رسالتؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظام عدالت کا یہ مسلمہ عدالتی طریق کار تھا کہ مدعی، مدعا علیہ کی حاضری ضروری قرار دی گئی تھی، گواہ گواہی دیتے تھے۔ گواہوں پر جرح ہوتی تھی اور فیصلہ ظاہری شہادت پر دیا جاتا تھا۔ جو لوگ اس عہد کے نظامِ عدالت کی تفصیلات سے ناواقف نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نیچرل جسٹس کا یہ عدالتی طریق کار عہدِ حاضر کی پیداوار ہے ہم نے وافر دلائل سے ثابت کیا کہ یہ طریق کار عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ کی عدالتوں کا معمول تھا۔

اس عہد میں عدل و انصاف کا معیار ملحوظ رکھنا ضروری ہے وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جس وسیع پیمانے پر بغاوت ہوئی تھی اس کی تفصیلات سب جگہ موجود ہیں، اس بغاوت کو فرو کرنے پر خالد بن ولید مامور تھے اس نازک صورت میں ان پر قتل کا الزام لگا اب یہ موقع تھا کہ ایک شہری شکایت کو نظر انداز کر دیا جاتا اور سپہ سالارِ اعظم کو ریاست کی اہم ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا موقع دیا جاتا مگر اسلام عدل کے تقاضوں کو پورا کرنا باقی تمام فرائض سے مقدم سمجھتا ہے اس لئے سپہ سالارِ اعظم کو محاذِ جنگ سے عدالت میں پیش ہونے کا حکم ہوا غالباً تاریخ میں یہ نادر واقعہ ہے یہ ہے اسلامی نظامِ عدالت۔

ملزم کا بیان

خالدؓ بن ولید نے مندرجہ ذیل بیان دیا جس میں انہوں نے مقدمہ کی تفصیلات بتائیں:

بنو ثعلبہ بن یربوع کے مالک بن نویرہ اور جنگجوؤں کا ایک گروہ مسلم افواج نے گرفتار کیا اور ان کے مظالم کے خلاف فیصلہ کے لیے انھیں سپہ سالارِ اعظم کے سامنے پیش کیا۔ گرفتار کرنے والے فوجیوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ انہوں نے اذان کا جواب دیا تھا اور نماز ادا کی یا نہیں۔ ایک گرفتار کرنے والے سپاہی ابوقتادہ کا کہنا تھا کہ انہوں نے جواب دیا اور نماز پڑھی تھی مگر دوسروں نے اسکی تردید کی

اس تنفیذ کو دور نہ کیا جا سکا۔ پس فیصلہ ملتوی کر دیا گیا اور قیدیوں کو بعض سپاہیوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ یہ بہت ٹھنڈی رات تھی۔ سردی بڑھتی رہی۔ سپہ سالار خالدؓ نے پکارنے والے کو حکم دیا جس نے اعلان کر دیا "اپنے قیدیوں کو گرم رکھو" (ادفئوا اسرکم) بعض فوجیوں کی بولی میں اس کا مطلب تھا "اپنے قیدیوں کو مار ڈالو"۔ قیدیوں کے محافظ یہی بولی بولتے تھے انہوں نے سوچا کہ سپہ سالار نے انھیں مار ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ پس انہوں نے ان کو مار ڈالا۔ ضرار بن الازور نے مالک بن نویرہ کو قتل کر دیا۔ خالدؓ نے شور و غوغا سنا اور بھاگ کر اپنے خیمہ سے نکلے۔ اس وقت تک وہ انھیں مار چکے تھے۔ انہوں نے آہ بھری "جو اللہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے"۔ لوگوں نے ان کے متعلق مختلف خیال ظاہر کیا۔ ابوقتادہ نے ساری ذمہ داری خالدؓ کے کاندھوں پر ڈال دی[۳۹] جس نے انھیں سرزنش کی اور ان پر ناراض ہوئے۔ اس پر ابوقتادہ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ کے حضور شکایت پیش کی وہ بھی ابوقتادہ پر ناراض ہوئے۔ اس پر اس نے حضرت عمرؓ سے بات کی جنہوں نے کہا کہ خالدؓ کی تلوار ظلم و تشدد کے لیے بے نیام ہو گئی ہے۔ آپؓ نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ الزام درست نہیں تب بھی انھیں (خالد کو) قابو میں رکھنا ضروری ہے اور انہوں نے اس پر اصرار کیا۔[۴۰]

خالد کے بیان کا ایک اور متن یوں بیان کیا گیا ہے:

جب مالک بن نویرہ اور اس کے فوجی قید کر کے لائے گئے تو مسلمان افواج کے سپہ سالار اعظم نے مالک سے پوچھا:

"تم جانتے ہو کہ ادائے زکوٰۃ نماز کے ساتھ کس قدر مربوط ہے"۔ مالک نے جواب دیا "یہ تمہارے سربراہ (خلیفہ) کا نظریہ ہے"۔ پھر خالدؓ نے پوچھا "کیا وہ صرف ہمارے سربراہ ہیں تمہارے نہیں؟ اے ضرار! اس کا سر قلم کر دو"۔

اس کا سر قلم کر دیا گیا۔[۴۱]

فیصلہ کا اعلان

مستغیث اور ملزم نے عدالت میں اپنے بیان دیئے۔ انھیں پوری شہادت جو ان کے پاس تھی پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا۔ بیانات اور شہادت کو عدالت نے پرکھا۔ ضروری عدالتی کارروائی مکمل کرنے کے بعد خلیفہ نے اپنے فیصلہ کا یوں اعلان کیا:

"میں وہ تلوار نیام میں نہ رکھوں گا جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے بے نیام کر دی ہے (لم اکن لأشیم سیفاً سلّہ اللہ علی الکافرین)"[۴۲] خالدؓ نے مالک بن نویرہ کو مارنے کے معاملہ میں اپنی قوت فیصلہ (اجتہاد) سے کام لیا اور ایسا کرنے میں غلطی کا مرتکب ہوا۔ ایسے ہی ایک مقدمہ میں ایک اعلیٰ عدالت کا فیصلہ موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ (عرب کا ایک قبیلہ) کی طرف بھیجا۔ اس قبیلہ کے قیدی خالدؓ کے سامنے لائے گئے۔ اپنی بریت کے لیے قیدیوں نے کہا "ہم نے مذہب ترک کر دیا ہے"۔ (صبأنا صبأنا) اور واضح طور پر یہ نہیں کہا "ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے"۔ (اسلمنا)۔ خالدؓ کی نظر میں قیدیوں کا بیان ارتداد کے مترادف تھا۔ پس آپ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فیصلہ کیا کہ یہ قیاس کی غلطی تھی اور خالدؓ قتل کا ذمہ دار قرار نہ دیا گیا۔ اور نہ ہی انھیں معزول کیا گیا تھا۔ تاہم چونکہ یہ قرار پا چکا تھا کہ قیدی اپنے اسلام کا واضح طور پر اظہار نہ کر سکے تھے اس لیے انکا خونبہا ریاست کی طرف سے ادا کر دیا گیا تھا۔[۴۳]

اس نظیر کے پیش نظر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ زیر نظر مقدمہ میں خالد نے اپنی

قوت فیصلہ سے کام لیا اور غلطی کا مرتکب ہوا۔ (تأول فاخطا)[۳۴] پس وہ مالک بن نویرہ کے قتل کا ذمہ دار نہیں۔ مگر آپؓ کے خیال میں مستغیث کو نقصان پہنچ چکا تھا اس لئے آپؓ نے مقتول کا خونبہا اس کے بھائی متمم بن نویرہ کو ادا کر دیا۔[۳۵]

گواہ

مندرجہ بالا مقدمہ میں ابوقتادہ، الحارث بن ربعی جو انصار مدینہ میں سے بنو سلمہ[۳۶] کے بھائی عدالت میں بطور گواہ پیش ہوئے تھے۔ وہ ان فوجیوں میں سے تھے جنہوں نے مالک بن نویرہ کو گرفتار کیا تھا اور اس کو اور اس کی فوج کو قیدی بنا کر لائے تھے۔ تمام فوج نے اس امر کی گواہی دی کہ قیدیوں نے نہ اذان دی نہ نماز ادا کی (انھم لم یؤذن ولا صلوا)[۳۷]۔ ابوقتادہ واحد شخص تھے جو کہتے تھے کہ "انہوں نے نماز ادا کی"۔ (فشھد ابوقتادہ الحارث بن ربعی الانصاری انھم اقاموا الصلوٰۃ)[۳۸]۔

ابوقتادہ کے متعلق بتانے والی اہم بات یہ ہے کہ وہ ان انصار میں سے تھے جنہوں نے بنو تمیم اور سجاح بنت الحارث کے خلاف کامیاب معرکہ آرائی کی۔ مگر اس مہم کے بعد انہوں نے مالک بن نویرہ کے خلاف آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جو اپنی فوجوں کے ساتھ البطاح کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ ان کا انکار مذہبی یا نظریاتی بنیادوں پر نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کام خلیفہ نے ان کے سپرد کیا تھا وہ البزاخہ کی مہم کے بعد مکمل ہو چکا تھا۔ اور انھیں مزید احکامات نہیں ملے تھے۔ (قالوا ما ھذا بعھد الخلیفۃ الینا ان الخلیفۃ عھد الینا ان نحن فرغنا من البزاخۃ واستبرأنا بلاد القوم ان نقیم حتی یکتب الینا)[۳۹]۔

خالد نے انھیں مطلع کیا "اگر یہ حکم تمھیں ملا تھا، تو خلیفہ نے مجھے آگے بڑھنے کے احکام بھیجے اور میں سپہ سالار ہوں تازہ احکام میرے پاس آتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر مجھے ان کا کوئی خط یا حکم نہ بھی آیا ہو اور میں محسوس کروں کہ باغیوں کی سرکوبی کا اچھا موقع ہے تو میں اس کا فائدہ اٹھاؤں گا۔ پس میں مہاجرین اور تابعین کے ہمراہ پیش قدمی کر رہا ہوں اور میں تمھیں مجبور نہیں کرتا اور وہ آگے بڑھ گئے۔ انصار شرمندہ ہوئے اور بڑبڑائے۔ انہوں نے کہا اگر فوج کے ہاتھ مال غنیمت لگا تو وہ اس سے محروم رہ جائیں گے اور اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تو ان پر (انصار پر) فرار کا الزام عائد ہوگا۔ تب وہ خالدؓ کے ساتھ جا ملنے کو تیار ہو گئے اور انھیں ایک پیغام رک جانے کے لیے بھیجا۔ پھر وہ ان سے جا ملے۔

مالک بن نویرہ کے خلاف مہم کا مندرجہ بالا پس منظر ظاہر کرتا ہے کہ ابوقتادہ اور اس کے ساتھی ابتداً اس کے حق میں نہ تھے مہم میں ان کی شمولیت مجبوری کے عالم میں خارجی وجوہ سے تھی۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کی طرف سے خالدؓ کی مخالفت کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے، ان کو ان حالات کا پورا علم نہ تھا جن کے تحت مالک بن نویرہ قتل ہوا۔ دوسری چیز جس نے ان کے ظن میں اضافہ کیا اور طیش بڑھایا وہ مالک بن نویرہ کی بیوہ ام تمیم سے خالدؓ کی شادی تھی۔ آپؓ نے اس بات پر خالد کو مدینہ آمد پر سخت سست بھی کہا تھا۔

اسلام میں عدلیہ کی بالادستی کی یہ بہترین مثال ہے ایک سپہ سالار اعظم کے خلاف قتل کا الزام لگتا ہے جبکہ وہ ریاست کی سلامتی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ مگر اسلام میں عدلیہ کا تصور یہ ہے کہ افواج، اموال، وسائل و ذرائع دولت سب کے سب انسانی عزو شرف کی حفاظت، جان و مال

اور عزت و آبرو کی نگہداشت کے لیے ہیں۔ عدلیہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان اعلیٰ مقاصد اور اقدار کی بالادستی قائم کرے۔ عدل و انصاف کے قیام کی راہ میں حکومت کا سربراہ افواج کا سربراہ، عدلیہ کا سربراہ مقننہ کا سربراہ انتظامیہ کا سربراہ رکاوٹ نہیں بن سکتے، چونکہ ملک و قوم کی بقا کا دارومدار عدل و انصاف پر ہے اس لئے عدل ملکی بقا سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے کہ ملکی بقا بے انصافی اور ظلم پر قائم ہو سکتی ہیں ملک کا قیام اور بقا ظلم و عدوان پر مبنی ہو اس کا قائم نہ رہنا قائم رہنے سے بہتر ہے۔ عدل میں جو قوت ہے وہ ظلم میں نہیں۔ اس لیے جو حکومت عدل کو ترجیح دیتی ہے وہ دراصل ملکی بقا کا انتظام کرتی ہے اور جو حکومت ظلم کے ذریعے ملکی قیام و بقا کی کوشش کرتی ہے وہ دراصل ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہے۔ یہی راز تھا اس فیصلہ کا کہ اگرچہ خلافت کو سنگین ترین ملکی بقا کا مسئلہ درپیش ہے مگر خلیفہ کی نظر میں اس کا حل یہ تھا کہ سپہ سالار اعظم کو عدالت انصاف میں پیش کر کے گواہی و شہادت کے مطابق فوری طور پر فیصلہ کر دیا جائے اس سے ملکی دفاع کی قوت میں مزید اضافہ ہوا۔ اگر حضرت علیؓ بھی حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے خلاف اسی حکمت عملی سے کام لیتے تو تاریخ اسلام کی موجودہ شکل مختلف ہوتی۔

ایک مسلمان کے قتل کا مقدمہ

دو آدمیوں نے اسلام قبول کیا ان کے پاس حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے امن نامہ بھی تھا۔ انھیں قتل کر دیا گیا۔ وہ عبدالعزیٰ بن ابی رہم اور لبید بن جریر تھے۔ اول الذکر کو جریر بن عبداللہ البجلی نے قتل کیا تھا اور دوسرے کو کسی دوسرے مسلم فوجی نے قتل کیا تھا۔ فوجی حکام اس کا فیصلہ نہ کر سکے کیونکہ شاید یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جو اس قسم کی مہم کے دوران پیش آیا۔ اس لئے مقدمہ مدینہ میں خلیفۃ المسلمین کے حضور بھیج دیا گیا۔ پہلی اطلاع کے ساتھ نہ ثبوت موجود تھا اور نہ دلائل اور نہ ہی تفتیشی معلومات دستیاب تھیں حضرت عمرؓ نے بادی النظر میں حضرت خالد پر شک کا اظہار کیا۔ ایک اہم اصول یہ تھا کہ عدالتی طریق کار کے مطابق ادنیٰ عدالتیں اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرتی تھیں۔ اہم ترین قاعدہ یہ بھی تھا کہ سول اور فوج کے لیے علیحدہ علیحدہ عدالتی نظام قائم نہ تھا ریاست کے تمام شہری برابر تھے خواہ وہ کسی حیثیت میں سول انتظامیہ یا فوجی انتظامیہ میں کسی بھی عہدے پر کام کرتے ہوں۔

فیصلہ

حضرت ابوبکرؓ نے مقدمہ کے متعلق جملہ حالات واقعات اور معلومات کا جائزہ لیا۔ مقدمہ کی پوری تفصیلات سننے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد آپؓ نے قرار دیا:

ان لوگوں کو ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو دشمنانِ اسلام کے علاقہ میں قیام کریں (کذالک یلقی من ساکن اھل الحرب فی دیارھم)[41]۔ آپ نے بہرحال مقتولین کا خون بہا ادا کر دیا اور ان کے بال بچوں کی نگہداشت کے لیے حکم بھیج دیا[42]۔

اس سے ثابت ہوا کہ فیصلے جلد بازی اور بے سوچے سمجھے نہیں کئے جاتے تھے گواہی شہادت تفتیشی معلومات کی بنیاد پر فیصلے ہوتے تھے

یمن کے ایک جج کے فیصلہ کے خلاف اپیل

یمن کے ایک شخص پر چوری کا الزام لگا۔ تفتیش کرنے اور شہادت پر غور کرنے کے بعد متعلقہ ضلع کے جج نے حکم دیا کہ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹ دیا جائے۔ ملزم نے یمنی جج کے فیصلے کے خلاف مدینہ میں خلیفۃ المسلمین کے حضور اپیل دائر کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ نے مستغیث کو عدالت میں طلب کیا اس کا بیان سنا اور فیصلہ محفوظ رکھا جس کا اعلان بعد میں ہونا تھا۔ مقدمہ آپ کے سامنے زیر تجویز تھا اور وہ شخص مدینہ میں مقیم تھا۔ رات کو اس شخص نے ایسی جگہ نماز ادا کرنا شروع کی کہ اسے دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "ان کا چوری کی بات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے (ایسا نیک آدمی کیونکر چوری کر سکتا ہے)" بعد میں حضرت ابوبکرؓ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس کے زیورات چوری ہو گئے۔ تحقیقات اور تفتیش کی گئی۔ وہ آدمی بھی تلاش کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "اللہ! جس آدمی کو اس نیک گھر والوں نے پناہ دی ہے اسے حفاظت میں رکھنا"۔ تفتیش کے نتیجہ میں زیورات ایک سنار کے پاس پائے گئے۔ سنار پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے بیان دیا کہ ہاتھ کٹا آدمی زیورات اس کے پاس لایا تھا اور اس کے ہاتھ فروخت کئے تھے۔ ملزم پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کے دوران اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اقبال جرم کیا۔ اس چوری نے اس شخص کے کردار پر روشنی ڈالی اور اس کی پہلی شکایت جو حضرت ابوبکرؓ کے پاس زیر غور تھی اس کا بھی تصفیہ ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فیصلہ سنا دیا جس کے مطابق چور کا بایاں ہاتھ بھی کاٹ ڈالا گیا۔ آپؓ نے تبصرہ کیا کہ "خدا کی قسم! اس شخص کی اللہ سے حفاظت کی دعا مجھ پر اس کی چوری سے زیادہ گراں بار ہے۔"[۴۳]

زنا کا مقدمہ

امام مالکؒ نے اپنی المؤطا میں اور البیہقی اپنی سنن میں زنا کے ایک مقدمہ کا ذکر کیا ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوا تھا۔ مقدمہ کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

"حضرت ابوبکر الصدیقؓ مسجد مدینہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آپؓ کے سامنے آیا وہ عدالت انصاف میں اپنی شکایت پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ مبہم گفتگو کر رہا تھا اور پریشان نظر آتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مستغیث کو ہدایت کی کہ اپنا مقدمہ عدلیہ کے سربراہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش کرے چنانچہ آپ کی ہدایت پر یہ مقدمہ حضرت عمر کی عدالت میں پیش ہوا۔

شکایت کنندہ نے حضرت عمرؓ کی عدالت میں درج ذیل بیان دیا:

"ایک مہمان اس کے یہاں آیا اور اس کے گھر ٹھہرا۔ قیام کے دوران اس نے اس کی بیٹی سے زنا کیا۔ شکایت کنندہ کا بیان سن کر حضرت عمرؓ نے افسوس کے ساتھ اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور کہا "اللہ تجھے برباد کرے۔ تو نے اپنی بیٹی کی عزت کی حفاظت کیوں نہیں کی؟ (تو نے اس واقعہ پر پردہ کیوں نہ پڑا رہنے دیا۔)"

حضرت عمرؓ نے مستغیث کا بیان لیا۔ اس پر جرح ہوئی گواہی و تحقیقاتی معلومات کے نتیجے میں زنا کا ارتکاب ثابت ہو گیا حضرت

عمرؓ نے فیصلہ سنایا اور مجرموں کو سزا کے لئے انتظامیہ کے سپرد کر دیا گیا جس پر اس آدمی اور عورت کو کوڑے لگائے گئے۔ اس کے بعد ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیئے گئے (یہ زنا کی سزا کا حصہ ہے)

ہم نے مندرجہ بالا مقدمات کی مثال یہ ثابت کرنے کے لیے دی ہے کہ اول تو ہر قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمات عدلیہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض بہت سنگین نوعیت کے تھے اور بعض قانونی پیچیدگی کے حامل تھے۔ یہ بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ عدالتی فیصلوں کا نفاذ انتظامیہ کی طرف سے فوری طور پر کیا جاتا تھا۔ آخر میں یہ بات قابل غور ہے کہ مثبت اور صفائی قانون کی روایات مدینہ کی منظم حکومت کے تحت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے تحت عدالتی نظام

ایک مثالی عدالتی نظام آفاقی اور ہمہ گیر عدل و انصاف کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ اہم ترین اصول یہ ہے کہ وہ ایک واضح آئین کے تحت قائم ہو۔ حضرت ابوبکرؓ کا نظام عدالت ایک واضح آئین کے تحت قائم تھا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ مدعی، مدعا علیہ، مستغیث اور ملزم کو ثبوت اور صفائی کے مساوی مواقع حاصل ہوں، فیصلے ظاہری شہادت پر ہوتے ہوں عدالتی طریق کار آسان سستا اور جلد انصاف فراہم کرنے والا ہو۔

عدالتی تاریخ کے مؤرخین اور ماہرین قانون و عدالت انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کو نظام عدالت کی پختگی، غیر جانبداری اور فراہمی انصاف کے لیے بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں ابواب میں ان عدالتی مسلمہ اصولوں کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ اصول اسلامی عدالت میں کارفرما رہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سربراہ حکومت، عدلیہ اور مقننہ تھے مگر یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ آپؐ کا نظام امت کی اجتماعی رائے شوریٰ کے اصول اور جمہوری اقدار پر مبنی تھا مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ تھے۔ ان تمام مناصب کے باوجود آپؐ نے انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے اصول کی اہمیت واضح فرمائی۔ اپنے ساتھ مدینہ میں حضرت عمرؓ کو عدلیہ کا سربراہ مقرر کر کے آپؐ نے اس عدالتی اصول کو عملی شکل دی۔ صوبوں میں قضا کا نظام قائم کیا اور قاضی مقرر کئے۔ یمن میں حضرت علیؓ صوبائی عدلیہ کے سربراہ تھے حضرت معاذؓ، حضرت ابو موسیٰؓ الاشعری، حضرت عمروؓ بن حزم اپنے اپنے علاقہ کے قاضی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے خلیفہ راشد تھے آپ انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے اصول سے پوری طرح سے باخبر تھے۔ اس کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ تھے۔ جلیل القدر صحابہ کرام بھی اس اصول کی عدالتی ضرورت کو خوب سمجھتے تھے۔ جماعت صحابہ نے عدلیہ نظام کے اس اہم اور مرکزی اصول کو حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جس طرح نافذ کیا اس کی تفصیل یہ ہے:

جب حضرت ابوبکرؓ نے حکومت سنبھالی تو پورا جزیرہ نما عرب ریاست مدینہ میں شامل ہو چکا تھا۔ ارتداد کی جنگ جو آپؓ کی حکومت کی ابتدا میں شروع ہوئی تھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور جزیرہ نما عرب ریاست کے پوری طرح قابو میں آ چکا تھا۔ عراق اور شام کے بڑے حصے فتح کے بعد اسلامی ریاست میں شامل ہو چکے تھے۔ گذشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کے لیے انتہائی پر جوش اور مخلص تھے اور آپؓ کی حکمت عملی پر پورے خلوص کے ساتھ مکمل طور پر عمل پیرا تھے انہوں

نے وہی عدالتی نظام قائم رکھا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رائج پایا تھا۔ انہوں نے خود دارالخلافہ میں بطور سربراہ ریاست اپنا منصب سنبھالا اور اکثر و بیشتر انھیں صوبائی اور ضلعی گورنروں اور ججوں کو برقرار رکھا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا۔

حضرت عمرؓ بطور سربراہ عدلیہ

اس کتاب کے باب پنجم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں حضرت عمرؓ کے بطور جج تقرر پر بحث ہو چکی ہے۔ جس میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ اس عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت عدلیہ کے سربراہ تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت آپ کی شخصیت امت میں آپ کے مرتبہ و مقام کے سبب اس عہد میں کسی دوسرے شخص کی حیثیت اس کے منصب اور مقام کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاں تک انتظامیہ اور عدلیہ میں علیحدگی کے اصول کا تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس علیحدگی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ آپ اس کی تشریح و تعبیر کرتے تھے، اور قرآنی احکام کے مطابق عدالتی فیصلے کرتے تھے۔ بایں ہمہ آپ نے اپنے بعد اس علیحدگی کے اصول کی تعلیم دینی تھی اس لئے آپ نے اپنے عہد ہی میں حضرت عمرؓ کو عدلیہ کا سربراہ مقرر کر کے اس اصول کی اہمیت ثابت کر دی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ کو عدلیہ کے سربراہ کے منصب پر قائم رکھا۔ ابن سعد اور الطبری بیان کرتے ہیں کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے نظام حکومت کے مختلف شعبوں کے سربراہ مقرر کرنے پر غور کیا تو حضرت عمرؓ کو عدلیہ کا سربراہ بنایا ابو عبیدہ کو خزانہ (بیت المال) پر تعینات کیا۔ ان کے تقرر پر آپؓ نے انھیں یہ کہتے ہوئے مخاطب کیا "میرے کام میں میری مدد کرو"[45] ایک اور بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ نے خود اپنی خدمات پیش کی تھیں "قال لہ ابو عبیدۃ انا اکفیک المال یعنی الجزاء و قال عمر انا اکفیک القضاء"[46] حضرت ابو بکرؓ نے ان کی خدمات قبول کر لیں اور انھیں بالترتیب عدلیہ اور خزانہ کے عہدے دے دیئے۔ "جعل ابوبکر عمر قاضیاً فی خلافتہ" الطبری گیارہویں ہجری کے اختتام پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کو عدلیہ پر مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کے پورے دور خلافت میں عدلیہ کے سربراہ رہے: (و استقضا ابو بکر فیھا عمر بن الخطاب فکان علی القضاء ایام خلافتہ کلھا) اسلامی فقہ و قضا کے چوٹی کے مورخین ابن سعد، الطبری، وکیع، ابن حجر العسقلانی نے مستند روایات میں حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ کو عدلیہ کا سربراہ ثابت کیا ہے۔ یہ اسلامی نظام عدالت کی تاریخ میں اولیت ہے کہ اس میں انتظامیہ اور عدلیہ میں علیحدگی شروع ہی سے تھی، جسے صدیوں بعد مغرب نے اب اپنایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کا اعتراف نہیں کیا۔ یہاں اس روایت کی تشریح ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ ایک سال تک اس عہدے پر رہے (فمکث عمر سنۃ) اور کوئی فریق مقدمہ ان کے پاس نہیں لایا (لا یاتیہ رجلاً) او (لم یخاصم الیہ احداً)۔ یہ ایک موضوع روایت ہے اور اپنی ظاہری حیثیت میں قبول نہیں کی جا سکتی۔ تاہم جو دلائل اس کے دفاع میں دیئے جاتے ہیں ان میں ایک نکتہ ہے۔ اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنے مقدمات براہ راست سربراہ حکومت کے پاس لے جانے کے عادی تھے۔ انہوں نے یہی طریقہ حضرت ابو بکرؓ کے دور میں بھی قائم رکھا۔ اس نظریہ کو اس قرآنی حکم سے بھی تقویت ملتی ہے جس میں اعتقاداً مومنا

کو اپنے تنازعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جانے کو کہا گیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ [۲۴]

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔

اس حکم کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے عدالتی طریق کار کی پیروی میں زیادہ تر متنازعہ فریق اپنے مقدمات براہِ راست خلیفہ کو پیش کرتے ہوں۔ تاہم اس بیان کے دفاع میں درج ذیل دلائل غلط ہیں: حضرت ابوبکرؓ کا دور پیغمبرؐ کے دور کے فوراً بعد کا تھا۔ لوگ عام طور پر نیکی اور راست روی کی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ ان میں احساسِ ذمہ داری اور خدا کی ناراضگی کا خوف بہت تھا اس لیے وہ بہت ہی کم جرائم کرتے تھے اور لڑائی جھگڑے کے مقدمات بھی بہت کم ہوتے تھے جیسا کہ پہلے، بیان کیا جا چکا ہے یہ نظریہ معیاری نہیں ہمیں بالتحقیق معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مختلف قسم کے بہت سے مقدمے تصفیہ کے لیے آپ کے پاس آئے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ معاشرہ کا اخلاقی معیار حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بلند تھا۔

تاہم ایک بات یقینی ہے اور یہ تاریخی شواہد سے بھی ثابت ہے۔ مدینہ کی بیشتر آبادی پہلے ارتداد کی جنگ میں اور پھر عراق اور شام کی فتوحات میں مصروف رہی۔ خلیفہ کے اہم ترین مشیر اور عمالِ ریاست مدینہ میں قیام پذیر رہے۔ وہ زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بزرگ صحابی تھے۔ یقیناً ایسے لوگوں کا اخلاقی معیار اعلیٰ ترین تھا۔ مدینہ کی باقی آبادی زیادہ تر خواتین، بوڑھوں اور معذور افراد پر مشتمل تھی جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان حالات میں یہ ممکن ہے کہ جرائم کی تعداد کم ہو گئی ہو اور خلیفہ کے پاس بہت کم مقدمات تصفیہ کے لیے آتے ہوں جنہیں وہ خود عام طور پر سہولت سے طے کر سکتے ہوں۔

باوجود مندرجہ بالا بحث کے ہم نے اور ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمات پیش ہوئے جن میں وہ مقدمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو خود حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے سپرد کیا تھا۔ اس مقدمہ کا تعلق زنا سے تھا حضرت عمرؓ نے مستغیث کے بیان، گواہی، جرح و دیگر تحقیقاتی معلومات کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے بحیثیت سربراہ انتظامیہ کے اس فیصلے کو نافذ کیا تھا۔ اسلامی تاریخ کے نامور مورخ الطبری نے بارہ ہجری کے آخر میں اپنے وقایع میں بیان کیا ہے کہ حج کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ مقدمات کے فریقین کو ہدایت کرتے جاتے تھے کہ وہ اپنا مقدمہ تصفیہ کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس لے جائیں:

(اذھبوا بھما الی عمرؓ فالینظر فان کان الجارح قد بلغ فالیقد منہ)

اس روایت نے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی کہ عہد ابوبکرؓ میں عدلیہ انتظامیہ سے علٰحدہ ہو چکی تھی۔ حج کے موقع پر صوبائی عدلیہ کے خلاف وفاقی عدلیہ کے سربراہ اپیلوں کی سماعت کرتے، نئے مقدمات سنتے اور فیصلہ کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ اعلان صاف طور پر ثابت کر رہا ہے کہ حضرت عمرؓ عدلیہ کے سربراہ تھے حج کے موقع پر پوری خلافت کے لوگوں کو اس کے تقرر سے متعارف کروا دیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے تحت صوبائی عدالتیں

حضرت ابوبکرؓ نے صوبوں میں وہی عدالتی نظام قائم رکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔ گورنروں اور ججوں کو پورے انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ الطبری نے ان میں سے چند کا ذکر کیا ہے:

عتاب بن اُسید مکہ میں۔ عثمان بن ابی العاص طائف میں۔ المہاجر بن امیہ صنعا میں، زیاد بن لبید حضرموت میں، العلا بن امیہ خولان میں۔ ابوموسیٰ الاشعری زبید اور زمع میں۔ معاذ بن جبل الجند میں، العلا بن الحضرمی بحرین میں، جریر بن عبد اللہ نجران میں۔ عبد بن ثور جرش میں، عیاض بن غنم الفہری دومۃ الجندل میں، ابوعبیدہ، شرجیل بن حسنہ، یزید بن ابی سفیان اور عمرو بن العاص شام کے چار بڑے صوبوں کے سپہ سالار، گورنر اور جج تھے اور خالدؓ بن ولید شام میں مجموعی طور پر فوج، انتظامیہ اور عدلیہ کے سربراہ تھے۔[۴۸] اور جن قاضیوں اور ججوں کی تفصیل دی گئی ہے وہ اپنے اپنے صوبے، ضلعے اور علاقے کی عدلیہ میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ جب انھیں کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا وہ اس کو ہدایات اور رہنمائی کے لیے عدلیہ کے سربراہ کے پاس مدینہ بھجوا دیتے۔ جب مستغیث یا مدعا علیہ ضلعی یا صوبائی عدالت کے فیصلہ سے غیر مطمئن ہوتا تو وہ ایسے فیصلہ کے خلاف سربراہ عدلیہ کی عدالت میں اپیل دائر کر دیتا۔ اگر خلیفہ کے علم میں آتا کہ کوئی غلط فیصلہ ماتحت عدالت نے کیا ہے تو وہ اس مقدمہ کو اپنی عدالت میں منتقل کرنے کا حکم دیتے یا متعلقہ عدالت کو اپنی ہدایات کے مطابق مقدمہ کی سماعت کرنے کو کہتے۔ حضرت ابوبکرؓ کے تحت صوبائی عدلیہ کے طریق عمل کی وضاحت کے لیے درج ذیل دو مقدمات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مہاجر بن امیہ صنعا کے قاضی تھے۔ دو گانے والیاں ان کی عدالت میں لائی گئیں۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے کی مجرم تھی۔ ظاہری شہادت سے ثابت تھا کہ ملزمہ نے جرم کیا ہے باقاعدہ سماعت کے بعد جرم ثابت ہو گیا تھا۔ جج نے سزا کا حکم سنا دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنے اور سامنے کے دانت اکھاڑ دینے کا حکم دیا۔ بعد میں اس فیصلہ کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ کو دی گئی۔ آپؓ نے ضلعی جج کو مندرجہ ذیل مشورہ ارسال کیا تھا:

"تم نے ان عورتوں کے متعلق جو فیصلہ دیا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالی والے گانے گائے تھے میرے علم میں آچکا ہے۔ اگر تم اس فیصلے کا حکم دے نہ چکے ہوتے تو میں تمھیں ان کے قتل کا حکم دیتا کیوں کہ پیغمبروں کی شان میں گستاخی عام سزا کی مستحق نہیں یعنی اگر کوئی مسلمان ایسا جرم کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور اگر یہ امت کے کسی ایسے فرد سے سرزد ہوا ہو جسے مسلمانوں کی پناہ حاصل ہو تو وہ باغی اور غدار قرار پاتا ہے۔"[۴۹] اس فیصلے سے چند آئینی اور عدالتی نکات سامنے آئے اول قاضی کے سامنے ایسا مقدمہ پیش ہوا جس پر کوئی واضح قانون موجود نہ تھا۔ قاضی نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر فیصلہ کر دیا۔ جسے اعلیٰ عدالت نے برقرار رکھا۔ دوم صوبائی قاضی کا فیصلہ اعلیٰ عدالت کے سامنے پیش ہوتا۔ سوم نئے درپیش حالات کے تحت قانون سازی کی ضرورت پڑتی۔ چہارم پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے مرکزی حکومت قانون سازی کرتی۔ پنجم گستاخِ رسولؐ کی سزا موت مقرر ہوئی۔ ششم اگر مسلمان گستاخی رسالت

کا مرتکب ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو جاتا ہے اسے سزائے موت دی جانے گی مفتتم اگر معاہد گستاخی رسالت کا مرتکب ہو تو وہ عہد شکن ہو کر غداری کا مرتکب ہوتا ہے اس لئے سزائے موت کا مستوجب قرار پاتا ہے۔

دوسری گانے والی نے اپنے گانوں میں مسلمانوں کی مذمت کی تھی۔ اس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے مہاجرؓ کو لکھا تھا :

میرے علم میں آیا ہے کہ تم نے اس عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں جو مسلمانوں کی مذمت میں گاتی تھی اور اس کے سامنے کے دانت اکھاڑ دیئے ہیں۔ اگر وہ عورت مسلمان تھی تو تمھیں چاہیے تھا اسے سزا دیتے اور مزید کارروائی کے لیے اسے میرے پاس بھیج دیتے تمھیں نہیں چاہیے تھا کہ اسے مسخ کرتے اگر وہ ذمی تھی تو میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تم نے اس کی غداری کو برداشت کیا جو اس کے مسلمانوں کی مذمت سے بھی زیادہ بڑا جرم تھا۔ اگر میں نے تمھیں پہلے اس معاملہ میں کچھ ہدایات بھیجی ہوتیں تو تمھیں میری طرف سے کچھ ناخوشگوار بات پہنچی ہوتی۔ پس مزاج ٹھنڈا رکھو اور لوگوں کو مسخ نہ کرو کیونکہ یہ یقیناً گناہ ہے اور ناپسندیدہ فعل ہے سوائے قانون کے تحت کی گئی کارروائی کے۔[۵۰]

یہ فیصلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا نظام حکومت قانون کی حکمرانی کے اصول پر قائم تھا" رول آف لاء" اسی عہد کے نظام حکومت اور نظام عدالت کی بنیاد تھا۔ اس فیصلے کا آخری حصہ انتہائی اہم ہے اس میں یہ قاعدہ اور قانون وضع کیا گیا ہے کہ کسی شہری کے خلاف قانون کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی، کسی شہری کو قانون سے زیادہ سزا نہیں دی جا سکتی۔ قانون کی حکمرانی کی یہ بہترین مثال ہے۔

۱۲۔ حضرت ابوبکرؓ کے تحت گورنر اور جج حضرت خالدؓ بن ولید کو ایک پیچیدہ عدالتی مسئلہ پیش آیا۔ ایک شخص ان کی عدالت میں لایا گیا جو لواطت کا مرتکب ہوا تھا۔ یہ جرم ثابت ہو گیا تھا۔ خالدؓ ایسے جرم کی سزا کے متعلق واضح نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے مقدمہ مدینہ میں اعلیٰ عدالت سے مشورہ کے لیے بھیج دیا۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اس جرم کی سزا کے متعلق واضح نہ تھے۔ لہٰذا آپ نے اصحابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ بلائی اور اس مسئلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت علیؓ ابن ابی طالب ان سب میں فصیح ہونے کے باعث بولے :

"بے شک یہ ایک ایسا گناہ ہے جو ایک قوم کے سوا کسی سے سرزد نہیں ہوا۔ اور آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ اللہ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ پس ہم خیال کرتے ہیں کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیں۔ اس پر تمام اصحاب متفق تھے۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو اسے جلا کر مار ڈالنے کا حکم دیا۔"[۵۱]

پہلا مقدمہ اس بات کا اہم نمونہ ہے کہ اسلامی ریاست کے ابتدائی زمانہ میں بھی انصاف عجلت سے غلط سلط نہیں کیا جاتا تھا خصوصاً جب ایسے انصاف کا تعلق کسی کی زندگی یا عزت سے ہوتا۔ عدالت اس کو بہت سنجیدہ مسئلہ خیال کرتی اور ایسے مقدمات میں پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کرتی۔ ریاست نے اپنے عدالتی افسر مقرر کئے ہوئے تھے جو صوبائی اور دیگر عدالتوں کی نگرانی کرتے تھے۔ جب کبھی ماتحت عدالت کوئی متعصبانہ یا غلط فیصلہ کرتی تو مرکزی حاکم اپنے نظرثانی اور اپیل کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے صوبائی قاضی کے خلاف نکتہ چینی کرتا۔

قانون کی حکمرانی

حضرت ابوبکرؓ کے تحت عدلیہ اور انتظامیہ کو" قانون کی حکمرانی" قرار دیا جا سکتا ہے لوگوں پر کسی فرد کی آمرانہ رائے کی نہیں

بلکہ قانون کی حکمرانی تھی۔ قانون اور غیر جانبداری کے اصول قائم تھے۔ اور بلا لحاظ مرتبہ دولت یا سرکاری منصب ہر ایک پر مساوی طور پر قانون کا اطلاق ہوتا تھا۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصول اور قواعد و کلیات پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب کر دیئے گئے تھے۔ اور جو مقدمات فیصلہ کے لیے عدالت میں لائے جاتے ان پہ اطلاق کے ضابطے بھی وضع کئے جا چکے تھے۔ خلیفۂ اوّل نے لیے نظام حکمرانی نے ثابت کر دیا تھا کہ لوگوں کو عدل و انصاف کی فراہمی کی ضمانت حاصل ہے۔ گو عدالتیں ان کی زندگی، عزت و آبرو اور مال کی حفاظت کے لیے ہیں اور جج انصاف کے محافظ تھے بلا رو و رعایت اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاست کی طرف سے شہریوں کے حقوق میں کوئی مداخلت نہ کی جاتی تھی۔ کوئی بھی مثال ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جہاں انتظامیہ نے عدلیہ کے فرائض میں مداخلت کی ہو۔ کوئی مظلوم خواہ وہ مسلمان ہوتا یا غیر مسلم اپنے تنازعے طے کرانے کے لئے عدالتوں سے رجوع کر سکتا تھا۔ تاریخ نویسوں نے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں جن میں گورنر اور منتظمین پر ججوں نے مقدمے چلائے تھے جبکہ شکایت کنندگان غیر مسلم تھے۔

حوالہ جات و تشریحات

۱۔ قرآن ۴ : ۵۹

۲۔ ابن ہشام، السیرۃ، ۱۳۵۶ھ قاہرہ جلد چہارم، صفحہ ۳۴۰، ۳۴۱۔ ابن سعد، طبقات، بیروت، ۱۳۷۷ھ جلد سوم صفحہ ۱۸۳، الطبری، تاریخ، جلد سوم، صفحہ ۲۰۳۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد پنجم، صفحہ ۲۴۸۔ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۹۶۵ء ۱۳۸۵ھ جلد دوم، صفحہ ۳۳۲۔

۳۔ ابنِ سعد طبقات، بیروت، ۱۳۷۷ھ جلد ہفتم و سوم صفحہ ۱۷۸۔

۴۔ قرآن ۲۲ : ۴۲۔

۵۔ ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ، بیروت۔ ریاض جلد چہارم صفحہ ۳۱۱۔

۶۔ ایضاً ۷۔ ۹ : ۱۰۳۔

۸۔ البخاری، الصحیح جیسا کہ ابن حجر العسقلانی نے حوالہ دیا ہے، فتح الباری، مطبع خیریہ ۱۳۱۹ھ جلد سوم صفحہ ۲۳۲۔

۹۔ الطبری، التاریخ متذکرہ بالا، جلد سوم، صفحہ ۲۲۰۔ ۱۰۔ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ، جلد ششم، صفحہ ۳۱۱۔

۱۱۔ قرآن ۹ : ۶۰۔ والمؤلفۃ قلوبھم (اور لوگوں کے دل جیتنے کے لیے)

۱۲۔ ابنِ کثیر، البدایہ متذکرہ بالا جلد ششم، صفحہ ۳۱۱۔

۱۳۔ ایضاً۔ ایک اور بیان میں لفظ عَنَق (بکری) کی بجائے عقال (اونٹ باندھنے کی رسی) کے استعمال ہوا ہے۔

۱۴۔ ایضاً۔ ۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا، جلد سوم، صفحہ ۲۰۳۔ ۱۷۔ ایضاً۔ ۱۸۔ ایضاً۔

۱۹ ـ ایضاً ـ ۲۰ ـ ایضاً ـ ۲۱ ـ ایضاً ـ

۲۲ ـ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا، جلد سوم، صفحہ ۲۰۲ ـ الشافعی، المسند، مصر جلد دوم، صفحہ ۱۲۲۔ البخاری، صحیح، کانپور، ہندوستان، جلد دوم، صفحہ ۲۰۲ ـ المسلم، صحیح، کراچی ۱۳۴۹ھ جلد دوم، صفحہ ۹۱ ـ ابوداؤد، السنن، کانپور، جلد اول صفحہ ۵۷ ـ احمد، مسند، مصر جلد اول صفحات ۴، ۵ ـ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مصر ۱۳۵۶ھ جلد ششم صفحہ ۲۸۵ ـ

۲۳ ـ الطبری، تاریخ جلد سوم متذکرہ بالا صفحہ ۲۰۲ ـ ۲۴ ـ البخاری الصحیح، الوصایا، نفقات القیم ـ

۲۵ ـ الطبری، تاریخ جلد سوم متذکرہ بالا، صفحہ ۲۰۲ ـ

۲۶ ـ ایضاً صفحہ ۲۴۲ ـ ۲۷ ـ ایضاً ـ ۲۸ ـ ایضاً ـ

۲۹ ـ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابو قتادہ گرفتار کرنے والے عساکر کے ساتھ تھے۔ وہ واحد آدمی تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ قیدیوں نے اذان کا جواب دیا اور نماز ادا کی ـ باقی عساکر اس سے اختلاف کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ انہوں نے اذان کا جواب دیا نہ نماز ادا کی ـ

۳۰ ـ الطبری، جلد سوم، صفحہ ۲۴۲ ـ ۳۱ ـ ابن کثیر، البدایہ متذکرہ بالا، جلد ششم صفحہ ۳۲۲ ـ

۳۲ ـ الطبری متذکرہ بالا، جلد سوم، صفحہ ۲۴۲ ۳۳ ـ ابن کثیر، البدایہ متذکرہ بالا، جلد ششم صفحہ ۳۲۳ ـ

۳۴ ـ الطبری متذکرہ بالا، جلد سوم، صفحہ ۲۴۲ ۳۵ ـ ایضاً ـ

۳۶ ـ الطبری، متذکرہ بالا ـ جلد سوم، صفحہ ۲۴۳ ـ ۳۷ ـ ابن کثیر، البدایہ، متذکرہ بالا، جلد ششم صفحہ ۳۲۲

۳۸ ـ ایضاً ـ ۳۹ ـ الطبری، متذکرہ بالا، صفحہ ۲۴۱

۴۰ ـ ایضاً صفحہ ۲۴۲ ـ ۴۱ ـ ایضاً جلد چہارم، صفحات ۲۴، ۲۵ ـ

۴۲ ـ ایضاً صفحہ ۲۴ ـ ۴۳ ـ الشافعی، مسند، جلد دوم، صفحہ ۸۵ ـ

۴۴ ـ مالک الموطاء، مصر ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء جلد دوم صفحہ ۸۲۶ ـ البیہقی، السنن، جلد ہشتم صفحہ ۲۲۳ ـ

۴۵ ـ البیہقی، السنن، جلد ہشتم، صفحہ ۸۷ ـ ابن عبدالبر، الاستیعاب، حیدر آباد دکن ۱۳۳۶ھ جلد دوم، صفحہ ۴۱۷

۴۶ ـ ابن سعد طبقات، جلد سوم صفحہ ۱۸۴ ـ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۵۰ ـ وکیع، اخبار القضاۃ جلد اول صفحہ ۱۰۴ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، جلد چودہ صفحہ ۹۹ ـ

۴۷ ـ قرآن ۴ : ۶۵ ـ ۴۸ ـ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحات ۵۰، ۵۱ ـ

۴۹ ـ ایضاً جلد سوم، صفحہ ۲۷۷ ـ ۵۰ ـ ایضاً ـ

۵۱ ـ البیہقی، السنن الکبریٰ جلد سوم صفحہ ۲۳۲ ـ مندرجہ کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے :

ڈاکٹر محی الدین، ابوبکر اور ان کا دور، فیروز سنز، بندر روڈ، کراچی ۱۹۵۴ ـــ معین الدین ندوی، خلفائے راشدین، دار المصنفین اعظم گڑھ (ہندوستان)

حبیب الرحمٰن خان شیروانی، حضرت ابوبکر، شیخ ایم اشرف، لاہور ۱۹۶۹ء، ترجمہ از ڈاکٹر معین الحق ـ سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبر، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۷ء

حضرت عمرؓ کا نظامِ عدالت

دستور

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ اسلام کے دوسرے خلیفہ مقرر ہوئے۔ ان کی حکومت کا دستور الکتاب[1] اور رہنما قرآن تھا![2]

اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کا فرض ہے کہ وہ قرآن کی دفعات کے مطابق فیصلے کریں۔[3] تمام مسلمانوں کو قرآن کی پیروی لازم ہے اور انھیں اس کی بنیاد پر کئے گئے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔[4] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بہترین نمونہ (اسوہ حسنہ) حضرت عمرؓ کے سامنے قرآنی دستور کے نفاذ کا عملی نمونہ تھا۔[5]

قرآنی دفعات اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری حضرت عمرؓ کی حکومت کی بنیادی پالیسی تھی۔ اپنے مختلف فرامین، اعلانات اور اقرار ناموں میں آپؓ نے قرآن اور سنت کی بنیادی اہمیت پر زور دیا۔ آپ نے اس ضمن میں اپنے فوجی کمانداروں، صوبوں کے گورنروں اور ججوں کے تقرر ناموں میں ایک شق شامل کی۔ آپ نے اپنے فوجی افسروں کو تحریری ہدایات بھیجیں کہ وہ اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ مشہور ترین اور معروف عدالتی منشور جو آپؓ نے ایک گورنر اور صوبائی عدالتوں کے سربراہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری کو بھیجا اس میں درج ذیل شق شامل ہے:

"خوب فہم و فراست سے کام لو جس مسئلہ میں خلجان ہو اور کتاب اللہ اور سنت رسولؐ تمھیں نہ پہنچی ہو۔"[6]

اپنے صوبائی گورنروں اور ججوں کے فرائض اور ذمہ داریوں پر بحث کرتے ہوئے ایک مرتبہ آپؓ نے فرمایا:

"اے خدا صوبائی گورنروں کے تقرر میں تو میرا شاہد ہے۔ بےشک میں نے انھیں لوگوں کو دینی تعلیم دینے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکھانے، ان کے درمیان انصاف کرنے، مالِ غنیمت تقسیم کرنے اور جو مشکل مسائل ان کو درپیش ہوں ان میں مجھ سے رجوع کرنے کے لئے بھیجا ہے۔"[7]

تاریخ میں متعدد مقدمات درج ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مستند حدیث کا حوالہ دیا جاتا جو مسئلہ سے متعلق ہوتی تو حضرت عمرؓ اس کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیتے۔ فتح عراق کے موقع پر آپ کو مجوسیوں کا مقدمہ درپیش تھا مسئلہ یہ تھا کہ مجوسیوں کو اہلِ کتاب شمار کیا جائے یا نہیں۔ آپؓ نے یہ مسئلہ مدینہ میں شوریٰ کی ایک مجلس کے سامنے یوں رکھا:

" میں نہیں جانتا کہ مجوسیوں سے کیا سلوک کروں "۔

عبدالرحمٰن رضی بن عوف جو شوریٰ کے رکن تھے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد آئی جو انہوں نے یوں بیان کی :

میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ان کے ساتھ اسی طرح سلوک کرو جس طرح تم اہل کتاب کے ساتھ کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے ابن عوف کا بیان تسلیم کیا اور اسی کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیا۔ چونکہ یہ مقدمہ ان کے پاس دشت میسان (ایک صوبہ جو بصرہ اور بغداد کے درمیان واقع تھا) کی صوبائی عدلیہ نے بھیجا تھا آپؓ نے مندرجہ ذیل عدالتی حکم کے ساتھ فیصلہ قاضی کو بھیج دیا :

"ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لو"۔

شام کی فتح کے بعد صوبہ میں طاعون پھوٹ پڑی۔ حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے سرحدوں پر تعینات فوجی کمانڈروں کی مجلس طلب کی۔ سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کی آبادی کو کس طرح محفوظ رکھا جائے۔ مختلف آراء کا اظہار ہوا۔ بعض وہاں رکنا چاہتے تھے اور بعض وہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بزرگ صحابی حضرت عبدالرحمٰنؓ نے یہ بیان دیا :

" مجھے اس کا صحیح علم ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے :

جب تم سنو کہ کسی علاقہ میں یہ وبا پھیل گئی ہے تو اس کی طرف پیش قدمی نہ کرو اور اگر وبا پھیل چکی ہو اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے پناہ کے لیے مت بھاگو"۔

حضرت عمرؓ نے ابن عوف کی یہ شہادت قبول کر لی اور اس کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کر دیا۔ آپؓ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور مدینہ کو لوٹ گئے ۹

قانون سازی

عدالتی منشور کی وہ شق جو اُوپر بیان ہوئی ہے جس میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری کو ہدایات دی ہیں ظاہر کرتی ہے کہ خلافت کی جغرافیائی توسیع کے پیش نظر اور نئے نئے سماجی، قانونی اور عدالتی مسائل سامنے آنے کے باعث ریاست کو ایسے مسائل کے حل کے لیے نئی قانون سازی اور تفسیر قرآن و سنت کی ضرورت پڑی۔ یہ دوسرا اہم اور مشکل مسئلہ تھا۔ یہ کام حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں کرنا پڑا۔ اس میں ایک طرف اجتہاد کی ضرورت تھی اور دوسری طرف اس پر مسلم امہ کا اجماع درکار تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا اور آپؓ اس پر لگ گئے۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس چیلنج کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔

قانون سازی کے بنیادی اصول تو دستورِ قرآن میں دیئے ہوئے تھے۔ سب سے بنیادی اصول تھا " باہم مشورے سے حکومت چلانا"۔ (امرھم شوریٰ بینھم) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا گیا تھا۔ "وشاورھم فی الامر"

لوگوں سے حکومت کے معاملات میں مشورہ کرو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی حیات میں اس دستوری دفعہ پر عمل کیا تاریخی مواد کا جائزہ لینے اور حدیث، فقہ کے مطالعہ کے بعد راقم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ غیر الہامی معاملات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پیدا ہوئے ان کے حل میں مشاورت کے قرآنی اصول کی سختی سے پابندی کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے قرآنی اصولوں پر مبنی مشاورتی جمہوری قانون ساز ادارہ قائم کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے سوانح نگاروں کا یہ عمومی بیان ہے کہ ان کے فیصلے ان کے ذاتی تفکر و اجتہاد پر مبنی تھے۔ تاریخی شواہد سے اس نظریہ کو تقویت نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں حضرت عمرؓ نے بہت سے نئے قوانین کی ابتدا کی اور کئی نئے اور تعمیری نظریوں کو جنم دیا۔ لیکن ان کے نفاذ کے لیے انھیں مہاجرین اور انصار کی اکثریت کو قائل کرنا پڑا۔ اس طرح انھیں اپنے اجتہاد کو قانون کا درجہ دینے سے پہلے مقننہ کے اجماع کی شکل دینی پڑی حضرت عمرؓ کی عظمت بحیثیت قانون ساز ان کی اس قابلیت میں مضمر ہے کہ انہوں نے نئے مسائل چھیڑے اور ان کو قانون ساز دل کی اکثریت سے مؤثر طریقوں اور قائل کرنے والے دلائل کی قوت سے منظور کرایا۔ مندرجہ بالا طریق کار کی وضاحت کے لیے ایک مسئلے کی قانون سازی کا حوالہ دیا جاتا ہے:

عراق کی فتح پر سواد کا ایک بڑا زرخیز علاقہ مسلم افواج کے قبضہ میں آیا۔ فوج کے افسران خصوصاً مہاجرین کی خواہش تھی کہ زمین اور کاشت کار ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس نظریہ کے سب سے زیادہ بلند آواز حامی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت بلالؓ تھے۔[۲] حضرت عمرؓ اس نظریہ سے متفق نہ تھے۔ آپؓ زمین کو ریاست کی ملکیت رکھنا چاہتے تھے اور فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو ایک مقررہ شرح سے ادائیگی کرنا چاہتے تھے۔ اس مسئلہ پر شوریٰ کے مختلف اجلاسوں میں بحث و تمحیص ہوئی۔ آخرکار یہ طے پایا کہ مسئلہ انصار کے زعما پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو خاص طور پر اس غرض سے تشکیل دی جائے۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے نظریے کمیٹی کے سامنے پیش کئے۔ حضرت عمرؓ کا بیان جیسا کہ ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں روایت کیا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> "تم نے ان لوگوں کے دلائل سن لیے ہیں۔ شاید یہ سوچتے ہیں کہ میں انھیں ان کے حقوق سے محروم کرنا چاہتا ہوں میں نے منقولہ مالِ غنیمت ان میں تقسیم کر دیا ہے۔ تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ زمین اور کاشت کار ایک مشترکہ وقف کی حیثیت میں ریاست کے کنٹرول میں رہیں۔ کاشت کار زمین پر ایک مقررہ رقم کا خراج ادا کریں اور فی کس کے حساب سے جزیہ دیں۔ خراج اور جزیہ مسلمانوں کے لیے ایک مستقل ذریعہ آمدنی بن جائیں۔ فوج، بچے اور آئندہ نسلیں اس مشترکہ وقف سے مستفید ہوں ہمیں اپنی سرحدوں کی نگرانی کے لیے ایک مستقل فوج رکھنے کی ضرورت ہے۔ مختلف مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرنا ہیں۔ اگر زمین اور کاشت کار ان لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے تو پھر ان منصوبوں پر خرچ کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔"

اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے مخالفین کے نظریات کا رد بھی کیا۔ اور بعض آیات قرآنی کے مطالب جو وہ پیش کر رہے تھے ان کا جواب دیا۔ آپؓ نے کہا:

"یہ لوگ صرف وہی آیات قرآن پیش کرتے ہیں جو اُن کا مقصد پورا کرتی ہیں"

اور ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو میرے نظریہ کی حمایت کرتی ہیں۔ پھر آپؓ نے سورۃ الحشر سے متعلقہ آیت کا حوالہ دیا: "وما افاء اللہ علیٰ رسولہ منھم" اور کہا کہ یہ یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی جو اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور اب اس آیت کا اطلاق عام زمینوں پر ہوتا ہے۔ پھر آپؓ نے اسی سورہ الحشر کی آیات (۷ اور ۸) کا حوالہ دیا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ لوگ «انصار» جن کا ذکر اس آیت میں ہے ایسی زمینوں سے استفادہ کے برابر کے حقدار ہیں (و الذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم)

آیت کا ابتدائی جملہ (و الذین جاؤ من بعدھم) "آنے والی نسلیں" ان کی فیصلہ کن دلیل تھی (انی قد وجدت حجۃ) حضرت عمرؓ نے اپنی دلیل یہ کہتے ہوئے ختم کر دی: یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم زمین صرف موجودہ نسل میں بانٹ دیں اور آنے والی نسلوں کو اس سے محروم کر دیں[۱۳]۔

فریقین کے بیانات اور دلائل سننے کے بعد کمیٹی نے اپنے متفقہ فیصلہ کا اعلان کیا (فقالوا جمیعاً)

یا امیر المومنین آپ کا نظریہ درست ہے۔ آپ کی رائے حق پر مبنی ہے۔ آپ کی رائے سب سے صائب ہے اور حالاتِ حاضرہ میں سب سے انسب ہے۔ اگر فوج شہروں اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے نہ رکھی جائے تو دشمن (اہل الکفر) دوبارہ ان پر قبضہ کر لیں گے[۱۴]۔

مندرجہ بالا فیصلہ دونوں فریقوں نے قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دو آدمی (حضرت عثمان بن حنیف اور حضرت حذیفہ بن الیمان) جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے تجربہ کار تھے مقرر کئے کہ زمین کی پیمائش کریں اور خراج و جزیہ کی رقم کا تعین کریں۔

مندرجہ بالا مقدمہ اس بات کی کافی شہادت پیش کرتا ہے کہ قوانین جو حضرت عمرؓ کے دور میں بنے قرآنی اصولوں اور باہمی مشورہ (شوریٰ بینھم) پر مبنی تھے۔ مہاجرین اور انصار کو مسلم اُمّۃ کی رائے عامہ کا نمائندہ تسلیم کیا گیا تھا۔ انہیں قانون سازی کی مجلس میں طلب کرنے کے لیے نماز کے لیے اکٹھے ہونے کا اعلان کر کے کیا جاتا تھا (الصلوٰۃ جامعۃ) اس طلبی پر اراکین مسجد نبوی میں جمع ہو جاتے اور دو رکعت نماز خلیفہ کے ساتھ ادا کرتے اس کے بعد حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے ہو جاتے اور درپیش معاملہ مجلس کے سامنے بیان فرماتے[۱۵]۔

ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بزرگ چھ صحابی مجلس مشاورت (مجلس شوریٰ) کے مرکزی رکن تھے جن سے حضرت عمرؓ اکثر و بیشتر مشورہ کرتے تھے۔ یہ عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، معاذؓ بن جبل، اُبیؓ بن کعب اور زیدؓ بن ثابت تھے[۱۶]۔

تعلیمِ قانون

"قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں" ایک ایسا مقولہ ہے جسے مغرب کے ترقی یافتہ ممالک نے حال ہی میں اختراع کیا ہے

اور وہ اس پر زور دیتے ہیں۔ اس کے برعکس عوام میں قانونی تعلیم عام کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ کسی بے گناہ شخص کو سزا دینا ظلم ہے جتنا لوگوں کو قانون سے ناواقف رکھا جائے اور حکومت ان کی قانونی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ کرے اسلام ان کو قصوروار نہیں گردانتا ایسے معصوموں کو سزا دینا ظلم ہے۔ مغرب نے عدالتوں کے ذریعہ اس مقولہ پر عمل کرنے سے پہلے اپنے شہریوں کو قانونی واقفیت بہم پہنچانے کا اہتمام نہیں کیا۔ اسلام اس نظریہ کا حامی نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین فرض لوگوں کو قانونِ الٰہی کی تعلیم دینا اور انہیں اپنے قانونی فرائض سے آگاہ کرنا تھا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ [17]

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

یہاں یعلمھم الکتاب (وہ ان کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں) کو لوگوں کو قانونِ الٰہی (الکتاب) سکھانے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ ایک اور آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا قانونِ الٰہی کی تعلیم کا فریضہ زیادہ واضح الفاظ میں یاد دلایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ [18]

اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کافر لوگوں کو ہدایت نہ دیں گے۔

اسلام متعلقہ شخص کو ناواقفیت کے سبب قصوروار نہیں ٹھہراتا اس صورت میں خاص طور پر جب ریاست کے ادارے لوگوں کو تعلیم دینے سے متعلق اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو پورا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کو جوابدہ ٹھہرایا ہے جن کو اس نے پیغمبر بھیج کر اپنا پیغام پہنچایا ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ [19]

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آ پہنچے جو کہ تم کو صاف صاف بتلاتے ہیں ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا تاکہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور نذیر نہیں آیا۔ سو تمہارے پاس بشیر اور نذیر آ چکے ہیں۔

سزا دینے سے پہلے تعلیم سے متعلق ادارے اپنا محاسبہ کریں گے کہ کیا انہوں نے حقیقتاً قانونی تعلیم دی ہے اور یہ تحقیق کر لی گئی ہے کہ ملزم یہ تعلیم پا چکا ہے:

كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا

نَذِيرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ

جب اس میں (دوزخ میں) کوئی گروہ ڈالا جاوے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر) آیا تھا سو ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا اور تم بڑی غلطی میں پڑے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پوری تعلیم نافذ کی۔ آپ نے نومسلموں میں استاد بھیجے کہ ان کو قانونِ الٰہی سے واقف کریں۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی سختی سے آپؐ کی پیروی کی۔ انہوں نے اپنے فوجی کمانداروں کو خصوصی واضح احکام دیئے کہ کسی کو سزا دینے سے پہلے یہ تحقیق کرلیں کہ اسلام کا پیغام مناسب طور پر دشمن کو پہنچ چکا ہے اور انہوں نے دانستہ اس سے انحراف کیا ہے۔ اگر کسی کو غلطی سے اس تک اسلامی تعلیم پہنچائے بغیر سزا دے دی جاتی تو اس کو مناسب معاوضہ دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے عدلیہ کے ان اصولوں کو اداروں کی شکل دی اور مفتی (ماہرین قانون) خلافت کے مختلف صوبوں میں مقرر کئے تاکہ لوگوں کو ملکی قانون کی تعلیم دیں مبادا وہ ناواقف رہ جائیں۔ مندرجہ ذیل علما مشہور ماہرینِ قانون تھے جن کی خدمات لوگوں کی تعلیم کے لیے موجود تھیں:[۲]

حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، معاذؓ بن جبل، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، اُبیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، ابوہریرہؓ اور ابودرداؓ۔ شاہ ولی اللہ نے نشاندہی کی ہے کہ صرف حکومت کی طرف سے مقرر کردہ افراد ہی قانونی رائے (فتویٰ) دے سکتے تھے اور دیگر افراد کو حکومت کی اجازت کے بغیر ایسا کرنے کی ممانعت اور اس سے گریز کرنے کی ہدایت تھی۔" مقررہ ماہرینِ قانون کی مناسب طور پر تشہیر کی گئی تھی اور لوگوں سے کہا گیا تھا کہ ان سے قانونی رائے لیں۔ حضرت عمرؓ نے جابیہ میں عوام کے ایک اجتماع میں اس کا اعلان کیا تھا۔[۳]

نظامِ عدالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نما عرب کے حدود میں عدالتی نظام قائم کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے تحت عراق اور شام کے کچھ علاقے بھی فتح کر لیے گئے تھے اور ان کی عدلیہ کے دائرہ اختیار میں آ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عدلیہ کی حدود پورے عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر کی فتح کے بعد ان پر پھیلا دی تھیں۔ جب فتوحات کا زور تھا اور امن و امان قائم ہوا تو حضرت عمرؓ کو مفتوحہ علاقوں میں رومیوں اور ایرانیوں کے قائم کردہ دو بڑے نظام ہائے قانون و عدل کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں مختلف النسل، علاقائی اور مذہبی گروہوں سے بھی سابقہ پڑا یہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے قبول کیا اور انتہائی کامیابی سے اس پر قابو پایا۔ آپؓ نے اس عدالتی نظام کو وسعت دی اور اس کی تفصیلات مرتب کیں جو انھیں اپنے پیشروؤں سے ملا تھا اور اپنے دور کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک مؤثر اور قابل عدلیہ قائم کی۔

اسلامی ریاست کی تیز توسیع اور بے شمار مسائل کے رونما ہونے سے آپؓ کے زمانہ میں عدالتی نظام ضرورتاً زیادہ باقاعدگی اختیار کرنے لگا۔ آپ نے عدلیہ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی عہدِ رسالت اور عہدِ حضرت ابوبکرؓ

میں معرضِ وجود میں آچکی تھی آپ نے اُسے زیادہ وسعت دی عدلیہ اور انتظامیہ کی کلیتہً علیحدگی اچھی بات ہے جس کے لیے اب دنیا کوشاں ہے کسی تہذیب کی عظمت کا اندازہ ہمیشہ اس کے قانونی نظام کی خود مختاری سے ہوتا ہے جس پر اس تہذیب کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس پہلو سے عدلیہ کو انتظامیہ کے برے اثرات سے بچانے کی حضرت عمرؓ کی کوششیں نہ صرف قابلِ ستائش ہیں بلکہ ان کے عصر میں قبل از وقت بھی ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کا کہنا ہے کہ اسلامی قانون نے اصولی اور عملی طور پر حضرت عمرؓ کے تحت اتنی وسعت اختیار کی کہ بعد کے بیشتر فقہا خصوصاً چاروں فقہی مکاتب فکر کے بانیوں نے آپؓ کے فیصلوں، اصولوں اور طریق کار کو اپنے مطالعے کا اصل موضوع بنایا[۲۷]۔ حضرت عمرؓ کے دور کے عدالتی فیصلوں نے بڑی حد تک اسلامی قانونی نظام کی ترقی میں حصہ لیا کیونکہ عدالتی اصولوں اور نظریوں کے لیے وہ ایک معتبر بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ بطورِ جج

یہ بیان ہو چکا ہے کہ عہدِ رسالتؐ ہی میں عدلیہ اور انتظامیہ میں علیحدگی ہو چکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص عدلیہ کا سربراہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے آپ ہی چیف جسٹس کے منصب پر فائز تھے۔ اگرچہ صوبوں میں صوبائی اور ضلعی قاضی مقرر کئے جا چکے تھے۔ عہدِ رسالتؐ میں حضرت عمرؓ کا عدالتی امور پر مقرر ہونا ثابت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظامیہ اور عدلیہ کو علیحدہ کرنے کا عملی طور پر انتظام فرما دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے واضح طور پر علیحدہ کر دیا تھا عدلیہ کی سربراہی کے لیے باقاعدہ طور پر حضرت عمرؓ کو پیش کش کی جو انہوں نے منظور کی۔ اس کی تفصیل گذشتہ باب میں گزر چکی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے اصول کو مزید وسعت دی حضرت زیدؓ بن ثابت کو عدلیہ کا سربراہ مقرر کیا جس کی تفصیل اسی باب کے آئندہ اوراق میں آ رہی ہے۔ عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے سلسلے میں ایک امر کی وضاحت ضروری ہے اس علیحدگی کے باوجود خلیفہ وقت بھی عدالتی مقدمات کی سماعت کرتے اور صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتے تھے۔ جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے اس کا سربراہ علیحدہ مقرر تھا۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے تمام مفتوحہ صوبوں میں اسلامی نظامِ عدالت کو توسیع دی انصاف مہیا کرنے کے لئے جج و قاضی مقرر کئے۔ صوبائی اور ضلعی قضاۃ عدلیہ نے بہت سے مشکل اور پیچیدہ مقدمات مدینہ میں وفاقی عدلیہ کو مشورہ کے لیے بھیجے۔ تاریخ میں بہت سے مقدمات قلمبند ہیں جن کا فیصلہ حضرت عمرؓ نے کیا اور بہت سے فیصلوں پر نظرثانی کی۔ فوجی کمانداروں اور دیوانی حکام کی بدعنوانیوں اور قانونی زیادتیوں کے خلاف اپیلیں اور رٹیں بھی آپؓ کے سامنے پیش ہوئیں۔ آپؓ نے بڑے سے بڑے افسر کے خلاف بلا رد و رعائت فیصلے کئے۔ حضرت عمرؓ کے دور کے عدالتی طریق کار کی وضاحت کے لئے ایک مقدمہ کی کارروائی اور اس کا فیصلہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ایک زنا کا مقدمہ — ابوبکرہ بنام مغیرہؓ

الطبری نے اپنی تاریخ میں ۱۷ھ کے واقعات کے تحت یہ مقدمہ درج کیا ہے علاوہ ازیں محدثین و فقہا نے اُسے

مختلف اسناد اور طرق سے اس کی روایت کی ہے۔ فقہ اور تاریخ کے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر نے الطبری کی تاریخ میں درج واقعہ کو ہی اپنی روایت اور استنباط کی بنیاد بنایا ہے جس پر ہم بعد میں تبصرہ کریں گے۔ الطبری کی روایت کے مطابق مغیرہ بن شعبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی بصرہ کے گورنر تھے۔ ربیع الاول ۱۷ھ میں شہر کے ایک باشندہ ابوبکرہ نے گورنر کے خلاف تحریری شکایت حضرت عمرؓ کو پیش کی۔

ملزم پر فردِ جرم اور اس کی عدالت میں طلبی

شکایت میں بدیہی شہادت کی بنیاد پر عدالت نے محسوس کیا کہ مقدمہ سماعت کے لیے قانونی شرائط پوری کرتا ہے۔ ملزم حضرت مغیرہؓ پر فردِ جرم عاید کر دی گئی اور انھیں گورنری سے معزول کر کے عدالت میں طلب کر لیا گیا۔ نئے مقرر کردہ گورنر بصرہ حضرت ابو موسیٰؓ الاشعری کو حضرت مغیرہؓ کی معزولی کا حکم دے کر بصرہ بھیج دیا گیا تاکہ وہ حضرت مغیرہؓ سے عہدہ سنبھال لیں اور انھیں عدالتی تحقیقات کیلئے مدینہ بھیج دیں۔

معزولی کا حکم پاکر حضرت مغیرہؓ نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری کو عہدہ سونپ دیا۔ اس کے بعد عدالت کے حکم کی تعمیل میں ملزم اور شکایت کنندہ مع اپنے گواہوں کے مدینہ روانہ ہو گئے تاکہ خلیفہ کی عدالت میں پیش ہوں۔

مقدمہ کی کارروائی

عدالت نے ملزم کو بلایا اور اسے فردِ جرم دی اور اسے اپنی حیثیت بیان کرنے کے لیے کہا۔ حضرت مغیرہ نے جرم سے انکار کیا اور عدالت سے استدعا کی کہ شکایت کنندہ اور گواہوں پر مندرجہ ذیل نکات پر جرح کا موقع دیا جائے یہ نکات مقدمہ کے لیے تیار کردہ تنقیحات تھیں اور ان پر بحث ہوئی۔

پہلا سوال تھا: انہوں نے مجھے (ملزم کو) کس طرف سے دیکھا میرے چہرے کی طرف سے یا میری پشت کی طرف سے؟ (سل ھولاء الاعبد کیف رأونی مستقبلھم او مستدبرھم؟) دوسرا سوال تھا: انہوں نے عورت کو کیسے دیکھا اور اسے کیسے پہچانا؟ (وکیف رأوا المرأۃ او عرفوھا؟) اگر وہ میرے سامنے کی طرف تھے تو فعل مباشرت ان سے کیسے پوشیدہ نہ تھا؟ (فان کانوا مستقبلی فکیف لم استتر؟) اگر وہ میری پشت کی طرف تھے تو کس حکم سے انھیں اجازت ملی کہ وہ میرے گھر میں میری بیوی پر مجھے دیکھیں (او مستدبری فبای شئ استحلوا النظر الیّ فی منزلی علی امرأتی؟)

بخدا میں نے اپنی بیوی کے سوا کسی کے ساتھ مباشرت نہیں کی میری بیوی ملزمہ عورت (ام جمیل) سے مشابہ ہے (واللہ ما اتیت الا امرأتی وکانت شبھا)

شکایت کنندہ اور گواہوں کے بیانات

ملزم کی تشریح کے بعد شکایت کنندہ ابوبکرہ نے سب سے پہلے بیان دیا (فبدأ ابوبکرۃ فشھد علیہ) اس نے

اسے (مغیرہ) کو ام جمیل کے پاؤں کے درمیان دیکھا اور وہ (عضو کو) سرمہ دانی میں سلائی کی طرح ڈال اور نکال رہا تھا (انہ رآہ مبین رجلی ام جمیل وھو یدخلہ و یخرجہ کالمیل فی المکحلۃ) حضرت عمرؓ نے پوچھا : تُو نے انھیں کس طرف سے دیکھا (کیف رأیتھما ؟) اس نے کہا انھیں پیچھے سے دیکھا (قال مستدبرھما) حضرت عمرؓ نے پوچھا : تو نے اس کا سر (چہرہ) کیسے پہچانا (کیف استثبت رأسھا) اس نے کہا میں نے (اس کے اُٹھنے کا) انتظار کیا (تحاملت) پھر دوسرے گواہ شبل بن معبد کو بلایا گیا اس نے بھی اس کی طرح گواہی دی (فشھد بمثل ذلک) حضرت عمرؓ نے پوچھا : تو نے انھیں پیچھے سے دیکھا یا آگے سے (استدبرتھما او استقبلتھما) اس نے کہا میں نے انھیں آگے سے دیکھا (استقبلتھما) تیسرے گواہ نافع نے بھی ابوبکرہؓ کی طرح گواہی دی (وشھد نافع بمثل شھادۃ ابی بکرۃ) چوتھے گواہ زیاد نے ان جیسی گواہی نہ دی (ولم یشھد زیاد بمثل شھادتھم) اس نے بیان کیا : میں نے اسے ایک عورت کے پاؤں کے درمیان دیکھا میں نے رنگین پیر کرتے دیکھے اور ننگے سُرین دیکھے اور چڑھی ہوئی سانسیں سنیں (رأیتہ جالسا بین رجلی امرأۃ فرأیت قدمین مخضوبتین تخفقان واستین مکشوفتین وسمعت حفزانا شدیداً) حضرت عمرؓ نے پوچھا : کیا تو نے سرمہ دانی میں سلائی کی طرح دیکھا (ھل رأیت کالمیل فی المکحلۃ) اس نے کہا : نہیں (لا) حضرت عمرؓ نے پوچھا : کیا تو اس عورت کو پہچانتا ہے (فھل تعرف المرأۃ) اس نے کہا : نہیں (لا) مگر وہ اس کے مشابہ تھی (ولکن اشبھھا) حضرت عمرؓ نے کہا : اب ہٹ جاؤ (فتنح) جج نے تین کے متعلق حکم سنایا اور انھیں کوڑوں کی حد لگی (وامر بالثلاثۃ فجلدوا الحد) اور انھوں نے یہ آیت پڑھی : فاذ لم یاتوا بالشھداء فاولئک عند اللہ ھم الکذبون (النور ۱۳) پھر جب نہ لائے گواہ تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔

اس پر مغیرہؓ نے کہا : مجھے ان غلاموں سے بچائیے (اشفنی من الاعبد)

حضرت عمرؓ نے کہا : چپ رہو اللہ تمھیں چپ کرے تجھے موت دے (اسکت اسکت اللہ نامتک) بخدا اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں تجھے سنگسار کر کے رہتا (اما واللہ لو تمت الشھادۃ لرجمتک باحجارک)۔[۲۷]

(تاریخ الطبری واقعات سال ۱۷ ہجری جلد ۴ صفحہ ۲۰۸–۲۰۷)

فیصلہ کا اعلان

قرآن کے قانونِ شہادت کے مطابق زنا کے مقدمہ میں ثبوت کے لیے چار گواہ درکار ہیں۔[۲۵] اگر شکایت کنندہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو جھوٹی تہمت لگانے پر انھیں سزا دی جائے گی :

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ[۲۶]

اور جو لوگ (زنا کی) تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو اور پھر چار گواہ نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی دُرّے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول مت کرو۔ اور یہ لوگ فاسق ہیں۔

مقدمہ کی کارروائی سے واضح ہے کہ چونکہ گواہ زیاد نے شکایت کنندہ اور اس کے دو ساتھیوں کی شہادت کی حمایت نہیں کی۔ اس لیے شہادت مکمل نہ تھی۔ قرآنی قانون شہادت کے مطابق انھیں جھوٹے گواہ قرار دیا گیا اور ہر ایک کو اسی کوڑے کی سزا دی گئی (وأمر بالثلاثة فجلدوا الحد)۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں عدالتی طریق کار

ہم نے مندرجہ بالا مقدمہ کی کارروائی تفصیل سے بیان کی ہے تاکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں وضع کردہ اور زیر عمل عدالتی طریق کار اور قواعد و ضوابط کا عملی نمونہ اور نقشہ پیش کیا جا سکے۔ مندرجہ بالا مقدمہ اور فیصلہ سے درج ذیل عدالتی اصول اور بنیادی نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں:

۱۔ انصاف بلالحاظ مرتبہ، نسل اور علاقہ فریقین مہیا کیا جاتا۔

۲۔ ایک عام آدمی بھی اپنے صوبہ کے گورنر کے خلاف استغاثہ دائر کر سکتا تھا اور اپنی شکایات کا ازالہ کر سکتا تھا۔

۳۔ مدینہ کی عدالت کے دروازے خلافت کے تمام شہریوں کے لیے کھلے تھے جہاں بلا وقت اور بلا خرچ انصاف مہیا کیا جاتا تھا۔

۴۔ شکایت موصول ہونے پر اس کے مندرجات کی تفتیش کی جاتی اور انھیں جانچ پرکھا جاتا تھا۔ مقدمہ کی بظاہر شہادت کی بنا پر فرد جرم تیار کی جاتی اور ملزم پر جوابدہی کے لئے عائد کی جاتی۔

۵۔ اگر جرم کسی فوجی یا سول افسر سے سرزد ہوا ہوتا تو اسے اپنے عہدہ سے معزول کر دیا جاتا تاکہ وہ عدالت کی کارروائی پر نہ تو اثر انداز ہو سکے اور نہ دباؤ ڈال سکے۔

۶۔ ملزم کو اپنی صفائی کا پورا پورا موقع دیا جاتا کہ وہ اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی صفائی پیش کرے۔

۷۔ حالات اور تنقیحات جو ملزم اپنے بیان میں اٹھاتا ان کو مناسب اہمیت دی جاتی اور مقدمہ کی کارروائی کے دوران انھیں پیش نظر رکھا جاتا اور گواہوں پر جرح کے دوران بھی ان پر نظر رہتی۔

۸۔ شکایت کنندہ اور گواہ اصل حالات بیان کرنے اور عدالت کو حقیقت حال دریافت کرنے میں مدد دینے کے لیے آزاد تھے۔

۹۔ جرح کے دوران شکایت کنندہ اور گواہ تمام سوالوں کے جواب دینے اور جن حالات میں جرم سرزد ہوا تھا ان کی تفصیل بتانے کے پابند تھے۔

۱۰۔ شہادت لینے اور فیصلہ دینے میں قرآنی قانون کو بالاترین مقام حاصل تھا۔ اگر شکایت کنندہ اور گواہ قرآنی قانون شہادت پر پورے نہ اترتے تو انھیں جھوٹے گواہ ہونے کی قرآنی سزا دی جاتی اور ملزم کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سلسلہ میں عدالت میں علیحدہ مقدمہ درج کرائے۔

اس مقدمہ کے دائر ہونے، فردِ جرم تیار کرنے، ملزم پر عائد کرنے، سماعت اور جرح کی کارروائی، مستغیث کو ثبوت پیش کرنے کی آزادی اور ملزم کو صفائی پیش کرنے کا موقع، شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کا اعلان، فیصلہ پر عمل درآمد ایسے واضح اور صاف معاملات ہیں کہ ان کا مطالعہ کرتے وقت بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ عہدِ حاضر کی کسی جدید ترین اور ترقی یافتہ عدالت کی کارروائی ہے اس مقدمہ کی تفصیلات سے اگر حضرت عمرؓ اور ان کے عہد کا ذکر حذف کر دیا جائے تو اس کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص لازماً سمجھے گا کہ یہ انتہائی ترقی یافتہ اور عہدِ حاضر کے عدالتی نظام کا عدالتی طریقِ کار ہے۔

اس مقدمہ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مغیرہ بن شعبہ پر جس عورت (ام جمیل) سے زنا کرنے کا الزام لگا اسے عدالت نے طلب نہیں کیا فردِ جرم میں اس کا نام موجود تھا۔ گواہی اور جرح کے دوران اس کا نام آیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ ملزم نفسِ الزام سے انکاری ہے یہ مقدمہ اس مقدمہ سے مختلف ہے جس میں ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کیا مگر جب یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا تو آپ نے فرمایا: "اما غنمك وجاريتك فرد عليك" "تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھی کو واپس اور پھر آپؐ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرما دی۔ اس کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے باب چہارم میں ہے۔ اس مقدمہ میں ملزم نے زنا کا اقرار کیا۔ عدالت نے تفتیشی افسر بھیجا جس کے سامنے عورت نے بھی اعتراف کر لیا۔ مقدمہ زیرِ غور میں ملزم مغیرہ زنا کے الزام سے انکار کر رہا ہے اس لیے عورت کو عدالت نے طلب نہیں کیا۔

اس مقدمے کا دوسرا بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ اگر زنا کے گواہوں میں اختلاف ہو جائے یا اور کسی وجہ سے ان کی شہادتوں سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا الٹے گواہ جھوٹے الزام کی سزا پائیں گے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں پہلا یہ کہ چاروں گواہ ثقہ ہوں مگر گواہی دیتے وقت ان میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ گواہ تزکیہ الشہود کی شرائط پوری نہ کرتے ہوں اگرچہ وہ تعداد میں پورے ہوں۔ دوسری صورت میں فقہا کی دو رائے ہیں امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر ایک شخص زنا کے مقدمے میں چار فاسق گواہ پیش کرے تو نہ قاذف پر حد جاری ہو گی اور نہ گواہوں پر حد واجب ہو گی۔ کیونکہ قرآن چار گواہوں کا تقاضا کرتا ہے اور اس شخص نے یہ تقاضا پورا کر دیا۔" وهذا قد اتى باربعة شهداء فلا يلزمه الحد ولأن الفاسق من اهل الشهادة وقد وجدت شرائط شهادة الزنا من اجتماعهم عند القاضي الا انه لم تقبل شهادتهم لاجل التهمة فكما اعتبرنا التهمة في نفي الحد عن المشهود عليه فكذلك وجب اعتبارها في نفي الحد عنهم" (امام رازی التفسیر الکبیر ج ۱۳، ص ۱۵۹) مگر امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق ان پر حد جاری ہو گی۔ کیونکہ وہ معتبر شرائط سے متصف نہیں۔ وہ گواہوں کے زمرے سے خارج ہو گئے اور محض قاذف رہ گئے۔" انهم غير موصوفين بالشرائط المعتبرة في قبول الشهادة فخرجوا عن ان يكونوا شاهدين، فبقوا محض القاذفين (رازی ۱۵۹)

مقدمہ مغیرہ میں چار گواہوں کی تعداد بھی پوری ہے اور ان میں سے کوئی فاسق بھی نہیں۔ ان پر پہلی صورت کا اطلاق ہوتا ہے جس کے مطابق چار معتبر گواہوں کے درمیان گواہی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایسی صورت میں زنا کی گواہی دینے والوں پر قذف کی حد کیوں جاری ہو؟ قرآن کے قانونِ شہادت کے مطابق زنا کے مقدمہ میں چاروں گواہوں کا متفق الرائے

ہونا ضروری ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ نفس واقعہ کی بنیادی شرائط شہادت کے بارے میں چاروں گواہوں کا مشاہدہ اور علم ذاتی ہو۔ وہ خارجی اثر کے تحت واقعات بیان نہ کریں۔ اس شکل میں چاروں گواہوں میں اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر چاروں گواہوں میں سے بعض بعض کے زیر اثر گواہی دیں تو دوران گواہی ان میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اختلاف کی وجہ سے چار کا نصاب پورا نہیں ہوتا اور عدم تکمیل نصاب مستوجب قذف قرار پاتا ہے۔ کیونکہ اگر چاروں گواہ متفق الرائے ہوکر گواہی دے دیں تو ملزم کو رجم کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ معتبر ہیں اس اصول کے پیش نظر ہم تحقیق کرتے ہیں کہ آیا مغیرہ کے خلاف چاروں گواہ ابتدا ہی سے متفق الرائے تھے؟ ان چاروں کا مشاہدہ اور علم ذاتی تھا یا ان میں سے بعض خارجی اثر کے تحت گواہی پر آمادہ ہوئے تھے؟

یہ مقدمہ مختلف طرق سے روایت ہوا ہے۔ بعض روایات میں جزوی اختلاف ہے اور بعض میں بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مقدمہ کی روایت میں دوسرا نمایاں پہلو محدثین اور مورخین کی روایت میں اختلاف ہے محدثین میں سے امام حاکم نے المستدرک میں یہ روایت تفصیل سے بیان کی ہے اور مؤرخین میں سے امام طبری نے اسے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ طبری کی روایت کا وہ حصہ جو عدالت کی کارروائی سے متعلق تھا اُسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس کے دوسرے حصہ پر بعد میں بطور تقابل تبصرہ کیا جائے گا۔ ہم پہلے امام حاکم کی المستدرک سے یہ مقدمہ نقل کرتے ہیں: (ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ المعروف بالحاکم النیساپوری (۴۰۵ھ) الجزء الثالث مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد الدکن ۱۳۴۱ھ صفحات ۴۴۸، ۴۴۹)

(حدثنا) ابوبکر محمد بن داود بن سلیمان الزاهد ثنا عبد الله بن محمد بن قحطبة بن مرزوق الطلحی ثنا محمد بن نافع الکرابیسی البصری ثنا ابوعتاب سهل بن حماد ثنا ابوکعب صاحب الحریر عن عبد العزیز بن ابي بکرة قال کنا جلوسا عند باب الصغیر الذی فی المسجد یعنی باب غیلان ابوبکرة واخوه نافع و شبل بن معبد فجاء المغیرة بن شعبة یمشی فی ظلال المسجد و المسجد یومئذ من قصب فلنتهی الی ابي بکرة فسلم علیه فقال له ابوبکرة ایها الامیر ما یخرجك من دار الامارة قال اتحدث الیکم فقال له ابوبکرة لیس لك ذلك الامیر یجلس فی داره ویبعث الی من یشاء فتحدث معهم قال یا ابا بکرة لا بأس بما اصنع فدخل من باب الاصغر حتی تقدم الی باب ام جمیل امرأة من قیس قال وبین دار ابی عبد الله وبین دار المرأة طریق فدخل علیها قال ابوبکرة لیس لی علی هذ ، اصبر فبعث الی غلام له فقال له ارتق من غرفتی فانظر من الکوة فانطلق فنظر فلم یلبث ان رجع فقال وجدتهما فی لحاف فقال للقوم توموامعی فقاموا فبدأ ابوبکرة فنظر فاسترجع ثم قال لاخیه انظر فنظر قال ما رأیت قال رأیت الزنا ثم قال ما رابك انظر فنظر قال ما رأیت قال رأیت الزنا محصنا قال اشهد الله علیکم قالوا نعم قال فانصرف الی اهله وکتب الی عمر بن الخطاب بما رأى فاتاه امر فظیع صاحب رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فلم یلبث ان بعث ابا موسی الاشعری امیرا علی البصرة فارسل ابو موسی الی المغیرة ان اقم ثلاثة ایام انت فیها امیر نفسك فاذا کان الیوم الرابع فارتحل انت وابوبکرة وشهوده فیا طوبی لك ان کان مکذوبا علیك وویل لك ان کان مصدوقا علیك فارتحل القوم ابوبکرة وشهوده والمغیرة

بن شعبة حتى قدموا المدينة على امير المؤمنين فقال هات ما عندك يا ابابكرة قال اشهد اني رأيت الزنا محصنا ثم قدموا يا عبد الله اخاه فشهد فقال اشهد اني رأيت الزنا محصنا ثم قدموا شبل بن معبد البجلي فسأله فشهد كذلك ثم قدموا زيادا فقال ما رأيت فقال رأيتهما في لحاف وسمعت نفسا عاليا ولا ادري ما وراء ذلك فكبر عمر وفرح اذ نجا المغيرة وضرب القوم الا زياد۔

حاکم کی روایت کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ ابوبکرۃ اس کا بھائی نافع اور شبل بن معبد مسجد کے باب الصغیر (باب غیلان) کے پاس بیٹھے تھے۔

۲۔ مغیرۃ خود ان کے پاس آئے۔ ابوبکرہ نے پوچھا کہ مغیرۃ گورنر ہیں انھیں دار الامارت سے نکل کر خود ان کے پاس آنے کی کیا حاجت تھی وہ انھیں وہیں طلب کر سکتے تھے۔

۳۔ ابوبکرۃ سے باتیں کرنے کے بعد مغیرہ باب الاصغر ہی سے گزر کر ام جمیل کے گھر میں داخل ہو گئے۔

۴۔ اس پر ابوبکرۃ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غلام کو بھیجا کہ وہ کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھے۔

۵۔ غلام نے تھوڑی دیر بعد واپس آکر بتایا کہ اس نے ان دونوں کو ایک لحاف میں پایا ہے۔

۶۔ ابوبکرہ نے دوسروں کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ وہ گئے۔

۷۔ ابوبکرہ نے پہلے خود دیکھا پھر اپنے بھائی کو دیکھنے کے لیے کہا جس نے دیکھا ابوبکرۃ نے اس سے پوچھا کیا دیکھا اس نے جواب دیا میں نے زنا دیکھا۔

۸۔ ابوبکرہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اس سے دوبارہ پوچھا "ما رابك" "تجھے کس چیز نے شک میں ڈالا ہے؟ پھر دیکھو اس نے پھر دیکھا اس نے پوچھا کیا دیکھا اس نے جواب دیا میں نے زنا محصن دیکھا۔

۹۔ ابوبکرہ نے انھیں کہا کہ تم اللہ کے لیے شہادت دو گے انہوں نے کہا ہاں۔

۱۰۔ ابوبکرہ نے گھر آکر یہ واقعہ حضرت عمر کو لکھ بھیجا۔

۱۱۔ حضرت عمرؓ نے اسے صحابی رسولؐ کے لیے افسوسناک امر قرار دیا مغیرہ کو معطل کر کے ابوموسیٰ الاشعری کو گورنر بصرہ مقرر کر دیا۔ ملزم مغیرہ اور شکایت کنندہ ابوبکرۃ مع گواہوں کے مدینہ عدالت میں پیش ہوئے۔

۱۲۔ حضرت عمر کے سامنے ابوبکرہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے زنا محصن دیکھا ہے پھر اس کے بھائی ابوعبداللہ (نافع) نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے زنا محصن دیکھا ہے پھر شبل بن معبد نے بھی ویسا ہی بیان دیا۔ پھر زیاد کو بیان دینے کے لیے کہا گیا اس نے کہا "میں نے ان دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا اور پھولی ہوئی سانس سنی۔ اس کے آگے کیا تھا مجھے معلوم نہیں"۔ رأيتهما في لحاف و سمعت نفسا عاليا ولا ادري ما وراء ذلك"۔

۱۳۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تکبیر کہی اور خوش ہوئے کیونکہ مغیرہ کو نجات ملی۔

۱۴۔ زیاد کے سوا باقی گواہوں پر حد جاری ہوئی۔

اب ہم تاریخ طبری کی روایت نقل کرتے ہیں:

ذكر خبر عزل المغيرة عن البصرة وولاية أبي موسى :

قال : وفي هذه السنة ولّى عمر أبا موسى البصرة، وأمره أن يشخص إليه المغيرة في ربيع الأول فشهد عليه — فيما حدثني معمر، عن الزهري، عن ابن المسيب — أبو بكرة، وشبل بن معبد البجلي، ونافع بن كلدة وزياد .

قال، وحدثني محمد بن يعقوب بن عتبة عن أبيه، قال : كان يختلف إلى أم جميل، امرأة من بني هلال وكان لها زوج هلك قبل ذلك من ثقيف، يقال له الحجاج بن عبيد فكان يدخل عليها، فبلغ ذلك أهل البصرة فأعظموه، فخرج المغيرة يوماً من الأيام حتى دخل عليها، وقد وضعوا عليها الرصد فانطلق القوم الذين شهدوا جميعاً، فكشفوا الستر وقد واقعها فوفد[1] أبو بكرة إلى عمر فسمع صوته وبينه وبينه حجاب : فقال أبو بكرة؟ قال : نعم، قال، لقد جئت لشر، قال : إنما جاء بي المغيرة ثم قص عليه القصة، فبعث عمر أبا موسى الأشعري عاملا، وأمره أن يبعث إليه المغيرة، فأهدى المغيرة لأبي موسى عقيلة، وقال : إني رضيتها لك فبعث أبو موسى بالمغيرة إلى عمر

قال الواقدي، وحدثني عبد الرحمن بن محمد بن أبي بكر بن محمد ابن عمرو بن حزم، عن أبيه، عن مالك بن أوس بن الحدثان، قال، حضرت عمر حين قدم بالمغيرة، وقد تزوج امرأة من بني مرة، فقال له : إنك لفارغ القلب، طويل الشبق فسمعت عمر يسأل عن المرأة فقال يقال لها الرقطاء، وزوجها من ثقيف، وهو من بني هلال .

قال أبو جعفر : وكان سبب ما كان بين أبي بكرة والشهادة عليه — فيما كتب إلى السري، عن شعيب عن سيف، عن محمد والمهلب وطلحة وعمرو بإسنادهم، قالوا : كان الذي حدث بين أبي بكرة والمغيرة بن شعبة أن المغيرة كان يناغيه، وكان أبو بكرة ينافره عند كل ما يكون منه، وكانا بالبصرة، وكانا متجاورين بينهما طريق وكانا في مشربتين متقابلتين لهما في داريهما في كل واحدة منهما كوة مقابلة الأخرى، فاجتمع إلى أبي بكرة نفر يتحدثون في مشربته، فهبت ريح، ففتحت باب الكوة، فقام أبو بكرة ليصفقه، فبصر بالمغيرة، وقد فتحت الريح باب كوة مشربته، وهو بين رجلي امرأة، فقال للنفر : قوموا فانظروا فقاموا فنظروا ثم قال : اشهدوا، قالوا : من هذه؟ قال : أم جميل ابنة الأفقم — وكانت أم جميل إحدى بني عامر بن صعصعة، وكانت غاشية للمغيرة، وتغشى الأمراء والأشراف — وكان بعض النساء يفعلن ذلك في زمانها — فقالوا : إنما رأينا أعجازاً ولا ندري ما الوجه؟ ثم إنهم صمموا حين قامت، فلما خرج

---

[1] ط : "فكتب" وانظر اليعقوبي ۲ : ۱۲۴

المغيرة إلى الصلاة حال أبوبكرة بينه وبين الصلاة وقال: لا تصل بنا فكتبوا إلى عمر بذلك، وتكاتبوا، فبعث عمر إلى أبي موسى، فقال: يا أبا موسى، إني مستعملك، إني أبعثك إلى أرض قد باض بها الشيطان وفرّخ، فالزم ما تعرف، ولا تستبدل فيستبدل الله بك. فقال: يا أمير المؤمنين أعنّي بعدة من أصحاب رسول الله من المهاجرين والأنصار، فإني وجدتهم في هذه الأمة وهذه الأعمال كالملح لا يصلح الطعام إلا به فاستعن بمن أحببت فاستعان بتسعة وعشرين رجلا منهم أنس بن مالك وعمران بن حصين وهشام بن عامر ثم خرج أبو موسى فيهم حتى أناخ بالمربد وبلغ المغيرة أن أبا موسى قد أناخ بالمربد فقال والله ما جاء أبو موسى زائراً ولا تاجراً، ولكنه جاء أميراً. فإنهم لفي ذلك، إذ جاء أبو موسى حتى دخل عليهم، فدفع إليه أبو موسى كتاباً من عمر وإنه لأوجز كتاب كتب به أحد من الناس أربع كلم عزل فيها، وعاتب، واستحث وأمر: أما بعد فإنه بلغني نبأ عظيم، فبعثت أبا موسى أميراً فسلم إليه[1] ما في يدك[2]، والعجل، وكتب إلى أهل البصرة: أما بعد، فإني قد بعثت أبا موسى أميراً عليكم، ليأخذ لضعيفكم من قويكم، وليقاتل بكم عدوكم وليدفع عن ذمتكم[3] وليحصي لكم فيئكم ثم ليقسمه بينكم، ولينقي لكم طرقكم[4]

وأهدى له المغيرة وليدة من مولدات الطائف تدعى عقيلة، وقال إني قد رضيتها لك ــ وكانت فارهة ــ وارتحل المغيرة وأبوبكرة ونافع بن كلدة وزياد وشبل بن معبد البجلي حتى قدموا على عمر فجمع بينهم وبين المغيرة، فقال المغيرة: سل هؤلاء الأعبد كيف رأوني مستقبلهم أو مستدبرهم؟ وكيف رأوا المرأة أو عرفوها؟ فإن كانوا مستقبلي فكيف لم أستتر[5]، أو مستدبري فبأي شيء استحلوا النظر إليّ في منزلي على امرأتي؟ والله ما أتيت إلا امرأتي ــ وكانت شبهها[6] ــ فبدأ بأبي بكرة، فشهد عليه أنه رآه بين رجلي أم جميل وهو يدخله ويخرجه كالميل في المكحلة، قال كيف رأيتهما؟ قال مستدبرهما قال فكيف استثبت[7] رأسها؟ قال: تحاملت ثم دعا بشبل بن معبد، فشهد بمثل ذلك. فقال: استدبرتهما أو استقبلتهما؟ قال استقبلتهما وشهد نافع بمثل شهادة أبي بكرة، ولم يشهد زياد بمثل شهادتهم. قال: رأيته جالساً بين رجلي امرأة، فرأيت قدمين مخضوبتين تخفقان، واستين مكشوفتين، وسمعت حفزاً شديداً. قال: هل رأيت كالميل في المكحلة؟ قال لا، قال: فهل تعرف المرأة؟ قال: لا، ولكن أشبهها، قال: فتنح، وأمر بالثلاثة فجلدوا الحد، وقرأ: فإذ لم

---

[1] من ابن الاثير والنويري

[2] س ابن الاثير: "بيديك"

[3] ابن الاثير: "دينكم"

[4] ابن الاثير: "طريقكم"

[5] ابن كثير: "لم يستتروا"

[6] ابن الاثير وابن كثير والنويري: "تشبهها"

[7] س: "استثبت"

یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ[1]

فقال المغيرة : اشفف من الأعبد، فقال : اسكت اسكت الله نامتك! أما والله لو تمت الشهادة لرجمتك بأحجارك

تاریخ طبری کی روایت کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ ابوبکرۃ اور مغیرہ کے درمیان پہلے سے باہمی منافرت مغیرہ کے خلاف ابوبکرۃ کی شہادت کا سبب تھی مغیرہ ابوبکرۃ کی تحقیر کیا کرتے اور ابوبکرہ مغیرہ کے ہر کام کے خلاف منافرت پھیلاتے تھے ۔

۲۔ دونوں پڑوسی تھے ۔ دونوں کے بالا خانوں کی کھڑکیاں بالمقابل تھیں ۔

۳۔ ابوبکرہ اپنے بالا خانہ میں ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ہوا سے کھڑکی کا دروازہ کھلا جسے بند کرنے کے لیے ابوبکرہ اُٹھے اچانک مغیرہ کو دیکھا ۔ جس کی کھڑکی کا دروازہ بھی ہوا سے کھل گیا تھا ۔

۴۔ مغیرہ ایک عورت کے پاؤں کے درمیان تھے ۔

۵۔ ابوبکرہ نے لوگوں سے کہا اٹھو دیکھو وہ اُٹھے اور دیکھا ۔

۶۔ ابوبکرہ نے انھیں کہا گواہ رہو ۔

۷۔ انہوں نے پوچھا یہ عورت کون ہے ۔

۸۔ ابوبکرہ نے بتایا یہ ام جمیل بنت افقم ہے ۔

۹۔ انہوں نے کہا ہم نے تو صرف سُرین دیکھے ہیں جہاں چہرے کے متعلق کچھ معلوم نہیں پھر جب وہ اٹھی تو وہ آمادہ ہو گئے ۔

۱۰۔ انہوں نے یہ واقعہ حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا جنہوں نے مغیرہ کو معزول کر کے ابوموسیٰ الاشعری کو گورنر مقرر کر دیا ۔

۱۱۔ مغیرہ اور ابوبکرہ مع گواہاں عدالتِ عمرؓ میں حاضر ہوئے ۔

۱۲۔ مغیرہ نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ ان غلاموں سے یہ سوال کئے جائیں : انہوں نے مجھے کیسے دیکھا پیچھے سے یا آگے سے انہوں نے عورت کو کیسے دیکھا اور کیسے پہچانا اگر یہ لوگ میرے آگے کی طرف تھے تو میں کیسے پوشیدہ نہ رہا (لم یستتروا (ابن کثیر) وہ کیسے پوشیدہ رہے ، اگر وہ میرے پیچھے تھے تو کس حکم سے انھیں اجازت ملی کہ وہ میرے گھر میں میری بیوی پر مجھے دیکھیں ۔ بخدا میں نے اپنی بیوی کے سوا کسی کے ساتھ مباشرت نہیں کی ۔ میری بیوی اس عورت سے مشابہ ہے ۔

۱۳۔ ابوبکرہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے مغیرہ کو ام جمیل کے پاؤں کے درمیان دیکھا وہ اپنا عضو سرمہ دانی میں سلائی کی طرح ڈال اور نکال رہا تھا ۔ ابوبکرہ نے مغیرہ کو پیچھے سے دیکھا جب عورت اٹھی تو اسے پہچانا دوسرے گواہ شبل نے بھی گواہی تو ابوبکرہ کی طرح دی مگر یہاں اختلاف کیا کہ اس نے مغیرہ کو پیچھے کی بجائے آگے سے دیکھا ۔ تیسرے گواہ نافع نے ابوبکرہ کی طرح گواہی دی ۔

۱۴۔ چوتھے گواہ زیاد نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے مغیرہ کو ایک عورت کے پاؤں کے درمیان دیکھا رنگے پیر گرتے اور

[1] سورۃ النور ـ ۱۳

نگلے سُرین دیکھے پھولی ہوئی سانسیں سنیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تو نے سرمہ دانی میں سلائی کی طرح دیکھا اس نے کہا نہیں
حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تو نے عورت کو پہچانا اس نے کہا نہیں۔ مگر وہ اس کے مشابہ تھی۔
۱۵۔ حضرت عمرؓ نے تین پر کوڑوں کی حد جاری کی۔
۱۶۔ مغیرہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: "مجھے ان غلاموں سے بچائیے جس پر حضرت عمرؓ نے کہا: "چپ رہ اللہ تمہیں چپ کرے تجھے موت دے بخدا اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں تجھے سنگسار کر کے رہتا۔"

محدثین اور مؤرخین کی روایتوں میں تضادات

محدث (حاکم) اور مورخ (طبری) کی روایتوں میں چند بنیادی تضاد پائے جاتے ہیں جن کو سمجھے بغیر حضرت عمرؓ کے فیصلے کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے:

۱۔ سب سے بڑا اور بنیادی تضاد یہ ہے کہ طبری کی روایت کے مطابق یہ واقعہ مغیرہؓ کے اپنے گھر کے بالاخانہ میں پیش آیا جبکہ حاکم کی روایت کے مطابق یہ واقعہ ام جمیل کے گھر میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ اتنا بڑا تضاد ہے کہ اگر دیگر قرائن موجود نہ ہوں تو فی نفسہ واقع کا وقوع پذیر ہونا مشکوک قرار پاتا ہے۔

۲۔ دوسرا تضاد یہ ہے کہ طبری کی روایت کے مطابق ابوبکرہ دیگر حضرات کے ساتھ اپنے بالاخانے میں تھے۔ ابوبکرہ اور مغیرہ کے بالاخانوں کی کھڑکیاں اچانک ہوا سے کھل گئیں جہاں سے ابوبکرہ اور دیگر حضرات نے یکے بعد دیگرے یہ کھلم کھلا واقع بغیر کسی حجاب کے دیکھا۔ حاکم کی روایت کے مطابق ابوبکرہ دیگر افراد کے ساتھ مسجد کے باب الصغیر (غیلان) کے پاس بیٹھے تھے وہاں سے انہوں نے مغیرہؓ کو ام جمیل کے گھر داخل ہوتے دیکھا۔ ابوبکرہ نے اپنا غلام نگرانی پر مقرر کیا جس نے آکر اطلاع دی کہ اس نے ان دونوں کو ایک لحاف میں پایا اس اطلاع پر ابوبکرہ دیگر حضرات کے ساتھ بالاخانے میں گئے اور یکے بعد دیگرے یہ واقعہ دیکھا۔
ان روایتوں میں بنیادی تضاد یہ ہے کہ طبری کے مطابق ابوبکرہؓ اور دیگر حضرات نے یہ واقعہ غلام کی نگرانی کے بغیر خود دیکھا جب کہ حاکم کے مطابق نگرانی پر مقرر کردہ غلام کی اطلاع پر یہ سب لوگ اٹھ کر بالاخانہ میں گئے اور وہاں سے دیکھا۔

۳۔ تیسرا بڑا تضاد یہ ہے کہ حاکم کی روایت کے مطابق خود ابوبکرہ نے اپنے غلام کو نگرانی پر مقرر کیا جس نے اطلاع دی کہ اس نے ان دونوں کو ایک لحاف میں پایا "وجدتهما فی لحاف" اس سے آگے اس نے نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ بتایا۔ اور یہی بیان زیاد نے دیا۔ جس نے کہا: "رأیتهما فی لحاف و سمعت نفساً عالیا ولا ادری ما وراء ذلک" میں نے ان دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا اور پھولی ہوئی سانس سُنی اس سے آگے کیا تھا مجھے معلوم نہیں۔ اس کے برعکس طبری کے مطابق ابوبکرہ کا بیان یہ تھا کہ اس نے مغیرہ کو ام جمیل کے کھڑے پاؤں کے درمیان اس حالت میں دیکھا کہ وہ سرمہ دانی میں سلائی کی طرح ڈال اور نکال رہا تھا۔ یہ مشاہدہ بجز اس کے ممکن نہیں کہ لحاف وغیرہ کے حجاب کے بغیر براہ راست کیا گیا ہو۔ مگر حاکم کی روایت کے مطابق واقع یوں ہے کہ جب ابوبکرہ نے اپنے بھائی ابو عبداللہ (نافع) کو دیکھنے کے لیے کہا اور اس نے دیکھ کر جس انداز میں اس کا اظہار کیا اس

سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے بھی ان دونوں کو لحاف میں دیکھا۔ ابوبکرہ کے استفسار پر اس نے فقط یہ کہا: "رأیت الزنا" میں نے زنا دیکھا یہ بیان اس کے ذاتی علم اور مشاہدے کے مطابق تھا۔ مگر اس سے سرمہ دانی میں سلائی کی طرح والی بات ثابت نہیں ہوتی اور زنا کے مقدمہ میں شہادت مشکوک قرار پاتی ہے یہ خدشہ ابوبکرہ کو لاحق ہوا جس نے اپنے بھائی پر زور دے کر کہا "ما رابک" تجھے کس چیز نے شک میں ڈالا ہے۔ جس کے بعد نافع نے کہا کہ اس نے زنا محض دیکھا۔ اب ذرا تامل سے معمولی عقل و فہم کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ منظر اسی طرح تھا جس طرح ابوبکرہ نے بے حجاب اور کھلم کھلا بیان کیا ہے تو اس کے بھائی نافع کو بھی پہلی ہی نظر میں اسی طرح نظر آنا چاہیے تھا۔ جو شک و شبہ سے بالکل بالا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں نافع نے اپنے ذاتی علم و مشاہدہ کی بنا پر جو کچھ دیکھا وہ شک و ریب سے بالا نہیں تھا۔ جس سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ نافع کا دوسرا بیان اپنے بھائی ابوبکرہ کے زیرِ اثر تھا۔ حاکم کی روایت میں ابوبکرہ کے بھائی نافع کے بعد شبل بن معبد اور زیاد کا موقعہ زنا دیکھنے کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ عدالت میں انہوں نے بیان دیا۔ اگر نافع کی طرح موقع واردات پر شبل اور زیاد اپنے مشاہدات کا اظہار کرتے تو اس سے واضح ہو سکتا تھا کہ ان کا مشاہدہ ابوبکرہ کی طرح بلا حجاب تھا یا نافع کی طرح مشکوک تھا۔

ان تضادات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابتدا ہی سے مدعی اور گواہوں کے درمیان متفق علیہ نہ تھا صاف طور پہ نظر آ رہا تھا کہ نافع نے اپنے بھائی ابوبکرہ کے زیرِ اثر اپنا پہلا بیان بدلا تھا۔ نافع اور شبل کے ابوبکرہ کے زیرِ اثر ہونے کا سب سے مضبوط قرینہ یہ ہے کہ ابوبکرہ کا غلام اس واقعہ کا سب سے پہلا اور موقعہ کا گواہ ہے درحقیقت اس کی ابتدائی رپورٹ ہی اس پورے واقعہ کی بنیاد ہے۔ اس کی رپورٹ بغیر کسی شک و شبہ کے یہ ہے کہ اس نے ان دونوں کو ایک لحاف میں پایا اس سے آگے نہ اس نے کچھ دیکھا اور نہ بیان کیا۔ اگر اس نے لحاف وغیرہ کے حجاب کے بغیر یہ منظر دیکھا ہوتا تو وہ یقیناً اس کا ذکر کرتا۔ یہ ابوبکرہ کے اپنے غلام کا بیان ہے۔ جو صریحاً ابوبکرہ کے اپنے بیان کے خلاف ہے۔ چوتھے گواہ زیاد کا بیان حدیث اور تاریخ کی تمام کتب میں ایک ہی ہے۔ اس میں نہ موقع واردات پر کوئی تضاد پایا جاتا ہے اور نہ عدالت میں بیان دیتے وقت کوئی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اس نے مغیرہ کو ایک عورت کے ساتھ ایک لحاف میں دیکھا نہ اس نے سرمہ دانی میں سلائی کی طرح والی کیفیت دیکھی اور نہ وہ عورت کو پہچانتا تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے مشاہدے کے مطابق بیان دیا جو ابوبکرہ کے زیرِ اثر نہ تھا۔

اس پورے واقعہ میں اہم ترین بات یہ ہے کہ دو آدمیوں کے مشاہدات اور بیان بالکل یکساں ہیں۔ ایک ابوبکرہ کے غلام کا بیان۔ دوسرے زیاد کا بیان۔ دونوں ایک دوسرے کے زیرِ اثر نہ تھے۔ بلکہ غلام تو ابوبکرہ کا تھا اس لئے اس کے بیان میں اگر کوئی میلان والی بات ہو سکتی تھی تو وہ ابوبکرہ کی تائید ہی میں ہو سکتی تھی اس کے مخالف نہیں ہو سکتی تھی مگر امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی ابتدائی رپورٹ اور ابوبکرہ کا بیان باہم متضاد ہیں۔ زیاد کا مشاہدہ اور بیان وہی ہے جو ابوبکرہ کے غلام کا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ غلام اور زیاد کے بیان ذاتی علم اور مشاہدے پر مبنی تھے اور ابوبکرہ کے اثر سے بالا تھے۔ غلام کو زیرِ اثر لانے یا اپنے مطابق بیان دینے کی نوبت اس لئے نہ آئی کہ اسے نہ عدالت میں پیش کرنا تھا اور نہ زنا کے ثبوت میں قاضی کے سامنے اس کا بیان

ہوتا تھا۔ زیاد اگر بصرہ میں موقع واردات پر ابو بکرہ کے زیر اثر آ گیا ہو تو یہ ممکن ہو سکتا ہے مگر عدالت میں قاضی کے متنبہ کرنے پر کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر صحیح اور درست بیان دے اور یہ بات سمجھ کر بیان دے کہ اس کے صحیح یا غلط بیان پر ایک صحابی رسولؐ پر رجم یا نجات کا دار و مدار ہے تو زیاد اپنے ایمان اور مشاہدے پر اعتماد کرتے ہوئے وہی بیان دیتا ہے جو اس کے ذاتی علم اور مشاہدے کا تقاضا تھا۔

ہم نے محدثین اور مورخین کی روایت کا خاص طور پر تقابل اس لیے کیا ہے تاکہ اصل حقائق سامنے لائے جا سکیں۔ امام حاکم نے "المستدرک" اس دعوے کے ساتھ مدون کی ہے کہ اس میں وہی روایات جمع کی گئی ہیں جو صحیحین بخاری اور مسلم کی روایات کے پائے کی ہیں۔ نامور محدث اور حدیث کی پرکھ کے نقاد امام الذہبی نے "المستدرک" کی تلخیص تیار کی اس کے ساتھ دوسرا یہ کارنامہ انجام دیا کہ امام المستدرک کے دعوئ صحت کو اصول حدیث اور امام بخاری اور امام مسلم کے اصولوں کے مطابق پرکھا۔ امام الذہبی کی تحقیق کے مطابق "المستدرک" کی دو تہائی روایات ان کے دعوے کے مطابق امام بخاری اور امام مسلم کے معیار کے مطابق ہیں۔ مگر ایک تہائی روایات اس معیار پر پوری نہیں اتریں۔ مغیرہ کے بارے میں "المستدرک" کی روایت امام الذہبی کی تحقیق کے مطابق ان روایات میں سے ہے جو بخاری اور مسلم کے معیار کی نہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ مغیرہ کے بارے میں امام حاکم کی روایت محدثین کے ہاں صحیح اور مستند روایت ہے امام حاکم کے علاوہ اور محدثین نے بھی مغیرہ والی روایت بیان کی ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الشہادات میں اسے تعلیقاً بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر العسقلانی نے اپنی "فتح الباری" الجزء الخامس دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور الباکستان ص ۲۵۶ پر، ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی نے اپنی "السنن الکبریٰ" الجزء العاشر الطبعۃ الاولیٰ المطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ بحیدر آباد الدکن الہند ۱۳۵۵ھ ص ۱۵ پر ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی (۱۲۶ تا ۲۱۱ھ) نے اپنی "المصنف" الجزء الثامن حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اپنی "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" الجزء السادس دار الکتاب، بیروت لبنان صفحہ ۲۸۰ پر، حافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۲۶۰ تا ۳۶۰ھ) نے اپنی "المعجم الکبیر" الجزء السابع مطبعۃ الوطن العربی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء ۲/۳۷۲ پر یہ روایت بیان کی ہے۔

صحیح بخاری میں اگرچہ یہ روایت تعلیقاً بیان ہوئی ہے مگر اس کی صحت کا ثبوت یہ ہے کہ امام حاکم نے امام بخاری کے معیار کے مطابق اس کی پوری سند بھی بیان کر دی ہے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں الطبرانی اور البیہقی کی روایتوں کی تخریج کے بعد لکھا ہے کہ "واسنادہ صحیح" اس کی اسناد صحیح ہیں۔ مجمع الزوائد کے مدون نے الطبرانی کی روایت نقل کرنے کے بعد اپنی تحقیق لکھی ہے کہ "ورجالہ رجال الصحیح" اس کے رجال صحیح ہیں۔ ہم نے محدثین کی بیان کردہ روایت کو تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس لیے لکھا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ امت میں اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ "سنت" اس مقدمہ کے بارے میں کیا روشنی ڈالتا ہے۔ بہرحال اس سے واضح ہو گیا کہ مغیرہ کے بارے میں صحیح روایت وہی ہے جو محدثین نے اور بالخصوص حاکم اور الطبرانی نے بیان کی ہے۔

اب ہم مؤرخین کی طرف لوٹتے ہیں۔ مورخین نے اپنے اپنے رنگ میں اس روایت کو بیان کیا ہے ہم طبری کی روایت کا حوالہ دے چکے ہیں۔ اس پر مختصر بحث مفید رہے گی ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (۲۲۴ تا ۳۱۰ھ) نے اپنی کتاب تاریخ الرسل والملوک" الجزء الرابع سنۃ ۱۷ھ میں " ذکر جزعزل المغیرۃ عن البصرۃ وولایۃ ابی موسیٰ" کے تحت اس واقعہ پر چار روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت معمر زہری اور ابن المسیب کے حوالے سے ہے جس میں فقط اتنا ذکر ہے کہ ابوبکرہ شبل بن معبد البجلی، نافع بن کلدہ اور زیاد نے مغیرہ کے خلاف گواہی دی۔ دوسری روایت محمد بن یعقوب بن عتبہ عن ابیہ کی سند سے نقل ہے یہ حاکم کی" المستدرک" والی روایت سے تقریباً مطابق ہے۔ تیسری ایک مختصر روایت الواقدی کے حوالے سے ہے۔ چوتھی روایت " السری" کے ایک خط پر مبنی ہے جو اس نے الطبری کو لکھا اور الطبری نے ویسے کا ویسا نقل کر دیا۔

پہلی تینوں روایتیں محدثین کی بیان کردہ روایتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ الطبری نے صحت کے نقطہ نظر سے انہیں ترتیب وار نقل کیا ہے۔ مگر چوتھی روایت الطبری نے" السری" کے خط کی شکل میں بیان کی ہے جس کے شروع میں وہ لکھتا ہے" فما کتب الیّ السری" السری نے جو سند بیان کی ہے اس میں غیر معتبر راوی سیف بن عمر موجود ہے۔ الذہبی نے اسے متروک قرار دیا ہے اسلامی اصول حدیث، اصول فقہ اور اصول تاریخ کے مطابق یہ روایت انتہائی ناقابل اعتبار ہے کیونکہ اس کے رجال غیر معتبر ہیں۔ خود الطبری کی ترتیب کے مطابق یہ آخری درجے کی روایت ہے۔ الطبری نے جو روایت دوسرے نمبر پر بیان کی ہے۔ وہ روایت اور درایت کے مطابق درست معلوم ہوتی ہے اس میں بالکل صاف اور واضح طور پر ذکر ہے کہ یہ واقعہ ام جمیل کے گھر پر پیش آیا اس روایت کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابوبکرہ وغیرہ نے نگران مقرر کر کے خفیہ نگرانی کرائی "وقد وضعوا علیہما الرصد" مگر السری کے حوالے سے جو چوتھی روایت نقل کی ہے اس میں یہ واقعہ خود مغیرہ کے اپنے گھر میں وقوع پذیر دکھایا گیا ہے۔ یہ تضادات اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اصل روایت وہی ہے جو خود الطبری نے اس واقعہ کے آغاز میں بیان کی ہے۔ جو محدثین کے اصول کے مطابق ہے اور یہ آخری روایت غلط غیر مستند اور وضعی ہے جسے غیر معتبر اور متروک راویوں نے بیان کیا ہے۔ الطبری نے بطور محقق اور مفسر اس واقعہ کو اپنی تفسیر میں سورۃ النور میں "قذف" کے مقام پر نقل کیا ہے۔ وہاں انہوں نے اسی روایت سے استناد کیا ہے جو محدثین نے روایت کی ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ الطبری کی اپنی تحقیق کے مطابق" السری اور سیف والی روایت" ناقابل اعتبار ہے۔

السری اور سیف والی روایت میں منجملہ دیگر غلط بیانیوں کے یہ بہت بڑا تضاد ہے کہ ابوبکرہ جب دوسرے افراد کو دعوت نظارہ دیتے ہیں تو وہ افراد ابوبکرہ سے پوچھتے ہیں یہ عورت کون ہے "من ھذہ" ابوبکرہ بتاتے ہیں کہ وہ اُم جمیل بنت افقم ہے وہ افراد پھر کہتے ہیں کہ ہم نے تو صرف سُرین دیکھے ہیں ہم نہیں جانتے چہرہ کس کا ہے؟" انما رأینا اعجازا ولا ندری ما الوجہ" جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ابوبکرہ کے علاوہ تینوں گواہ عورت کو نہیں پہچانتے تھے۔ پہچاننے کی صورت میں سوال بے معنی اور بے موقع تھا یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ذاتی علم کی بنیاد پر نہیں بلکہ ابوبکرہ کے زیر اثر عورت کو ام جمیل سمجھا فیصلہ اور سزا پر عمل درآمد کے بعد جب حضرت عمرؓ نے انہیں توبہ کرنے کے لیے

کہا تو وہ توبہ پر آمادہ ہوگئے اور انہوں نے توبہ کی - ان دونوں کا یہ فعل ظاہر کرتا ہے ۔ ملزمہ عورت کو پہچاننے جیسے مقدمہ کے بعض بنیادی امور کے بارے میں وہ ذہنی طور پر مطمئن نہ تھے اور وہ ابوبکرہ کے زیر اثر گواہی دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ گواہی دینے تک وہ اس خارجی اثر پر مطمئن ہوں مگر زیاد نے اپنے ذاتی مشاہدے اور علم کی بنیاد پر جو مضبوط اور قوی مؤقف اختیار کیا تھا اس سے متاثر ہو کر وہ بھی اپنے ذاتی مشاہدہ اور علم پر انحصار کرنے پر مائل ہوگئے ہوں۔ اس سے ان کی بدنیتی ثابت نہیں ہوتی ہے البتہ ذاتی علم اور مشاہدہ کی بجائے خارجی اثر پر انحصار معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بات شہادت کے اسلامی اصولوں کے منافی ہے بالخصوص زنا جیسے مقدمات میں جن کی شہادت کا نصاب پورا ہونے کی صورت میں ملزم کو رجم کی سزا دی جاتی ہے۔ جو حدود میں سنگین ترین حد ہے ۔ یہی اسباب تھے جن کے تحت حضرت عمرؓ نے انھیں قذف کی سزا دی

بعد کے مؤرخین نے زمانے کی طوالت کے برابر اس میں طول طویل رنگ آمیزیاں کیں صحیح اور غلط روایتوں پر مبنی جن مؤرخین نے اس واقع کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے :۔

الطبری تاریخ ج ۴ صفحات ۶۹ تا ۷۱، ۱۷ھ ذکر خبر عزل المغیرہ، ۵۱ھ ذکر قتل حجر بن عدی ۔

ابن خلکان ۔ تاریخ وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان ج ۲ صفحہ ۳۹۴ ذکر یزید بن زیاد بن ربیعہ ۔

ابن الاثیر ۔ الکامل فی التاریخ ذکر ۱۷ھ ج ۲ صفحہ ۲۲۴، ج ۳ صفحہ ۲۳۷ ذکر قتل حجر بن عدی ۔

الذہبی ۔ تاریخ اسلام ج ۲ صفحہ ۲۵۰ ذکر مغیرہ

ابوالفداء تاریخ ابوالفداء ذکر ۱۷ھ ص ۱۶۲ ۔

ابن الکثیر البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صفحات ۴۹ ۔ ۵۱ ذکر مغیرۃ

یعقوبی تاریخ یعقوبی ج ۲ صفحہ ۱۳۶

شرح ابن ابی الحدید ج ۳ صفحہ ۲۳۶ ذکر مطاعن عمر، طعن نمبر ۴

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تحفۂ اثنا عشریہ باب المطاعن میں طعن نمبر ۶ کے تحت باب ۱۱ صفحہ ۲۹۷ پر مغیرہ کے زنا پر جو اعتراضات و تنقیحات ہیں ان کا جواب دیا ہے ۔ مفتی محمد قلی ایک شیعہ مصنف نے تحفہ اثنا عشریہ از عبدالعزیز کے جواب میں ایک جامع اور مبسوط کتاب بعنوان : "تشیید المطاعن" لکھی اس میں طعن ششم پر شیعہ نقطۂ نظر سے بڑی مفصل بحث کی ہے یہ بحث از صفحہ ۵۹۶ تا ۷۰۰ پر پھیلی ہوئی ہے یہ کتاب فقہ جعفریہ کی جامع المنتظر کے کتب خانہ میں موجود ہے

بعد کے مؤرخین نے زمانے کی طوالت کے برابر اس میں طول طویل رنگ آمیزیاں کیں اور اسے اس حد تک بنیاد سے دور لے گئے کہ خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کی امانت، دیانت، عظمت اور عدالت بھی محفوظ نہ رہنے دی۔ کہا یہ گیا کہ حضرت عمرؓ نے زیاد کو جو یہ کہا کہ " فجاء زیاد فقال عمر جاء رجل لا یشھد الا بحق " (الطبرانی، المعجم الکبیر الجزء السابع صفحہ ۲۷۴) "زیاد پیش ہوا حضرت عمرؓ نے کہا یہ شخص آیا ہے جو صرف وہی گواہی دے گا جو حق ہے"۔ اس سے زیاد نے منحرف ہونے کا اشارہ پایا یہ بہتان عظیم ہے کہ حضرت عمرؓ نے مغیرۃ کی خاطر گواہ کو اشارہ دیا۔ یہ اتنی بڑی تہمت ہے کہ یہ خود قذف کی متقاضی ہے۔ اس وقت

کے نظام عدالت کا یہ عدالتی طریق کار تھا کہ مدعی، مدعا علیہ، گواہوں سب کو اللہ کا خوف دلا کر حق بیان کرنے کو کہا جاتا تھا۔ عہد رسالت کا وہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو کہا تھا کہ تم میں سے جو زیادہ بولنے والا ہے اگر میں نے اس کے حق میں فیصلہ دیا تو وہ یوں سمجھے جیسے اُسے جہنم کا ٹکڑا دیا گیا ہے جس سے متاثر ہو کر دونوں نے صلح کر لی۔ مقدمہ زیر غور میں تو قاضی نے صرف یہ کہا ہے کہ "رجل لا یشہد الا بحق" یہ شخص صرف وہی گواہی دے گا جو حق ہے۔ حق کی گواہی دینے کے لیے کہنے کو کس اصول یا قانون یا قاعدے کے مطابق اصل بیان سے منحرف ہونے کا اشارہ قرار دیا جا سکتا ہے اسی طرح مغیرہ نے اس موقع پر زیاد سے کہا "یا زیاد اذکر اللہ تعالیٰ واذکر موقف یوم القیامۃ فان اللہ تعالیٰ وکتابہ ورسولہ وامیر المومنین" (القاضی احمد الشہیر با بن خلکان، تاریخ وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان، الجزء الثانی صفحہ ۴۵۳) زیاد! اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جب تم روز قیامت کھڑے ہو گے اللہ تعالیٰ اس کی کتاب، اس کا رسولؐ اور امیر المومنین موجود ہوں گے۔ جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس سے تجاوز کر کے اس کی طرف مت جا جو تم نے نہیں دیکھا بخدا اگر تم میرے پیٹ اور اس عورت کے پیٹ کے درمیان ہوتے تو پھر بھی میرے عضو تناسل کو اس کے اندر داخل ہوتا نہ دیکھ سکتے تھے" فو اللہ لو کنت بین بطنی وبطنہا ما رأیت ان یسلک ذکری فیہا" (ابن خلکان صفحہ ۴۵۹) عدالت میں ایک گواہ سے اگر یہ کہا جائے کہ وہ اللہ، اس کے رسولؐ، اس کی کتاب اور روز آخرت کو یاد کر کے سچی اور صحیح گواہی دے تو کیا یہ احقاق حق کی رغبت دلانا نہیں ہو گا کیا اس سے گواہ کو یہ اشارہ ملے گا کہ وہ اپنے سچے۔ اصل اور حقیقی بیان پر قائم رہے یا اس سے منحرف ہو جائے۔ حقیقت وہی ہے کہ جب یہ داستان مورخین کے ہاتھ آیا تو انہوں نے نہ تو اسلامی تاریخ نگاری کے اصولوں کو مدنظر رکھا اور نہ صحابہ کی عزت و حرمت کے تقدس کا خیال کیا حتیٰ کہ وہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و عدالت تک جا پہنچے۔ ورنہ جہاں تک صحت واقعہ کا تعلق ہے اسے محدثین نے بیان کر دیا ہے اور وہی درست ہے۔ ہم امام حاکم کی روایت کے ضمن میں امام الذہبی کا ذکر کر آتے ہیں۔ الامام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی (۷۴۸ھ - ۱۳۷۴ء) نے اپنی کتاب "سیر اعلام النبلاء" مؤسسہ الرسالہ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء میں ابوبکرہ، نافع، شبل، زیاد اور مغیرہ بن شعبہ کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔ سب جگہ اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے مگر ایک محقق اور محدث کے اصولوں کے مطابق حالات قلمبند کئے ہیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر العسقلانی اور دیگر محدثین نے صحابہ کے حالات پر کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں یہ واقعہ موجود ہے ان میں نہ تضاد ہے اور نہ غلط بیانی۔

مغیرہ اور ابوبکرہ کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے تعلقات پہلے سے کشیدہ تھے دونوں کا تعلق طائف سے تھا جو مشہور عرب قبیلہ بنو ثقیف کا گڑھ تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طائف کا محاصرہ کیا تو عین محاصرے کے دوران ابوبکرہ بنو ثقیف کو چھوڑ کر سیڑھی کے ذریعے اتر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ ملے۔ اسلام قبول کیا اور امت مسلمہ میں شامل ہو گئے۔ طائف میں یہ غلام تھے بنو ثقیف نے آنحضرت سے اپنا غلام واپس مانگا مگر آپؐ نے اسے

واپس کرنے کی بجائے آزاد کر دیا۔ ان کا اصل نام نفیع تھا محاصرے کے دوران فصیل سے سیڑھی کے ذریعے اترنے کی وجہ سے آپ ابوبکرۃ کہلائے۔ تدلی من الحصن ببکرۃ فمن یومئذ کنی بابی بکرۃ (الذہبی سیر اعلام النبلاء ج ۳، ص۶) ان کی ماں سمیہ بنو ثقیف میں سے مشہور عرب طبیب حارث بن کلدہ کی لونڈی تھی اور ابوبکرۃ اس کے غلام تھے "کان عبداً للحارث بن کلدہ فاستلحقہ وسمیۃ ھی مولاۃ الحارث" (ابن عساکر بحوالہ الذہبی سیر اعلام النبلاء ج ۳، ص۶) ابوبکرہ کا بھائی نافع اور زیاد بھی اسی سمیہ کے بیٹے تھے۔ اس طرح مقدمہ مغیرہؓ میں مدعی اور گواہ ایک ہی لونڈی سمیہ کے بیٹے اور آپس میں بھائی تھے۔ "والجمیع اولاد سمیۃ المذکورۃ فھم اخوۃ لام" (ابن خلکان ج ۲، ص۳۹۳) یہ ہے وہ سماجی پس منظر جس کے تحت مغیرہ ان سب کو اس مقدمہ کے دوران بار بار "غلاموں" کے حقیر نام سے پکارتا ہے مغیرہ بنو ثقیف کے معزز خاندان سے تھے اپنے آپ کو عالی نسب سمجھتے تھے۔ جب مغیرہ اور یہ گواہ حضرت عمر کی عدالت میں پیش ہوئے تو اس وقت مغیرہ نے کہا "سَلْ ھولاءِ الاعبد کیف رأونی" (الطبری تاریخ ج ۴، ص۷ سنۃ ھ) ان غلاموں سے پوچھیے "انہوں نے مجھے کس حالت میں دیکھا" اسی طرح جب عدالت نے فیصلہ سنا دیا اور گواہوں کو قذف کی سزا ہو چکی تو حضرت مغیرہؓ نے پھر حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر کہا "اشفنی من الاعبد" مجھے ان غلاموں سے بچائیے (الطبری ج ۴ ص۷۲) جس پہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اسکت اسْکَتَ اللہ نامتک! اما واللہ لو تمت الشھادۃ لرجمتک باحجارک (الطبری ایضاً ص۷۲)

چپ رہ اللہ تمھیں چپ رکھے تمھیں موت دے بخدا اگر گواہی پوری ہو جاتی تو میں تمھیں سنگسار کر کے رہتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ اور ابوبکرہ کے درمیان پہلے سے کشیدگی موجود تھی اور وہ موقع بموقع ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرتے رہتے تھے۔ انھیں اسباب کے تحت بعض مؤرخین نے اس مقدمہ میں مغیرہ اور ابوبکرہ کی باہمی منافرت اور عداوت کو مغیرہ کے خلاف ابوبکرہ کی شہادت کے اسباب میں شمار کیا ہے چنانچہ ابو جعفر الطبری نے اس مقدمہ کی تفصیل نقل کرنے سے پہلے اپنی طرف سے ذیلی عنوان تحریر کیا ہے "وکان سبب ماکان بین ابی بکرۃ والشھادۃ علیہ" مغیرہ کے خلاف شہادت کا سبب وہ چیز تھی جو ابوبکرہ اور مغیرہ کے درمیان تھی۔ اس کے بعد تعلقات کی کشیدگی کا سبب بیان کیا گیا ہے "کان الذی حدث بین ابی بکرہ والمغیرہ بن شعبہ ان المغیرہ کان ینا غیہ، وکان ابوبکرۃ ینافرہ عند کل مایکون منہ" (ابو جعفر الطبری۔ تاریخ ج ۴ ص۷ سنۃ ھ) ابوبکرہ اور مغیرہ کے درمیان جو واقعہ پیش آیا اس کا سبب یہ ہے کہ مغیرہ ابوبکرہ کی تحقیر کرتا تھا اور ابوبکرہ کی روش یہ تھی کہ مغیرہ کام کرتا تھا وہ اس کے خلاف منافرت پھیلاتا تھا۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کی باہمی منافرت کا اس مقدمے کی ابتدا میں کافی دخل موجود تھا۔ ان مباحث کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ فی نفسہ واقعہ درست ہو۔ یہ واقعہ محدثین کی صحیح روایت کے مطابق ام جمیل کے گھر پیش آیا ہو۔ ابوبکرہ اور اس کے بھائیوں نے مغیرہ اور ام جمیل کو ایک لحاف میں دیکھا ہو۔ اگرچہ لحاف کے بغیر بے حجاب اور کھلم کھلا سرمہ دانی میں سلائی کی طرح کی حالت میں انہوں نے مشاہدہ نہ کیا ہو مگر ابوبکرہ کے زیر اثر دوسرے گواہ ابوبکرہ کے ہمنوا ہو گئے ہوں۔ زیاد عدالت میں اپنے مشاہدے پر قائم رہا ہو۔ ان واقعات کے مطابق حضرت عمرؓ کا فیصلہ عدل و انصاف اور قرآن کے قانون شہادت کے عین مطابق ہے۔ اس صورت میں ابوبکرہ اور دو گواہوں پر قذف کی سزا بالکل درست ہے۔ لہٰذا یہ درست نہیں کہ اگر چار گواہوں میں سے ایک گواہ مختلف بیان دے تو تین کو قذف کی سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ اس سے کوئی گواہ عدالت میں نہ جائے گا۔

اس مقدمے کی مندرجہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں گواہ شروع ہی سے متفق نہ تھے۔ انھیں اپنے علم و مشاہدہ کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ مقدمہ اس واقعہ سے بالکل مختلف ہے جس میں چاروں گواہوں نے اپنے علم و مشاہدہ کی بنیاد پر آزادانہ گواہی دینے کا فیصلہ کیا ہو۔ اگر دیگر قرائن شہادت دیں کہ چاروں گواہوں نے آزادانہ طور پر اپنے ذاتی علم و مشاہدہ کی بنیاد پر گواہی دینے کا فیصلہ کیا تھا اس کے باوجود ان میں کوئی ترغیب یا ترہیب کا شکار ہو گیا تو ایسی صورت میں قاضی کو اختیار ہوگا کہ وہ منحرف گواہ کو سزا دے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے اس مقدمے کی تفصیلات سامنے آچکی ہیں۔ اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے مآخذ اصلیہ دو ہیں ایک قرآن اور دوسرا سنت۔ قرآن محفوظ مصئون اور مکمل موجود ہے۔ سنت کا علم صرف صحیح حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ امت کا اجماعی فیصلہ ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیثوں میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ مورخین کی بیان کردہ وہی روایات قابلِ استناد ہیں جو اصولِ حدیث کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ جو روایات "صحیح" نہ ہوں انھیں استنباط مسائل کی بنیاد بنانا درست نہیں غیر معتبر ضعیف متروک جھوٹے راویوں کی روایات سے بلا سوچے سمجھے استنباط، استدلال اور اجتہاد کرنا صحیح نہیں۔ ہمیں آخر میں اس مسلمہ امر کی طرف اس لیے متوجہ کرنا پڑا کیوں کہ اس مقدمہ کی تحقیق کے دوران ہم نے دیکھا کہ چند مفسرین نے محدثین کی روایت کی بجائے مورخین کی روایت پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ استنباط، استدلال اور اجتہاد کا نتیجہ درست نہیں ہو سکتا۔

مفسرین میں سے اس واقعہ کو ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف با بن العربی نے اپنی تفسیر "احکام القرآن القسم الثالث دار احیار الکتب العربیہ الطبع الاول ۱۳۷۷ھ - ۱۹۵۰ء" میں سورۃ النور کی آیت "والذین یرمون المحصنات" کی تفسیر کے تحت درج کیا ہے۔ اور اپنے استنباط کی بنیاد السری اور سیف بن عمر کی روایت کو بنایا ہے۔ جس پر مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر کے بعض مفسرین جن میں ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں انہوں نے بھی اس روایت پر اعتماد کرتے ہوئے مسائل کا استنباط کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دورِ حاضر اسلام کے بنیادی اصولوں اور مستند مآخذ کی نئی تفسیر، تشریح اور تعبیر کا دور ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن درپیش مسائل کے حل میں اسلام کے مسلمہ مصادر اور مآخذ اصلیہ کو ملحوظِ خاطر رکھنا ازبس ضروری ہے ——— حضرت عمرؓ نے بہت سے مقدمات فیصل کئے جو مدینہ اور خلافت کے دوسرے صوبوں سے ان کے پاس آئے۔ چند اور مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

ایک سے زیادہ آدمیوں سے سرزد قتل

پانچ آدمیوں نے ایک غیر معروف شخص کو یمن کے ضلع صنعا میں قتل کر دیا۔ مقامی عدلیہ نے مقدمہ مدینہ کی عدالت میں بھیج دیا حضرت عمرؓ نے مقدمہ اور وہ حالات جن میں قتل ہوا تھا سنے۔ شہادت سے ظاہر ہوا کہ پانچوں کے پانچوں آدمی قتل کے ذمہ دار تھے اس لیے آپؓ نے پانچوں کو سزائے موت دے دی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر صنعا کے تمام باشندوں نے اس کے قتل میں حصہ لیا ہوتا تو وہ سب پر یہی سزا نافذ کرتے۔ [۲۸]

ایک مقدمہ قتل کا فیصلہ جس میں وارثوں نے قاتل کو معاف کر دیا

ایک قتل ہوگیا اور مقدمہ حضرت عمرؓ کو بھیج دیا گیا تاکہ فیصلہ کر دیں۔ سماعت کے بعد ملزم کو قتل کا مجرم قرار دے دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا جس میں قاتل کو سزائے موت دے دی گئی تھی۔ فیصلہ کے اعلان پر مقتول کے ورثاء میں سے ایک نے اعلان کیا کہ اس نے قاتل کو معاف کر دیا ہے اور دعویٰ میں اپنے حصّہ سے دستبردار ہو گیا ہے' حضرت عمرؓ بہرحال اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ ایک قانونی ماہر اور فقیہہ عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت عدالت میں موجود تھے۔ عدالت کی اجازت سے اُنھوں نے اپنی رائے یُوں ظاہر کی :

"تمام ورثاء قاتل کے خلاف اپنا حق رکھتے ہیں۔ اگر ایک اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور دوسرے نہ ہوں توسب کے اتفاقِ رائے کے بغیر فیصلہ نافذ نہیں ہو سکتا۔"

اُن کی رائے سُن کر حضرت عمرؓ نے اُن سے دریافت کیا " زیرِ غور مقدمہ کس طرح فیصل ہو ؟ " اُنھوں نے عرض کیا "قاتل ورثاء کو خون بہا ادا کرے۔ اور جس نے اپنا حق چھوڑ دیا ہے اس کا حصّہ مجرا کرے " حضرت عمرؓ نے اُن کی رائے قبول کر لی۔ اس کے مطابق حکم دے دیا اور پہلا فیصلہ واپس لے لیا۔[۹۱]

اسلام میں وکالت

مندرجہ بالا مقدمہ قتل کی کارروائی ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی عدلیہ کے سربراہ حضرت ابن الخطاب نے ایک ماہر قانون کو عدالت کے رُوبرو اپنی رائے دینے کی اجازت دی۔ ماہر قانون نے اپنی آزادرائے کے مطابق قانون کی تشریح کی اور اپنی رائے ظاہر کی۔ عدالت نے اس کی رائے قبول کر لی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مستند ماہر قانون (ایڈووکیٹ) عدالہائے انصاف میں پیش ہونے اور عدالت کے سامنے مقدمہ کے قانونی نکات کی وضاحت اپنے نظریہ کے مطابق کرنے میں عدالت کی مدد کرنے کے مجاز ہیں؟ خلافت راشدہ میں ایسے بہت مقدمات کا ذکر موجود ہے جن میں قاضی نے ماہرین قانون و فقہ سے ماہرانہ رائے طلب کی اور مقدمات کے مختلف پہلو ان ماہرین کی رائے سے اُجاگر ہوئے۔ اگر موجودہ وکالت کے پیشے میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں تو وکالت کا ادارہ مفید نتائج برآمد کر سکتا ہے۔

گواہوں اور قسم کی عدم موجودگی میں فیصلہ

سعد بن لیث کے قبیلہ کے ایک شہسوار نے دوڑ میں جہینہ قبیلہ کے ایک شخص کا پنجہ کچل دیا۔ چوٹ موت کا باعث ہوگئی اور وہ شخص فوت ہوگیا۔ حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ درج ہوگیا۔ آپؓ نے سعد کے کچھ آدمیوں کو طلب کیا لیکن سے قسم اُٹھانے کے لیے کہا گیا کہ وہ شخص اس زخم کے باعث فوت نہیں ہوا تھا۔ اُنھوں نے قسم اُٹھانے سے اِنکار

کر دیا۔ دونوں فریقوں کے انکار پر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا کہ ملزم ستم زدہ فریق کو نصف خون بہا ادا کرے۔[۳۰]

شکایات اور ان کی تفتیش

شکایات کی مناسب تفتیش انصاف کی پہلی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ اس کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفتیش کے محکمہ کی بنیاد رکھ دی تھی جس کو حضرت عمرؓ نے ترقی دی۔ آپؓ نے مدینہ میں ایک مستقل دفتر تفتیش قائم کر دیا تھا۔ آپؓ نے محمد بن مسلمہ الانصاری کو اس محکمہ کا سربراہ مقرر کیا۔ اس دفتر کے ذریعہ عوام کی ان شکایات کی تفتیش کی جاتی جو گورنروں اور اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف ہوتیں جو خلافت کے صوبائی دارالحکومتوں میں تعینات ہوتے۔ شکایت موصول ہونے پر محکمہ تفتیش کے سربراہ محمد بن مسلمہ کو خلیفہ حکم دیتا کہ متعلقہ صوبائی دارالحکومت جائیں اور پوچھ گچھ کریں۔ تفتیش کے طریقہ کار کے طور پر وہ دارالحکومت جامع مسجد میں بعد نماز اجتماع منعقد کرتے اور شکایت کے متعلق جلسہ عام میں پوچھ گچھ کرتے۔ ہر شہری کو اپنی رائے دینے کا اختیار تھا اور وہ معاملہ کے خلاف یا اس کے حق میں جرح کر سکتا تھا۔ وضاحت کے لیے چند واقعات درج ہیں:

۱۷ھ میں کوفہ کا نیا شہر آباد ہوا۔ سعد بن ابی وقاص اس کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک گورنر ہاؤس تعمیر کیا اور ایک دروازہ اس کے دفتر کے سامنے رکھا۔ اس دروازہ کا پس منظر یہ تھا کہ گورنر ہاؤس شہر کے مرکز میں واقع تھا جو گنجان آباد تھا۔ بازار اور تجارتی مراکز گورنر ہاؤس کے آس پاس واقع تھے۔ گورنر ہاؤس کے باہر شور و غل کے باعث سعد اپنے سرکاری کام امن و سکون سے نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے دفتر کے سامنے دروازہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ کے پاس ایک شکایت دائر کی گئی کہ سعدؓ نے ایک محل بنا لیا ہے جس کا نام اُن کے نام پر قصر سعد رکھا گیا ہے۔ اور جس کے سامنے ایک دروازہ بنوایا ہے۔ اس سے شکایت کنندگان کو براہِ راست اس کے سامنے حاضر ہونے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

شکایت موصول ہونے پر خلیفہ نے فوراً محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ کوفہ جا کر معاملہ کی تحقیقات کریں۔ انھیں مزید ہدایت دی گئی کہ اگر شکایت کے مندرجات درست پائے جائیں تو دروازہ جلا ڈالا جائے۔ انھیں سعد کے نام ایک خط بھی دیا گیا جس میں لکھا تھا:

> "مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک محل بنوا لیا ہے۔ تم اسے ایک قلعہ کے طور پر استعمال کرتے ہو، یہ قصر سعد کہلاتا ہے۔ تم نے ایک دروازہ بنایا ہے تاکہ لوگوں کو خود سے دُور رکھ سکو۔ اس سے نیچے اُترو اور اُسے بند کر دو۔ لوگوں کا اپنے پاس آنا روکنے کے لیے اپنے محل میں دروازہ نہ بناؤ، اور اس طرح ان کے حقوق پامال نہ کرو۔ (تنفیھم بہ عن حقوقھم) یہ اہم ہے تاکہ وہ تمھاری مجلس میں اور تمھارے گھر سے چلتے وقت تمھارے برابر ہوں۔"[۳۱]

مندرجہ بالا احکام کے ساتھ محمد بن مسلمہ کوفہ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے معاملہ کی تحقیقات کی اور دیکھا کہ سعدؓ کے محل کے سامنے ایک دروازہ کھڑا ہے۔ انھوں نے جلانے کی لکڑی خریدی، محل گئے اور اس کا دروازہ جلا ڈالا۔ اس کی اطلاع سعد کو ملی۔ اس نے تحقیقاتی افسر کے پاس ایک ایلچی بھیجا۔ اور اُن سے اپنے دفتر میں آنے کی درخواست کی۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر سعدؓ نے ان کو اخراجات سفر پیش کیے۔ اُنھوں نے رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سعدؓ کو حضرت عمرؓ کا تذکرہ[۱۱۱] خط دے دیا[۱۱۲]۔ خلیفہ کی ہدایت کے مطابق کارروائی مکمل کر کے محمد بن مسلمہ فوراً دارالخلافہ لوٹ گئے۔ جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو ان کے پاس رقم ختم ہو گئی تھی۔ انھیں درختوں کی چھال پر گزارہ کرنا پڑا۔ اس حالت میں وہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اُنھوں نے اپنی کارروائی کی مکمل رپورٹ پیش کر دی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم نے سعدؓ سے سفر خرچ کیوں نہ قبول کیا؟" اُنھوں نے جواب دیا "اگر آپؓ یہ چاہتے تھے تو آپؓ مجھے تحریری اجازت دیتے یا آپؓ نے مجھے زبانی اجازت دی ہوتی۔" اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "سب سے اعلیٰ نظریہ کے حامل وہ لوگ ہیں جو متعلقہ حاکم کے ایک حکم کی عدم موجودگی میں انتہائی احتیاط سے عمل کرتے ہیں[۱۱۳]۔"

عہدِ حاضر کی انتظامیہ کے لیے دروازے پر دربان کی عدم موجودگی ناقابلِ فہم معلوم ہوگی۔ کیونکہ اس کا پورا فلسفہ اور عمل دربار اور دربان پر استوار ہے۔ یہ نوکر شاہی ہے جو دفتریت کے فلسفے پر قائم ہے۔ حکومتی اور عوامی مسائل اُلجھانے اور نپٹانے میں اتنا وقت صرف کر دیا جاتا ہے کہ لوگ پریشان ہو کر نیچے سے اُوپر تک دفتروں کے چکر کاٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر عوام کے ہجوم کو روکنے کے لیے دربانوں کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ ذمہ دار نظامِ حکومت تھی۔ ہر سطح کے افسران اپنی سطح پر فیصلہ کرنے اور نافذ کرنے کے مجاز اور مختار تھے۔ بہت کم مسائل گورنر یا خلیفہ تک پہنچتے تھے۔ اکثر نچلی سطح پر اطمینان بخش طریقے سے حل ہو جاتے تھے، جو چند ایک شکایتیں گورنر یا خلیفہ تک پہنچتی تھیں۔ اگر اُن کی راہ میں بھی دربان کھڑے کر دیئے جاتے تو اسلامی فلسفہ انتظامیہ مجروح ہوتا، چونکہ اسلامی دفاتر میں عوامی ہجوم کا تصور ہی ناقابلِ فہم ہے اس لیے دربار اور دربان کی ضرورت بے معنی چیز تھی۔

مندرجہ بالا سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ہمیشہ شکایت کنندگان اور ستم رسیدہ کے آرام و سہولت کو اولیت دیتے تھے۔ اور ہر وہ متصورہ رکاوٹ جو اُن کے خیال میں تکلیف پیدا کرتی دُور کر دیتے۔ شکایت قبول کرنے میں تاخیر اور فیصلوں میں دیر تصوّرِ انصاف کے منافی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک تاخیر کا مطلب "حقوق سے انکار" تنفیھم بہ عن حقوقھم" جلد اور صحیح فیصلہ کسی بھی عدالتی نظام کی اہلیت، قابلیت اور ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے بنیادی اور اہم ذرائع ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عدالتی نظام کا کسی جدید نظام سے تقابل ظاہر کرے گا کہ حضرت عمرؓ کا نظام مقدمہ کی ضروریات پوری کرنے، شکایتیں وصول کرنے اور اُنھیں ٹھیک فیصل کرنے کے معاملہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ایک بہترین مثال محمد بن مسلمہ کے کردار میں مسلمان افسروں کے لیے ملتی ہے جو سرکاری خرچ پہ دورے کرتے ہیں۔

تمام قومی اُمور پر انصاف کی برتری

حضرت عمرؓ کے عدالتی نظام کا اولین اصول تھا کہ لوگ اصولوں کی پابندی کریں اور کوئی بھی شخص قانون کی دسترس سے باہر نہ ہو۔ ذاتی مفاد ریاست کے مفاد کے ماتحت ہوں گے۔ کوئی شخص نقطہ نظر سیاسی اور سماجی طور پر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو انصاف سے بالا نہیں۔ اسلامی سیاق و سباق میں مسلمان قوموں اور افراد کو اسلام پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ صرف انھی لوگوں کو سرکاری عہدے خصوصاً عدلیہ کے عہدے دیئے جا سکتے ہیں جو بے داغ کردار کے حامل ہوں۔ اگر کسی سرکاری عہدے دار پر کوئی الزام عاید ہو تو الزام کی پوری پوری تحقیقات ہونا چاہیے کسی ہنگامی حالت کو جواز بنا کر انصاف کے تقاضوں کو پس پشت ڈالا نہیں جا سکتا۔ یہ ضروری ہے۔ کیونکہ صرف بے داغ کردار اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل افراد ہی مشکل میں پھنسی ہوئی قوم کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ مذکورہ اصول کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم المرتبت صحابی اور انتہائی باعزت گورنر اور حضرت عمرؓ کے دور کے فاتح کے خلاف ایک مقدمہ ذیل میں دیا جاتا ہے جس کی باضابطہ تحقیقات محمد بن مسلمہ نے کی تھی۔

کوفہ سے کچھ لوگ مدینہ آئے اور انھوں نے خلیفہ حضرت عمرؓ کے پاس حضرت سعدؓ بن ابی وقاص گورنر کوفہ کی شکایت پیش کی۔ انھوں نے سخت احتجاج کیا اور اس کے خلاف شدید الزامات لگائے۔ کوفہ میں اس وقت ہنگامی حالات تھے پارسیوں نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج فارس کے تمام علاقوں اور صوبہ سندھ، خراسان اور حلوان سے نہاوند میں خلافت کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے جمع کر لی تھی۔ سعد بن ابی وقاص کوفہ کے گورنر اور عراق و ایران میں مسلم افواج کے سپہ سالار تھے۔ وہ افرادی اور اسلحی قوت مجتمع کرنے میں بیحد مصروف تھے اور نہاوند کے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس نازک مرحلہ پر حضرت عمرؓ نے مسلم افواج کے سپہ سالار کے خلاف شکایت قبول کی۔ خلیفہ نے الجراح بن سنان شکایت کنندگان میں سے ایک کو مخاطب کیا اور کہا بظاہر شہادت اور ہنگامی حالات تمہاری شکایت کے حق میں نہیں۔ تاہم خدا کی قسم یہ ہنگامی حالت مجھے تمہارے اس معاملہ کی تحقیقات سے باز نہ رکھ سکے گی (وایم اللہ لا یمنعنی ذالک من انظر فیما لدیکم) اس کے بعد حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ کوفہ جا کر معاملہ کی تحقیقات اور چھان بین کریں۔[۴۴]

محمد نے سعدؓ سے کہا جب تک افواج نہاوند کو روانہ ہوں وہ ان کے ساتھ اہل کوفہ کے درمیان ایک چکر لگائیں۔ وہ انھیں کوفہ کی تمام مسجدوں میں لے گئے۔ انھوں نے معاملہ کی پوچھ گچھ خفیہ طور پر نہیں کی کیونکہ معاملہ خفیہ نوعیت کا نہیں تھا۔ ہر مسجد میں وہ مجمع عام میں کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے سعد کے متعلق پوچھا۔ ہر جگہ لوگوں نے کہا "ہم سوائے بھلائی کے کچھ نہیں جانتے۔ ہم ان کی عہدہ سے برطرفی نہیں چاہتے۔ ہمارے پاس اس معاملہ میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" الجراح بن سنان اور اس کے ساتھی خاموش رہے۔ نہ انھوں نے سعدؓ کے خلاف کچھ کہا اور نہ اس کی تصدیق کی جو کچھ لوگ کہہ رہے تھے انھوں نے دانستہ (سعد کی) اس تعریف پر پردہ ڈالا جو اس وقت لوگ کر رہے تھے۔ آخر تحقیقاتی ٹیم بنو عبس میں پہنچی۔ محمدؓ نے کہا "خدا کی قسم کھا کر کہو کہ تم اس شخص کے متعلق سچ کے سوا کچھ نہ کہو گے۔" اسامہ بن قتادہ نے کہا

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سعد برابر برابر تقسیم نہیں کرتے (بالسویہ) اور یہ لوگوں پر انصاف سے حکمرانی نہیں کرتے (ولا یعدل فی الرعیہ) اور جنگ کے لیے باہر نہیں جاتے (ولا یغزو فی السریہ) بنو اسد نے بھی الزام لگایا کہ سعد نماز احسن طریقے سے نہیں پڑھتے۔ (لا یحسن یصلی)۔

شکایت کنندگان اور اُن کے حامیوں کے بیانات سننے کے بعد محمد بن مسلمہ نے اپنی تفتیش مکمل کر لی اور سعد اور شکایت کنندگان کے ہمراہ مدینہ روانہ ہو گئے تاکہ انھیں مدینہ میں عدالت کے رُوبرو پیش کر سکیں۔ افسر تحقیقات نے اپنی تفتیشی رپورٹ خلیفہ کو پیش کر دی۔ محمدؓ سے شکایت کی تفصیلات سُن کر حضرت عمرؓ نے سعد سے بعض سوالات کیے تاکہ معاملہ مزید واضح ہو سکے۔ آپؓ نے دریافت کیا "اے سعد تمھاری شامت آئے! تم نماز کس طرح ادا کرتے ہو۔" انھوں نے جواب دیا "میں پہلی دو رکعت میں لمبی سورتیں پڑھتا ہوں اور بعد کی دو رکعت میں چھوٹی سورتیں" حضرت عمرؓ نے کہا "تم سے اسی کی توقع تھی" پھر آپ نے فرمایا "اگر احتیاط کا تقاضا نہ ہوتا تو ان کا راستہ بالکل صاف تھا (لولا الاحتیاط لکان سبیلھم بیناً)۔

فیصلہ

تفتیشی رپورٹ ملاحظہ کرنے اور شکایت کنندگان اور ان کے حامیوں کے بیانات سننے اور ملزم پر جرح کرنے کے بعد خلیفہ نے سعد کو کوفہ کی گورنری سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ آپؓ نے دریافت کیا "کوفہ میں تمھارا نائب کون ہے اے سعد" انھوں نے جواب دیا "عبداللہ بن عتبان" حضرت عمرؓ نے اس کی توثیق کر دی اور اُسے گورنر مقرر کر دیا۔[۳۵]

مصر کے گورنر عیاض بن غنم کے خلاف ایک شکایت موصول ہوئی۔ اُن پر نفیس کپڑے پہننے اور دروازہ پر پہرہ دار بٹھانے کا الزام تھا۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ سے کہا کہ مصر روانہ ہو جائیں اور عیاض کو مصر میں جس حالت میں پائیں اسی میں لے آئیں۔ مصر پہنچنے پر محمد نے اسے نفیس کپڑوں میں ملبوس پایا۔ انھوں نے اُسے اسی حالت میں پکڑا اور مدینہ لے آئے اور اُسے خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ نے اس کے نفیس کپڑے اُتروا دیئے اور کمبل سے بنی ہوئی پوشاک پہننے پر مجبور کر دیا۔ آپؓ نے بکریوں کا ایک ریوڑ بھی طلب کیا اور حکم دیا "یہ چرواہے کا ڈنڈا پکڑو اور ان بکریوں کو چراؤ" عیاض انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ تاہم وہ کہتا رہا "موت اس سے بہتر ہے" (والموت خیر من ھذا) اس پر حضرت عمرؓ نے کہا "تم اس سے نفرت کیوں کرتے ہو۔ تمھارا باپ غنم کہلاتا تھا کیونکہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔"[۳۶]

حج کے دوران مکہ میں سالانہ عدالت عالیہ

حضرت عمرؓ کے عہد کی عدلیہ کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔ اولاً فوجداری شکایات کی وصولی اور تصفیہ اور دیوانی مقدمات کے فیصلہ میں تاخیر برداشت نہ کی جاتی تھی۔ دوم آپ کی خلافت میں قانون کے سامنے ہر فرد برابر سمجھا جاتا تھا۔ اور کسی کے

سرکاری مرتبہ، سماجی حیثیت یا مذہبی عقائد سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ مدینہ میں ان کی عدالت کے دروازے دن رات کھلے رہتے تھے اور شکایت کا ازالہ نہایت اہلیت سے کیا جاتا اور ملزم کو اپنی صفائی کا پورا پورا موقع دیا جاتا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوتے تو انہیں سزا دی جاتی۔ شکایت کنندگان کی مزید سہولت اور آسانی کے لیے اور یہ اہتمام کرنے کے لیے کہ تمام خلافت میں حق و انصاف قائم ہے۔ آپؓ دورانِ حج مکہ میں ایک باقاعدہ سالانہ عدالت عامہ قائم کرتے۔ الطبری نے اپنے وقائع میں حضرت عمرؓ کے پہلے سال حکومت کے اختتام پر لکھا ہے کہ ہر سال خلیفہ خود حج میں شریک ہوتے۔ سوائے پہلے سال کے جب کہ آپؓ نے اپنی جگہ عبدالرحمٰن بن عوف کو مقرر کیا[۳۷]۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ حج کے موقع پر عدالت لگاتے اور مختلف فریقین کے بیچ کچھ جھگڑے طے کرتے اور ان کی شکایات کا ازالہ کرتے جو عام حالات میں کسی نہ کسی وجہ سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا نہیں سکتے تھے[۳۸]۔ حضرت عمرؓ نے اس طریق میں خاطر خواہ اصلاح کی۔ آپؓ نے اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ ہر سال حج پر حاضر ہوں۔ آپؓ اپنی عدالت کعبہ کے قریب لگاتے۔ اور لوگوں کو کسی بھی گورنر یا جابر کے خلاف شکایت پیش کرنے کی دعوت دیتے[۳۹]۔ ان موقعوں پر چھوٹی چھوٹی شکایات بھی پیش کی جاتیں اور موقع پر ہی ان کا ازالہ کر دیا جاتا۔ ایک مرتبہ آپؓ نے حج کے دوران جلسۂ عام بلایا اور لوگوں کو مخاطب کیا:

"اے لوگو! میں نے تم پر اپنے گورنر اس لیے مقرر نہیں کیے کہ وہ تمہارے تماچے لگائیں، تمہاری عزت پر دھبّے لگائیں اور تمہارے اموال خورد برد کریں۔ میں نے انھیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور سنّتِ رسولؐ کی تعلیم دیں۔ پس اگر ان میں سے کوئی اس سے تجاوز کرے تو مظلوم اس کی زیادتی کی شکایت مجھ سے کرے تاکہ میں اس کی شکایت کا ازالہ کرسکوں۔"

اس موقع پر عمروؓ بن العاص برہم ہو گئے اور بولے:

"اے امیرالمومنینؓ! آپؓ کیا خیال کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں سے کوئی گورنر مقرر کر دیا گیا ہو اور وہ ان میں سے کسی کو سزا دے تو کیا آپؓ اس کی شکایت کی بھی تلافی کریں گے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

"ہاں یقیناً میں اس کی تلافی کروں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے خلاف بدلہ دیتے دیکھا ہے۔"

اس پر ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا "آپؓ کے گورنر نے مجھے سو دُرّے مارے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا: کیا تم گورنر کو سو دُرّے لگاؤ گے؟ آؤ دُرّے لگاؤ۔" عمرو بن العاص کھڑے ہو گئے اور بولے "اے امیرالمومنین! اگر آپؓ اپنے اپنے گورنروں کے خلاف یہ دروازہ کھول دیں گے تو ان کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ یہ ایک نظیر بن جائے گی جس پر آپؓ کے بعد عمل ہوگا۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "میں کیوں بدلہ نہ دلاؤں جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے خلاف بدلہ دیتے دیکھا ہے۔ عمرو بن العاص نے بمشکل اس شخص کو آمادہ کیا کہ وہ ہر دُرّے کے بدلے دو درہم لے لے[۴۰]۔

قانون کے سامنے شاہ وگدا کی برابری

مکہ میں ایک سالانہ عدالت عالیہ کے دوران ایک بادشاہ اور ایک عام آدمی کا مقدمہ فیصلہ کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا۔ جبلہ بن ایہم جو شام کی سرحد پر غسانی نسل کا بادشاہ تھا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور حج ادا کرنے مکہ آیا۔ طواف کعبہ کے دوران اس کی چادر کا ایک کونہ ایک بدو کے پاؤں تلے آ گیا۔ جبلہ نے اسے ایک تھپڑ مارا۔ جواباً بدو نے بھی اسے ایک تھپڑ مارا۔ غصہ اور توہین سے جبلہ برہم ہو گیا۔ وہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور بدو کی شکایت کی۔ واقعہ کی تفصیل سن کر حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا "تم نے اپنے عمل کا بدلہ پا لیا"۔ فیصلہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور بولا: "ہم لوگ اتنے مرتبہ والے ہیں کہ اگر کوئی ہم سے بدتمیزی کرے تو وہ ختم کر دیا جاتا ہے"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ صورت حال دورِ جاہلیت میں تھی۔ اسلام نے بلند رتبہ اور کم رتبہ والوں کو برابر کر دیا ہے"۔ آخری فیصلہ سن کر جبلہ نے کہا "اگر اسلام ایسا مذہب ہے جو اعلیٰ اور ادنیٰ میں فرق تسلیم نہیں کرتا تو میرے لیے اس سے وفاداری مشکل ہے"۔ اس کے بعد وہ چپکے سے قسطنطنیہ چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے قانون اور انصاف کی بالادستی قائم رکھی اور ایک اہم شخص کی خاطر قانون نہیں بدلا۔[41]

حضرت عمرؓ کے نظام عدل میں غیر مسلموں کا مقام

ایرانی سلطنت اور رومی سلطنت کے تمام ایشیائی و افریقی علاقے حضرت عمرؓ کی خلافت میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ دنیا کی بڑی جدید اور ترقی یافتہ سلطنتیں تھیں۔ یہ وسیع علاقہ: عراق، شام، فلسطین، مصر — بہت سے قدیم مذاہب اور نظامہائے قانون کا نقطۂ آغاز اور مولد تھا۔ قدیم مجموعہائے قوانین کا آغاز یہیں ہوا اور یہیں انھوں نے ترقی کی اور ان پر عمل ہوا۔ ان علاقوں کے بڑے بڑے قانونی سلسلے جن میں قوانین حمورابی، آشوری قوانین، حتی قوانین، حتی ہدایات، جدید بابلی قوانین، معاہدہ مصر، دستاویزات مصر، میسوپوٹامیہ کی قانونی دستاویزات، سمیری قوانین، اکادی، آرامی، فونیسی، عبرانی، عربی اور حبشی شامل تھے۔ ان مجموعوں کے متون تلاش اور کھدائی کے ذریعہ جو مصر، میسوپوٹامیہ، ایشیائے کوچک اور شام میں ہوئی دستیاب ہو گئے ہیں۔ خط میخی کے مطالعہ نے ان متون کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ جیمز بی پریچارڈ نے ایک عظیم کتاب Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament, کے نام سے مرتب کی ہے۔ مندرجہ بالا مجموعے اور قوانین اس کتاب کے دوسرے حصہ جس کا نام "Legal Texts" ہے[42] میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعے اور قوانین ان انتظامی، قانونی اور عدالتی اداروں کا قدیم پس منظر فراہم کرتے ہیں جو ان علاقوں میں رومیوں اور ایرانیوں نے قائم کیے تھے۔ یہ ابتدائے اسلام میں موجود تھے۔ رومی سلطنت کی بیشتر آبادی عیسائی ہو چکی تھی اور سلطنت فارس کے باشندوں کو مجوسی مذہب قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہودیوں کی ایک بڑی اقلیت بھی ان ممالک میں رہتی تھی اور باقی آبادی کافر و ملحد تھی۔

باوجود قیمتی قانونی ورثہ اور حاکموں کا مذہب قبول کر لینے کے ان سلطنتوں کے عوام سے یکساں برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا وہ محض ٹیکس ادا کرنے والے تھے۔ اور اگر ٹیکس کی وصولی سے حاکم مطمئن نہ ہوتا تو انھیں سخت سزا دی جاتی۔ قانونی اور عدالتی ادارے زیادہ تر ٹیکس نا دہندگان کو سزا دینے کے لیے تعزیری ادارے بن کر رہ گئے تھے اور رعایا کے حقوق پر کم ہی توجہ دیتے تھے۔ حاکموں کے ظلم اور عوام کے لیے بنیادی حقوق کی نفی نے خاص طور پر ان علاقوں میں اسلام پھیلانے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے اس کو قبول کرنے میں مدد دی۔ اسلام نے بنیادی انسانی حقوق کا ایک واضح اور مفصل ضابطہ بلالحاظ مذہب، نسل اور علاقہ کے عطا کیا۔ خلافت نے اس ضابطہ کے محافظ کی حیثیت سے اس پر سختی سے عمل کیا اور مسلم افواج اور فوجی مشینری عمل میں آ جاتی اگر رومی یا ایرانی شہنشاہ اپنی رعایا میں اسلام کے پھیلاؤ اور اس اسلامی ضابطۂ حقوق انسانی کے قبول سے اپنی ظالمانہ حکومت کی تباہی کا خطرہ محسوس کر کے اس اسلامی نظریہ کی ابھرتی لہروں کو روکنے کی کوشش کرتے۔ جو لوگ اسلام قبول کر لیتے فوراً امہ میں شامل کر لیے جاتے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بلا امتیاز برابر کے حقوق حاصل کر لیتے جو فوراً اسلام کے دائرہ میں داخل نہ ہو پاتے۔ وہ بھی اسلامی ضابطہ حقوق انسانی سے مستفید ہوتے۔ ان کی جان مال، عزت یا مذہب کے خلاف زیادتی کی صورت میں وہ ایک مؤثر اور اہل و غیر جانبدار نظام عدالت سے رجوع کر سکتے تھے۔

قرآنی ضابطہ حقوق انسانی کے علاوہ غیر مسلموں کو اُن کے حقوق اور مذہب کی حفاظت کی تحریری ضمانت بھی دی جاتی۔ ایسے معاہدے بہت مقدس خیال کیے جاتے۔ اُن کو برقرار رکھا جاتا اور ان کی حفاظت بالکل اسی طرح کی جاتی جیسے خلافت کے دستور کی۔ اس طرح خلافت میں غیر مسلموں کو تمام دستوری حقوق حاصل تھے جب کہ اس سے قبل وہ رعایا تصور ہوتے اور حاکم کے رحم و کرم پر تھے۔ مندرجہ بالا کو ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کا غیر مسلموں کے حقوق کا ایک ضابطہ جو ایلیا (یروشلم) کے لوگوں کے لیے ان کے ہتھیار ڈالتے وقت ۱۵ھ میں منظور کیا گیا تھا مثلاً درج ذیل ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

یہ ایک دستاویز امن ہے جو اللہ کے خادم عمرؓ امیر المومنین نے ایلیاء کے لوگوں کے لیے منظور کی۔ وہ انھیں جان، مال، گرجا، صلیب، بیمار و صحت مند اور ہر مذہبی فرقہ کو امان دیتے ہیں۔ ان کے گرجا قبضہ میں نہ لیے جائیں گے۔ نہ انھیں منہدم کیا جائے گا۔ وہ کم نہیں کیے جائیں گے نہ ان کی وسعت کم کی جائے گی۔ نہ ان کی صلیبیں نہ کوئی اور چیز ان کی جائیدادیں سے کم کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر زبردستی نہیں کی جائے گی۔ ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ کوئی یہودی اہل ایلیاء کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اہل ایلیاء اسی طرح جزیہ ادا کریں گے جس طرح دوسرے شہروں کے لوگ کرتے ہیں۔ وہ ایلیاء سے رومیوں اور بت پرستوں کو نکال دیں گے۔ ان میں سے جو چلے جائیں گے اُن کے جان و مال اُس وقت تک محفوظ

ہوں گے جب تک وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچیں اور اُن میں سے جو ٹھہریں گے وہ امن میں ہوں گے۔ وہ اہلِ ایلیا کی طرح جزیہ دیں گے۔ اہلِ ایلیا میں سے وہ لوگ جو اپنے جان و مال کے ساتھ رومیوں کے ساتھ جائیں گے اور اپنے گرجے اور صلیبیں خالی کر دیں گے۔ وہ اپنے جان و مال، گرجوں اور صلیبوں کے ساتھ اس وقت تک محفوظ رہیں گے۔ جب تک وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچیں۔ غیر ملکیوں میں سے جو ایلیا میں کوئی قتل کیے بغیر رہ رہے ہیں۔ اگر رہنا چاہیں تو اہلِ ایلیا کی طرح جزیہ ادا کریں گے۔ جو ایسا کرنا چاہیں وہ رومیوں کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ جو اپنی قوم میں واپس جانا چاہیں۔ ان سے اس وقت تک کچھ نہیں لیا جائے گا جب تک اُن کی فصلیں کاٹی جائیں۔

اس معاہدہ کے مندرجات پر اللہ، اس کے رسولؐ، ان کے جانشینوں اور تمام مومنین کی ضمانت ہے۔ اس وقت تک جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اس پر خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبدالرحمٰن بن عوف، معاویہ بن ابی سفیان گواہ تھے، حضرت عمرؓ نے اسے مکمل کیا اور ۱۵ھ میں اس پر دستخط کیے۔

مندرجہ بالا دستاویز میں غیر مسلموں کے بنیادی حقوق و مراعات درج ہیں۔ انھیں اپنے مذہب، سماج اور قومی معاملات میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی گئی تھی اور انھیں جان و مال اور مذہب کی امان دی گئی تھی۔ ان کے گرجوں اور صلیبوں کو دستوری و قانونی حفاظت فراہم کی گئی تھی۔ ان کی پرستش کی جگہوں کی تقدیس قائم رکھنے کی واضح ذمہ داری تھی اور ان کے گرجوں کی حدود میں قبضہ مخالفانہ کے خلاف بھی ضمانت تھی۔ اللہ کے وعدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضمانت کے ساتھ ان کو مکمل آزادی حاصل تھی اور مذہب کے معاملہ میں ان پر کوئی زبردستی نہیں کی جاتی تھی۔ غالباً یہ عیسائیوں کی واضح یا مبینہ خواہش تھی کہ معاہدہ میں ایک شق یہود کے انخلاء کی رکھی گئی کیونکہ عیسائی صدیوں سے حضرت عیسیٰؑ کو یروشلم میں مصلوب کرنے کی بناء پر ناراض تھے۔ ان کی شکایت دُور نہیں ہوئی تھی۔ یہ دنیا میں ایک منفرد دستاویز حقوق و مراعات ہے جو کسی فاتح نے مفتوح کو دی۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے یہ دستاویز مثالاً پیش کی گئی ہے ورنہ ایسی ضمانت مختلف علاقوں اور شہروں کے اُن غیر مسلموں کو دی گئی جنھوں نے افواجِ اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ تمام ایسی ضمانتیں، معاہدے اور دستاویزات روشن ضمیری کے ساتھ ٹھیک ٹھیک پوری کی گئیں۔ کسی موقع پر اگر مسلمان اہلِ اقتدار اپنے اختیار سے باہر حالات کے باعث اس حیثیت میں نہ تھے کہ غیر مسلموں کی جان، مال، آبرو اور مذہب کی حفاظت کر سکیں تو انھوں نے ان کی حفاظت کی جو رقم (جزیہ) وصول کی تھی وہ لوٹا دی۔ ایک مثال نمونتہً پیش کی جاتی ہے:

حمص (حُمص، قدیم ایمیسا، مرکزی شام کا ایک شہر) کی ابوعبیدہ کے ہاتھوں فتح کے بعد رومی شہنشاہ نے اپنی تمام فوج انطاکیہ (انتورخ) میں مسلمانوں سے آخری جنگ کے لیے جمع کر لی۔ حمص مسلم افواج کے لیے ایک اچھی جگہ نہ تھی، جہاں وہ رومیوں کی متحدہ فوجی قوت کا مقابلہ کر سکتے۔ ان حالات میں ابوعبیدہ، کمانڈر افواجِ اسلام نے فوجی شوریٰ کا جلسہ طلب کیا تاکہ صورتِ حال پر غور کر سکیں۔ مجلس میں یہ طے پایا کہ حمص سے پیچھے ہٹ جائے اور دمشق میں خالد بن ولید سے مل جایا جائے۔ ان حالات میں پسپا ہوتی افواج سنگین زیادتیاں کرتی ہیں اور مفتوح لوگوں سے زیادہ سے زیادہ

مال و زر وصول کرنے کی کوشش کرتی ہیں، خاص طور پر جب وہ دشمن کے مذہب کے پیرو ہوں۔ دوسری طرف ابوعبیدہ کمانڈر اسلامی افواج حمص کی عیسائی آبادی کے حقوق و مراعات کے بارے میں متفکر تھے۔ اُنھوں نے اُنھیں ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ درپیش مرحلہ میں وہ اپنے وعدہ پر قائم رہنے کے قابل نہ تھے۔ اس نازک مرحلہ پر گورنر شام اور افواج اسلامی کے سپہ سالار کا مندرجہ ذیل فیصلہ تاریخ میں ثبت ہے۔

ابوعبیدہ نے اپنے خزانچی حبیب بن مسلمہ کو بلایا اور یوں حکم دیا: جزیہ یا خراج ایک ٹیکس ہے۔ جو عیسائیوں سے دشمنوں کے خلاف ان کی حفاظت کے لیے لیا جاتا ہے۔ موجودہ نازک حالات میں ہمارے لیے ان کی حفاظت ممکن نہیں۔ پس جو کچھ ان سے اکٹھا کیا ہے لوٹا دو اور اُن سے کہہ دو کہ ہم ان کا اب بھی بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ کیونکہ موجودہ حالات میں ہم تمھیں موعودہ حفاظت فراہم نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جزیہ جو تمھاری حفاظت کا معاوضہ ہے تمھیں واپس کیا جاتا ہے۔ (رد انکم قد اشترطتم علینا ان نمنع کم انا لا نقدر علی ذالک وقد رددنا علیکم ما اخذ نا منکم) خزانچی نے ابوعبیدہ کے اس حکم کی تعمیل کی لاکھوں کی رقم عیسائیوں اور یہودیوں کو لوٹا دی۔ وہ مسلمانوں کے اس جذبۂ انصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ رو دیئے اور جذبات سے پکار اُٹھے "خدا تمھیں واپس لائے" یہودی زیادہ متاثر ہوئے اور بولے "ہم تورات کی قسم کھاتے ہیں جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکے گا"۔ اس کے بعد اُنھوں نے اپنے قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور اہم جگہوں پر پہرے دار مقرر کر دیئے۔[۴۵] ابوعبیدہ کا مندرجہ بالا فیصلہ دوسرے شہروں میں بھی نافذ ہوا جہاں سے مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔ دوسرے علاقوں کے سالاروں کو ایک حکم نامہ جاری کر دیا گیا تھا جس میں انھوں نے عیسائیوں اور یہودیوں سے جمع کیا ہوا جزیہ اپنے علاقہ سے پسپائی سے قبل اُنھیں واپس کر دینے کے لیے کہا گیا تھا۔[۴۶]

عیسائیوں کے ساتھ سب سے زیادہ انصاف کا سلوک کیا گیا خواہ ان میں سے بعض باغی ہو گئے تھے۔ اور معاہدہ کی خلاف ورزی کر چکے تھے۔

شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان ایک سرحدی شہر عربسوس مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ اس کی عیسائی آبادی سرحد کی دوسری جانب اپنے ہم مذہبوں کے لیے مخبری میں ملوث ہوئی۔ یہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔ عمیر بن سعد اس علاقہ کے گورنر نے اس بے وفائی کی اطلاع مدینہ میں خلیفہ کو دی۔ یہ ایک اہم معاملہ تھا اور سزائے موت کا مستوجب تھا۔ تاہم حضرت عمرؓ نے ان سے نرمی کا سلوک کیا۔ محض اس لیے کہ وہ ذمی تھے۔ آپؓ نے امیر کو مندرجہ ذیل حکم بھیجا:

اُن کی جائیداد اور املاک زمین، مویشی اور اموال کی ایک فہرست تیار کرو۔ ہر چیز کی دوگنی قیمت اُنھیں دے دو اور اُنھیں کسی دوسری جگہ ہجرت کر جانے کا حکم دے دو۔ اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو انھیں سال کی مہلت دے دو اور پھر جلاوطن کر دو۔ کیونکہ اُنھوں نے تنبیہ پر عمل نہ کیا اس لیے جلاوطنی کے احکامات نافذ کر دیئے گئے۔[۴۷]

ایسے مقدمات بیان کیے گئے ہیں جن میں ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر سمجھا گیا۔ الشافعیؒ

نے حضرت عمرؓ کا مندرجہ ذیل فیصلہ قلم بند کیا ہے:

قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ علاقہ کے جج نے حضرت عمرؓ سے مشورہ طلب کیا جو اسلامی عدلیہ کے سربراہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے مندرجہ ذیل عدالتی حکم بھیجا:

قاتل کو مقتول کے ورثا کے حوالہ کر دو۔ اس حکم کی تعمیل میں قاتل کو حنین کے سپرد کر دیا گیا جو مقتول کا وارث تھا، اس نے اسے قتل کر دیا۔[۴۸]

شام سے ایک ذمی مدینہ آیا اور خلیفہ سے شکایت کی کہ اپنی پیش قدمی کے دوران مسلم افواج نے اس کی فصل تباہ کر دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا اور اپنے افسر خزانہ کو کہا کہ اسے معاوضہ میں ایک ہزار درہم ادا کر دے۔[۴۹]

عمرو بن العاص کی انتظامی اور عدالتی عملداری میں ایک ذمی عیسائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے ایک صحابی عرفہ کی موجودگی میں گالی دی۔ عرفہ یہ برداشت نہ کر سکے اور اسے ایک تھپڑ مارا۔ عیسائی نے عمروؓ بن العاص کے سامنے شکایت کی۔ عرفہ کو عدالت انصاف میں طلب کیا گیا۔ اور معاملہ کی تحقیقات کی گئیں۔ عرفہ نے سارا واقعہ بیان کیا۔ عمروؓ نے انھیں معاہدہ کی متعلقہ شق یاد دلائی جس میں ذمیوں کو پناہ دی گئی تھی۔ عرفہ نے عرض کیا "خدا معاف کرے! انھیں سرعام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ معاہدہ میں انھیں آزادی گفتار اور اپنے گرجاؤں میں عبادت کی آزادی دی گئی ہے۔ انھیں دشمنوں کے خلاف پناہ بھی دی گئی ہے اور یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کی طرف سے دشمنوں سے لڑیں گے۔ ان سے یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ ان پر کوئی ناقابل برداشت بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔" عمرو بن العاصؓ نے عیسائی کی شکایت ہمدردی سے سنی اور عرفہ کے دلائل پر بھی توجہ دی۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ عرفہ نے معاہدہ کی کسی شق کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ یہ شکایت کنندہ خود ہی تھا جس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اسلام کو گالیاں دی تھیں۔[۵۰]

مندرجہ بالا سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل تھی اور اگر انھیں کوئی شکایت ہوتی تو وہ عدالت سے رجوع کر سکتے تھے اور عدالتیں ان کی شکایت کا ازالہ انتہائی اہلیت اور انصاف سے کرتیں۔ ہم اس بحث کو اس قاعدہ پر ختم کرتے ہیں جو خالد بن الولید سپہ سالار مسلم افواج نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دوران مقرر کیا تھا اور جس پر حضرت عمرؓ کے عہد میں ساری مملکت میں عمل ہوتا رہا۔ ریاست کے معاملات میں مسلم اور غیر مسلم مساوی تصور ہوتے تھے۔ ایک مسلم کو غیر مسلم کے بدلہ میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو ڈانٹا جاتا۔ اگر انھوں نے غیر مسلموں کو ڈانٹا ہوتا۔ معذور اور محتاج مسلمان اور غیر مسلم ریاست کے خزانہ سے گھر بیٹھے وظیفہ حاصل کرنے میں برابر کے حق دار تھے۔ متعلقہ قاعدہ مندرجہ ذیل تھا:

میں نے انھیں یہ استحقاق دیا ہے کہ ایسے بوڑھے شخص کے معاملہ میں جو معذور ہو چکا ہو یا جس پر کوئی آفت آ گئی ہو یا وہ امیر تھا، پھر وہ غربت میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس کے ہم مذہبوں نے اسے خیرات دی۔ ایسا شخص جزیہ سے مستثنیٰ ہو گا۔

وہ اور اس کے لواحقین مسلمانوں کے خزانہ سے اُس وقت تک وظیفہ پائیں گے جب تک وہ دار الہجرہ (مدینہ) اور دار الاسلام (خلافت) میں رہیں گے۔ اگر وہ دار الہجرہ اور دار الاسلام سے ہجرت کر جائیں تو مسلمان انھیں وظیفہ دینے کے پابند نہ ہوں گے۔[51]

اس قاعدہ کی حمایت میں اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ نے قرآن کا حوالہ دیا۔ آپ نے حکم جاری کیا اور وہ افسرِ خزانہ کو بھیجا۔ قرآن کے ضابطہ میں "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ" (صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا) لفظ الفقراء مسلمانوں پر حاوی ہے۔ اور المسٰکین میں اہلِ کتاب بھی شامل ہیں۔ یہودی، عیسائی (والفقراء هم المسلمون وهذا من المسكين من اهل الكتاب) مندرجہ ذیل واقعہ اور اس پر حضرت عمرؓ کا فیصلہ اس حکم کا پس منظر تھا۔[52]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک غیر مسلم بھکاری دیکھا۔ آپؓ نے اس سے پوچھا "تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟" اس نے جواب دیا: "جزیہ ادا کرنے، دیگر ضروریاتِ زندگی کے لیے اور بڑھاپے کے باعث" (اسئلُ الجزیه والحاجه والسن) حضرت عمرؓ اُسے اپنے گھر لے گئے اور اُسے کچھ رقم دی۔ اس کے بعد آپؓ نے ایک حکم جاری کیا اور اُسے بیت المال کو بھیج دیا۔ آپؓ نے حکم دیا تھا "اس آدمی کو دیکھو اور اس جیسے دوسروں کو۔ بخدا ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا ہے۔ ہم نے اس کی جوانی کھالی اور بڑھاپے میں اُسے ذلیل کیا۔" حضرت عمرؓ نے اسے اور اُس جیسے دوسروں کو جزیہ معاف کر دیا۔[53]

بلا خوف انصاف

حضرت عمرؓ کی انتظامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپؓ بلا خوف و رُو رعایت انصاف کرتے تھے۔ ان کے غیر جانبدار انصاف کی مثالیں اگلے حصہ میں دی جائیں گی۔ جہاں تک اُن کے بلا خوف انصاف کا تعلق ہے۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ نہ سب سے طاقت ور شخص اور نہ کوئی ہنگامی حالت کبھی اُن کی خلافت میں اُن کے دماغ میں کبھی پریشانی یا بیقراری کا باعث ہوئے مقدمات کے صحیح فیصلہ پر پہنچنے میں اور احکام جاری کرنے میں۔ اُن کے بلا خوف انصاف کی ایک نمایاں مثال خلافت میں ہنگامی حالات کے دوران وہ مقدمہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صحابی سعد بن ابی وقاصؓ[54] گورنر کوفہ اور ایران و عراق میں سپہ سالار افواج اسلامی پر غنائم برابر تقسیم نہ کرنے اور لوگوں میں انصاف نہ کرنے اور جنگ میں حصہ نہ لینے کا الزام تھا۔ (فانه لا یقسم بالسویه ولا یعدل فی الرعیه ولا یغزو فی السریة)[55]

شکایت کنندگان نے حضرت عمرؓ کے پاس نازک وقت میں شکایت کی جبکہ شہنشاہ ایران نے ساری سلطنت سے ساری فوجیں نہاوند میں جمع کر لی تھیں تاکہ مسلمانوں سے آخری معرکہ لڑے۔ حضرت عمرؓ کے حکم پر سعد بن ابی وقاص سپہ سالار مسلم افواج شہنشاہ کے مقابلہ کے لیے پوری تیاری کے بعد کوفہ سے کوچ کر رہے تھے۔ اس ہنگامی حالت نے آپؓ کے دل میں کوئی خوف پیدا نہیں ہونے دیا اور انصاف کا پرچم بلند رکھنے کے لیے آپؓ نے حکم دیا کہ سعد بجائے نہاوند کے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کرنے کے مدینہ کی عدالت انصاف کی طرف چل پڑیں۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! یہ مجھے تمہارے معاملہ کی چھان بین سے نہیں روک سکتا۔" (وایم اللہ لا یمنعنی ذلك

من الذلّ فی مالدیکم[۵۶] اس پر حضرت عمرؓ نے محکمۂ تفتیش کے سربراہ محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ کوفہ جا کر ابتدائی تحقیقات کریں۔ بظاہر شہادت کی بنا پر مقدمہ ایسا تھا کہ خلیفہ اس کی سماعت کریں۔ چنانچہ سپہ سالار جو ملزم تھا اُس کو حکم دیا گیا کہ عدالت میں حاضر ہو کر صفائی پیش کرے۔ سماعت ہوئی۔ گو سائلان کوئی محکم ثبوت اپنی حمایت میں پیش نہ کر سکے تب بھی حضرت عمرؓ نے سپہ سالار کو اس کے عہدے سے برطرف کرنے کا فیصلہ کیا۔[۵۷] اس طرح سعد بن ابی وقاص کی قوت، مقبولیت اور شہرت اور ہنگامی حالت جو اعلانِ جنگ کے باعث تھی اور سعد کی انتہائی اہمیت جو ایرانیوں کے خلاف قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ کا فاتح تھا اور جس نے موجودہ جنگ کے لیے آدمی اور سامان بھی فراہم کر لیا تھا، سب کے باوجود حضرت عمرؓ نے اس پر مقدمہ چلایا اور انھیں ان کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ کیا کوئی قوم بلاخوف انصاف کی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟

مشہور کمانداروں، فاتحوں اور طاقت ور گورنروں اور منتظمین جیسے مغیرہ بن شعبہ[۵۸]، عیاض بن غنم[۵۹] کی مثالیں پہلے اُوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ ابو موسیٰ الاشعری کو بھی ان کے خلاف ایک شکایت کے سلسلہ میں مدینہ طلب کیا گیا تھا اور اُن پر مندرجہ ذیل الزامات پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔

۱۔ اُس نے جنگی قیدیوں میں سے ساٹھ شہزادے چُن لیے ہیں اور اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

۲۔ اُس نے اپنے انتظامی اختیارات زیاد بن سمیہ کو سونپ دیئے ہیں اور وہی مختارِ کُل ہے۔

۳۔ اس کی ایک لونڈی کو اعلیٰ خوراک دی جاتی ہے۔ جو عموماً مسلمانوں کو میسر نہیں۔

ابو موسیٰ نے عدالت میں اپنا بیان دیا جس میں اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت عمرؓ نے خود یہ بیان قلم بند کیا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد اور ملزم کے بیان اور شہادتوں کا جائزہ لے کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ آپؓ کے مطابق پہلا الزام بے بنیاد تھا اس لیے وہ چھوڑ دیا گیا۔

دوسرے الزام پر ابو موسیٰ نے بیان کیا تھا: زیاد ایک طباع (جوہر قابل) اور بڑا مدبر ہے۔ اس لیے میں نے اُسے اپنا مشیر مقرر کیا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے زیاد کو طلب کیا اور اُس کا بیان لیا۔ وہ واقعی ایک لائق آدمی تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے خود اُسے گورنر بصرہ کا مشیر مقرر کیا۔

تیسرے الزام پر ابو موسیٰ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا اس لیے وہ لونڈی اُن سے لے لی گئی۔[۶۰]

بلاخوف انصاف کی معیاری مثال حضرت عمرؓ کا وہ فیصلہ ہے جو خالد بن الولید کے خلاف شکایت پر کیا تھا۔ فردِ جرم میں مندرجہ ذیل الزامات[۶۱] خالد پر ان کی شام کے علاقہ قنسرین میں سالار افواج اسلامی کی مدت ملازمت کے دوران کسے تھے۔

۱۔ ابو عبیدہ جو شام میں مسلم افواج کے سپہ سالار تھے انھوں نے فتح حمص کے بعد خالد بن الولید کو قنسرین میں علاقائی سالار مقرر کیا۔ الحاضر کے مقام پر رومی سپہ سالار اور ہرقل کے بعد رومیوں میں چوٹی کے آدمی نے خالد کی فوج پر

حملہ کر دیا۔ میناس قتل ہو گیا اور رومیوں کا مکمل قلع قمع ہو گیا۔ الحاضر کے لوگوں کا گروہ جو رومیوں کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کرتا رہا، مقامی عرب عیسائیوں پر مشتمل تھا[۹۲]۔ اپنی شکست کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل معذرت خالد کو بھیجی :

"وہ عرب ہیں۔ وہ دوسروں کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ وہ جنگ میں حصّہ لینے کے لیے رضامند نہ تھے۔ (انهم عرب وانهم انما حشروا ولم يكن من رأيهم حربه[۹۳])۔ خالد بن الولید نے یہ معذرت قبول کر لی اور انھیں چھوڑ دیا (فقبل منهم وتركهم[۹۴])"

خالد بن ولید کا مندرجہ بالا عمل اسلامی فوجی قوانین کے خلاف تھا۔ قوانین میں ان معاہدوں کی جو بغیر لڑے ہتھیار ڈال دینے (صلحًا) والے دشمن سے کیا جائے شرائط مقرر تھیں۔ اس میں ایسے دشمن سے مختلف شرائط دی تھیں جو مسلمانوں سے لڑے اور شکست کھا جائے (عنوةً)۔ مندرجہ بالا عرب عیسائیوں نے درحقیقت شدید جنگ (قتالاً شدیداً) میں مسلمانوں کے خلاف حصّہ لیا تھا اور شکستِ فاش سے دوچار ہوئے تھے۔ خالد نے اس معاملہ میں بالفعل جنگ کرنے والوں اور سرِ جنگ کرنے والوں کے لیے مقررہ شرائط میں سے کوئی شرط بھی عاید نہ کی۔ ایسا رویہ اسلامی فوجی قوانین میں ناقابلِ معافی تھا[۹۵]۔ لڑنے والے دشمن کو شکست کے بعد جنگی قیدی بنانا ضروری تھا اور اسی کے مطابق سلوک کرتے ہوئے قوانین میں مقررہ شرائط عائد کرنا چاہیے تھیں۔ ان کو پاسداری یا معاوضہ پر چھوڑ دینا ریاست کے سربراہ کا خصوصی استحقاق تھا۔ خالد نے فوجی قانون پر عمل نہیں کیا اس لیے اس کی خلاف ورزی پر مرر دالزام ٹھیرایا :

۱۔ جب خالد کے عمل کی خبر حضرت عمرؓ کو ملی، آپؓ نے اس پر الزام عاید کیا : "خالد نے اپنے آپ کو مختار بنا لیا ہے۔" (امر خالد نفسه[۹۶])

۲۔ اس کی قنسرین کی کامیاب مہم کے بعد خالد فرصت اور تفریح کے موڈ میں غسلخانہ میں داخل ہوا اور شراب (خمر) آمیز سیال اپنے بدن پر ملا۔ یہ اطلاع ملنے پر حضرت عمرؓ نے خالد کو لکھا : مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم نے شراب (خمر) کی مالش کی جبکہ اللہ تعالیٰ نے شراب کی ظاہر خاصیت اور باطن خاصیت اور اس کی مالش منع کر دی ہے۔ پس اپنے جسموں پہ اس کی مالش نہ کرو (بلغني انك تدلكت بخمر وان الله قد حرم ظاهر الخمر وباطنه ومسه فلا تمسوها اجسادكم[۹۷]) الزام کے متعلق خالد کے جواب سے حضرت عمرؓ کی تسلی نہیں ہوئی۔ آپؓ نے اپنی ناراضی کا اظہار یہ کہہ کر کیا "مغیرہ کے بیٹے (خالد کے دادا) دائمی لعنت کی طرف مائل ہیں۔ اللہ تمھیں اس پر فنا نہ کر دے[۹۸]"

۳۔ فتح قنسرین کی تکمیل پر خالد بن الولید کو غنیمت کا بہت بڑا حصّہ ملا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی داد و دہش سے فیض پایا (فانتجع خالداً رجال من اهل الآفاق)۔ الاشعث بن قیس ان فیض پانے والوں میں سے ایک تھا جس کو اس نے دس ہزار درہم دیئے تھے (كان الاشعث بن قيس ممن انتجع خالداً

بقنسرین ناجازۃ بعشرۃ الاف) پر حضرت عمرؓ کو بتایا گیا ۔ آپؓ نے اسے مندرجہ ذیل ہدایات بھیجیں :
تم کسی کو ایک بکری یا ایک اونٹ میری پیشگی منظوری کے بغیر نہ دو گے (کتب الی خالد ان لا تو فی شاۃ ولا بعیرا الا مامری)۔
یہ صدر مقام سے ہدایات پاکر خالد نے ان پر عمل کرنے کے بجائے جواب دیا : یا مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے اور اپنی مرضی سے آزادانہ کام کرنے دیا جائے یا آپ اپنی کارروائی فرمائیں۔ ابن حجر نے ایک بیان کا حوالہ دیا ہے جو صاف صاف کہتا ہے کہ خالد کی معزولی اس کی بے ضابطگی کے سبب تھی ۔ یعنی غنائم تقسیم کرنے کے بعد وہ عادتاً اس کا حساب خلیفہ کو پیش نہ کرتا تھا (وکان سبب عزل عمر خالد اما ذکرہ الزبیر بن بکار قال کان خالد اذا صار الیہ المال قسمہ فی اھل الغنائم ولم یرفع الی ابی بکر حسابا)
مندرجہ بالا پس منظر کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے خالد بن الولید پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دیا ۔ آپؓ نے ایک پیام رساں کو بلایا اور اسے مندرجہ ذیل تحریری حکم دیا جو ابو عبیدہ شام میں اسلامی فوج کے سپہ سالار کے نام تھا :

" خالد کو کھڑا ہونے کو کہو اسے اسکی پگڑی سے باندھو ۔ اس کے سر سے اس کی ٹوپی اتار دو ۔ جب تک وہ تمہیں وہ ذرائع بتائے جن میں سے اس نے الاشعث کو انعام دیا ۔ کیا اس نے یہ ذاتی ملکیت میں سے دیا یا ریاست کے مال میں سے جو بطور غنیمت اس کے ہاتھ لگا تھا (امن مالہ ام من اصابۃ اصابھا) اگر وہ یہ کہے کہ اس نے یہ ریاست کے مال میں سے دیا ہے تو اس نے اپنی خیانت قبول کر لی ۔ اگر وہ کہے کہ اس نے اپنے ذاتی مال میں سے دیا تو اس نے فضول خرچی کی ہے ۔ (فقد اقر بخیانۃ وان زعم انھا من مالہ فقد اسرف) اسے ہر دو صورت میں معزول کر دو اور اس کے کام کو سنبھال لو (واعزلہ علی کل حال وضم الیک عملہ)"

ابو عبیدہ نے خالد کو عدالت میں حاضری کے لیے طلب کیا ۔ اس کی آمد پر ابو عبیدہ نے لوگوں کا جلسہ عام بلایا ۔ ان کے درمیان وہ خود منبر پر بیٹھ گئے ۔ حضرت عمرؓ کا ایلچی (بلالؓ) کھڑا ہوا اور خالد سے پوچھا " اس نے کہاں سے الاشعث کو (دس ہزار درہم) عطا کیے " خالد نے جواب نہ دیا ۔ ابو عبیدہ خاموش تھے اور کچھ نہیں بولے تھے ۔ اس پر بلال کھڑا ہو گیا اور بولا " امیر المومنین نے تمہارے معاملہ میں یہ یہ حکم دیا ہے " اس نے اس کی پگڑی اتاری خالد نے اس کی مزاحمت نہ کی کیونکہ حکم " سننے اور تابعداری کرنے " کا تھا ۔ اس نے اس کی ٹوپی بھی اتار دی ۔ پھر اس نے اسے کھڑا کیا اور اس کی پگڑی سے باندھ دیا اور پوچھا " تم نے الاشعث کو تحفہ کہاں سے دیا ؟" کیا تم نے یہ اپنی ملکیت میں سے دیا یا ریاست کے مال میں سے جو تمہارے پاس تھا ۔ اس نے اقبال جرم کیا " اپنے مال میں سے " اس نے اسے رہا کر دیا اور اس کی ٹوپی اس کے سر پر دوبارہ رکھ دی اور اس کی پگڑی بلال نے خود اپنے ہاتھ سے باندھ دی ۔ اس پر وہ بولا :

"ہم اپنے حکام کی بات سنتے ہیں اور مانتے ہیں اور اپنے اہلِ اقتدار کی عزت کرتے ہیں اور اُن کی خدمت کرتے ہیں۔"

مقدمہ کی سماعت کے بعد خالد کو حضرت عمرؓ کی طرف سے اپنی برطرفی کا حکم ملا جس میں اسے ان کے سامنے مدینہ میں پیش ہونے کی ہدایت بھی تھی۔ اس کے بعد وہ قنسرین لوٹ گیا اور وہاں سے حمص جہاں اُس نے لوگوں کو ایک الوداعی خطاب کیا اور مدینہ روانہ ہو گیا۔

حضرت عمرؓ نے خالد کے خلاف الزامات کی تحقیق کا حکم دیا اور عدالتی کارروائی کی تفتیش کے نتیجہ میں خالد کو اس کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔ تفتیش اور عدالتی کارروائی نہایت غیر جانبداری اور بے خوفی سے کی گئی۔ خالد کو اپنے خلاف الزامات کے سلسلہ میں اپنی صفائی کا پورا موقع دیا گیا۔ ان کی توجیہہ قابلِ قبول نہ سمجھی گئی۔ پھر ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے ذمہ دار قرار دے دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے بلا خوف، عدالت کا فیصلہ نافذ کیا۔

اپنے مقدمہ کی سماعت کے وقت خالد اپنی قوت، مقبولیت اور شہرت کے عروج پر تھا۔ وہ جنگِ مُوتہ کا ہیرو تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی تھی جس پر اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "سیف اللہ" کا لقب دیا گیا تھا۔ وہ ارتداد کی لڑائی کا فاتح تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب میں پھیل گئی تھی۔ وہ عراق میں اور پھر شام میں سپہ سالار مقرر ہوا تھا۔ وہ شام کی فیصلہ کن جنگ یرموک و دمشق کا ہیرو تھا اور بہت مقبول تھا اور حمص و قنسرین کی فتح میں اپنے سپاہیوں کا منظورِ نظر تھا۔ مندرجہ بالا مردانگی کے کام، فتوحات اور اُن کے نتیجہ میں خالد کی طاقت، مقبولیت اور شہرت ایک طرف تھی اور نفاذ انصاف اور اُس کی بالادستی کا قیام دوسری طرف تھا۔ خالد سرکاری اور سماجی مرتبہ اور فوج میں اُس کی مقبولیت نے جب ان کے پاس اس کی شکایت پیش کی گئی حضرت عمرؓ کے دل میں کوئی خوف پیدا نہیں کیا۔ آپؓ نے خالدؓ کے خلاف اپنا فیصلہ نافذ کیا جب اُس کے خلاف الزام ثابت ہو گیا تھا۔

مندرجہ بالا بحث ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور خالدؓ کے تعلقات کے متعلق غلط فہمیوں کا حوالہ دیا جائے جو بعض مؤرخین کے متعصب بیانات کے مطابق حضرت عمرؓ کے فیصلہ کی غیر جانبداری میں شک پیدا کرتے ہیں۔ الطبری، ابن اثیر اور ابن کثیر نے مندرجہ ذیل بیان قلمبند کیا ہے:

حضرت عمرؓ نے خالد کو ان باتوں کی بناء پر برطرف کیا جو اُن کے خلاف اس کی کہی ہوئی سمجھی جاتی ہیں۔ حضرت عمرؓ اس سے ناراض رہے اور اس کے اعمال کو حضرت ابو بکرؓ کے پورے عہد میں ناپسند کرتے رہے۔ ناپسندیدگی کی وجہ خالد کا وہ طرزِ عمل تھا جو اُس نے ابن نویرہ اور اس کے خلاف جنگ میں اختیار کیا تھا۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو ان کا پہلا حکم خالدؓ کی برطرفی تھا۔ آپؓ نے کہا "وہ (خالد) میرے تحت کسی عہدہ پر نہیں رہے گا۔" اس پر حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہ کو لکھا "اگر خالد اقبالِ جرم کرے تو وہ اپنے موجودہ عہدہ پر برقرار رہے گا۔ اگر وہ اقبالِ جرم نہ کرے تو تم اس کا عہدہ سنبھالو گے۔ اس کے بعد اس کی پگڑی اس کے سر سے اُتار دو اور اُس کی جائیداد آدھی کر دو۔" جب

ابو عبیدہ نے یہ حکم خالد کو پہنچایا اُس نے کہا "مجھے اجازت دو کہ میں اپنے معاملہ میں اپنی بہن سے مشورہ کر لوں" ابو عبیدہؓ نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔ خالد اپنی بہن فاطمہ بنت الولید زوجہ الحارث بن ہشام کے پاس گیا اور اُسے صورتِ حال بتائی اُس نے کہا "خدا کی قسم! حضرت عمرؓ تمھیں پسند نہیں کرتے وہ چاہتے ہیں کہ تم اقبالِ جرم کر لو، تاکہ وہ تمھیں برطرف کر سکیں۔" اُس نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور کہا "خدا کی قسم! تم نے سچ کہا ہے۔" اُس نے اپنی راہ عمل طے کی اور اقبال جرم سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت بلالؓ کھڑے ہو گئے اور ابو عبیدہ کی طرف بڑھے اور کہا خالد کے متعلق ان کا کیا حکم تھا؟ اس نے جواب دیا "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اس کی پگڑی اُتار لو اور اس کی جائیداد کے حصے کر دو۔" اس نے اس کی ہر چیز سوائے جوتوں کے تقسیم کر دی۔ ابو عبیدہ نے کہا "یہ معاملہ صرف اس سے ہی فیصل ہوگا۔" اس پر خالد نے کہا "آگے بڑھو میں کوئی چیز نہ رکھوں گا جو میری امیر المومنین کی نافرمانی کا باعث ہو ضروری کارروائی پوری کرو" اس نے اس کا ایک جوتا لے لیا اور دوسرا اُسے دے دیا۔ اپنی برطرفی کے بعد خالد حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ روانہ ہو گئے۔

مندرجہ بالا بیان کی سچائی پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ یہ دو متضاد متون میں بیان ہوا ہے۔ پہلے متن کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کا سب سے پہلا حکم تھا۔ جب وہ ۱۳ھ میں خلیفہ بنے۔ دوسرا متن کہتا ہے کہ یہ واقعہ اُن کی خلافت کے پانچویں سال ۱۷ھ میں ہوا۔ ابن الاثیر مقدمہ کی روداد اور برطرفی بیان کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس وقت خالدؓ علاقائی سالار تھا۔ قنسرین میں مقیم تھا۔ جہاں سے اُس نے وہ جائیداد حاصل کی جو اُس نے شاعر کو دی جس کے لیے اس پر مقدمہ چلا۔ ساتھ ہی وہ کہتا ہے وہی واقعہ ۱۳ھ میں حضرت عمرؓ کا پہلا حکم تھا۔ جو جنگ یرموک اور فتح دمشق سے بھی پہلے تھا۔ حمص اور قنسرین کا تو ذکر ہی کیا جو پانچ سال بعد ۱۷ھ میں زیر نگیں آئے۔

خالدؓ سے حضرت عمرؓ کی ناراضگی اور خالدؓ کے افعال کی ان کے پورے دور حضرت ابوبکرؓ میں ناپسندیدگی کی بنیاد خالد کا مالک بن نویرہ کے قتل سے متعلق طرز عمل تھا اور خالدؓ کی اس کی بیوہ سے شادی بھی تھا۔ کوئی شک نہیں حضرت عمرؓ صرف شکایت کنندہ مالک کے بھائی کا بیان سن کر ناخوش ہوئے تھے اور خالدؓ کے مدینہ آپؓ کی عدالت میں حاضری کے لیے آنے پر اپنی برہمی کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن جونہی عدالت نے مسئول الیہ کا بیان سننے اور واقعہ کی تفصیل جاننے کے بعد ملزم کو باعزت بری کر دیا تو حضرت عمرؓ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ اس کے بعد خالدؓ جزیرہ نما عرب، عراق اور شام میں بڑے بڑے فوجی عہدوں پر رہے اور بہت اہم اور فیصلہ کن فوجی معرکوں میں کامیابی اور عزت سے لیتے رہے لہٰذا حضرت عمرؓ کا اُنھیں اس الزام پر برطرف کرنا جو پہلے ہی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں غلط ثابت ہو چکا تھا بالکل بے بنیاد ہے۔

اس بیان کی جعلی حیثیت اس حقیقت سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خالدؓ نہایت ذمہ دار اور بلند فوجی عہدوں پر پانچ سال (۱۳ھ تا ۱۷ھ) حضرت عمرؓ کے تحت برقرار رہے جبکہ محولہ بیان میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ مذکور ہے

"وہ (خالد) میرے تحت کبھی کوئی عہدہ نہ پا سکے گا" (لا یلی لی عملا ابداً)[78] مندرجہ ذیل حقائق اس بیان کی صداقت کی نفی کرتے ہیں: سنہ ۱۳ھ کی ابتدا میں حضرت ابوبکرؓ نے شام کے مختلف علاقوں میں مندرجہ ذیل سالار روانہ کیے۔[79]

"خالد بن السعید بن العاص تیماء، یزید بن ابی سفیان، دمشق، ابوعبیدہ بن الجراح، حمص، عمرو بن العاص فلسطین، شرجیل بن حسنہ اردن، ہرقل رومی شہنشاہ نے بڑی افواج اکٹھی کیں۔ پوری شامی آبادی کو تیار کیا اور مندرجہ بالا سالاروں کے تحت مختلف چھوٹی چھوٹی مسلم افواج کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ رومیوں کی جنگی حکمت عملی کی اطلاع پاکر حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ شام کی تمام مسلح افواج متحد ہو جائیں۔ آپؓ نے خالد بن الولید کو بھی حکم دیا کہ عراق میں ایرانی محاذ پر اپنا جانشین مقرر کرے اور متحد اسلامی افواج کی کمان شام میں رومیوں کے خلاف سنبھال لے۔ اسی حکم میں اسے خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ شام میں اپنا کام مکمل کر کے عراق لوٹ آئے (فاذا فرغ عاد الی عمله بالعراق)[80]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالد کا تقرر بطور سپہ سالار متحدہ افواج منتقل نہ تھا۔ شام میں فوجی کارروائی مکمل کر لینے کے بعد وہ تقرر کی شرائط کے مطابق سپہ سالار نہیں بننا تھا۔ یہی حقیقت میں ہوا بھی۔ اس کی فتح یرموک کے بعد وہ سپہ سالار نہ رہا۔ جو واحد تبدیلی حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر اور حضرت عمرؓ کے اختیار سنبھالنے پر ہوئی وہ یہ تھی کہ شام میں تقرر کے شرائط کے مطابق اُسے عراق واپس آنا تھا جب کہ حضرت عمرؓ نے اسے شام میں ہی رکھا اور اسے ابوعبیدہ سے متصل کر دیا (فانه ضم خالد الی ابی عبیدة[81]) اس مشترکہ سالاری میں خالد نے فتح دمشق، حمص اور قنسرین میں پورے اختیارات استعمال کیے۔ مندرجہ بالا شہادت اس بیان کا جعلی ہونا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے جو کہتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کی ابتدا ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ خالد کو کوئی عہدہ نہ دیں گے۔

یہ بیان حضرت عمرؓ کے اس حکم کا حوالہ بھی دیتا ہے کہ آپؓ نے خالدؓ کو اقبال جرم یا انکار کا حکم دیا (ان خالدا کذب نفسه فهو امیر علی ما هو علیه وان هو لم یکذب نفسه فانت الامیر علی ما هو علیه[82]) یہ تاریخ کی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ حکم حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں قنسرین کی فتح کے بعد دیا تھا لہٰذا ۱۳ھ میں روایت زیر بحث میں اس کا ذکر اس کا کذب ثابت کرتا ہے۔

عدالتی طریق کار کی تفصیل جیسا کہ روایت میں دی گئی ہے۔ انتہائی غیر مبہم طریقہ سے ظاہر کرتی ہے کہ حضرت بلالؓ نے ساری تفتیش قنسرین کی فتح کے بعد کی۔ وہ بڑی رقم جو کہا جاتا ہے کہ خالدؓ نے الاشعث کو بخشی اس کے قبضہ میں قنسرین کی مہم کے بعد ہی آئی تھی اس سے پہلے نہیں۔ (فما صاب اموالا عظیمة[83]) اس کے بعد جعلی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اس کا آخری جملہ ہے جس میں ذکر ہے کہ جب عمرؓ نے اسے برطرف کر دیا تو خالدؓ حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ روانہ ہو گیا (ثم قدم خالد علی عمر المدینة حین عزله[84]) جب کہ یہ وافر تاریخی شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالدؓ کو ۱۳ھ میں نہ برطرف کیا گیا تھا اور نہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس روانہ ہوا تھا۔ درحقیقت وہ پانچ سال شام میں ہی قیام پذیر رہا، فوجوں کی کمان کرتا اور حضرت عمرؓ کے تحت علاقہ پر علاقہ فتح کرتا رہا۔

معروضہ روایت کے بے بنیاد ہونے کا حتمی ثبوت وہ دلیل ہے جو ابن حجر نے اپنی اصابہ میں بیان کی ہے۔ ابن حجر بیان کرتا ہے کہ خالد کی برطرفی کے بعد اُسے ایک بار پھر حضرت عمرؓ نے اپنے فرائض سنبھال لینے کی دعوت اس شرط پر دی کہ وہ اسلامی فوجی ضابطہ قانون اور غنائم کی تقسیم سے متعلق قواعد کی پابندی کرے گا۔ خالدؓ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اُسے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا (فعزلہ ثم کان یدعوہ الیٰ ان یعمل فیأب الا ان یخلیہ یفعل ما شاء فیأب عمر[85])

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد کی غیر جانبدار اور آزاد عدلیہ کو بدنام کرنے کے لیے یہ کہانی گھڑی گئی کہ پہلا حکم جو حضرت عمرؓ نے اقتدار سنبھالتے ہی جاری کیا وہ انصاف اور اصول معدلت پر مبنی نہیں تھا۔ اس کی بنیاد داخلی تھی اور ذاتی بغض و رنجش پر مبنی تھی[86] (انما نزع عمر خالداً فی کلام کان خالد تکلم بہ فیما یزعمون ولم یزل عمر علیہ ساخطاً ولامرہ کارھاً فی زمان ابی بکر کلہ[87])۔ یہ درست نہیں یہ من گھڑت ہے۔ حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں خالد کو برطرف کیا۔ جب وہ پہلے پانچ سال آپؓ کے ماتحت کام کر چکا تھا۔ وہ بہت ذمہ دارانہ اور اونچے فوجی عہدوں پر رہا اور اس فوج کا سالار تھا جس نے رومیوں کو شکست دی۔ یرموک کی فیصلہ کن جنگ کے بعد حضرت عمرؓ نے جنگ کا ایک منصوبہ تمام شام کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا جس کے مطابق شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص کو اُردن اور فلسطین بھیجا گیا تھا اور سب سے اہم اور مرد در بود اشد بید[88] علاقہ جو شام کے رومی مقبوضات کے ساتھ ساتھ تھا یعنی حمص اور قنسرین ابوعبیدہ اور خالد بن الولید کے تحت دیئے گئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے احکامات تھے: "فنصرف انت وخالد الی حمص[89]" (خالد کے ساتھ حمص کی طرف پیشقدمی کرو) حمص کی کامیاب مہم کے بعد تنہا خالد کو قنسرین کی فتح کے لیے بھیجا گیا تھا۔ بعث ابوعبیدہ کے بعد حمص خالد بن الولید الی قنسرین[90]۔ البقاع بھی خالد نے فتح کیا تھا: ان ابا عبیدہ بعث خالد بن الولید الی البقاع فتحہ بالسیف[91]۔ حضرت عمرؓ خالدؓ کی عزت کرتے تھے اور آپؓ نے اسے اسلامی فوج ضابطہ کے مطابق معاہدے کرنے کا اختیار دیا تھا: صلحہ اہل بعلبک وکتب لھم کتاباً[92]۔ شام میں فحل کی مہم کے دوران خالد ہراول دستہ کا سالار تھا۔ تدجعل علی المقدمہ خالد بن الولید[93]۔

مندرجہ بالا تاریخی شہادت پوری قوت سے ثابت کرتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو خالد بن الولید سے کوئی ذاتی کد نہ تھی۔ لہٰذا یہ کہانی جو خالد کی برطرفی حضرت عمرؓ کے پہلے ہی حکم میں ظاہر کرتی ہے بالکل کھوکھلی اور بے بنیاد ہے۔ حضرت عمرؓ کے تحت خالدؓ کو عزت حاصل تھی۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا۔ جب اس کے خلاف بعض شکایات پہنچیں تو مناسب تفتیش کی گئی اور اس کے مطابق کارروائی کی گئی تھی۔ یہ سب سے منصفانہ کارروائی تھی جو تمام قانونی اور عدالتی تقاضے پورے کرنے کے بعد ہوئی تھی۔ خالدؓ اور اُس کے خاندان کے تعلقات حضرت عمرؓ کے ساتھ خالدؓ کی برطرفی کے بعد بھی پُرتپاک و پُرجوش رہے۔ مدینہ میں آمد پر خالدؓ نے مایوس شخص کا باغیانہ رویّہ نہیں اپنایا تھا۔ اُس نے صرف اپنے احساسات بیان

کیے اور کہا: میں مسلمانوں میں اپنی برہمی آپ پر ظاہر کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! اے عمرؓ آپؓ میرے معاملہ میں مجمل نہیں رہے۔ (لقد شکوتک الی المسلمین وباللہ انک فی امری غیر مجمل یا عمر[94]) حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا "یہ دولت کہاں سے آئی؟" (من این ھذا الیسار) خالدؓ نے جواب دیا: غنیمت اور حصّوں میں سے (من الانفال والسھمان ما زاد علی الستین الفا فلک) حضرت عمرؓ نے ان کے سامان کا جائزہ لیا۔ بیس ہزار زیادہ پائے گئے جو اس نے بیت المال میں جمع کرا دیئے۔ اس پر خالدؓ کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا:-

اے خالد! خدا کی قسم! تم میرے نزدیک باعزت ہو اور مجھے بہت عزیز ہو۔ تم آج کے بعد مجھے کسی بات کے لیے موردِ الزام نہ ٹھہراؤ گے۔ (یا خالد واللہ انک علی لکریم وانک الیّ لحبیب ولن تعاتبنی بعد الیوم علی شیء[95])۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک واضح حکم تمام صوبوں کو بھیجا جس میں خالدؓ کی برطرفی کے متعلق شکوک، اور غلط فہمیاں دُور کر دی گئیں۔ گشتی مراسلہ میں تھا: "مَیں نے خالدؓ کو بغض یا خیانت کی وجہ سے برطرف نہیں کیا ہے بلکہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حرص کو جگہ دے رہا ہے اور مجھے ڈر تھا کہ وہ اس پر اعتماد کرنا نہ چھوڑ دیں۔ اس کے لیے اس نے تکلیف اُٹھائی۔ مَیں اُن کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ اللہ ہی تقدیر بنانے والا ہے اور انھیں کوئی مصیبت پیش نہ آئے (کتب عمر الی الامصار انی لم اعزل خالداً عن سخطۃ ولا خیانۃ ولکن الناس فتنوا بہ فخفت ان یوکلوا الیہ ویبتلوا بہ فاحببت ان یعلموا ان اللہ ھو الصانع و ان لا یکونوا بعرض فتنۃ[96])۔

حضرت عمرؓ اور خالدؓ کے درمیان خیرسگالی کے تعلقات کا سب سے بڑا فیصلہ کُن ثبوت خالدؓ کی بہن فاطمہ بنت الولید کی حضرت عمرؓ سے شادی ہے۔ فاطمہ کا شوہر الحارث بن ہشام اس طاعون کا شکار ہو گیا تھا جو ۱۸ھ میں شام میں مسلم افواج میں پھوٹی تھی۔[97] الحارث کی موت کے بعد حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ میں فاطمہؓ سے شادی کی تھی۔ (فیما تزوج عمر فاطمۃ بنت الحارث وھی اخت خالد بن الولید[98])۔ خالدؓ اپنی بہن کی حضرت عمرؓ سے شادی کے وقت زندہ تھا اور ایک سال بعد ۲۱ھ میں فوت ہوا۔[99]

اگر حضرت عمرؓ نے خالدؓ کو اپنی دشمنی اور بُغض کی بناء پر برطرف کیا ہوتا تو خالدؓ اپنی بہن کو اپنے دشمن سے شادی نہ کرنے دیتا اور نہ ہی فاطمہ نے اپنے بھائی کے دشمن سے شادی کی ہوتی۔ یہ شادی اسلام کے ان دو عظیم فرزندوں کے درمیان پُرتپاک تعلقات کا واضح ثبوت ہے۔ یہ سب بے بُنیاد کہانی کو اُڑا کر رکھ دیتا ہے اور اس روایت کا جھُوٹ ظاہر کرتا ہے۔ جو بعض غیر معتبر افراد نے ملی بھگت سے تیار کی تھی الجو کہتی تھی۔ خالدؓ نے ابوعبیدہ سے اپنی بہن سے مشورہ کرنے کی اجازت چاہی۔ ابوعبیدہ نے اُسے اجازت دے دی۔ وہ اپنی بہن کے پاس گیا اور اس سے اپنے معاملہ میں مشورہ کیا۔ اس نے

کہا: خدا کی قسم! حضرت عمرؓ تمہیں پسند نہیں کرتے۔ اس نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور کہا: خدا کی قسم تم نے سچ کہا ہے۔ (واللہ لا یحبک عمر ابدًا وما یرید الا ان تکذب نفسک ثم تنزع عنک فقبل رأسها وقال صدقت واللہ)[۱] یہ تعجب خیز ہے کہ مندرجہ بالا بیان میں فاطمہ اپنے بھائی کو عمرؓ کی زیرکی سے ہوشیار رہنے کے لیے متنبہ کرتی ہے اور خالدؓ نے اس پر اس کے سر کو بوسہ دیا اور دوسری طرف وہی فاطمہؓ حضرت عمرؓ سے شادی کر لیتی ہے اور خالدؓ بخوشی اُسے ایسا کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ کس قدر تضاد! دراصل یہ کہانی حضرت عمرؓ کے فیصلوں کی غیر جانبداری اور آزادی پر حملہ کی بدنیت سے گھڑی گئی جس کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔

عربوں کی قبائلی عصبیت سے اُمّت کی تشکیل کی صورت میں حالیہ تبدیلی ایک اور اہم جزو ہے جس کو خالدؓ کی برطرفی کے سلسلہ میں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ سب سے زیادہ چوکس اور محتاط، فرض شناس اور کسی ایسے واقعہ یا کارروائی کا نوٹس لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جو اُن کے خیال سے قبائلی عصبیت کا کوئی رجحان رکھتا ہو۔ قبائلی ضابطہ میں سردار اور افراد قبائل کسی فوجی ضابطہ کے پابند نہ تھے۔ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بلا امتیاز اور بلا جواز قتل کر سکتے تھے۔ زندہ یا مُردہ کو دورانِ جنگ یا حملہ یا اس کے بعد مسخ کرنا، جنگی قیدیوں سے غیر انسانی سلوک اور عورتوں کو مالِ تجارت تصور کرنا بہادری کے کام اور قابلِ فخر کارنامے سمجھے جاتے تھے۔ اسلام نے ایک واضح فوجی ضابطہ دیا۔ سالار اور سپاہی کا فرض تھا کہ اس کے قاعدوں پر عمل کریں۔ اس کی کسی شق کی خلاف ورزی ایک سنگین جرم تصور ہوتی تھی اور مجرم سے امتیاز اس کی سرکاری یا سماجی حیثیت کے قانون اور انصاف کے مطابق سلوک ہوتا تھا۔ اس سماجی مذہبی پس منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ کیوں حضرت عمرؓ نے معمولی فروگذاشت چھوٹے جرائم یا سالاروں، گورنروں اور دیگر عمالِ حکومت کی بے ضابطگیوں کا اتنا خیال کیا۔ مالک بن نویرہ سے متعلق واقعات، اس کی بیوی، غنائم کا حساب پیش کرنے پر اصرار، الاشعث پر غنائم کی دہش اور آخر میں خالدؓ کی برطرفی کا کھلا مقدمہ چلانے کو حضرت عمرؓ کی مندرجہ بالا حکمتِ عملی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

بلا رو رعایت انصاف

حضرت عمرؓ ایک منظّم عدلیہ قائم کرتے اور اس کے کامیاب انتظام میں بھی اس لیے کامیاب ہوئے کہ وہ ہمیشہ خود کو قانون کا تابع تصور کرتے اور قانونی اور عدالتی طریقِ کار کے لیے جب بھی ضرورت ہوتی خود کو اُس کے تحت دے دیتے۔ ایک بار ایک بدّو نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ یمنی کپڑے کی چادر سے بُنی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ جو چادر حضرت عمرؓ کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حصّہ میں ملی تھی۔ ایک چادر حضرت عمرؓ کے ناپ کی قمیص کے لیے ناکافی تھی۔ بدّو نے حضرت عمرؓ کو عوام کے سامنے تقریر کے دوران روک دیا اور یہ جاننا چاہا کہ حضرت عمرؓ کے لیے اپنے حصّہ کی ایک چادر میں سے اپنے ناپ کی قمیص پہننا کیونکر ممکن ہوا؟ حضرت عمرؓ نے اپنا خطبہ روک دیا اور اپنے بیٹے

عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ بدو کے سوال کا جواب دیں۔ ابن عمرؓ نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کے حصّہ کی چادر ان کی قمیص بنانے کے لیے کافی نہ تھی اس لیے اس نے اپنے حصّہ کی چادر بھی انھیں دے دی اس طرح ان کی قمیص مکمل ہو گئی تھی، اس پر بدو مطمئن ہو گیا تھا اور خلیفہ کو تقریر جاری رکھنے دی۔ غصّہ میں حضرت عمرؓ نے ایک بدو کو کئی دُرّے رسید کیے۔ وہ ظالم کے خلاف اپنا انصاف طلب کرتا آیا۔ حضرت عمرؓ نے پشیمانی ظاہر کی اور بدو سے اتنے ہی دُرّے انھیں لگانے کو کہا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ مندرجہ ذیل خود کلامی کرتے گھر لوٹے :

اے خطاب کے بیٹے! تم عاجز تھے اور اللہ نے تمھیں مرتبہ دیا۔ تم بھٹکے ہوئے تھے اور اللہ نے تمھیں ہدایت دی۔ تم کمزور تھے اللہ نے تمھیں طاقتور بنایا۔ پھر اُس نے تمھیں لوگوں پر حاکم بنایا اور جب اُن میں سے ایک تمھاری مدد طلب کرتا آیا تو تم نے اُسے مارا۔ اس کے سامنے کس چیز نے تمھیں روکا؟[۱۰۲]

حضرت عمرؓ نے کبھی اپنے متعلقین اور قریبی رشتہ داروں کو حکومت کی انتظامیہ میں مداخلت نہ کرنے دی۔ اگر اُن کے خاندان کے کسی فرد نے کوئی نامناسب حرکت کی یا کوئی جُرم کیا فوراً قانونی کارروائی کی گئی۔ ان کا بیٹا عبیداللہ شراب پینے کا مرتکب ہُوا اُسے دُرّے لگائے گئے (ضرب عمر ابنہ عبید اللہ و اصحابہ فی شراب شربہ[۱۰۳]) وہ دُرّوں کی ضرب سے مر گیا۔ (فضربہ عمر الحد فی الشراب فمات)

عبداللہ اور عبیداللہ حضرت عمرؓ کے دو بیٹے ایک مرتبہ مسلم افواج کے ساتھ عراق میں تھے۔ ابوموسیٰ الاشعری گورنر بصرہ نے اُنھیں کچھ رقم بیت المال سے قرض دی۔ اُنھوں نے رقم کسی کاروبار میں لگا دی اور اس پر کچھ نفع کمایا۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ تک پہنچی تو آپؓ نے دونوں بیٹوں کو اپنے سامنے طلب کیا۔ آپؓ نے اُن سے پوچھا "کیا ابوموسیٰ نے ایسا قرض ہر سپاہی کو دیا تھا یا صرف تمھیں؟" اُنھوں نے جواب دیا "صرف ہمیں" حضرت عمرؓ نے کہا "اُس نے یہ رقم تمھیں خاص طور پر دی تھی کیونکہ تم امیرالمومنین کے بیٹے تھے" اور حکم دیا اصل رقم مع تمام نفع کے جو اس پر حاصل ہُوا بیت المال میں جمع کرا دیں۔ فیصلہ کے اعلان پر عبداللہ خاموش رہے لیکن عبیداللہ نے درخواست کی:

"اے امیرالمومنین! آپؓ کو یہ مقدمہ یوں فیصل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نقصان کی صورت میں ہم پوری رقم بیت المال لوٹانے کے ذمہ دار تھے۔" حضرت عمرؓ نے اس عذر پر کوئی توجہ نہ دی اور صرف اپنا پہلا فیصلہ دوہرا دیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص کھڑا ہُوا اور یہ قانونی مشورہ دیا "اے امیرالمومنین! کیا اس کو شراکت کا کاروبار تصوّر نہیں کیا جا سکتا" حضرت عمرؓ نے اس کی رائے منظور کر لی اور حکم دیا کہ آدھا منافع بیت المال میں جمع کرا دیا جائے اور آدھا عبداللہ اور عبیداللہ کو دے دیا جائے[۱۰۴]۔ اس مقدمہ کی کارروائی سے وکالت کے ادارے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

قدامہ بن مظعون، حضرت عمرؓ کا برادرِ نسبتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا صحابی شراب نوشی کے الزام میں گرفتار ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے بلا جھجک اُس کی سزا کا حکم دے دیا اور اُسے دُرّے لگائے گئے[۱۰۵]۔ (عزل قدامہ بن مظعون عن البحرین وحدّہ فی شرب الخمر[۱۰۶])۔

حوالہ جات و تشریحات

۱ - کتاب ایک تحریر ہے جو خود مکمل ہے۔ سامی مذاہب میں الکتاب سے مراد قانون الٰہی، ضابطۂ حیات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیا۔ "اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔" (قرآن ۱۷ : ۲) ابراہیمؑ پر نازل ہونے والے صحف (۱۹ : ۴۱) اسمٰعیلؑ پر (۱۹ : ۵۴) ادریسؑ پر (۱۹ : ۵۶) اور یہودیوں کے لیے ہدایات الکتاب کہلائیں۔ یہ کتابیں یقیناً ان پیغمبروں کی اُمتوں کے لیے ہدایت اور دستور تھیں۔ چونکہ ان کے پاس یہ کتابیں تھیں اس لیے قرآن نے بار بار ان کا حوالہ بطور "الکتاب" دیا ہے۔

۲ - قرآن (۲ : ۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابیوں میں عمرؓ سب سے مقدم منتقین میں سے تھے۔

۳ - ایضاً (۴ : ۱۰۵) ۴ - ایضاً (۴ : ۵۹ اور ۶ : ۱۵۶) ۵ - ایضاً (۳۳ : ۲۱)

۶ - الجاحظ، البیان والتبیین، قاہرہ ۱۹۴۸ء - ۱۳۶۷ھ جلد دوم صفحہ ۴۸۔ پوری بحث کے لیے ذیل میں عنوان "حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ عدالتی اصول" ملاحظہ ہوں۔

۷ - ابن سعد، طبقات، جلد دوم، صفحہ ۳۳۶

۸ - ابو یوسف، کتاب الخراج (ایڈیشن بلاق، مصر، ۱۳۰۲ھ) صفحہ ۴۷

۹ - البخاری، الصحیح، کتاب الطب۔ مالک بن انس، الموطأ، باب الطاعون۔

۱۰ - قرآن (۴۲ : ۳۸) ۱۱ - ایضاً (۳ : ۱۵۸)

۱۲ - ابو یوسف، کتاب الخراج متذکرہ بالا صفحہ ۲۰

۱۳ - ایضاً صفحہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ ۱۴ - ایضاً صفحہ ۱۴، ۱۵

۱۵ - ابن سعد، طبقات، ایڈیشن حیدرآباد (ہندوستان) جلد سوم صفحہ ۱۳۴۔ الطبری۔ تاریخ پرانا ایڈیشن صفحہ ۲۴۵۷۔ شبلی نعمانی، الفاروق ایڈیشن مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، جلد دوم، صفحہ ۲۸۳)

۱۶ - ابن سعد، طبقات ایڈیشن حیدرآباد (ہندوستان) جلد سوم، صفحہ ۱۳۴

۱۷ - قرآن (۶۲ : ۲) ۱۸ - ایضاً ۵ : ۶۷

۱۹ - ایضاً ۵ : ۱۹ ۲۰ - ایضاً ۶۷ : ۸ و ۹

۲۱ - شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، صفحہ ۱۳۰ ۲۲ - ایضاً

۲۳ - ایضاً۔ شبلی متذکرہ بالا جلد دوم، صفحہ ۳۴۴

۲۴ - شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، جلد دوم فقہ عمرؓ کے حوالے سے، ابو یحییٰ امام خان نوشہروی لاہور ۱۹۵۲ء صفحہ ۲

۲۵ - قرآن ۲۴ : ۴ ۲۶ - ایضاً

۲۷ - الطبری، تاریخ، جلد چہارم، صفحات ۲۰۷، ۲۰۸، زیر ۱۷ھ
۲۸ - مالک، الموطأ ۲۹ - الشافعی بحوالہ فقہ عمرؓ (صفحہ ۲۳۲)
۳۰ - مالک، الموطأ ۳۱ - ایضاً ۳۲ - ایضاً ۳۳ - ایضاً
۳۴ - ایضاً صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶ - وکان محمد بن مسلمة هو صاحب العمال الذی یقتص آثار من شکی زمان عمر - ۳۵ - ایضاً صفحہ ۲۳۶
۳۶ - ابویوسف، کتاب الخراج متذکرہ بالا صفحہ ۶۶، شبلی، الفاروق، متذکرہ بالا صفحہ ۲۱۶
۳۷ - الطبری، تاریخ زیر واقعات ۱۳ھ جلد چہارم، صفحہ ۸۲ -
۳۸ - الطبری نے اپنے وقائع (تاریخ) میں لکھا ہے: ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے حج کیا۔ حج کے دوران ایک مقدمہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوا۔ آپؓ نے مقدمہ حضرت عمرؓ کو بھیج دیا اور فریقین کو ان کے سامنے پیش ہونے کو کہا: اذهبوا بهما الی عمر فلینظر فان کان الجارح قد بلغ فلیقد منه۔ (جلد چہارم، صفحہ ۲۷ اختتام ۱۲ھ) ۳۹ - الطبری، جلد چہارم زیر واقعات ۱۳ھ
۴۰ - ابویوسف، کتاب الخراج متذکرہ بالا صفحہ ۶۶ - ابن سعد، طبقات، جلد دوم، صفحہ ۳۵۹ - وکیع، جلد اوّل، صفحہ ۱۰۸ - ۴۱ - شبلی، الفاروق متذکرہ بالا جلد دوم صفحات ۲۶۷، ۲۶۸
۴۲ -

James B. Pritchard, Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament, Princeton, New Jersey, Princeton University Press U.S.A., 1955, pp. 159 to 222.

۴۳ - شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفاء، مطبع صدیقی، بھوپال - ۱۲۸۶ھ صفحہ ۱۲۹ - مناظر احسن گیلانی، اسلام اور نظام جاگیرداری و زمینداری مدوّن محمد یوسف گورایہ، علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور ۱۹۷۵ء صفحات ۳، ۴،
۴۴ - الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم زیر واقعات ۱۵ھ صفحات ۱۵۹، ۱۶۰
۴۵ - البلاذری، فتوح البلدان، صفحہ ۱۳۷ - ابویوسف، کتاب الخراج متذکرہ بالا صفحہ ۸۱ - ازدی، فتوح الشام صفحہ ۱۳۸ شبلی، الفاروق - ایڈیشن مکتبہ رحمانیہ، لاہور، جلد اوّل، صفحات ۱۳۰، ۱۳۱ زیر عنوان یرموک۔
۴۶ - ایضاً ۴۷ - البلاذری، متذکرہ بالا صفحہ ۱۵ بحوالہ شبلی متذکرہ بالا جلد دوم صفحہ ۲۸۷ -
۴۸ - الدرایہ فی تخریج الہدایہ ایڈیشن دہلی صفحہ ۳۶۰ بحوالہ شبلی، الفاروق متذکرہ بالا جلد دوم صفحہ ۲۸۴ -
۴۹ - ابویوسف، کتاب الخراج، صفحہ ۶۸ ۵۰ - ابن حجر العسقلانی اسد الغابہ، زیر سوانح عرفہ۔ نیز ملاحظہ ہو شبلی، الفاروق متذکرہ بالا، جلد دوم صفحہ ۲۸۴ ۵۱ - ابویوسف، کتاب الخراج صفحہ ۸۵ - شبلی الفاروق،

متذکرہ بالاصفحات ۴۰ ۴۴ - ۴۱ ۴۴   ۵۲ - قرآن ۹ : ۶۰

۵۳ - ابویوسف، متذکرہ بالاصفحہ ۷۲ ، شبلی متذکرہ بالاصفحات ۴۴۱ - ۴۴۲

۵۴ - اس موقعہ پر سعد نے خود اسلام کے لیے اپنی خدمات گنوائی ہیں "میں پہلا شخص ہوں جس نے مشرکین کا خون بہایا (اللہ کی راہ میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے اپنے والدین کا اکٹھے نام لیا اور آپؐ نے کسی اور کے لیے ایسا نہیں کیا تھا (الطبری، تاریخ جلد چہارم صفحہ ۲۲۴ زیر واقعات ۱۲ ھ) ابن کثیر نے احمد بن حنبل کی سند پر سعد سے روایت کی ہے "یوم اُحد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری خاطر اکٹھے اپنے ماں، باپ کا نام لیا۔" سعد کے دوسرے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کے دن کہا "سعد! تیر چلاؤ، میرے ماں باپ تم پر قربان" (ارم سعد فداك امی و ابی) (ابن کثیر البدایہ، جلد ہشتم صفحہ ۷۳)

۵۵ - الطبری، تاریخ جلد چہارم، متذکرہ بالاصفحہ ۲۳۶

۵۶ - ایضاً صفحہ ۲۳۵   ۵۷ - ایضاً صفحہ ۲۳۶

۵۸ - اُوپر ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰ تا ۳۰   ۵۹ - اُوپر ملاحظہ ہو صفحہ ۴۴

۶۰ - الطبری صفحات ۲۷۱۰ تا ۲۷۱۲ شبلی الفاروق متذکرہ بالاصفحات ۳۰۴، ۳۰۵

۶۱ - متن میں درج چار الزام معلوم ہوتا ہے یکے بعد دیگرے لگائے گئے تھے حضرت عمرؓ نے ہر ایک کے سرزد ہونے پر اس کا نوٹس لیا۔ آخر کار ان کی بنیاد پر سماعت ہوئی۔

۶۲ - الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۱۵۴ زیر عنوان "حدیث قنسرین"، ۱۷ھ کے واقعات ہیں۔ ابن کثیر نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے "نصاریٰ العرب" (عرب عیسائی) البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۵۲

۶۳ - التاریخ متذکرہ بالا، جلد چہارم صفحہ ۱۵۵ زیر "حدیث قنسرین"

۶۴ - ایضاً   ۶۵ - ابن کثیر البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۵۲

۶۶ - زیر بحث مقدمہ کے مثل مقدمات میں اسلامی فوجی ضابطہ کی حدود قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر مبنی ہیں "پس جب تم کافروں سے میدانِ جنگ میں ملو اُن کی گردنیں اُڑا دو۔ اگر تم اُن پر حاوی آ جاؤ اُنھیں قیدی بنا لو اور اس کے بعد اُن سے حسن سلوک یا فدیہ ہے حتیٰ کہ لڑائی ختم ہو۔" (سورہ محمدؐ ۴۷ : ۴)

۶۷ - الطبری، تاریخ متذکرہ بالا زیر "حدیث قنسرین" جلد چہارم صفحہ ۱۵۵

۶۸ - ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ ایڈیشن بیروت (۱۹۶۵ء، ۱۳۸۵ھ) جلد دوم صفحہ ۵۳۶

۶۹ - ایضاً   ۷۰ - الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۲۰۵ - ابن الاثیر جلد دوم صفحہ ۵۳۶ -

۷۱ - ابن حجر العسقلانی الاصابہ فی تمییز الصحابہ، دار صادر، بیروت، آفسٹ چھپائی مصری ایڈیشن ۱۳۲۸ھ جلد اوّل صفحہ ۴۱۵

ابن کثیر، البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۱۱۵ ۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ زیر نظر ہدایات پہلے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے ایما پر خالد کو دی تھیں لہٰذا "کے" کا مطلب حضرت ابوبکرؓ ہے ۔ یہی اس موقع پر حضرت عمرؓ نے بھی اسے بھیجیں۔

۷۲ ۔ ایضاً ۷۳ ۔ ابن حجر متذکرہ بالا جلد اول صفحہ ۴۱۴

۷۴ ۔ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۲۰۵ ۔ ابن کثیر متذکرہ بالا ۔ جلد ہفتم صفحہ ۱۱۵ ۷۵ ۔ ایضاً

۷۶ ۔ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۵۶ ۔ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ متذکرہ بالا جلد دوم صفحہ ۴۲۷ ۔ ابن کثیر البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۱۸ ۔

۷۷ ۔ الطبری نے اس کا تضاد جلد چہارم میں صفحہ ۵۶ پر ۱۳ھ کے تحت بیان کیا ہے ۔ اور صفحہ ۲۰۵ پر ۱۷ھ کے تحت ۔ ابن الاثیر جلد دوم، صفحہ ۴۲۷ اور پھر صفحہ ۵۳۶ پر ۱۷ھ کے تحت ۔

۷۸ ۔ الطبری، تاریخ جلد چہارم صفحہ ۵۶ ۔

۷۹ ۔ ابن کثیر البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۳ ۸۰ ۔ ایضاً

۸۱ ۔ الطبری متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۵۶ ۸۲ ۔ ایضاً

۸۳ ۔ ایضاً صفحہ ۲۰۵ ۸۴ ۔ ایضاً صفحہ ۵۶

۸۵ ۔ ابن حجر الاصابہ جلد اول ۴۱۵

۸۶ ۔ ابن کثیر باوجود اپنی محتاطی کے اور لوسعت اپنی روایت پسندی ۔ اس نے آگے چل کر الاسمعی کا ایک غیر مستند بیان بھی لکھا ہے جس میں وہ ذکر کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور خالدؓ کے تعلقات اچھے نہ تھے ۔ کیونکہ بچپن میں ایک دوسرے سے کشتی کے دوران خالدؓ نے حضرت عمرؓ کا گھٹنہ توڑ دیا تھا اور یہی وجہ اُن کی دشمنی کی تھی۔ (البدایہ جلد ہفتم صفحہ ۱۱۵ ۔)

۸۷ ۔ الطبری متذکرہ بالا جلد ۵۶

۸۸ ۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳

۸۹ ۔ ایضاً صفحہ ۵۷

۹۰ ۔ ایضاً جلد چہارم صفحہ ۱۵۴

۹۱ ۔ ابن کثیر متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۲۱

۹۲ ۔ ایضاً صفحہ ۲۰

۹۳ ۔ ایضاً

۹۴ ۔ الطبری، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۲۰۵ ۔ ابن الاثیر الکامل متذکرہ بالا جلد دوم صفحہ ۵۳۷ ۔

۹۵ - ایضاً
۹۶ - ایضاً صفحات ۲۰۵ ، ۲۰۶
۹۷ - ابن الکثیر البدایہ متذکرہ بالا جلد ہفتم صفحہ ۹۳
۹۸ - ایضاً صفحہ ۱۰۱
۹۹ - ایضاً صفحہ ۱۱۳
۱۰۰ - الطبری متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۵۶
۱۰۱ -
۱۰۲ - فلپ کے حتی، دی عربز، لندن ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۷ -
۱۰۳ - الطبری ، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۱۵۲- محمد حسین ہیکل؛ الفاروق ، قاہرہ ۱۳۴۹ھ صفحہ ۲۱۷
۱۰۴ - ابن قتیبہ، المعارف ایڈیشن دار الکتب صفحہ ۱۸۸ ، ابن قتیبہ نے ملزم کی نشاندہی اس کے خاندانی نام ابو نجمہ سے کی ہے -
۱۰۵ - مالک بن انس، الموطاء ، جلد دوم
۱۰۶ - الطبری ، تاریخ متذکرہ بالا جلد چہارم صفحہ ۲۳۱ زیر ۲۳ھ ؛

حضرت عمرؓ کا نظامِ عدالت

حضرت عمرؓ کو وقت اور موقع ملا کہ وہ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ رکھنے کے اصول کو مزید ترقی دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں شعبے الگ الگ کر دیئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ابتدائی عہد میں جزیرہ نماعرب میں عام بغاوت اور ارتداد کی جنگ کے باوجود اس اصول پر مناسب توجہ دی گئی۔ حضرت عمرؓ کے عہد تک عرب میں امن وامان قائم ہو چکا تھا اور عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر کی کامیاب فوجی مہموں نے ایک موافق اور سازگار ماحول پیدا کر دیا تھا جس کے تحت تمام خلافت میں مناسب انتظامی اور عدالتی مشینری قائم کی جا سکے۔

زید بن ثابت۔ عدلیہ کے انچارج

پہلا قدم جو حضرت عمرؓ نے انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی کے لیے اٹھایا وہ مدینہ میں حضرت زیدؓ بن ثابت کا بطور جج تقرر تھا۔ آپؓ نے زیدؓ کے لیے ایک رقم بطور تنخواہ بیت المال سے مقرر فرمائی۔[1] اس تقرر کے بیان اور حالات کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیدؓ بن ثابت کو صرف مدینہ کا جج ہی مقرر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اکثر خلیفہ اس سے عدالتی معاملوں میں مشورہ کرتے تھے۔ اس سے ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ خلافت کی عدلیہ ان کے سپرد تھی۔ یہ اس حقیقت سے واضح ہے کہ جب آپؓ کے پاس اہم مقدمات آتے تو آپ اکثر انھیں تصفیہ کے لیے زیدؓ کے سپرد کر دیتے۔ زیدؓ انصار میں سے تھے۔ اور اپنی عدالتی سوجھ بوجھ اور تجربہ اور زیرکی کے باعث خلیفہ نے ان کی غیر معمولی تعریف کی انہوں نے کہا کہ عدلیہ انصار کا حصہ ہے۔[2] حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے کبھی کسی کو عدالتی معاملات میں زید بن ثابت پر ترجیح نہیں دی۔[3] انہوں نے مدینہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے پورے دورِ خلافت میں اور حضرت معاویہؓ کے عہد کے ابتدائی پانچ سال تک بطور جج خدمات انجام دیں۔ ان کا انتقال ۴۵ھ میں ہوا۔[4]

زیدؓ بن ثابت نے عدلیہ میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ ان کے بہت سے اہم فیصلوں کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔ عہد خلافت راشدہ میں عدلیہ کی علیحدگی اور آزادی اس حد تک تھی کہ سربراہ حکومت کو عدالت میں طلب کیا جاتا تھا چنانچہ خود حضرت عمرؓ ان کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ زیدؓ کی عظمت درست اور غیر جانبدار انصاف کرنے میں تھی۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر ہم ایک مقدمہ درج کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ اور اُبیؓ زیدؓ کی عدالت میں

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور اُبیؓ کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا۔ وہ اپنا تنازعہ چکانے کے لئے خلافت کی عدلیہ کے جج زیدؓ بن

ثابت کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ ان کی آمد پر زیدؓ نے از راہِ عزت خلیفہ کو نشست پیش کی حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تم نے پہلے ہم ظلم سے ابتدا کی ہے۔ میں تمہارے پاس ایک سائل کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں۔ اور پھر حضرت عمرؓ ان کے سامنے اپنے فریق مخالف اُبیؓ کے برابر بیٹھ گئے۔ سماعت شروع ہوئی۔ اُبیؓ نے اپنا حق طلب کیا اور حضرت عمرؓ نے اپنا دفاع پیش کیا۔ زیدؓ نے مدعی اُبیؓ سے دو صادق گواہ مانگے اس نے کہا کہ اس کے پاس کوئی شہادت موجود نہیں۔ پھر زیدؓ نے حضرت عمرؓ سے قسم اُٹھانے کے لیے کہا، مگر پیشتر اس کے کہ وہ قسم اٹھاتے زیدؓ اُبیؓ کی طرف متوجہ ہوئے ان سے امیرالمومنین کو قسم اٹھانے سے معاف کر دینے کے لیے کہا۔ حضرت عمرؓ نے مداخلت کرتے ہوئے زیدؓ سے کہا "کیا تم تمام لوگوں کے درمیان یونہی فیصلہ کرتے ہو؟"

زیدؓ نے جواب دیا: "نہیں"۔

حضرت عمرؓ نے کہا: "ہمارے درمیان اسی طرح فیصلہ کرو جیسے دوسروں کے درمیان کرتے ہو"۔

تب زیدؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: "قسم کھائیے اے امیرالمومنین"۔

حضرت عمرؓ بڑبڑائے: "سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز میرے نزدیک خدا کی قسم کھانا ہے"۔ پھر آپ نے ان الفاظ میں قسم کھائی:

"میں خدا کی قسم کھاتا ہوں جس کا کوئی ہمسر نہیں اُبیؓ کا میری زمین پر کوئی حق نہیں"۔ چونکہ مدعی کے حق میں کوئی شہادت موجود نہ تھی مقدمہ اس کے خلاف فیصل ہو گیا۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے مقدمات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین خود عدالتوں میں حاضر ہوئے جس سے انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی ثابت ہوتی ہے دوسرا اصول یہ ثابت ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت اور عام شہری میں عدالتی مساوات تھی۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا تیسرا اصول یہ تھا کہ فیصلہ شہادت اور ثبوت پر ہوتا تھا۔

صوبائی نظام عدالت

حضرت عمرؓ نے مرکزی عدلیہ کے استحکام اور خلافت کے جج کے تقرر کے بعد ججوں کے ایسے ہی تقرر اپنی خلافت کے صوبائی دارالحکومتوں میں بھی کئے۔ یہ صوبائی جج خود مختار تھے اور صرف مرکز عدلیہ کے ماتحت تھے وہ صوبائی گورنروں کے بجائے براہِ راست مرکزی عدلیہ کے تحت فرائض انجام دیتے تھے۔ خلافت کے بعض علاقوں میں انصاف مہیا کرنے سے متعلق کچھ بے ترتیبی ظاہر ہوئی تھی۔ بزرگ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو ان مقامات پر سرکاری کام سے یا ذاتی حیثیت میں گئے ہوئے تھے ان سے مقامی لوگ اپنے تنازعوں میں مشورہ لیتے، اس طرح یہ اصحابؓ عملاً عدالتیں بن گئے تھے۔ جن کو حکومت نے مقرر نہیں کیا تھا۔ پس ایک طرف ان سے اور دوسری طرف سرکاری طور پر مقرر ججوں سے متضاد فیصلے صادر ہوئے لہٰذا حضرت عمرؓ نے ایک حکم جاری کیا جس میں ایسے اقدام سے منع کیا گیا اور لوگوں کو مطلع کیا گیا کہ انصاف کرنا صرف ریاست

کا کام ہے۔ اس طرح بہت اہم اصحابؓ مثلاً عبداللہؓ بن مسعود کو بھی ان معاملات میں جو ان کے پاس لائے جائیں فیصلہ کرنے سے باز رکھا گیا۔ مندرجہ بالا حکم سے عدلیہ اور زیادہ واضح شکل میں نمودار ہوئی اور صوبائی نظام عدالت مستحکم ہوا۔ مندرجہ ذیل اہم جج تھے جن کا تقرر حضرت عمرؓ نے مختلف صوبوں میں کیا تھا۔

ابو قرہ کو کوفہ کا پہلا جج مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے بعد قاضی شریح بن الحارث الکندی آئے۔ قاضی شریح اس عہدہ پر مختلف وقفوں میں ۷۸ھ تک تعینات رہے۔ وہ ایک ممتاز اور ذہین قاضی تھے گو وہ صحابیِ رسولؐ نہ تھے پھر بھی حضرت عمرؓ نے کوفہ جیسے اہم صوبہ کی عدلیہ کی ذمہ دار اسامی انھیں سونپی۔

عبادہ بن صامت فلسطین کے قاضی تھے وہ ان پانچ صحابہ میں سے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پورا قرآن حفظ کیا تھا۔ حضرت عمرؓ ان کے تقویٰ، علم اور عدالتی معاملوں میں عمیق نظری کے باعث ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ابو درداؓ ایک بڑے اور ذی عزت صحابیِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام کے قاضی مقرر کئے گئے تھے۔ صحابہ آپ کی بڑی عزت و عظمت کرتے تھے اور آپ زہد، عدل اور ذہانت کے لیے مشہور تھے۔

ایاس بن صبیح ابو مریم کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا اور کعب بن سوار الازدی ان کے جانشین ہوئے تھے۔ ابو موسیٰؓ الاشعری کے بطورِ عامل بصرہ تقرر پہ ابو مریم کو ماتحت قاضی مقرر کر دیا تھا۔ اور خلیفہ نے ابو موسیٰ کو ابو مریم کے فیصلوں کی نگرانی کرنے کے لیے لکھا۔ صوبائی قاضی عدالتی امور اور فراہمیِ انصاف میں آزاد اور خود مختار۔ انتظامی امور میں وہ عامل صوبہ سے رابطہ رکھتے۔ ابو موسیٰؓ جیسی عظیم فقہی اور عدالتی شخصیت مقدمات میں قانونی اور عدالتی مددگار بھی ثابت ہوتی تھی۔ یہ مشہور اور اہم قاضی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے مختلف صوبوں میں مقرر کیا۔ اس عہد کی ان عظیم ہستیوں کے تقرر سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عمرؓ عدالتی نظام کو ریاست کا بہت اہم فریضہ تصور کرتے تھے اور آپؓ نے اس کام کے لیے سب سے اہل ہستیوں کو مقرر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ایماندار اور قابل ججوں کے تحت عدلیہ نے غیر مسلموں میں بھی ایک وقار حاصل کیا۔

گورنروں اور ججوں کو ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں حضرت عمرؓ نے گورنروں اور ججوں کو متعدد ہدایات جاری کیں۔ آپ انھیں تقرر نامے جاری کرتے جن کی توثیق ایک کمیٹی کرتی تھی۔ آپؓ کی یہ ہدایت تھی کہ سرکاری عمال اپنے اپنے صوبوں کے صدر مقام پہنچنے پر شہریوں کے مجمع عام میں اپنے تقرر کا خط پڑھ کر سنائیں تاکہ وہ ان کے اختیارات اور فرائض سے واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد اگر کوئی اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتا یا لوگوں پر ظلم و ستم کرتا تو وہ اسے روک سکتے تھے اور اگر عامل نہ رکتا تو وہ خلیفہ سے اس کی شکایت کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے عمال کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا۔

"ہوشیار رہو! میں نے تمھیں جابر و ظالم بنا کر مقرر نہیں کیا۔ میں نے تمھیں خدا ترس رہنما مقرر کیا ہے تاکہ تم مسلمانوں کے حقوق محفوظ کرو اور ادا ہوں۔ انھیں ظالمانہ طریقے سے مارو مت کہیں وہ بزدل نہ بن جائیں۔ بہتات سے ان کی بیجا تعریف نہ کرو

کہیں وہ مغالطہ میں نہ پڑ جائیں۔ ان پر اپنے دروازے بند مت کرو کہیں وہ غریبوں کے حقوق غصب نہ کرنے لگیں۔ خود کو ترجیح نہ دو کہیں وہ ان پر ظلم کرنے لگیں۔"[۱۱] یہ سب احتیاطی تدابیر تھیں تاکہ ظلم اور جبر کو روکا جا سکے اور غیر جانبدار انصاف صحیح طور پر اور آزادی سے فراہم ہو سکے۔ تصور یہ تھا کہ عمال ریاست کے علاوہ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کریں۔ گورنروں اور قاضیوں کی روانگی پر آپؓ خود ان کے ہمراہ ہدایت کرتے چلتے :

"اپنے اختیارات سے ہوشیار رہو۔ میں نے تمھیں مسلمانوں کے سروں پر ان کا خون بہانے کے لیے مقرر نہیں کیا اور نہ ان کی عزتوں کی بے حرمتی کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ میں نے تمھیں صرف اس لیے مقرر کیا ہے نماز قائم کرو، ان کے درمیان غنائم تقسیم کرو، ایمانداری سے ان میں انصاف کرو۔" پھر آپؓ انھیں حکم دیتے :

تم ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کرو گے۔ تم نفیس و اعلیٰ پوشاک نہیں پہنو گے نہ باریک پسا آٹا کھاؤ گے اور تم اپنے دروازہ پر پہرہ دار مقرر نہیں کرو گے۔ تم ضرورت مندوں کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھو گے۔"[۱۲]

اپنا عہدہ سنبھالنے کے لئے روانگی کے وقت آپؓ گورنروں اور ججوں کی املاک اور دولت کی فہرست تیار کرتے اور وقتاً فوقتاً یہ دیکھتے کہ انہوں نے ناجائز ذرائع سے اپنی املاک میں اضافہ تو نہیں کیا۔ ایک مرتبہ خالد بن الحارث نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ بعض گورنر آپؓ کے احکامات کی تعمیل نہیں کر رہے۔ تفتیش شروع ہوئی اور جو مجرم پائے گئے ان کی آدھی املاک ضبط کر لی گئی اور بیت المال میں جمع کرا دی گئیں۔"[۱۳] اس کے بعد خلیفہ نے دارالخلافہ سے متعدد ہدایات گورنروں اور قاضیوں کو انصاف کرنے کے لیے بھیجیں۔ آپؓ نے بہت سی تقاریر عوام کے سامنے کیں جن میں عوام کو تعلیم دی اور ان کے حقوق بتائے اور اپنے گورنروں اور قاضیوں کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہوئے خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط ابو موسیٰؓ الاشعری کو لکھا تھا یہ بہت جامع خط تھا جس میں عدلیہ کے بنیادی اصول طریق کار اور قواعد و قوانین موجود تھے۔"[۱۴] یہ خط اس عہد کے عدالتی نظام کی اصل تصویر ہے۔ قرآن تمام عدالتوں کے لئے بنیادی کتاب قانون ہے۔ لیکن اعصار و امصار میں پیدا ہونے والے نئے مسائل کے حل کے لیے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ درپیش مشکلات قرآنی ہدایات کی روشنی میں آسان بنائی جائیں۔ اس لیے قانون الٰہی کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے حضرت عمرؓ نے بہت سے خط اپنے ججوں کو لکھے۔ وہ خط جو آپ نے اپنے مشہور قاضی شریح کو لکھا تھا اس میں تحریر تھا مقدمات کا فیصلہ کرنے میں قرآن کی پیروی کرو اگر کسی مسئلہ میں قرآن میں کوئی وضاحت نہ ملے تو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر سنت میں بھی کوئی حل نہ ملے تو اجماع کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر اجماع میں بھی کچھ نہ ملے تو اپنے اجتہاد سے کام لو۔"[۱۵]

عمرؓ کے مرتّبہ عدالتی اصول

تمہید

دستیاب تاریخی مواد اور تازہ تحقیق کے مطابق حضرت عمرؓ نے خلیفہ کی حیثیت سے ۲۴۵ خطوط اپنے صوبائی گورنروں

ججوں، سالاران فوج، بڑے شہروں کے معززین مختلف علاقوں کے سرداروں کو لکھے اور ان میں سے بعض رومی شہنشاہ کے نام بھی ہیں[۲۱]۔ ابوموسیٰؓ الاشعری کو تقریباً ستر مکتوب ملے جو حضرت عمرؓ کے عمال کو ملنے والے خطوط میں سب سے بڑی تعداد ہے۔ خلیفہ کے لکھے ہوئے خطوط کے تقابلی مطالعے سے پتا چلتا ہے اور یہی نظریہ ابن الجوزی کا بھی ہے کہ ابوموسیٰ کے نام خطوط مواد کے لحاظ سے سب سے قیمتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم موضوعات عدالتی، قانونی، انتظامی، اخلاقی اور سیاسی پر بحث ہے اور ان میں متنوع مفصل مباحث ہیں۔

ان خطوط میں سب سے اہم اور مشہور ترین وہ خط ہے جو حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ الاشعری کو لکھا تھا۔ ابن الحدید، النویری اور راغب الفقیہ کے مطابق ابوموسیٰ اس وقت بصرہ کے گورنر عامل اور قاضی تھے[۲۲]۔ یہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا انتہائی اہم صوبہ تھا۔ یہ خط جو انصاف کے نفاذ اور طریقہ سے متعلق ہدایات پر مبنی ہے اس موضوع پر دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی یہ اہم ترین دستاویز ہے جو اسلامی ادب عدلیہ میں ملتی ہے۔ اس نے تمام قدیم مسلم فقہا کی توجہ حاصل کی ہے۔ اس پر اکثر تبصرہ ہوا ہے اور مشہور ماہرین قانون نے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً ابن القیم نے اپنی بسیط کتاب اعلام الموقعین کا بہت بڑا حصہ اس کے مطالعہ پر مخصوص کیا ہے۔ اسی طرح ابن فرحون نے اس دستاویز کا تفصیلی تجزیہ اپنے تبصرۃ الحکام میں کیا ہے اور اس کے مشمولات پر تفصیل بحث کی ہے۔ یہ خط اسلامی ادبی دور کی ابتدا سے اسلامی لٹریچر کے ہر میدان میں نقل ہوا ہے خواہ وہ تاریخی ہو یا قانونی، عدالتی یا ادبی مضامین کے مجموعے ہوں۔

اس مکتوب کی اس اہمیت نے ماضی قریب میں مستشرقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ انہوں نے اس کے تنقیدی مطالعہ پر خاصا وقت صرف کیا ہے اور اس کے متن کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ ہر قسم کی تحقیقی تکنیک اور طریق تصنیف، تاریخی، اشتقاقی، قانونی، عدالتی اور ادبی استعمال کرتے ہوئے تقریباً سب نے متفقہ طور پر اس کی صحت پر شبہات ظاہر کر کے اسے مشتبہ قرار دینے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد دوہرا معلوم ہوتا ہے: اول وہ حضرت عمرؓ کی ذات کی عظمت کے خلاف ہیں مگر ان کی طرف سے یہ اہم اور قیمتی مکتوب دیکھ کر ان کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہتی دوسرے انہیں اس بات کا ثبوت درکار ہے کہ ابتدائی تاریخ اسلام میں سرے سے کوئی عدالتی نظام تھا ہی نہیں وہ کم و بیش ایک وحشیانہ نظام تھا اور یہ کہ یہ مکتوب بہت بعد میں گھڑا گیا اور مسلمان فقہاء اور مؤرخین نے اسے زمانۂ قدیم کا ظاہر کر کے حضرت عمرؓ سے منسوب کر دیا تاکہ اسلام کی شان بڑھا سکیں۔ ایمل تیان جو بیروت یونیورسٹی میں شعبہ قانون و اقتصادیات کے پروفیسر ہیں اس نظریہ کے سب سے نمایاں وکیل ہیں۔ اس نے اپنی کتاب

"Histoire De L' Organisation Judiciaire En Pays D' Islam" (Leiden F J. Brill, 1960)

میں بہت سی دلیلیں بعض جدید مسلم مصری لکھنے والوں سے مستعار لی ہیں مثلاً محمود بن محمد بن عرنوس اور علی عبدالرازق نے جو شکوک و شبہات پیدا کئے وہ مستشرقین کے لیے بے حد مرغوب ہیں۔

مؤخر الذکر نے اپنی کتاب "الاسلام و اصول الحکم" میں یہ پُرزور دعویٰ کرتے ہوئے کہ ریاست قائم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا منصب نہیں تھا اور بہت تقرر ہو آپؐ نے گورنروں اور ججوں جیسے عہدوں پہ گئے ان کا انکار کرتے ہوئے ابوموسیٰ الاشعری کے یمن میں بطور گورنر و جج تقرر پر شک ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح مرگولیس نے دعویٰ کیا ہے کہ ابوموسیٰ کو کوفہ میں حضرت عمرؓ نے نہیں حضرت عثمانؓ نے گورنر مقرر کیا تھا۔ اس لیے اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ خط کبھی بھی حضرت عمرؓ کی طرف سے ابوموسیٰ الاشعری کو نہیں لکھا گیا۔ یوں ان مصنفین نے قیاس اور دوسروں کے لیے اس دعوے کا جواز پیدا کیا ہے کہ ابوموسیٰ، حضرت عمرؓ کے اس مکتوب کا مکتوب الیہ عدالتی اور قانونی تجربہ نہ رکھتا تھا۔ اور اس لیے اس خط کے تکنیکی نکات اور اس کے مضمرات سمجھنے اور ان کا اطلاق کرنے کا پوری طرح اہل نہ تھا۔

مندرجہ بالا پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے منطقی طور پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتوب پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے ابوموسیٰ الاشعری کا کردار بیان کرنے کے لیے کچھ وقت صرف کیا جائے تاکہ دیکھا جا سکے کہ آیا وہ اسلامی عدالتی ادب کی اس اہم دستاویز کا مکتوب الیہ ہونے کے لیے ضروری قانونی اور عدالتی علمیت اور تجربہ رکھتا بھی تھا یا نہیں۔

ابوموسیٰ الاشعری

ابوموسیٰ کا پورا نام عبداللہ بن قیس بن سلیم بن حضار بن حرب بن عامر بن عنز بن بکر بن عامر بن عذر بن وائل بن نجیہ بن الجماہر بن الاشعر تھا۔ اپنے وطن یمن سے ابوموسیٰ ایک مرتبہ مکہ آیا جہاں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کی بابت سنا۔ انہوں نے نیا دین مسلمانوں کی پہلی ہجرت حبشہ سے پہلے ہی قبول کر لیا۔[19] اسلام کے وہ ابتدائی ایام مومنوں کے لیے سخت ترین تھے خصوصاً مکہ میں غیر ملکیوں کے لیے تو انتہائی اذیت ناک تھے۔ باوجود ان تمام مصائب کے ابوموسیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سعید بن العاص بن امیہ کی پناہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں انہوں نے مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں بیٹھ کر اسلام کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ جب مکہ والوں کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی دشمنی مومنین کی ایذا رسانی پر منتج ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر ابوموسیٰ پہلی ہجرت حبشہ میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصہ نجاشی کے ملک میں ٹھہرنے کے بعد انہوں نے اپنے وطن واپس جانے کی اجازت طلب کی۔ اپنے قیام یمن کے دوران انہوں نے اپنا تمام وقت تعلیم و تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا۔ وہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح خیبر کے موقع پر آن ملے۔ اس کے بعد سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہ کر قانونِ اسلامی کے اہم مسائل سیکھتے اور ان پر بحث کرتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے اپنے آپ کو صفِ اول کے فقیہ کے طور پر صحابہ رسولؐ میں نمایاں کر لیا اور امت مسلمہ کے چھ بہترین قانون دانوں میں شمار ہونے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ ایک نمایاں سپاہی بھی تھے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگی لقب "سید الفوارس" عطا ہوا جو ان کی بہادری کی علامت اور اعتراف تھا۔

ابوموسیٰ بطورِ قاضی یمن

باذان گورنر یمن کی موت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کو دس علاقوں میں بانٹ دیا اور ہر علاقہ کا ایک الگ

عامل مقرر کیا۔ کیونکہ یمن مسلم ریاست کا بہت نمایاں اور اہم صوبہ تھا صف اوّل کے چھ اسلامی قانون کے فقہا میں سے معاذ بن جبل، علی بن ابی طالبؓ اور ابو موسیٰ الاشعری اس کے تین علاقوں میں مقرر ہوئے۔ ابو موسیٰ الاشعری جو بہت ممتاز فقیہہ اور اسلامی قانون کے نمایاں عالم تھے ان کو مارب کا علاقہ دیا گیا۔ عدالتی اور انتظامی مقدمات جن کا فیصلہ ابو موسیٰ نے یمن میں بطور قاضی کیا ان کی اعلیٰ قانونی مہارت عدالتی طریق کار اور ہنرمندی کے ساتھ ساتھ ان کا اسلامی قوانین کے مأخذ کا مکمل علم ظاہر کرتے ہیں۔

بعض جدید محققین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظامی اور عدالتی اقدامات واضح معلوم نہیں ہوتے خصوصاً علی عبدالرازق اور ایمل تیاں جیسے مصنفین مطمئن نہیں۔ علی عبدالرازق تفصیل سے معاذ بن جبل اور علی ابن ابی طالب کے تقرر پر بحث کے بعد نشاندہی کرتا ہے کہ ایک ہی شخص کے سپرد مختلف فرائض عامل قاضی، مبلغ وغیرہ بیک وقت تھے۔ لہٰذا ان بیانات کو متضاد تصور کرتے ہوئے اس نے پوری طرح انھیں مسترد کر دیا ہے۔ اس کے خیال سے یہ تقرر کبھی ہوا ہی نہیں۔ لہٰذا وہ مشہور آئینی اور عدالتی مکالمہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معاذ بن جبل کے درمیان مؤخر الذکر کے تقرر کے وقت اس کو اسلامی قانون کے مأخذ بتاتے اور نئے ابھرنے مسائل میں قرآن اور سنت رسولؐ سے استنباط کے اصول سمجھاتے ہوئے ہوا تھا۔ ایک تاریخی فسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ علی عبدالرازق کے اس دعویٰ سے تیاں نے اخذ کیا ہے کہ چونکہ ابو موسیٰ الاشعری کا تقرر بطور قاضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا اس لیے اسے کوئی عدالتی تجربہ نہ تھا۔ لہٰذا ابو موسیٰ کو سب سے اہم دستاویز جس میں انتہائی تکنیکی عدالتی ہدایات تھیں ملنے کا کوئی جواز ہی نہیں

لیکن کسی واقعہ یا حقیقت کو مسترد کرنا کیونکہ اس کے متعلق متضاد بیانات ہیں تاریخی تحقیق کے تمام اصولوں اور علمی اعتراضات کے قاعدوں کے منافی ہے۔ بہت سے تاریخی واقعات نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ دوسری جگہ بھی ہیں جن کے متعلق خلط ملط کرنے والے بیانات ہیں لیکن ان کو بطور واقعات مسترد نہیں کیا گیا ہے۔ کسی تاریخی واقعہ کا ابطال اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کے خلاف مدسے زیادہ شہادت دستیاب ہو ورنہ اس کی تشریح کرنا ضروری ہے۔

موجودہ معاملہ میں کوئی مشکلات نہیں۔ ہم یمن میں اس انتظامی بندوبست کے حقائق پہلے ہی بیان کر چکے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ایک ہی شخص کو مختلف فرائض سونپے گئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے تضاد کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ ریاست کے انتظام کے ابتدائی دنوں میں انتہائی کفایت شعاری، جو کسی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان خصوصیات کے حامل بہت سے افراد حاصل نہیں ہو سکتے لہٰذا کئی بڑے مناصب ایک ہی شخص کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ یہی کچھ ابتدائے بازنطینی حکومت میں ہوا اور یہی کچھ ابتدائے اسلام میں بھی ہوا کسی علاقہ کے عامل کو اکثر دفاعی اہتمام، امن وامان قائم رکھنے، انصاف کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کے لیے کہا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ اسلامی ریاست ایک مذہبی تحریک کے نتیجہ میں وجود میں آ چکی تھی ان عاملوں کو اکثر مبلغ بنا کر بھی بھیجا جاتا تھا اور ان کے فرائض کے اس گوشہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت وعزت دی جاتی تھی۔

اب یہ ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ معاذؓ بن جبل، علیؓ بن ابی طالبؓ اور ابو موسیٰؓ الاشعری رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین صحابہ تھے ۔ وہ دور دور تک اپنے تقویٰ علم اور قانونی مہارت کے لیے مشہور تھے۔ اس لئے اگر یہ لوگ بیک وقت کئی فرائض پر یمن کی انتظامیہ میں مامور کئے گئے تو اس میں کوئی الجھن یا تعجب کی بات نہیں۔

فی الوقت ہم ابتدائے اسلام میں قانونی معمولات اور اداروں کے ارتقاء پر غور کر رہے ہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاذؓ اور ابو موسیٰ الاشعریؓ کے یمن میں تقرر کا انکار اپنے ساتھ پہلے سے سوچا سمجھا نتیجہ رکھتا ہے کہ چونکہ یہ واقعات درست نہیں تھے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی معاذؓ سے عدالتی طریق کار کے متعلق گفتگو نہیں فرمائی اور نہ ہی ابو موسیٰ کو عدالتی نظام کا کوئی تجربہ اپنے تقرر بطور قاضی بصرہ سے پہلے تھا۔ لیکن تاریخ گھڑی نہیں جا سکتی اور ایک ثابت شدہ واقعہ کو جھٹلانا تاکہ دوسرا ثابت شدہ واقعہ غلط کہا جا سکے ناقابل معافی ہے ۔ لہٰذا ہم ثابت کرتے ہیں کہ یہ تینوں افسران یقیناً یمن کی عدلیہ میں مامور کئے گئے تھے اور مختلف فرائض ادا کرتے رہے تھے اور اکثر اپنے منصبی فرائض کے علاوہ ذمہ داریاں نباہتے رہے جو بعد کی تاریخ میں الگ عمال کو سونپے گئے۔

ایسے ججوں کے تقرر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ہدایات دیتے تھے کہ مقدمہ کا فیصلہ کس طرح کریں، طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے اور مختلف قسم کے لوگوں سے مختلف علاقوں میں کس طرح بنٹا جائے ۔

ابن ہشام اور بخاریؒ بیان کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل کے یمن میں تقرر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت کی: "ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اور ترشی نہ کرنا۔ ان کو خوش روئی سے مائل کرنا اور بد مزاجی سے انھیں دور نہ کرنا۔ تم جلد ہی ایک اہل کتاب قوم کی طرف جا رہے ہو جو تم سے پوچھیں گے "جنت کی کنجی کونسی ہے" انہیں بتانا: یہ شہادت دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس کا کوئی شریک نہیں[۲]"۔

ایک اور بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے کہا:

"جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو گا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟"

معاذؓ نے جواب دیا: "میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: "اگر کتاب اللہ میں تمھیں اس کے متعلق کچھ نہ ملے پھر؟"

معاذؓ نے جواب دیا: "تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: "اگر تمھیں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کچھ نہ ملے اور نہ کتاب اللہ میں پھر؟"

معاذؓ نے جواب دیا: "میں اپنی اجتہادی رائے استعمال کروں گا اور اس کے لیے پوری طرح غور کروں گا۔"

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اس کے سینہ پر رکھا اور فرمایا: "الحمد للہ کہ اس نے پیغامبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا با اصول بنایا جو رسول خدا کی مرضی کے مطابق ہے[۲۱]۔"

یمن کے ایک اور صوبہ میں حضرت علیؓ کے تقرر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نصیحت کی اور مندرجہ ذیل ہدایات دیں:

" لوگوں کو قرآن اور اسلامی قوانین کی تعلیم دینا اور ان کے تنازعے طے کرنا ۔ دینی مالی واجبات کی جو رقم یمن کے عمال اکٹھی کریں اسے ایک جگہ جمع کرنا ۔ جب دو شریک نزاع تمہارے پاس آئیں تو اس وقت تک فیصلہ مت کرنا جب تک تم دونوں فریق کے دلائل نہ سن لو

اور معاملہ کو صاف صاف نہ سمجھ جاؤ۔"

ابو موسیٰ بطور عامل عراق

یمن میں عامل اور جج کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اپنے تقرر کے وقت سے ابو موسیٰ اپنی انتظامی اور عدالتی ذمہ داریاں تقریباً دس سال تک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے تحت پوری کرتے رہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ کسی عامل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اعتماد اتنے طویل عرصہ تک حاصل رہا ہو۔ دراصل اپنے عہدہ پر ان کا اتنے عرصہ قیام بذاتِ خود ہی ابو موسیٰ کی عدالتی اور انتظامی امور میں دیانت، ایمانداری، اہلیت اور قابلیت کا بڑا اعتراف ہے۔ ۱۷ھ میں ایک بہت قابل اور تجربہ کار گورنر مغیرہؓ بن شعبہ کی بصرہ کی گورنری سے برطرفی پر حضرت عمرؓ کو مغیرہ کا جانشین تلاش کرنے میں دشواری پیش آئی۔ طویل غور و خوض اور مشاورت کے بعد ابو موسیٰ الاشعری ہی واحد آدمی نظر آیا جو بصرہ کے معاملات سے نپٹ سکتا تھا، امن و امان قائم رکھ سکتا تھا، کمزوروں کے حقوق کا طاقتوروں کے مقابلہ میں تحفظ کر سکتا تھا اور راہزنوں اور اصفہان فتح کرنے کیلئے جہاد کر سکتا تھا۔

ابو موسیٰ کو مکمل انتظامی اور عدالتی اختیارات دیئے گئے تھے۔ اپنے تقرر پر اسے ایک خط دیا گیا تھا جس میں اس کے تقرر کی شرائط درج تھیں۔ ایک بہت تجربہ کار عامل اور مشہور فقیہہ اور اسلامی قوانین کا عالم ہونے کے باعث ابو موسیٰ نے اس نئے صوبے کا انتظام بڑی قابلیت اور حکمت و تدبر سے کیا اور لوگوں سے ایسا سلوک کیا کہ وہی عراقی جنہوں نے ان کے پیش رو کو زنا کے الزام میں برطرف کرا دیا تھا ابو موسیٰ سے اس قدر خوش اور اس کے وفادار ہو گئے تھے کہ انہوں نے اس کی جگہ عمار بن یاسر کا تقرر پسند نہیں کیا اور خلیفہ پر زور دیا کہ ابو موسیٰ کو ان کے عامل کے طور واپس لائیں۔ وہ اپنے عہدہ پر حضرت عمرؓ کے سارے دور میں رہے اور اس دوران حضرت عمرؓ نے انھیں مشہور خط لکھا جس میں ہدایت تھی کہ عدالتی معاملات کس دستور کے مطابق نپٹائیں۔

یہ مختصر حالات ابو موسیٰ کی اہم شخصیت کا خود واضح ثبوت ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنجیدہ شاگرد کی حیثیت سے کیا۔ اور جلد ہی خود کو صحابہ رسولؐ میں نمایاں کر دیا اور قانون اسلامی کے چھ چیدہ ماہرین میں شمار ہونے لگے۔ رسول اللہؐ نے انھیں یمن کے ایک اہم صوبہ کا قاضی مقرر فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں ان کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ خلیفہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں وہ عدالتی عہدہ پر یمن ہی میں تھے۔ جب عراق فتح ہوا اور کوفہ و بصرہ جیسے بڑے شہر آباد ہوئے تو امن و امان قائم رکھنے کے لیے ان نئے صوبوں میں اہل آدمیوں کی ضرورت تھی۔ کوفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معتمد صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اس علاقہ کے فاتح کی عملداری میں تھا۔ بصرہ مغیرہ بن شعبہ کو سونپا گیا تھا اور ان کی برطرفی کے بعد خلیفہ کی نظر میں واحد اہل آدمی ابو موسیٰ الاشعری تھا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت عمرؓ کے وقت تک انتظامیہ اور عدالتی نظام کا تجربہ تھا۔ ایک ذہین اور سمجھ دار آدمی ہونے کے باعث اس وسیع تربیت اور تجربہ نے اسے حضرت عمرؓ کی خلافت کا سب سے اہل اور قابل ترین عامل اور جج بنا دیا تھا۔ ابتدائی دور خلافت کے اختتام تک ابو موسیٰؓ عوام کی نظر میں اخلاقی دیانت داری اور عدالتی غیر جانبداری کے لیے مقبول ہو چکے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پرشورش زمانہ میں وہ کوفہ کے گورنر ہی رہے اور باوجود اہم سیاسی اختلافات

سے کے جو سارے مملکت میں پھوٹ پڑے تھے ابو موسیٰ اپنے عہدہ پر رہے اور انہوں نے نہ صرف اپنی شہرت ایک ایماندار خادمِ اسلام کے طور قائم رکھی اور اپنے علاقہ میں امن رکھا بلکہ بڑی ذمہ داری اور احساسِ انصاف و معدلت کے ساتھ انصاف کرتے رہے۔

جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور امت کئی گروہوں میں بٹی ہوئی تھی اس دوران وہ ان سب سے الگ رہے انہوں نے یہ علیحدگی سادہ لوحی کے باعث نہیں بلکہ اپنی عظیم دانائی اور احساسِ انصاف کے باعث اختیار کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ، زبیرؓ بن عوام اور طلحہؓ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے انھیں برطرف کر دیا۔ کسی اور گروہ میں شامل ہونے کے بجائے وہ حجاز چلے گئے اور سیاسی فضا صاف ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

اتفاقاً یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے دومۃ الجندل کی مشہور ثالثی عدالت میں اپنے مقدمہ میں انہیں نمائندہ بنانے سے انکار کر دیا تھا۔[۲۲] انھیں خوف تھا کہ کہیں ابو موسیٰؓ ان کے خلاف نہ ہو جائیں۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کوفہ کی گورنری سے اپنی برطرفی کے بعد معاویہؓ نے ان کے بیٹوں کو دو اہم صوبوں کی گورنری کی پیش کش کی اور ایک اعلیٰ عہدہ خود ان کو پیش کیا۔ بشرطیکہ وہ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ لیکن اپنی اخلاقی دیانتداری اور عدالتی غیر جانبداری کے باعث انہوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی اور کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں جس کی پیش کش تم نے کی ہے۔"

لہٰذا یہ مؤرخین کی بڑی بے انصافی ہے کہ ابو موسیٰؓ کے کردار کو مسخ کر کے انہیں ایک سادہ لوح اور حکمت و تدبر سے عاری ظاہر کریں جو فنِ سفارت اور سیاسی اونچ نیچ کو سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عراقیوں کو یقین تھا کہ ابو موسیٰؓ کی صلاحیت کا آدمی ہی جو عدالتی نظام کا وسیع تجربہ رکھتا تھا اور لوگوں کے معاملات سے بخوبی واقف تھا صورتِ حال سے صحیح نپٹ سکتا تھا اور بنو امیہ کی سازباز میں مزاحم ہو سکتا تھا۔ رائے عامہ ریاستی سفارت کے اہم امر کی انجام دہی کے لیے کسی گوشہ نشین کو نہیں چن سکتی۔ ابو موسیٰ جیسے ذہین، احساسِ عدل کے مالک اور سیاسی سوجھ بوجھ کے شخص کے لیے اس سے بڑا کیا خراج ہو سکتا ہے جو اسے حضرت علیؓ کے سب سے وفادار ساتھیوں میں سے ایک نے اس وقت دیا جب مصالحت کی دستاویز پر صفین میں دستخط ہوئے۔

آخر میں یہ قابلِ غور ہے کہ حضرت عمرؓ نے کیوں ابو موسیٰؓ کو اپنے ماتحت کام کرنے والے تمام نمایاں ججوں میں سے عدالتی طریق پر ان کی مشہور ہدایات پانے کے لیے چنا تھا۔ اس کا جواب تلاش کرنا مشکل نہیں۔ ابو موسیٰؓ عہدِ رسالت میں قبولِ اسلام کے بعد مستقلاً حضرت عمرؓ کے عہد کے دوران ریاست کی نمایاں شخصیت رہے۔ عمروؓ بن العاص کی شہادت موجود ہے کہ وہ ایک بزرگ اور مؤقر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انھیں یمن کے ایک اعلیٰ عہدہ کے لیے چنا پھر حضرت عمرؓ نے انھیں ایک تجربہ کار اور اپنے عہد کے آزمودہ شخص کی حیثیت سے چنا ایسا شخص جو اپنی سیاسی فراست، عدالتی باریک بینی اور اخلاقی دیانتداری کے لیے شہرت عام رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں مختلف اوقات میں دو اہم شہروں کوفہ اور بصرہ پر اختیار دیا گیا۔ اس دور میں یہ یکتا عزت تھی ان کی مستقل شہرت، اخلاقی اور ذہنی خوبیوں نے ہی بظاہر وہ بہترین شخص قرار دیا جو خلیفہ کی خصوصی توجہ حاصل کرے اور جن کے ذریعہ آپؓ نے اہلِ عراق کو عدالتی طریق کار اور نظام پر اہم اصولوں کی دستاویز ارسال کی۔ اسی نوعیت کے مختصر خطوط دوسرے گورنروں اور ججوں کو بھی لکھے گئے لیکن مکمل اور مفصل ہدایات صرف ابو موسیٰؓ الاشعری ہی کو جاری

کی گئیں کیونکہ وہ انھیں بہتر سمجھ سکتے تھے اور ان پر عمل کر سکتے تھے۔

ابو موسیٰؓ الاشعری کے کردار کے تفصیلی بیان کے لئے تشریحات ملاحظہ کیجئے۔[۲۴]

حضرت عمرؓ کا خط بنام ابو موسیٰ الاشعریؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے وقتاً فوقتاً اپنے تمام گورنروں اور ججوں کو ہدایات جاری کیں۔ وہ ہدایت کا خط جو خلیفہ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ الاشعری کو اس وقت بھیجا جب انھیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا سینکڑوں مکاتیب اور ہدایت ناموں میں ایک ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں اور ججوں کو بھیجے۔

حضرت عمرؓ کا عدالتی اصول اور طریق کار سے متعلق ہدایات کا خط جو ابو موسیٰ الاشعری کے نام تھا ابتدائی اسلامی تاریخ قانون اور ماخذ میں ملتا ہے۔ گو تمام ماخذ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ بعض اہم ابتدائی مصنفین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم ان باتوں پر ہم اس وقت بحث کریں گے جب ہم اس خط کی داخلی و خارجی شہادت کے مواد پر غور کریں گے۔ فی الحال یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس دستاویز کا ذکر شروع کے مصنفین کی بڑی تعداد نے کیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا حوالہ مالک بن انس (۱۷۹ھ) کی موطا کتاب ۳۶ باب ۲ میں اور پھر ابو یوسف (۱۱۳-۱۸۲ھ) کی کتاب الخراج (صفحہ ۶۲، ایڈیشن قاہرہ ۱۳۰۲ھ) میں ملتا ہے گو صرف چند متعلقہ جملے ہی درج کئے گئے ہیں۔ مکمل شکل میں خط کا متن تاریخی ترتیب سے مندرجہ ذیل کتب میں دیا گیا ہے۔[۲۵]

الجاحظ (۱۵۰-۲۲۵ھ) البیان والتبیین، جلد دوم صفحہ ۴۸ ایڈیشن قاہرہ ۱۹۴۸ء-۱۳۶۷ھ۔

المبرد (۸۵-۲۱۰ھ) کامل، جلد اول صفحہ ۱۴ ایڈیشن مصر ۱۳۵۶ھ۔

ابن قتیبہ (۲۱۳-۲۷۶ھ) عیون الاخبار، جلد اول صفحہ ۶۶ ایڈیشن قاہرہ ۱۳۴۳ھ۔

البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) مخطوطہ ریئس الکتاب، استنبول، انساب الاشراف جلد دوم صفحہ ۶۲۳۔

الوکیع (متوفی ۳۰۶ھ) اخبار القضاۃ جلد اوّل صفحہ ۷۰ ایڈیشن ۱۳۶۶ھ قاہرہ۔

ابن عبد ربہ (۲۴۶-۳۲۸ھ) عقد الفرید جلد اوّل صفحہ ۱۰۰ ایڈیشن ۱۳۵۹ھ قاہرہ۔

ابو الحسن علی البغدادی الدارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) سنن الدارقطنی ۲: ۵۱۲

الماوردی (۳۶۲-۴۵۰ھ) الاحکام السلطانیہ صفحات ۱۱۹-۱۲۱ ایڈیشن ENGER

ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) النبذ فی اصول الفقہ الظاہری صفحات ۵۱-۵۲، الاحکام فی اصول الاحکام جلد ہفتم

ابو بکر البیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) سنن الکبریٰ جلد دہم صفحہ ۱۱۹

ابن عبد البر (متوفی ۴۶۳ھ) جامع بیان العلم جلد دوم صفحہ ۶۶

الشیرازی (متوفی ۴۷۶ھ) طبقات الفقہا صفحہ ۷ ایڈیشن بغداد ۱۳۵۶ھ

السرخسی (متوفی ۴۸۳ھ) المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۶۸

ابن ابی الحدید (متوفی ۶۵۵ھ) شرح نہج البلاغہ -

النویری (متوفی ۷۳۲ھ)، نہایۃ الارب، جلد ششم صفحہ ۲۵۷ -

ابن القیم (متوفی ۷۵۱ھ) اعلام الموقعین ۱ : ۳۰ -

الزیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) نصب الرایہ ۴ : ۶۳ -

ابن خلدون (۷۳۲-۸۰۸ھ) مقدمہ صفحہ ۲۲۱ ایڈیشن بیروت ۱۹۰۰ء -

القلقشندی (متوفی ۸۲۱ھ) صبح الاعشیٰ ۱۰ : ۱۹۳ -

علی المتقی (متوفی ۹۷۵ھ) کنز العمال جلد سوم -

خط کا حوالہ متعدد دیگر مؤرخین، محدثین اور فقہا نے بھی اپنی کتب میں دیا ہے۔ بعض متون میں غیر محتاط کمی بیشی ہے لیکن مصنفین کی ایک بڑی تعداد کا متن کم و بیش یکساں ہے خصوصاً ابتدائی مصنفین کی تصنیفات میں اس کا التزام ہے۔ ان کے درمیان بھی اختلاف ہیں لیکن وہ لفظی نوعیت کے ہیں اور مطلب و انداز کے لحاظ سے کوئی بڑا فرق نہیں۔ ان متون میں سے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد جاحظ، مبرد اور ابن قتیبہ کے ہیں - مارگولیتھ نے ابن قتیبہ کا متن استعمال کیا ہے[۲] تاہم موجودہ مصنف کے نزدیک جاحظ کا متن زبان، عدلیہ اور دیگر نظریات کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ ذیل میں ہم یہ متن اور اس کا ترجمہ دے رہے ہیں اور جہاں مناسب اور ضروری ہوگا ہم اس کے مختلف متن بھی دیں گے :-

رسالة عمر رضی اللہ عنہ الی ابی موسی الاشعری

رواہا ابن عیینة و ابوبکر الہذلی و مسلمة بن محارب، رووہا عن قتادة ۔ و رواہا ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، عن عبید اللہ بن (ابی) حمید الہذلی عن ابی الملیح بن اسامة الہذلی ان عمر بن الخطاب کتب الی ابی موسی الاشعری :—

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ اما بعد :

فان القضاء فریضة محکمة، و سنة متبعة ۔

فافہم ۱، اذا ادلی الیک ۲، فانہ لا ینفع تکلم بحق لا نفاذ لہ ۳ ۔

آس بین الناس ۴، فی مجلسک و وجہک ۵، حتی لا یطمع شریف فی حیفک، و لا یخاف ۶ ضعیف من جورک ۔

البینة ۷ علی من ادعی و الیمین علی من انکر ۔

والصلح جائز بین المسلمین ۸ الا صلحا ۹ حرم حلالا او احل حراما ۱۰ ۔

ولا یمنعنک ۱۱ قضاء قضیته بالامس ۱۲ فراجعت ۱۳ فیه نفسک ۱۴ ، و هدیت فیه ۱۵ لرشدک ، ان ترجع عنه ۱۶ الی الحق فان الحق ۱۷ قدیم ، و مراجعة ۱۸ الحق خیر من التمادی فی الباطل ۔

الفہم الفہم عند ما یتلجلج ۱۹ فی صدرک ، مما لم ۲۰ یبلغک فی کتاب اللہ ولا فی سنة النبی صلی اللہ علیه وسلم ۔ اعرف ۲۱ الامثال والاشباه ، وقس الامور ۲۲ عند ذلک ، ثم اعمد ۲۳ الی احبہا الی اللہ واشبہہا ۲۴ بالحق فیما تری ۲۵ ۔

واجعل للمدعی حقا غائبا او بینة ، امدا ۲۶ ینتہی الیه ، فان احضر بینته اخذت ۲۷ له بحقه ، و الا وجہت ۲۸ علیه القضاء ، فان ذلک انفی للشک ، و اجلی للعمی ، و ابلغ فی العذر ۔

المسلمون ۲۹ عدول بعضہم علی بعض ، الا مجلودا فی حد ، او مجربا ۳۰ علیه شہادة زور ، او ظنینا فی ولاء او قرابة ؛

فان ۳۱ اللہ قد تولی منکم السرائر ، و درأ عنکم بالبینات و الایمان ۔

ثم ایاک و القلق و الضجر ، و التاذی بالناس ، و التنکر ۳۲ للخصوم فی مواطن الحق ۳۳ ، التی یوجب اللہ بہا الاجر ، و یحسن بہا الذخر ۔

فانه من یخلص نیته فیما بینه و بین اللہ تبارک و تعالی ۳۴ ، ولو علی نفسه ، یکفه اللہ ما بینه و بین الناس ، و من تزین للناس بما یعلم اللہ منه خلاف ذلک ہتک اللہ ستره ، و ابدی فعله ۳۵ ۔

فما ظنک بثواب غیر اللہ فی عاجل رزقه ، و خزائن رحمته ۔ و السلام (علیک)

VARIOUS READINGS

A = Ibn ‘Abd Rabbihī
B = Balādhurī
D = Dārquṭnī
K = Ibn Khaldūn
M = Mubarrad
Ma = Māwardī
Q = Ibn Qutaybah

1. B.	ويفهم
2. A adds	الخصم
3. B.	وانفذ الحق اذ وضع لک
4. B.	و آس بين الخصوم
M. Ma.	في وجهک و عد لک و مجلسک
5. B. D.	فی مجسلک و وجہک و عد لک
K.	فی وجہک و مجسلک و عد لک
6. B. K. M. Ma. Q.	ولاييأس ضعيف من عد لک
7. B.	واعلم ان البينة علی من ادعی واليمين علی من انکر
8. B. Q.	والصلح جائز بين الناس
9. B.	الا ان يکون صلحا
10. A. D. K. M. Ma. Q.	احل حراما او حرم حلالا
11. A. D. K. Ma.	ولا يمنعک
K. Ma.	امس
A.	ثم راجعت
12. B. M.	اليوم
13. D.	راجعت
K.	فراجعت اليوم فيه عقلک
14. M. Ma.	فراجعت فيه عقلک
15. B. Q.	وهديت لرشدک
B.	ان تراجع فيه الحق
D.	ان تراجع الحق
B.	فان الحق قديم لا يبطله شئی
B. adds	ان
16. K. M. Ma.	ان تراجع الی الحق
Q.	ان ترجع الی
A.	ان ترجع عنه
17. Q.	ان الحق لا يبطله شئی

18. واعلم ان مراجعة الحق خير من التمادي في الباطل

A. والرجوع اليه خير من التمادي على الباطل

Ma. Q. فيما تلجلج

B. مماليس في قرآن ولا سنة مما لم يبلغك به كتاب الله ولا سنة نبيه صلى الله عليه وسلم

Ma. مماليس في كتاب الله تعالى ولا سنة نبيه

19. D. فيما يختلج في صدرك

20. Q. مما ليس فيه كتاب ولا سنه

K. M. مما ليس كتاب ولا سنه

D. مما لم يبلغك في الكتاب او السنه

21. M. Q. و اعرف الاشباه و الامثال

D. Q. ثم in place of و

D. ف in place of ثم before اعمد

M. فقس

M. ثم اعمد الى اقربها الى الله

D. فاعمد الى احبها الى الله

22. B. عند ذلك و قس الامور

K. Ma. و قس الامور بنظائرها

23. Q. ثم اعمد لاحبها الى الله

A. ثم اعمد الى احبها عند الله و رسوله

K. Ma, Omit the whole sentence and omit فيما ترى

Omits او بينة

A Omits حقا غائبا او بينة

D. بينته in place of بينة

24. B. M. A. واشبهها بالحق

25. Q. اجعل لمن ادعى حقا غائبا

B. D. add غائبة

K. Ma.	اجمل لمن ادعی حقا غائبا او بینة
26. D. Q.	فان احضر بینة اخذ بحقه
D.	وجهت القضاء علیه
B. adds	فان اعجز عنها استحللت علیه القضیة
Ma.	و الا استحللت القضیة علیه
27. Q.	و الا استحللت
M.	الا استحللت علیه القضیة
K.	و استحللت القضاء علیه
B. Omits	فان ذلک انفی للشک
A. D. Omit	انفی للشک
D. adds	مجلود فی حد او مجرب فی شهادة زور
M. Ma.	او نسب
A. adds	او نسب
B. adds	تبارک و تعالی
K. Ma. for the whole sentence	عفا عن الأیمان و درأ بالبینات
28. Q. Omits the whole sentence	
K. M. Ma Omit	وابلغ فی العذر
29. Q.	والمسلمون عدول فی الشهادة
30. B.	او مجربة علیه
Instead of	قرابة
31 A. B. D. M. Q. Omit	قد
D. Q. Omit	ان of ف
K.	فی نسب او ولاء
K. adds	سبحانه
D. Q. Omit	و الأیمان
D. Q.	ثم in place of و
Instead of	بالناس
M.	والخلق

A. Omits والقلق والضجر

32. Q. بالخصوم
B. والغضب

and بالخصوم in place of بالناس

K. Ma. والتاف

B. عند تنافر الخصوم والتنكر بهم

A. فی مواطن الحقوق

D. و یحسن بها الذکر

33. Q. Omits بها and والتنکر للخصوم

M. فان الحق فی مواطن الحق یعظم الله به

K. فان استقرار الحق فی مواطن الحق یعظم الله به الاجر و یحسن به الذکر

B. فان ترک الغضب فی مواطن الحکم مما یوجب الله به الا جر و یحسن به الذخر

34. Q. فانه من صلحت سریرته فیما بینه و بین الله اصلح الله ما بینه و بین الناس

B. فمن خلصت نیته لربه کفاه ما بینه و بین الناس

M. و من صحت نیته و اقبل علی نفسه کفا الله ما بینه و بین الناس

35. Q. و من تزین للدنیا بغیر ما یعلم الله منه شانه الله

D. غیر ذلک یشنه الله

B. انه لیس فی قلبه شانه الله تبارک و تعالی ۔ فان الله لا یقبل من عبده الا ما کان خالصا

M. و من تخلق للناس بما یعلم الله انه لیس من نفسه شانه الله

D. Omits منه خلاف ذلک هتک الله ستره و ابدی فعله فما ظنک بثواب and ولو علی نفسه غیر الله فی عاجل رزقه و خزائن رحمته ۔

K. Ma. Omits the last the two sentences; Q. Omits the last one sentence.

الجاحظ کے متن کا ترجمہ

قضا حکم فرضِ الٰہی اور قابلِ اتباع سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگر کوئی دعویٰ تمہارے سامنے پیش ہو تو اس کا فیصلہ پورے غور و خوض کے بعد کرو (اسے نافذ بھی کرو) کیونکہ صحیح فیصلہ کا اعلان بغیر اس کے نفاذ کے بے سود ہے۔

اپنی عدالت اور مجلس میں لوگوں سے یکساں برتاؤ کرو تاکہ اعلیٰ نسب والا تم سے ناانصافی کی توقع نہ کرے اور کمزور تمہارے ظلم سے خوف زدہ نہ ہو۔

بارِ ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر قسم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام، حلال اور حلال حرام نہ ہو جائے کل

اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج پورے مقدمہ پر غور، ہدایت اور رُشد کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو کیونکہ انصاف قدیم ہے اور حق کی طرف مراجعت باطل پر اصرار سے بہتر ہے۔

جن معاملات میں شبہ ہو اور قرآن اور سنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حکم نہ پاؤ تو ان پر بار بار غور کرو۔ ان کی امثال اور اشباہ پہچانو اور قیاس سے کام لو اس پر اعتماد کرو جو تمہاری نظر میں اللہ کو پسندیدہ اور حق کے مشابہ ہو۔

حق مدعی التوا میں رکھو یا مقررہ میعاد میں ثبوت طلب کرو۔ اگر وہ ثبوت پیش کرے تو اس کا حق دو ورنہ اس کے خلاف فیصلہ دو کیونکہ شبہ دور کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے۔ اندھیروں کو چھانٹو اور عذر طلب کرو۔

تمام مسلمان باہم عدول ہیں سوائے مجلود فی الحد کے یا مجرب جھوٹے گواہ کے یا سرپرستی یا قرابت میں مشکوک کے اللہ کو تمہارے دلی بھیدوں سے تعلق ہے اور ثبوت اور قسم پر سزا موقوف رکھتا ہے۔ فریقین کی موجودگی میں عدالت میں بے چینی، برہمی جھلاہٹ اور تنکر سے احتراز کرو اس کا اجر اللہ پر واجب ہے یہ بموجب اجر الٰہی اور انعام آخرت ہے۔

جو اپنے اور اللہ کے مابین معاملات میں مخلص ہو خواہ وہ اس کے اپنے ہی خلاف ہو اللہ اسے ان معاملات میں کافی ہوگا جو اس کے اور لوگوں کے مابین ہیں۔ جو لوگوں سے بناوٹ کرے جبکہ اس کے مخالف اللہ اصلیت جانتا ہو تو وہ راز فاش اور فعل آشکارا کر دے گا تم اللہ کے ثواب کے متعلق کیا سوچتے ہو جو وہ یہاں رزق اور آخرت میں اپنی رحمت کے خزانے دیتا ہے والسلام (علیک)

تبصرہ

کسی بھی قدیم تاریخی دستاویز کا اصل متن ثابت کرنا مشکل ہے۔ تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یونان اور روم کی تاریخ کی مشہور دستاویزات جو قدیم و جدید مصنفین کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں اگر حسابی قاعدہ سے دیکھا جائے تو اصل نہیں ہیں۔ کوئی بھی شخص ایک بھی ایسی قدیم دستاویز پیش نہیں کر سکتا جس کے متن میں اختلاف نہ ہو۔ تاریخی واقعات جزو ایمان نہیں ہوتے اس لئے وہ احتیاط سے محفوظ نہیں رکھے جاتے لہٰذا جب مؤرخین ہمیں کوئی زمانہ بعید کی تاریخی دستاویز پیش کرتے ہیں تو بیشتر اوقات اس کا متن سو فی صد خالص نہیں ہوتا البتہ اس کا مضمون اکثر درست اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ مسلمہ تاریخی تنقید کے اصول حضرت عمرؓ کے خط پر نافذ کرتے ہوئے ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسے جعلی اور بناوٹی قرار دیں۔ خط کے متن میں ہم نے اس کے متن کے اختلافات اور اس کی شقوں کی ترتیب، طرزِ بیان اور مضمون میں اختلافات دے دیتے ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ یہ اختلافات دراصل زبان اور تکنیکی اصطلاحات کے اختلافات ناقابلِ ذکر ہیں اور یہ گزشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔

ہم نے خارجی اور داخلی تنقید کے اصولوں کا اس خط کے مطالعہ پر اطلاق کیا ہے اور پورے طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ خط میں چند الفاظ کی دوسری دستاویزات کے الفاظ، کلمات اور جملوں سے مماثلت دراصل اس کے سوا کچھ ثابت نہیں کرتی کہ عدالتی نظام کے بعض تصورات اور اصول حضرت عمرؓ سے پہلے ہی جنم لے چکے تھے اور امت کی سماجی و سیاسی زندگی میں جاری و ساری تھے حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک بیان کا تعلق ہے بڑے بڑے ادیبوں کو گذشتہ علمی اور ادبی سرمایہ پر انحصار کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر وہ نئی زبان ایجاد کریں تو کوئی بھی ان کی بات نہ سمجھے گا۔ کم و بیش یہی صورت تاریخ تصورات کی ہے۔ تمام معنی جو کوئی شخص اپنے خیالات اور ارادہ کو دیتا ہے قطعاً نئے نہیں ہوتے اس کا بیشتر حصہ ورثے میں حاصل ہوا ہے۔

مزید یہ کہ اگر کوئی کسی تاریخی تحریک کی نمائندگی کرے یا کوئی عالمی نظریہ پیش کرے یا کسی پرانے فلسفہ یا سنت کو جاری رکھے یا اسے ترقی دے، صورت حال کے باعث، اسے بہت سے خیالات مستعار لینا پڑیں گے جو پہلے سے ایک معیار کی حیثیت سے جاری اور قابلِ قبول تھے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے اہم صحابی اور آپؐ کے دوسرے جانشین ہونے کی حیثیت سے دانستہ اور استقلال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی پیروی ہر اس اصول اور عمل میں کی جو آپؐ نے کہا اور کیا تھا۔

لہٰذا جب آپؓ نے گورنروں اور ججوں کو ہدایات کے خطوط بھیجے تو یقیناً آپؓ کے ذہن میں اصول اور طریق عدل کے مسلمہ اصول رہے ہوں گے جو آپؓ کے پیشروؤں نے اسلامی ریاست کی انتظامیہ میں نافذ کئے تھے۔ ہم نے متعدد مثالیں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی انتظامیہ سے دے کر یہ حقیقت پوری طرح ثابت کر دی ہے"۔[27] اسی طرح اگر حضرت عمرؓ کے خط کے بعض بیانات کی نقل حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یا دوسرے بعد کے آنے والوں نے کی تو یہ ایک فطری عمل تھا۔ ان بیانات کی حضرت عمرؓ سے پہلے یا بعد کسی مضمون یا دستاویز میں موجودگی یہ ثابت نہیں کرتی کہ وہ حضرت عمرؓ کے خط میں واقع نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر ہم ارتقائے تاریخ میں سماجی اصول قبول کریں تو ان دونوں امکانات کو ناقابلِ اعتراض تسلیم کرنا ہو گا۔

یہ مسئلہ کہ خط میں مختلف تصورات علیحدہ اور بے جوڑ ٹکڑے ہیں جو حضرت عمرؓ سے پہلے اور بعد کے ماخذ سے چن لیے گئے ہیں اور بعد کے مسلم مؤرخین کی سازش سے ایک مشہور تاریخی دستاویز کے طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں تاکہ حضرت عمرؓ کی ذات نمایاں ہو سکے اسلامی تاریخ سے بغض و عناد کی حیثیت رکھتا ہے"۔[28]

—— تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی عظمت کا انحصار محض اس خط پر نہیں۔ آخر یہ لوگ یہ تسلیم کرنے سے کیوں انکار کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ایک وسیع اور دور دراز مملکت کے حاکم ہوئے اور اپنے ماتحت سینکڑوں گورنر، جج اور فوجی سالار رکھتے ہوئے ایسا مواد پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کر سکتے تھے خواہ وہ ان کے اپنے دل سے ہو یا گذشتہ تاریخ اور نمونۂ عمل سے فراہم ہوا ہو۔ کیا وہ اتنے ذہین نہیں تھے کہ اس قسم کا خط لکھ سکتے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ خط واحد تحریری دستاویز نہیں بہت سی اور بھی اسی نوع اور مضمون کی حامل ان کی تحریریں ہیں جو انہوں نے اپنے ماتحت عمال عدالت کو تمام سلطنت میں لکھیں۔

اور اس دعویٰ کی کسی معقول شہادت سے حمایت نہیں کی جا سکتی کہ دستاویز میں دیئے گئے کئی حقائق دراصل بعد کی تاریخ سے متعلق ہیں۔[29] خط میں اجتماعی عدل کے بنیادی تصورات ہیں جو عالمی حیثیت کے ہیں جو قرآن و سنت میں حضرت عمرؓ سے پہلے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ احساس عدل فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ پس جہاں اجتماعی زندگی ابھرتی ہے وہاں حصولِ انصاف کی کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہوتی ہے۔ متمدن سوسائٹی میں یہ بنیادی تصورات زیادہ منظم و متشکل ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف دو دہائیوں میں اسلامی سلطنت کے معجزانہ ارتقا سے ایک اعلیٰ انتظامی نظام کی تنظیم لازمی ہو گئی اور اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ نظام عدالت کسی بھی حکومت کا سب سے بڑا فریضہ ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ تھا کہ عدالتی طریقِ کار کے نظائر اور اصول اتنی ہی تیزی سے ارتقا پذیر ہوئے جتنی تیزی سے خود خلافت پھیلی۔ اس لئے یہ نہ صرف ممکن بلکہ اغلب ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو ایک بڑی ریاست کے سربراہ تھے اپنے ایک صوبائی جج کو یہ خط لکھا ہو۔ کم از کم اس

حقیقت کا اعتراف بازنطین اور ایران کی تہذیبوں نے کیا ہے جو حضرت عمرؓ کے تحت آگئی تھیں اور اس طرح انہوں نے ایک اعلیٰ انتظامی نظام مع انصاف کے ارتقا کی ضرورت پیدا کی۔ اگر حضرت عمرؓ نے کوئی عارضی انتظام کیا تھا تو مفتوحہ اقوام جو بہتر تہذیب کی حامل کہی جاتی ہیں آپ کے تابع نہ ہوتیں نہ آپؓ کی دیانت اور انصاف کی تعریف کرتیں جو انہوں نے اکثر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے زمانے کے مقابلہ میں جب حضرت عمرؓ کا دور گزر چکا تھا اور ان کا مثالی عدل اپنی حیثیت کھو چکا تھا اور جب اس دستاویز کی جعل سازی کی کوئی تاریخی اہمیت نہ رہی تھی سوائے چند غیر معتبر مورخوں کی ذاتی خوشی کے اس خط کی تحریر کا وقت وہی زیادہ مناسب اور موزوں تھا جب اسے عہدِ فاروقی میں لکھا گیا۔

اس خط کے اصلی ہونے سے متعلق تمام مناقشہ صرف اس پہ ایک بعد کے مصنف کے بہت بڑے ناقابلِ اعتماد تبصرے سے پیدا ہوا۔ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) نے اس کی اصلیت پہ شک کی کوئی وجہ بیان نہیں کی۔ وہ صرف اس لیے اس کی اصلیت سے منکر ہے کہ یہ قیاس اور اجتہاد کو اسلامی قانون کے ماخذ بنانے میں دلیل فراہم کرتا ہے جبکہ وہ ظاہری مکتبِ فکر سے تعلق کے سبب ان مزید ماخذ قانون کو قبول نہیں کرتا۔ اس لئے وہ ایک اہم تاریخی دستاویز کو کسی تاریخی شہادت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے مکتبِ فکر کے تعصب کی حمایت میں مسترد کرتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ابنِ حزم انتہائی کٹر اور تند مزاج تھا اس لئے وہ جب کسی خیال کی مخالفت کرتا ہے تو بڑی شدت سے کرتا ہے۔ در اصل اسلامی فقہ کے ارتقا کے قدیم زمانہ میں کسی نے بھی اس خط کی اصلیت پہ اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابنِ حزم تنہا مصنف ہے جس نے اس کی اصلیت پر اعتراض کیا۔ ابنِ حزم تاریخ میں اس وقت نمودار ہوا جب اسلامی فقہ کا ارتقا عروج کو پہنچ چکا تھا۔ وہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوا۔ اس سے پہلے اس دستاویز کے متعدد حوالے ملتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ ابن حزم کے بعد کے عہد میں بھی اس خط کی اصلیت پر کبھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ البتہ ابھی حال میں بعض مستشرقین اور ایک مسلم عالم محمود بن محمد بن عرنوس اس سے مستثنیٰ ہیں۔[۴۰]

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ حضرت عمرؓ کے خط بنام ابو موسیٰ الاشعری پر یہ اعتراض اصلی ہے یا نہیں صرف ابنِ حزم کی تنقید کے گرد گھومتا ہے۔ ابنِ حزم کے خیالات اور دلائل پر عنقریب اگلے صفحات پر تفصیل سے بحث ہوگی۔

فی الحال ہم جدید مسلم عالم محمود بن محمد بن عرنوس کے اعتراض پر مختصراً غور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ابنِ حزم سے اتفاق کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا جعلی خط ہے۔ واحد نئی دریافت جو وہ کرتا ہے یہ ہے کہ بقول ابن خلدون شریح کو حضرت عمرؓ نے قاضی بصرہ کا اور ابو موسیٰؓ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔[۴۱] لیکن دیگر روایات کے مطابق عرنوس کے خیال میں ابو موسیٰ کو کبھی بھی کوفہ میں مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ خط انہیں نہیں لکھا جا سکتا تھا۔[۴۲] اولاً ابن خلدون واحد مورخ ہے جو کہتا ہے کہ یہ خط کوفہ بھیجا گیا تھا۔ ابن الحدید، النویری اور ابن القیم سب نے اس جگہ کا نام جہاں خط بھیجا گیا بصرہ لکھا ہے۔ پس ابن خلدون کی سند قبول نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ بہت بعد میں ۸۰۸ھ میں فوت ہوا۔ دوسرے معتدبہ شہادت موجود ہے کہ ابو موسیٰؓ الاشعری نے ایک سال تک کوفہ میں بھی حضرت عمرؓ کے تحت خدمت انجام دی۔[۴۳] اس لئے یہ امکان مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے یہ عدالتی ہدایات اس عرصہ میں وصول پائی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن خلدون نے اپنے بیان میں غلطی کی ہو اور شریح اور ابو موسیٰ کی جگہ اُول بدل دی ہو کیونکہ شریح تمام

زندگی کوفہ ہی میں تعینات رہے اور ابو موسیٰؓ نے اپنی بیشتر مدت بصرہ میں گزاری۔ اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ ابن خلدون کا مضمون مسخ شدہ نہیں۔ بہرحال غلط فہمی کی کوئی بھی وجہ ہو عزنوس کے دلائل کو نہ تاریخ کی حمایت ہے نہ استدلال کی۔ وہ محض ایک گذشتہ عظیم شخصیت سے مرعوب ہو گیا تھا جو اپنے مخالفین کو جھٹلانے میں اپنی نمی اور شدت میں بے مثال ہے۔

تاہم یہ حیران کن ہے کہ یہ آج کے نقاد اپنے نظریہ کی بنیاد تقریباً پوری پوری ابن حزم کے دلائل پر رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر ابن حزم کی تنقید کا مناسب جواب دے دیا جائے تو سارے مناقشہ کو منطقی اختتام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

ابن حزم نے اس خط پر اپنی کتاب "النبذ فی اصول الفقہ الظاہری"[۴۴] میں مختصر بحث کی ہے اور اس کا تفصیلی مطالعہ اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام"[۴۵] میں کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اس نے اتفاقاً اس خط پر اس وقت بحث کی ہے جب وہ زیادہ اہم مسئلہ قیاس پر بحث کر رہا تھا۔ چھوٹی کتاب میں وہ اس کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کہتا سوائے اس کے کہ اس کے خیال میں یہ محض جعلی ہے کیونکہ دو متروک راوی اس کے بیان کرنے والے ہیں اور اس لئے بھی کہ دوسرے ذرائع سے معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے مماثلت پر قیاس کرنے سے منع کیا تھا۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ نہ صرف حضرت عمرؓ بلکہ تمام صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیاس کی ممانعت پر متفق تھے۔ یہاں قیاس کے ایک ماخذ فقہ اسلامی ہونے سے متعلق مناقشہ میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ابن حزم کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً قیاس کو اسلامی قانون کا ایک ماخذ مانتے تھے۔[۴۶]

مین بحث کے دوران ابن حزم نے ایک ایسی حقیقت سے انکار کیا ہے جو تاریخ سے صاف ثابت ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ خلافت کے ابتدائی ایام میں ہزاروں مواقع پر خلفاً اور ان کے نمائندے روزانہ اس وقت کی پیچیدہ معاشرت میں ابھرتے لاتعداد مسائل حل کرنے کے لیے قیاس سے کام لیتے تھے۔ اس نکتہ کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہری مکتبِ فکر بھی جس سے ابن حزم کا تعلق تھا صحابہ کے قیاس پر یقین رکھتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک نسل کو قانون سازی کے لیے اجماع کی اجازت تھی تو کون سے اخلاقی یا عدالتی اصول دوسری نسلوں کو اسی عمل سے روک سکتے ہیں؟ مزید یہ کہ اجماع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس سے قبل قیاس کا طویل عمل نہ ہو۔ لیکن یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا کبھی صحابہ کے قیاس پر ان کے اپنے عہد میں اس وجہ سے اعتراض ہوا کہ یہ بدعت تھی اور مذہب سے باہر قانون سازی تھی۔

الاحکام[۴۷] میں ابن حزم حضرت عمرؓ کے مکتوب پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور اس پر زیادہ عمیق تنقید کرتا ہے۔ اس کے اعتراضات دو قسم کے ہیں جو دستاویز کی خارجی اور داخلی شہادت پر مبنی ہیں۔ جہاں تک خارجی شہادت کا تعلق ہے اس کی دلیل وہی ہے جو پہلی کتاب میں ہے یعنی کہ دونوں راوی جنہوں نے یہ خط بیان کیا ہے علما کے ہاں متروک ہیں۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ابن حزم پانچویں صدی کے وسط میں یہ دعویٰ کرتا ہے جبکہ اس مکتوب سے متعلق بہت سی شہادت پہلے ہی جمع ہو چکی تھی۔ دراصل راویوں کے دو سلسلے جن کا ذکر وہ کرتا ہے اس دستاویز سے متعلق سب سے کم معروف سلسلے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دانستہ یہ دو سلسلے چنے تاکہ اپنی تنقید کا رُخ ان کی طرف کر سکے۔ ان سلسلوں کے ساتھ بھی اس نے پورا انصاف نہیں کیا۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ پہلے سلسلہ کے آخری دو راوی عبدالملک اور اس کا باپ متروک ہیں گو کہ دیگر عظیم محدثین نے انھیں تسلیم کیا ہے۔[۴۸]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا خط اٹھارہ دیگر سلسلہائے رواۃ سے روایت کردہ ہے جن میں بیشتر معروف اور مشہور ہیں اور ان میں بعض ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔[۴۹] ابن حزم جیسے عالم کو یہ سب معلوم ہوں گے۔ اس کا ان سلسلوں کو نظر انداز کر دینا اس بات پر مبنی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیاس کی بنیاد منہدم کرنا چاہتا تھا اور اس عمل میں ہر اس چیز کو گرا دینا چاہتا تھا جو راستہ میں آئے دوسری بات جو ہمیں زیادہ محسوس ہوتی ہے وہ اس کا حضرت عمرؓ کے قاضی شریح کے نام ایک اور خط کو قبول کر لینا ہے۔ اس مکتوب میں حضرت عمرؓ انھیں قرآن اور سنت کے احکام کی پابندی اور سلف کے فیصلوں کی پیروی کی ہدایت فرماتے ہیں اور اگر ان ماخذ سے کوئی رہنمائی نہ ملے تو یہ اس پر تھا کہ وہ معاملہ کو آگے بڑھائے اور کوئی فیصلہ کرے یا اسے ملتوی رکھے۔[۵۰]

اس دستاویز کا حوالہ دینے کے بعد ابن حزم بیان کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا بیان حتمی طور پر قیاس کے اصول کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن یہ ایک واضح مفروضہ ہے کیونکہ یہ دوسرا خط اس دعویٰ کے بالکل الٹ بات ثابت کرتا ہے۔ جب سلف (قضاۃ یا صحابہ) نے ذاتی فیصلہ کیا انہوں نے لازماً اپنا ذاتی فیصلہ اور استدلال استعمال کیا یہ اجتہاد ہے جس کی ایک خاص شکل قیاس ہے مزید برآں قاضی شریح کو ان مقدمات میں جہاں پہلے تین ماخذ کام نہ آئیں تو اپنا ذاتی استدلال استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی تھی یہاں پھر واضح طور پر قیاس کے استعمال کی بات آئی۔ پس اگر حضرت عمرؓ ایک خط میں اجتہاد اور قیاس پر عمل کی ہدایت کر سکتے تھے تو کون چیز مانع تھی کہ وہ ایسی ہی ہدایات اپنے دوسرے خطوط میں نہ دیں جو انہوں نے اپنے گورنروں اور ججوں کو لکھے۔ اس لیے اگر پہلی روایت کے رواۃ غیر معتبر ہیں تو دوسری روایت کے سلسلے خود اس کے مطابق معتبر ہیں اور اس سے وہی مقصد پورا ہوتا ہے جو پہلی روایت سے ہو سکتا تھا اگر وہ ابن حزم کے خیال میں درست ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی محض غیر معتبر سلسلہ روایت کا وابستہ ہونا کوئی مقصد حاصل ہو سکے وجہ جواز نہیں ہو سکتا جس سے ایک اہم تاریخی دستاویز مسترد کر دی جائے۔

داخلی شہادت

اب ہم اس عبارت کا جائزہ لیں گے جس کی منطقیت پر ابن حزم نے اعتراض کیا ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت عمرؓ کہتے ہیں: ایسے شخص کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی جس کو شراب نوشی یا زنا کی سزائے حد دی جا چکی ہو۔ ابن حزم بحث کرتا ہے کہ یہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ کے نظریہ کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایسے شخص کی شہادت کی اجازت دی ہے اگر وہ توبہ کر لے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ فقہاء کے اس نظریہ پر کوئی اجماع نہیں ہے کیونکہ اوزاعی ایسے شخص کی شہادت کی اجازت نہیں دیتے جسے کسی جرم میں کوڑے لگ چکے ہوں۔[۵۱] اس سے ابن حزم یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ تمام متضاد نظریات ہیں اس لئے ان میں سے کوئی بھی حضرت عمرؓ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے حصے میں حضرت عمرؓ کسی رشتہ دار یا آقا کی شہادت سے منع فرماتے ہیں۔ جبکہ فقہائے عراق نے آقا کے حق میں غلام کی شہادت کی اجازت دی ہے اور ان لوگوں کو قانون کی نظر میں غیر معتبر قرار نہیں دیا۔ فقہا ایک منصف ... کے خلاف بھی قبول کرتے ہیں پس یہاں بھی اس مسئلہ پر کوئی اجماع نہیں کیونکہ بعض فقہا ایسے اشخاص کی شہادت کی ...

اور دوسرے اجازت نہیں دیتے۔ اسی سلسلہ میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ قانون کی نظر میں سب لوگ سچے ہیں جبکہ فقہا کسی مسلمان غلام کی شہادت قبول نہیں کرتے ۔[47] ابن حزم بحث کرتا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے واقعی یہ ہدایات دی ہوتیں تو فقہا کبھی بھی آپؓ سے اختلاف نہ کرتے۔

اولاً یہ غور کرنا چاہیئے کہ حضرت عمرؓ نے صوبوں میں عدالتی طریق کار سے متعلق تفصیلی قواعد و ضوابط نہیں بھیجے تھے۔ آپؓ نے مختصر مگر ضروری ہدایات بطور سربراہ ریاست صوبائی ججوں اور گورنروں کو بھیجیں۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی ان ہدایات کا جامع اور خالی مسئلہ پر عمل ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ کسی ایسے شخص کی سچائی اور دیانت داری مشکوک ہو جاتی ہے جسے کسی جرم میں سزا مل چکی ہو لہٰذا حضرت عمرؓ نے اپنے ججوں کو عام ہدایت دے دی کہ ایسے شخص کی شہادت قبول نہ کریں۔ لیکن قرآن کے مطابق اگر وہ توبہ کرے تو ایسے شخص کی شہادت اتنی ہی معتبر ہو جاتی ہے جتنی کسی دوسرے مسلمان کی ہوتی ہے۔[48] اس لیے فقہا نے عموماً یہ محسوس کیا کہ توبہ کر لینے والے شخص کو یہ رعایت دی جائے۔ لیکن چونکہ ایسے شخص کی دیانت داری پر ہر وقت شک کیا جا سکتا ہے اس لیے بعد کے دور کے بعض فقہا یہ رعایت دینے کو تیار نہیں تھے یوں کسی جرم میں سزا پانے والے کی شہادت کی قبولیت میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اس اختلاف سے زیادہ سے زیادہ اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ جہاں تسلیم شدہ ماخذ خاموش ہوں وہاں مسائل کے حل کے لیے فقہا کے ذاتی اجتہاد اور قیاس کی اجازت ہے۔ حضرت عمرؓ کے احکامات فرمان الٰہی نہ تھے۔ ان کی عزت زیادہ تر اس لیے کی جاتی تھی کہ ان میں بیشتر قرآن و سنت کی روح پائی جاتی تھی۔ لیکن فقہا ان احکامات کی لفظی پابندی پر مجبور نہ تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان ہدایات میں وسیع گنجائش ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود محدود طور پر قرآن و سنّت کے مطالب اخذ کرنے کے لیے اتنے ہی آزاد تھے جتنے حضرت عمرؓ مجاز تھے۔ لہٰذا جیسا کہ بعد کی کتب فقہ میں درج ہے فقہا کے اختلافات یقیناً اس دستاویز کی جعلسازی کا کوئی ثبوت نہیں ہیں۔

ایک مزید دلیل کے طور پر ہم آسانی سے ثابت کر سکتے ہیں کہ دوسرے بہت سے مسائل میں جن کا ذکر اس خط میں نہیں بعد کے فقہا نے حضرت عمرؓ سے واضح اختلاف کیا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ بیک وقت تین اعلان طلاق تین طلاق تصور ہوں گی تاہم بعد کے بعض فقہا نے اس رائے کو قبول نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے قانون کی وضاحت کے لیے اسلام نے ان تمام مومنین کو انفرادی آزادی عطا کی ہے جو اس کے اہل ہیں۔ لہٰذا یہ دلیل دینا کہ حضرت عمرؓ کا خط جعلی ہے کیونکہ اس کے بعض مشتملات کو بعد کے فقہا نے قبول نہیں کیا کوئی منطق نہیں۔

دوسرے حصے سے متعلق اعتراض کا جواب بھی وہی ہے۔ یہ احتیاط سے غور کرنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے تمام صوبوں کے عدالتی فیصلوں کی مکمل یکسانیت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات کے باوجود ایک مسئلہ پر مختلف فیصلے خلافت کے مختلف علاقوں میں حضرت عمرؓ کے ججوں کے عمل سے آسانی اور بہتات سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ابن مقفع کے "رسالہ فی الصحابہ"۔ ابو یوسف کی کتاب "الرد علیٰ سیر الاوزاعی"۔ الشافعی کی کتاب "الام" یا الطبری کی کتاب "اختلاف الفقہا" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان مجموعوں میں لاتعداد مثالیں ملیں گی جہاں قضاۃ اور فقہا نے ایک ہی مسئلہ پر مختلف فیصلے دیئے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ مختلف علاقوں میں حالات مختلف تھے اور ججوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام حالات پر غور کریں۔

خط کے تیسرے ٹکڑے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر جج کو کسی فیصلہ میں تذبذب ہو تو وہ ایسا فیصلہ دے جو حق کے نزدیک زیادہ قریب اور اللہ کو پسند ہو۔؟ ابن حزم بحث کرتا ہے کہ ایک واقعہ یا سچ ہو سکتا ہے یا جھوٹ یہ کہنا منطقی تضاد ہے کہ ایک سچ زیادہ سچ کی طرح ہے کیونکہ آدھا سچ، سچ نہیں اور ایسا بیان حضرت عمرؓ سے منسوب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بے خود غلط دلیل ہے کیونکہ یہ عام آدمی کا بھی تجربہ ہے کہ کسی معاملہ کی پوری حقیقت اس کے ذہن میں ہمیشہ بیک وقت منکشف نہیں ہوتی لیکن درپیش مسئلہ متقاضی ہوتا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کرے۔ لازماً ایک ایماندار اور ذمہ دار جج ایسا فیصلہ دیتے ہوئے ہچکچائے گا جس پر وہ سو فی صد یقین نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا اسے اپنا فیصلہ اپنے بہترین علم اور سمجھ بوجھ کے مطابق دینا ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس صورتحال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خط کی ایک اور شق میں آپؓ فرماتے ہیں کہ اگر فیصلہ دینے کے کچھ عرصہ بعد تم محسوس کرو کہ تم سے غلطی ہوئی ہے تو اپنے فیصلہ سے رجوع کرو اور حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیا فیصلہ دو۔ یہ غلطی ہی کے امکان کی وجہ سے ہے کہ تمام نظامہائے قانون میں اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کی اجازت ہے۔ حضرت عمرؓ کی نیت صرف جج کو خود فریبی سے متنبہ کرنے کی تھی اور جہاں تک خود جج کا تعلق ہے ہو سکتا ہے اولاً مسئلہ اس کے ذہن میں واضح نہ ہو لیکن جوں جوں وہ گہرائی میں جاتا جائے معاملہ کے مختلف پہلو اس پر روشن ہوتے جائیں اور یہ پہلو پریشان کن اور متضاد ہوں۔ ایسی صورت میں جو چیز ایک ایماندار جج کی رہنمائی کر سکتی ہے وہ محض سچ کی خالص محبت اور خوف خدا ہے اور اسی سے کام لینے کے لئے حضرت عمرؓ نے کہا ہے۔

دراصل یہ خط اپنی اہمیت کے اعتبار سے ابتدائے اسلام اور عدالتی نظام کے تشکیلی دور کا ابتدائی تین سو سالوں میں موجود رہا جب فقہا، قانونی طرزِ عمل اور عدالتی نظام پر بحث کرتے تو اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا اور اس پر بحث ہوتی اور مؤرخین جب حضرت عمرؓ کے نظام حکومت پر بحث کرتے تو اس کی نشاندہی کرتے۔ اور بھی بہت سے معاملات حضرت عمرؓ سے متعلق ہیں جنھیں مؤرخین اور فقہا دونوں کی زیادہ توجہ حاصل ہوئی جب ان سب کو ایک منظم اکائی میں دیکھا جانے تو حضرت عمرؓ کی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے ان میں اس خط کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔

اس مکتوب کو سب سے پہلے خصوصی توجہ ابن قیم سے حاصل ہوئی جس نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" میں اس پر انتہائی جامع اور مفصل بحث کی۔ ابن القیم، ابن تیمیہ کے نقش قدم پر چل کر اُمت کو اسلام کے بنیادی ماخذ کتاب و سنت کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے زمانہ تک ملوکیت کے تحت ثانوی ماخذ نے اصلی ماخذ پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ خلافت کے بعد ملوکیت کے تحت جو نظام عدالت قائم ہوا اس کے اصول و قواعد ملوکیت کی چھاپ سے مبرا نہ تھے۔

یقیناً یہ خط ابو یوسف اور مالک بن انس کے علم میں تھا۔ ابو یوسف نے اپنی کتاب الخراج میں اس پر مختصر بحث کی ہے۔[۵] حقیقت یہ ہے کہ خط کے مشمولات ابو یوسف کے زمانہ تک عام ہو چکے تھے پس تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہ رہی تھی۔

حضرت عمرؓ کے اسی مضمون کے بعض دوسرے خطوط کا ذکر بھی ابو یوسفؒ نے کیا ہے۔ ان کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ ابتدائے اسلام میں انصاف کس طرح ہوتا تھا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابو یوسفؒ کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔ وہ ایک ایسے دور میں زندہ رہے جبکہ اسلامی دنیا میں فن

تحریر اور نظامِ تعلیم ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ کتاب الخراج سے پہلے کے زمانہ کی بہت کم کتابیں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ موطا، کتاب الخراج کی پیش رو ہے جس میں اس خط کا اقتباس موجود ہے۔ ان چند کتابوں کے سوا جو پہلے لکھی گئیں زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات سے متعلق ہیں لہٰذا ان میں حضرت عمرؓ کے مکتوب کا حوالہ دینے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن چونکہ خط ایک اہم نوعیت کا تھا یہ سینہ بہ سینہ زبانی روایت ہوتا رہا جیسا کہ دوسرے اہم اسلامی تاریخی مواد کے ساتھ ہوا۔ خلافت راشدہ کی تاریخ، بنو امیہ اور ابتدائے بنو عباس کی تاریخ تیسری صدی ہجری کے بعد کے حصہ میں مدون ہونا شروع ہوئی اس کا بیشتر حصہ اصلی مانا گیا ہے۔ طبری کی مفصل تاریخ چوتھی صدی ہجری تک تکمیل ہوئی ہے یہ معتبر ہے۔ حضرت عمرؓ کا مکتوب اس عظیم تاریخی مواد میں موجود ہے۔ اگر ہم ایک پہاڑ کو تسلیم کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی ایک اہم چٹان کو قبول نہ کریں۔

یہ درست ہے کہ ابو یوسفؒ کے بعد بعض مستند لکھنے والوں نے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔[46] لیکن اولاً ان لوگوں کی یہ فروگذاشت اس دستاویز کو مسترد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ابن سعد نے حضرت عمرؓ کی زندگی کے متعلق بعض اہم حقائق نظر انداز کر دیئے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے متعلق وہ ارتداد کی جنگوں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔[47] اس لئے اس دستاویز سے متعلق اس کی خاموشی کو کیونکر یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس کے نزدیک یہ وجود ہی نہ رکھتی تھی۔ حقیقت میں ابن سعد محض تاریخ نہیں لکھ رہا تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تین نسلوں تک اسلام کے عظیم اور پاکیزہ افراد کے سوانح مرتب کر رہا تھا۔ جہاں اسنے سیاسی شخصیتوں کی زندگی سے بحث کی ہے وہاں اس نے بعض واقعات بھی بیان کئے ہیں جو عاملین سے عام دلچسپی کے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں اسلام کے ابتدائی دور کی اہم شخصیات کیوں شامل ہیں۔

جہاں تک ابو یوسفؒ کے بعد کی بعض دوسری اہم تاریخی اور قانونی کتب میں حوالہ کی کمی کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کمی عام نہیں یہ صرف تھوڑی سی تعداد کے ماخذ میں شامل نہیں جہاں ہم اس کی توقع کرتے تھے۔ لیکن کوئی یہ کیوں فرض کرے کہ جہاں کہیں حضرت عمرؓ کا ذکر آئے گا اس خط کا حوالہ بھی لازماً ہوگا۔ کسی تاریخی دستاویز کا حوالہ صرف وہیں دیا جاتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہو۔ لیکن ابو یوسفؒ کے بعد کا تمام ادب اس نوعیت کا نہیں جس میں لازماً اس مکتوب کے حوالہ کی ضرورت ہو۔ اس لیے آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بعض جگہوں پر اس کے حوالہ کی کمی اس لیے نہیں ہے کہ اس خط کا وجود نہیں تھا البتہ اس کا ذکر ضروری نہ تھا۔ بہرحال جزوی فروگذاشت کی دلیل کمزور ترین ہے جو کسی تاریخی نظریہ کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔

ابن حزم کے بعد اس دستاویز سے متعلق پہلا شبہ ہمارے زمانہ میں ایک مستشرق، مارگولیتھ نے ظاہر کیا ہے۔ اس کی پشت پناہی بیک وقت دوسرے مستشرقین خصوصاً ایمل تیاں نے کی ہے۔ کیونکہ ہم نے تفصیلاً ان کے اعتراضات مسترد کر دیئے ہیں[48] ہم انھیں یہاں نہیں دہرائیں گے۔ تاہم یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ مستشرقین اس مکتوب کی عدم موجودگی ثابت کرنے پر کیوں اتنا زور لگاتے ہیں۔ یہ خط ابتدائے اسلام میں عدلیہ کے اصول اور عمل کے ارتقا کا مختصر ریکارڈ ہے لہٰذا اس کی تاریخی حیثیت سے انکار سے یہ ناقد کہنا چاہتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں کوئی قابل ذکر عدالتی نظام نہیں تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کا دور محض ایک سیاسی اور فوجی ثالثی کا دور تھا۔ انصاف ایک شائستہ تصور ہے جو صرف مہذب سوسائٹی میں جنم لے سکتا ہے لیکن جدید مستشرقین اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ

اسلام کے بانی اور ان کے نامور جانشینوں نے مہذب ماحول پیدا کیا تھا۔ لہٰذا اس سادہ اسلامی سوسائٹی میں بہترین عدالتی نظام کی موجودگی بقول ان کے ناممکن تھی۔ تاہم حضرت عمرؓ کا خط صاف طور پر واضح کرتا ہے کہ ایسا معاشرہ موجود تھا۔ لہٰذا اس دستاویز کی موجودگی سے انکار اسلام کی شاندار ابتدا کا وقار گھٹانے کی ایک شاطرانہ چال ہے۔ اس کتاب کے پہلے آٹھ ابواب اس کا مسکت جواب ہیں کہ عہد رسالتؐ اور خلافت راشدہ میں ایک عظیم الشان عدالتی نظام قائم ہوا تھا جس کی روایات رہتی دنیا تک مشعل راہ رہیں گی۔

حالیہ زمانہ میں مغربی علم و فضل میں ابتدائی اسلامی تاریخ کے بہت سے بنیادی اور عالمی سطح پر مسلمہ حقائق کو غیر مستند کہہ کر مسترد کرنے کی ایک نمایاں روش نظر آتی ہے۔ مثلاً منٹگمری واٹ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی غیر ملکی بادشاہ کو خط لکھا تھا جس میں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اگر ایسے خطوط اصلی مان لیے جائیں تو وہ پریشان ہوتا ہے کیونکہ پھر تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کہ وہ تمام اقوام کے لیے رسول ہیں سچ ہو جائے گا۔ اس کی منشا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ کو ثابت کرنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ اقوام عالم کے رسول ہیں۔[۴۹]

آر۔ بی۔ سارجینٹ انکار کرتا ہے کہ دستور مدینہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت مرتب ہوا ایک جامع دستاویز ہے۔[۵۰] ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے خط کی اصلیت کا بطلان بھی بلاشبہ ایسی ہی ایک کوشش ہے۔ تاہم تاریخ سے محض اس لیے نہیں کترایا جا سکتا کہ بعض لوگ اس سے آنکھیں چراتے ہیں۔ یقیناً تنقید کا ایک منصب ہے اور یہ تاریخ کو داستان گوئی سے الگ کرنا ہے لیکن اگر تنقید کی جگہ عصبیت لے لے تو وہ اصل تاریخ کا تو پتا نہ لگا سکے گی، البتہ وہ ایک افسانہ کو ضرور جنم دے گی۔

سیرت کے مطالعہ کا مستند مواد محدثین نے امت مسلمہ کے اجماعی فیصلے کے مطابق صحاح ستہ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابو داؤد ابن ماجہ میں جمع کر دیا ہے۔ تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن کے بعد اسلام پر سب سے مستند لٹریچر ان چھ کتابوں میں موجود ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے اس اصول کو مان کر کتب حدیث سے سیرت کا مطالعہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ مگر غیر مسلموں کے لیے اس اصول کو تسلیم کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ ان کی تحقیق کا پیمانہ دوسرا ہے جسے وہ تاریخیت کا نام دیتے ہیں۔ جس کے مطابق جو واقعہ تاریخی طور پر پہلے لکھی گئی کتاب میں درج ہے وہ بعد میں لکھی جانے والی کتاب میں درج ہونے کی نسبت صحیح ہے۔

مثلاً ان کے نزدیک السُّدّی، سیف بن عمر واقدی، ابن اسحاق کی کتابیں بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ سے زیادہ معتبر ہیں کیونکہ اوّل الذکر کے مصنف پہلے پیدا ہوئے اور مؤخر الذکر محدثین بعد میں پیدا ہوئے۔ اسلامی تحقیق کے معیار میں یہ بنیادی اختلاف اس وقت سیرت کے مواد کے حق و باطل کو سمجھنے میں حائل ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے سیرت کے مطالعہ کے لیے جو اُصول بنائے ان کے مطابق وہ تمام مواد مسترد ہو گیا جو اس معیار پر پورا نہیں اترتا مگر مستشرقین کے لیے مسلمانوں کا یہی مسترد کردہ مواد مرغوب روایات فراہم کرتا ہے دورِ حاضر کے مسلمان مستشرقین کی اس ہوشیاری سے ناواقف ہیں اس لیے مغربی زبانوں میں جدید تحقیقی تکنیک اور اسلوب کے تحت مرتب کی ہوئی انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، المانوی زبانوں میں کتب سیرت کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ سیرت کے بارے میں کتب کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ خود بعض مسلمان واعظوں اور ذاکروں نے لاعلمی یا بددیانتی سے مسلمان محدثین اور محققین کا مسترد کردہ مواد اپنے وعظوں اور مجلسوں میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ سیرت مقدسہ کا مستند اور تحقیقی مواد دب کے رہ گیا ہے۔ عہد حاضر کے محققین

کا فرض ہے کہ وہ سیرت کا مستند مواد دنیا کے سامنے لائیں جس سے ایک طرف مغربی مستشرقین کے نظریہ تاریخیت کا پول کھلے اور دوسری طرف غیر ذمہ دار واعظوں اور ذاکروں سے امت مسلمہ کو نجات حاصل ہو۔

تشریحات وحوالہ جات

۱۔ ابن سعد، طبقات، جلد سوم، صفحہ ۳۴۶۔ وکیع، اخبار القضاۃ، جلد اول، صفحہ ۱۰۸۔

۲۔ وکیع، جلد اول، صفحہ ۱۰۸۔

۳۔ ابن سعد، جلد دوم، صفحہ ۳۵۹۔

۴۔ ابن سعد، جلد دوم، صفحہ ۳۵۹۔

۵۔ وکیع، جلد اول، صفحات ۱۱۰۔

۶۔ بغوی بحوالہ فقہ عمر از شاہ ولی اللہ مدونہ امام خان نوشہروی، صفحہ ۲۱۱۔

۷۔ الطبری، تاریخ، جلد چہارم، صفحہ ۳۲۵۔

۸۔ ابن حجر العسقلانی، اصابہ فی تمیز الصحابہ۔ ابن عبد البر الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ زیر سوانح عمری کعب بن سُوَر الازدی۔

۹۔ وکیع، متذکرہ بالا، جلد اوّل، صفحہ ۲۷۰۔

۱۰۔ الطبری، متذکرہ بالا، جلد چہارم، صفحہ ۲۴۷۔ ابن حجر، اصابہ، متذکرہ بالا۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ، فی تذکرہ حذیفہ بن یمان۔

۱۱۔ ابو یوسف، الخراج، ص ۶۲۔

۱۲۔ ابو یوسف، صفحہ ۲۶۔ ابن قتیبہ، عیون الاخبار، جلد اول صفحہ ۵۴۔

۱۳۔ البلاذری، فتوح البلدان، صفحہ ۲۱۹۔

۱۴۔ ابو یوسف، الخراج، ایڈیشن مصر ۱۳۰۲ھ صفحہ ۶۲۔ ابن قتیبہ، عیون الاخبار جلد اول صفحہ ۶۶۔ المبرد، الکامل، جلد اول صفحہ ۱۴۔ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، جلد اول۔

۱۵۔ الوکیع، اخبار القضاۃ، جلد اول، صفحہ ۱۰۰ زیر عنوان شریح۔

۱۶۔ ملاحظہ ہو خورشید احمد فارق، حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط (اُردو)

۱۷۔ محمد حمید اللہ کے مطابق: "زیر بحث مکتوب ابو موسیٰ کی گورنری کے ابتدائی ایام میں لکھا گیا معلوم ہوتا ہے اور کعب بن سُوَر کے بطور قاضی تقرر سے پہلے (جو بقول ان کے ۱۸ھ میں قاضی مقرر ہوا تھا)

Administration of Justice under early caliphate, Journal of the Pakistan Historical Society. Karachi, January, 1971, Vol. XIX, Part I, p.2.)

۱۸۔ Emile Jyan, Histoire De L'Organisation Judiciaire En pays D'Islam, Leiden, E. J. Brill, 1960, pp. 77 - 82.

۱۹۔ یہ خیال تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ سشتہ کی بات ہے کہ وہ اپنے قبیلے کے پچاس افراد کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور مدینہ میں رہ پڑا (حمید اللہ، متذکرہ بالا، صفحہ ۳)

۲۰۔ ابن ہشام، سیرۃ، جلد چہارم، صفحہ ۲۶۰۔ بخاری، کانپور (ہندوستان ۱۳۰۹ھ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۶۴)۔

۲۱۔ i۔ ابن سعد، طبقات، بیروت ۱۳۷۷ھ، جلد دوم، صفحہ ۵۸۴۔

ii۔ جامع الترمذی، کانپور، جلد اول، صفحہ ۱۰۱ ۱۳۷۷

iii۔ سنن ابو داؤد، کانپور، جلد اول صفحہ ۱۴۹، کتاب القضاء

iv۔ وکیع، اخبار القضاۃ، جلد اول صفحہ ۹۰۔

v۔ ابن عبد البر، الاستیعاب، جلد اول، صفحہ ۱۳۸، حیدر آباد ۱۳۳۶ھ

۲۲۔ وکیع، اخبار القضاۃ، قاہرہ، ۱۳۶۶ھ صفحات ۸۶ - ۸۷ -

۲۳۔ یہ بتایا گیا ہے کہ مصالحت پر ابو موسیٰ کا تقرر اس حقیقت کی بنا پر تھا کہ علیؓ کی فوج بیشتر یمنی نژاد رضاکاروں پر مشتمل تھی اور یہ ان کے اصرار پر تھا کہ علیؓ نے بے دلی سے اسے اپنے اور معاویہ کے درمیان تحکیم میں نمائندہ نامزد کیا۔ ابن عبد البر مصالحتی فیصلہ میں (علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو برطرف کرنے میں) ابو موسیٰ کے رویہ اور علیؓ کے خلاف اس کے بغض میں کوئی تعلق پاتا ہے (حمید اللہ، متذکرہ بالا، صفحہ ۴) ۔

۲۴۔ i۔ ابن سعد، طبقات جلد چہارم، صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶، جلد ششم، صفحہ ۱۶ -

ii۔ ابن عبد البر، الاستیعاب ۱۳۳۶ھ، جلد اول صفحہ ۳۸۰۔

iii۔ احمد بن حنبل، مسند، جلد چہارم صفحہ ۳۹۶ -

iv۔ وکیع، اخبار القضاۃ۔ جلد اول صفحہ ۱۰۵ -

v۔ ابن ہشام، السیرہ، جلد چہارم صفحہ ۸۷ -

vi۔ طبری، تاریخ، جلد سوم صفحہ ۲۱۴ -

vii۔ بخاری، الصحیح، مصر ۱۳۱۲ھ جلد پنجم صفحہ ۱۶۱ -

viii۔ ابو یوسف، الخراج ۱۳۰۲ھ صفحہ ۶۲ -

ix۔ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، جلد اول صفحہ ۲۴ -

x۔ الجاحظ، البیان جلد اول صفحہ ۱۲۴ -

xi۔ المبرد، کامل جلد اول صفحہ ۴ -

(۲۴) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ہفتم صفحات ۲۲۵-۲۲۶ ۔

۲۵۔ حمید اللہ نے مخطوطات سے مزید شہادت پیش کی ہے معمر بن راشد البصری (متوفی ۱۵۴ھ) اپنی جامع (مخطوطہ) عن قتادہ متوفی ۱۱۷ھ) محمد الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) اپنی الاصل (مخطوطہ) عبدالرزاق بن ہمام (متوفی ۲۱۱ھ) اپنی مصنف (مخطوطہ) عن معمر عن قتادہ۔

عبدالملک بن حبیب القرطبی (متوفی ۲۳۸ھ) الواضحہ میں ۔
ابوبکر الخصاف (متوفی ۲۶۱ھ) اپنی ادب القاضی میں ۔
البزاز (متوفی ۲۹۲ھ) اپنی مسند میں (مخطوطہ) ۔
الحاکم المروزی الشہید (متوفی ۳۳۴ھ) اپنی المختصر الکافی میں (مخطوطہ) ۔
الجصاص الرازی (متوفی ۳۷۱ھ) اپنی شرح ادب القاضی للخصاف میں
الباقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) اپنی اعجاز القرآن میں ۔
الحلوانی (متوفی ۴۴۸ھ) اپنی المبسوط میں (مخطوطہ) ۔
ابن مازہ (متوفی ۵۳۶ھ) اپنی شرح ادب القاضی الخصاف میں مخطوطہ) ۔
ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ) اپنی تاریخ دمشق میں (مخطوطہ) ۔
الکسانی (متوفی ۵۸۷ھ) اپنی بدائع صنائع میں
ابن الجوزی (متوفی ۵۹۷ھ) اپنی تاریخ عمرؓ میں ۔

۲۶۔ Margliouth, The Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain 1910, pp.307-326.

۲۷۔ ڈوپ کے ابواب V IV V VI کا حوالہ دیا جاتا ہے ۔

۲۸۔ یہ تبصرہ ایمل تیاں نے اپنی کتاب Histoire De L'Organisation JU Judiciaire En Rays D'Islam, Leiden E.J.Brill, 1960 میں کیا ہے

ایمل تیاں کے علاوہ دوسرے مستشرقین جنہوں نے دستاویز کی سند پر شک پیدا کیا یہ ہیں:

Louis Milliot, Charles Pellat and Vincent Monteil

ہم تیاں کے اعتراضات پر متن میں بحث کر چکے ہیں مارگولیتھ نے مندرجہ ذیل نکات اٹھائے ہیں:

i ۔ 'قس' ایک یہودی لفظ ہے جو حضرت عمرؓ نے دستاویز میں استعمال کیا لہذا کوئی یہودی قانون داں حضرت عمرؓ کا مشیر تھا۔

ii ۔ تمام سلسلے قابلِ اعتماد گواہ نہیں ہو سکتے ۔ iii ۔ الفاظ میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔

۱۷/ - الماوردی کی تنقید - تنہا جاحظ ہی اسناد دیتا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ اعتراضات غلط فہمی پر مبنی ہیں "قس" قیاس سے صیغۂ امر ہے اور حضرت عمرؓ سے پہلے بھی عرب اسے اکثر استعمال کرتے تھے - یہی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دیگر اصحاب کے ساتھ ہے - جہاں تک اسناد کا تعلق ہے جاحظ کے علاوہ ہم نے اور بہت سی سندیں پیش کی ہیں - مسلمانوں کے معتبر ہونے کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک عام اصول مقرر فرمایا تھا۔ مستثنیات بہرحال ہوتی ہی ہیں - جب مفہوم میں کوئی فرق نہ ہو مترادفات سے دستاویز کے مستند ہونے میں لازماً کوئی شک پیدا نہیں ہوتا - مارگولیتھ نے اس نکتہ کی جو الماوردی نے اٹھایا پوری تحقیق نہیں کی - اس نے دراصل بعض باتیں ظاہر کی ہیں جو وہ دستاویز میں دیکھنا چاہتا تھا ۔

Louis Milliot نے اس دستاویز کا ذکر (i) Introduction a l'Etude droit

Musulman میں پیرس ۱۹۵۳ء، صفحہ ۶۹۳ اور Bulötin des Etudes Arabes الجیریا ء

صفحہ ۱۳۳ اس نے صرف ایل تیاں کے دلائل دہرائے ہیں ۔

Charles Pellat نے اپنی کتاب Le millieu basreen de Jahiz پیرس ۱۹۵۳ء میں کہا ہے

کہ یہ دستاویز صرف ایک سلسلہ رواۃ سے منقول ہے جو جاحظ کی کتاب میں ہے Pellat کو چاہئے تھا کہ کم از کم ان سلسلہائے روایت ہی پر غور کرتا جو خود جاحظ نے لکھے ہیں اگر ان پر نہیں تھا جو ہم نے اوپر درج کئے ہیں ۔

Vincent Monteil نے اپنے ترجمۂ مقدمہ ابن خلدون میں صفحہ ۴۳۸ پر مارگولیتھ اور روز نتھال کے علاوہ

Gottheil and D. Santillana کے حوالہ سے کہا ہے کہ یہ دستاویز جعلی ہونی چاہیے ۔

gotheil نے عربی کتاب "تاریخ قضاۃ مصر" کے تعارف صفحہ vii. viii پر ایک لفظ بھی دستاویز کے خلاف

نہیں لکھا - اور یہی حال D. Santillane کا - اپنی کتاب istituzioni di

Diracto musulmano malichita. جلد دوم میں ہے صفحہ ۵۶۹ ۔

۲۹ - تیاں ایضاً ۔

۳۰ - محمود بن محمد بن عرنوس تاریخ القضاء اردو ترجمہ از محمد احمد ۱۹۶۰ء لاہور صفحہ ۴۴ ۔

۳۱ - ابن خلدون، مقدمہ، بیروت ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۲۱ ۔

۳۲ - محمود بن محمد بن عرنوس متذکرہ بالا ۔ ۳۳ - الطبری التاریخ جلد چہارم صفحات ۲۱۴ - ۲۶۲ ۔

۳۴ - ابن حزم النبذ صفحات ۵۱، ۵۲ ۔ ۳۵ - ابن حزم الاحکام جلد ہفتم، مصر ۱۳۴۷ھ صفحہ ۱۴۶ ۔

۳۶ - ملاحظہ ہو مضمون تفصیلی مطالعہ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم جلد دوم صفحہ ۵۵ ۔

۳۷ - ابن حزم الاحکام جلد ہفتم صفحہ ۱۴۶ ۔ ۳۸ - یحییٰ بن معین، ابن حجر العسقلانی تہذیب، جلد ششم صفحہ ۴۲۸

۳۹ - خط کے مختلف سلسلہ اسناد ذیل میں دیئے جاتے ہیں :-

ا - ابو یوسف، عبید اللہ بن ابی حمید غالب الہذلی عن ابو مالک الہذلی ۔

ii - الجاحظ عن ابی یوسف، عبیداللہ بن ابی حمید غالب الہزلی عن ابی ملیح الہزلی ۔

iii - ابوالحسن علی بن عمر عن ابی جعفر محمد بن سلیمان الشعانی عن سہد اللہ بن ابی الصمد بن ابی خدکش عن عیسٰی بن یونس عن عبید اللہ بن ابی حُمید الہزلی عن ابی الملیح ۔

iv - الجاحظ عن سفیان بن عیینہ عن قتادہ ۔

v - الجاحظ عن ابی بکر الہزلی عن قتادہ ۔

vi - الجاحظ عن مسلمہ بن محارب عن قتادہ ۔

vii - محمد بن خلف الوکیع عن علی بن محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب عن ابراہیم بن البشر عن سفیان بن عیینہ عن ادریس العودی عن سعد بن ابی بردۃ ۔

viii - ابوبکر البیہقی عن ابی الطاہر الفقیہہ عن ابی حمید بن بلال عن یحیی بن الربیع عن سفیان عن ادریس العودی عن ادریس العودی عن سعد بن ابی بردۃ ۔

ix - ابوبکر عن ابی طاہر الفقیہہ عن احمد بن محمد بن یحیٰی بن الربیع عن سفیان بن عیینہ عن ادریس العودی عن سعد بن ابی بردہ ۔

x - سفیان بن عیینہ عن ادریس العودی عن سعد بن ابی بردہ ۔

xi - ابن قتیبہ عن کثیر بن ہشام عن جعفر بن برقان ۔

xii - ابوعبید القاسم بن سلام عن کثیر بن ہشام عن جعفر بن برقان ۔

xiii - ابونعیم الفضل بن دکین عن جعفر بن برقان عن معمر البصری عن ابی العوام ۔

xiv - ابوبکر البیہقی ابوعبداللہ الحافظ عن ابی العباس محمد بن یعقوب عن محمد بن اسحاق الصغانی عن ابن کنانہ عن جعفر بن برقان عن معمر البصری عن ابی العوام ۔

xv - البلاذری عن ابراہیم بن مسلم الخوارزمی عن وکیع عن سفیان عن قبیلہ شیبی کا ایک شخص ۔

xvi - احمد بن حنبل عن سفیان عن ادریس العودی عن سعد بن ابی بردہ ۔

۴۰ - ابن حزم، الاحکام جلد ہفتم صفحہ ۱۴۷ ۔ ۴۱ - ابن حزم ایضاً ۔

۴۲ - ایضاً ۔ ۴۳ - القرآن ۲۴ : ۴ و ۵ ۔

۴۴ - ابن حزم متذکرہ بالا۔

۴۵ - مالک بن انس نے اپنی موطا میں حضرت عمرؓ کا حوالہ اس مضمون کے سلسلہ میں دیا ہے (ملاحظہ کیجیے موطا، کتاب ۳۶ باب ۱، ایڈیشن ۱۹۵۱ء ۔ ۱۳۷۰ھ ۔

۴۶ - الشافعی نے اس کا حوالہ اپنی الام میں دیا ہے، جلد ہفتم صفحات ۱۱، ۳۵، ۹۷ ۔

۴۷ - ابن سعد، طبقات، جلد سوم ۔ ۴۸ - مندرجہ بالا تشریح نمبر ۱۲ ملاحظہ کیجیے ۔

۴۹- منٹگمری واٹ، .. Muhammad At Medina آکسفورڈ ۱۹۵۶ء، صفحہ ۲۴۴ -

۵۰ -

R B. Serjeant, The 'Constitution of Medina' The Islamic Quarterly A Review of Islamic Culture January - June, 1964. The Islamic Culture Centre, Regents' Lodge, 146 Park Road, London N.W.8

انگلینڈ - وہ دعویٰ کرتا ہے "بظاہر یہ ایک ہی دستاویز سمجھی جاتی ہے - حالانکہ میری ساری دلیل اس نظریہ پر مبنی ہے کہ در اصل یہ واضح طور پر الگ الگ دستاویزات کا مجموعہ ہے" تاہم وہ اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے "یہ دستاویز اتنی ہی دلچسپ بلکہ ابتدائی تاریخ اسلام کے لیے اہم بھی ہے . جتنا قرآن خود اور یہ بلا شک وشبہ مستند ہے"

یہ دیکھنا دلچسپی کا باعث ہے کہ مستشرقین اپنی مخصوص مذہبی مشنری ذہنیت کے تحت مختلف نظریے کسی نہ کسی اسلامی تاریخی مسئلہ پر تخلیق کرتے رہتے ہیں - واٹ کا ان خطوط کی صحت سے انکار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ملکوں کے بادشاہوں کو لکھے کسی تاریخی شہادت پر مبنی نہیں بلکہ صرف اس کی اس پریشانی پر ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام اقوام عالم کے لیے بھیجے گئے تھے (ملاحظہ ہو MUHAMMAD AT MEDINA صفحہ ۲۴۶) دیگر حالات میں SERJEANT ان خطوط کے مستند ہونے پر بہت مصر ہے اور انھیں بلا شک وشبہ مستند مانتا ہے - وہ کہتا ہے: "دیگر دستاویزات جو اتنی ہی بالقرب یا وثوق کے لیے اتنی ہی تاریخی اہمیت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت میں سے وہ خطوط ہیں جو ابھی تک ہمارے لئے محفوظ ہیں" ، (The Constitution of Medina p.1).

رسولؐ نمبر

ایک دستاویز، جو زندہ رہے گی

۱۲ ربیع الاوّل کے مُبارک موقع پر
صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاءُ الحق صاحب
کی تقاریر کے وُہ حصّے جو رسالہ نقوش سے متعلق ہیں

اس سال جو کتابیں چُنی گئی ہیں اُن کے علاوہ نقوش کے رسول نمبر پر بھی انعام (ایک لاکھ) دیا گیا ہے۔ یہ نقوش کے لیے خصوصی انعام تھا، جو مدیرِ نقوش محمد طفیل کی کوششوں کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ ماہرین کی نظر میں جیسا کہ آپ نے ابھی سُنا، اُن کے شائع کردہ رسولؐ نمبر کی چار جلدیں ادبِ سیرت میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ اس کارنامے پر جناب طفیل صاحب کو دِلی مبارکباد پیش کرتا ہُوں اور دُعا کرتا ہُوں کہ وُہ اپنے منصوبے کے مطابق رسولؐ نمبر کی دسُوں ضخیم جلدیں چھاپنے میں کامیاب ہو جائیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

○

سیرتِ طیبہ کے سلسلے کی ایک اور کاوش جس کا میں بطورِ خاص ذکر کرنا چاہتا ہُوں وہ نقوش کا رسولؐ نمبر ہے۔ یہ دسُوں جلدوں پر مشتمل ایک ناقابلِ فراموش تالیف ہے جس کے پہلے چار حصّے پچھلے سال مکمل ہو گئے تھے اور آخری چھ جلدیں اب مکمل ہُوئی ہیں۔ نقوش کے مدیر جناب محمد طفیل صاحب نے اگلے روز مجھے اس یادگار نمبر کا ایک سیٹ پیش کیا۔ میں انھیں اس کامیاب کاوش پر دِلی مبارکباد پیش کرتا ہُوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر سیرت پر کام کرنے والوں کے لیے ایک قابلِ قدر حوالہ یا REFERENCE WORK ثابت ہو گا۔

جس طرح سر سیّد احمد خاں نے کہا تھا: "اگر خدا نے مجھ سے پُوچھا کہ دُنیا سے کیا لائے ہو؟ تو میں جواب دُوں گا، مولانا حالی سے مسدس لکھوائی"۔ اسی طرح اگر مجھ سے سوال ہوا تو میں کہوں گا رسولؐ نمبر لایا ہُوں۔ گو یہ کام طفیل صاحب نے کیا ہے، مگر اس میں کچھ میرا بھی حصّہ ہے!

۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

○

ابتدائیہ

میں نے جب بھی کوئی نمبر پیش کیا، بڑی محنت سے پیش کیا، موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ وہ افسانہ نمبر ہو، غزل نمبر ہو، شخصیات نمبر ہو، طنز و مزاح نمبر ہو، مکاتیب نمبر ہو، آپ بیتی نمبر ہو، ادب عالیہ نمبر ہو، لاہور نمبر ہو، ادبی معرکے نمبر ہو، میر تقی میر نمبر ہو، غالب نمبر ہو، اقبال نمبر ہو، غرض جو نمبر بھی ہو، جو موضوع بھی ہو، میں نے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ اور میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہُوا۔ ایسا خیال صرف میرا نہیں، سبھی کا ہے۔ علماؑ کا بھی، دانشوروں کا بھی، ادبا کا بھی، شعرا کا بھی اور قارئین کا بھی!

رسول نمبر کا قصہ یہ ہے کہ یہ موضوع میرے دل کی گہرائیوں کا موضوع تھا اور ہے۔ اس نمبر پر میں نے اپنے تمام نمبروں سے زیادہ محنت کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے جُملہ نمبروں پر اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ اس پاک موضوع پر، تو یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، میرا خدا تو جانتا ہے، وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

جن نمبروں پر میں نے کم محنت کی اُن نمبروں کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ کہہ سکتا ہوں کہ حق ادا ہُوا۔ یہ نمبر جس پر میں نے جُملہ نمبروں سے زیادہ محنت کی اس کی بابت تکمیلِ کار کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جو یہ کہے کہ وہ اس موضوع کا حق ادا کر سکتا ہے وہ شخص عالم ہو سکتا ہے، وہ شخص سچا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال مَیں نے دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ، جو رسول نمبر پیش کیے وُہ اہلِ علم کے نزدیک معتبر ٹھہرے۔ وہ اہلِ صحافت کے نزدیک قابلِ ستائش ٹھہرے۔ وہ آرا، جو ایک عرصے کے بعد گم ہو جاتیں، اُنھیں میں نے صد درجہ ممنونیت کے ساتھ بہ طور گواہی یکجا کر دیا ہے۔

میرے نزدیک گواہی کی بڑی اہمیّت ہے۔ ہمارے رسولؐ اپنے آخری خطبہ میں تین بار فرماتے ہیں: اے لوگو! گواہ رہنا، اے لوگو! گواہ رہنا، اے لوگو! گواہ رہنا!!

محمد طفیل

التماس

۱۹۲ء کی بات ہے کہ مولانا محمود حسن نے شاہ عبدالقادر کی تفسیر پر نظرِ ثانی کرتے وقت لکھا:

"حضرت شاہ صاحب (شاہ عبدالقادرؒ) کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو ان شاء اللہ ایسا نہیں کہ اہلِ علم و دیانت میں کوئی اس کا منکر ہو۔ ہاں احقر نے جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے اس کی نسبت ضرور ہم کو خلجان ہے۔ اس لیے اہلِ علم و انصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو کر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابلِ اصلاح ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرمائیں اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرمائیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہلِ علم اور عوام دونوں کو مفید ہے ایک تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آجائے۔ جس طرح ہو اور جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔"

۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبیؐ کے بارے میں لکھا:

"سیرۃ نبوی جلد اوّل طبع اوّل کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے اس اثنا میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکسارانِ دار المصنفین کے لیے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا، اور امراء اور والیانِ ملک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا، بلکہ خواص اور علماؑ کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہلِ علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزانِ نقد میں سیرۃ کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسما کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظرِ ثانی کی، اہلِ تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی، اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انھوں نے اپنے نتائجِ افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے اُن سے فائدہ اٹھایا۔"

۱۹۸۱ء کی بات ہے کہ فدوی محمد طفیل نے بھی پوری دردمندی کے ساتھ اپیل کی تھی:

جو خواہش مولانا محمود حسن کی تفسیر کے بارے میں تھی ویسی ہی خواہش میری اس نمبر کے بارے میں ہے۔ وُہ عالم سہی میں طالب علم سہی، وہ برگزیدہ سہی میں گنہگار سہی۔ اس کے باوجود خواہش میری بھی وہی ہے کہ اس کام کو بھی بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ لہٰذا اس نیکی میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا (تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کی جا سکے) ——— جیسا کہ سیرۃ النبیؐ کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا ساتھ دیا تھا۔

محمد طفیل

جسٹس شیخ آفتاب حسین

مکرمی جناب محمد طفیل صاحب،

سلام مسنون!

مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے مجھے سیرت طیبہ پر مشتمل نقوش کا رسولؐ نمبر ارسال فرمایا۔ اس گرانقدر اور علمی تحفہ پر میں آپ کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی تمام انسانیت کے لیے ایسی مکمل اور جامع رہنمائی کی حامل ہے کہ انسانی حُسنِ کردار کی تمام تاریخ اس کے سامنے ایک پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی، بالخصوص دورِ جدید کی انسانیت کی فلاح سیرتِ طیبہ کو نمایاں کرنے ہی میں مضمر ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور خُوب سے خوب تر اسالیب اور پیشکش کے جدید و حسین زاویوں کے ساتھ منظرِ عام پر لایا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بروقت اور صحیح قدم اٹھایا ہے۔

نقوش کا رسولؐ نمبر بلا شبہ بہت قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے۔ ان شاء اللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔

والسلام علیکم

آپ کا مخلص

آفتاب حسین چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

دار العلوم، دیوبند، انڈیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبِ مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

چند روز ہوئے، پہلے آپ کے ماہنامہ نقوش کا رسولؐ نمبر دار العلوم دیوبند کے نام پہنچا تھا اس کے بعد اس نمبر کا پورا سیٹ

میرے نام وصول ہُوا۔ بڑے ولولہ اور شوق و اشتیاق کے ہاتھوں سے پارسل کھولا تو رسولؐ نمبر پر نظر پڑتے ہی جی باغ باغ ہو گیا۔ سبحان اللہ، صلِ علیٰ، آپ نے کیا اور کس درجہ عجیب و غریب اور دلکش و دل آفرین نمبر شائع کیا ہے، اسے نمبر کیوں کہئے یہ سیرتِ طیبہ کی انسائیکلو پیڈیا اردو زبان کی ہے۔ آپ نے 'نقوش' کے بڑے بڑے اور عظیم الشان نمبر شائع کر کے جس عالی حوصلگی، عزم بلند و جرأتِ بے باک کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب اس نمبر کے بعد ان اوصاف و کمالات پر حرارتِ ایمانی، عشقِ رسولؐ اور سوز و گدازِ قلب کا بھی اضافہ ہوا۔ اس پر آپ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں، نہ صرف میری اور مسلمانوں کی طرف سے بلکہ ہر محبِ انسانیت و شرافت کی طرف سے۔ فجزاکم اللہ جزاءً کثیراً۔

'برہان' میں ان شاء اللہ عنقریب "باب التقریظ والانتقاد" کے زیرِ عنوان اس پر مفصل تبصرہ شائع ہوگا۔ خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیریت و عافیت ہوں۔

والسلام مع الاکرام
مخلص سعید احمد اکبر آبادی

میاں طفیل محمد

محترمی و مکرمی مدیر نقوش جناب محمد طفیل صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کی طرف سے آپ کے موقر جریدہ نقوش کے رسولؐ نمبر کی پہلی چار جلدیں موصول ہُوئیں۔ آپ کی اس نوازش اور گراں قدر ہدیہ کے لیے تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ آپ کی یہ پیشکش ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے نہایت لائقِ تحسین ہے میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اپنے پیشِ نظر اس مقدس منصوبہ کی کما حقہٗ تکمیل کے لیے ضروری وسائل و ذرائع، ذوق و شوق اور مہلت عطا فرمائے۔ آخر میں اس ہدیہ کے لیے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خاکسار
طفیل محمد

مولانا نعیم صدیقی

برادرم طفیل صاحب! السلام علیکم

کوہکنی اس کا پیشہ ہے، قلم اس کا تیشہ ہے! وہ ہمیشہ شیریں نہر کی سرمستی شوق میں ایک نہ ایک پہاڑ کھودتا ہے اور ایک نئی جُوئے علم و ادب بہا نکالتا ہے کہ تشنگانِ معنی صدیوں سیراب ہوتے رہیں ——— کون؟ طفیلِ نقوش۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو بازار سے اٹھا اور اس انسانِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آرام گاہ تک جا پہنچا، جس کے دم سے

ظلمت کے صحرا میں نور کی ندیاں رواں ہو گئی تھیں، وہاں سے فیضیاب ہو کر لوٹا تو خامۂ مژگاں سے جگر کاوی کر کے ایک چشمۂ زمزم جاری کر دیا ـــــ یہ ہے "نقوش" کا رسول نمبر۔

آج سے دس برس پہلے کوئی یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ جس "نقوش" کا دائرہ شعر و افسانہ اور ادبی تحقیق و تنقید ہے وہ کبھی رسولِ برحق کی سیرت کو بھی موضوع بنائے گا اور بنائے گا بھی اس شان سے کہ قدیم و جدید نامور سیرت نگاروں کی فراموش شدہ اور تازہ تحریروں کو چمن در چمن سمیٹ کر ایک شاندار گلدستۂ معرفتِ رسالت مآب تیار کرے گا جس کے ہفت رنگ پھولوں سے طرح طرح کی خوشبوئیں نکل کر ضم ہوں گی اور قلب و نظر کی فضاؤں میں پھیلیں گی۔

چار ضخیم جلدیں، اکتیس سو صفحات پر پھیلی ہوئیں، طباعتی اور اشاعتی حسن سے آراستہ سامنے ہیں۔ سرسری طور پر ورق گردانی کے لیے بھی وقت چاہیے، ابھی تو دس جلدیں پوری ہوئی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قائم کیا تھا، اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل ـــــ شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا ادارہ "نقوش" نے قائم کیا ہے۔ آج اردو زبان کے ذخیرۂ سیرتِ پاک میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی

حمداً و سلاماً

محمد طفیل کو اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کا ایک خاص سلیقہ اور ذوق دیا ہے۔ ایک دن جب طفیل صاحب نے مجھ سے سیرۃ نمبر کا تذکرہ کیا اور اس کا پلان پیش کیا تو میرے وجدان نے باطن سے آواز دی کہ دنیائے ادب کے اس مسافر کو دربارِ نبوت سے طلب کر لیا گیا ہے اور الحمد للہ کہ ویسا ہی ہوا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔

"نقوش" کے سیرت نمبر کی چار ضخیم جلدیں میرے سامنے ہیں، مزید چھ جلدیں متوقع ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سیرتِ پاک سے متعلق مواد کا ایسا گلدستہ اور مجموعہ اردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا ـــــ ان چار جلدوں کو دیکھ کر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد طفیل صاحب کو حیاتِ دراز، صحت و عافیت اور ذوق و شوق چند در چند عطا فرمائے کہ یہ اس عظیم کام کو پوری دل جمعی سے پورا کر سکیں۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

برادرِ محترم مولانا محمد طفیل صاحب کی عظیم تالیف "نقوش" کا رسول نمبر سیرۃ نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس کی زیارت و مطالعہ سے یہ ناچیز مشرف ہوا۔ اس پر جو تاثرات قلب میں پیدا ہوئے تعبیر و بیاں کی محدود

دست میں وہ نہیں سما سکتے۔ میں صرف اسی قدر کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر علماء، ربانیین، محققین و مورخین نے جو کچھ علمی خدمت کی ہے نقوش کا رسولؐ نمبر ان تمام سابقہ خدمات کا مجموعہ ہے اور ساتھ ہی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ مبارکہ، آپؐ کے محاسنِ اخلاق، علمی و عملی فضائل و کمالات کا صحیح ترجمان ہے۔ آثارِ نبویؐ کا بلند پایہ مظہر ہے۔ ہر مسلمان کے ذمہ خاتم الانبیاء و المرسلین کی معرفت اور آپ کی ذاتِ اقدس سے تعلق ضروری بلکہ عین مقتضائے ایمان ہے کیونکہ ہر مومن کا ایمان آپؐ ہی کے آفتابِ نبوت کی تجلّیات و انوار کا فیض ہے تو جس طرح روشنی کی معرفت آفتاب کی معرفت پر موقوف ہے اسی طرح ہر مومن کو اپنی معرفت بھی بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کے ممکن نہیں۔ وہ اپنے وجودِ ایمانی میں سراپا محتاجِ پیغمبر ہے۔ تو اس بلند پایہ خدمت نے ہر مسلمان کے واسطے یہ سعادتِ عظمیٰ مہیا کر دی ہے کہ وہ اپنے وجودِ ایمانی کو پہچانے اور ساتھ ہی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات و محاسن کی معرفت حاصل ہو اور یہ جانے کہ آپ کا وجود باجود اُمت کے لیے بلکہ تمام عالم کے لیے قدرِ عظیم اور بلند پایہ نعمت ہے۔ انعام کمال اور محاسن کا علم ذریعہ محبت ہے۔ ہر منعم و محسن اور باکمال کے ساتھ قلب کی وابستگی انسانی فطرت کا تقاضا ہے تو رسولؐ نمبر میں مرتب کردہ مضامین ایک طرف کمالاتِ نبویہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں تو دوسری طرف مومن کے قلب میں محبتِ رسولؐ پیدا ہونے کا باعث ہیں جو دین و دنیا کی جملہ سعادتوں کا ضامن ہے۔ رسولؐ نمبر میں جمع کردہ مضامین، بلند تحقیقی مقالے اور مستند مضامین ہیں۔ سلف صالحین اور ائمہ متکلمین کے مسلک اور ان کی تحقیق کے مطابق ہیں۔

دعا ہے کہ خداوندِ عالم اس علمی گرانقدر سرمایہ سے اُمت کو زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے اور حضرت مؤلف کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم۔

والسلام

ناچیز محمد مالک کاندھلوی

مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر! صبحِ صادق کی روشنی پھیل رہی ہے، مؤذنوں کی آوازوں اور اذانوں کی گونج اور سرد ہوا نگاہ اور دل و دماغ کو نور و سرور کے عالم میں لیے جا رہی ہے۔ کل ماہِ بہارِ عارفین ربیع المیلاد کی پہلی تاریخ تھی اور طفیلِ محمدؐ محمد طفیل کی قسمت کا ستارہ نئے اُفق سے اُبھر رہا تھا۔

دس سال گردن جھکاتے، کچھ کریدتے، غوطے لگاتے، قلم چلاتے رہے۔ موتی پرو دیے، پتھر جمع کیے، ان کے رنگ ڈھنگ دیکھے اور پھر انھیں جوڑا۔ چمن چمن گئے، کیاری کیاری سے پھول توڑے اور بڑے بڑے گلدستے بنائے رنگین اور مہکتے ہوئے۔

'نقوش' کا رسولؐ نمبر تین ہزار صفحات سے متجاوز یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو طفیل صاحب نے چھاپ کر بارگاہِ پروردگارِ عالم میں پیش کر دیا۔ اللہ اُن کی سعی مشکور قرار دے۔ وہ نئے اُفق میں داخل ہو گئے۔

محمد طفیل صاحب کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیشکش کا سلیقہ اور طریقہ اُن کی عقیدت اور حقیقت، ان کا عشق اور جذبہ جو رنگ لایا ہے وہ ان کے چہرے اور لبوں پر بول رہا ہے ۔ یہ کامیابی اور بہت بڑی کامیابی، یہ سُرخ رُوئی اور گُل فشانی مبارک ہو اور یہ ہدیہ قبول ہو۔

(۲)

میں پُوچھوں کہ مزاج مبارک ؟ تو آپ کہیں گے ہم اس کے ہیں ہمارا پُوچھنا کیا۔ ہاں صاحب ! آپ کو یہ کہنے کا حق ہے آپ انھیں کے طفیل خوش و تندرست رہیں اور انھیں کے لیے کام کریں اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے !

ہمیں مدرسے میں ادب کے نام سے خدا جانے کیا کیا پڑھایا جاتا تھا۔ جب ہم پُوچھتے تھے کہ حریری کا فائدہ ؟ تو اساتذہ فرماتے تھے یہ مقدمات میں سے ہے، عربی کے رنگا رنگ پہلو، زبان اور کلمات کے استعمالات اس لیے پڑھائے جاتے ہیں کہ کلام اللہ شریف و حدیث مبارک سمجھنے میں آسانی ہو، نہ وہ پاک کلام ہے ۔

نقوش کے سب نمبر مقدمہ اور یہ نمبر ان تجربوں کے بعد ایک اساسی کام ہے ۔ مبارک باد اور دعائیں توفیق مزید اور پیش قدمی کی آرزو ہے ۔

مرتضیٰ حسین از ایران ۔ تہران

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مکرمی والمحترم ۔ السلام علیکم

نقوش کے سیرت نمبر کی چار جلدیں موصول ہُوئیں۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی ۔ کیا عجب کہ یہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہِ سفر ہو جائے ۔ ظاہری اور معنوی حیثیت سے یہ دیدہ زیب اور راحتِ دل ہے۔ آپ کے اس نمبر کے ساتھ لوگوں کا مطالعہ ہمارے یہاں کی سیرت ہفتم کا بھی ہو جائے گا۔

آپ نے نقوش کے بہت سے نمبر نکالے ہیں۔ یہ سارے نمبر آپ دار المصنفین کے کتب خانے کے لیے بھیج دیں۔ نقوش کے نمبر ہر کتب خانے کے لیے باعثِ زینت ہیں۔

خدا کرے آپ کا مزاج گرامی ہر طرح مع الخیر ہو ۔

والسلام

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سید ابوالحسن علی ندوی

مکرمی ! زید لطفہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے دونوں عنایت نامے نظر نواز ہوئے۔ میں نے پہلے ہی خط کے جواب میں رسولؐ نمبر کی رسید دے دی تھی۔

تعجب ہے کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا۔ بہرحال اس مبارک، قیمتی، قابل قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعے آپ نے سعادتِ دارین کا اچھا سامان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔

والسلام

مخلص ابو الحسن علی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

رسولؐ نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں۔ عنایت کے بوجھ سے کچل گیا۔ خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے۔

(۲)

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں مرسلہ گراں مایہ تحفہ پہنچا۔ یعنی رسالہ نقوش کا رسولؐ نمبر جلد ۵ تا ۱۰ ———— میں کہہ نہیں سکتا کتنا متاثر ہوا، اور آپ نے کتنی محنت اٹھائی ہے! اللہ آپ کو حسناتِ دارین عطا فرمائے۔

سیّد اسعد گیلانی

برادرِ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

نوازش نامہ ملا، ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت، حوصلہ اور اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ سرسیدؒ نے جب یہ لکھا کہ میں سرولیم میور کی ظالمانہ کتاب (جس میں اس نے حضور اکرمؐ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے تھے) کا جب تک جواب نہ دوں گا میرے لیے چین حرام ہے چاہے مجھے حضور اکرمؐ کی آبرو کی خاطر کاسۂ گدائی لے کر نکلنا پڑے۔ اس کے ان الفاظ نے میرے دل کی ساری کدورتیں اللہ کے اس بندے کے بارے میں صاف کر دیں اور میرا نقطۂ نظر اس کے بارے میں بدل گیا مجھے اس کے مقصد میں اخلاص کا یقین ہو گیا۔

اور آپ تو رسولِ اکرمؐ کے بارے میں نقوش کی ۱۰ جلدیں اور اپنا سارا آرام چین تج کر اور حضور اکرمؐ کی خاطر اپنی انا کو ڈبیہ میں رکھ کر نکل کھڑے ہوئے ہیں آپ کے خلوص میں کون شبہ کر سکتا ہے اور خلوص کا جواب خلوص ہی ہوتا ہے۔ آپ مطمئن رہیے اِن شاءاللہ جو میرے بس میں ہو گا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر حامی و ناصر ہے۔

(۲)

نوازش نامہ ملا۔ اس سے پہلے چار جلدیں نقوش کے رسولؐ نمبر کی مل چکیں جس کی میں نے رسید ارسال کر دی تھی۔

میں نے ان کی ورق گردانی کی اور آپ کے دیباچوں کو بھی دیکھا ہے۔ جس خلوص و محبت اور عشقِ رسول اکرمؐ کی کیفیت ان میں پائی جاتی ہے اس سے دل پر بہت اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوفِ خدا اور عشقِ رسولؐ کی وافر مقدار عطا فرمائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہے باقی جو کچھ ہے وہ کباڑ کا ڈھیر ہے۔

اتنے عمدہ مضامین آپ چن چن کر لائے ہیں۔ ان کو گلدستہ کی مانند اپنے معروف سلیقے سے سجایا اور گلدستۂ حُبِ نبویؐ بنایا ہے کہ بے ساختہ آپ کو دربارِ رسول مقبولؐ کی بہترین نشست گاہ کا اہل سمجھنے لگا ہوں۔

آپ تشریف لائیں تو سر آنکھوں پر، اپنے ہاں بلائیں تو بسر و چشم حاضر ہونے کو تیار ہوں۔ سیرت کے حوالے سے آپ کی سرفرازی ہزار مبارکباد کی مستحق ہے۔

آپ کا مخلص بھائی اسعد گیلانی

محمد صلاح الدین

محترم محمد طفیل صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

نقوش کے "رسولؐ نمبر" کی چار جلدیں موصول ہوئیں، اس متبرک ہدیہ کا شکریہ اور اس عظیم سعادت کے حصول پر آپ کو مبارک باد۔

مجھے آپ کا پیکٹ یکم جنوری کو موصول ہوا۔ اس لیے اس ہفتے صرف مولانا نعیم صدیقی صاحب کا تبصرہ شائع ہو سکے گا جمعہ ۱۴ جنوری کو ادبی صفحہ پر ان شاء اللہ سیر حاصل تبصرہ شائع ہوگا۔ آپ کے لیے ایک اور مبارکباد بھی واجب ہے، یعنی ایک لاکھ روپے کا نقد انعام جو آپ نے صدرِ مملکت جناب محمد ضیاء الحق صاحب سے وصول کیا۔ یہ اس آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ غلام کا ادنیٰ سا تحفہ ہے جس سے آپ حقیقی، ابدی اور ناقابلِ تصور اجر و انعام وصول پائیں گے۔ خدا آپ کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین والسلام

آپ کا بھائی

محمد صلاح الدین مدیر روزنامہ جسارت کراچی

قدیر الدین احمد ریٹائرڈ چیف جسٹس

جناب محمد طفیل صاحب

السلام علیکم

آپ کے خط مورخہ ۵ ۱/۸۴ کا عبوری جواب میں نے دے دیا تھا امید ہے کہ آپ کو ملا ہوگا۔ اُس وقت تک رسولؐ نمبر کی

چار جلدیں مجھے نہیں مل سکیں۔ اب میں نے ان کو دیکھا ہے اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وُہ تو بہت دیر طلب کام ہے، تاہم آپ کی فرمائش کے مدِنظر اپنی رائے پیش کرنا چاہتا ہُوں۔

سب سے پہلے تو ان چار جلدوں کی شان و شوکت کا ذکر کر دُوں۔ ماشآ اللہ بہت دیدہ زیب سیٹ ہے اور مُجسّم بھرپور ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ آپ نے مضامین کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ چاروں جلدوں میں بہت کچھ وہی شامل ہے جس کو ان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دس جلدوں میں کیا کچھ آ سکے گا اور کیا رہ جائے گا۔ ابھی تو پانچویں جلد کے مضامین کی بھی خبر نہیں ہے۔

تیسرا تاثر مجھ پر یہ مرتّب ہوا ہے کہ اکثر مصنّفین پایہ کے ہیں اور مضامین عالمانہ ہیں۔ البتّہ سب ایک معیار کے نہیں ہیں۔ بعض بعض بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں مگر یہ فرق ناگزیر ہے۔ نفسِ مضامین کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ توہمات نگاری سے اجتناب پایا جاتا ہے جو اس زمانہ کے لیے بڑی خُوبی کی بات ہے۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر طلب قدیرالدین احمد

مولانا عبدالقدوس ہاشمی

مکرم و محترم جناب محمد طفیل صاحب مدیرِ نقوش زید اخلاصہٗ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ پرسوں ہی مل گیا تھا۔ آج کی ڈاک سے نقوش رسولؐ نمبر کی چار جلدیں وصول ہوئیں۔ صمیمِ قلب سے اس عنایت کرم کے لیے شکر گزار ہُوں اور دُعا کرتا ہُوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس بے مثال دینی و علمی کارنامہ کو قبول فرمائے اور آ... آخرت میں اس عمل صالح کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

نقوش کے پچھلے سارے خاص نمبر بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھے تھے۔ لیکن یہ رسولؐ نمبر تو حقیقۃً بے مثال ... اس قدر ظاہری اور باطنی خوبیوں کے ساتھ اتنا وسیع اور کامل مجموعہ کہ جیسے سیرۃ طیّبہ پر ایک وسیع دائرۃ المعارف بن گیا ہے ... آپ کی ہمت، اخلاص اور وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ آخر میں پھر اس قیمتی ہدیہ پر شکریہ پیش کرتا ہوں۔ جزاک اللہ خیر ...

مخلص دُعاگو

عبدالقدوس ہاشمی

ظہور احمد اظہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی محمد طفیل صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

سب سے پہلے تو میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے کہ آپ نے "نقوش" کا شاندار رسولؐ نمبر شائع کر کے اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی بھی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ یہ نمبر بلاشبہ اہلِ علم کی قدردانی کا مستحق ہے اور ان شاء اللہ آپ کے لیے توشۂ آخرت بھی ہوگا۔ اس کے بعد آپ کا شکریہ بھی واجب ہے کہ مجھ جیسے کم علم انسان کو نوازا۔ یہ آپ کا کرم ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!

آپ نے اس نمبر میں سیرت نبویؐ کے بہت سے گوشوں کے متعلق نہایت وقیع، مفید اور مستند معلومات جمع کر دی ہیں، تاہم اس بحرِ بیکراں کے لیے تو سفینہ چاہیے! اگر آئندہ بہت سے نمبر آپ اس کے لیے مختص کر دیں تو نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں آپ سیرت نبویؐ پر ایک وسیع ذخیرۂ معلومات یکجا کر جائیں گے بلکہ یہ بات دوسروں کے لیے ایک قابلِ فخر و قابلِ تقلید مثال بن جائے گی۔

دنیا کے مختلف گوشوں میں متعدد زبانوں میں چودہ صدیوں کے دوران جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کی ایک جامع فہرست شائع ہو سکے تو یہ سیرت نبویؐ کا ایک ناقابل فراموش اور عظیم الشان کارنامہ ہوگا۔ اگر کسی خدمت کے قابل سمجھا جاؤں تو باعثِ سعادت سمجھوں گا۔ "فصاحتِ نبویؐ" کے عنوان سے میری کتاب چند روز تک منظرِ عام پر آ رہی ہے ہدیہ کروں گا۔

مخلص ظہور احمد اظہر

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

جناب محترم و مکرم دام مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

"نقوش" کا رسولؐ نمبر (چار حصے) موصول ہوا۔ آپ نے عقیدت اور علمی خدمت کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ پاک آپ کو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت، شفقت اور شفاعت نصیب فرمائے اور آپ جیسے نیک بندوں کے طفیل مجھ جیسے سیاہ کار کی بھی آخرت میں شرم رکھ لے۔ آمین ثم آمین!

ایک نعتیہ رباعی کا مصرع ہے:

دیر آمدہٖ ز دور آمدہٖ

یہ نعتیہ نمبر بھی اسی طرح خطاب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ میری زندگی میں شائع ہو گیا۔ جزاکم اللہ فی الدارین احسن الجزاء۔

احقر غلام مصطفیٰ

مالک رام

عزیزی! آداب

چند دن ہوئے نقوش کا رسولؐ نمبر (چار جلدیں) موصول ہوا۔ کیا بتاؤں کہ اسے دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ میں اس کے لیے ایک مضمون "رحمۃٌ للعالمین" لکھنا چاہتا تھا لیکن چونکہ جس نہج پر لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے پورا مطالعہ نہ کر سکا، نہ مواد جمع ہوا۔ اس لیے آج تک اسے قلمبند نہیں کر سکا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں اس نمبر میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گا۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ایک پرانا مضمون کہیں سے ڈھونڈ نکالا، کم از کم کامل محرومی سے بچ گیا۔ جو مضمون زیرِ غور ہے ان شاء اللہ وہ بھی مکمل ہو جانے پر حاضر کروں گا۔ وما توفیقی الّا باللہ العظیم۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

میرے فاضل دوست!

السلام علیکم۔

میں فالج کا مریض بن کر علاج کے لیے تین ماہ سے راولپنڈی میں ہوں۔ آپ کا مکتوب گرامی جو ۲/۸/۵ کو لاہور سے چلا تھا ۲/۱۰ کو مجھے یہاں ملا۔ ظاہر ہے کہ میری خاموشی کی وجہ معقول تھی۔ اور اس لیے قابلِ معافی۔

آپ نے رسولؐ نمبر اس شان و شوکت سے نکال کر مسلمانانِ عالم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اگر تمام مسلمان مل کر بھی آپ کا شکریہ ادا کریں تو بھی پوری طرح حق ادا نہ ہو۔ بہر حال آپ کی نجات کے لیے رسولؐ نمبر کے چند صفحات کافی تھے۔ پورا نمبر تو یقیناً آپ کو حضورؐ کی ہمسائیگی میں پہنچا دے گا۔ آپ میری صحت کے لیے دعا کریں۔

نیاز مند برقؔ

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

برادرِ گرامی سلام و رحمۃ

نقوش رسولؐ نمبر کی چھ جلدیں مل گئی تھیں مجھے خود بھی رنج ہوا کہ ان میں میری ایک سطر بھی نہ آ سکی۔ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو میں نقوش کے لیے کچھ لکھتا ہوں تو بہت محتاط رہتا ہوں، اس میں چھپنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ نظر کے سامنے جانے گا ایسا نہ ہو کہ بجائے سُرخ رُوئی کے شرمندگی کا سامنا ہو۔ دوسرے جب سے مجھے شعبے کی صدارت ملی ہے کام بہت بڑھ گیا ہے۔

پہلے ہی خاصا مصروف رہتا تھا، اب تو بُرا حال ہے ۔ پھر بھی قرآن کریم سے متعلق باقی جلدوں کے لیے ایک مفصل مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے خدا کرے اس سے کچھ تلافی ہوجائے ۔ والسلام

آپ کا نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ندوی

محترم گرامی جناب محمد طفیل صاحب زید لطفکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"نقوش" کے ریکارڈ توڑ نمبروں میں "رسول نمبر" تو ظاہری باطنی ہر لحاظ سے سب سے بڑھ چڑھ کر رہا، اور ابھی تو اصل منصوبہ کے مطابق نصف نمبروں سے بھی کم سامنے آئے ہیں، جلدیں مکمل ہوجائیں گی تو آپ کو کن الفاظ میں مبارکباد دی جائے گی ! کیا

ثبت است بر جریدۂ عالم "نقوش" ما

کا مصرع اس وقت تک کے لئے محفوظ رکھوں ؟

(۲)

سال بھر کے انتظار کے بعد رسول نمبر کی بقایا چھ جلدیں موصول ہُوئیں، دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی بخاص کر اس لیے کہ موجودہ جلدوں کا معیار نقشِ اوّل سے بہتر اور بلند تر ہے، اور ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ آپ نے جس والہانہ محبت و تعلق کے ساتھ اس نمبر پر محنت کی ہے وہ نادر ہے ۔ خدا کرے کہ آپ کی خواہش پُوری ہو اور یہ نمبر آپ کی دُنیوی اور اُخروی سعادت کا ذریعہ بنے ۔

مزید دو ایک جلدوں کی لالچ نے آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا ہے، خاص کر یٰسین صاحب کی کتاب کے ضمائم اور حواشی نے ۔

آپ کا مسعود الرحمٰن

ڈاکٹر جمیل جالبی

مجی محمد طفیل صاحب ! سلام مسنون

ڈاک سے نقوش کا رسول نمبر موصول ہُوا جس کے لیے آپ کا انتہائی شکرگزار ہوں ۔ ماشاءاللہ، کیا نمبر نکالا ہے ! دیکھ کر رُوح تازہ ہوگئی ۔ کل سے اس نمبر کو پڑھ رہا ہُوں ۔ آپ نے اس موضوع کو نیا تناظر دیا ہے، خدا آپ کو خوش و خرم رکھے اور دین و دنیا کی دولت سے مالا مال کرے ۔

(۲)

نقوش کے رسول نمبر کی جلد پنجم، ششم، ہفتم اور ہشتم موصول ہوئیں ۔ سبحان اللہ ! کیا کام کیا ہے ۔ خدا آپ کو اجرِ عظیم دے ۔

یہ کام آپ ہی کر سکتے تھے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا مخلص
جمیل جالبی

مشفق خواجہ

محترمی و مکرمی! سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور پھر نقوش کا سیرت نمبر۔ ان عنایات کے لیے ممنون ہوں۔ سیرت نمبر ہر اعتبار سے ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ تین دن سے یہ رسالہ ہے اور میں ہوں۔ یقین کیجئے کہ یہ کام صرف دولت کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا تھا، اگر عشقِ صادق رہنما نہ ہوتا تو اتنا شاندار نمبر شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ واقعی آپ کام کرتے ہیں اور کام بھی زندہ رہنے والا۔

آپ کی درازیِ عمر، صحت اور شادمانی کی دُعا کرتا ہوں کہ آپ بڑے بڑے کام انجام دیتے رہیں۔

(۲)

سیرت نمبر کے چھ مزید شمارے ملے۔ سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس عظیم کام کو آپ ہی انجام دے سکتے تھے۔ خدا آپ کو صحت و شادمانی کی دولت سے مالامال کرے تاکہ آپ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ ایسے بڑے بڑے کام تا دیر انجام دیتے رہیں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ

سیّد ضمیر جعفری

محمد نقوش کی طرف سے نقوشِ محمدؐ کا تحفہ مل گیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں! میرا دل کہتا ہے آپ کی یہ سوغات حضورؐ کی بارگاہ میں قبول ہو گی۔ آپ نے اپنی بخشش کا پروانہ جیب میں رکھ لیا۔

آپ کا اپنا
ضمیر

لیفٹیننٹ جنرل کے۔ ایم۔ عارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی! السلامُ علیکم۔

آپ نے تو "رسولؐ نمبر" سے میرا گھر بھر دیا۔ پچھلے سال اس تاریخی "رسولؐ نمبر" کی پہلی چار جلدیں ملیں اور کل اس کی آخری چھ جلدیں موصول ہوئیں۔ اب اس جلدوں کا یہ متبرک سیٹ میری ذاتی لائبریری کا موقر ترین حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

میں اس گرانقدر تحفے کے لیے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کا خیراندیش

عارف (خالد محمود عارف)

جیلانی بانو

بھائی! آداب عرض۔

ابھی رسولؐ نمبر کی چھے جلدیں ملیں۔ یہ نایاب، عظیم تحفہ پاکر آپ کے لیے دل سے دُعا نکلی۔

اوا کیا کروں؟

پہلے والی چار جلدیں ابھی تک پڑھے جارہی ہوں۔ اب ان چھے جلدوں کی روشنی ملے گی۔ انور تو بہت خوش ہوئے۔ اپنے ڈپارٹمنٹ لے گئے لوگوں کو دکھانے (اسلامک سٹڈیزہ والے ہیں نا)۔ انور کا خط آپ کو مل گیا ہوگا!

آپ نے ایک سے ایک بھاری بھرکم نمبر نکالنے کی روایت ڈالی۔ مگر اب تو آپ اردو ادب سے باہر پاؤں رکھ چکے ہیں، رسولؐ نمبر تو عالمی ادب میں جگہ پائے گا۔ سیرت پر اتنا مواد کیسے اور کہاں اکٹھا مل سکتا ہے!

آپ کی بہن بانو

ممتاز مفتی

محترمی۔ ایک وہ زمانہ تھا جب میں تم سے محبت کیا کرتا تھا۔ جب محبت کا عالم ہو تو شکریہ ادا کرنے کی نہ ضرورت ہوتی ہے نہ گنجائش۔ اب محبت تو تم نے کاٹ کر رکھ دی، اب میں تم سے عقیدت رکھتا ہوں اور تمہارا احترام کرتا ہوں۔ میرا بس چلے تو احترام نہ کروں مجبوری میں کرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ تم نے بحیثیت مصنف اور ایڈیٹر جو جو کارہائے عظیم کر دکھائے ہیں، انھیں تسلیم نہ کرنا ناممکن العمل ہے۔ بہر حال لب لباب یہ ہے کہ تم نے رسولؐ نمبر بھیجا، میں بیحد شکرگزار ہوں۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔ میں بھی ایک چھوٹی سی کتاب "یا ترا" بھیج رہا ہوں، شرم آتی ہے، اونٹ کے منہ میں زیرہ والی بات ہے۔

ممتاز مفتی

ڈاکٹر حنیف نقوی

مکرمی! سلام مسنون۔

پندرہ سولہ دن قبل رسولؐ نمبر کی چھ جلدیں موصول ہوئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی اس نوازش بے پایاں اور کرم بے نہایت کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ جس طرح خاص نمبروں کی ترتیب و اشاعت کے معاملے میں اردو صحافت کی تاریخ میں آپ خود ہی اپنی مثال ہیں، اسی طرح اپنے نیازمندوں کے ساتھ اس حسنِ سلوک میں بھی کوئی آپ کا نظیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح اردو صحافت کی تاریخ میں نت نئی روایتیں قائم کرتے رہیں اور آپ کی ان مساعیِ جمیلہ کے نتیجے میں اردو زبان و ادب کا دامن مالا مال ہوتا رہے۔ آمین

مخلص

حنیف نقوی

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

برادرِ گرامی قدر۔ سلام مسنون۔

آپ کے بھیجے ہوئے رسولؐ نمبر کے بقایا شاہکار ملے۔ سیرتِ نبویؐ پر آپ نے جو کام پیش کر دیا ہے وہ مدتوں اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار رہے گا۔ اور آئندہ جو بھی اس مقدس موضوع پر کام کیا جائے گا وہ آپ کے عظیم و شاندار کارنامے کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ مقدس موضوع، قیمتی مواد، بیش از بیش تحقیقات اور اس پر آپ کا سلیقہ، پیش کرنے کا حسین و دلنواز انداز۔ اُردو میں آپ کا کارنامہ یقیناً سیرتِ نبویؐ کے شایانِ شان ہے۔ سچ مانئے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور ملا۔

ابھی پروردگارِ عالم آپ سے سیرتِ رسولؐ اور اپنے کلامِ پاک کی خدمت لینا چاہتا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے اور بارگاہِ ربّ العزت میں دُعا بھی کہ وُہ آپ کو ہمارے درمیان تا دیر بہ صحت و توانا قائم و دائم رکھے گا۔ آپ کی بیماری دراصل صدقہ ہے آپ کی جان کا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہر بڑے کام کے بعد اسی طرح نظرِ بد کے اثرات سے بچاتا ہے۔

خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے اب قرآن نمبر کا بیڑا اٹھایا ہے۔

محمد یٰسین مظہر صدیقی

محمد اکبر الدین صدیقی

محترمی و معظمی! السلام علیکم۔

نقوش کا رسولؐ نمبر چار جلدوں میں بہ احتیاط تمام بغیر کسی گزند کے وصول ہوا۔ سراپا سپاس ہُوں۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی سیرت پر اس قدر مواد نہیں۔

پینتیس سال قبل ایک چھوٹے سے مقام پر میں امتحان کے نگرانِ کار کی حیثیت سے گیا تھا وہاں ایک ساٹھ سالہ

ضعیف اردو سیکھ کر اردو دانی کا امتحان دے رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس عمر میں آپ نے یہ زحمت کیوں کی؟ تو کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ مذہب اسلام کے تعلق سے جتنا مواد اُردو میں ملتا ہے اور کسی زبان میں نہیں، میری مادری زبان کنڑی ہے، اردو سیکھ کر اپنی مذہبی کتابیں خصوصاً قرآن کے تراجم پڑھوں گا۔

سیرتِ رسولؐ پر نقوش کا رسولؐ نمبر سب کتابوں سے بے نیاز کر دے گا۔ خدا آپ کو ہمت دے اور تندرست رکھے کہ اسلام کی اس قدر عظیم خدمت فرما رہے ہیں۔ ادب کی بھی آپ نے کچھ کم خدمت نہیں کی۔

محمد اکبرالدین صدیقی

ابوسلمان شاہجہانپوری

باسمہٖ

حضرت مخدومی! آپ جس طرح ایک دُور افتادہ نیاز مند طالب علم کو جس طرح اپنی بے غرضانہ نوازشوں سے نوازتے ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اسے آپ کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی و سُرخ رُوئی کا وسیلہ بنائے اور جس اسمِ سامیؐ کو آپ نے دنیا میں روشن کیا ہے آخرت میں اسی وجودِ قدسی کا قرب و معیت نصیب ہو۔

رہا آپ کے اس عظیم الشان کارنامے کا تو لیس کمثلہ شیٔ۔

جس طرح سیرتِ طیبہ کا ہر گوشہ اور اس کا ہر نکتہ دُنیا کے تمام اخلاقی اقدار، جامعیت کے خصائص اور فضائل و محاسن کے بلند سے بلند معیارات سے بلند تر ہے اور کوئی انسانی ذہن اس بلندی کا تصور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح نقوش کا رسولؐ گرامی نمبر علم و تحقیق کے بلند سے بلند معیار اور جامعیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ خصائص سے ماوراً ہے۔ مجلاتی صحافت کی کسی زبان کی تاریخ میں تصنیف و تالیف کی کوئی ایسی مثال اور حسنِ جامعیت کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں کہ تبلیغ و تفہیم کے لیے اس کا نام زبان پر لایا جائے۔ اگر کوئی مثال ہے تو یہی نقوش کا رسولؐ نمبر۔ آپ نے یہ نمبر شائع فرما کر علم و تحقیق اور دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔

خاکسار، ابوسلمان شاہجہانپوری

مصوّر سبزواری

برادرِ محترم محمد طفیل صاحب! آداب و نیاز!

سوچتا ہوں کہ پاکستان بننے کے بعد کئی دہائیوں سے نقوش کے بے نظیر اور ضخیم ادبی نمبر نکال کر آپ نے جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں وہ اگلی نسلوں کے لیے ناقابلِ یقین ہوں گی اور پھر چُپ چاپ یہ جان لیوا اہتمام۔ کوئی شکوہ نہ کساد بازاری کا نہ عدمِ ترسیلیت کا۔ جتنے آج کے ادبی جرائد کے مدیرانِ کرام شاکی رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو ادب میں جمود اور

موت کی افواہ تک اڑا دیتے ہیں۔ خدا آپ کے کاروانِ عزم کو اسی طرح جاری رکھے۔ آپ کے بارے میں ایک بار شاید جمیل ملک یا اشفاق احمد نے ستائشی انداز میں کہا تھا کہ محمد طفیل صاحب کی رازداری کی یہ صفت ہے کہ جو کرنا چاہتے ہیں اسے بتاتے نہیں اور جو بتاتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

نیاز کیش

مصور سبزواری

کرنل محمد خاں

جناب طفیل صاحب! السلام علیکم۔

کولمبس نے ساری زندگی میں ایک دنیا ڈھونڈی تھی، آپ ہر سال ایک نئی دنیا دریافت کرتے ہیں۔ آپ کی ادبی معرکوں کی دنیا کی سیر سے ابھی سیر نہیں ہوئے تھے کہ آپ نے ایک اتنی ہی وسیع اور قابلِ دید دنیا ——— عصری ادب کی ——— بنا سجا کر پیش کر دی۔ ایں کار از تو آید و ....

شاید آپ کو احساس نہ ہو، ان کارناموں کی بدولت آپ نے زندگی میں ہی ایک تاریخی اہمیت اور مقام حاصل کر لیا ہے اور بجا طور پر کہ یہ آپ کی اپنی محنت، ذہانت اور دیانت کا ثمرہ ہے۔ بے شک رحمتِ خداوندی آپ کے ساتھ ہے لیکن جیسا کہ وہ کہتے ہیں خدا ان کی مدد کرتا ہے جو خود آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ اردو زبان کے ساتھ آپ کا نام اسی طرح لازم ملزوم ہو گیا ہے جیسے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا۔ آپ اردو کے دوسرے بابا ہیں! اس دنیا میں جب تک ایک اردو داں بھی باقی ہے آپ کا نام زندہ رہے گا۔

خدا آپ کو لمبی عمر اور کامل صحت عطا کرے۔ آمین

خیر اندیش، محمد خاں

(۲)

محمد طفیل، مدیرِ نقوش بلاشبہ ایک ممتاز ادیب ہیں اور خاکہ نگاری میں تو اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں لیکن آج سے بہت عرصہ پہلے جب میں نے ان کے کمال کا اعتراف کیا تھا تو بحیثیتِ مدیر کیا تھا کہ بطور ادیب آپ کا مقام بلند سہی بحیثیتِ مدیر بلند تر ہے۔ لیکن بخدا اُس وقت مجھے اُن کی مدیرانہ عظمت کا وہ اندازہ نہ تھا جو نقوش کا رسولؐ نمبر دیکھ اور پڑھ کر ہوا ہے۔

گزشتہ تیرہ صدیوں میں صدہا عاشقانِ رسولؐ نے سیرتِ طیبہ پر لکھا یا لکھوایا ہے، لیکن جو سعادت مدیرِ نقوش کے حصے میں آئی ہے وہ معدودے چند ہی ہستیوں کو نصیب ہوئی ہے۔ اس جلیل و جمیل صحیفے کے متعلق حرفِ توصیف کہنے سے پہلے سر جھک جاتا ہے!

سرسید علیہ الرحمۃ نے حالی سے ایک مسدس لکھوا کر اپنی عاقبت کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ذرا اس اجر کا اندازہ کریں جو مدیرِ نقوش کو بیسیوں شبلیوں کے گلہائے عقیدت جمع کر کے بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے پر ملے گا۔ اور کیا یہ اُس مرتبہ دانِ محمدؐ کے فیض کا اشارہ نہیں کہ جس طرح محمد طفیل اس دنیا میں ماشاء اللہ کامیاب و کامران ہے، اگلی دنیا میں بھی ان شاء اللہ سرخرو

سربلند رہے گا۔
مدیرِ نقوش کو اس قابلِ رشک حال و مستقبل پر ہزار مبارکبادیں۔ محمد خاں

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

برادرِ مکرم طفیل صاحب! سلام مسنون
اللہ سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا عطیہ نقوش کے رسولؐ نمبر کی صورت میں موصول ہوا۔ یہ نمبر ۵ سے ۱۰ تک ہیں۔ میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اتنا نفیس تحفہ عنایت کیا۔ بڑے ذوق و شوق سے پورا اگھران نمبروں کو پڑھ رہا ہے اس کارِ خیر کے لیے خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے ہم سب کی عزت حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں رکھ لی۔ خدا کرے کہ آپ کی یہ مساعیٔ جمیلہ بارگاہِ رسالت سے سندِ خوشنودی پائے۔
جذبات کی شدت نے چند اشعار کہے ہیں جو روانہ کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کو پسند آئیں۔ اگر یہ اشعار پسند آئے تو آپ ضرور مجھے خط لکھیں گے، معلوم نہیں کیوں مجھ کو اس کا یقین ہے۔
آپ نے رسولؐ نمبر کی چھ جلدیں (۵ تا ۱۰) روانہ فرمائیں۔ شروع کی چار جلدوں سے کیوں محروم رہا؟ آپ نے مژدہ سنایا ہے کہ دو جلدوں کی ترتیب کا کام جاری ہے، خدا کرے کہ وہ جلد شائع ہوں۔ آپ کا، ظہیر احمد صدیقی

(۲)

نقوش
(رسولؐ نمبر)

مرقع اتنا کوئی جریدہ نہ پہلے نکلا کبھی نہ نکلے
نقوش کا یہ رسولؐ نمبر طفیل کا شاہکار بھی ہے
میں سوچتا ہوں کہ اس کی ترتیب کب تھی فانی بشر کے بس کی
ضرور اس پیشکش میں شامل نوازشِ کردگار بھی ہے

یہ حسنِ تحقیق کا مرقع جلا ہے ایماں کے آئنوں کی
نگاہِ اہلِ نگاہ و دل میں ہے درسِ عرفان و آگہی کا
ہر ایک پہلو ہر اک رخ سے کیا ہے اس شان سے احاطہ
کہ گوشہ گوشہ ہوا ہے روشن حیات و شخصیتِ نبیؐ کا

یہ ہے وُہ قاموسِ خیر و برکت کشاکش و کشمکش میں جس کو
حیاتِ نو کا پیام کہیے فلاح کی اک سبیل کہیے
یہ راہ گم کردہ راہیوں کو شعورِ منزل عطا کرے گا
یہ پیش کش ہے عظیم اس کو مجاز کیوں سنگِ میل کہیے

چہار جانب سے آ رہی ہیں صدائیں تبریک و تہنیت کی
طفیل صاحب بڑے سلیقہ سے حقِ سیرت ادا کیا ہے
نقوش کا یہ رسولؐ نمبر ہے بابِ سیرت میں حرفِ آخر
حقیقتاً شبلی و سلیمان کی مساعی کا تکملہ ہے

معارف کا خزینہ بھی، ارمغانِ نیاز بھی ہے
صحیفۂ حسن قبول پائے گا موجبِ منزلت بھی ہو گا
منائیں گے اس جشنِ اجرا ملائک و جن و انس مل کر
رسولؐ نمبر طفیل صاحب کو توشۂ آخرت بھی ہو گا

پروفیسر عبد القوی دسنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے محترم، مکرم، معظم بھائی طفیل
السلام علیکم، خوش رہیے، جُگ جُگ جئیے۔

کچھ اور کام کیجئے نہ کیجئے، نقوش کے ضخیم شمارے اور عظیم نمبر مسلسل پیش کرتے جائیے اور اُن سے اردو زبان و ادب کا ایک ایسا قلعہ تعمیر کیجئے جو وسعت و رفعت میں بے مثال ہو اور غیروں کے لیے قابلِ تقلید تو بن جائے، قابلِ تسخیر نہ بن سکے اور اس کے ایوانِ عام میں تختِ پر بیٹھ کر آپ یہ آواز بلند کیجئے:

مملکتِ اُردو کے رہنے والو! آپ کو اور کیا چاہیے؟ میں نے شخصیات نمبر دئے، طنز نمبر دئے، غزل نمبر دئے، افسانہ نمبر دئے، مکاتیب و خطوط نمبر دئے، آپ بیتی نمبر دئے، غالب سے متعلق عظیم نمبر دئے، انیس نمبر دئے، ادبی معرکہ نمبر دئے، عصری ادب نمبر حال ہی میں پیش کر چکا ہوں، اقبال نمبروں کے ڈھیر لگا رہا ہوں، میر نمبروں میں اضافہ کر رہا ہوں، تنقید نمبر

نئے زاویے سے پیش کرنا چاہتا ہوں، شعر نمبر ایک نئے انداز سے لانے کی فکر کر رہا ہوں۔

اور عوام میں سے کوئی عبدالقوی دسنوی اُٹھ کر صدا بلند کرتا ہے: عالی مرتبت، شہنشاہِ مملکتِ آداب! زبان و قلم کی امان ہو تو عرض کروں۔

نہایت نرم و شیریں لہجہ میں ایک آواز فضا میں لہراتی ہے:

ارشاد، کیا کہنا چاہتے ہیں؟ فرمائیے!

اور پھر دُوسری آواز لرزتی ہوئی فضا میں گونج اٹھتی ہے:

آپ نے ہم اردو والوں کو جتنے قیمتی نمبر عنایت کیے ہیں ان سب کو ہم جان و دل کی طرح عزیز رکھتے ہیں، ان سے ہم نے اپنے دل و دماغ کے مختلف گوشوں کو سجا رکھا ہے اور ان سے کسی لحہ غافل نہیں رہے ہیں اور بیشک ان نمبروں کے لیے ہم ہمیشہ سے سپاس گزار ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن اس خبر نے ہمیں بیحد مسرور کیا ہے کہ اب آپ "رسولؐ نمبر" پیش کرنے جا رہے ہیں، جس کے ابتدائی دو نمبر تقریباً مکمل ہونے کو آئے ہیں اس کی جلدوں کا انتظار رہے اور بہت زیادہ انتظار رہے۔

اس کے ساتھ ہی البتہ یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا ہے کہ سرسید بارگاہِ خداوندی میں "مدوجزرِ اسلام" ہاتھوں میں لیے پہنچے، شبلی اپنے اور سید سلیمان ندوی کے کاندھوں پر سیرت النبیؐ کی جلدیں سنبھالے ہوئے نوشش معلیٰ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی، اور اب ہم آپ کے عہد کے اردو والے، کتنے خوش نصیب ہیں کہ قطار اندر قطار، بادشاہ سے رعایا تک سبھی سب نقوش کے رسولؐ نمبر کی جلدیں اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچیں گے اور کہیں گے کہ ہم تیرے لیے محمد طفیل کے رسولؐ نمبر لے کر حاضر ہو رہے ہیں۔

ہم نے ان کا مطالعہ کیا ہے، ہمارے دل و دماغ روشن ہوئے ہیں، چہرے کبھی تمتماتے ہیں، کبھی شگفتہ ہوئے ہیں، آنکھیں کبھی جھکی ہیں، کبھی اشکبار ہو کر دامن کو تر کر گئی ہیں۔

یہی سب لے کر، ہم سب حاضر ہوئے ہیں کہ ان کے طفیل ہماری بھی بخشش ہو جائے، اور اُس بادشاہ کی بھی جس کی ایک ادا نے محمد طفیل کی ہمتوں کو بلند اور حوصلوں کو سوا کر دیا ہے، انھیں بادشاہ کے لیے اقبال کے یہ اشعار لب تک آئے ہیں:

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہ سوار — حاملِ "خُلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ "اہلِ دل" فقر ہے شاہی نہیں

جاتے جاتے اپنے عزیز بھائی محمد طفیل کا بہت بہت شکریہ کہ نقوش کا "عصری ادب نمبر" کیا بھیجا، عصری افکار کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ سچ ہے کہ عظیم نمبروں کو نہایت وقار کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ اللہ نے مدیر نقوش کو ہی عطا کیا ہے۔

بہت ساری اچھی اچھی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں، اس خواہش کے ساتھ کہ کبھی کبھی اپنی تحریروں کو بھی آنکھوں سے لگانے کا موقع دیجئے۔ آپ کا ہمیشہ مخلص

عبدالقوی دسنوی

(۲)

یُوں تو آپ نے نقوش کے بہت سے شمارے اور تقریباً تمام نمبر عنایت کر کے جس طرح کی نیکی میرے ساتھ کی ہے میں نہ تو بیان کر سکتا ہُوں نہ اس کا حساب کتاب کرنے کی اہلیت رکھتا ہُوں لیکن رسولؐ نمبر بھیج کر آپ نے مجھے مزید ایک بڑی دولت اور نعمت سے مالا مال کیا ہے اس کو تحریر میں لانا میرے لیے اس وجہ سے ممکن نہیں رہا کہ میرے دل میں سچے جذبات جو آپ کے لیے پیدا ہو رہے ہیں ان کا ساتھ نہ الفاظ دے سکتے ہیں نہ زبان ترجمانی کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔ بس اتنا جان لیجئے کہ جب سے چار حصّے رسولؐ نمبر (نقوش) کے ڈاکیہ دے گیا ہے آپ کو تو بار بار دُعائیں دے ہی رہا ہُوں اس ڈاکیہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہُوں جو نہایت سلیقہ سے ان نمبروں کا پیکٹ میرے گھر پہنچا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اس کا فرض تھا لیکن نہ جانے مجھے ایسا لگا کہ اس نے بھی میرے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اب تک نقوش کے مختلف شمارے بھیج کر آپ میری اس دنیا کو سنوارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن اس قیمتی نمبر کو شائع کر کے آپ نے اپنی دونوں دُنیا تو سنواری ہی ہیں، مجھے اس نمبر کو عنایت کر کے میری بھی دونوں دنیا بنانے میں مدد کی ہے۔ اور میری طرح ہزاروں لوگ جو اس عظیم نمبر کا مطالعہ کریں گے نہ جانے کس کس طرح سے اپنی زندگیوں کو فیض پہنچائیں گے اور اس طرح آپ مسلسل اور طویل مدت تک اس کی برکت سے ثواب حاصل کرتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ یہ کہنا بھی بجا ہے کہ:

آپ نے اس نمبر کی اشاعت سے

اُردو کی خدمت کی ہے، اس کا وقار بنایا ہے۔

انسانیت کی خدمت کی ہے، اس کا احترام بڑھایا ہے۔

اسلام کی خدمت کی ہے، اس کی عظمتوں اور صداقتوں سے ایک دنیا کو روشناس کیا ہے۔

جب سے یہ نمبر آیا ہے بہت سے حضرات محض دیکھنے کے لیے میرے غریب خانے پر تشریف لا چکے ہیں اور بہت سے شائقین دیکھنے کے لیے تڑپ رکھتے ہیں۔ جس نے بھی دیکھا وہ مسرور بھی ہوا متحیّر بھی، اور جب رخصت ہُوا تو آپ کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا تعریف و تحسین کی صدائیں بلند کرتا ہوا رخصت ہوا۔

واقعی چار حصّوں پر مشتمل یہ عظیم رسولؐ نمبر کتابت، طباعت، کاغذ، حُسنِ ترتیب، تزئین، مقالات، مواد، تصاویر ہر اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ نمبر معلومات کا اس قدر زبردست خزانہ ہے جس پر اردو صحافت ہی نہیں اُردو دُنیا بجا طور پر فخر کرتی رہے گی۔ اُردو دُنیا نے عقیدت کا اتنا قیمتی سرمایہ کبھی نہیں پیش کیا۔ یہ بات جو میں لکھ رہا ہُوں سچ ہے کسی کے کام کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں ہے نہ ایسے کام کے سلسلے میں اس طرح کا خیال ذہن میں جگہ پا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نقوش کا یہ علمی، ادبی، تاریخی، سوانحی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور روحانی تحفہ اس قدر اہم ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری زبان میں مل سکے۔ اس لیے ہم سب اردو والے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ہماری زبان میں نقوش جیسے بڑے رسالے کا

رسولؐ نمبر نکالنے والے قابلِ صد احترام اسلام کے فرزند محمد طفیل موجود ہیں۔ اس لیے ہم سب اپنے پیارے رسولؐ سے محبت کرنے والے اپنے محمد طفیل کو گلے لگا کر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور بارگاہِ خداوندی میں اس کی درازیِ عمر اور اس کے ہاتھوں سے اس طرح کے عظیم کام بار بار انجام پانے کے لیے دُعائیں کرتے ہیں۔

حصہ پنجم کا انتظار ہے۔ باقی پانچ نمبر قارئین پر چھوڑ کر کس طرح کا شائع کرنا چاہتے ہیں، آگاہ کیجئے گا۔

جب سے رسولؐ نمبر آیا ہے ایک خواہش بار بار پیدا ہو رہی ہے کہ کاش ایک حصہ صرف نعتیہ کلام کے لیے مخصوص کیا جائے تاکہ اُردو میں جو کچھ نعتیہ کلام ہے اس کا بہترین انتخاب اس میں شائع کیا جاسکے، ساتھ ساتھ نعت گوئی کے فن پر اس میں چند اچھے مضامین بھی شامل کر دئے جائیں۔

آپ کا اپنا عبدالقوی دسنوی

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

میرے کرم فرما جناب محمد طفیل صاحب

آداب و تسلیمات

حضور والا! عشقِ رسولؐ ہو تو ایسا ہی ہو جس کا مظاہرہ آپ نے رسولؐ نمبر کی چار جلدوں میں کیا ہے۔ آج سے کئی سال پہلے میں نے نقوش میں رسولؐ نمبر کا اشتہار دیکھا تھا۔ جب اس کے بارے میں پھر کچھ نہیں معلوم ہوا تھا تو گمان ہوا تھا کہ شاید اب آپ اسے شائع نہیں کریں گے۔ میرا گمان صرف رسولؐ نمبر کی ایک ہی جلد تک محدود تھا۔ دس سال کے بعد آج جو بھاری بھرکم رسولؐ نمبر کی چار جلدوں کا پیکٹ کشمیر "جنت بے نظیر" کی ٹھنڈی ہوائیں کھا کر لکھنؤ پہنچا تو آنکھوں میں تراوت اور دل میں ایک روحانی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ واللہ! رسولؐ نمبر معجزے سے کم نہیں۔

طفیل صاحب! اب آپ اور کیا چاہتے ہیں! دنیا تو پہلے ہی آپ کے قدموں میں حاضر تھی اب عاقبت کے لیے بھی وسیلۂ نجات کا بے پناہ سرمایہ ہاتھ آیا ہے۔ مزید کس چیز کی آرزو ہے! بخدا! آپ بڑے خوش قسمت اور اقبال مند ہیں کہ حدیثِ رسولؐ کے پیشِ نظر دنیا اور عقبیٰ دونوں آپ کے نصیب میں آگئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخرت کی بخشش کے لیے رسولؐ نمبر کافی ہے۔ اس معرکہ آرا اور صبر آزما کام سے آپ نے یقیناً خدا اور رسولؐ کی خوشنودی حاصل کی ہے۔

"طلوع" کی تحریروں سے میں بےحد متاثر ہوا ہوں، تصویریں بے حد حسین ہیں۔

طفیل صاحب! آپ کی طرف سے ابھی تک میرے خط (مورخہ ۲۴ دسمبر ۸۲ء) کا جواب نہیں آیا ہے۔ میں لاہور میں نقوش کے خصوصی شماروں کا ایک جائزہ بھی مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ نقوش پر کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے کچھ شمارے میرے پاس ہیں، بہت نہیں ہیں، اگر سبھی شمارے ہوتے تو میں نے ایک ضخیم کتاب آپ کے کارناموں پر مرتب کی ہوتی۔ والسلام

خاکسار

اکبر حیدری

رضوان اللہ آروی

۶۸۶

"نقوش کے ذریعہ دلوں پر مہر خلوص کا نقش ثبت کرنے والے، محترم محمد طفیل صاحب!
ہدیۂ سلام و خلوص

محسن انسانیتؐ کی سوانح مبارکہ پر دس ضخیم جلدیں پیش کرکے آپ نے ملتِ اسلامیہ پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، یقیناً وہ اپنے آخری سفر تک اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ کیا مضائقہ ہے اگر میں آپ کو محسنِ ملتِ اسلامیہ کا خطاب دوں کہ نقوش کے رسولؐ نمبر کے بعد آپ اس خطاب کا استحقاق حاصل کر چکے ہیں۔

آپ نے اب تک نقوش کے مختلف نمبر پیش کیے ہیں۔ میر نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، میر انیس نمبر، اور جانے کون کون نمبر۔ لیکن میں سوچتا ہوں، وہ ساعت کس قدر پُر سعادت و مبارک ہو گی جب آپ نے "بریدہ از ہمہ سو بستہ ام بسوئے رسولؐ" کے مصداق ہر دو عالم سے رشتۂ امید منقطع کرکے باعثِ ایجادِ دو عالمؐ سے اپنی آس کی ڈوری باندھی تھی۔ خفیف سے تصرف کے ساتھ حافظ کا یہ شعر آپ کو مخاطب کرکے پڑھا جا سکتا ہے: ؎

چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتت دادند

اور پھر معاً مجھے یہ خیال آیا کہ رسولؐ نمبر کی دس جلدیں اور عشرۂ مبشرہ کی دس ہی کی تعداد۔ اگر قرونِ اولیٰ میں دس خوش نصیب صحابیوں کو آنحضورؐ نے اپنی زبان مبارک سے جنت کی لفظی بشارت عطا کی تھی تو آج رسولؐ نمبر کی دس جلدیں آنحضرتؐ کی معنوی بشارت کا ثبوت ہیں۔ عشرۂ مبشرہ کی تعداد سے رسولؐ نمبر کی تعداد پر حسین مماثلت عنداللہ و عندالرسولؐ اس کی مقبولیت کا پتا دے رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سیرۃ پر مختلف زبانوں میں قابلِ قدر کوششیں کی گئی ہیں اور کی جا رہی ہیں۔ دیگر زبانوں سے قطع نظر اُردو زبان کا بھی "سیرتی ادب" مالا مال ہے۔ ان میں علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی کی مشترکہ کاوش "سیرۃ النبیؐ" کی کئی ضخیم جلدیں خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بعد کا آنے والا کوئی بھی سیرۃ نگار اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا اور یقیناً رسولؐ نمبر کو ترتیب دیتے وقت آپ کے پیشِ نظر بھی یہ کتاب رہی ہو گی۔ لیکن ان سب اعترافات کے باوجود، یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ سیرت کی ان ساری کتابوں کے درمیان آپ کی کاوش منفرد بھی ہے اور عظیم بھی۔ بلاشبہ نقوش کا رسولؐ نمبر آنحضرتؐ کی سوانح حیات پر ایک دائرۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ آنحضرتؐ کی بے مثل شخصیت کے لیے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں گے اور یہ دریا جتنا امنڈے گا تشنگی اتنی ہی بڑھے گی۔ تاہم اس حقیقت کے باوجود، میں سمجھتا ہوں کہ نقوش کے رسولؐ نمبر کے بعد سیرتی ادب پر مستقبل قریب میں مزید اضافے کا کوئی امکان نہیں۔

آپ کا اپنا، رضوان اللہ آروی

پروفیسر عبد الرحمن عبد

محترمی مکرمی جناب محمد نقوش صاحب!
السلام علیکم و رحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔
نقوش کے "رسول نمبر" میرے مطالعے میں اکثر رہتے ہیں کیونکہ میں خود سیرت کے ایک پہلو پر لکھ رہا ہوں۔
آپ نے جس محنت اور محبت سے رسول نمبر کی دس جلدیں تیار کی ہیں اس پر دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو احسن الجزا عنایت فرمائے۔ آمین۔ آپ نے حُبِ رسول کی صد ہزار شمعیں جلا کر چراغاں کر دیا ہے۔
ہزار خامیوں کے باوجود میں بھی اسی راہ کی ایک معمولی کڑی ہوں جس کا آپ ہمالہ ہیں، دل میں تمنا بیدار ہوتی ہے کاش دس سال قبل میں اس کام کے ضمن میں آپ سے منسلک ہوتا۔ میں بھی کچھ، صرف پروف ریڈنگ جیسا ہی بے شک، کام کر کے اس نیکی کے دریا میں سے چند گھونٹ پی سکتا۔
بہرحال آپ کو اس عظیم کارنامے پر بہت بہت مبارکباد۔
فقط والسلام

عبد الرحمن عبد

پروفیسر فیض اللہ منصور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر مکرم! السلام علیکم۔
ان مجلدات کو دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ نے تائیدِ ایزدی سے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو ان شاء اللہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ یہ نمبر آپ کی شب و روز کی محنت، حُبِ رسول اور خلوصِ نیت کا آئینہ دار ہے۔
میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے، عزائم ہمیشہ بلند اور فکر جواں رہے تاکہ سیرت پاک پر مزید کام جاری رہے۔ آمین ثم آمین۔
آپ نے چھ جلدیں ارسال فرما کر مجھ پر جو احسان فرمایا ہے اس کو الفاظ کا جامہ دینے سے قاصر ہوں۔ اور دلی کیفیت الفاظ میں متشکل بھی تو نہیں ہو سکتی۔

آپ کا بھائی
فیض اللہ منصور

رسولؐ نمبر کی ۱۳ جلدیں چھپ چکی ہیں
مزید دو جلدیں چھپیں گی۔ اس طرح کل
۱۵ جلدیں ہوں گی، جن کے مجموعی صفحات

۱۲,۰۰۰

سے زائد ہوں گے، اِن شاءَ اللہ العزیز!
آخری ۲ جلدیں تمام عالمِ اسلام کے
سیرتی ادب سے متعلق ہوں گی

○ محمد طفیل (خاکہ) ـــــــ سلمان بٹ

ہمارے ہاں دارالامان کے وقتوں کا ایک تالا تھا اس میں خاص بات یہ تھی کہ بڑی مشکل سے کھلتا تھا۔ ایک بار کھلنے کے بعد اسے دوبارہ بند کرنے کے لیے بھی خاصی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ محمد طفیل صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو خاصی لمبی نشست کے باوجود ان کے منہ سے چار چھ جملے ہی نکلے ہوں گے باقی خانہ پُری میں اور اسرار زیدی کرتے رہے۔ طفیل صاحب بس کڑک مرغی کی طرح پھولے پھولے سے ساکت بیٹھے رہے۔ ہولے ہولے پتا چلا کہ اجنبیوں سے ذرا دیر میں کھلتے ہیں۔ ایک بار بے تکلف ہو جائیں تو پھر لذت گفتار سے گھنٹوں نوازتے رہتے ہیں۔

دراصل محمد طفیل صاحب مجلسی آدمی نہیں ہیں گفتگو کے ذریعے کسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتے بالواسطہ طور پر بھی اپنی اہمیت نہیں جتاتے۔ لگتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ سے بالکل بے نیاز ہیں یا شاید وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے فن سے ناواقف ہیں۔ یا ممکن ہے وہ اسے سرے سے فن تسلیم ہی نہ کرتے ہوں۔ محفل آرائی کے شوقین لوگ بالعموم کام سے دامن بچاتے ہیں۔ جبکہ محمد طفیل کی ساری زندگی کام سے عبارت ہے۔ محفل کبھی کبھار ان کے ہاں بھی ضرور جمتی ہے لیکن کام کے بعد۔ ان کے ہاں کام کا نمبر پہلے آتا ہے طعام و کلام کا بعد میں اور آخر میں سلام کا۔

محمد طفیل عرف محمد نقوش کام زیادہ کرتے ہیں بولتے کم ہیں اور وہ بھی نرم اور آہستہ لہجے میں۔ بعض اوقات تو ان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ انھوں نے کبھی تھوڑا کام کر کے نعرہ نہیں لگایا۔ نعرہ تو وہ بڑے سے بڑا کام کرنے کے بعد بھی نہیں لگاتے۔ کام کے انجام کو ہی انعام سمجھتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ہیں۔ ہاں البتہ تعریف و توصیف سن کر بُرا بھی نہیں مناتے۔ کون ہے جس کے فن کو سراہا جائے تو وہ خوش نہ ہو! یہ انسانی فطرت ہے۔ انسان ہونے کے ناطے جہاں محمد طفیل کے حصے میں بہت سی خوبیاں آئی ہیں وہاں چند کمزوریوں کا ہونا بھی لازمی امر ہے۔

محمد طفیل نے اردو ادب کی بے پایاں خدمت کی ہے کاتب کی حیثیت سے، مدیر کی حیثیت سے، ادیب کی حیثیت سے اور ایک ناشر کی حیثیت سے ان کی مثال ایک زرخیز قطعۂ زمین کی ہے۔ جو ایک بھرپور فصل کے بعد دوسری بھرپور فصل کے بیجوں کی پرورش شروع کر دیتا ہے۔ سُنا ہے کہ کسان لوگ ایک زمین سے چند فصلیں لینے کے بعد ایک موسم کے لیے اس میں کچھ نہیں بوتے تاکہ کھیت کی کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو جائے۔ لیکن محمد طفیل انسان ہے کھیت نہیں وہ متواتر بڑی بڑی

فصلیں دے رہا ہے لیکن اس کی توانائی میں کمی نہیں آئی۔

محمد طفیل نے آج تک جو کچھ پیش کیا ہے وہ مقدار، معیار اور سلیقے کے اعتبار سے بہت بوجھل ہے۔ ان کے کام کو ایک جگہ اُٹھا کر دیا جائے تو دنیا کا بلند ترین مینار بن سکتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ "مینار" کے۔ ٹو" کی ہمسائیگی میں جا پہنچے۔ ان کے پُورے کام کا تصور کرتے ہی دل پر ہیبت سی چھا جاتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک شخص نے بغیر کسی باقاعدہ ٹیم کے یہ موٹے موٹے نقوش نمبر کیسے نکال لیے اور وہ تمام مراحل جو ایسی بھاری بھاری تخلیقات کے تصور سے لے کر اشاعت تک راستے میں آتے ہیں انھوں نے کیسے طے کیے!

حال ہی میں انہوں نے نقوش کا جو "رسولؐ نمبر" پیش کیا ہے اس قسم کے پراجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے بظاہر ایک بہت بڑے ادارے کی ضرورت ہوتی جس میں کئی بورڈ اور کمیٹیاں دن رات کام کرتیں تو سالوں میں جا کر کہیں یہ منصوبہ مکمل ہوتا۔ محمد طفیل نے تنِ تنہا یہ کام کیسے سرانجام دیا میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ محمد طفیل در اصل الہ دین کا جن ہے جو انسان کا بھیس بدل کر ادب کی سرزمین پر قابض رہے۔

بڑے بڑے کاموں کے ڈھیر لگا دینے کے بعد محمد طفیل کو تھک جانا چاہیئے تھا۔ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بیسیوں بار راہیِ ملکِ عدم ہو چکا ہوتا۔ لیکن محمد طفیل کے ارادے "نیک" نظر نہیں آتے۔ ان کے چہرے پر عمرِ رفتہ کے آثار تو ہولے ہولے مرتسم ہو رہے ہیں لیکن تھکاوٹ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ اُن کے دماغ میں اب بھی بہت کچھ ہے، بڑے بڑے منصوبے باندھتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اُنھیں پورا بھی کر دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ان کی منصوبہ بندی کا قائل ہے۔

وہ زیادہ تر اپنے پریس میں پائے جاتے ہیں، جس کمرے میں اُن کا دفتر ہے وہاں دن بھر پریس کی مشینری سے متعلقہ بھیانک قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں، وہاں مسلسل بیٹھنا ہی جان جوکھوں کا کام ہے چہ جائیکہ وہاں بیٹھ کر تخلیقی کام بھی کیا جا سکے میں تو جب بھی وہاں گیا ہوں واپس آکر سر درد کی ٹکیہ ضرور کھائی ہے لیکن محمد طفیل صاحب اسی ماحول میں اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر لیتے ہیں۔ کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ اسی باعث تو مجھے شبہ گزرتا ہے کہ وہ انسان نہیں بلکہ جن ہیں۔ اور جن بھی نہایت طاقتور نسل کے۔

محمد طفیل صاحب سگریٹ نہیں پیتے، چائے ضرور پیتے ہیں۔ روایتی عشق و محبت کے سلسلے میں ان کی کتابِ حیات کے متعلقہ اوراق کورے ہیں حالانکہ ضرورت سے زیادہ قبول صورت اور خوش رنگ ہونے کے سبب وہ اس میدان میں بھی معرکہ آرائی کر سکتے تھے، لیکن شاید یہ اُن کا میدان نہیں تھا۔ اور اگر کبھی وُہ بھولے سے اسی میدان میں داخل ہُوئے بھی ہوں تو اب بالکل انکاری ہیں۔ انھیں اپنی شہرت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اپنی تحریروں میں جہاں کہیں موقع ملتا ہے اپنی پاک دامنی کی گردان شروع کر دیتے ہیں۔

نقوش کے خاص نمبروں کا فن ایجاد کر کے طفیل صاحب نے اُردُو زبان اور اردو ادیبوں پر جو احسان کیا ہے اس کے بوجھ سے ادب اور ادیب دونوں کی گردنیں کبھی اُوپر نہ اُٹھ سکیں گی۔

افسانہ نمبر، غزل نمبر، خطوط نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر، ادب عالیہ نمبر، پطرس نمبر، منٹو نمبر، شوکت نمبر، غالب نمبر، میر تقی میر نمبر، ادبی معرکے نمبر اور رسولؐ نمبر (دس جلدوں میں) وہ جو پطرس بخاری نے کہا تھا نقوش پر بالکل صادق آتا ہے کہ:

”اس کا ہر نمبر خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر ہی شائع کیا جاتا ہے۔“

محمد طفیل صاحب بڑی آہستہ روی سے کسی کے قریب آتے ہیں، لیکن قریب آنے کے بعد دور نہیں جاتے۔ تعلق نبھانا خوب جانتے ہیں، ماہ و سال کی گردش ان کے رویوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں لیکن ان کی محبت کا رکھ رکھاؤ وہی رہتا ہے، ان کی اپنی زندگی میں بھی اسی قسم کے ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے جو بلندیوں پر پرواز کرنے والے طیاروں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو محسوس ہوتا ہے۔ محمد طفیل کی زندگی بھی ایسی ہی ہے، پرسکون، ٹھہری ہوئی، جس کے سکوت کو پریس کی مشینوں کی آواز بھی توڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

طفیل صاحب نے زندگی کی ابتدا کاتب کی حیثیت سے کی، لیکن اپنی بے پناہ قوتوں کے بل بوتے پر زندگی کی ہر نعمت کو مسخر کر لیا۔ آج ان کے پاس سب کچھ ہے لیکن یہ سب کچھ ان کے لیے کبھی طعنہ نہیں بنا، اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ محمد طفیل نے کس طرح خون اور پسینے کی تمیز ختم کر کے یہ سب کچھ حاصل کیا۔ وہ شاید اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں لیکن وہ مادی خواہشات کو بے لگام نہیں ہونے دیتے۔

طفیل صاحب ایک سیدھے سادے، محنتی، مخلص اور جنون کی حد تک مستقل مزاج انسان ہیں ان کی کامرانیوں پر جہاں بہت سے لوگ رشک کرتے ہیں، وہاں شاید کچھ لوگ حسد بھی کرتے ہوں۔ لیکن طفیل صاحب رشک و حسد سے بے نیاز صرف اپنا کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔

طفیل صاحب ایک چونکا دینے والے مصنف بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کے مجموعے ”صاحب“، ”جناب“، ”آپ“، ”محترم“، ”مکرم“، ”محبی“ اردو خاکہ نگاری کی روایت میں بڑا ہی خوبصورت اور انوکھا اضافہ ہیں۔ میں ان سب مجموعوں کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ یہ مجموعے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں، جس میں متعلقہ اشخاص کو اپنی شخصیت کے وہ خم اور گوشے بھی نظر آ جائیں گے، جن پر خود ان کی نظر بھی نہیں گئی ہوگی۔

طفیل صاحب کی ایک اور دلچسپی پاکستان رائٹرز گلڈ سے ان کا لگاؤ ہے، گلڈ کے ذریعے انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی قابلِ قدر خدمت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں ہمیشہ اردو کے ادیبوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔ گویا انہوں نے ادیبوں کی علمی خدمت کے ساتھ ساتھ مادی خدمت بھی کی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ صرف اپنے لیے نہیں سوچتے بلکہ سب کے لیے سوچتے ہیں، نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ عملاً کر دکھاتے ہیں۔

طفیل صاحب تحریر و تقریر کے انداز میں کسی قسم کی تلخی نہیں آنے دیتے۔ اگر کبھی مجبوری کے تحت چھری چلانی پڑ جائے تو میٹھی چھری کا انتخاب کرتے ہیں ورنہ وہ اگر کسی کو کند چھری سے بھی ذبح کرنا چاہیں تو کوئی اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

کام سے ان کی بے پناہ لگن دیکھ کر یُوں لگتا ہے کہ یہ چاہتے ہیں جب میں دُنیا سے رخصت ہُوں تو ایک مثالی بوجھ میرے سر پر ہو اور اونٹوں پر "نقوش" کے ضخیم نمبر لدے ہُوئے ہوں اور ان کے استقبال کے لیے سرسید، حالی، شبلی، غالب اور اقبال جیسے بزرگ باہیں پھیلائے کھڑے ہوں۔

(روزنامہ مشرق لاہور ۲۷، اپریل ۱۹۸۴ء) ○

○ قابلِ قدر دینی اور علمی خدمت —— مولانا کوثر نیازی

بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں۔ وہ بجائے خود محشرِ خیال کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی زمرے میں ہمارے دوست جناب محمد طفیل مدیر نقوش آتے ہیں جنہوں نے تنِ تنہا ایسے کارنامے انجام دئے ہیں کہ بڑی بڑی اکیڈیمیاں اور ادارے بھی ان کا تصور نہ کر سکیں۔ "نقوش" کے جو معرکۃ الآراء ادبی نمبر طفیل صاحب نے نکالے تھے انھی کو دیکھ کر بڑے بڑوں کے ہوش اُڑ جاتے تھے کہ اب انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اردو تو اردو، دنیا کی کسی بھی زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کارنامہ "نقوش" کا "رسولؐ نمبر" ہے جو دس جلدوں اور ۰۰۰، ۶ صفحات پر پھیلا ہُوا ہے۔ اسے دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

یہ نمبر پاس ہو تو آپ نے گویا ہر وہ تحریر پڑھ لی جو ان تمام صدیوں میں آنحضورؐ پر لکھی گئی ہے۔ سیرت میں جملہ کتابوں کی تلخیص نہیں تو کم سے کم ان کی خصوصیات کا تعارف تو آپ کو مل ہی جائے گا۔ سچ کہتے ہیں کسی کے ظاہر پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ طفیل صاحب کو کم سے کم تیس سالوں سے ہم بھی جانتے تھے مگر کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ شخص اتنا بڑا عاشقِ رسولؐ بھی ہے۔ سبحان اللہ! کیا خوب صورت بات کہی ہے:

"دعویٰ کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں میرا کوئی دعویٰ نہیں، میں تو صرف عاشقانِ رسولؐ کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا ہُوں، وہ بھی سب سے آخر میں۔"

پہلی جلد شائع کی تو لکھا:

"میں نے آج تک جتنے نمبر شائع کیے وہ سب فخریہ انداز میں پیش کیے مگر یہ نمبر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کر رہا ہُوں۔ یہ معاملات دل کے ہیں، کبھی اِس طرح خوشی، کبھی اُس طرح خوشی۔"

محمد طفیل اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے، سلیس اور سادہ فقروں میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے مگر جو تاثیر ان کے ان مختصر اداریوں میں ہے جو انہوں نے ہر جلد کے شروع میں لکھے ہیں اس کی تو بات ہی اور ہے۔ ایک مختصر سے اداریے کا مختصر سا اقتباس:

"ہاتف نے کہا: "حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"ہوں۔"

"حدادب کا مقام ہے۔"

"یا الٰہی! میں کیا کروں؟ حضورؐ! میں کیا کروں؟"

میری التجا پر دوبارہ غیبی آواز آئی:

"آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے رسولِ خدا کے بارے میں لکھا ہو اور ان کا حق ادا کیا ہو۔"

میں ایک بار پھر سناٹے میں آ گیا، جھرجھری لی تو میں کہہ رہا تھا:

"میں حضورؐ کا اُمتی ہوں، میں اس کام کے لیے خود حضورؐ سے اجازت لے کر آیا ہوں۔"

اس پر ہاتف نے کہا:

"تو پھر لکھو۔"

جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

تب میں نے گھر والوں سے کہا:

"مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنت میرے رسولؐ کی ہے۔"

رسولؐ نمبر ابھی مکمل نہیں ہوا، اس کی دسویں جلد عربی، اردو اور فارسی کے مرحوم شعراء کی منتخب نعتوں پر مشتمل ہے۔ ابھی دو جلدیں اور آئیں گی جن میں سے ایک زندہ شعراء کی نعتوں کے لیے وقف ہو گی۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، سرورق سب کچھ اتنا اُجلا اور دیدہ زیب ہے کہ گھنٹوں دیکھتے رہئے اور طبیعت پھر بھی سیر نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کام حکومتیں نہ کر سکی تھیں سیرت کی خدمت کا وہ کام ایک درویش منش انسان نے کر دکھایا ہے۔ ○ (روزنامہ جنگ لاہور ۳ جون ۸۴ء)

○ نوائے وقت فورم کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مذاکرے کی تفصیلات

بیدار سرمدی: یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسے حوالے سے گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں جو محترم محمد طفیل نے اپنی زندگی کا حاصل قرار دیا ہے۔ میری مراد نقوش کے رسولؐ نمبر سے ہے۔ دس جلدوں پر مبنی اس نمبر پر گفتگو کرنا سعادت کا باعث بھی ہے اور خیر و برکت کا باعث بھی۔ اس نمبر کی پہلی چار جلدیں جونہی منظرِ عام پر آئی تھیں ان پر اہلِ علم اور اہلِ نظر نے خراجِ عقیدت پیش کیا تھا اب ان کے مشن کے بڑے مرحلے کی تکمیل پر ہم ان کا انٹرویو بھی شائع کر چکے ہیں اور آپ حضرات کی رائے بھی اب سامنے آئے گی۔ میں سب سے پہلے مولانا مالک کاندھلوی سے گزارش کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

مالک کاندھلوی: میں اس مبارک تقریب میں اپنی حاضری کو مبارک سمجھتا ہوں۔ محترم محمد طفیل کا یہ کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت پر جس انداز میں محمد طفیل نے خدمت انجام دی ہے میں حضورؐ کے ارشاد کی روشنی میں اس کا ذکر کروں گا کہ:

"اللہ اس کو شاداب اور آباد رکھے جس نے میری بات کو محفوظ رکھا اور دوسروں تک پہنچایا۔"

حضور اکرمؐ کی سیرت مبارکہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام جہانوں کے لیے راہنما لائحۂ عمل اور ضابطۂ ہدایت ہے۔ میں حیران ہوں کہ مؤلف نے انتہائی محنت کے ساتھ سیرت کے موتیوں کو جمع کیا۔ سیرت نمبر میں اخلاق اور عقاید، اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت، نظامِ سلطنت اور نظامِ حکومت تک کے مسائل اتنی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اس وقت دنیا جن فتنوں اور مصائب میں مبتلا ہے اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرت پر عمل کیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی سیرت کی روشنی میں جہاں ہمیں اپنے انفرادی اخلاق کو بہتر بنانے کے راہنما اصول ملتے ہیں وہاں اجتماعی اصلاح اور خوشحالی کا سامان بھی میسر ہے۔ اس دور میں ہر شخص ذاتی اغراض میں لگا ہے اجتماعی مفاد کے تقاضوں سے غافل ہے اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ بحر و بر پر فساد ظاہر ہو رہا ہے۔ اس دور میں اس انداز سے حضورؐ کی سیرت کو پیش کرنا گویا دنیا کو مصائب سے نکالنے کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ اس میں یقیناً مؤلف کی یہ علمی خدمت تاریخ میں روشن مثال تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ تمدن کی کامیابی اور نظامِ مملکت کی کامیابی کے لیے بھی بہترین سامان جمع کیا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا مؤلف کی یہ کوشش کامیاب کرے۔ میں اس بات سے متاثر ہوا ہوں کہ طویل عرصے کی کوششوں کے بعد نقوش کا رسول نمبر مرتب ہوا ہے اور مؤلف کو اس نیک مشن میں اپنی صحت اور مال کی قربانی بھی دینا پڑی ہے۔ یہ جذبہ حضورؐ سے تعلق اور محبت کی نشانی ہے۔ اس رسول نمبر میں سیرت پاک کے حوالے سے جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے میرے خیال میں وہ مستند اور معتمد ہے اور خاص طور پر محدثین کے جو اصول ہیں ان کی روشنی میں سیرت پاک کے تمام ابواب کو ترتیب دے کر اس نمبر کو صحیح معنوں میں مکمل کر کے پیش کیا گیا ہے۔

بیدار سرمدی: اب ڈاکٹر محمد یوسف گورایا سے گزارش ہے کہ وہ نقوش کے رسول نمبر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایا: نقوش کا رسول نمبر دس جلدوں میں چھپ کر ہمارے سامنے آگیا ہے اسے ہم قومی فخر سمجھیں پاکستان کے محققین کی طرف سے مرتب کو ہدیۂ تبریک پیش کریں اس اعتبار سے بھی اس کو دیکھا جائے کہ یہ انتہائی قابلِ قدر خدمت ہے جو انجام دی گئی ہے۔ رسول نمبر کی جن باتوں نے مجھے متاثر کیا ہے ان میں سے پہلی بات اس کا تکمیلی پہلو ہے۔ اب تک اس موضوع پر جو خدمات بھی انجام دی گئی ہیں بالخصوص پاک و ہند میں ان میں سب سے جامع اور سب سے بڑی خدمت مولانا شبلیؒ کی ہے جو سیرت النبیؐ کی صورت میں ہمارے سامنے آئی تھی۔ اس کی چھ جلدیں چھپی تھیں۔ بہت کم اہلِ علم کو اس بات کا علم تھا کہ اس کی ایک ساتویں جلد بھی ہے۔ نقوش کے اس نمبر سے نہ صرف اس بات کا ہمیں علم ہوا بلکہ وہ پوری کی پوری ساتویں جلد اس میں شامل کر لی گئی جس سے ایک عظیم سیرۃ النبی پر لکھی ہوئی کتاب کی تکمیل بھی ہو گئی۔ اس طرح تکمیل کے بعد جو پہلو خاص طور پر متاثر کرتا ہے وہ اس کا اضافہ ہے۔ جو اب تک کام ہوئے ان میں بہت سے پہلو رہ گئے تھے۔ ضرورت تھی کہ ان پر کام کیا جائے۔ اس رسول نمبر کے آنے سے ان پر معتدبہ کام ہوا ہے اور بہت سے اضافے کیے گئے ہیں۔ ایک اور پہلو جو قابلِ ذکر ہے وہ اس کی جدت ہے۔ اس کا مطلب میں یوں بیان کروں گا

کہ بالکل ہی مختلف سٹائل اور اسلوب سے اسے پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے قدیم سکالرز، محققین، مصنفین نے جو کام کیے وہ اپنے عہد کو سامنے رکھ کر کرتے تھے۔ اب تک ترتیب اور تدوین کا جو اسلوب ہمارے سامنے آیا ہے ان میں امام بخاریؒ کا ذکر اہم ہے۔ انھوں نے موضوعات عنوانات مقرر کیے۔ پھر تلاش کی کہ کون سی مستند صحیح احادیث ان کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ آج بھی ضرورت تھی کہ ہم مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل سیرتِ رسولؐ میں تلاش کیا جائے۔ اس لیے پہلا تقاضا یہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ وہ مسائل کیا ہیں۔ رسول نمبر کو (جو دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں) پیشِ نظر رکھا جائے تو اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مرتب نے ملک و ملت اور معاشرے کو درپیش مسائل کا احاطہ کیا ہے اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ ان مسائل کا صرف احاطہ ہی نہیں کیا بلکہ کوشش یہ کی ہے کہ جو مستند اور قابلِ قدر لوگ موجود ہیں ان سے ان مسائل کا حل سیرتِ نبوی کی روشنی میں تحریر کروایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد میں انھیں بہت حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور انھوں نے نئے نئے عنوانات اور موضوعات کے تحت جو کچھ لکھا ہے وہ قوم کے مسائل کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گا۔ ایک اور بات جو بڑی قابلِ قدر ہے یہ ہے ایک موضوع پر مختلف اہلِ بصیرت اور اہلِ دانش نے لکھا ہے۔ اس بات سے بہت سی دشواریاں ختم ہو گئی ہیں۔ مثلاً ہجرت کا موضوع لے لیجئے۔ اب تک سیرت پر جتنی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں سیرت نگار نے کوشش کی ہے کہ اپنے علم اور فضل سے اس موضوع پر لکھے۔ ایک انسان کی کوشش بہرحال محدود کوشش ہوتی ہے لیکن اسی موضوع پر جب مختلف اہلِ علم و فضل قلم اٹھاتے ہیں تو وہ موضوع جامع بن جاتا ہے، اس میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ہر موضوع کی بنیادی اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اگر اسی موضوع اور اصطلاح کو مختلف مصنف اپنے اپنے انداز اور علم سے پیش کرتے ہیں تو قاری کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بہت سے محققین نے مل کر ایک موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے جس سے نہ صرف سابقہ تحقیق کو جمع کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ آئندہ کے لیے ایک جامع اور مفصل مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور بات جس سے میں متاثر ہوا ہوں، یہ ہے کہ سیرت کے ایک واقعہ کو ایک مصنف پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے وہ اس کو اپنی فکر کے مطابق پیش کرے گا اسی کو جب بہت سے مصنفین مل کر لکھیں گے تو اس کی تعبیر اور ان کی تشریح اور بیان سے اس واقعہ کے جہاں تک ممکن ہو سکے جملہ پہلوؤں کا احاطہ ممکن ہو جاتا ہے اس سے وہ واقعہ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے اور سیرت کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر انسائیکلو پیڈیا لکھے گئے ہیں (اور اس رسولؐ نمبر کو اگر انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا) مثلاً انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ہے اس میں اسلام کے تمام پہلوؤں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ایک پہلو جیسا کہ سیرت کا ہے اس پر اس رسولؐ نمبر کی طرح ایک جگہ اتنا بڑا کام نہیں ہوا۔ میں کئی زبانوں کا طالب علم رہا ہوں میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی زبان میں اتنا جامع، اتنا مکمل کام نہیں ہوا ہے۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ سیرت پر گزشتہ کچھ عرصے سے جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان میں کوشش کی جا رہی ہے کہ آپ کی ولادت، غزوات اور جو بہت ہی نمایاں پہلو تھے ان سے ہٹ کر بھی کام کیا جائے مگر اس سے پہلے جو چیز سیرت کی کتابوں میں غالب رہی ہے وہ غزوات، معجزات وغیرہ تک محدود تھی موجودہ رسولؐ نمبر نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس میں حضور اکرمؐ کی سیرت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی تعلیمات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کو جو مسئلہ درپیش ہے وہ اقتصادیات کا استحکام، اصلاحِ معاشرہ، تعلیم و تمدن اور عدالت کے نظام کو بہتر بنانے کا ہے اور سیرت کے پہلوؤں کے حوالے سے ان پہلوؤں پر بہت کم کام ہوا تھا۔ ہمارے سامنے موجودہ مسائل کے حل کے لیے رسول اللہ کی زندگی سے مثالیں ایک جگہ جمع نہیں کی گئی تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ آج کی زبان اور محاورے میں آپؐ کی تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ آج کا عام پڑھا لکھا نوجوان مسلمان اسے نمونے کے طور پر سامنے رکھ سکے۔ نقوش کے رسولؐ نمبر میں اس ضرورت کو پورا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو بات مجھے اور نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں سیرت نگاری، یہ ایک ایسا موضوع تھا جو اہلِ علم میں ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے بقول سیرت ہے ہی قرآن۔ لیکن قرآن پر مبنی سیرت کی کوئی مفصل کتاب موجود نہیں ویسے کہنے کو تو پورا قرآن آپ پر نازل ہوا اور ہے بھی حقیقت۔ لیکن قرآن پر مبنی کوئی علیحدہ کتاب تدوین نہیں کی جا سکتی تھی اب نقوش کے سیرت نمبر میں غلام مصطفیٰ خاں کا مضمون "بہ قرآن در شانِ محمدؐ" ایک اچھوتے موضوع کے طور پر شامل کیا گیا ہے اس کو میں نے شروع سے آخر تک مفصل طور پر دیکھا ہے انہوں نے الحمد سے والناس تک پورے قرآن کو سیرت کے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ جتنے بھی واقعات قرآن پاک کی سورتوں میں آئے ہیں اس کا مرکزی اور محوری نقطہ سیرت کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مستند طریقہ ہے جو بہت کم اس سے پہلے منظرِ عام پر آیا۔

اسی طرح ماخذات پر جو کام ہوا ہے مثلاً مستشرقین نے بھی کام کیا۔ یہ تحقیق ہوئی کہ سیرت پر اب تک کیسی کیسی کتابیں لکھی گئیں مگر ان کی محنت اس لحاظ سے مشکوک ٹھہرتی ہے کہ وہ غیر مسلم تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے سیرت نگاری پر جو کام کیا وہ صحت کے اعتبار سے مسلمانوں کے اطمینان پر پورا نہیں اترتا۔ نقوش کے رسولؐ نمبر میں جتنے مضامین جامعیت کے ساتھ یکجا کیے گئے ہیں۔ یہ محققین کے لیے عظیم سرمایہ ہے۔ میں "البرڈ گیون" کا مقدمہ دیکھ رہا تھا جو اس نے ابنِ ہشام کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کرتے وقت لکھا تھا نقوش کے رسولؐ نمبر میں اس مقدمے کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مضامین ہیں جو سیرت پر ماخذات اور سیرت نگاری کی تاریخ پر لکھے گئے ہیں۔ بعض اور پہلوؤں کا ذکر ضروری ہے۔ مثلاً اصحابِ صفہ پر ایک بڑا جامع مضمون پیش کیا گیا ہے۔ ہم ان کا ذکر پڑھتے رہے ان کی قدر و منزلت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ لیکن ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں اہم تفصیلات مرتب ہو کے اس رسولؐ نمبر کے ذریعے ہمارے سامنے آئی ہیں۔ میری ایک تجویز بھی ہے کہ ہجرت کا واقعہ مختلف مقامات پر دیا گیا ہے۔ دوبارہ اشاعت کے دوران تمام واقعات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو زیادہ اچھا رہے گا۔ پھر اگر ایک اتنے بڑے کارنامے کی تفصیلات کو جاننے کے لیے مضامین کی الگ فہرست شائع کر دی جائے تو لائبریریوں میں مطالعہ کے سلسلے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

بیدار سرمدی : محترم نعیم صدیقی صاحب تشریف رکھتے ہیں خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی سیرت نگار ہیں اب ان سے گزارش ہے کہ وہ اظہارِ خیال فرمائیں۔

نعیم صدیقی : میں چھوٹی سی تمہید سے بات شروع کروں گا۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے میں میو ہسپتال میں آنکھ کا آپریشن کروا کر لیٹا تھا جو اہلِ قلم وہاں پہنچے میری نظر میں اُن میں سب سے اہم شخصیت محمد طفیل صاحب کی تھی

مجھے احساس ہُوا کہ ایسے شخص نے کیسے وقت نکالا جو رات دن اتنا مصروف ہے۔ اس سے کچھ پہلے یا بعد میں طفیل صاحب کی طرف سے بات چھڑی کہ ان کا ارادہ رسولؐ نمبر شائع کرنے کا ہے۔ مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ کام کی ایک مخصوص لائن پر مصروف شخص نے اچانک ایک نیا مشن شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن دوسری طرف بہت زیادہ خوشی بھی ہوئی کہ بہرحال اس دائرے میں جو کام جس طرح سے بھی ہو جائے وہ اُمت کے لیے دین کی سربلندی کے لیے باعثِ خیر و برکت ہے۔ چنانچہ آپس میں کچھ باتیں ہوتی رہیں کچھ روبرو اور کچھ خطوط کی شکل میں مشاورت ہوئی یہ ممکن ہے کہ محمد طفیل اس طرح کی چیزوں کو راز میں رکھتے ہوں اور یہ راز ہی رہتا لیکن دو باتوں کے حوالے سے مجھے سب کچھ کہنا پڑا۔ میرا جذبہ یہ تھا کہ وہ اس نمبر کا اس نیت سے آغاز کریں کہ یہ سرمایۂ آخرت ہے۔ باقی ساری چیزیں ایک طرف ڈال دیں یہ کام اتنی بڑی سعادت ہو گا کہ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اب میں نے ان کی تحریروں میں جذبہ دیکھا ہے "رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کی آخری صف کا آخری آدمی بھی محمد طفیل ہو تو یہ میری سعادت ہوگی"۔ اس طرح میں نے محسوس کیا کہ سچا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں میں کارفرما ہے۔ دُوسری بات میں نے یہ کی تھی کہ تنوع کے جذبے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کوشش سے ایسی چیزیں جمع ہو جائیں جو ہمارے ذہنوں کو بکھیر دیں، سیرتِ رسولؐ ہی ایسی چیز ہے جو ہمیں متحد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ساری چیزیں ہمیں بکھیرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اس بات کو پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ سیرت کو اسی جذبے سے پیش کیا جائے۔ جب مجھے یہ تحفۂ عظیم ملا تو میں نے ایک بڑی بات یہ محسوس کی کہ آج جب کہ عالمِ اسلام عالمِ مغرب اور دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی اسلام کی تحریک اور مسلمانوں کو ایک بار پھر جگانے کی تحریک جاری ہے۔ ایسے میں جب پیغامِ حق کی پیاس پائی جاتی ہے اور نوجوان نسل مغربی مرعوبیت سے نکل کر اسلامی تعلیمات کی رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ نئی دنیا تعمیر کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا کام جو ہوا ہے مذکورہ ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ اس کام کا سیرت کی کتابوں سے تقابل بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بجائے خود جو سرمایہ ہے وہ انتہائی قابلِ فخر ہے۔ اگر اردو زبان کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایک بڑی کوشش سلمان منصور پُوری نے کی ہے، اس میں جذبۂ روحانیت کو بڑی حد تک سمویا گیا ہے۔ علامہ شبلی کے ہاں کسی حد تک عقلیت کا رجحان نمایاں ہے، مغرب کے اثرات بھی سامنے رکھے گئے ہیں۔ جسٹس امیر علی نے تو گویا مغرب کی ضروریات اور مغرب زدہ ذہن کو ہی سامنے رکھ کر سب کچھ لکھا ہے۔ یہ کام تو اب تک ہمارے سامنے ہے لیکن میں ایک کتاب کا ذکر کروں گا جس کا ذکر عام گفتگو میں کم ہوا ہے، وہ مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی کتاب ہے، میں تمام مکاتبِ فکر کی کتابیں پڑھتا ہوں کہ یہ کتاب اپنے اندر صحیح انداز کا جذبہ رکھتی ہے اس کے علاوہ ایسی بہت کتابیں ہیں۔ حال ہی میں "انسانِ کامل" کی بڑی اہمیت ہے خالد علوی کی کتاب بھی قابلِ ذکر ہے۔ میں اپنے کام کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ ان سب کتابوں کے ساتھ ساتھ میں نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی کتاب کو سند کے لحاظ سے بہت اہم پایا ہے۔ ان سب لوگوں نے ٹھوس کام کیا ہے۔ اسی طرح عربی میں سیرت ابنِ ہشام میرے سامنے رہی ہے اور بھی کتابیں دیکھی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان تمام کتابوں کے بعد نقوش کا رسولؐ نمبر اس دور کی ضروریات کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ آج کے نوجوان طبقے کی فکری رہنمائی

میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت خوشی ہے کہ بعض موضوعات مثلاً عدلیہ اور ریاست کے پس منظر میں تحریر کی ایک ایک سطر کے لیے حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر لکھنے والے بڑے لوگ ہیں۔ آج کی مثالی اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے اس نمبر سے مکمل رہنمائی مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد طفیل کا یہ کام چند تعریفی کلمات سے بہت بڑا کام ہے۔ یہ اپنی تحسین آپ ہے۔ اسے کئی نسلوں تک کام دینا ہے۔ اصحاب صفہ، کاتبانِ وحی، وفود کی تعداد جیسے اہم موضوعات کے حوالے سے بات ہوئی ہے کہ وہ اس نمبر کی بدولت ہمارے سامنے آئے۔ ان کی عادت مجھے معلوم ہے یہ مولانا سلیمان ندوی کے الفاظ میں چیونٹیوں کے منہ میں سے شکر کا ایک ایک دانہ نکال کر جمع کرتے ہیں اور مٹھاس کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ انہوں نے اس طرح خاموشی سے ریزہ ریزہ جمع کر کے لاہور نمبر نکالا۔ اب لاہور پر کوئی شخص لکھے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں نے سیرت نمبر کی دس جلدوں میں سے چھٹی اور دسویں جلد کو خاص طور پر سامنے رکھا ہے۔ چھٹی جلد میں تو مجموعۂ احادیث ہے جو مولانا متین ہاشمی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ حدیث کے مسائل کے ضمن میں جو مقالات ہیں ان پر مجھے تفصیلی بات نہیں کہنی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں انہیں پڑھ کر بہت مطمئن ہوا۔ معلومات اور مسائل کی حد تک ان میں بہت سی چیزیں آگئی ہیں۔ دسویں جلد (نعت) میں نعتوں کے اردو حصہ کو میں نے سرسری طور پر دیکھا اور محسوس ہوا کہ تقریباً تمام اہم نام آگئے ہیں۔ فارسی کے حصے کو میں نے زیادہ توجہ سے نہیں دیکھا عربی کے حصے کے حوالے سے البتہ مجھے کچھ کہنا ہے (اگرچہ میں عربی دان نہیں ہوں) میں تھوڑا بہت ان چیزوں کو پڑھتا رہا ہوں۔ ایک بات مجھے محسوس ہوئی ہے کہ قصیدہ بردہ کیسے رہ گیا!

محمد طفیل: یہ قصیدہ رسول نمبر کی دسویں جلد میں آگیا ہے۔

نعیم صدیقی: اچھا، میں دسویں جلد میں دیکھتا رہا ہوں۔ خیر، جناب ابو طالب کے جو اشعار دیے گئے وہ کیسے منتخب کیے گئے؟ ان کا ایک زوردار نعتیہ قصیدہ وہ ہے جس کی جھلک حالی کی مد و جزر اسلام میں ملتی ہے۔ اس قصیدے میں زورِ بیان انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انتخاب کرنے والے نے یہ سوچا کہ قصیدے کے جس حصے میں براہ راست حضور پاکؐ کی ذات مبارکہ کے بارے میں اشعار ہیں وہ لے لیے جائیں۔ بہرحال نعت کی خاص فضا بنتی ہے۔ ایک اور خاص بات جو میں نے نوٹ کی ہے وہ یہ ہے کہ مستشرقین کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا ٹھوس جواب پیش کیا جائے۔ دار المصنفین کے مہتمم سید صباح الدین عبدالرحمٰن تشریف لائے۔ ان کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔

آپ مولانا سلیمان کے براہِ راست شاگرد ہیں انہوں نے وہاں فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سیمینار کرایا۔ سیمینار میں مستشرقین پر جو مقالات پیش کیے گئے ان میں بتایا گیا کہ پہلے تو پادری وغیرہ کام کرتے رہے تھے۔ مگر آٹھویں صدی میں بشپ جان آف دمشق کے ذریعے علمی کام کا آغاز ہوا اور تب سے منٹگمری واٹ تک مختلف مستشرقین نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کیا ان سازشوں کا ٹھوس جواب ریکارڈ پر رکھنا ضروری ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ نقوش کے اس سیرت نمبر کی ایک جلد خاص اس کام کے لیے مخصوص کر دی جائے۔

محمد طفیل: اس موضوع پر مقالات لکھوائے جا چکے ہیں اور ان شاء اللہ سیرت نمبر کی زیرِ تکمیل جلدوں میں انہیں پیش کیا جائے گا۔

نعیم صدیقی : بہرحال میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ایک جلد مقرر کی جائے۔

محمد طفیل : دراصل مستشرقین نے جو اعتراضات اٹھائے ہیں وہ انتہائی جذباتی نوعیت کے ہیں اور مسلمان تو ویسے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

مولانا مالک کاندھلوی : جذباتی چیزیں تو ہیں مگر ہم ان کا ضابطہ تمہید کے طور پر مرتب کر کے کھلے انداز سے ان کی ان چیزوں کو جمع کریں جن سے وہ اسلام سے متنفر بناتے ہیں ان کا مزاج تو جیسا کہ صدیقی صاحب نے کہا بالکل یہی ہے کہ وہ ہر بات کو اس انداز کے ساتھ پیش کریں گے جیسے کہ وہ بظاہر اسلام کی صداقت کو تسلیم کر رہے ہیں مگر درمیان میں ایک جملہ یا لفظ ایسا استعمال کر جائیں گے جو ذہنوں کو انتشار کا شکار بنا دیتا ہے۔

نعیم صدیقی : بہرحال اس پر جامع اور الگ جلد کی صورت میں کام سامنے لانا چاہیے۔

بیدار سرمدی : ڈاکٹر معین الرحمان فاضل دانشور ہیں اب ان سے گزارش ہے کہ وہ نقوش کے سیرت نمبر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

ڈاکٹر معین الرحمان : آج کی نشست نقوش کے رسول نمبر کے حوالے سے منعقد کی گئی ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے ابھی محمد طفیل اس موضوع پر دو تین جلدیں مزید بھی پیش کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ ستائش اور تحسین درحقیقت نقوش کے بارے میں واقعاتی باتیں ہیں۔ محمد طفیل کا یہ کارنامہ ۱۹۸۲ء میں چار جلدوں کی صورت میں پہلی بار سامنے آیا تھا۔ نقوش سے محمد طفیل کا تعلق دو چار برس کی بات نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ ایک تہائی صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ ۵۰ء سے محمد طفیل شعر و ادب کے میدان میں ہیں۔ رسالہ نقوش کی ادارت کی بھی ایک تاریخ ہے۔ جب رسالہ نقوش سے محمد طفیل منسلک ہوئے تو وہ چھبیس ستائیس برس کے جوان رعنا رہے ہوں گے۔ ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ جب انھوں نے نقوش کے رسول نمبر کا سلسلہ شروع کیا تو وہ ۵۸ برس کی پختہ کار شخصیت تھے۔ اب جب نقوش کی رسول نمبر کی دس جلدیں انھوں نے پیش کی ہیں تو وہ ۶۰ برس سے تجاوز کر چکے ہیں۔ اب تک انھوں نے ادبی میدان میں جو کچھ کیا گویا وہ تربیتی عرصہ تھا اور وہ کام آغاز کر رہے تھے۔ جیسا کہ مولانا نے فرمایا تمام راستے ادھر کو ہی جاتے ہیں۔ نقوش کی پیشانی پر ہمیشہ یہ درج رہتا :

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان۔

زندگی آمیز ادب افسانے میں، شعر و ادب کی شخصیات میں، مکاتیب میں، خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اور پھر اردو ادب کی چار اہم شخصیات میر انیس، میر تقی میر، غالب اور اقبال پر نقوش کے خصوصی نمبر شائع ہوئے اور وہ یادگار ہیں۔

پھر معاصر شخصیتوں پر بھی انہوں نے خصوصی نمبر نکالے۔ آپ بیتی نمبر اور شخصیات نمبر الگ ہیں۔ یہ ساری تیاری اور منصوبہ بندی ایک بڑے منصوبے کے لیے تھی جو اب رسول نمبر کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ رسول نمبر کی دسویں جلد کو لے لیجئے اس میں بھی انھوں نے اپنا راستہ ہٹ کر نکالا ہے۔ اب تک کے مجموعے عام طور پر زمانی ترتیب کے لحاظ سے ہوتے تھے۔ محمد طفیل صاحب نے زمانی ترتیب کو بھی قائم رکھا اور انھوں نے ہیئت کے اعتبار سے بھی کام کیا۔ مثلاً درود و

سلام، مثنوی، مسدس، نظمیں، آزاد نظم، رباعیات جیسے عنوانات قائم کئے اور پھر زمانی ترتیب بھی پیشِ نظر رکھی۔

جناب یوسف گورایہ نے اہم کام کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے مضامین پر مشتمل ایک الگ فہرست شائع کی جانے۔ میرا خیال ہے یہ درست ہے کہ موضوع وار ایک اشاریہ مرتب کردیا جائے اور یا پھر اسماء الرجال کے حوالے سے اشاریہ دے دیا جائے۔

بیدار سرمدی: اب تک رسول نمبر کی معنوی خوبیوں پر بات ہوئی ہے۔ نقوش کے اس رسول نمبر کا ایک بصری حسن بھی ہے اور بصری حسن معنوی حسن تک رسائی کا پہلا زینہ اور پہلا معیار سمجھا جاتا ہے۔ میں مولانا مالک کاندھلوی سے گزارش کروں گا کہ وہ رسول نمبر کے اس پہلو پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔

مولانا مالک کاندھلوی: نقوش کا بصری حسن بھی یقیناً مثالی ہے دینی خدمت کے لیے باطنی محاسن کے ساتھ ظاہری محاسن کا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انسان کی پہلی نظر ظاہری محاسن کی طرف ہی اٹھتی ہے۔ اس نمبر کی کتابت، طباعت اور دوسرے پہلو لائقِ تحسین ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے بڑے ذخیرے سے اتنے محاسن کا انتظام کرنا اور نبھانا بڑی کامیابی ہے۔ بعض محدثین نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

قرآن پاک کو اس طرح لکھا جائے کہ الفاظ ترتیب سے ہوں۔

گویا ظاہری محاسن اور حُسنِ ترتیب بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

بیدار سرمدی: ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک شخص نے اس پر عمر کا اتنا سرمایہ خرچ کیا اور ایک قیمتی دستاویز تیار کی تو ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اس کے پھیلانے اور عام قارئین تک پہنچانے کی اجتماعی کوششیں بھی ہوں۔ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

مولانا مالک کاندھلوی: میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری سطح پر تو اس نیک کام کے پھیلاؤ کے لیے جو کچھ ہوگا سو ہوگا عام علمی اور دینی اداروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس نمبر کو خریدیں۔ لائبریریاں اپنے ہاں اسے رکھیں۔ اس طرح ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔

ڈاکٹر یوسف گورایہ: یہ کتاب صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے قابلِ قبول ہے۔ جب ہر شخص اس سے استفادے کی کوشش کرے گا تو اس کا پھیلاؤ شروع ہو جائے گا۔ صوبائی اور مرکزی حکومت کو بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ کوئی قصبہ ایسا نہیں جہاں سکول اور کالج نہیں اور کوئی سکول اور کالج ایسا نہیں جہاں لائبریری نہ ہو ان اداروں میں ہر سال کتابیں خریدی جاتی ہیں اور ان کے مخصوص فنڈ ہیں۔ اس کے علاوہ ملک سے باہر سفارتخانوں میں اسے پہنچایا جائے۔ پھر باہر جو اردو دان طبقہ ہے اس تک اسے پہنچایا جائے۔

بیدار سرمدی: نقوش کے رسول نمبر کو اردو زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل کرنے سے اس کی افادیت کے نئے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر یوسف گورایہ: میرے خیال میں اسے دوسری زبانوں میں ضرور منتقل ہونا چاہیے۔ لیکن اس وقت جب محمد طفیل صاحب تمام جلدوں کی تدوین اور ترتیب کے بارے میں تمام کام مکمل کریں۔

ڈاکٹر معین الرحمان: میں سمجھتا ہوں کہ اس کے نفع بخش مضامین اور مندرجات کی بنا پر ترجمہ کرنے والے خود اس کی طرف رجوع کریں گے۔

بیدار سرمدی: پروفیسر محمد منور علم و ادب کی نامور اور ممتاز شخصیات میں سے ہیں اُنھوں نے سیرتِ رسولؐ کے حوالے سے مختلف تصنیفات کو دیکھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب وہ نقوش کے رسولؐ نمبر کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

پروفیسر محمد منور: نقوش کی تمام جلدوں کا مکمل مطالعہ تو بہت مدت کا متقاضی ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ دیکھا اور پڑھا ہے اس کی روشنی میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نمبر سیرت کی حد تک دائرۃ المعارف بن گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ سیرت ایسا موضوع ہے کہ اس پر قلم اٹھانے والا مثالی اوصاف کا مالک ہو۔ چنانچہ سید بدرالدین علوی۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، محمد اجمل، مولانا ابوالحسن ندوی جیسے اہم نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سیرتِ رسولؐ پر جتنا کچھ عربی میں لکھا گیا اتنا فارسی میں نہیں لکھا گیا اور جتنا اردو میں لکھا گیا اتنا عربی فارسی میں ملا کر نہیں لکھا گیا۔ علامہ شبلی یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ اردو ہمیں اس لیے عزیز ہے کہ اس میں اتنا دینی سرمایہ ہے جو کسی زبان میں نہیں ہے حالانکہ اردو زبان کو شروع ہوئے ابھی اتنا عرصہ نہیں ہوا۔ اب یہ نقوش کا رسولؐ نمبر سامنے رکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان نے کئی قدم آگے بڑھے ہیں۔ بعض موضوعات کے سلسلے میں پڑھنے والوں کی پیاس نئے انداز سے بجھی ہے۔ مثلاً غزوات اور مہمات کو علیحدہ علیحدہ ایک حد تک ہم نے پڑھا ہوگا لیکن ایک جگہ ، سے زیادہ پہلے ہمارے سامنے نہیں آئے۔ پھر حضورؐ کے سپہ سالار، غزوہ بدر کے اصحاب اور اس طرح دوسری تفصیلات اس رسولؐ نمبر میں ملیں گی۔ چونکہ محمد طفیل صاحب کا کہنا ہے کہ ابھی وہ اس پر مزید کام کر رہے ہیں۔ اس لیے حضورؐ کے فقیہ صحابہ اور ان سے فقہ کے مختلف سلسلوں کی تفاصیل آئیں گی۔ حضورؐ کے اقوال، حضورؐ کی مختلف جملوں میں بڑی بات کہنے کا فن، حضورؐ کے ہمعصر شاہوں، شیوخ اور قبائل کی تفصیلات اس میں ملیں گی۔ نئے دور میں لوگ وقت کی کمی کے بحران میں مبتلا ہیں رسولؐ نمبر کی موجودگی میں کم وقت میں حضورؐ کے عہد کا معاصر نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں کچھ باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ رسولؐ نمبر کی آنے والی جلدوں میں انڈونیشیا، ملائشیا، چین، روسی ترکستان، ترکی اور ایسے ہی دوسرے ممالک میں نعت اور سیرت پر ہونے والے کام کو جمع کیا جائے۔ میں نے برازیل میں آباد مسلمانوں کی نعتیں دیکھی ہیں۔ اس تمام کام کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ اس نمبر میں عربی، فارسی اور اردو نعت کے تقریباً تمام اہم اور بڑے نام آ گئے ہیں اور یہ بات اطمینان بخش اور قابلِ ستائش ہے۔

بیدار سرمدی: اس وقت اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی جو باتیں ہو رہی ہیں اس دھارے میں آپ کی نظر میں رسولؐ نمبر کیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

پروفیسر محمد منور: اس دور کے مسائل پر بھی ہمارے معاصر اکابر نے بحث کی ہے۔ اب تو کہا نہیں جا سکتا کہ رسول نمبر کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ کیونکہ یہ عملاً مشکل ہوگا۔ لیکن ایسا اہتمام تو ہو سکتا ہے کہ نوجوانوں کو اس کے پڑھنے کی طرف لایا جائے۔ یہ کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ عمل کرنے کی غرض سے مکمل کی جا رہی ہے کم از کم جو پڑھے وہ اپنائے تو سہی اور اپنائے بھی اس طرح کہ دوسروں کو اس کے کردار میں سیرت کی خوشبو آئے۔ محمد طفیل صاحب نے سو اتنا بڑا کام کیا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا کام کرنے والے کو حضورؐ کا دامانِ رحمت میسر نہ ہو۔

بیدار سرمدی: اس پاک کاوش کے پھیلاؤ کے سلسلے میں پہلے بھی باتیں ہوئی ہیں۔ مثلاً تعلیمی اداروں کی لائبریریوں میں اور ایسے دوسرے علمی مراکز پر اس کی دستیابی ممکن ہو آپ مزید کیا تجویز پیش کریں گے؟

حافظ سلیم تابانی: میں سمجھتا ہوں کہ یہ نمبر طلبہ اور مدارس کی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے علماء کی بھی ضرورت ہے۔ آج کی تفرقہ بازی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علماء میں سے بعض سیرتِ رسولؐ پر توجہ نہیں دیتے۔ اور یہ کتاب ان میں اتحاد اور ان کے مطالعہ میں برکت کا باعث بن سکتی ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر علیحدہ علیحدہ ہو سکتی ہے لیکن سیرت پاک ایسا پہلو ہے جس میں تفرقہ بازی نہیں ہو سکتی۔ میری رائے میں تمام علماء کو خصوصی طور پر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بیدار سرمدی: صدرِ مملکت پہلے بھی اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں اب یہ کام بھی وہی کر سکتے ہیں کہ ملک بھر کی لائبریریوں اور دوسرے مراکز تک رسول نمبر پہنچانے کے لیے ذاتی دلچسپی لیں۔

تحفے تحائف اور جہیز کے لیے نقوش کے رسول نمبر کی روایت شروع کرنا ثواب کے ساتھ ساتھ اس کے پھیلاؤ کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر مختلف انعامی مقابلوں میں اسے انعام کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر محمد منور: میں کسی عزیزہ یا عزیز کی شادی میں جاتا تھا تو مسدس حالی دیا کرتا تھا لیکن پھر اس طرح کی کوئی اور کتاب دینا شروع کر دی اب وہ لوگ جن کے پاس استطاعت ہے وہ یقیناً رسول نمبر دے سکتے ہیں۔

بیدار سرمدی: اگرچہ رسول نمبر کا دس جلدوں کا سیٹ ایک ہزار کا ہے تو میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہوں گا کہ یہ اس قیمت پر تین گنا سستا ہے اور یہ بھی محمد طفیل صاحب کی بڑی ہمت ہے۔

پروفیسر محمد منور: میں تو بنکوں، تجارتی اداروں اور انشورنس کمپنیوں کو بھی اس طرف متوجہ کروں گا پھر ہمارے سارے بورڈ مختلف مضامین میں اوّل آنے والوں کو انعامات دیتے ہیں وہ اس کو کیوں نہ پیش کریں۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۶ جون ۸۴ء)

○

○ سوالات اسد اللہ غالب کے، جوابات محمد طفیل کے

اسد اللہ غالب: رسول نمبر کی اشاعت کا خیال کیسے آیا؟

محمد طفیل: شاعروں اور ادیبوں کا تو یہ ہے کہ وہ خیال کے بادشاہ ہوتے ہیں اگر آپ مجھے بھی چھوٹا سا ادیب سمجھ لیں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندہ رہنے کی ایک تدبیر سوچی تھی، ایسی تدبیر جس میں میرے لیے راحتیں ہی راحتیں تھیں، سکون ہی سکون تھا۔ مثلاً میں نے سوچا، افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر مجھے کب تک زندہ رکھ سکیں گے۔ جواب ملا: دس بیس برس۔ اسی طرح مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر، شخصیات نمبر تیس چالیس برس، غرض اقبال نمبر، غالب نمبر اور میر نمبر میں سے کسی نمبر نے مجھے چالیس پچاس برس سے زیادہ زندہ رہنے کی نوید نہ سنائی۔ مگر میں چالیس پچاس برس کی عمر میں فوت ہونا نہیں چاہتا تھا میں تو لمبی عمر چاہتا تھا۔

"بہت خوب! لمبے منصوبے۔"

"جی ہاں! لمبے منصوبے۔ مگر کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا، سوچ سوچ کر بوڑھا ہو گیا، بالآخر روشنی ملی۔ قدرت نے میری مدد کی۔ منزل کی نشان دہی کر دی کہ "رسول نمبر چھاپو۔ صدیوں زندہ رہو گے۔" یہ تو طے ہو گیا کہ رسول نمبر چھاپنا چاہیے۔ مگر کیسے؟ یہ کام تو علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے کیا تھا۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کیا تھا۔ سوال پیدا ہوا کہ یہ ہیچمدان اگر اس کام کو کرے تو کیسے؟ ایسا محسوس ہوا جیسے مور نے اپنے پاؤں نہ دیکھے ہوں، رنگ برنگے پر دیکھ لیے ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جتنے رنگ کے پر ملے وہ سب میں نے اکٹھا کر لیے۔ اپنے اردگرد سیرت کی کتابوں کا ڈھیر لگا لیا۔ ہر کتاب نے مجھ سے کہا میری اس خوبی کو نوٹ کر لو، میری اس خوبی کو نوٹ کر لو۔ میری اس خوبی کو نوٹ کرو۔ چنانچہ یادداشتیں جمع ہوتی رہیں، دماغ میں کمپیوٹر لگ گیا۔"

"اچھا، یہ بتائیے یہ کمپیوٹر امریکہ کا ہے یا روس کا؟"

"یہ کمپیوٹر نہ امریکہ کا ہے نہ روس کا، اس کمپیوٹر پر مہر ہے مدینہ کی، اور اس کمپیوٹر کو بنے چودہ سو سال گزر چکے ہیں مگر اس میں نہ کوئی فرق آیا ہے اور نہ آئے گا۔ یہ قیامت تک سچی گواہیاں دے گا۔"

"قیامت کی بات پر، یہ پوچھ لوں، اس نمبر کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں؟"

"اس نمبر کے سلسلے میں قیامت کا لفظ استعمال نہ کریں۔ اس مہم میں جو کچھ پیش آیا اسے مشکلات کا نام نہ دیں۔ وہ سب راحتوں کے مرحلے تھے وہ سب قرب حضوری کی منزلیں تھیں۔ میں تو راہِ حبیب میں دوڑتا چلا گیا۔ منزل قریب آتی گئی، میں نے ایسے ایسے تن آسان علماء سے مضامین لکھوائے جو ایک لفظ لکھنے کے بعد اللہ میاں سے پوچھا کرتے تھے دوسرا لفظ لکھوں یا نہ لکھوں۔ یقین جانیے مجھے تو ایسے لگا جیسے میرے ہاتھ اسم اعظم لگ گیا ہو۔ میں نے

جو چاہا وہ ہوگیا۔ یہ سب برکتیں موضوع کی تھیں۔"

"پہلی بار چار جلدوں کے سلسلے میں جو آپ کی پذیرائی ہوئی اس سے آپ مطمئن ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ کام کسی دنیاوی لالچ کی خاطر نہیں کیا تھا بلکہ میرا تو یہ خیال تھا کہ اتنا ضخیم کام میری زندگی میں چھپ نہ سکے گا، بے شک میں نے یہ کام تیرہ برسوں میں انجام دیا۔ ان تیرہ برسوں میں جن کے مہینے ۱۵۶، دن ۴۷۴۵، گھنٹے ۱۱۳۸۸۰، اور منٹ ۶۸۳۲۸۰۰ ہوتے ہیں۔ یہ حساب میں نے اس لیے کیا کہ میں نے یہ کام منٹوں کو ذہن میں رکھ کر کیا۔ برسوں کو نہیں، اگر ایسا نہ کرتا تو یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زندگی کے معمولات بدل ڈالے جن تقریبات کو چھوڑ سکتا تھا وہ چھوڑیں۔ جن رشتہ داروں کی شادیوں میں عدمِ شرکت سے گزارہ ہو سکتا تھا، وہ وقت بچایا۔ بلکہ یہاں تک کہ اس عرصہ میں جو مجھے چھوٹے موٹے عارضے لاحق ہوئے ان پر بھی میں نے خدا سے کہا: مجھے رسولؐ نمبر چھاپنے کی مہلت دیجئے، اس کے بعد تیری رضا۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا کہ جس کی آرزو اس کی زندگی میں پوری ہوگئی، وہ بھی سب سے بڑی آرزو۔ اہلِ علم نے بھی دل کھول کر داد دی۔ میں ان سب کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ پاکستان کے دینی اداروں نے بھی داد دی اور ہندوستان کے دینی اداروں نے بھی۔ مثلاً دار المصنفین اعظم گڑھ (شبلی نعمانی کی سیرت النبیؐ چھاپنے والا ادارہ) ندوۃ المصنفین لکھنؤ، دار العلوم دیوبند، یہ سب کچھ میرے لیے حد درجہ فخر کی بات ہے۔ یہ فخر کی بات پاکستان کے لیے بھی ہے۔

اہلِ علم نے نہ صرف داد دی بلکہ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ ان کی روشنی میں جو نئے نمبر چھپیں گے ان کی بات ہی اور ہوگی۔ بغرض اس کام کو سب نے اپنا کام سمجھ لیا ہے۔ وہ سوچتے ہیں اگر کسی وجہ سے ہم سیرت کے فلاں موضوع پر کام نہیں کر سکے تو وہ کام نقوش کے ذریعہ سامنے آجائے۔ میں نے بھی سیرت کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے کہ ان نمبروں کو مزید بہتر بنانا ہے۔ کیونکہ یہ نمبر جس ذاتِ اقدس کے بارے میں ہیں یا جن کے حضور پیش کرنا ہیں، یہ ان کے شایانِ شان تو ہوں یا انسانی کوششوں کی انتہا تو ہوں۔"

"حکومت نے آپ کو پہلی چار جلدوں پر ایک لاکھ کا انعام دیا۔ کیا آپ کا حق ادا ہوگیا؟"

"آپ کے خیال میں کتنا انعام ملنا چاہیئے تھا؟"

"علماء کا طبقہ اسے سیرت پر انسائیکلو پیڈیا قرار دے رہا ہے۔ ماضی میں بھی ایسے بھرپور کام کی کوئی مثال نہ تھی۔ کم از کم آپ کو پانچ لاکھ روپیہ ملنا چاہیئے تھا۔"

"نہ نہ، ایسا نہ کہیں، سب کچھ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ محض کارندے ہیں۔ جو کچھ مجھ سے کرانا مقصود تھا وہ میں کر رہا ہوں، جو کچھ دوسرے سے کرانا مقصود ہے وہ دوسرا کر رہا ہے۔ ہم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔"

"جدید عصری تقاضوں کے مطابق آپ نے خاص طور پر کن موضوعات کا انتخاب کیا؟"

"میرے نزدیک آپ کا یہ سوال، بنیادی سوال ہے کہ اتنی سیرت کی کتابوں کی موجودگی میں۔ آخر اس بہ ل

ضرورت کیا تھی؟ میرے نزدیک ضرورت یہ تھی اور ہے کہ میرے ملک کا معاشرہ بگڑ رہا ہے (یاد رہے یہ منصوبہ میں نے ۱۹۷۰ء میں بنایا تھا حالات آج بھی جُوں کے توں ہیں) اسے سیرت النبیؐ کی روشنی میں سنوارنے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک کی خدمت کا بامعنی منصوبہ ہے۔ ملکی منصوبوں میں، یہ سب سے بڑا منصوبہ ہے کہ قوم کی سوچ کا چلن بدلا جائے اور وہ چلن وہ ہو جس کا درس ہمیں محمد رسول اللہؐ نے دیا تھا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ میں نے جو عنوانات سوچے وہ میری سوچوں کی ترجمانی کریں گے۔ مثلاً ایک عنوان ہے: "اصلاحِ معاشرہ اور سیرۃ نبویؐ"، دوسرا "عظمتِ انسانی کا نقیب ہمارے رسولؐ"۔ تیسرا "فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظامؐ"، چوتھا "اخلاقی اصلاح اور ہمارے رسولؐ"۔ پھر جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے "علوم انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر"، "علم و تہذیب کی ترقی میں معارفِ محمدیؐ کا حصہ"۔ "رسالت محمدیؐ کا عقلی ثبوت"۔ ایسے عنوانات سیرت کی کتابوں میں یا تو موجود نہیں یا برائے نام ہیں۔ ان پر سیر حاصل مواد موجود نہیں۔ ہم نے تو ایسے عنوانات پر آٹھ آٹھ دس دس مضامین لکھوائے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور وقت کے تقاضے پورے ہوں۔

آپ نے یہ موضوع چھیڑ دیا ہے تو یہ بھی سُن لیں کہ ہم نے سیرت کے ایسے پہلو ڈھونڈے اور انھیں موضوع بنایا جن پر سیرت کی سابقہ کتابیں چُپ ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ مگر یہ دیکھ لیجئے آپ کے پاس وقت ہے؟"

"ضرور بتائیے، بھلا اس کام کے لیے وقت کیوں نہ ہوگا! اس طرح ہمارے قارئین کو آپ کی سوچ کے ہر پہلو سے آگاہی ہوگی۔"

"مناسب ہوگا پہلے ہم سیرت کی اہم کتابوں کو ذہن میں رکھ لیں۔ مثلاً سیرۃ النبیؐ اور رحمۃ للعالمینؐ کو! ان میں سے کسی کتاب میں اصحابِ صفہ پر مواد ملے گا؟ یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ جنتی ہیں۔ اس عنوان کے تحت بے شک چند سطریں، چند صفحے ملیں گے مگر نام بہ نام تذکرہ نہ ملے گا۔ ہم نے ۸۹ اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ کاتبانِ وحی پر چند سطریں ملیں گی مگر نام بہ نام تذکرہ نہ ملے گا۔ ہم نے ۴۸ اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ واقعۂ ہجرت سیرت کا بنیادی موضوع ہے مگر اس پر چند صفحات ملیں گے زیادہ تفصیل نہ ملے گی۔ ہم نے اسباب و محرکات پر گفتگو کی، راہیں، قیام اور منزلوں کا ذکر کیا پھر اس کی عالمگیر اہمیت پر گفتگو کی۔ ہم نے اس موضوع کے لیے ۱۲۷ صفحات مختص کیے۔ یہ بھی عرض کردوں ہمارے پاس بنیادی کتاب سیرتِ ابن ہشام ہے۔ اس میں خدمتِ اقدس میں پہنچنے والے جتنے وفود کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بعد تحقیق اس میں اضافہ کیا۔ ہمارے ہاں ۱۰۱ وفود کا ذکر ملے گا۔ یہ ہے وہ تھوڑی سی تفصیل، جس سے ہمارا کام، سیرت کی دوسری کتابوں سے الگ نظر آئے گا۔ یہاں ایک بات کی صراحت کردوں، وہ یہ کہ میرے اس سب کچھ بیان کردینے سے سیرت کی متذکرہ کتابوں کی اہمیت نہ کم ہوسکتی ہے اور نہ ہوگی۔ یہ تو سیرت کے موضوع پر مینارۂ نور ہیں اور میں بات نئے موضوعات کی کر رہا ہوں۔ غرض رسولؐ نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں میرے ذہن میں صرف یہی باتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ یہ نمبر سیرت کی کتابوں کے مختلف نہج پر ترتیب دیا جائے اور یہ کہ سیرت کے نئے موضوعات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ دُوسرے حضورؐ کی زبان سے جو کچھ نکلا ہو یا جو کچھ کیا ہو اسے یکجا کردیا جائے۔ تیسرے یہ کہ معاشرہ کو

سیرتِ رسولؐ کی روشنی میں سنوارا جائے۔"

"رسولؐ نمبر کی دس جلدوں پر کیا آپ کا ابتدائی منصوبہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے یا آپ اس کام کو مزید جاری رکھیں گے؟"

"میرا خیال ہے کافی باتیں ہو گئی ہیں باقی پھر پر اٹھا رکھیے !"

"بس دو ایک باتوں کا اور جواب دے دیجئے۔"

"بات یہ ہے کہ میں نے ساری عمر خاموشی سے کام کیا ہے۔ میرا وجود عمل سے قائم ہے باتوں سے نہیں۔ اس لئے بخوشی یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ زندگی بھر یہ چاہا کہ میں نہ بولوں میرا کام بولے۔ مگر میں منصوبہ کی تکمیل والی بات کا جواب عرض کیے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ موضوع ایسا ہے کہ جتنا لکھیے، جتنا پڑھیے، جتنا سوچیے، انتہا نہیں ملتی۔ جب میں نے پہلی چار جلدوں میں قسط پیش کی تھی تو اس وقت عرض کیا تھا:" قارئین نے اگر میرے کام کی پذیرائی کی تو اور جلدیں پیش کروں گا، ورنہ اپنی مرضی سے ایک جلد تو مزید پیش کروں گا کیونکہ وہ ناگزیر ہے۔ وہی بات دس جلدیں پیش کرنے کے بعد بھی عرض کر رہا ہوں اگر حالات نے اجازت دی تو اور جلدیں پیش کروں گا ورنہ ایک جلد تو اور پیش کروں گا کیونکہ وہ پہلے ہی کی طرح ناگزیر ہے۔ انھی دس جلدوں کا وہ تکملہ ہے۔"

"حکومت آپ کے لیے کچھ کر رہی ہے؟ بس یہ ذرا سا سوال ہے۔"

"میں اپنا کام کر رہا ہوں، حکومت اپنا فرض ادا کرے گی، خاص طور پر صدرِ مملکت کو اس موضوع سے بعید دلچسپی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ کام مکمل ہو جائے۔ وہ اس موضوع سے ربطِ خاص رکھتے ہیں۔"

"یہ باتیں تو تھیں رسولؐ نمبر کے بارے میں، ایک سوال آپ کی سابقہ ادبی زندگی کے بارے میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ رسولؐ نمبر کی اشاعت کے بعد، ارفع منزل پر پہنچنے کے بعد کیا آپ دوبارہ شعر و ادب کی لایعنی دنیا میں واپس آئیں گے؟"

"دوست ! آپ نے ادب کی خدمت کو لایعنی قرار دیا۔ یہ آپ نے ظلم کیا، مجھے تکلیف پہنچائی۔ ادب و شعر کے ذریعہ ملک کے ذہین طبقہ کی تربیت کو بھی میں عبادت ہی سمجھتا ہوں، مدارج کا فرق بے شک ہے۔"

"کوئی پیغام ؟"

"مجھے اپنے اہلِ وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتداً سے لے کر اب تک میں نے زندگی ان کے نام لکھ دی تھی اب وہ میرے لیے دعا کریں کہ مجھے میرا مقصود ملے۔ وہ یہ کہ دربارِ رسالت کی آخری صف میں جو آخری آدمی کھڑا ہو وہ محمد طفیل ہو۔"

○ (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۴ جنوری ۱۹۸۴ء)

○ جنگ فورم کے تحت ایک خصوصی نشست کی رُوداد —— تحریر و میزبانی: ضیا شاہد، حسن رضوی

میزبان: آج کی نشست "نقوش کے "رسولؐ نمبر" کے بارے میں ہے یوں تو نقوش نے ہمیشہ ہی بڑے وقیع نمبر دیئے ہیں، تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر اب تک نقوش کی دس جلدیں چھپ چکی ہیں اور محمد طفیل صاحب کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کا بطور خاص تذکرہ ضروری ہے۔ جس ترتیب سے آپ حضرات یہاں تشریف فرما ہیں اس اعتبار سے آغا سہیل صاحب گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

آغا سہیل: یہاں پہ مجھ سے سینئر حضرات اور علمائے کرام موجود ہیں نقوش کے رسولؐ نمبر کی بات کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس جریدے نے اصنافِ ادب پر مختلف قسم کے نمبر شائع کیے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسی صنف باقی ہو جس پر نقوش کا کوئی نمبر نہ نکلا ہو۔ یہ بات بخوبی کہی جا سکتی ہے کہ محمد طفیل مدیر نقوش بذاتِ خود ایک اکیڈمی کے برابر ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شاید کوئی اکیڈمی بھی اتنی لگن اور اتنی محنت سے وہ کام سرانجام نہ دے سکتی جو محمد طفیل صاحب نے انجام دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے حوالے سے نقوش کا یہ نمبر اردو ادب ہی میں نہیں بلکہ کسی بھی زبان کے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار پائے گا۔ حال ہی میں نقوش کے اس نمبر کی پانچویں جلد سامنے آئی ہے جس میں اسلامی ریاست کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس نمبر کے مندرجات کو ایک نظر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر عرق ریزی سے موضوعات کا انتخاب کیا گیا۔ مثال کے طور پر "بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا کا سیاسی نظام" یہ ایک مضمون کا عنوان ہے اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی دلچسپ تحقیق ہے کہ اس وقت کے عالمی منظر کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور مضمون تاسیسِ ریاست کے سلسلے میں "ریاست کی فکری بنیادیں" ہے جس میں اسلام کے نقطۂ نظر سے ریاست کے جتنے بھی گوشے ہو سکتے ہیں ان سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاسیس ریاست سے توسیع ریاست تک اور استحکامِ ریاست سے انتظامِ ریاست تک کتنے ہی موضوعات ہیں جو انتہائی سلیقے سے اس نمبر کی زینت بنائے گئے ہیں۔ اس ایک جلد کے علاوہ دیگر جلدوں کے مندرجات بھی میں نے جستہ جستہ دیکھے ہیں۔ مثلاً ایک پوری جلد میں انتخابِ نعت ہے۔ اتنی اہم جلدوں پر ایک ہی نشست میں بات کرنا بھی مشکل ہے البتہ میں نے محض اس لیے حامی بھر لی کہ اس گفتگو میں شرکت میرے لیے باعثِ سعادت ہو گی۔

اسعد گیلانی: آغا صاحب نے درست فرمایا ہے۔ اس قدر بھرپور کام کے بارے میں چند جملوں میں کچھ کہنا ممکن نہیں بہر حال مختصراً یہ عرض ہے کہ اردو ادب میں اب تک جتنے نمبر بھی نکلے ہیں، جتنے رسائل نے خصوصی اشاعتیں شائع کی ہیں ان سب کے مقابلے میں نقوش کا یہ رسولؐ نمبر اس اعتبار سے سرِفہرست ہے کہ اب تک دس ضخیم جلدوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کام کے بارے میں کسی نے ایسی کاوش نہیں کی۔ فی الحقیقت یہ ایک طرح کا انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے جو لائبریریوں میں محفوظ رہ سکتا ہے اور اہلِ علم صدیوں تک اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جہاں تک

اس کام کی عظمت کا تعلق ہے میں صرف یہ کہوں گا کہ دار المصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جو بھارت میں اب تک کام کر رہا ہے اس ادارے نے سیرت کے موضوع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے چھ جلدیں لکھی ہیں جو اب تک اس سلسلے کا سب سے وقیع اور ضخیم کام سمجھی جاتی تھیں حالانکہ یہ چھ جلدیں بھی سب کی سب سیرت پر نہیں ہیں بلکہ ڈیڑھ جلد کا مواد سیرت پر ہے اور باقی ساڑھے چار جلدیں عبادات وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ گویا مکمل چھ سات سو صفحات سیرت پر ہیں اس کے مقابلے میں نقوش کا دس جلدوں پر مواد کم و بیش ۶۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اردو ادب میں اب تک اتنا مواد کہیں پر جمع نہیں ہوا۔

اس کام کا ایک پہلو جو قابلِ غور ہے میں کچھ اس طرح سے بیان کروں گا کہ نقوش نے اس سے پہلے بھی نمبر نکالے ہیں۔ نمبر طنز و مزاح پر ہو، غالب پر ہو، مکاتیب پر ہو، آپ بیتی پر ہو، محمد طفیل صاحب نے ان کے ذریعے ادب کے میدان میں اپنا سکہ بٹھایا اور وہ حوالے کی کتاب بن گیا۔ ان میں سے دو ایک نمبر یقینی طور پر حرفِ آخر نہیں تو ریفرنس کے طور پر ہمیشہ زندہ رہنے والی دستاویز ضرور ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس بات کی کم ہی توقع تھی کہ ادب کے میدان کا یہ شہسوار جسے نقوش کہتے ہیں پلٹ کر سیرت جیسے دینی موضوع پر آئے گا اور یہاں بھی اپنے جھنڈے گاڑ دے گا۔ سیرت کا میدان بہت کٹھن اور نازک ہوتا ہے اس کا تعلق صرف علم یا تحقیق سے نہیں بلکہ اس کے لیے جذبہ، جذبے کی گہرائی اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے محبت چاہیے۔ تب ہی سیرت کا حق ادا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سب خصوصیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ یہ اس کی رحمت کا ایک حصہ ہیں جو ہر کس و ناکس کو نہیں ملتی قدیم کتابوں کے ڈھیر سے مواد مرتب کرنا کسی اور موضوع کے بارے میں تو آسان ہو سکتا ہے مگر سیرت کے موضوع پر نہیں کیونکہ محض قینچی چلا کر مواد مرتب کر لیا جائے تو نہ اس میں جان ہوگی نہ اثر۔ پھر نقوش کے اس نمبر کی جلدوں کو دیکھیں تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے منٹو نمبر یا پطرس نمبر مرتب کیے تھے اس لیے کہ ان نمبروں کی ادبی حیثیت کچھ بھی ہو رسولؐ نمبر کے مقابلے میں وہ سارے کچھ بھی نہیں اس کام کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اب تک جو کچھ شائع ہو چکا ہے یہ نمبر اس مواد سے نہیں بلکہ تازہ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے اور یہ نئے مضامین اور نئے موضوعات اس نمبر کی بہت بڑی خوبی ہیں۔ سیرت کا موضوع ویسے بھی قابلِ فخر ہے لیکن اردو ادب اس ایک نمبر کے بارے میں فخر کر سکتا ہے میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ایک پہلو "حکمت کلام" پر ایک کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے گزشتہ دنوں بہت سی کتابیں کھنگالیں اب محسوس کرتا ہوں کہ جتنی کتابیں میں نے دیکھی تھیں یہ نمبر ان سے کہیں زیادہ ہے جس طرح سیرت کو بیان کرنے میں ایک لذت ہے اسی طرح اس نمبر کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی ایک لطف ہے اور محمد طفیل صاحب کی درازیِ عمر کی دعا کرتے ہوئے امید رکھنی چاہیے کہ جیسا کہ انھوں نے رسولؐ نمبر کے دیباچوں میں لکھا ہے وہ اس کام کو جاری رکھیں گے۔

ڈاکٹر سلیم اختر: ہم سب جانتے ہیں کہ اب تک محمد طفیل صاحب کے نقوش کی شہرت ادب کے حوالے سے تھی۔ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں انہوں نے بہت سے وقیع نمبر شائع کیے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب محمد طفیل کسی خاص اشاعت کا منصوبہ بناتے ہیں وہ کئی برس تک اس پر سوچتے ہیں اور شدید محنت کرتے ہیں۔ سیرت نمبر پر کام بھی انھوں نے دس بارہ

برس پہلے شروع کیا تھا۔ ایک اور خصوصیت ان کے کام کی ہے کہ وُہ اپنے ہر سابقہ کام سے کہیں زیادہ محنت کرتے ہیں کہ اگلا کام پہلے سے بہتر ہو۔ جہاں تک سیرت پر نقوش کی حالیہ اشاعت کا تعلق ہے اس کی دس جلدیں جو اب تک آئی ہیں وہ ایک معرکۃ الآراء کام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایسی اشاعت نہیں ہے کہ رات کو سونے سے پہلے ایک آدھ مضمون پڑھ لیا اور بس۔ اس کے مضامین اس کے موضوعات اور اس کی تحقیقی کاوشیں تو آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کی حیثیت رکھتی ہیں اور لائبریریوں میں، تعلیمی اداروں میں اور علم و ادب کے متوالوں کے ساتھ ساتھ سیرتِ رسولؐ کے مشتاق پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک گراں قدر تحفہ ہیں۔ رات میں "نقوش" کی ان اشاعتوں کو دیکھ رہا تھا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قولِ مبارکہ پر نظر پڑی کہ "اسلام کی بنیاد عقل پر ہے" یہ ایک حدیث مجھے نہ جانے کہاں لے گئی اور میں نے صدیوں سے جو کچھ ہو رہا تھا ایک نئے رنگ سے دیکھا۔ پھر مذہب کے نام پہ آج کل جو کچھ سوچا جاتا ہے یا کہا جاتا ہے وُہ اپنے اصل رنگ میں سامنے آیا اور وقتی مصلحتوں کے پردے اُٹھ گئے۔ جو دین روشنی دینے والا تھا اسے نہ جانے کیا رنگ دیا جاتا رہا ہے۔ آج پاکستان، ایران اور دوسرے ملکوں میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جو کام ہو رہا ہے اس سلسلے میں نقوش کا یہ نمبر ایک زبردست "کانٹری بیوشن" ہے اس لیے نہیں کہ یہ محض سرورِ کائناتؐ سے عقیدت کی چیز ہے بلکہ اس لیے کہ اس نمبر میں آج کے حوالے سے زندگی کے مختلف مسائل کو حل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور یہ دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب تک محمد طفیل نے جو کچھ کیا تھا وہ ان کی دُنیا کے لیے تھا اور یہ کام انھوں نے اپنی عاقبت کے لیے کیا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کام ایسا ہے کہ صرف ان کی نہیں بلکہ ان بے شمار پڑھنے والوں کی عاقبت بھی اس نمبر سے سنور رے گی جنہیں اس کی تحریروں سے روشنی ملے گی۔

حفیظ تائب: بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے جب محمد طفیل کو محمد نقوش کہا تھا تو ان کے پیشِ نظر یقیناً یہ بات ہو گی کہ نقوش ہی محمد طفیل کی روحِ رواں ہے اور ان کی تمام توانائیاں نقوش پر ہی صرف ہوتی ہیں۔ افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، جنگ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر، شوکت تھانوی نمبر، پطرس نمبر، منٹو نمبر، ادب عالیہ نمبر، میر تقی میر نمبر، غرض ہر نمبر اپنی جگہ ایک مستند دستاویز ہے جسے ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا لیکن رسولؐ نمبر شائع کر کے انہوں نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ اس نمبر کی تیاری کے وقت محمد طفیل صاحب کے سامنے یہ بات رہی ہے کہ عہدِ موجود میں رسولؐ کی سیرتِ مبارکہ سے کس کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یُوں تو سیرتِ نبیؐ پر اب تک جو مواد شائع ہو چکا ہے اسے ایک جگہ جمع کر دینا بھی کم اہم کام نہیں ہے لیکن طفیل صاحب کی مہم جو طبیعت نے اس موضوع پر اس قدر عظیم و وقیع اضافے کیے ہیں کہ زبان پر ماشاءاللہ کے الفاظ آجاتے ہیں اور مرتب کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی اکرمؐ کی شخصیت کے زیادہ سے زیادہ پہلو سامنے آجائیں اور پڑھنے والا ان کے زیادہ سے زیادہ احاطے میں کامیاب ہو جائے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خاص مضامین کا ذکر کر دیا جائے۔ پہلی جلد میں سیرت نگاروں کے بارے میں مواد بہت خاص چیز ہے۔ دُوسری جلد میں سیرتِ نبویؐ کے سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھ کر بات کی گئی ہے حقیقتِ توحید و وحی اور مکہ مکرمہ کی قدیم تاریخ پر اتنے تفصیلی مضامین ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس جلد میں سیرت پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی

کتاب محمد رسول اللہ کا ترجمہ بھی شامل ہے تاکہ مربوط حالات سامنے آسکیں۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اس مستند کتاب کے بعض حصے اس لیے حذف کر دیے گئے کہ بعض طبائع کی آزردگی کا اندیشہ تھا۔ تیسری جلد کے اہم حصے اصلاحِ معاشرہ، فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام پر مشتمل ہیں۔ چوتھی جلد علوم انسانی پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر اور اخلاقی ابواب پر مشتمل ہے۔ پانچویں جلد میں عہدِ نبویؐ میں اسلامی ریاست کی نشوونما کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دو بنیادی مقالات ایسے ہیں جن کے بارے میں طفیل صاحب کا اپنا تاثر یہ ہے کہ اگر انھوں نے اور کچھ بھی نہ کیا ہوتا اور صرف یہ دو غیر مطبوعہ مقالے پیش کیے ہوتے تو میرے اطمینان کے لیے کافی تھے۔ یہ مقالے ڈاکٹر نثار احمد اور ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر کے قلم سے ہیں۔ چھٹی جلد فنِ حدیث اور اقوالِ رسولؐ پر ہے جو مولانا محمد متین ہاشمی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ سیرۃ ابنِ ہشام میں ۱۵ وفود کا ذکر ہے جو حضورِ اکرمؐ سے آکر ملے تھے لیکن نقوش کی ایک جلد میں ایسے ۷۰ وفود کا ذکر ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ آٹھویں جلد میں واقعۂ ہجرت کے اسباب و محرکات، سفر کی راہوں اور صعوبتوں تک کا تذکرہ آگیا ہے۔ اردو میں اس سفر کی اس قدر تفصیل کم از کم پہلے کسی جگہ نہیں ملتی۔ اصحابِ صُفّہ میں سے ۹۰ صحابہ کا تذکرہ بھی اس جلد کی اہم چیز ہے۔ فصاحت و بلاغت پر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کا مضمون بھی اس جلد کی ایک خصوصی تحریر ہے۔ نویں جلد آٹھویں جلد کا تکملہ ہے۔ دسویں جلد نعتِ رسولؐ پر ہے۔ جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ ان مختصر گزارشات کا مقصد یہ ہے نقوش کے رسولؐ نمبر میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اس کی طرف اشارہ کیا جائے ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کسی ایک نشست میں اس نمبر کی محض فہرست اور مضمون نگاروں کے نام ہی کر بیان کرنا مشکل ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر: اہلِ علم نے اب تک جو کچھ کہا میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ میرا تعلق ایک سے زائد زبانوں سے رہا اردو کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی میں جو کچھ شائع ہوتا ہے کوشش ضرور کرتا ہوں کہ اسلامی دُنیا سے متعلق ہے تو اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ میں یہ بات پُورے وثوق سے کہہ سکتا ہُوں کہ صرف اردو نہیں بلکہ اسلامی دنیا میں کسی بھی دُوسری زبان میں سیرت کے موضوع پر اس قدر وسیع معلومات کا ذخیرہ کسی ایک جگہ موجود نہیں۔ اس اعتبار سے اردو زبان کو یہ فخر ملا ہے اور اس کا وسیلہ محمد طفیل صاحب ہیں کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اس قدر عمدہ مواد ایک جگہ جمع کیا اور اپنے مجلّے کے لیے ہی نہیں بلکہ اُردو زبان کے لیے ایک باعثِ توقیر کام کیا اور اس زبان کی عزّت بڑھائی۔ اس نمبر میں جو معلومات جمع کی گئی ہیں انہیں دُو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛

اوّل جو مواد پہلے سے اردو میں تھا اسے سامنے رکھ کر مرتّب کروایا، جو مواد دوسری زبانوں میں تھا اسے اردو میں ترجمہ کروایا۔

دوسرے حصّے میں وہ تحریریں آتی ہیں جو مختلف موضوعات پر اب تک سامنے نہیں آئے تھے مختلف اہلِ قلم حضرات سے لکھوائی گئی ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ محمد طفیل صاحب نے سیرتِ نبویؐ کو آج کے انسان تک اس طرح پہنچایا ہے کہ ان دنا

کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ واقعی قرآن کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مسلمانانِ عالم کے لیے ایک نمونہ ہے اس اعتبار سے محمد طفیل صاحب کا یہ کام انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہے۔

سید محمد متین ہاشمی: نقوش کے رسولؐ نمبر کی پہلی جلد سے دسویں جلد تک جو کچھ پیش کیا گیا ہے میں اس کے بارے میں ایک بات خاص طور پر کہنا چاہوں گا کہ اس کام کا اجر محمد طفیل صاحب کو دنیا میں تو مل نہیں سکتا، ہاں آخرت میں ضرور ملے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طور پر کچھ لکھنا پل صراط پر چلنا ہے ذرا سا بھی لغزش کہا جائے تو اسفل السافلین میں شامل ہو۔ سیرت میں غور و فکر میں غلو سے کام لے تو شریعت کی حدود سے نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے ابنِ ہشام سے قاضی عیاض علامولانا جامی یا شاہ ولی اللہ وغیرہم تک اس سلسلے میں بہت احتیاط برتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد طفیل صاحب کی کون سی ادا اللہ تعالیٰ کو پسند آئی کہ انھوں نے اتنا بڑا کام شروع کیا اور پھر خوش اسلوبی سے ختم بھی کر لیا۔ میرا تعلق تحقیقی شعبے سے ہے اور اردو کے علاوہ بھی سیرت سے متعلق کتابیں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ سیرت کے سلسلے میں سب سے مشکل کام اس عظیم شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنا ہے لہٰذا جو بھی کام ہوگا وہ نامکمل ہوگا۔ اس طرح نقوش کا موجودہ نمبر بھی حرفِ آخر نہیں کیونکہ قیامت تک لوگ لکھتے رہیں گے مگر کام مکمل نہ ہوگا البتہ کام کی قدر اس اعتبار سے کی جاتی ہے کہ لکھنے والے یا جمع کرنے والے نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے۔ اس معیار پر نقوش کے رسولؐ نمبر کو واقعی اب تک جو کام ہوا ہے اس کی روشنی میں انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے کیونکہ میں نے خود کسی زبان میں اتنا جامع کام نہیں دیکھا۔ جب بھی میں نے کسی مضمون کی طرف اشارہ کیا کہ فلاں جگہ موجود ہے محمد طفیل صاحب نے کہا: ہاں میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہ نمبر پڑھ کر رُوح خوش ہو جاتی ہے اور دل سے ان کے لیے دُعا نکلتی ہے۔ صرف دو باتیں اور کہوں گا۔ یہ کہا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے نقوش کی دو جلدیں اور باقی ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہونا چاہیے، دو جلدیں کیوں؟ اس کے بعد کیوں نہیں؟ محترم طفیل صاحب! اس کام پر لگے رہیے، جب تک زندگی ہے کرتے رہیے، یہ تو کبھی نہ ختم ہونے والا کام ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی ادارہ ہمت کرے تو اس نمبر کے مضامین کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ اس زبان کو ذکرِ رسولؐ سے مالا مال کر دے گا اور مضامین اتنے مستند اور وقیع ہیں کہ ہم انہیں اعتماد اور اطمینان کے ساتھ پوری دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ضیا شاہد: نقوش کے رسولؐ نمبر کے بارے میں اب تک علماء اور دانشور حضرات نے جو گفتگو کی اس کے بعد مزید کسی گفتگو کی شاید ضرورت نہ ہو تاہم جیسا کہ ابھی ایک دوست نے ذکر کیا کہ سیرت کے ذیل میں اس قدر وقیع کام جو انجام دیا گیا ہے اس کے تذکرے میں حصہ لینا بھی ایک سعادت ہے۔ لہٰذا اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے اس نشست میں گفتگو کے خاتمے اور آپ حضرات کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے دو تین باتیں عرض کروں گا۔

ذاتی طور پر میرا تعلق عربی زبان اور اسلامی علوم سے ایک بے خبر طالب علم کا سا رہا ہے اور میں نے نقوش کے اس خاص نمبر کے جو شمارے جستہ جستہ دیکھے ہیں ان سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایسا مواد جمع کیا گیا ہے یا مرتب

کیا گیا ہے جو سب مکاتب فکر کی نظر میں مسلّمہ ہے۔ میں اس نکتے کو کچھ اس طرح بھی بیان کر سکتا ہوں کہ دینی موضوعات پر کام کرتے وقت یہ مشکل بالعموم پیش آتی ہے کہ صدیاں گزرنے کے باعث تشریح کے ذیل میں مختلف مکاتب فکر پیدا ہو چکے ہیں جن میں سے بعض کا نقطۂ نظر دوسروں سے بہت حد تک مختلف ہو گیا ہے اور اکثر تحریریں خواہ ان میں تحقیق کا مادہ کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو، اس کڑے امتحان میں آکر اپنی افادیت کم کر دیتی ہیں کہ وہ کسی ایک یا دُوسرے مکتبِ فکر کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہوتیں۔ اس تلخ حقیقت کی روشنی میں نقوش کا یہ نمبر اس اعتبار سے گراں قدر ہے کہ اسے پوری قوم کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان موضوعات پر سب کا اجماع ہے اس طرح آج کے انتشار میں جہاں مذہب اور دین کی بھی ایسی ایسی تشریحات پیش کی جاتی ہیں کہ انسان اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ نقوش کی یہ جلدیں پڑھے لکھے طبقوں میں اتحاد و یگانگت کا باعث بنیں گی اور ان کے قدم اجماع کی طرف بڑھیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں سیرت کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ محسوس ہوتا تھا کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کی باتیں برحق لیکن ان کی شخصیت کے بالعموم ان گوشوں کی بات زیادہ ہوتی تھی جن کا تعلق شخصی عقیدت و احترام سے ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آج کے مسائل کے لیے بھی ان کے اقوال و شخصیت سے روشنی مل سکے۔ یہ چیزیں یقیناً موجود تو تھیں مگر اس طرح ایک جگہ واضح طور پر جمع نہیں تھیں۔ محمد طفیل صاحب نے انھیں ایک جگہ پیش کر دیا ہے اور اس طرح دنیا کے مسلمان ممالک میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جو تحریک شروع ہوئی ہے نقوش نے اس تحریک میں فعال ترین کردار ادا کیا ہے کہ دین کی سچی اور بھرپور تصویریں اور تحریریں پیش کی ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا متین ہاشمی صاحب کی یہ تجویز قابلِ غور ہے کہ اس کام کا ترجمہ عربی اور دوسری زبانوں میں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں چونکہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب یہاں موجود ہیں جنھوں نے نسیم حجازی کے دو ناولوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اگر وہ خود یا کوئی بورڈ یا اکیڈیمی بنا کر نقوش کے ان نمبروں کو عربی زبان میں منتقل کروانے کا کام شروع کر سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔

تیسری بات جس کی طرف میں اشارہ کروں گا وہ نقوش کے رسولؐ نمبر کی مختلف جلدوں کا صوری حسن ہے کتابت سے طباعت تک اور اس نمبر کے لائبریری ایڈیشن کے کاغذ اور مضبوط جلد اور سلائی تک ہر کام بہت معیاری ہے اور واقعی اس جذبے اور خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے کہ صدیوں تک لائبریریوں میں محفوظ رہ سکے کیونکہ آفسٹ پیپر جس پر نقوش کا یہ نمبر چھپا ہے بہت مضبوط ہوتا ہے اور بوسیدہ نہیں ہوتا۔ پھر اسلم کمال صاحب کے طغرے، اور جا بجا مقاماتِ مقدسہ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے حوالے سے ان آثار اور مقامات کی تصویریں اس میں شامل کی گئی ہیں جن کی موجودگی کے باعث پڑھنے والے کو دیکھنے کے لئے بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ اور یُوں لگتا ہے وہ دور منتقل ہو کر سامنے آگیا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے وہ ایک طرح سے دیکھا بھی ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں محمد طفیل صاحب کو جو آج کی نشست کے مہمانِ خصوصی بھی ہیں" جنگ" کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اُنھوں نے یہ عظیم کام سرانجام دیا اللہ تعالیٰ انھیں طویل عمر عطا فرمائے تاکہ وہ اس کام کو جاری رکھ سکیں۔

(روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ر جنوری ۱۹۸۴ء)

○

○ محمد طفیل سے گفتگو ——— سوالات : حسن رضوی

حسن رضوی : طفیل صاحب! حال ہی میں نقوش کے معرکۃ الآرا رسولؐ نمبر کی دس جلدیں مکمل طور پر شائع ہوئی ہیں اس نمبر کی اشاعت بلاشبہ ہر اعتبار سے ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ادبی و مذہبی حلقوں میں اس نمبر کی جو پذیرائی ہوئی ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہم آج آپ سے اس خصوصی نمبر کے حوالے سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو آپ یہ فرمائیں کہ نقوش کی ابتدا کب ہوئی؟ یہ کون سا مبارک سال تھا؟

جواب : اجرا ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ ۱۹۵۱ء سے بندۂ عاجز اس کا مدیر ہے۔

سوال : اب تک کتنے خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ موضوع اور سن وار بتائیے تاکہ آپ کی سوچوں کا نہج معلوم ہو۔

جواب : میں نے عام شماروں کو بھی خاص نمبر بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ عام شماروں میں بھی ٹھکانے کی تحقیقات ملیں گی میں پاک و ہند کے تمام لکھنے والوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے خوابوں کو تعبیر بخشی۔ بہر حال خاص نمبروں کے نام عرض کئے دیتا ہوں:

(۱) افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء	(۲) پنج سالہ نمبر ۱۹۵۳ء
(۳) افسانہ نمبر ۱۹۵۴ء	(۴) غزل نمبر ۱۹۵۴ء
(۵) شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء	(۶) منٹو نمبر ۱۹۵۵ء
(۷) افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء	(۸) شخصیات نمبر ۲ ۱۹۵۶ء
(۹) مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء	(۱۰) دس سالہ نمبر ۱۹۵۸ء
(۱۱) طنز و مزاح نمبر ۱۹۵۹ء	(۱۲) پطرس نمبر ۱۹۵۹ء
(۱۳) ادب عالیہ نمبر ۱۹۶۰ء	(۱۴) افسانہ نمبر ۱۹۶۰ء
(۱۵) غزل نمبر ۲ ۱۹۶۰ء	(۱۶) لاہور نمبر ۱۹۶۲ء
(۱۷) شوکت تھانوی نمبر ۱۹۶۳ء	(۱۸) آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء
(۱۹) جنگ نمبر ۱۹۶۶ء	(۲۰) خطوط نمبر ۱۹۶۸ء
(۲۱) افسانہ نمبر ۱۹۶۸ء	(۲۲) غالب نمبر ۱۹۶۹ء
(۲۳) غالب نمبر ۲ ۱۹۶۹ء	(۲۴) غالب نمبر ۳ ۱۹۷۱ء
(۲۵) افسانہ نمبر ۱۹۷۴ء	(۲۶) اقبال نمبر ۱۹۷۷ء
(۲۷) اقبال نمبر ۲ ۱۹۷۷ء	(۲۸) اقبال نمبر ۳ ۱۹۷۷ء
(۲۹) میر نمبر ۱۹۸۰ء	(۳۰) میر نمبر ۲ ۱۹۸۰ء
(۳۱) ادبی معرکے نمبر ۱۹۸۱ء	(۳۲) انیس نمبر ۱۹۸۱ء

(۳۳) عصری ادب نمبر ۱۹۸۲ء (۳۴) رسولؐ نمبر چار جلدیں ۱۹۸۲ء

(۳۵) میر نمبر ۳ ۱۹۸۳ء (۳۶) رسولؐ نمبر چھ جلدیں ۱۹۸۳ء

— یہ ان خاص نمبروں کی فہرست ہے جو میری ادارت میں شائع ہوئے عام شمارے الگ ہیں۔

— خاص نمبروں اور سالناموں کو فہرست میں درج نہیں کیا ان کی تعداد آٹھ ہے۔

— میری ادارت میں نقوش کے ذریعہ جتنے صفحات اہلِ قلم تک پہنچے ان کی تعداد پچاس ہزار سے زائد ہے یعنی ۵۰۵۲۵ صفحات۔

سوال: آپ ادب کے آدمی تھے مذہب کی طرف کیسے نکل گئے؟ کوئی خاص واقعہ محرک بنا؟

جواب: خوب سے خوب ترکی جستجو میری زندگی کا چلن ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ موضوع کا حق ادا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے نمبر سے لے کر آخری نمبر تک آپ یہ محسوس کریں گے کہ ان کا مرتب تازہ دم ہے نڈھال نہیں ہوا۔ اسی سبب سے میں پہلی مہم کے بعد دوسری مہم پر روانہ ہوتا رہا۔ مہم جوئی کی اسی روش نے مجھے دربارِ حبیبؐ تک پہنچایا۔ بے شک اس سفر میں تیرہ برس گزرے اس کے باوجود ہر لمحہ طمانیتِ قلب کا باعث رہا۔ میں راستوں کے پیچ و خم سے ناواقف تھا، یہی وجہ تھی کہ ہر قافلہ سالار سے پوچھا، دربارِ حبیبؐ کتنی دور ہے؟ اب یہ آپ بتائیں کہ میں کتنے فاصلے پر کھڑا ہوں!

سوال: اتنے بڑے منصوبے میں آپ کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؟

جواب: مشکلات بے شک مشکلات ہوتی ہیں آدمی بددل ہو جاتا ہے مگر یہ موضوع سکون آمیز اور روح پرور تھا کہ دشواریاں بھی راحتوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔ ہر مشکل نے یہ سمجھایا فکر نہ کرو، نیکیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ گناہ گار ایسی نیکیوں سے سرشار ہوتا رہا، میری کیفیتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

سوال: رسولؐ نمبر مرتب کرتے ہوئے کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو تو وہ ہمارے قارئین کو بھی بتائیں۔

جواب: دیکھیے جناب میری رسوائی کا سامان نہ کریں مذہب میں بعض مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے، عقل پیچھے رہ جاتی ہے، واقعہ آگے بڑھ جاتا ہے، ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر میں نے رسولؐ نمبر میں کیا ہے۔ مثلاً ایک دن عجیب واقعہ ہوا میں نے دیکھا کئی بزرگ ہستیاں میرے سامنے کھڑی ہیں کمرہ بھر گیا میں کرسیاں ڈھونڈنے لگا، بتایا گیا ڈیوڑھی میں بھی آدمی کھڑے ہیں باہر سڑک پر بھی کھڑے ہیں حدِ نگاہ تک ایسا ہی تھا۔

میں نے پوچھا "میرے لیے حکم؟"

"رسولؐ نمبر دیکھا تھا دعا مانگنے آ گئے ہیں۔"

"کون تھے وہ لوگ؟"

"میں کون ہوں؟"

شاید ایک گواہ۔

سوال : طفیل صاحب ! یہ فرمائیں کہ پہلی چار جلدیں اور بعد کی چھ جلدیں الگ الگ وقفوں سے کیوں چھاپیں ؛ کیا کوئی ترتیب کا مسئلہ تھا یا کوئی اور وجہ ؟

جواب : میرا منصوبہ یہ تھا کہ بارہ برس تک اس نمبر کو مرتب کروں گا بعد کے بارہ برسوں میں اسے چھاپوں گا بہ سال ایک جلد۔ بیچ میں یہ منصوبہ بدلا، سوچا اگر اتنی مہلت نہ ملی تو کیا ہوگا ! بے قراری بڑھنے لگی۔ چنانچہ اپنے سارے وسائل کو نچوڑا تب پہلی چار جلدیں منظرِ عام پر آسکیں (ان وسائل میں اپنی کوئی ڈھائی لاکھ کی مشینیں بیچنا بھی شامل ہے) اسی طرح دوسرے سال چار جلدیں چھاپیں، مرتب ہونے کے باوجود دو جلدیں آخر میں چھاپیں۔ یعنی دس جلدیں ایک طرح سے تین مرحلوں میں چھپیں، غرض اپنے وسائل کے اعتبار سے ایک ان ہونا کام ہوگیا۔ یہ کرشمہ ہے موضوع کا !

سوال : حکومت نے آپ کو انعام سے نوازا، کیا رسولؐ نمبر کی فروخت میں بھی مدد دی ؛

جواب : وزارتِ مذہبی امور ہر سال سیرت کی کتابوں پر انعام دیتی ہے پچھلے برس مجھے بھی دیا حکومت سیرت کے موضوع سے خاص دلچسپی رکھتی ہے جو شخص یا جو ادارہ اچھا کام کرے گا اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگی، وہ زید بھی ہو سکتا ہے وہ بکر بھی ہو سکتا ہے۔

سوال : طفیل صاحب ! کن کن ادیبوں نے آپ کی رسولؐ نمبر کے سلسلے میں مدد کی ؛

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ سارے پاکستان اور سارے ہندوستان کے علما و فضلا نے جس کا ذکر میں نے اپنے ادارتی نوٹ میں کیا ہے ایسا میں نے ہر نمبر کے بارے میں لکھا البتہ یہ ہے کہ ہر شخص ہر موضوع کا پارکھ نہیں ہوتا اس لیے میرے کرم فرماؤں کا حلقہ متنوع اور وسیع ہے جو بڑھ کر اب ساری دنیا پر محیط ہوگیا ہے۔

سوال : یہ موضوع نازک تھا آپ نے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو کیسے مطمئن کیا ؛

جواب : یہ موضوع قطعاً نازک نہیں بشرطیکہ نیت میں ٹیڑھ نہ ہو۔ میں نے پرچہ مرتب کرتے وقت یہ طے کیا تھا کہ کسی بھی فقہی سوچ کے خلاف کچھ نہیں چھاپنا۔ یہی انداز میرا ادب میں رہا پھر یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سب کے رسول ہیں کوئی انھیں صرف اپنی سوچوں کی حد تک محدود کیوں کرے وہ کیوں دوسروں کے جذبات کا احترام نہ کرے !

سوال : آئندہ کے عزائم کے بارے میں کچھ فرمائیں گے ؛

جواب : عزائم تو بہت سے ہیں بات توفیق کی ہے، حالات نے اجازت دی تو دس جلدوں کے بعد مزید تین جلدیں پیش کروں گا ورنہ انھی دس جلدوں کو مزید بہتر بناتا رہوں گا ان میں ہر دم اضافے کرتا رہوں گا تا آنکہ ایسی چیز بن جائے جو سب کے لیے قابلِ فخر ہو میرے لیے، آپ کے لیے، ملک کے لیے۔

سوال : طفیل صاحب ! پہلی چار جلدوں کے بارے میں اہلِ علم نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے ہمیں بھی آگاہ کریں۔

جواب : اس سلسلہ میں آپ اخبارات و رسائل میں بہت کچھ پڑھ چکے ہوں گے کچھ اہلِ علم کی آرا میں پیش کیے دیتا ہوں :

○ شیخ آفتاب حسین (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت) نے لکھا :
"نقوش کا رسولؐ نمبر بلاشبہ قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے ان شاء اللہ یہ نمبر قبولِ دوام کی مسند پر فائز ہوگا۔ آپ نے اس سمت میں نہایت موزوں، بروقت اور صحیح اقدام اٹھایا ہے۔"

○ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا :
"اسے نمبر کیوں کہئے یہ تو اردو زبان کی سیرت طیبہ پر انسائیکلو پیڈیا ہے۔ سبحان اللہ! آپ نے کیا دلکش اور دل آفریں نمبر شائع کیا ہے۔"

○ مولانا نعیم صدیقی نے لکھا :
"علامہ شبلی اور سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کے میدان میں ایک سنگِ میل قائم کیا تھا اب ویسا ہی دوسرا سنگِ میل شاید کچھ زیادہ بڑا اور اونچا آپ نے قائم کیا۔"

○ مولانا سید محمد متین ہاشمی نے لکھا :
"سیرت پاک سے متعلق مواد کا ایک ایسا گلدستہ اور مجموعہ اردو تو کیا، دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملے گا۔ ان جلدوں کو دیکھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔"

○ شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے لکھا :
"نقوش کا رسولؐ نمبر سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم ترین خدمت ہے۔ اس میں جمع کردہ مضامین مستند اور بلند پایہ تحقیقی مضامین ہیں۔"

○ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا :
"رسولؐ نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی، کیا عجب کہ آپ کے لیے عاقبت میں زادِ راہ سفر ہو جائے۔ یہ نمبر ظاہری اور معنوی حیثیت سے بھی راحتِ دل ہے۔"

○ سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا :
"اس مبارک، قیمتی، قابلِ قدر اور تاریخی نمبر کے ذریعہ آپ نے سعادتِ دارین کا اچھا سامان کیا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبولیت بخشے اور آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔"

○ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرمایا :
"رسولؐ نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں، عنایت کے بوجھ سے کچل گیا خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے۔" (آمین)

○ مولانا سید مرتضیٰ حسین نے لکھا :
"محمد طفیل کی عاجزانہ اور منکسرانہ پیشکش کا سلیقہ اور طریقہ ان کی عقیدت و محبت، ان کا عشق اور جذبہ جو

رنگ لایا ہے وُہ ان کے چہرے اور لبوں سے بول رہا ہے۔ یہ سرخروئی مبارک ہو۔"

(روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ جنوری ۱۹۸۴ء)

○

○ نقوش رسولؐ نمبر کی تعارفی تقریب ——— ارشاد احمد عارف

نقوش کا نام اور محمد طفیل کا کام ادبی حلقوں میں ہمیشہ معتبر سمجھا گیا ہے لیکن اب کے محمد طفیل نے "نقوش" کو جو نئی جہت عطا کی ہے اس سے بہت سوں کو حیرت اور مسرت ہوئی ہے۔ نقوش، شعر و ادب کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں ایک معتبر نام تھا لیکن رسولؐ نمبر کے حوالے سے وہ عالمِ اسلام کا مشترکہ اثاثہ کہلانے کا مستحق ہے ہماری اس رائے کو مزید تقویت اس تقریب میں جو پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی، متعدد اہلِ علم کی ان آرا سے ملی جس میں انھوں نے وثوق کے ساتھ بتایا کہ عربی، انگریزی، اردو اور فارسی زبان میں سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر لکھی جانے والی کوئی کتاب نقوش رسولؐ نمبر سے زیادہ وقیع، جامع اور مکمل نہیں۔

۲۸ مارچ کی شام وفاقی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی صدارت میں منعقد ہونے والی اس تقریب کے مہمانِ خصوصی بھارت سے آئے ہوئے ممتاز عالمِ دین اور "برہان" دہلی کے مدیر مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے۔ جناب محمد طفیل بھی تقریب کے دُولھا بنے سٹیج پر بیٹھے تھے۔ معروف ادیب اور ڈرامہ نگار جناب مرزا ادیب نے نقوش کی ادبی خدمات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا اور مکاتیب نمبر سے اقبال نمبر تک ان بیسیوں خصوصی شماروں کا ذکر کیا جو ناقابلِ فراموش بھی ہیں اور زندہ جاوید بھی۔ انھوں نے کہا محمد طفیل نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے لیکن انھوں نے اب جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ان کے لیے باعثِ فخر ہی نہیں ابدی سعادت بھی ہے اور انہوں نے نہایت عجز کے ساتھ یہ ہدیہ اس بارگاہ میں پیش کیا ہے جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی تابِ سخن نہیں رکھتے، نقوش صوری اور معنوی خوبیوں کا مرقع ہے نقوش کی دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن محمد طفیل کی بلند حوصلگی ھل من مزید کا نعرہ لگا رہی ہے اور وہ نئے افق کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ رسولؐ نمبر کی دس جلدیں پھولوں کے دس گلدستوں کی مانند ہیں جن کا حُسن اور مہک دیوانہ بنائے دیتا ہے۔ انہوں نے ہر جلد میں شامل مضامین کا مختصر تعارف پیش کیا۔

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی نے بتایا کہ محمد طفیل نے تین سال پہلے نقوش کے رسولؐ نمبر کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہونے والے کام سے مجھے آگاہ کیا تھا تو مجھے ایک گونہ مسرت اور ایک گونہ حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ طفیل صاحب سلیقے کے آدمی ہیں انہوں نے نقوش کا جو بھی نمبر نکالا یادگار بنا ڈالا۔ وہ رسولؐ نمبر مرتب کریں گے تو یقیناً ایک زمانہ اس سے فیض پائے گا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ ادب کے آدمی، سیرتِ نبویؐ کا پُل صراط کیسے عبور کریں گے۔ آج نقوش کی دس جلدیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نمبر کی ترتیب میں اپنا سارا سلیقہ اور قرینہ نچوڑ کر رکھ دیا ہے انہوں نے یہ نمبر پیش کرکے جیتے جی اپنی بخشش کا سامان کر لیا ہے۔ طفیل صاحب اسے اپنا کارنامہ نہیں سمجھتے وہ نہایت

معجزنے کہتے ہیں۔ اس کا حسنِ ترتیب حسنِ سیرت سے مستعار ہے اور اس کی تکمیل توفیقِ ایزدی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسولؐ نمبر کی جامعیت، معنویت، تنوع، خوبصورتی، میعار، گہرائی اور ثقاہت دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں سیرت پر ہونے والا کوئی کام رسولؐ نمبر سے استفادہ کیے بغیر مستند نہیں کہلا سکے گا۔ انھوں نے کہا ایک ایسے وقت میں جب حکومت کی کئی کمیٹیاں، کونسلیں، اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں سرگرم عمل ہیں نقوش کے رسولؐ نمبر سے استفادہ کیا جانا چاہئے کہ اس میں نظامِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک واضح جھلک موجود ہے۔ انھوں نے مدیرِ نقوش کو اس عظیم پیشکش پر مبارکباد پیش کی۔

علماء اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے نقوش کو ایک انسائیکلو پیڈیا قرار دیا اور کہا کہ مدیر نے ایک جریدے کو انسائیکلو پیڈیا بنا کر نئے لوگوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے انھوں نے نقوش میں شامل کئے گئے مضامین و مقالات کو تحقیقی اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا۔ ماخذ کے اعتبار سے رسولؐ نمبر ایک اہم دستاویز سیرت کے بارے میں یہ اردو کی مفصل کتاب اور موضوع کے لحاظ سے بہترین کوشش اور تخلیقی کام ہے۔ اس میں نظامِ حکومت کے بارے میں بھی واضح مواد موجود ہے۔ اور اگر اس سے استفادہ کیا جائے تو موجودہ دور کے کئی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ذخیرۂ معلومات یکجا ہو گیا ہے جس سے وہ آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں پاکستان اور اہلِ پاکستان کو اس پر فخر کرنا چاہیے کہ سیرت پر جامع ترین کتاب اس دھرتی کے ایک سپوت نے شائع کی ہے۔

اورینٹل کالج کے استاد اور عربی کے ممتاز سکالر جناب ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اپنی تقریر میں کہا ہمارا یہ ایمان ہے کہ علم، معرفت اور ادب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دین ہے۔ آپ کی آمد سے قبل تاریکی تھی آپؐ تشریف لائے تو اجالا ہو گیا، علم پھیلا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ نقوش کا یہ کام بھی ادبی نوعیت کا ہے اور فارسی اور عربی ادب میں ہونے والے کام سے نقوش بازی لے گیا ہے۔ نقوش کو ایک لاثانی مقام ملا ہے ادبیات عالیہ میں اس کا بلند مقام ہے۔

جناب احمد سعید کرمانی وزیر بھی رہے اور سفیر بھی، تحریکِ پاکستان میں انھوں نے قائداعظم کے زیرِ سایہ کام کیا۔ "نقوش" کے رسولؐ نمبر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا: رسولؐ نمبر ایک پاکیزہ دستاویز ہے اس لیے پاکباز لوگوں کو اس پر اظہارِ خیال کا حق پہنچتا ہے لیکن میرے خیال میں طفیل صاحب نے سوچا ہو گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں گناہ گار لوگ بھی ہیں اس لیے انھوں نے مجھے گناہگاروں کی نمائندگی کے لیے منتخب کیا۔

انھوں نے کہا کہ طفیل صاحب نے اسلام کی بروقت خدمت کی ہے۔ دنیائے اسلام اس وقت نئے مسائل سے دوچار ہے جب تک ان کا تسلی بخش حل نہیں نکلتا اور بھی مشکلات پیدا ہوں گی۔ جناب کرمانی نے بتایا کہ میں طفیل صاحب کو شعر و سخن کا آدمی سمجھتا تھا لیکن ان سے مل کر میرے خیالات تبدیل ہوئے اور نقوش پڑھ کر میری زندگی تبدیل ہو گئی اب میں رات گئے جب دنیا محوِ خواب ہوتی ہے اور فضا پرسکون نقوش کا مطالعہ کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت علامہ اقبال نے "محمد" نامی کتاب کے مصنف کا ماتھا چوما تھا اگر علامہ آج زندہ ہوتے تو نقوش کی اشاعت پر محمد طفیل کا ماتھا چومتے اور گلے سے لگا لیتے

کیونکہ محمد طفیل نے جنون کی حد تک کام کیا ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت اور محکمہ تعلیم کی تمام لائبریریوں کو نقوش رسولؐ نمبر کی خریداری کا قانوناً پابند کیا جائے۔

جناب سید اسعد گیلانی، حکمت انقلاب نبویؐ کے مصنف کی حیثیت سے سیرت نگاروں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں انہوں نے رسولؐ نمبر کی تدوین کو موجودہ دور کا کارنامہ قرار دیا اور کہا جو کام اس نمبر کی شکل میں کیا گیا ہے اسے دیر تک آگے نہیں بڑھایا جا سکے گا۔ انھوں نے بتایا کہ رسولؐ نمبر میں ایک ہزار سے زاید موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مدیر نقوش کا یہ کام افراد تو کیا کسی اکیڈمی کے بس کی بات بھی نہیں کوئی ادارہ بھی ان کے اس اعزاز میں برابری نہیں کر سکتا۔ انہوں نے ترتیبِ نو کی ضرورت پر زور دیا اور تجویز پیش کی سیرت کی ایک اٹلس مرتب کی جانی چاہیے جس سے دورِ نبوت کی جغرافیائی، سیاسی، معاشی حیثیت کا ادراک ہو سکے انھوں نے طفیل صاحب سے کہا کہ وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔

دیال سنگھ لائبریری کے ریسرچ سکالر اور معروف عالم دین مولانا محمد متین ہاشمی نے کہا: جس بارگاہ میں قدسیوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں وہاں محمد طفیل یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے عقیدت بھرے کام کی نسبت جس ذات سے ہے اس کے طفیل کام وقعت اختیار کر گیا ہے۔ انھوں نے کہا یہ کام جاری رہنا چاہیے کہ زندگی کا سرمایہ یہی ہے۔

مدیر نقوش محمد طفیل نے حاضرین کو بتایا کہ میں ہزاروں صفحات پر مشتمل رسالہ چھاپتا ہوں مگر اپنی بات ایک صفحہ میں کرتا ہوں آج بھی اپنی اس روش کو نہ چھوڑوں گا اصل میں مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ رسولؐ نمبر میں کہہ چکا ہوں۔ ایک پرانی بات یاد آئی۔ ۲ جولائی ۱۹۷۲ کو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نقوش کے سلسلے میں ایک مذاکرہ ہوا تھا اس میں مجھ سے (۱۲ برس قبل) پوچھا گیا تھا کہ مستقبل میں کیا کچھ کرنے کی ٹھان رکھی ہے؟ میرا جواب یہ تھا کہ اگر قدرت نے مجھے مہلت دی تو میں سیرۃ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایک نمبر پیش کرنا چاہتا ہوں میری خواہش اور کوشش ہوگی کہ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ کے ساتھ ساتھ اگر اردو ادب کے پاس کوئی اثاثہ ہو تو وہ نقوش کا رسولؐ نمبر ہو۔

اب جبکہ وہ نمبر پیش ہو چکا ہے اس کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے آپ نے کہنا ہے مگر جو کچھ میں نے سنا یا پڑھا اس میں اہلِ علم نے بتایا کہ "سیرت نبویؐ پر اس سے جامع اور وقیع دستاویز" دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ میں اس لائق نہ تھا جس لائق بنایا گیا یہ سب کچھ تائیدِ ایزدی سے ہوا انسان کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا اس فکری اور دینی معجزے میں میرے لئے خوشی کا جو پہلو ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سے اس کام کے لیے جسے منتخب کیا وہ محمد طفیل ہے۔

مجھ سے ایک اخبار نویس نے پوچھا تھا اہلِ ملک کے لیے کوئی پیغام؟

میرا جواب یہ تھا: مجھے اپنے اہلِ وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک میں نے زندگی ان کے نام لکھ دی تھی اب وہ میرے لیے دعا کریں کہ مجھے میرا مقصود ملے وہ یہ کہ دربارِ رسالت کی آخری صف میں جو آخری آدمی کھڑا ہو، وہ محمد طفیل ہو!

تقریب کے مہمان خصوصی مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جذباتی انداز میں مدیر نقوش کو خراج تحسین پیش کیا اور بتایا ، بھارت میں رہتے ہوئے ہماری تمنا تھی کہ زندگی میں ایک بار اس شخص کو دیکھنا نصیب ہو (انھوں نے زیارت کا لفظ استعمال کیا) جس نے سیرت کا یہ بے بہا ذخیرہ جمع کرکے اردو زبان وادب کو پوری دنیا میں قابل فخر مقام دیا ہے نہ صرف یہ کہ ہماری یہ تمنا بر آئی بلکہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس تقریب میں شرکت اور اپنے جذبات کے اظہار کا موقع بھی ملا ۔

انھوں نے کہا : انسانی خدمت کے مختلف طریقے ہوتے ہیں لیکن سب سے بڑی خدمت عام انسانیت کی یہ ہے کہ ایسی چیز اس کے سامنے پیش کی جائے جو اس کی زندگی سنوارنے کا کام دے بنی نوع انسان کی اس بڑی خدمت کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اس محسن انسانیتؐ کے اسوۂ حسنہ کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے کیونکہ یہی اسوہ حسنہ تھا جس نے عرب کے بدوؤں کو تاریکی کے متوالوں کو اجالوں کا پیامبر اور پوری دنیا کا رہنما بنا دیا تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات مجسم قرآنؐ ہے اس لیے یہ دراصل اسوہ حسنہ کی تصویر ہی نہیں قرآن پاک کی تفسیر بھی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ یہ دینی خدمت بھی ہے ، اُخروی سعادت بھی ۔

وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل نے اپنے صدارتی خطبے میں نقوش رسولؐ نمبر کی ترتیب و تدوین کو موجودہ دور کا زندہ معجزہ قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لیے کسی تنظیم یا ادارے کی انتھک کوششیں درکار تھیں لیکن محمد طفیل نے اکیلے یہ کام کرکے ہمیں شرمندہ کر دیا ہے اُنھوں نے کہا یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی محبت کی شاندار مثال ہے حیاتِ طیبہ پر اس سے جامع کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ یہ دینی ادب اور اردو ادب میں شاندار اضافہ بھی ہے انھوں نے کہا لوگوں کو اس کام پر حیرت ہے جب کہ مجھے ندامت ہے کہ یہ کام تو ہماری یونیورسٹیوں کو کرنا چاہئے تھا ۔ انھوں نے کہا کہ اسے انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر ہونا چاہئے تھا لیکن اب ایک انڈکس کے ذریعے اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے ۔ اس سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگا ۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام کا اختتام نہیں آغاز ہونا چاہئے اور اسے جاری رہنا چاہئے ۔ انھوں نے احمد سعید کرمانی کے اس مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ نقوش کو سرکاری لائبریریوں کے لیے خریدا جائے ۔ کہا کہ ہماری وزارت یہ کام کرے گی اور میں اس کی ہدایت کروں گا ۔ لیکن میرے خیال میں کوئی بھی لائبریری اس وقت تک لائبریری کہلانے کی مستحق نہیں جب تک رسولؐ نمبر اس میں موجود نہ ہو ۔ انھوں نے کہا کہ نقوش قرار واقعی زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ ہے رسولؐ نمبر کی وجہ سے اُردو زبان کو وسعت ملی ہے ۔ رسولؐ نمبر علم التواریخ میں بھی گرانقدر اضافہ ہے ۔ نوجوان نسل اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے ۔

اس موقع پر گورنمنٹ کالج شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے محمد نقوش کے نام سے محمد طفیل کی شخصیت اور خدمات پر ایک کتاب پیش کی اور نقوش ادبی ایوارڈ کا اعلان کیا گیا ۔

(روزنامہ جنگ لاہور ۳ راپریل ۱۹۸۴ء)

○

○ رسولؐ نمبر کی تعارفی تقریب

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمد طفیل جہدِ مسلسل کا دوسرا نام ہے اور اسی وجہ سے "نقوش" کا ہر شمارہ ایسے نقوش مرتب کرتا ہے جنہیں لازوال حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں نقوش کا رسولؐ نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ لوگوں تک پہنچا ہے اسی سلسلے میں گزشتہ دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے زیرِ اہتمام ایک خصوصی تقریب کی منعقد ہوئی وفاقی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل صدرِ مجلس تھے جبکہ دیوبند کے علامہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مہمانِ خصوصی تھے۔ ممتاز دانشور میرزا ادیب، سید خورشید احمد گیلانی، ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ارشد میر، ڈاکٹر معین الرحمٰن، مولانا متین ہاشمی اور کالعدم جماعت اسلامی لاہور کے صدر سید اسعد گیلانی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے رسولؐ نمبر کے سلسلے میں محمد طفیل کی مخلصانہ اور عاشقانہ کاوشوں کو بہت سراہا اور کہا کہ یہ کام عشقِ رسولؐ کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ وفاقی وزیر ڈاکٹر محمد افضل نے کہا کہ مدیرِ نقوش نے ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ہے اس اہم دستاویز کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں رکھنے کے احکامات جاری کیے جائیں گے۔ علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے کہا کہ یہ وہ کام ہے جو بڑے بڑے اداروں یا یونیورسٹیوں سے برسوں میں مکمل نہیں ہوتا۔ یقیناً "نقوش" کا رسولؐ نمبر سیرتِ نبویؐ کے سلسلے میں ایک سنگِ میل ہے۔

(روزنامہ امروز لاہور ۵ راپریل ۱۹۸۴ء)

○

○ نقوش کا رسولؐ نمبر ——————— رپورٹ : رؤف ظفر

سیرتِ نبویؐ پر ادارہ نقوش نے رسولؐ نمبر کے عنوان سے دس ضخیم جلدیں پیش کی ہیں۔ سیرتِ نبویؐ پر یہ عہدِ حاضر کا عظیم کارنامہ ہے، جس پر مدیرِ نقوش جناب محمد طفیل کو نہ صرف پاکستان بلکہ متعدد اسلامی ممالک کی طرف سے خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے اس عظیم الشان کارنامے کے حوالے سے گزشتہ دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے زیرِ اہتمام ایک تقریب کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر محمد افضل وفاقی وزیرِ تعلیم نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، مولانا سید اسعد گیلانی، مولانا سید محمد متین ہاشمی، سید احمد سعید کرمانی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور میرزا ادیب شامل تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر رسالہ "برہان" دہلی مہمانِ خصوصی تھے۔ مقررین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ دنیا کی کسی زبان میں سیرتِ رسولِ اکرمؐ پر ایک جگہ اتنا کام نہیں ہوا۔ ذیل میں اس تقریب کی روئیداد پیش کی جا رہی ہے۔

ارشد میر

پاکستان رائٹرز گلڈ کی سلور جوبلی کے موقع پر آج اس پاکیزہ نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں پاکستان رائٹرز گلڈ اور ادارہ نقوش کی جانب سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ رسالہ نقوش ایک رسالہ نہیں ایک تحریک ہے۔ محمد طفیل ایک فرد نہیں بلکہ ایک

ادارہ ہیں۔ آج سے پہلے نقوش کے کئی ایک ضخیم رسالے اردو ادب کے حوالے سے شائع ہوئے۔ ان کی ترتیب و تدوین اور محنت پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اس بار محمد طفیل ہمارے سامنے ایک نئے رنگ میں آئے ہیں۔ انھوں نے عرق ریزی اور دیدہ ریزی سے دس جلدوں میں رسول نمبر کی تدوین و ترتیب کی ہے۔ یہ ان کی ایک ناقابلِ فراموش خدمت ہے۔ ایک لحاظ سے انھوں نے آخرت کا سامان کر لیا ہے۔ میں اس تقریب کے مقررین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

میرزا ادیب

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ماہِ نو جب چودھویں کا چاند بن جاتا ہے تو حدِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ادبی مجلّے کا حدِ کمال یہ ہے کہ وہ نقوش بن جائے۔ نقوش اب تک بیسیوں خصوصی نمبر شائع کر چکا ہے۔ بعض نمبر ناقابلِ فراموش ہیں۔ مثلاً آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، افسانہ نمبر، منٹو نمبر، اقبال نمبر اور ایسے کئی نمبر ہمہ گیری کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ لیکن نقوش کے رسول نمبر کی چار جلدیں گزشتہ سال منظرِ عام پر آئی تھیں اب چھ جلدیں مزید سامنے آئی ہیں جس کے ساتھ یہ عظیم کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ میں ان تازہ چھ جلدوں پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک وسیع و عریض باغ میں جا نکلا ہوں، جہاں قدم قدم پر رنگا رنگ پھول کھلے ہیں اور میں ہر پودے پر ایک لمحہ کے لیے نگاہ ڈال کر آگے چل دیتا ہوں۔ پانچویں جلد ۴۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس اہم موضوع پر بحث کرتی ہے کہ عہدِ نبوی میں ریاست کی نشوونما اس انداز سے ہوتی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کن امور کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ حضورؐ کے نظام کے تجزیہ سے پیشتر ہندوستان، چین، عرب اور گردو پیش کے دوسرے ممالک کے سیاسی معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ یہ جاننا نہایت ضروری تھا کہ اس وقت عرب کے قریبی ممالک کی حالت کیا تھی، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کی تاسیس فرمائی۔ ایک فقید المثال باب میں ریاست کے ترکیبی عناصر پر روشنی ڈالی گئی۔ ہر باب نہایت اہم ہے۔ دیگر ابواب بتاتے ہیں کہ زندگی کے کن کن شعبوں میں کس طرح اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے، مکالماتِ رسولؐ، کاتبانِ وحی، عہدِ نبویؐ کے نامور سپہ سالار، رسول اللہؐ کے فیصلے، رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ سیاست اور دیگر اہم موضوعات کو ایک اور جلد میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ۱۵، صفحات کی جلد ہشتم میں خطباتِ رسولؐ کے بارے میں انتہائی قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ حضورؐ کے ان جاں نثار ساتھیوں کا ذکر بھی ہے جو جنگِ بدر میں شہید ہوئے تھے۔ جلد نہم ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا ہر باب دوسری جلدوں کے ابواب کی طرح اہم ہے اور اس میں ان آثار کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق براہِ راست حضور پاکؐ سے ہے۔ مثلاً مدینۃ الرسولؐ، مدینۃ النبیؐ، جنت البقیع وغیرہ۔ جلد دہم ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں نعتیہ ادب کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلا باب مقالات کے لیے وقف ہے جس میں نعتیہ شاعری پر لکھا گیا ہے ان میں غیر ملکی (عربی، اردو، فارسی) زبانوں میں لکھی گئیں نعتیں بھی شامل ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا، نقوش کی ہر جلد اپنے مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اس بات کا مطالبہ

کر رہی ہے کہ اس پر ایک جامع اور وسیع مقالہ لکھا جائے۔ نقوش کے رسول نمبر کی مجموعی جلدوں کے مجموعی صفحات کی تعداد ۹۱۴۱، ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان ایسی مثال پیش کرنے سے یکسر قاصر ہے جو فقط ہماری قومی زبان کو حاصل ہے۔ اس میں سیرت پاک پر سب سے زیادہ، سب سے اہم اور سب سے مفید کام ہوا ہے۔ جس کا کریڈٹ یقیناً جناب محمد طفیل کو جاتا ہے گزشتہ کئی صدیوں میں سیرت پاک پر بہت کام ہوا ہے اور تقریباً ہر پہلو پر لکھا گیا ہے۔ لیکن نقوش کی دس جلدوں میں جتنی معلومات سمیٹ دی گئی ہیں ان کی دستیابی کہیں سے ممکن نہیں ہے۔ یہ مواد جتنا وسیع ہے اتنا ہی قیمتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا تمام نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ نقوش کے مقالہ نگاروں کی یہ ہمت ہے کہ انہوں نے دنیا کے کونے کونے سے مواد حاصل کرکے اسے وسعت نظر سے کام لے کر پیش کیا ہے۔ ان جلدوں میں ہمارے سیکڑوں مقالہ نگاروں نے الگ الگ موضوع پر اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا ہے۔ طفیل صاحب نے حسن ظن کی جو روایات قایم کی ہیں وہ بذاتِ خود ایک تاریخی درجہ رکھتی ہیں۔ نقوش رسولؐ نمبر کی جلد اوّل میں انہوں نے لکھا تھا کہ" اس نمبر کی اشاعت میرے لیے وہ سعادت ہے کہ جس کی طلب ایک عرصہ سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اس نمبر کے لیے بڑی محنت کی ہے اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس قابل ہوا ہوں۔ میں نے آج تک جتنے نمبر پیش کیے ہیں سب فخریہ انداز میں پیش کیے، مگر یہ نمبر نہایت عاجزی کے ساتھ پیش کرتا ہوں"۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ طفیل صاحب کی دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ وہ جتنا شاندار کارنامہ پیش کرنے کا خواب دیکھتے تھے اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان کام انہوں نے انجام دیا ہے۔ ان کا یہ ناقابل فراموش کارنامہ ایک تاریخ بن گیا ہے۔ یہ دور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں اور جس میں ہمارے ساتھ طفیل صاحب بھی ہیں، اس لحاظ سے یاد رکھا جائے گا کہ نقوش کا رسولؐ نمبر عالمِ اسلام کے علم وادب کے افق پر ایک ستارہ بن کر چمکا۔

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

لگ بھگ تین سال پہلے کی بات ہے جناب طفیل محمد صاحب میرے ہاں تشریف لائے اور فائل کھول کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ میں نقوش کا رسولؐ نمبر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اس صدی کا عظیم اور تاریخی نمبر ہوگا۔ یہ سُن کر مجھے یک گونہ حیرت اور مسرت ہوئی۔ مسرت! اس لیے کہ طفیل صاحب سلیقے اور قرینے کے آدمی ہیں۔ نقوش کا جو نمبر نکالا یادگار بنا ڈالا۔ نقوش کا اگر رسولؐ نمبر پیش کیا تو اس سے ایک زمانہ فیض پائے گا۔ حیرت اس بات پر کہ ایڈیٹر نقوش ایک ادبی شخصیت' اور نقوش ایک ادبی مجلہ، سیرت نبویؐ کا نازک پُل صراط کیسے عبور کریں گے! آپ سے پتا چلا کہ آج سے کئی برس پہلے اس پر خاموشی سے کام شروع کر رکھا ہے اور قریب قریب دس ضخیم جلدیں پیش کرنے کا ارادہ ہے اور آج وہ تاریخی کام سب کے سامنے ہے۔ اس دن کے مقابلے میں آج مسرت زیادہ ہے۔ طفیل صاحب نے اپنا سارا سلیقہ اور قرینہ نچوڑ کر اس رسولؐ نمبر میں سمو دیا ہے۔ پہلے دن کی طرح حیرت آج بھی فزوں تر ہے کہ غالب نمبر، لاہور نمبر، میر نمبر، انیس نمبر پیش کرتے ہوئے طفیل صاحب نے رسولؐ نمبر کی کتنی حسین اور پیاری سوغات عشق ومحبت کے متوالوں کے حوالے کی ہے البتہ ہم سب کے لیے

حیرت اور مسرت کے ساتھ ساتھ ایک اور کیفیت کا اضافہ کر دیا گیا ہے جسے رشک کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ نمبر پیش کر کے جیتے جی اپنی بخشش کا حتمی سامان کر لیا ہے۔ سُن رکھا ہے کہ جنّت کے آٹھ دروازے ہیں طفیل صاحب رسولؐ نمبر کی ایک ایک جلد ہاتھ میں لے کر جنّت کے ایک ایک دروازے سے داخل ہونے کے حقدار نظر آتے ہیں۔ طفیل صاحب! ہم آپ کو اس سرفرازی اور سرخروئی پر تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ رسولؐ نمبر کی ترتیب کے دوران اور بعد میں بھی طفیل صاحب سے کہا گیا کہ آپ نے موضوع کا حق ادا کر دیا تو انہوں نے سراپا انکسار بن کر جواب دیا کہ اس کا حسنِ ترتیب حسنِ سیرت سے مستعار ہے۔ نقوش کو بارگاہِ رسالت مآبؐ سے اس درجہ فیض ہے کہ اب نقوش پڑھا نہیں جائے گا بلکہ اس کی تلاوت کی جائے گی لیکن اگر سراپا یہ زیبائی و رعنائی کا تذکرہ حسن نہ ہو تو کیا ہو۔ قلم اس کی عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرے تو کس کی عقیدت کا دم بھرے! یہی وہ جذبۂ صادق اور ارادۂ خالص تھا جو طفیل صاحب کو اس کوچے میں لے گیا اور وہ شیفتگی، شہرت، نیک نامی اور محبت کی خیرات سے اپنا کشکول بھر کر باہر لائے۔ جب گئے تھے تو ہاتھ میں کاغذ کے چند پُرزے تھے، آئے تو دامن میں رسولؐ نمبر کی دس جلدیں تھیں ۱۹۰۲ء میں کتابت شروع ہوئی اور ۱۹۸۲ء میں طباعت کا آغاز ہوا۔ اور یہ دس سال عمر بھر کا سرمایہ بن گئے۔ نقوش کے ہر نمبر کے عنوانات اگر مرتب کیے جائیں تو یہ پوری ایک کتاب بن جاتی ہے۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہے اور طفیل کا دعویٰ بھی نہیں یہ کام سیرت پر حرفِ آخر ہے۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مستقبل میں سیرتِ رسولؐ پر ہونے والا کوئی کام، نقوش کے سیرت نمبر کے حوالے کے بغیر مستند اور مکمل نہیں کہلا سکے گا۔ جب میں رسولؐ نمبر کی جامعیت، خوب صورتی، معیار، گہرائی، ثقاہت اور معنویت پر نظر ڈالتا ہوں تو ذہن سرورِ کائناتؐ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس عظیم ہستی کا کاغذی پیرہن اتنا دیدہ زیب ہو اس کی اپنی شخصیت کس درجہ دلنواز، جامع، خوبصورت، معیاری، گہری اور لاجواب ہوگی۔ اس وقت ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا چرچا عام ہے۔ اگر یہ ادارے محض گزرِ اوقات کے لیے نہیں تو ان کی بجائے نقوش کا رسولؐ نمبر حکومت کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو ایک اسلامی حکومت کا ناک نقشہ دکھانے کے لیے کافی ہے۔ اس میں اسلامی انقلاب کا تذکرہ ہے، دستورِ عمل بھی درج ہے اور نظامِ مصطفیٰؐ کا جائزہ موجود ہے۔ زمانہ اور اس کے تمام تجربات تسلیم کر چکے ہیں کہ انقلابِ محمدیؐ ان سب سے زیادہ جامع، موثر، طاقتور اور مکمل انقلاب تھا جس نے ظلم کا خاتمہ کر کے میزانِ عدل قائم کیا اور اخوت و مساوات کا نمونہ پیش کیا۔ مطلق العنانی کی حوصلہ شکنی کی، رنگ نسل زبان اور وطن کے جھمیلوں سے آزاد کر کے بین الاقوامیت اور آفاقیت سے آشنا کیا۔ پاکستان کا موجودہ معاشرہ زمانۂ جاہلیت کی عرب سوسائٹی سے زیادہ خراب نہیں کہ یہاں نظامِ مصطفیٰؐ اپنے پورے حیات بخش ثمرات ارضی و سماوی برکات کے ساتھ برپا نہ ہو سکے۔ اس مثالی نظامِ حیات کی جھلکیاں نقوش کے رسولؐ نمبر میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ جذبۂ خلوص، طلبِ صادق، لگن، محنت، عزمِ مصمم، دلسوزی، یقینِ محکم، حسنِ ذوق اور عقیدت دس معنوی کیفیات نقوش کے رسولؐ نمبر کی دس جلدیں بنتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

طفیل صاحب نقوش کو پرچہ کہتے ہیں جبکہ میں اسے ایک انسائیکلو پیڈیا کہتا ہوں۔ طفیل صاحب نے نقوش کو

پرچے کے انسائیکلوپیڈیا بنا کر پرچہ نکالنے والوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ جہاں تک نقوش رسولؐ نمبر کا تعلق ہے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک نہایت کامیاب کوشش ہے اس میں تنوع، وسعت، جامعیت بدرجہ کمال ہے۔ اس میں سیرتِ رسولؐ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ اس کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت مختلف مکاتب فکر کا حسین امتزاج ہے۔ رسولؐ نمبر میں وسعتِ تدبر اور وسعتِ فکری سے مختلف مکاتب فکر کے افکار و نظریات کو اپنے دامن میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے یہ راہ نکالی ہے کہ اختلاف میں اتحاد کی صورت کیسے پیدا ہوتی ہے جہاں تک رسولؐ نمبر کے نام کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں اس میں بھی طفیل صاحب نے ایک انفرادیت پیدا کی ہے۔ حیاتِ طیبہ کے جملہ تمام پہلوؤں پر یہ نمبر محیط ہے۔ اس نمبر کی اشاعت سے تحقیق و ریسرچ کے ضمن میں ضرورت پڑنے والے مواد کی کمی پوری ہو گئی ہے۔ موضوعات میں تنوع نے آئندہ محققین کے لیے نئے مضامین اور عنوانات فراہم کر دیے ہیں اردو زبان کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس میں سیرت پر جامع ترین، وسیع ترین کتاب موجود ہے۔ پاکستان کو بھی اس بات پر فخر ہے کہ اس دھرتی سے دنیا کی جامع ترین سیرت پر کتاب دنیا کے سامنے آئی ہے۔ رسولؐ نمبر کے مختلف ابواب اور عنوانات کو جب دیکھا جائے تو سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ طیبہ کے جملہ پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں، جس کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنی 'انفرادی' سیاسی اور اجتماعی زندگی کو کیسے اسلوب میں ڈھالیں کہ جسے اُسوۂ حسنہ قرار دیا جائے۔ رسولؐ نمبر کے مختلف ابواب میں ایسی باتوں کو پوری طرح تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو نظامِ زندگی سے بحث کرتی ہیں۔ سیرت نگاروں نے حضور صلعم کے رہن سہن کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

میں وقت کی مناسبت سے صرف دو باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا جن کا تعلق طفیل صاحب کے اس عظیم کارنامے کے دفاع سے ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بعض دوستوں کے اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہوں کہ طفیل صاحب اور ان کے رسالے نقوش نے ادب کی خدمات انجام دیں اور یکایک اس راستے کو چھوڑ کر سیرت رسولؐ اللہ کو اپنے اس رسالے میں سجانے کے لیے تیار ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقوش رسولؐ نمبر شائع کر کے حقیقی معنوں میں ادب کی دنیا میں نہایت اونچے اور بلند مقام پر پہنچ گیا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ دنیائے انسانیت میں علم اور معرفت اور ادب، سرورِ کائناتؐ کے طفیل سے آیا آپؐ کے آنے سے پہلے تاریکی ہی تاریکی تھی آپؐ کے آنے کے بعد اُجالے ہوتے چلے گئے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے سیرتِ پاک کا فارسی، عربی اور اردو ادب میں نہایت بلند مقام ہے۔ اس لحاظ سے طفیل صاحب کی ہر کوشش ان کے رسالے کو ادب کی دنیا میں غیر فانی مقام عطا کرتی ہے۔

احمد سعید کرمانی

سچ پُوچھیے تو طفیل صاحب نے اسلام کی بروقت خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے اس وقت دنیائے اسلام میں

عجیب قسم کے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جب تک ہم ان کا حل نہ پیش کریں خطرہ ہے کہ ہم مزید کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں ایک دن ہمت کر کے طفیل صاحب کے پاس پہنچا اور غالباً پہلی بار دیکھا ان کے بارے میں رائے تھی کہ وہ شعر و ادب کی محفل کے عادی ہیں لیکن جب چند لمحات کے لیے بیٹھا تو اپنے خیالات کو یکسر بدلنے پر مجبور ہو گیا مجھے محسوس ہوا کہ میں جس شخص کے قریب بیٹھا ہوں وہ رسول پاکؐ کے عشق میں سرشار ہے اس کا باطن پاک و صاف ہے اگر آج علامہ اقبال زندہ ہوتے تو ان کا ماتھا چومتے۔ اور سید سلیمان ندوی زندہ ہوتے تو وہ بھی ان کے ہاتھ چومتے۔ جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ہر پہلو کو اُجاگر کرتا ہو اس کا یہ مقام کیوں نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ طفیل صاحب نے جنون کی حد تک محنت کی ہے اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو بھی یکجا کر دیا ہے ترتیب دینا اور انتخاب کرنا بھی ایک فن ہے طفیل صاحب نے جنون کے سہارے پر بغیر کوئی ڈگری حاصل کیے وہ کام کر دکھایا ہے جو یورپ میں اعلیٰ ڈگریوں والے کرتے ہیں دراصل طفیل صاحب کا ارادہ ہے (اور خدا کرے وہ کامیاب ہوں) کہ وہ چھ جلدیں اور مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ دُنیا میں اردو جاننے والے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے انہوں نے حضورؐ کی زندگی کے ہر پہلو کو نہایت خوبی کے ساتھ اردو داں لوگوں کے لیے پیش کیا ہے اور اگر یہ رائے تسلیم کر لی جائے کہ اردو داں مسلمانوں کی تعداد عربی جاننے والوں سے زیادہ ہے تو پھر یہ ایک ایسی سعادت ہے کہ جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے بلاشبہ اس سے پہلے بھی سیرت پر کتب لکھی گئیں لیکن طفیل صاحب نے تمام پھولوں کو یکجا کر کے قوم کے سامنے ایک ایسا خوشنما گلدستہ پیش کر دیا ہے کہ اس کو بار بار دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔

میں اپنی مختصر تقریر کو اس کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اے اللہ! طفیل صاحب کو اتنی ہمت دے، اتنی مہلت دے، اتنی صحت دے، اتنا جنون دے کہ باقی چھ جلدیں بھی مکمل کر دیں۔ قوم طفیل صاحب کی مشکور رہے اور آنے والی نسل آپ کو عقیدت اور محبت سے یاد کرے گی، آپ کا یہ احسان کوئی چھوٹا نہیں آپ نے وہ کر دکھایا ہے جو بڑوں سے نہ ہو سکا۔

مولانا سید اسعد گیلانی

مجھے اس سیرت نمبر کے ساتھ ایک طویل مدت تک قربت اور ذہنی مطابقت حاصل رہی ہے اور میں نے بڑی حیرت کے ساتھ اس سارے کارنامے کو دیکھا ہے نصف صدی کے بعد اب کہیں جا کر سیرت کا بحر اوقیانوس ہمارے سامنے آیا ہے اور یہ طفیل صاحب کی اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری اور عشقِ رسولؐ کا نتیجہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس فخر سے سرفراز فرمایا ہے یہ سیرت کی جلدیں ۶ ہزار ۹ سو ۶ صفحات مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے آئی ہیں اس سے پہلے سیرت کا اتنا مسلسل اور ضخیم مجموعہ ہمارے سامنے کوئی نہیں ہے اس میں ایک ہزار چھ سو ستاسی چھوٹے بڑے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اس طرح سے یہ اردو ادب میں سیرت کا ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا بڑا کام ہمارے اردو ادب میں موجود نہیں ہے یہ ان کا وہ امتیاز ہے جو ان کو حاصل ہے۔ طفیل صاحب ایک طویل مدت سے بہتر کام کرنے والی شخصیتوں کو اُجاگر کرتے چلے آئے ہیں۔ ہر بار ان کی نظر اونچی ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ان کی نظر اس پاک ہستی تک

جا پہنچی جسے عالمِ انسانیت میں سب سے اونچا مقام حاصل ہے اس کے بعد اور کوئی اونچا مقام نہیں یہ وہ توفیق ہے جو کسی بڑے ادیب کو مل سکتی ہے۔ اگر مزید چھ جلدیں شامل ہو جاتی ہیں تو اس کے بعد ایک بورڈ بیٹھے جو ان تمام موضوعات کا انتخاب کرے اور ان کی کتابی اور تاریخی نوعیت بنائے۔ اس کے بعد اس کی نوعیت ایسی ہو جائے گی کہ سیرت میں کام کرنے والے لوگ اس کام سے آئندہ صدی تک استفادہ کرتے رہیں گے۔ اس کا ایک ایسا انڈکس بنانے کی ضرورت ہے جو سیرت کا کام کرنے والوں کے لیے جلد کی صورت میں رہنمائی کا کام دے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ قوم کے نوجوان اور نونہال اس سیرت پاک سے استفادہ کریں گے اور بالآخر اس مقام پر پہنچ جائیں گے جس مقام پر ایک مسلمان کی زندگی کو ہونا چاہیے۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی

طفیل صاحب کا نقوش سیرت رسولؐ نمبر ایک بہت بڑا کارنامہ ہے میں بھی شریکِ مشورہ رہا ہوں۔ میں نے طفیل صاحب سے ایک بات کہی اور وہ یہ کہ میری صرف یہ دعا ہے کہ زندگی کے آخری لمحے تک آپ اس بحرِ ذخار میں غوطہ زن رہے کرنے کا جو کام ہے وہ میں نے کہہ دیا ہے دس جلدیں نہیں، پندرہ جلدیں نہیں، بیس جلدیں نہیں، اپنے کام کو حضور صلعم کے نام پر وقف کر دو جتنا لکھوا سکو لکھواؤ میں آپ سے پوری ذمہ داری سے یہ عرض کرتا ہوں کہ صرف اردو زبان میں ہی نہیں جیسا کہ یہاں کہا گیا ہے بلکہ اردو، انگریزی، عربی، فارسی کسی زبان میں اتنا بڑا مجموعہ نہیں لکھا گیا۔

آپ دعا کریں صرف اس بات کی کہ طفیل صاحب کی اس خدمت کو اللہ تعالیٰ مدینے والے کی بارگاہ میں قبول کرلے اور اس خدمت کے طفیل ہمیں بھی آقائے نامدارؐ کی شفاعت بخشے۔

محمد طفیل

میں ہزاروں صفحات پر مشتمل رسالہ چھاپتا ہوں، مگر اپنی بات ایک صفحہ میں کرتا ہوں۔ آج بھی اپنی اس روش کو نہ چھوڑوں گا اصل میں مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ رسولؐ نمبر کے اداریے میں کہہ چکا ہوں جو جولائی ۱۹۷۲ء کو لاہور ریڈیو سٹیشن سے نقوش کے سلسلے میں ایک مذاکرہ ہوا تھا اس میں مجھ سے ۱۲ برس پہلے پوچھا گیا تھا کہ مستقبل میں کیا کچھ کرنے کے ارادے ہیں میرا جواب یہ تھا کہ اگر قدرت نے مہلت دی تو میں سیرتِ رسولؐ پر ایک نمبر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش اور کوشش ہوگی کہ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ کے ساتھ ساتھ اگر کوئی طویل مدت کے بعد کوئی ایسا اضافہ ہو تو یہ نقوش کا رسولؐ نمبر ہو۔ اب جبکہ وہ نمبر پیش ہو چکا ہے اس کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے آپ نے کہنا ہے۔ میں نے جو کچھ پڑھا یا سنا اس میں اہلِ علم نے بتایا کہ سیرتِ نبویؐ پر اس سے زیادہ ضخیم دستاویز دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ میں اس لائق نہ تھا اس لائق بنایا گیا۔ انسان کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا یہ سب کچھ تائیدِ ایزدی ہے۔ اس فکری معجزے میں میرے لیے خوشی کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں سے اس کام کے لیے جسے منتخب کیا وہ میں ہوں۔ مجھ سے ایک اخبار نویس نے پوچھا تھا:

"اہلِ ملک کے لیے کوئی پیغام ؟" میرا جواب یہ تھا کہ مجھے اہلِ وطن سے یہ کہنا ہے کہ ابتداً سے لے کر اب تک میں نے اپنی زندگی ان کے نام لکھ دی ہے اب وہ میرے لیے دعا کریں مجھے میرا مقصود ملے اور یہ کہ دربارِ رسالت کی آخری صف میں جو آخری آدمی کھڑا ہو وہ محمد طفیل ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

آپ کو معلوم ہے کہ انسان کی خدمت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں کہ لوگ مختلف قسم کے فلاحی کام کرتے ہیں لیکن سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ چیز لوگوں کے سامنے پیش کی جائے جس سے کہ وہ شرفِ انسانیت کے اعلیٰ معیار تک پہنچ سکیں وہ ظاہری اعتبار سے بھی اور باطنی اعتبار سے بھی، دینی اعتبار سے بھی اور دنیاوی اعتبار سے بھی، اس عالمِ فانی کے اندر بھی اور عالمِ بالا میں بھی، وہ عزت وشرف کے اس کمال کو حاصل کر سکے جو ایک انسان کا مبنیٰ مقصود ہے اس خدمت کے لیے سب سے بڑا ذریعہ وہ کتاب ہے جس نے اس دنیا کو ایک انقلاب سے روشناس کرایا۔ اس اعتبار سے نوعِ انسانی کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن کو پیش کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن وسیرت میں فرق کیا ہے؟ قرآن ایک کتاب ہے جب کہ مجسمہ قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے۔ قرآن درحقیقت سدا بہار پھول ہے جس سے ساری دنیا معطر ہو سکتی ہے اور حضور کی ذات مبارک اس کی خوشبو ہے۔ اس خوشبو کو پھیلانے کے لیے نسیم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جس طرح سے ہمارے سیرت نگار اس خوشبو کو پھیلانے کے لیے اس ثواب کے اندر شریک ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی اس ثواب میں شریک ہیں جو اسے شائع کرتے ہیں اور لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے طفیل صاحب نے ایک بہت بڑی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے فقط مسلمانوں کی نہیں، اسلام کی نہیں، کسی فرقے کی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت ہے کہ اس کی اُمت دنیا میں سربلند نظر آئے۔ اسلام بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلمان اس دنیا میں باعزت اور باوقار زندگی گزاریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو بے پناہ وسائل سے نوازا ہے۔ جہاں ان چیزوں میں خدا کا فضل ہے وہاں کتابت وطباعت کے معاملے میں ہمارے ہاں معیاری کتابوں کی اشاعت ہو اور ہیئت، کتابت، طباعت اس قدر اعلیٰ ہو کہ ہم یہ کہہ سکیں یہ ہمارا معیار ہے اور اس بنا پر ہم اپنے آپ کو کسی دوسرے سے کمتر نہ سمجھیں۔

ڈاکٹر محمد افضل

اس وقت تک رسول نمبر کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے میرے خیال میں اس میں کوئی گرانقدر اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے میری بھی حیرت واستعجاب کی ملی جلی کیفیت تھی کہ ایک شخص اتنا بڑا کام کیسے سرانجام دے سکتا ہے۔ یقین جانیے کہ جتنا عرصہ یہاں بیٹھا رہا ہوں میرا سر ندامت سے جھکا رہا کہ جو کام بڑے بڑے اداروں نے کرنا تھا اور یونیورسٹی نے انجام دینا تھا وہ محض ایک شخص کی ہمت سے سرانجام پا گیا۔ یہ یقیناً طفیل صاحب کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے کہ اتنا بڑا کام بغیر کسی ادارے کی مدد سے انجام پا گیا۔ مولانا اکبر آبادی صاحب نے بہت خوب فرمایا ہے کہ "یہ کام اختتام پذیر نہیں ہے بلکہ کام اب شروع ہوا ہے اور اسے تاحیات جاری رکھا جائے۔" میرے ذہن میں یہ تھا کہ طفیل صاحب سے عرض کروں گا کہ اگر اس کا کبھی دوسرا ایڈیشن نکلے اور ان شاء اللہ جلد نکلے گا تو اس کو ایک انسائیکلو پیڈیا کی شکل دے دی جائے۔ لیکن جیسا کہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اگر اس کا ایک پرمعنی عمدہ اور اچھی قسم کا انڈکس تیار کیا جائے تو وہ بھی اتنا ہی کارآمد ہوگا، اس طرح انڈکس کے ذریعے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا۔

یہ کہا گیا تھا کہ یہ کتاب ہر لائبریری میں ہونی چاہئے۔ میرا یہ خیال ہے کہ کوئی لائبریری 'لائبریری' کہلانے کی مستحق ہی نہیں جس میں یہ کتاب نہ ہو۔ چنانچہ میں اپنی وزارت کی سطح پر یہ کوشش کر رہا ہوں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ ہم حکماً تو ایسا نہیں کر سکتے تاہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کو خرید کر لائبریریوں اور یونیورسٹیوں میں بھیجا جائے۔ لیکن لائبریری میں ایک کتاب کا ہونا کافی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب میں سے دو تین سو کتابیں مختلف موضوعات پر نکال کر بچوں تک پہنچائی جائیں۔ مجھے پوری طرح سے امید ہے کہ یہ کام ضرور ہوگا اور ہمارے پبلشر اس کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں گے۔

یہ جامع اور فکر انگیز پیش کش مدیر نقوش اور ان کے معاونین کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے لیے جتنا شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ یہ رسولؐ نمبر اردو ادب میں بھی گراں قدر اضافہ ہے۔ اور یہ ادب یقیناً زندگی آمیز اور زندگی آموز ہے۔ اس رسولؐ نمبر کی وجہ سے اردو زبان کو ایک وسعت عطا ہوئی ہے، اردو زبان کی کم مائیگی ختم ہوئی ہے، اس رسولؐ نمبر نے اردو زبان کو اتنی وسعت عطا کی ہے کہ اب ہر شخص دین کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ رسولؐ نمبر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ علم التواریخ میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ یہ علم ابھی تک ہمارے یہاں نہیں آیا۔ اس علم کا طرز تحریر، ببلیوگرافی، مواد جمع کرنے کا طریقہ، ہمارے طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

طفیل صاحب کی شخصیت ہم سے مخفی نہیں ہے جو شخص اکیلا اس کام کو انجام دے سکتا ہے وہ بہت ہی بلند و بالا شخصیت کا مالک ہے۔ ان کی استقامت کی ہر ایک نے تعریف کی ہے۔ میں جناب طفیل صاحب کو اس عظیم پیشکش پر تہ دل سے خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کام کو جاری رکھیں اور ہمارے لیے نئی چیزیں پیدا کرتے رہیں۔ ایک اور چیز ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اب جبکہ وہ اپنے راستے سے ہٹ کر ایک دوسری چیز کی طرف آگئے ہیں اور علمی کام کو انھوں نے تھوڑا سا ایک طرف رکھ دیا ہے میری طرف سے یہ درخواست ہے کہ وہ یہ کام ضرور کریں لیکن علم و ادب کو بھی نہ بھولیں پچھلے وقتوں میں بہت سے اچھے رسالے نکلتے تھے، ہر مہینے بہت اچھی چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ ہمیں "نقوش" سے بھی یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اس کام کے ساتھ ساتھ ہمیں ہر ماہ ایسی چیزیں بھی دے جس سے علم و فن کو فروغ حاصل ہو۔ مجھے امید ہے کہ طفیل صاحب اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے کیونکہ ہمیں پڑھنے کے لیے کچھ نہیں ملتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ہمیں پڑھنے کو کچھ نہیں ملے گا تو ہمارے طالب علموں کو سوچنے کا موقع نہیں ملے گا۔

(روزنامہ مشرق لاہور ۵ جولائی ۱۹۸۴ء)

○

○ لاثانی شخصیت کو لاثانی انداز میں پیش کیا

ہمارے کرم فرما جناب چودھری محمد طفیل صاحب نے جو اب زیادہ تر محمد نقوش کے نام سے جانے جاتے ہیں جب بھی موضوع پر نقوش کا خاص نمبر نکالا اس کے باب میں ایک لائبریری سے بے نیاز کر دیا، وہ افسانہ نمبر ہو، مکتوبات نمبر ہو، غزل نمبر ہو، پطرس بخاری نمبر ہو خواہ شوکت تھانوی نمبر، یہی حال ادبی معرکوں والے شمارۂ خاص کا ہے۔ "آپ بیتی نمبر" اپنے انداز کا انوکھا تجربہ تھا۔ ہر فرد فہرست اپنی داستانِ حیات خود سنا رہا تھا۔ مسلمانانِ پاک و ہند کے اکابر علم و ادب میں ان کے پیغمبر حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر شامل ہوتے۔ حضور رسالتمآبؐ تو ہر شخص سے زیادہ اہلِ اُمّت کے دلنشین تھے اور ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کی شان ہی اور ہے۔ چنانچہ اس لاثانی شان کو لاثانی انداز میں پیش کرنے کے لیے طفیل صاحب کو لاثانی کوشش کرنی پڑی۔

اُردو ادب میں سیرتِ نبویؐ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ چھوٹی بڑی درجنوں کتب موجود ہیں۔ عربی سے ترجمہ ہونے والی کتبِ سیرت کی تعداد بھی قابلِ لحاظ ہے، بعض انگریزی کتب بھی ترجمہ ہوئیں۔ اس ضمن میں جدید ترین مثال ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب ہے جو انگریزی سے ترجمہ ہو کر پہلی بار نقوش کے رسول نمبر میں شامل و شائع ہوئی۔ اردو ادب کو حضرت شبلی اور سید سلیمان ندوی کی مرتب کردہ سیرۃ النبیؐ پر فخر ہے۔ ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ خود عربی زبان میں بھی جس میں کہ قرآن کریم نازل ہوا اردو زبان میں تصنیف پانے والی "سیرت النبیؐ" جیسی مربوط و مضبوط کوئی کتاب نہیں۔ یہاں میں حدیث کی باتیں نہیں کر رہا، اس لئے کہ حدیث کا مسئلہ بالکل جدا ہے اور اس میں اہلِ عرب نے اور ان اہلِ عجم نے بھی جنہوں نے عربی میں لکھا کمال کر دکھایا۔ اس شمارے میں ان جملہ کاوشوں پر بحث موجود ہے ——— سیدھی سی بات ہے کہ حدیث نبویؐ کی حیثیت سیرت سے پیشتر فقہی ہے اس لیے جس قدر احتیاط حدیث کے ضمن میں لازم ہے وہ عیاں ہے۔ یہی باعث ہے کہ اسماء الرجال کا ایک شعبہ کھل گیا۔ اس شعبے نے مختصر شخصیت نگاری کے فن کا عربی زبان میں آغاز کیا۔ اس سے علمِ تاریخ کو بے بہا مدد ملی۔ اسماء الرجال اور تاریخ و سیرت مسلمانوں کا خاص موضوع ہے ——— حدیث شریف کی بدولت اصحاب، تابعین، اتباعِ تابعین اور رواۃِ مابعد اور اسی طرح رواۃ الرواۃ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ لاکھوں افراد کا ذکر و کردار محفوظ ہو گیا۔

طفیل صاحب نے بڑی کاوش سے مقالے جمع کیے، ایک مقالہ جو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور جو جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا مصنفہ ہے حضورِ اکرمؐ کے قرآن کریم میں آمدہ ذکر پر مشتمل ہے سُوَرِ قرآنی کی ترتیب کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے بڑی عقیدت اور محنت و کاوش کے ساتھ "آں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است" کی حقیقت کا مفہوم واضح کیا ہے۔ اسی طرح وہ مقالہ جس میں حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے قرآن کی روشنی میں سیرۃِ نبویؐ پر روشنی ڈالی ہے اُمتِ مسلمہ کے حضور میں ایک بیش بہا تحفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی کاوش مولانا قاری محمد عبد اللہ سلیم صاحب نے فرمائی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے پندرھویں صدی میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی تبلیغ کے لیے اور اُمت کی تقویت کے لیے دس نکات پیش فرمائے ہیں ——— حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے سیرت نگاری میں عمومی رجحانات پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی صاحب نے قرآن کریم کے آئینہ میں حضورؐ سیدالانامؐ کی جس طرح زیارت کی اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ سید بدرالدین علوی صاحب نے ترتیب قرآن بعصر نبی آخرالزمان پر جاندار تحریر پیش کی ہے۔

جناب عبداللہ قدسی اور عبدالمجید صدیقی اور حبیب احمد کے مقالات قبل اسلام کے عرب کے احوال پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے مطالعے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کس تہذیبی، فکری اور اخلاقی ماحول کے ظہور کا باعث ہُوا۔ سیرت کے مصادر و منابع پر محمد اجمل اصلاحی کے مضمون کا جو ترجمہ خلیل ابراہیم صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا قابلِ ستائش ہے۔ اسی طرح پروفیسر تحسین فراقی صاحب نے مسٹر گلامے کی تحریر کا جو ابن اسحاق کے متعلق ہے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ہے ابن اسحاق کے احوال سے آگاہی ہر طالب مطالعہ سیرت کو مطلوب تھی۔ ابن ہشام اور لیعقوبی وغیرہا سے متعلق بھی تحقیقی مقالے موجود ہیں۔

سیرت نبویؐ کے ضمن میں حضرت ابوالکلام مرحوم کے بھی نصف درجن سے زیادہ مقالات موجود ہیں اور نظر نوازی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مولانا اسحاق النبی، سید امیر علی، بریگیڈیئر گلزار احمد، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، حضرت مولانا اشرف علیؒ، مولانا ماہر القادری، پروفیسر خورشید احمد۔ اور پھر کس کس عالم اور محقق کا ذکر کیا جائے ——— حق یہ ہے کہ سیرت نبویؐ، قرآن، قرآنی اور اسلامی علوم، اسلامی تاریخ و سیرت کے اصول، اسلامی تعلیم کے اصول، اسلامی اخلاق کے آداب، خصوصاً مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حوصلہ افزا معانی پر مشتمل یہ مجلدات درجنوں اسلامی مضامین و موضوعات پر ایک لائبریری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر لکھنے والے حضرات مجلّہ بلند پایہ عالم اور ادیب بھی ہیں لہٰذا یہ چاروں مجموعے اردو زبان کے علمی ذخیرے میں ایک گراں مایہ اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں جس کے لیے اردو زبان ممنون رہے گی ——— اور پھر خیال آتا ہے کہ اگر ان چار جلدوں میں یہ یہ کچھ ہے تو باقی چھ جلدیں جو ابھی آنے والی ہیں وہ کیا کیا دینی و علمی گلدستہ ہائے رنگ و بُو لائیں گی۔ یہ بڑی تقطیع کے باریک تحریر میں تقریباً پونے چار ہزار صفحات ہیں، جو عام کتابی صورت میں چھپیں تو ایک درجن مجلدات کو شامل ہوں۔ دس جلدیں جب مکمل ہوں گی تو امید ہے کہ وہ سیرت کے ضمن میں ہر ضرورت اور طلب پوری کریں گی۔

طفیل صاحب نے اَن تھک محنت سے کام لیا ہے، اتنا بڑا کام بغیر لگن کے نہیں ہوتا۔ ہم سب طفیل صاحب کے شکر گزار رہیں اور جب دسوں مجلدات مکمل ہوں گے تو اردو زبان کا دامن بیحد وسیع ہو جائے گا۔ لہٰذا اردو زبان تمام دنیا کی زبانوں کو سیرت کے باب میں چیلنج کرنے کی بجا طور پر مستحق ہو گی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دل سے لینے والا اور حضورؐ کے ذکرِ جمیل کو عام کرنے والا کوئی بھی فرد نور، رحمت، ہدایت، برکت اور شفا سے محروم نہیں رہتا۔ طفیل صاحب نے تو یہ جملہ انعامات یقیناً جھولیوں سمیٹ لیے ہیں۔

کرنی ان کی خوش نصیبی پر جس قدر بھی رشک کرے کم ہے۔ اللّٰھم بارکۃ وبارکنا، اللّٰھمّ ارحمہٗ وارحمنا۔

۱۰ جنوری ۸۴ء

(پروفیسر) مرزا محمد منوّر
صدر شعبۂ اقبالیات، جامعہ پنجاب، لاہور

○ نقوش، رسولؐ نمبر ایک نظر میں — میرزا ادیب

"قیامت میں جب خدائے تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا؟ تو میں کہوں گا: مسدس حالی"

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

پہلا نثری فقرہ سر سید احمد خاں کا ہے، وہ اپنے پیدا کرنے والے کے لیے مسدسِ حالی کا تحفہ لے کر قیامت کے روز بارگاہِ ایزدی میں پہنچے ہیں۔ اس نثری ٹکڑے کے بعد جو اشعار دیے گئے ہیں وہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے ہیں جو ان کی نظم "حضور رسالت مآبؐ میں" سے لیے گئے ہیں۔

جب حکیم الامت پر ہنگامۂ زمانہ گراں گزرتا ہے تو وہ رختِ سفر باندھ روانہ ہو جاتے ہیں اور فرشتے انھیں بزمِ رسالتؐ میں لے جاتے ہیں، حضورؐ پوچھتے ہیں:

نکل کے باغِ جہاں سے تو مثلِ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تُو آیا

اور علامہ اقبالؒ جو تحفہ لے کر گئے ہیں وہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں اگر خدا تعالیٰ نے قیامت کے روز پوچھا: ہمارے لیے کیا لایا؟ تو کیا وہ یہ جواب نہیں دیں گے:

"آج میں جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہوں یہ توفیق نہیں انعام ہے، اور یہی انعام تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔"

"یہ انعام کیا ہے؟"

نقوش کا رسولؐ نمبر۔

مجھے یقین واثق ہے اُس وقت بارگاہِ ایزدی بارگاہِ رحمت بن جائے گی۔ اس سے بڑا تحفہ خدا نے رسول کو کیا دیا جا سکتا ہے کہ اس میں رسولِ خدا کی مقدس زندگی کا ایک ایک نقش اپنے تمام تر جذبات کے ساتھ موجود ہے۔

مگر یہ معاملہ خدا اور اس کے ایک بندے کے درمیان ہے۔ میں خدا کا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں اور یہ دیکھنے کی کوشش

کرتا ہوں کہ محمد طفیل نے رسولؐ نمبر کی صورت میں ہمیں کیسا تحفہ دیا ہے؟ یہ تحفہ کیا ہے؟ اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ آئیے پہلے طفیل کے ماضی پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

علامہ نیاز فتحپوری نے ایک بار لکھا تھا کہ طفیل نے اب تک جتنے نمبر شائع کیے ہیں اگر انھیں کسی جگہ یکجا کر دیا جائے تو ایک اچھی خاصی لائبریری بن سکتی ہے۔ اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم کے اس فقرے میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے۔ خیال رہے کہ نیاز کا انتقال اس زمانے میں ہُوا تھا جب طفیل کا سفرِ شوق بڑی تیزی سے جاری تھا۔ نیاز مرحوم کے انتقال کے بعد بھی نقوش کے کئی بڑے وقیع پرچے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

طفیل نے اپنے ان انسائیکلوپیڈیائی قسم کے پرچوں کی وساطت سے اردو ادب کو اتنا کچھ دیا ہے اور ایسے متنوع انداز میں دیا ہے کہ ایک طویل سے طویل اور مبسوط سے مبسوط مقالے میں بھی اس کا تجزیاتی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ پطرس بخاری نے بالکل درست کہا تھا کہ نقوش کے مطالعہ کے لیے جس عمر کی ضرورت ہے میں اس سے محروم ہُوں۔

طفیل نے جس موضوع کو بھی چھیڑا ہے اس پر حرفِ آخر کا حکم تو نہیں لگایا جا سکتا کہ دنیا میں نہ آج تک ایسا ممکن ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا مگر ہر پرچے میں موضوعاتی جامعیت کا اس درجہ اہتمام کیا ہے کہ بظاہر کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ لاہور نمبر، مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر، شخصیات نمبر، جنگ نمبر، میر نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر اور متعدد افسانہ نمبر۔ اور حال ہی میں انھوں نے عصری ادب نمبر بھی دیا ہے۔

ان نمبروں اور ان نمبروں کے علاوہ دوسرے نمبروں کی بنا پر 'نقوش' اردو ادب کی آبرو کہلانے کا مستحق ہو چکا ہے لیکن ان سب نمبروں کے پیچھے وُہ چیز ہے جسے ہم اپنی زبان میں دنیا کہتے ہیں۔ ان کی اشاعت عبارت ہے اُس عملی جدوجہد سے، جس کا تعلق دنیا سے ہے مگر آج ہم 'محمد نقوش' کو اس راستے پر جادہ پیما نہیں دیکھتے جس پر وہ اب تک بڑی مستعدی کے ساتھ گام زن رہے ہیں۔ آج انھوں نے اپنا راستہ بدل دیا ہے۔ آج ان کا سفرِ شوق پہلے راستے سے بالکل الگ ایک نئی راہ پر اپنا آغاز کر رہا ہے۔ آج نقوش کے وہ نقش نہیں ہیں جن سے ہم مانوس ہیں، جن میں دلفریب رنگوں کی ایک دنیا آباد دیکھتے چلے آئے ہیں۔

آج محمد طفیل نے کوئی دنیاوی کارنامہ نہیں، ایک دینی کارنامہ انجام دیا ہے۔

آج ان کے دامن میں ادبی خزانہ نہیں، دینی خزانہ ہے۔ آج انہوں نے ادبی گلدستے نہیں سجائے، خاکِ مکہ و مدینہ کی خوشبوئیں لے کر آئے ہیں۔ آج وہ آسمانِ رسالتؐ سے ان تاروں کی روشنی لائے ہیں جس سے ہر کلمہ گو کا دل منوّر ہے۔ آج وہ اس ادب گاہ سے چند جلوے لے کر آئے ہیں جو عرش سے بھی نازک تر ہے اور جہاں جنید و بایزید بھی نفس گم کردہ حالت میں آتے ہیں۔

نقوش کا رسولؐ نمبر چار جلدوں میں ہے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۰۷۶ ہے۔

اگر میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس کام کا ذکر کرنا چاہُوں تو کہہ سکتا ہُوں کہ نقوش کا رسولؐ نمبر حقیقۃً 'دائرۂ معارفِ نبویہ' ہے

اور ایک لازوال کارنامہ ہے کیونکہ اس کی نسبت ایک لازوال ہستی سے ہے۔

جہاں تک سیرت نگارانِ رسولؐ کا تعلق ہے حضرت عروہ بن الزبیرؓ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ان کے بعد کوئی دور، کوئی زمانہ، کوئی عہد ایسا نہیں گزرا جس میں سیرت کی کتابیں نہیں لکھی گئیں ان کتابوں کی تعداد ہزاروں سے اُوپر ہے، اور اب تک ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری اپنی قومی زبان اور علاقائی زبانیں سیرت کی کتابوں سے محروم نہیں ہیں۔ ان میں شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے اور آج یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سیرت النبیؐ کے عالی مقام مصنفوں نے اپنے شاہکار کے ذریعے جو قابلِ عد فخر روایات قائم کی تھیں نقوش کا رسولؐ نمبر اسے بہت آگے لے گیا ہے بہ لحاظ معلومات کے بھی، مضامین کی افادیت کے بھی اور تحریروں کی جامعیت کے بھی۔ پہلی جلد کو لے لیجئے یہ جلد ۱۰۶ صفحات کو محیط ہے۔

اس میں سب سے پہلے پندرھویں صدی کا ذکر ہے ماضی و حال کے آئینہ میں۔ اور مصنف ہیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ اس عالمانہ مقالے میں پچھلی صدیوں کے اجمالی بیان کے ساتھ ساتھ موجودہ صدی ہجری میں عالمِ اسلام کے لیے دس نکاتی پروگرام پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تکنیک کے باب میں سیرت نگاری کے بنیادی اصولوں، بعض اہم پہلوؤں اور سیرت نگاری کی ذمے داریوں تک کی گفتگو کی گئی ہے۔

اس نہایت اہم باب کے بعد جو سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے: ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے اپنے ایک مضمون میں فرمایا ہے: نبی مکرمؐ کی سیرت کے لیے قرآن کافی ہے۔ حضورؐ کے اخلاقِ حسنہ کیا تھے۔ یہ قرآن کے گہرے مطالعہ سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا کا اپنا ارادہ تھا کہ وہ یہ کام کر کے دنیا سے رخصت ہوں مگر نہ کر سکے۔

قرآن مجید رسولِ پاکؐ کی ذات برگزیدہ کی عملی تفسیر ہے۔ اللہ نے جو کچھ کہا وہ قرآن پاک میں ہے اور رسولِ خداؐ نے فرمودات حق کے مطابق جو کچھ کیا وہ سیرتِ پاک میں ہے۔ اس جلد میں سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک، پورے فرقانِ حمید میں اللہ نے اپنے رسولؐ کو جس جس انداز سے مخاطب کیا ہے، جس جس طریقے سے ان کا ذکر کیا ہے یا جو جو باتیں بتائی ہیں ان سب کو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سیرت کے دورِ اوّل اور سیرتِ نبویؐ کی اوّلین کتابوں کے احوال و کوائف درج ہیں۔

دوسری جلد میں مولانا نعیم صدیقی کا ایک مبسوط اور تفصیلی مقالہ شاملِ اشاعت ہے۔ عنوان ہے۔ رسول اللہ ایک نظر میں۔ ایک باب ہے سیرتِ نبویؐ کی توقیت، ایک باب الرسالات النبویہؐ کا احاطہ کرتا ہے۔ حقیقتِ توحید اور حقیقتِ وحی کی مفصل بحث ہوا الگ الگ ابواب میں ملتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی زیرِ ترتیب سیرۃ النبیؐ کی ساتویں جلد کا غیر مطبوعہ مواد بھی دعوتِ مطالعہ دیتا ہے۔ اس جلد کو یہ سعادت اور امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی انگریزی کتاب "محمد رسول اللہ" کا پہلی بار اُردو ترجمہ چھپ رہا ہے۔ یہ ترجمہ بڑے سلیقے سے نذیر حق نے کیا ہے۔ مزید برآں مکے اور مدینے کی تاریخ بھی شریکِ اشاعت ہے۔

تیسری جلد میں مکّے اور مدینے کی قدیم تاریخ کو پھیلایا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے عالمِ بشریت کی کیا کیفیت تھی، عربوں کے کیا تصورات، معتقدات اور رسوم و رواج تھے۔ دوسرے باب میں رحمۃ للعالمینؐ کی اس حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا تعلق انسانِ کامل سے ہے۔ اصلاحِ معاشرہ میں حضورؐ کا کردار کیا تھا! اس پر گفتگو ایک الگ باب میں کی گئی ہے۔

نبی مکرمؐ حقیقی معنوں میں عظمتِ انسانی کے نقیبِ اوّل تھے، اس کو بھی موضوعِ فکر بنایا گیا ہے اور اس کے بعد جو باب شامل ہے اس میں معاشرے پر حضورؐ کے اثرات واضح کیے گئے ہیں۔ یہ اثرات سیاسی لحاظ سے کیا تھے، اقتصادی اعتبار سے ان کی نوعیت کیا تھی اور انھوں نے عربوں کی مجلسی اور تہذیبی زندگی کو کس کس طرح متاثر کیا تھا، اور ان اثرات کی بدولت جو معاشرہ وجود پذیر ہوا تھا اس کے نمایاں خدوخال کیا تھے؟

ان سوالوں کا جواب بڑی خوش اسلوبی سے دیا گیا ہے۔

چوتھی جلد کے عنوانات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر — علومِ انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر — اخلاقی اصلاح — ہمارے رسولؐ بہ حیثیت سپہ سالار (تمام غزوات کی تفصیل) — ہمارے رسولؐ غیر مسلموں کی نظر میں — متعلقاتِ سیرت۔

ہر عنوان متعلقہ موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

یہ نقوش کے رسولؐ نمبر کی چار ضخیم جلدوں کی محض چند جھلکیاں ہیں اور یہ بھی نامکمل۔ اصل میں قصہ یہ ہے، ع

ذوق ایں بادہ ندانی تا نہ چشی

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں یہ نمبر دائرۂ معارفِ نبویہ ہے اور واقعتاً یہ سیرتِ رسولؐ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

'نقوش' کے بڑے بڑے اہتمام بالشان نمبر شائع ہوتے رہے ہیں اور محمد طفیل بڑی خاموشی، بڑی استقامتِ طبع اور بڑے خلوص کے ساتھ اس نمبر کی ترتیب میں منہمک رہے ہیں۔ ویسے تو یہ نمبر ان کی دس سالہ محنت کا نتیجہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں وہ اس مدت سے بہت پہلے اس کی تیاریوں میں ذہنی طور پر مصروف ہو گئے تھے۔

پہلی جلد میں "اس شمارے میں" کے تحت انھوں نے جو افتتاحی سطریں لکھی ہیں ان میں ایک جگہ کہا ہے:

"میں نے آج تک جتنے نمبر پیش کیے وہ سب فخریہ انداز میں پیش کیے مگر یہ نمبر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ معاملات دل کے ہیں، کبھی اس طرح خوش، کبھی اس طرح خوش۔"

یہ نمبر طفیل صاحب نے انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کیا ہے اور کرنا بھی چاہئے تھا۔ اگرچہ یہ اس ہستی کے بارے میں ہے جس پر یہ مصرع بالکل بجا طور پر منطبق ہوتا ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

لیکن جو خود کو اللہ کا ایک عاجز بندہ تصور کرتا ہے اور جس کے انکسار کا یہ عالم ہے کہ جب وہ فتح کے بعد مکّے میں داخل ہوتا ہے تو وہ گھوڑے پر بیٹھ کر اس قدر جھکا ہوا ہے کہ اس کی ٹھوڑی گھوڑے کی گردن سے جا لگی ہے۔

فخرِ موجودات اور یہ فروتنی !
یہی ہمارے رسولؐ کی شان ہے ۔
محمد طفیل بڑے خوش نصیب انسان ہیں ——— انھوں نے جو خواب دیکھا تھا آج اسے عملی صورت میں دیکھ رہے ہیں ۔
ان کا یہ کارنامہ ایک لازوال کارنامہ ہے ——— جس پر آنے والی صدیاں چپ چاپ سایہ ڈال کر گزر جائیں گی اور
یہ اسی طرح شاداب ، تابناک اور زندہ و تابندہ رہے گا !!

میرزا ادیب

○

○ نقوش کا رسولؐ نمبر ——— ڈاکٹر انور سدید

نقوش کا رسولؐ نمبر پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر ، لا مثال شخصیت پر ایک عظیم کام ہے ۔
نقوش کا رسولؐ نمبر دیکھیں تو سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان نے بالعموم اور لاہور نے بالخصوص حضور نبی اکرمؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار " نقوش " کا رسولؐ نمبر چھاپ کر بھی کیا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اس گئے گزرے دور میں جبکہ آزاد فکری اور آزاد خیالی کی تحریکیں مذاہب کی گرفت اور مذہبی راہنماؤں سے محبت کے زاویوں کو کمزور کر رہی ہیں محمد طفیل نے یہ نمبر مرتب کر کے اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر باور کرایا ہے کہ حضور رسالتمآبؐ ہی پاکستانیوں کے دلوں کا اُجالا ہیں ۔ چنانچہ نقوش کا رسولؐ نمبر محض انسانی محنت کا عظیم کارنامہ نہیں بلکہ یہ اس جذبے کا ثمر ہے جو ایمانیات کے صدق و ثبات سے اُبھرتا ہے ۔

رسولؐ نمبر کو پندرھویں صدی ہجری کے ادب کی ایک اہم ترین دستاویز شمار کیا گیا ہے ۔ اس کی چار جلدوں کے تین ہزار چھہتر (۳۰۰۷۶) صفحات کے ہر لفظ میں محمد طفیل کی حُبِ نبوی کے چراغ روشن ہیں ۔ ایمان یہ کہتا ہے کہ انھیں یہ روشنی اگر اپنے بطون میں نظر نہ آتی تو شاید " رسولؐ نمبر " بھی مرتب نہ ہوتا ۔ شاید محمد طفیل اسی طمانیت میں ہی زندگی بسر کر ڈالتے کہ انھوں نے غزل نمبر شائع کیا ہے ، آپ بیتی نمبر چھاپا ہے ، شخصیات نمبر ، خطوط نمبر ، میر نمبر ، اقبال نمبر ، غالب نمبر ، لاہور نمبر ، پطرس نمبر ، منٹو نمبر ، اقبال نمبر ، ادب عالیہ نمبر وغیرہ وغیرہ نہ جانے کتنے ہمہ گیر موضوعات پر ہمہ گیر نمبر مرتب کیے ہیں ۔ ان میں سے ہر نمبر اس کے مرتب کی ذاتی لگن ، استقلال اور ادب دوستی کا معجزہ ہے ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑے کام کی تڑپ ان کے دل میں موجود تھی ، اور نقوش کا رسولؐ نمبر ایک ایسا ہی کارنامہ ہے جس کو دیکھ کر پڑھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے اور بطونِ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ محمد طفیل کا وہ جذبہ تر و تازہ رہے جس نے ان سے یہ عظیم الشان کارنامہ عملی صورت میں سرانجام دلایا ہے ۔ یہ جذبہ فزوں تر ہو ، یہ جذبہ خونِ گرم کی طرح زندہ رہے اور انھوں نے رسولؐ نمبر کی دس جلدوں کی ترتیب و تدوین کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ اشاعت کی تمام منزلیں حُسن و خوبی سے طے کر لے ۔
نقوش کے رسولؐ نمبر کی اشاعت کسی ہنگامی یا اضطراری خیال کا نتیجہ نہیں بلکہ محمد طفیل نے اس اہم کام پر برسوں سوچا ہے ۔

مجھے یاد ہے کہ دس بارہ سال قبل میں نے "سیارہ" کے نعت نمبر کے لیے اردو نعت کا ایک جائزہ لکھا تو اس کی بھنک کسی طرح محمد طفیل کے کان میں بھی پڑ گئی، پھر شومئ قسمت "سیارہ" کا نعت نمبر شائع نہ ہو سکا تو محمد طفیل صاحب نے میرا یہ مضمون نقوش کے رسول نمبر کے لیے محفوظ کر لیا۔ گزشتہ دس سال کے عرصے میں ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تو یہی کہتے :

"رسول نمبر کی ترتیب میں مصروف ہوں۔"

لیکن عالم یہ تھا کہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ اس نمبر کا ڈول کس طرح ڈال رہے ہیں اور غواصی کے کس عمل میں مبتلا ہیں۔ زندگی کے اس ہنگامہ دار وگیر میں بھی ان کا جنون آرام طلبی سے واقف نہیں ہوا، اس دس سال کے عرصے میں بھی انہوں نے نادر و نایاب نمبر چھاپے، رائٹرز گلڈ کے محاذ پر کام کیا، ادیبوں اور ناشروں کے جھگڑے چکائے، سیکڑوں کتابیں شائع کیں، خاکے لکھے اور شائع کیے۔ بچوں کی شادیاں کیں، دوستوں کی دعوتیں کیں۔ خود تقریبات منعقد کرائیں اور ادیبوں کے جلسوں میں شریک ہوئے، غرض کوئی ایک جہت ہو تو اس کا ذکر تفصیل سے کیا جائے، محمد طفیل کی مصروفیات اتنی تھیں کہ اجمال سے بھی ذکر ہو تو موضوع پھیلتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اب رسول نمبر سامنے آیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کام خود نہیں کیا کسی ہاتفِ غیبی نے ان کی مدد کی ہے۔

یہاں مجھے اپنے ایک مخلص دوست احمد حسین رشک ترابی یاد آ رہے ہیں۔ رشک صاحب اہلِ بیت کے مدح خواں ہیں، مرثیہ لکھتے ہیں اور اس قدر ڈوب کر جیسے کربلا کے تمام مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہوں، قادر الکلام ایسے کہ صرف ایک رات میں سو ڈیڑھ سو بندوں کا مرثیہ لکھنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں اور اس امتحان سے بارہا کامیاب گزرے ہیں ایک دفعہ میں نے پوچھا :

"رشک صاحب! اتنے طویل مرثیے آپ کیوں کر لکھ لیتے ہیں؟"

رشک صاحب نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف کھڑی کی اور عجز و انکسار سے بولے :

"انور سدید صاحب! اپنا کمال تو کچھ بھی نہیں، کوئی اَن دیکھی طاقت ہے جو مجھ پر اشعار کی بارش کرنے لگتی ہے میں تو بس بارش کے قطروں کو سمیٹتا چلا جاتا ہوں۔ حضرت نبی اکرم اور نواسۂ رسول کے اسمائے گرامی پر ارتکازِ ذہن کرتا ہوں، اشعار اُترنے لگتے ہیں۔ اور جس دن نان و نفقے کا فکر لاحق ہو اس دن ایک شعر بھی نازل نہیں ہوتا۔"

میں نے محمد طفیل سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا بلکہ جب سے انہوں نے رسول نمبر چھاپا ہے ان سے بالمشافہ تفصیل ملاقات بھی نہیں ہوئی، ہاں اس کا ایک پرتو رسول نمبر کے اداریہ میں موجود نظر آیا ہے اور وہ انھیں کے الفاظ میں سُنیے :

"میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا ہے اس کی بھی توفیق نہیں تھی، اس لیے کہ اہلِ نظر نے جو کچھ دیکھا وہ بھی میری سعی کا نہیں، تائید کا نتیجہ ہے۔

میرے حصے میں کیا آیا! حیرانی اور صرف حیرانی۔

آج بھی جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہوں، یہ توفیق نہیں انعام ہے.....
میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں اور کچھ بھی نہیں ہوں۔"

نقوش کا رسول نمبر اسی انکسار کی نہایت ہے لیکن محمد طفیل کی "نارسائیوں" کے امکانات جس انداز میں سامنے لائے ہیں ان کا تذکرہ اجمالی طور پر کرنا ضروری ہے۔ وضاحت اور تفصیل اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی تنگ دامانی کا احساس زیادہ ہے۔ محمد طفیل نے رسول نمبر دس برسوں میں مرتب کیا ہے اسے پڑھنے کے لیے مزید دس سال مجھے درکار ہیں۔

رسول نمبر کا بنیادی موضوع بلاشبہ نبی اکرمؐ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ تاہم محمد طفیل نے اس مرکزی موضوع سے قرینے اور سلیقے سے بہت سے نئے زاویے تراشے ہیں۔ چنانچہ پہلی جلد میں سیرت نگاری کی تکنیک، سیرت نبویؐ کا بنیادی مواد، سیرت کے دورِ اوّل کے اہم سیرۃ نگاروں کا جائزہ اور سیرۃ نبویؐ کی اوّلین کتابوں اور ان کے مولفین کے بارے میں جملہ معلومات جمع کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ سیرت کی جامعیت کے بنیادی اصولوں پر قاری محمد طیب صاحب نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سید معین الحق اور ندیم الواجدی صاحب نے ان دشواریوں کا جائزہ لیا ہے جو سیرۃ نگاری میں عموماً پیش آتی ہیں اور اکثر اوقات غلط اور گمراہ کن نتائج کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر معین الحق کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ

"خود ہمارے مصنفوں نے بھی سیرت اور مغازی پر ایسی روایتیں جمع کر دی ہیں جو کسی صورت میں بھی تاریخی شہادت کے جدید معیار پر پوری نہیں اُتر سکتیں۔"

ان دشواریوں کی روشنی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیرت نگاروں کی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا استشہاد قرآن کی آیات سے کرتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت کے اس ماخذ کی تشریح قاری محمد طیب، محمد عبداللہ سلیم، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر اسرار احمد، تمنا عمادی، بدرالدین علوی کے گرانقدر اور عالمانہ مضامین سے ہوتی ہے۔ سیرت نگارانِ رسولؐ میں عروہ بن الزبیر، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابنِ سعد، ابنِ حزم الاندلسی، ابن عبدالبر، قاضی عیاض، ابنِ کثیر، علامہ یوسف، ابن الجوزی وغیرہ کا ذکر اور ان کے کام کا تجزیہ محبت کے زاویے سے کیا گیا ہے۔ اس حصے میں بہت سے تراجم شامل ہیں اور قیاس یہ ہے کہ اردو دان طبقے کے سامنے یہ مواد پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔

رسول نمبر کی دُوسری جلد مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ کی ساتویں جلد کے تین اہم مضامین بھی جو فخرِ موجوداتؐ کی مکی اور مدنی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں شاملِ اشاعت ہیں۔ معنوی طور پر اس جلد کا موضوع حضورؐ کی سیرت ہے اور یہ فریضہ جناب نعیم صدیقی، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، مولوی اسحٰق النبی علوی نے ادا کیا۔ حضورؐ کے مکتوبات و فرامین کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے کیا ہے اور اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "الوثائق السیاسیۃ" سے استفادہ کا ذکر بھی درج ہے۔ حقیقتِ توحید پر ایک فاضلانہ مضمون مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا اور اس میں توحید کے کثیر الجہت معانی کو استدلال سے روشن کیا ہے۔ اسی جلد میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "عہدِ نبوی

کا ترجمہ نذیر حق نے کیا ہے۔ اس سے حضورؐ کی سیرت نگاری کا ایک نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے گرانقدر کام کے لیے تحسین کا زاویہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔

تیسری جلد کا غالب موضوع رحمۃ للعالمینؐ کی معاشرتی زندگی اور حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ ہے۔ اس میں اسلام سے پہلے کے عالم بشریت کا جائزہ نو سیر حاصل مضامین میں لیا گیا ہے اور لکھنے والے ہیں حافظ مظہر الدین صدیقی، سید امیر علی (ترجمہ محمد ہادی حسن)، عبداللہ قدسی، عبدالحمید صدیقی، سید شمس اللہ قادری اور حبیب احمد وغیرہ۔ اسی جلد میں ابوالکلام آزاد اور خلیفہ عبدالحکیم کے متعدد مضامین کو زیب و آرائش سے جگہ دے کر ان ارباب علم کی اسلامی خدمت اور حُبِ نبویؐ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے حضورؐ کی سیرت سے عصرِ حاضر کے نام پیغام اخذ کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے حضورؐ کی نجی اور گھریلو زندگی کے نقوش مرتب کیے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے حقوقِ اُمت کا جائزہ لیا ہے۔ اس حصے پر نادر و نایاب مقالہ حضورؐ کی سیرۃِ طیبہ پر قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ہے۔ اور یہ مقالہ اس موضوع کو ایک جداگانہ زاویہ عطا کرتا ہے۔

رسولؐ نمبر کی چوتھی جلد گویا سابقہ تین جلدوں کے مضامین اور حضورؐ کی ذاتِ طیبہ پر محاکمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بحث سابقہ مطالعوں کی روشنی میں ابھاری گئی ہے اور اس میں سید قطب شہید، سید ابوبکر غزنوی، عبدالرحمٰن عزام بک، ڈاکٹر احمد شلبی، حنیف اللہ پھلواروی، محمد توفیق حسین اور متعدد دوسرے فضلا نے حصہ لیا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مہاتِ رسول کا عالمانہ جائزہ لیا ہے اور پروفیسر عبدالصمد صارم نے قرآن، اسلام اور رسول کے بارے میں غیر مسلموں کے تاثرات جمع کیے ہیں۔ کارلائل کا مشہور مضمون "محمد — پیغمبرِ انسانیت" کا ترجمہ بھی اسی حصے میں شامل ہے۔

اس اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ محمد طفیل نے نقوش کے رسولؐ نمبر کے لیے اوّل درجے کا مواد حاصل کرنے کے لیے زمانی اور مکانی طنابوں کو آپس میں ملا دیا ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید کی قدغن کو بھی قبول نہیں کیا اور دنیا کے جس کتب خانے سے اور جس زبان میں بھی گراں قدر مواد ملا ہے اسے نقوش کے رسولؐ نمبر میں سمیٹ لیا ہے۔ چنانچہ اسے نقوش کا ہی نہیں محمد طفیل کا رسولؐ نمبر کہا جائے تو بالکل موزوں ہوگا۔

نقوش میں درج ہے کہ محمد طفیل کو اس نمبر کی اشاعت کے لیے اپنے پریس کا آدھا حصہ فروخت کرنا پڑا۔ اخبارات نے لکھا ہے کہ صدرِ مملکت نے اس گرانقدر اشاعت پر محمد طفیل کو ایک لاکھ روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ یہ دونوں زاویے محمد طفیل کی حُبِ نبویؐ اور تحسینِ سخن شناس کے مظہر ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ نقوش کا رسولؐ نمبر شائع کر کے محمد طفیل نے اپنے لیے سامانِ آخرت جمع کیا ہے۔ وہ آرزو پوری کی ہے جو برسوں ان کے دل میں سُلگتی رہی اور اب وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ:

"حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔"

اور اس نسبت کے سامنے دُنیا کی تمام چیزیں اور تمام انعامات ہیچ ہیں۔

چٹان، لاہور

○

○ دس دروازوں والا شہر ——— اسلم کمال

کیلنڈر پر آج سے دو تین دن بعد ۱۹۸۳ء کی جگہ ۱۹۸۴ء لکھا جائے گا۔ یہ دو تین دن گویا اس سال کے غروب کے آخری دو تین لمحے ہیں۔ یا یُوں کہہ لیجئے؛ تاریخ کے ایک صفحے کی آخری سطر کے آخری دو تین الفاظ زیرِ مطالعہ ہیں جن کے بعد اگلے صفحے پر لکھا ہوا آنکھ پڑھے گی۔

جریدہ 'نقوش' نے رسولؐ نمبر کی دس جلدیں مکمل ہو گئی ہیں۔ نقوش کے مدیر محمد طفیل عرف محمد نقوش نے اس طرح جریدۂ عالم کو اپنا نقشِ دوام پیش کر دیا ہے۔ نقوش کی یہ دس جلدیں محمد طفیل کا وہ دیرینہ خواب ہے جس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ گزشتہ بارہ برس سے مصروفِ کار تھے۔ ساڑھے سات ہزار صفحات پر مشتمل نقوش کا رسولؐ نمبر وہ دس دروازوں والا دیارِ عشق ہے جسے محمد طفیل کے عشق نے دستِ کارکشا و کارساز سے تعمیر کیا ہے۔

ہر شخص کسی شہر میں بستا ہے۔

ہر شخص کے ذہن میں ایک شہر ہوتا ہے۔ زندگی کے ایک ایک لمحے میں وہ اسی ایک شہر کی جانب محوِ سفر رہتا ہے۔ کسی بھی سمت کو یا کسی بھی جہت میں، اس کے قدم اُٹھیں اور وہ کوئی سا بھی راستہ اختیار کرے اُس راستے کی انتہا پر اس کی نظر بس اُسی ایک اپنے شہر کو شاد اور آباد دیکھتی ہے۔

حضرت سلطان باہُوؒ فرماتے ہیں؛

بغداد شہر دی کیہ نشانی اُچیاں لمیاں چیراں ہُو
تن من میرا پُرزے پُرزے جیوں درزی دیاں لیراں ہُو
ایہناں لیراں دی گل کفنی پا کے رلساں سنگ فقیراں ہُو
بغداد شہر دے ٹکڑے منگساں کرساں میراں میراں ہُو

جیسے کوئی شاعر کوئی شعری ترکیب ذہن میں بچا کر رکھ لیتا ہے، کسی خاص لمحۂ تخلیق کے لیے، یا کوئی مصوّر کوئی پرتوِ رنگ اٹھا رکھتا ہے کسی چہرے کے لیے، یا کوئی بھکاری دل میں کوئی صدا چھپا کر رکھتا ہے کسی درِ آستاں کے لیے۔ اسی طرح محمد طفیل نے دبا رکھی تھی اپنے نہاں خانۂ روح میں ایک تمنّا، ایک دُعا روضۂ رسولؐ کے لیے۔ اس کا بخت یاور ہوا تو اس نے عرض کی حضرت علامہ اقبال کی زبان میں؛

(ترجمہ) "ہم حضورؐ کے دل مبارک میں چھپا ہُوا بھید تھے، حضورؐ نے نعرۂ بے باکانہ لگایا تو ہم نمایاں ہو گئے۔

میری خاموش نَے میں حضورؐ کے عشق کا شور ہے، میرے پہلو میں سینکڑوں نغمے تڑپ رہے ہیں۔

مسلمانوں کا وجود حضورؐ کی تجلّی گاہ ہے آپؐ کی گردِ راہ سے قدم قدم پر طُور پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے پیکر کا وجود آپؐ کے آئینے سے پیدا ہُوا۔ آپؐ کے سینے کے سُورج سے ہماری صبح نمودار ہُوئی ہے۔

آپؐ کے عشق میں تڑپتے رہنا میرا کام ہے میری شام صبحِ قیامت سے بھی زیادہ گرم ہے۔
آپؐ ابرِ بہاراں ہیں اور میں اس کے لیے باغ ہوں۔ میرے انگور کی شاخ آپؐ کی بارش سے ہری ہے۔
میں نے محبت کے کھیت میں اپنی آنکھ بوئی اور اس سے نظارہ اور دید کا سرمایہ حاصل کیا۔"

محمد طفیل کی دُعا کو شرفِ قبولیت کے پَر لگ گئے کہ مانگنے والوں کی گردِ راہ کے ذرّوں کو بھی مہ و نجوم کا مقدر بخشا جاتا ہے، یہ اس درِ پاک کی زندہ روایت ہے۔ محمد طفیل نے واپسی پر کہا:

"اسلم کمال! میں نے جو جو مقامات دیکھے اور جہاں جہاں گیا ہوں ہر ہر لحہ اور ایک ایک ساعت یہ میرا گمان نہ تھا یقین تھا کہ یہ سفر دُہرایا گیا ہے، میرے قلب و رُوح پر تازہ کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں میرے آقا و مولاؐ کی رحمت مجھ پر اس قدر ......"

اور پھر محمد طفیل کی آنکھوں میں آنسو جھلملا نے لگے۔ میں نے بیس سال سے زائد عرصہ کی رفاقت میں محمد طفیل کی آنکھوں کا یہ فعل پہلی بار دیکھا تھا۔ محمد طفیل کی آنکھ کے اس فعل نے اربوں کھربوں آنکھوں کے ذوقِ دید کے لیے دیارِ عشق کی منظر کشائی کا سامان کر دیا ہے۔

پہلے دروازے سے اس شہر میں داخل ہوں تو سیرت النبیؐ کے لیے بنیادی مواد ملتا ہے۔ سیرت نگارانِ رسولؐ کا یہ گوچۂ خوش اطوار ہے۔ سیرتِ رسولؐ پر اوّلیں کتابوں کے بارے میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔

اس شہر میں دُوسرے دروازے سے اندر جائیں تو سیرۃِ رسولؐ کا تحقیقی مطالعہ حقیقتِ توحید اور حقیقتِ وحی کا علم حاصل ہوتا ہے۔

تیسرے دروازے سے اصلاحِ معاشرہ، فلاحی معاشرہ اور سیاسی نظام پر اثرات کی تفصیل ملتی ہے۔

چوتھے دروازے سے اس شہر میں جائیں تو اخلاقی اصلاح اور علمِ انسانی پر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر و نفوذ سامنے آتا ہے۔

اس شہر میں پانچویں دروازے سے داخل ہوں تو عہدِ نبویؐ میں ریاست کا نشوو ارتقا، عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت کا نقشہ ملتا ہے۔

چھٹے دروازے سے اندر جائیں تو اقوالِ رسولؐ، تدوینِ حدیث اور علمِ حدیث پر تحقیق و جستجو کا کارِ خیر دکھائی دیتا ہے۔

ساتویں دروازے سے کاتبانِ وحی کے حالات، دربارِ رسالتؐ کے فیصلے اور مکالماتِ رسولؐ گوشِ سماعت کو نوازتے ہیں۔

آٹھویں دروازے سے یہ شہر اصحابِ صُفّہ کے احوال، حضورؐ کی فصاحت و بلاغت اور حضورؐ کے خطباتِ رشد و ہدایت کی کرنیں بانٹتا ہے۔

نویں دروازے سے، پہلی تحریروں کی تکملہ والی صورت سامنے آتی ہے۔

دسویں دروازے سے اس شہر میں نعت پر ابتدائی کام کی بہم رسانی اور نئے موضوعات کا آغاز اپنی خوش نوائی سے نوازتا ہے۔

دس دروازوں والا شہر جس کی جانب محمد طفیل انجانے طور پر زندگی کے ہر لمحے میں سرگرم سفر رہا۔ وہ اس شہر کی جانب چلتا بھی رہا اور اس کی تعمیر بھی کرتا رہا۔ یہ شہر شوقِ طلب اور ذوقِ تعمیر کی صناعی کا نادر نمونہ ہے۔

دس دروازوں والے اس شہر کی آب و ہوا علاجِ خاطرِ آشفتہ حالاں ہے۔ یہاں ذرّے کو آفتاب بنایا جاتا ہے۔ یہاں بدر و حنین اور خندق و تبوک کے معرکے اور رزم گاہیں بھی ہیں۔ اس شہر کے مکین بلالِ حبشیؓ اور ایوب انصاریؓ بھی ہیں، یہاں صدیقِ اکبرؓ ہیں جن پر بنائے عشق و محبت ہے استوار۔ یہاں فاروقِ اعظمؓ ہیں جن کے دل کو قرارِ جوششِ حق سے ملا۔ یہاں عثمان غنی ذوالنورینؓ ہیں اور خیبر شکن علیؓ ابنِ ابی طالب بھی ہیں۔ اس شہر میں آقائے دوجہاں کو شبستانِ حرا کی یاد آتی ہے تو اُحد پہاڑ نیاز مندی میں بچھ بچھ جاتا ہے۔ یہاں شمعِ رسالت کے پروانوں پر ظلم و ستم کی دلخراش خبریں بھی آتی ہیں اور دُور دراز سے فتوحات کی خوشخبریاں بھی ملتی ہیں غرض اس دس دروازوں والے شہر میں مکہ مدینہ ہو گیا تو مدینہ مکہ ہو گیا ہے۔

کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جب انسان عدل نہیں مانگے گا، انصاف نہیں چاہے گا، محبت کا پیاسا نہیں ہوگا، خلوص کی تلاش نہیں کرے گا۔ انسان کا اجتماعی شعور جب بھی ہدایت مانگے گا اور رنگ و نسل، حسب و نسب اور رشتہ و پیوند کی زنجیریں توڑ کر میثاقِ آدمیت پر دستخط کر کے ایک انسانی مملکت کی تشکیل کرے گا تو اس مملکت کا دار الخلافہ میرا، آپ کا اور سب کا یہی دس دروازوں والا شہر ہوگا۔

اس شہر کے سب رستے، ساری گلیاں، تمام کوچہ و بازار، ہر آنگن، ہر محفل، ہر خلوت، ہر جلوت میں شوخیِ نقشِ پا حضورؐ کے خرامِ عفت مآب کی گواہی دیتی ہے۔ اس شہر کی زمین کے ذرّے، کنکر اور خار و خس اور آسمان کے آفتاب و ماہتاب اور ستارے سارے کے سارے حضورؐ کی سیرتِ پُر انوار کا ذکر کرتے ہیں۔ اس شہر کے سب کھیت کھلیان، سبزہ و گل، حجر، شجر، باغ و راغ حضورؐ کے کردارِ رحمت شعار کی بات کرتے ہیں۔ اس شہر کے تمام ذی نفس ذی روح جن و انس و ملک سب کے سب یہی کہتے ہیں حضورؐ عدل پرور، انصاف گستر، بے مثال، بے نظیر، بے حد کریم، بردبار حلیم خلقِ عظیم اور سراسر رؤف و رحیم تھے۔ یتیموں کے والی، غلاموں کے مولاؐ تھے۔

دس دروازوں کے اس شہر میں چلے آئیے اور ملا جامیؒ کے ہمنوا ہو جائیے: ؎

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

○

امروز ہفت روزہ اشاعت ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء

○

لاہور کے ادبی مجلّہ " نقوش " نے اپنے ضخیم خاص نمبروں کے لحاظ سے بجا طور پر لاثانی شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے پچھلے نمبر تمام تر ادبی موضوعات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً شخصیات نمبر، افسانہ نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر وغیرہ۔

لیکن یہ خاص نمبر، ان سب سے جُدا ایک دینی موضوع پر اور موضوع بھی ایسا جو ہر مسلمان کے لیے باعثِ کشش اور اس کے ذوقِ ایمانی کو تازہ کرنے والا ہے یعنی سیرۃِ رسولؐ اور اس کے مبادیات و متعلقات پر حُسنِ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اردو کے اعلیٰ ادبی معیار کو بھی اس میں پچھلے خاص نمبروں کی طرح قائم رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ محمد طفیل صاحب مدیر رسالہ نے جو اب تک صرف ادبِ اردو کے خادم کی حیثیت رکھتے تھے دین کی بھی ایک بڑی اور سدا بہار خدمت انجام دے ڈالی۔

یہ خاص نمبر، سیرتِ نبوی کے موضوع پر صحیح معنی میں انسائیکلو پیڈیائی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے سبھی مضامین مستند، جچے تُلے اور لائق استفادہ ہیں۔ ان چار ضخیم نمبروں کی تفصیلی مطالعہ کے لیے ہفتوں نہیں مہینوں کی نوبت درکار ہے حصّہ اول کی تفصیلی فہرست مضامین تقریباً چار صفحوں میں آئی ہے۔

پہلے حصہ کے مضامین سیرت طیبہ کے مبادیات اور اوّلیات اور سیرت نگاری کی تکنیک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اہلِ علم کے علم میں اضافہ کرنے والا ہے۔ بعض مضامین عام قارئین کے لیے بھی بڑے کار آمد ہیں خصوصاً " ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ " کے عنوان سے جس میں فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے پورے قرآن یعنی سورۂ فاتحہ سے لے کر سورہ والناس تک کا بہترین خلاصہ پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ " قرآن اپنے لانے والے (نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم) کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے: "

جلد اول کا پہلا مقالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے " پندرھویں صدی ہجری، ماضی و حال کے آئینہ میں " بڑا ہی موثر اور ایمان آفرین ہے۔

دوسرا فاضلانہ مضمون مولانا قاری محمد طیب صاحب کے قلم سے " سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول " اس سے قبل یہ کراچی کی ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں پڑھا جا چکا اور اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا۔

مولانا ابوالحسن علی کا ایک اور اہم مضمون " سیرت نگاری کی ذمہ داریاں " بھی اس نمبر کی زینت ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک مضمون " نبوتِ محمدیؐ پر قرآن میں استدلال " کلامی نقطۂ نظر سے بہترین ہے اور اس میں مستشرقین اور ان کے مقلدین کے اعتراضات کے بھی مدلل جوابات موجود ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم مدیر " صدق جدید " کے مدراس کے قرآنی لکچر جو سیرتِ نبویؐ قرآنی یا خطبات ماجدی

کے نام سے دوبارہ شائع ہو چکے تھے وہ بھی اس خاص نمبر میں "سیرت رسولؐ قرآن کی روشنی میں" کے زیرِ عنوان درج ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی کا مضمون "قرآن حکیم میں اطاعتِ رسولؐ" خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہے اس میں بعض نام نہاد مدعیانِ علم کے اس دعوے کی پوری تردید قرآن سے کی گئی ہے کہ پیغمبر کی حیثیت محض مبلغ اور شارح کی ہے شارع کی نہیں اور اس بنا پر ان صاحبان کا نقطۂ نظریہ ہے،

"ہر دور کے اہلِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ معاشرے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنے طور سے کتاب اللہ کی تشریح کریں"

عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین پر سید بدر الدین علوی کا مضمون موضوع کے حق کو پوری طرح ادا کرتا ہے۔

"سیرت نگارانِ رسولؐ" کے زیرِ عنوان پہلے سیرۃ نگار حضرت عروہ بن زبیرؓ پر خلیل ابراہیم صاحب کے عربی مضمون کا اردو ترجمہ محمد اجمل اصلاحی صاحب کے قلم سے اور ابنِ اسحاق کی سیرتِ رسولؐ پر مشہور مغربی مستشرق الفریڈ گیوم کے مضمون کا ترجمہ پروفیسر تحسین فراقی کے قلم سے بڑے پُر معلومات ہیں۔

اس بڑے عنوان کے تحت اس قسم کے دوسرے محققانہ مضامین سیرت کی قدیم عربی کتب سیرت ابن ہشام، طبقات ابنِ سعد، تاریخ الیعقوبی وغیرہ سے متعلق اہلِ علم کے بڑے کام کے ہیں۔

آخری طویل مضمون "سیرت نبویؐ کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین" پر ایک جرمن مستشرق جوزف ہیرووتس کا لکھا ہوا ہے جس کے انگریزی و عربی تراجم کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اسے اردو کا لباس پہنایا ہے۔

اس نمبر کے دوسرے مضمون نگاروں میں مولانا تمنا عمادی مرحوم، ڈاکٹر اسرار احمد وغیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ خاص نمبر اردو کے سیرتی لٹریچر میں نہایت وقیع و قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے اور محمد طفیل صاحب اس اہم دینی خدمت کے لیے مستحق مبارکباد اور اس سے کہیں زیادہ مستحق اجر ہیں۔ مدیرِ صدقِ جدید مولانا دریا بادی کاش آج زندہ ہوتے تو یقیناً وہ طفیل صاحب کی اس خدمتِ دین کی صحیح داد اپنی مخصوص انشا میں دیتے۔ (صدق جدید۔ لکھنؤ)

نقوش کا رسولؐ نمبر ——— ڈاکٹر خلیق انجم

"نقوش" اردو کا واحد رسالہ ہے جس نے اہم موضوعات پر ضخیم نمبر شائع کر کے اردو صحافت ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ نقوش کے اب تک بیس پچیس اہم نمبر شائع ہو چکے ہیں، جن میں غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر، شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، آپ بیتی نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، ادبی معرکے نمبر، خطوط نمبر اور منٹو نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان سب میں کئی نمبر ایسے ہیں جو دو دو جلدوں جلدوں میں شائع ہوئے ہیں اور جن میں متعلقہ موضوع کے ہر ممکن پہلو کا احاطہ کیا گیا تھا حال ہی میں "نقوش" کا رسولؐ نمبر شائع ہوا ہے۔ یہ غالباً ۱۴ یا ۱۵ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ فی الحال اس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں جو ۴۰۷۱ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان چاروں جلدوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح، شخصیت، سیرت اور انسانیت اور ان کے دین کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی رسالے نے آنحضرتؐ پر اتنا ضخیم نمبر ابھی تک شائع نہیں کیا۔ پہلی جلد میں "پندرھویں صدی ہجری ماضی اور حال کے آئینے میں" ہمارے عہد کے جید عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تحقیقی مقالہ ہے جس سے عالم انسانیت میں آنحضرتؐ کی اہمیت کا اور ان کے اعلیٰ ترین مقام کے وجوہ کا مکمل اندازہ ہوتا ہے۔ چار مختلف مقالوں میں سیرت نگاری کے فن پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں "سیرت نگاری کی ذمہ داریاں" بہت اہم مقالہ ہے۔ اس کے مصنف بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ یہ مقالہ صرف مذہبی شخصیتوں کی سیرت نگاری کے لیے ہی نہیں بلکہ مختلف فنون کے ماہرین کی شخصیت اور سیرت نگاری میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

ایک بہت طویل مقالے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن شریف میں کہاں کہاں آنحضرتؐ کا ذکر آیا ہے اور قرآن شریف کی اس آیت کا سیاق و سباق کیا ہے اور اس آیت سے آں حضرتؐ کی شخصیت اور سیرت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

مولانا قاری محمد طیب نے "رسول اللہ قرآن کریم کی عملی تفسیر" کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ آنحضرتؐ کی پوری زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقالہ "سیرت رسولؐ قرآن کی روشنی میں" بہت عالمانہ اور تحقیقی انداز میں لکھا گیا ہے۔

مختلف حضرات نے ان بزرگوں پر مقالے لکھے ہیں، جنھیں درجہ اول کے سیرت نگار کہا جاتا ہے۔ یہ مقالے بھی بہت تحقیق اور جستجو سے لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد سیرۃ نبویؐ کی اولین کتابوں اور ان کے مصنفین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

طفیل صاحب نے اردو کے سلسلے میں اتنا کام کیا تھا کہ ہمیں خیال تھا کہ انھوں نے اپنی مغفرت کا انتظام کر لیا ہے اب رسولؐ نمبر کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی آخرت سنوار لی ہے۔

(ہماری زبان۔ دہلی) ○

'NAQOOSH: RASOOL NUMBER
MONUMENTAL WORK OF HOMAGE

by Khaled Ahmed

FOUR volumes (800 pages average) of 'Rasool Number' have been published by 'Naqoosh', Lahore's prestigious literary journal. At least six more volumes are in preparation to encompass a lifetime's interest of Muhammad Tufail, the Edifor, in the life and work of the Holy Prophet (peace be on him). As an anthology of research and a treasury of sources, these volumes will be a most valuable contribution to the literature of the 15th Centry Hijra.

When Maulana Shibli undertook his gigantic 'Seerat' in 1933, the Begum of Bhopal was among the patrons who gave 50,000 rupees for the great biography. Tufail has had to sell a part of his press to finance the first four volumes, each priced at Rs. 100 (library edition) and Rs. 60 (readers' edition). Calligraphy on them began in 1972 and has been completed in 1982, giving proof of Tufails's steadfastness and devotion to the divine subject. His contribution to the literature of the Prophet's (peace be on him) life is the excellent arrangement of themes and careful selection of rare and high-quality material. Once again 'Naqoosh' will be a collector's delight.

Islamic scholarship follows the trinity of priorities established over hundred of years: Seerat–Hadith–Tafseer. Volume One deals with the entire known sources of the Prophet's (peace be upon him) biographies. Maulana Syed Abdul Hassan Ali Nadvi looks forward to the 15th Century Hijra in the light of our past and lays down a 10-point programme for a successful revival of Muslim for tunes. Qari Muhammad Tayyab raises some basic issues in the 'Seerat' scholarship and explains the main trends in early writings.

Maulana Nadim-ul-Wajidi states that 'Seerat' was traditionally taken to include accounts of the Prophet's (peace be on him) life from birth to demise including accounts of his Companions' lives. A lot of biographical material was produced during the lifetime of the Prophet (peace be on him) and the most authoriative 'life' was the one chronicled by Ibne Ishaq. But a 'life' is different from 'Hadith' as the latter is confirmed in its careful assessment of truth while the former is an inclusive record with aspects not scientifically acceptable as truth. He points to Ibne Ishaq's tendency to record 'week' sources and Waqidi's lack of authority as in 'Hadith'.

Dr. Syed Moeenul Haq's essay on the 'Seerat' literature discusses the challenges of Western orientalism which must be accepted by us and praises Sir Syed Ahmad for establishing a tradition by correcting William Muir's biography of the Prophet (peace be on him) Maulana Syed Abul Hassan Ali Nadvi sets down the minimal obligations of the writer of 'Seerat'.

Dr. Ghulam Mustafa Khan discusses the first source of information on 'Seerat', the Quran. Qari Muhammad Tayyab studies the life of the Prophet (peace be on him) as an exegesis of the Quran and Qari Muhammad Abdullah Saleem examines the personality of the Prophet (peace be on him) as explained by Allah, Maulana Muhammad Haneef Nadvi's essay attempts to discover how the Quran explains prophethood The same author contributes

insight into the concordance of 'Seerat' and the Quran. A classic research paper by Maulana Abdul Majid Daryabadi studies the life of the Prophet (peace be on him) in the light of the Quran. Dr. Israr Ahmad's paper on the purposes of the Prophethood as explained in the Quran Tammana Anmadi's study of the trinity of 'Muhammad—Quran - Allah', and Syed Badruddin Alvi's dicussion of the compilation of the Quran in the lifetime of the Prophet (peace be on him) complete the introduction to the art of writing the 'Seerat'.

The scholarship on sources is represented by Muhammad Ajmal Islahi (translated by Khalil Ibrahim) who discusses the earliest writer Urwah bin Zubair of Medina. Tehseen Firaqi does an admirable job of translating Guillaume on Ibne Ishaq and also introduces the author, an important detail usually omitted by our scholars. One learns about the extent of Ibne Ishaq's reliability as a source: Iman Hanbel accepted his account but did not rely on it for the adjudication of issues Muhammad Ajmal Islahi writes about Ibne Hisham whose edition of Ibne-Ishaq only has survived. Hisham excised a lot of indecent and defamatory poems from the original and added what he thought was worthy.

Dr. Nisar Ahmad Farooqi has written an interestingessay on Ibn Saad and his 'Tabaqat'; Dr. Muhammad Yasin Siddiqi on Yaqubi is equally engaging. A very modern paper on Ibne Hazm has come from Palestinian scholars Dr. Ahsan Abbas and Dr. Nasiruddin Assad ably translated by Ajmal Islahi The same translator has rendered Dr. Shauqi Zaif on Abdul Barr. The most comprehensive Arab scholar of the 8th Century A.D., Ibne Kathir is satisfactorily examined by Dr. Masoodur Rahman Nadvi. A recent source, Allama Yusuf bin Ismael (1848) is studied by Abdul Hakeem Sharaf Qadiri while Ghulam Jilani Barq

writes informatively about the 13th century A.D. writer of 'Seerat Ibne Jauzi of Baghdad. The final essay in the volume is the admirable study of early 'life' made by Joseph Horovitz, translated into English by Pickthall and now rendered into Urdu by Dr. Nisar Ahmad Farooqi

Volume Two takes us from issues of methodology to the actual substance of 'Seerat'. A hundred pages are devoted to the central question of the chronology of the life of Muhammad (peace be on him) and give us an authentic graded glimpse into the internal and external nature of the divine personality. Articles by Maulvi Ishaq-ul-Nabi on the subject enrich this section. Dr. Nisar Ahmad Farooqi has compiled the next section on the correspondence of the Holy Prophet (peace be on him) a most absorbing glimpse into the intellect of the greatest of then.

Three hitherto unpublished articles of Syed Sula-i-man Nadvi are offered in the section on actual niography. Together with Shibli, Maulana Nadvi is the pride of South Asian scholars on the subject closest to the heart of Muslims. Tufail's admiration of a 'life' written in English by Dr. Hamidullah causes it to be included in the next section, another 'first' in Urdu.

Volume Three contains 64 articles of excellent research on the Holy Prophet (peace be on him). This is actual biography, the crux of the whole effort made by Tufail whose uncanny grasp and discrimination in the corpus of literature produced in the 20th century is put to proof. Befittingly, the article on the pre-Islamic World is from Syed Ameer Ali. Half a dozen essays by Abdul Kalam Azad bring out the profound insight into the history and inspiration of Muhammad (peace be on him) which the Maulana possessed. More philosophical and exact is the pen of Khalifa Abdul Hakeem whose share also runs to more than six articles. Tufail's preference about authority is immaculate: it mixes literature with highclass research.

It is a pleasant surprise to see a very able essay penned by the Quaid-i-Azam on the Holy Prophet (peace be on him). There is Maulana Ashraf Ali Thanvi on the duties imposed upon us by our devotion to the Prophet (peace be on him), Dr. Syed Abdullah on the contemporary application of the example of the Prophet's life, the Late Justice S.A. Rahman on the concept of justice as epitomised by the Prophet (peace be on him). Writers include Abdul Majid Daryabadi, Dr. Khursheed Ahmad, Dr. Israr Ahmad, Raees Ahmad Jafri, Mulla Vahidi and many other luminaries.

Volume Four continues the inquiry into the most remarkable personality the world has even known. The discussion is thrown open by the great Arab scholar Syed Qutb Shaheed and is joined by a dozen scholars, of the stature of Dr. Hamidullah and Abdul Rahman Azzam. on the subject of 'Uloom': sciences, social sciences, eduction, medecine and mathematics--all inspired by the personality of Muhammad (peace be on him) Hafiz Mufti Muhammad Anwarul Haq leads the discussion of ethics under the Holy Prophet (peace be on him) with a full-length paper and is followed by Maulana Ashraf Ali Thanvi, Pir Karam Ali Shah and Abdul Haleem Mahmood (rector of Cairo's Al Azhar).

Brig. Gulzar Ahmad and Tahir Farooqi write on the battles fought by Muhammad (peace be on him) as a commander of the faithful. Ghulam Jilani Barq has compiled a comprehensive list, with commentary, of all the 'ghazwaat' which makes very good reading. This is followed by a devotional article by Munshi Ragunath Rao and a collection of quotes about the Holy Prophet (peace be on him) by a number of well-known non-Muslim personalities. Carlyles famous essay on Muhammad Ipeace be on him) as a hero of humanity is included; so is the one by Dr. Allama Iqbal on the importance of the Prophet's birthday.

Tufail had published a number of 'Naqoosh' about world biography in 1964. All the personalities of the world meriting a note were included and the volums comprised 1964 pages. In 1982, Tufail is presenting the life of a single man and the four volumes now published have surpassed 3,000 pages. And that is not even one-third of the material he has on his desk! The institution of 'Naqoosh' has paid a worthy tribute to the last Prophet (peace be upon him) and, in so doing, has reached the fulfilment dreamed of by this one-man literary show, Muhammad Tufail.

A HISTORIC FEAT

By M. A. Siddiqui

NAQOOSH'S RASOOL NUMBER is undoubtedly a document of great importance. Only four volumes of the contemplated 10-volume package have managed to see the light of day so far but it is already being talked about as Mohammad Tufail's labour of love which has added yet another laurel to Mohammad Naqoosh's cap.

Mohammad Tufail and Urdu language could justly pride on the achievement. No other journal – literary or religious -- has ever attempted such a tribute to the Prophet of Islam. One feels and not quite unjustly that Michael H. Hart's much-talked-about book "The 100 – A Reading of the Most Influential Persons in History" (A&W Publishers Inc. 1978) is only eminently right in according Prophet Muhammad the first place in the List of Honours.

Mohammad Tufail plans to bring out ten volumes. The first four volumes, so far published, unfold a creative format, and to those who might be justly recalling Allama Shibli's contribution to **Seeratnigari** (which is mainly the work of Allama Syed Sulaiman Nadvi) would be rightly happy to know that the volume II of this Number includes the late Sulaiman Nadvi's mamoth work. We should be grateful to Mohammad Tufail for having procured this document from Dr Salman Nadvi, son of the late Allama Sulaiman Nadvi, who is teaching at Durban University at the moment and is in his own right prominent scholar.

The first volume deals with the holy Quran, books on Seerat (Prophet's life) and the science of Seerat It is a 816-page document and contains the authoritative writings from eminent scholars like Syed Abul Hasan Ali Nadvi, Qari Mohammad Tayyab, Dr Nisar Ahmed Farooqi, Dr. Masood-ur-Rahman Khan Nadvi, Ghulam Jeelani Burq. The exhaustive article **Hama Quran Dar Shan-i-Mohammad** and the translation of Joseph Horovitz's writing about the early books on Prophet Muhammad, besides Maulana Syed Abul Hasan Ali Nadvi's **Pandarwhin Sadi Hijri – Mazi Aur Hal Ke Aaine Mein**, are marvellous pieces. One gets the impression that it is not articles but concise books, that one is going through, written with tremendous power of authority.

The second volume (760 pages) deals with Prophet's life. The section on Seerat's **Tauqeet** (chronological account of Prophet's life) is a beautiful summation. Prophet Muhammad's letters are another attraction.

This volume is an important document. It looks like a familiar path often trodden. But a painstaking feat of editing has made the effort so rewarding that we start feeling an affiinity with the whole approach.

The other articles which merit our attention in the second volume deal with the ancient history of Makkah and Medina. The most rewarding exercise is the translation of Dr M. Hameedullah's famous book **Mohammad Rasulullah** which runs from pages 515-760. Dr Hameed*ullah is a scholar of international repute and it is a good decision to* have this book translated into Urdu.

And now we move to the third volume. It deals with the pre-Islamic times, the personality of the Prophet and his role as a human being and Prophet. The 748-page volume is, I believe, a marvellous effort and one is amazed at the painstaking research articles contributed by some of the eminent writers

The one writer who could be regarded as one of the main contributors of this Number is Dr. Nisar Ahmed Farooqui. He is a well-known Urdu critic and research scholar, teaching Arabic at the University of Delhi. His work on Mir, Ghalib and other classical poets has met with unreserved praise but it is for the first time that he has acquitted himself admirably well in a field which demands complete command over the Arabic language, social dynamics of Islam and the whole field of historiography.

Mohammad Tufail has spotted a scholar which until now was known as an authority on Mir and Ghalib. This is what makes religious topic attain a new dimension. Scholars like Shibli, Maulana Abdul Majid Daryabadi, Abul Hasan Ali Nadvi, Sulaiman Nadvi, Saeed Ahmed Akbarabadi, Ghulam Rasul Mehr, Ghulam Jeelani Burq have become or are in the process of becoming a thing of the past. Nisar Ahmed Farooqi is perhaps the only writer – in his forties – well set on following into the foot steps of those writers whose knowledge of religion and literature was simply marvellous. It is rather surprising that all those scholars who approached religion and literature with equal ease were eminently tolerant persons. Shibli's example is heart-warming. So is Sulaiman Nadvi's loving preface to Jigar Morabadi's Shola-i-Toor,

Saeed Ahmed Akbarabadi's paternalisti treatment of Khyyam, Maulana Ashraf Ali Thanvi's defence of Hallaj, Abdul Hasan Ali Nadvi advocacy of Iqbal besides Sabahuddin Abdur Rahman's work on Ghalib.

Naqoosh's Rasul Number is an important document cementing the bonds between literature and religion and we come across many a literary and religious luminary providing pleasant proofs of their catholicity.

The fourth volume, comprising 752 pages, covers yet another aspect and quite thoroughly. This is the portion on **Aswa-i-Husna.** Many pieces of sound scholarship enchant us. Prophet Muhammad's role as the great revolutionary and his influence on human knowledge and wisdom has been ably discussed. Some of the pieces worth mentioning in particular are : **Uloom-i-Insani Ke Faroogh Per Hamare Rasool Ka Asar, Hamara Rasool Ba Haisiat Sipah Salar** and **Hamare Rasool Ghair Muslimon Ki Nazar Main.** Each section of this volume, like all other volumes, is so exhaustive that the whole effort could be treated as the compendium of some important books and articles grouped together under a well-thought-out scheme. The editing part of the effort is important in that it is the editor who, helped by his advisers, exhibits a rare determination to approach the subject with a feeling that major part of literature on Islam is about the Prophet and there could be no paucity of excellent material. Therefore, the norms of selection have to be exacting.

The humility and sense of pride which courses through Mohammad Tufail's opening lines preceeding each volume are perfectly understandable and justified. It is not without some rhyme and reason that he has most humbly solicited his readers, cooperation in pointing out all lapses which might come to their knowledge. A work of this size and importance could not aspire for being error-free but the way Mohammad Tufail has pain-stakingly tried to do justice to the theme is commendable and he deserves an unreserved commendation for this document of historic importance.

۲

نقوش نے ادب کی دُنیا میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

نقوش کا ہر نمبر، تاریخِ ادبِ اُردو کا زرّیں باب ہے۔

⊙

ادارۂ نقوش

نے

۵۳۰۰۰ سے زاید صفحات چھاپے۔

۱۰۰۰۰ صفحات سیرت پر پیش کیے۔

دُنیا کا کوئی ادبی اور مذہبی رسالہ نقوش کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

کیونکہ

ادبی صفحات کو سراہنے والوں میں: بابائے اُردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، نیاز فتحپوری، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، رشید احمد صدیقی، مالک رام، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری۔

مذہبی صفحات کو سراہنے والوں میں: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، سید محمد متین ہاشمی، مولانا محمد مالک کاندھلوی، میاں طفیل محمد، مولانا نعیم صدیقی، ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سید اسعد گیلانی

ایسے بڑے نام شامل ہیں

بابائے اردو مولوی عبدالحق:

مکرمی محمد نقوش صاحب سلمہٗ

"نقوش" (شخصیات نمبر): یہ پوٹ کی پوٹ، اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون مسخرہ کہتا ہے، یہ تو ابوالرسائل ہے۔ اس پر اظہارِ رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور ان پر مقالے ایک طومار ہے۔ یہ نمبر دراصل قاموسِ شخصیات ہے جو مدتوں یادگار رہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈا کریں گے۔ آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر تازہ شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا۔ اب صرف ایک شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا، کئی ہوں گے عجب نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔

(۲)

رام بابو سکسینہ:

"The Nuqoosh has made history for Urdu Journalism. It is a veritable mine of information. There is no parallel in Urdu, or in most of the languages of India for such varied, useful and monumental numbers. Only the genius of the compiler and organiser, Mohammad Tufail, could achieve the miracle. The "MAKATIB NUMBER" is a veritable feast and offers variegated fare of high quality. I congratulate all concerned on the splendid achievement. All lovers of Urdu owe a debt of gratitude to this master spirit."

Dr. RAM BABU SAKSENA
Member Sahitya Academy India.
(مصنف تاریخ ادب اُردو)

نقوش

کا اشاعتی خاکہ

شمارہ نمبر	سنہ	موضوع	صفحات
۱۹ - ۲۰	اپریل ۱۹۵۱ء	عام شمارہ	۲۳۲
۲۱ - ۲۲	مئی ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۶۲
۲۳ - ۲۴	جولائی ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۴
۲۵ - ۲۶	ستمبر ۱۹۵۲ء	○ افسانہ نمبر	۴۰۰
۲۷ - ۲۸	نومبر ۱۹۵۲ء	عام شمارہ	۲۴۰
۲۹ - ۳۰	فروری ۱۹۵۳ء	○ پنج سالہ نمبر	۴۰۸
۳۱ - ۳۲	مئی ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۰۸
۳۳ - ۳۴	اگست ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۰۸
۳۵ - ۳۶	اکتوبر ۱۹۵۳ء	عام شمارہ	۲۴۸
۳۷ - ۳۸	جنوری ۱۹۵۴ء	○ افسانہ نمبر	۵۰۶
۳۹ - ۴۰	مارچ ۱۹۵۴ء	عام شمارہ	۲۱۶
۴۱ - ۴۲	مئی ۱۹۵۴ء	○ غزل نمبر	۴۸۰
۴۳ - ۴۴	جولائی ۱۹۵۴ء	○ ضمیمہ غزل نمبر	۲۵۶
۴۵ - ۴۶	ستمبر ۱۹۵۴ء	عام شمارہ	۲۶۴
۴۷ - ۴۸	جنوری ۱۹۵۵ء	○ شخصیات نمبر	۷۰۰
۴۹ - ۵۰	۱۹۵۵ء	○ منٹو نمبر	۳۸۴
۵۱ - ۵۲	جولائی ۱۹۵۵ء	عام شمارہ	۲۴۸

پہلے ۱۸ شمارے جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ ہاجرہ مسرور اور جناب سید وقار عظیم نے مرتب کیے تھے
یہاں پر محمد طفیل کی ادارت میں شائع ہونے والے نمبروں کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

۵۳-۵۴	دسمبر ۱۹۵۵ء	○ افسانہ نمبر (دو جلدیں)	۱۰۹۰
۵۵-۵۶	مارچ ۱۹۵۶ء	عام شمارہ	۲۰۸
۵۷-۵۸	جون ۱۹۵۶ء	عام شمارہ	۲۴۶
۵۹-۶۰	اکتوبر ۱۹۵۶ء	○ شخصیات نمبر حصہ دوم	۸۰۶
۶۱-۶۲	جنوری ۱۹۵۷ء	سالنامہ	۳۸۴
۶۳-۶۴	جون ۱۹۵۷ء	عام شمارہ	۳۱۲
۶۵-۶۶	نومبر ۱۹۵۷ء	○ مکاتیب نمبر (دو جلدیں)	۱۰۴۸
۶۷-۶۸	اگست ۱۹۵۸ء	○ دس سالہ نمبر	۴۵۴
۶۹-۷۰	اکتوبر ۱۹۵۸ء	عام شمارہ	۲۷۲
۷۱-۷۲	فروری ۱۹۵۹ء	○ طنز و مزاح نمبر	۹۲۸
۷۳-۷۴	مئی ۱۹۵۹ء	عام شمارہ	۳۵۲
۷۵-۷۶	ستمبر ۱۹۵۹ء	○ پطرس نمبر	۶۴۰
۷۷-۷۸	دسمبر ۱۹۵۹ء	○ نامس نمبر	۳۹۴
۷۹-۸۰	اپریل ۱۹۶۰ء	○ ادب عالیہ نمبر	۲۷۰
۸۱-۸۲	جون ۱۹۶۰ء	عام شمارہ	۲۸۰
۸۳-۸۴	اگست ۱۹۶۰ء	عام شمارہ	۲۵۶
۸۵-۸۶	نومبر ۱۹۶۰ء	○ افسانہ نمبر	۷۰۴
۸۷	فروری ۱۹۶۱ء	عام نمبر	۳۱۲
۸۸	مئی ۱۹۶۱ء	عام نمبر	۲۴۶
۸۹	۲ جنوری ۱۹۶۰ء	○ غزل نمبر (اضافہ شدہ)	۷۵۲
۹۰	اکتوبر ۱۹۶۱ء	عام نمبر	۲۶۴
۹۱	دسمبر ۱۹۶۱ء	عام نمبر	۳۰۴
۹۲	فروری ۱۹۶۲ء	○ لاہور نمبر	۱۲۰۴
۹۳	مئی ۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۳۲۸
۹۴	جولائی ۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۳۰۶

۹۵	اکتوبر ۱۹۶۲ء	عام شمارہ	۳۱۲
۹۶	جنوری ۱۹۶۳ء	○ سالنامہ	۶۰۸
۹۷	مارچ ۱۹۶۳ء	عام شمارہ	۳۰۸
۹۸	جون ۱۹۶۳ء	عام شمارہ	۴۰۸
۹۹	ستمبر ۱۹۶۳ء	○ شوکت تھانوی نمبر	۶۲۴
۱۰۰	جون ۱۹۶۴ء	○ آپ بیتی نمبر (دو جلدیں)	۱۹۶۴
۱۰۱	نومبر ۱۹۶۴ء	عام شمارہ	۵۶۸
۱۰۲	مئی ۱۹۶۵ء	عام شمارہ	۵۰۰
۱۰۳	ستمبر ۱۹۶۵ء	عام شمارہ	۵۵۲
۱۰۴	جنوری ۱۹۶۶ء	عام شمارہ	۵۱۰
۱۰۵	اپریل ۱۹۶۶ء	○ سالنامہ (تین جلدیں) (جنگ نمبر)	۱۲۲۴
۱۰۶	اکتوبر ۱۹۶۶ء	○ خاص نمبر	۶۱۲
۱۰۷	مئی ۱۹۶۷ء	عام شمارہ	۴۲۶
۱۰۸	ستمبر ۱۹۶۷ء	○ خاص نمبر	۶۲۰
۱۰۹	اپریل ۱۹۶۸ء	○ خطوط نمبر (تین جلدیں)	۱۷۲۰
۱۱۰	نومبر ۱۹۶۸ء	○ افسانہ نمبر	۶۷۶
۱۱۱	فروری ۱۹۶۹ء	○ غالب نمبر ۱	۸۴۰
۱۱۲	اگست ۱۹۶۹ء	عام شمارہ	۴۲۲
۱۱۳	اکتوبر ۱۹۶۹ء	○ غالب نمبر ۲	۳۸۸
۱۱۴	جولائی ۱۹۷۰ء	عام شمارہ	۳۹۲
۱۱۵	دسمبر ۱۹۷۰ء	عام شمارہ	۴۴۸
۱۱۶	ستمبر ۱۹۷۱ء	○ غالب نمبر ۳	۶۱۲
۱۱۷	مئی ۱۹۷۲ء	عام شمارہ	۴۲۴

۱۱۸	جولائی ۱۹۷۳ء	○ سالنامہ	۵۲۸
۱۱۹	ستمبر ۱۹۷۴ء	○ افسانہ نمبر	۵۷۸
۱۲۰	جنوری ۱۹۷۶ء	○ سالنامہ	۶۲۰
۱۲۱	ستمبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر ۱	۵۵۷
۱۲۲	نومبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر (نیرنگِ خیال)	۶۰۰
۱۲۳	دسمبر ۱۹۷۷ء	○ اقبال نمبر ۲	۶۵۴
۱۲۴	جنوری ۱۹۷۹ء	○ سالنامہ	۵۳۰
۱۲۵	اکتوبر ۱۹۸۰ء	○ میر نمبر ۱	۶۳۲
۱۲۶	نومبر ۱۹۸۰ء	○ میر نمبر ۲	۶۴۰
۱۲۷	ستمبر ۱۹۸۱ء	○ ادبی معرکے نمبر (دو جلدیں)	۱۲۸۴
۱۲۸	نومبر ۱۹۸۱ء	○ انیس نمبر	۷۰۸
۱۲۹	ستمبر ۱۹۸۲ء	○ عصری ادب نمبر	۸۶۰
۱۳۰	دسمبر ۱۹۸۲ء	○ رسولؐ نمبر[1] (دو جلدیں)	۱۵۷۶
۱۳۰	جنوری ۱۹۸۳ء	○ رسولؐ نمبر (دو جلدیں)	۱۵۰۰
۱۳۰	دسمبر ۱۹۸۳ء	○ رسولؐ نمبر (دو جلدیں)	۱۵۲۰
۱۳۰	جنوری ۱۹۸۴ء	○ رسولؐ نمبر (چار جلدیں)	۳۰۱۲
۱۳۰	جنوری ۱۹۸۵ء	○ رسولؐ نمبر (تین جلدیں)	۲۱۰۰
۱۳۱	جولائی ۱۹۸۳ء	○ میر نمبر ۳	۵۷۲
۱۳۲	دسمبر ۱۹۸۴ء	○ سالنامہ	۴۸۰

جنوری ۱۹۸۵ء تک کُل صفحات ۵۳،۰۰۵

---

[1] اس موضوع پر کم از کم ۱۵ جلدیں پیش کی جائیں گی، ان شاءاللہ!

مجلاتی صحافت میں "نقوش" کا مقام

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (صدر شعبۂ صحافت)

ہم قومی سطح پر سوچیں، یا بین الاقوامی سطح پر، جب مجلاتی صحافت کی اصطلاح سامنے آتی ہے تو تصور کے پردے پر صرف ادبی رسائل نمودار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تمام عوام پسند ہفت روزہ، پندرہ روزہ ماہانہ اور سہ ماہی رسائل بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جو اگرچہ علم و ادب کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن ایسا خیال افروز مواد بہت کم پیش کرتے ہیں جو اہلِ دانش اور اہلِ علم کے لیے بھرپور علمی غذا کا کام دے، بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجلاتی صحافت میں عوام پسند رجحانات نے خالص علمی اور ادبی رسائل کو پسپائی پہ مجبور کر دیا ہے۔ ایسے رسائل دُنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اہلِ علم اُنھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم کی تعداد ہر معاشرے میں کم ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے رسائل کی اشاعت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ کرنا درست نہیں کہ اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔ چونکہ ان کے قارئین اہلِ علم اور اہلِ دانش ہوتے ہیں اور وہی معاشرے میں رہنمائی کا فرض سرانجام دیتے ہیں اس لیے محدود اشاعت کے باوجود ان رسائل کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔

مجلاتی صحافت میں "نقوش" کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کا مطالعہ عوام پسند رسائل کی روشنی میں نہیں، خواص پسند رسائل کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ ایسے رسائل کے لیے دُنیا میں مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں ان رسائل کے لیے "کوالٹی میگزین" کی اصطلاح رائج ہے اور اشتراکی دُنیا میں "کلچرل میگزین" کی بعض مغربی ممالک میں اُنھیں HIGH - BROW ہائی برُو میگزین بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ رسالے جو بلند ذہنی سطح کے لوگ پڑھتے ہیں۔ اپنے ہاں رسمی طور پر ایسی تمیز کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ لیکن جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کون سے رسالے عوام پسند ہیں اور کون سے خواص پسند۔ کون سے کم و بیش تفریحی مواد پیش کرتے ہیں اور کون سے خیال افروز تحریریں مہیّا کرتے ہیں۔ پس اس مقالے میں مَیں صرف خیال افروز علمی و ادبی صحافت کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ "نقوش" کا مقام کیا ہے۔

برِ عظیم میں مجلاتی صحافت کا آغاز خالص علمی رسائل سے ہوا جو کم و بیش سوا سو سال پہلے

اجنبی راج کی سرپرستی میں جاری ہونے۔ مقصد یہ تھا کہ برعظیم کے پڑھے لکھے لوگوں کو بتایا جائے کہ جس جنبی طاقت کے زیرِ سایہ وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ایک علمی نشاۃِ ثانیہ کی نقیب ہے۔ ہمارا پہلا آزاد رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا۔ جسے سرسید نے جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے سے نہ صرف اسلامی معاشرت میں علمی تجدد کو فروغ دیا بلکہ اُردو زبان میں ایک ایسے مقصدی ادب کی بنیاد رکھ دی جس نے آگے چل کر اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اُسے جمود سے نجات دلا کر اس قابل کر دیا کہ وہ نئے خیالات اور نئے اسالیب کو اپنے آپ میں سموئے۔ اور اس طرح معاشرے کی خدمت کا فرض سرانجام دے۔ "تہذیب الاخلاق" کی تقلید میں کئی رسالے نکلے اور انھوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔

ہماری مجلاتی صحافت میں "مخزن" کو دوسرے سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ بھی محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا علمبردار تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اُردو ادب کو نئی اصناف سے آشنا کیا جائے نثر اور شاعری میں نئے تجربے کیے جائیں اور مغربی ادب کے شہ پارے اُردو میں منتقل کیے جائیں۔ اس دور میں کچھ اور رسائل بھی نکلے۔ جن میں عبدالحلیم شررؔ کا "دلگداز"، اکبر شاہ نجیب بادی کا "عبرت" محمد دین فوق کا "کشمیری میگزین" اور مولانا ظفر علی خان کے دو رسالے "دکن ریویو" اور "پنجاب ریویو" نمایاں تھے۔

اس صدی کے آغاز میں جب ریاست منظرِ عام پر آئی تو چند ایسے رسائل نکلے جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے علمبردار تھے ان میں حسرتؔ موہانی کا "اُردوئے معلّی" بدرالزماں بدرؔ کا "شمس بنگال" ظفر الملک علوی کا "الناظر" دیا نرائن نگم کا "زمانہ" سید سلیمان ندوی کا "معارف" اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا "جامعہ" اور انجمن ترقی اُردو کا "اُردو" شامل ہیں۔ مؤخر الذکر رسالہ سیاست سے خالی تھا لیکن باقی رسائل میں سے بعض میں سیاست نمایاں تھی اور بعض میں علم السیاست، تاریخ اور عمرانیات، ان رسالوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک تو نئی کتابوں پر ٹھوس تبصرے کیے جاتے تھے، دوسرے علمی اور تہذیبی خبریں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کی جاتی تھیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد عوام پسند ادبی رسائل کا دور دورہ ہوا۔ ان میں "کہکشاں"، "ہزار داستان" "خیالستان"، "رومان" اور بعض دوسرے رسالے تو شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے، لیکن "نگار"، "ساقی" "نیرنگِ خیال"، "عالمگیر" "ہمایوں"، "ادبی دنیا" اور "ادبِ لطیف" نے طویل زندگی پائی اور ماشاءاللہ

ان میں سے چند رسائل اب بھی زندہ ہیں، ان رسائل نے نئے ادیبوں کے فن کو نکھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی میں اتنا نمایاں کردار ادا کیا کہ نہ صرف مجلاتی صحافت کی تاریخ میں بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں بھی اُنھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ یہ رسالے صرف عوام پسند نہیں تھے خیال افروز بھی تھے اور یہ علم و ادب کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتے تھے کہ اہلِ دانش اُنھیں قدر کی نظروں سے دیکھتے رہے۔

اِسی دَور میں یہ کوشش ہوئی کہ رسالوں کے خاص نمبر نکالے جائیں۔ جن میں کسی مخصوص موضوع پر بھرپور مواد پیش کیا جائے۔ "نیرنگِ خیال" سے سالناموں کا آغاز ہوا۔ جو اگر اُس زمانے کی پروڈکشن کے معیار کی روشنی میں دیکھے جائیں تو ایک عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی مخصوص موضوع پر خاص نمبر کا آغاز بھی "نیرنگِ خیال" سے ہوا جس نے پہلی مرتبہ "بانگِ درا" کے سائز میں تین ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل "اقبال نمبر" شائع کیا۔ "زمانہ" نے ایک ضخیم "پریم چند نمبر" چھاپا۔ "عالمگیر" نے "روسی ادب نمبر" پیش کیا اور "ہمایوں" نے "روسی ادب نمبر" اور "فرانسیسی ادب نمبر" شائع کیے۔ اور لاہور سے مجید ملک مرحوم نے "نرگس" کا "نظم نمبر" مرتب کر کے ایک اور طرح ڈال دی۔

میرے نزدیک "نقوش" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جو کام پہلے اِکا دُکا رسالہ کبھی کبھی اور نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتا تھا۔ وہ اس نے ایک بہت بڑے پیمانے پر، ایک منظم انداز میں اور جامعیت کے تمام تقاضوں کے ساتھ کر کے مجلاتی صحافت کو ایک انسائیکلو پیڈیائی رنگ بخش دیا۔ شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، لاہور نمبر، پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، سعادت حسن منٹو نمبر اور اسی قسم کے دوسرے نمبر ایسے اہم اور نادر مواد پر مشتمل ہیں جو اکٹھا نہ ہوتا تو اُردو ادب کا بہت بڑا ضیاع ہوتا۔ ان نمبروں کی ترتیب میں جس ریاض سے کام لیا گیا ہے مجلاتی صحافت میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اس کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ محققین کا کام آسان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اُنھیں جتنا مآخذی مواد "نقوش" کے خصوصی نمبروں میں ایک جگہ اور اچھی اور مستند صورت میں مل جاتا ہے۔ اتنا بے شمار کتابوں، دستاویزوں اور فائلوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ "نقوش" نے جن موضوعات پر خاص نمبر چھاپے ہیں اُن پر مزید تحقیق کا کام سہل ہو گیا ہے۔ اور اس کے لیے محققین یقیناً "نقوش" کے احسان مند ہیں۔

یہ نمبر اپنے اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ضخامت کو محدود کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی جاتی تو ان کی جامعیت میں فرق آ جاتا۔ ضخامت اور مواد کے اعتبار سے یہ

مستقل تصانیف اور تالیفات کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو کام "نقوش" نے کر دکھایا ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتاب، انسائیکلو پیڈیا اور مجلّے کو ایک جگہ سمو کر، اور اُسے حُسن بخش کر "نقوش" نے مجلاتی صحافت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور ثابت کر دکھایا ہے کہ کام کرنے کی نیت ہو، خلوص اور لگن ہو، تو جو کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے وہ فردِ واحد سرانجام دے سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں "نقوش" کے عام نمبر بھی خاص نمبر ہوتے ہیں اور وسیع ضخامت کی وجہ سے اس میں طویل مختصر افسانے، ناولٹ، طویل مقالے اور کلاسیکی شہپارے بغیر کسی تکلف کے دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لکھنے والے تنگ دامانی کی قید سے آزاد ہو کر لکھتے ہیں اور اس طرح اپنے موضوع سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ رسم اب چل نکلی ہے۔ پہلے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے "ادبی دنیا" کو یہی رنگ دیا اور اب "اوراق" اور "فنون" بھی اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔

"نقوش" کی ایک اور ادا جو مجھے بھاتی ہے، یہ ہے کہ یہ صرف ادب پیش نہیں کرتا۔ علم کے ہر شعبے پر سیر حاصل مواد پیش کرتا ہے۔ یہ ہماری مجلاتی صحافت کی کلاسیکی روایت ہے جسے بعد کے ادوار میں بہت سے رسالوں نے ترک کر رکھا تھا۔ حالانکہ نصف صدی قبل کے مقابلے پر آج اس بات کی اور بھی ضرورت ہے کہ مجلاتی صحافت محض سکہ بند ادب کی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ آج کے زمانے کے اہلِ دانش کی دوسری ذہنی ضروریات کی تکمیل کا بھی سامان فراہم کرے۔

"نقوش" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ مجلّہ کسی ایک دبستانِ ادب یا دبستانِ خیال سے وابستہ نہیں۔ ہر دبستانِ خیال کا ادیب اور شاعر اس کے صفحات پر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "نقوش" کو کلاسیکی روایات عزیز ہیں لیکن یہ تجدد کا مخالف نہیں۔ لہٰذا یہ کلاسیکی اور جدید روایات کے درمیان ایک پُل کا کام دیتا ہے۔

چونکہ ہمارے ہاں نئی باتیں عام طور پر مغربی ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اس لیے میں نے سوچا شاید "نقوش" نے جو رنگ لے رکھا ہے وہ بھی کسی دوسرے ملک کی تقلید پر مبنی ہو۔ چنانچہ میں نے مقالہ لکھنے سے پہلے مختلف ممالک کی مجلاتی صحافت پر کتابیں اور مقالے پڑھے اور برطانیہ، امریکہ، سوویت یونین، فرانس اور جرمنی کے بہت سے علمی اور ادبی رسالے دیکھے اور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنی جامعیت، اتنی خصوصیات کے حامل اور اتنی ضخامت کے رسائل دُنیا کے کسی ملک میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ "نقوش" دُنیا بھر میں اپنی قسم کا پہلا مجلّہ ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ میں نے اس مقالے میں دیدہ و دانستہ طفیل صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ اس

کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بہت شرمیلے ہیں اور تعریف سے اور بھی شرمائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب کسی کی تعریف کی جائے تو وہ "خلیفہ" بن جاتا ہے اور محض ماضی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ محمد طفیل "خلیفہ" نہ بنیں۔ تیسری وجہ یہ ہے خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کسی کی تعریف کی جائے لوگ تعریف کرنے والے سے محرکات وابستہ کرتے ہیں اور میری ذات سے پہلے ہی مختلف امور میں لاتنے محرکات وابستہ کر دیئے گئے ہیں کہ مزید محرکات کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی یہ پرانی ریت ہے کہ ہم کسی شخصیت کی اُس کی زندگی میں تعریف نہیں کرتے۔ مبادا کہ ہماری اپنی عظمت میں فرق آجائے۔ پس ان حالات میں معذرت خواہ ہوں کہ جناب طفیل کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین ادا نہیں کر سکا۔
